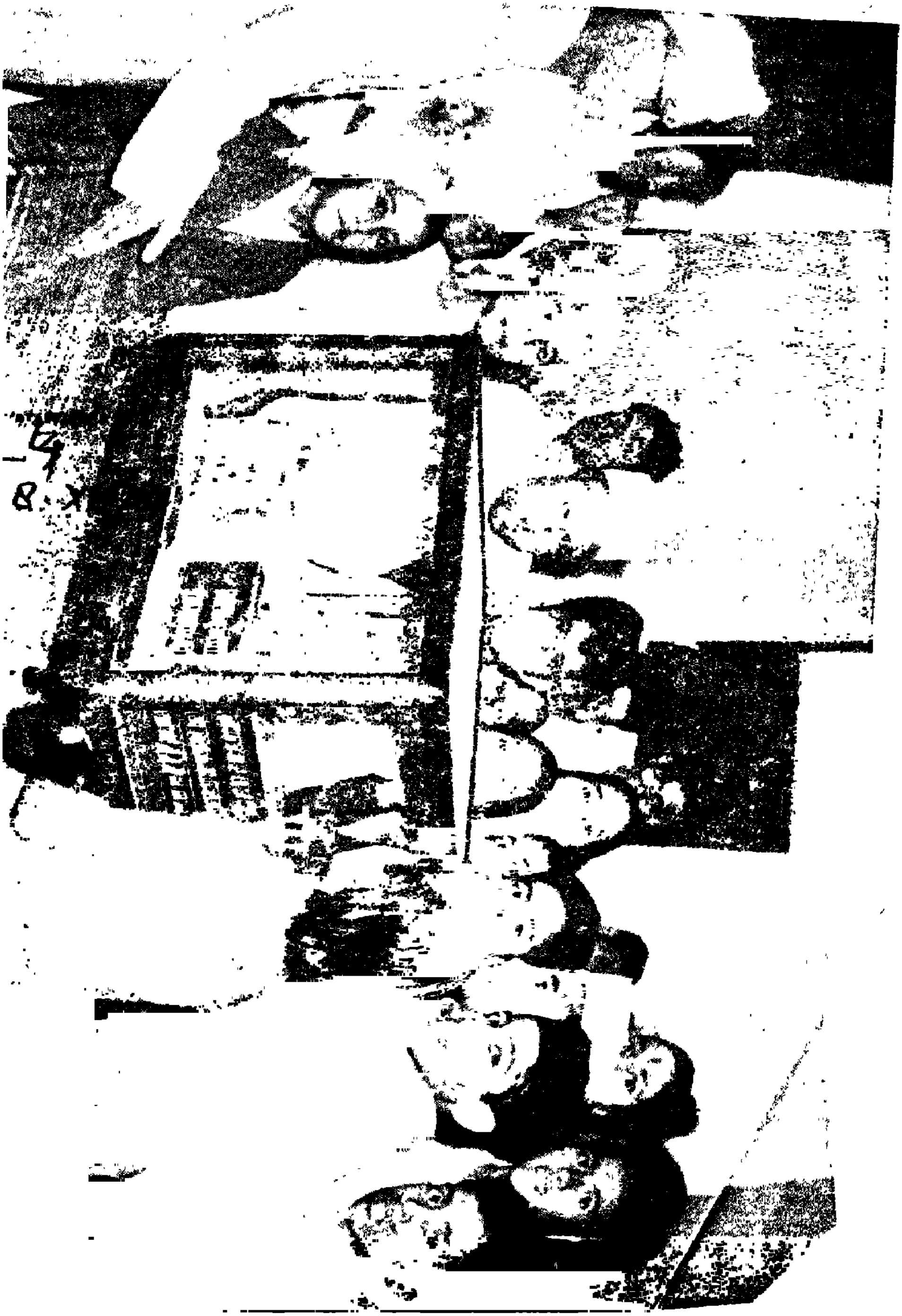
پیام تعلیم





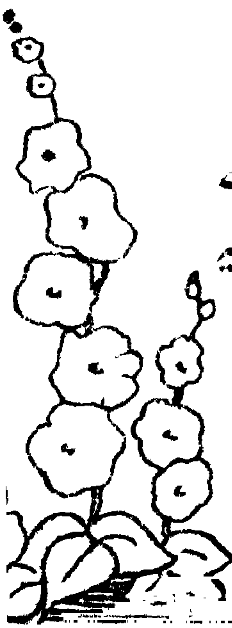
سالنامہ

پیامِ تعلیم

دہلی

جلد ۳ جنوری ۱۹۶۶ء شمارہ





ایڈیٹر

محمد حسین حسّان ندوی

آرٹسٹ: گلیڈون میسی

سالانہ چندہ	پانچ روپے
فی پرچہ	ایک روپیہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

بمبئی آفس: پرنس بلڈنگ، بمبئی ۳

اچھی اچھی کہانیاں
خوب صورت کتابت۔ عمدہ طباعت
اور رنگین تصویروں والی ایک بہترین کتاب

ابو خاں کی بکری

ڈاکٹر ذاکر حسین

قیمت ۲/۵۰

قابلِ مطالعہ

پاک کہانیاں

مقبول احمد سیوہاروی

بزرگانِ دین کی بالکل سچی کہانیاں۔ جنھیں پڑھ کر آپ بہت سی کام کی باتیں سیکھ سکتے ہیں۔

قیمت حصہ اوّل -/۹۵
حصہ دوم ۱/۱۵

خرگوش کا سپنا

کرشن چندر

میاں خرگوش کے کارنامے جنھوں نے اپنے تمام دشمنوں کو نیچا دکھایا۔ بڑی ہی مزے دار کہانی شروع سے آخیر تک ہنسی سے بھرپور۔

قیمت ۱/۷۵

بن اناڑی

عصمت چغتائی

بچے ہوں یا بڑے، صاحب بھی اس کتاب کو پڑھ کر اپنی ہنسی روک نہیں سکتے۔ راہ کرم اپنے اس کارنامے سے مطالعہ فرمائیں۔

قیمت ۱/۲۰

جن حسن عبدالرحمٰن

ایل لاگن

بچوں کی الف لیلیٰ موجودہ زمانے کے مطابق۔ ایک جن کی کہانی جو اب بھی ایک لڑکے کے قبضے میں ہے۔ بہت ہی مزیدار قصہ ہے۔

قیمت حصہ اوّل ۲/=
حصہ دوم ۲/=

تاروں کی سیر

کرشن چندر

آسمان میں دور خلا کے اندر جانا اب تو بہت ہی آسان ہو گیا ہے۔ آپ کی طرح تین بچے بھی وہاں کی سیر کر آئے ہیں۔ ان کی سیر کی مزیدار کہانی

قیمت ۱/۷۵

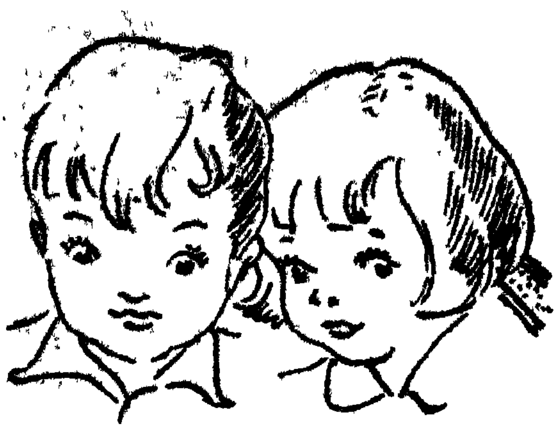
تصاویر

سرِ ورق: — سرِ ورق کی تصویر بمبئی کے مسٹر ایس۔ اے۔ چودھری کا عطیہ ہے

دوسرا صفحہ: — پروفیسر مجیب لاجپت نگر گرلز اسکول کو نہرو ٹرافی پیش کر رہے ہیں

تیسرا صفحہ: — بیگم مجیب ہارکورٹ بٹلر ہایر سکنڈری اسکول کو گاندھی ٹرافی دے رہی ہیں

فہرست



بچوں سے باتیں

پیامیوں کو نیا سال مبارک!

ہم اِس نئے سال کی خوشی میں دو تحفے آپ کی
ت میں پیش کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک
ا یہ خاص نمبر یا سالنامہ ہے۔ خدا کرے آپ کو
ند آئے۔

اس پرچے میں آپ اچھی اچھی کہانیاں پڑھیے
ں سے جی خوش کیجیے۔ ان کے علاوہ آپ کو
ا دل پر اثر کرنے والے اخلاقی مضمون ملیں گے۔
مضمون ملیں گے۔ پیامِ تعلیم کے خاص
نگار یوسف ناظم صاحب کا بہت ہی چٹپٹا
ن ملے گا۔ اور ہاں اچھی اچھی پیاری
میں ملیں گی۔ سعادت نظیر۔ حرمت الاکرام۔
بھارتی اور دوسرے شاعروں کے علاوہ اس
مرتبہ حضرت ساحر بھوپالی، اشعر رام نگری نے بھی
نوازش فرمائی ہے۔ ہمارے پرانے ساتھی شفیع الدین
نیّر صاحب ایم۔ اے سال کے سال ایک نظم ضرور
مرحمت فرماتے ہیں۔

آج کل کے حالات کی وجہ سے سالنامہ
نکالنے کا فیصلہ دیر میں ہوا۔ ہمیں خوشی ہے کہ دِلّی
سے باہر کے مضمون نگار حضرات نے ہماری درخواست
پر اپنے مضامین جلد سے جلد بھیجنے کی کوشش کی۔
پھر بھی بہت سے مضمون اس وقت ملے جب پرچہ
آخری شکل اختیار کر چکا تھا۔ دلی افسوس ہے کہ
ہم انھیں سالنامے کی زینت نہ بنا سکے۔ انشاء اللہ
اگلے پرچوں میں شائع ہوں گے۔





جامعہ کے تعلیمی میلے میں چھوٹے بچوں کا پروگرام





جامعہ کے تعلیمی میلے میں چھوٹے بچوں کا پروگرام



مدرسہ ابتدائی جامعہ کے ڈرا
"تپسیا کا پھل" کا ایک منظ



الجامعہ (بائیں سے چوتھے نمبر
۔ردائی پہنے ہوئے) "تپسیا کا پھل"
کے ساتھ۔

اس پرچے کی تیاری میں ہمیں اپنے مقامی ساتھیوں مجیب احمد خاں صاحب، سید احمد ولی صاحب، جناب تاباں صاحب (جنرل منیجر مکتبہ) کے علاوہ شاہد علی خاں صاحب (انچارج مکتبہ شاخ بمبئی) اور وقار خلیل صاحب سے غیر معمولی مدد ملی۔

شاہد صاحب تو شروع سے رسالے کی مدد کر رہے ہیں۔ اس مرتبہ انھوں نے بمبئی سے اچھے اچھے مضمون بھجوائے۔ نظمیں بھجوائیں۔ تصویریں بھجوائیں۔ سال نامے کے ٹائیٹل کی تصویر انھی کی نوازشوں کا نتیجہ ہے۔

وقار خلیل صاحب ہمارے لیے نظمیں لکھتے ہیں مضمون لکھتے ہیں اور حیدر آباد کے علمی و ادبی حلقے کے اہم لوگوں سے مضامین لکھوا کر بھجواتے ہیں۔ ان دونوں کی یہ نوازشیں شکریے سے بالاتر ہیں۔

پچھلے پرچے میں ہم نے نہرو انعام کا ذکر کیا تھا۔ یہ بھی بتایا تھا کہ اس سال یہ انعام راشد نعمانی صاحب کو ملا ہے۔ اور یہ کہ راشد صاحب نے ایم۔ اے تک جامعہ میں تعلیم حاصل کی ہے ایسا نہیں ہے۔

راشد صاحب نے ابتدائی تعلیم الٰہ آباد میں پائی۔ ہائی اسکول اور انٹر اسلامیہ انٹر کالج لکھنؤ سے پاس کیا۔ پھر جامعہ رُورل انسٹی ٹیوٹ سے رورل سروسز کا ڈپلوما حاصل کیا۔ جامعہ کے ٹریننگ کالج سے بی۔ ایڈ کیا اور اس وقت اسی کالج میں ایم۔ ایڈ کے طالب علم ہیں۔ بہر حال اس کامیابی پر ہم راشد نعمانی صاحب کو دوبارہ مبارک باد دیتے ہیں۔

بھئی آپ کو اس پرچے کا بہت انتظار کرنا پڑا۔ ہمیں اس کا بہت احساس ہے۔ پر کیا کیا جائے بعض مجبوریاں لاعلاج ہوتی ہیں۔ دلّی میں آج کل انفلوئنزا وبائی شکل میں پھیلا ہوا ہے۔ جسے فلو کہتے ہیں۔ ہمارے بعض کارکن خصوصاً سید احمد ولی صاحب عین وقت پر اچانک بیمار ہو گئے۔ یہ بیماری خطرناک تو نہیں لیکن بیمار کو بہت کمزور کر دیتی ہے۔ آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ ولی صاحب نے اس بیماری سے نجات پاتے ہی اسی جوش اور تن دہی سے کام شروع کر دیا۔ کمزوری کی بھی ذرا پروا نہ کی۔ اسی وجہ سے پرچے کی اشاعت میں زیادہ دیر نہ ہونے پائی۔

جناب کوثر اعظمی

حمد



اے خالقِ دو عالم
اے صانعِ مکرم
اونچا ہے تیرا رتبا
کوئی نہیں ہے تجھ سا
بے مثل ذات تیری
اعلیٰ صفات تیری
رب ہے، رحیم ہے تو
داتا، کریم ہے تو
داتا ہے تو سخی ہے
آقا ہے تو غنی ہے
تو نگہدار سب کا
پروردگار سب کا
تیری شان سب سے عالی
سارے جہاں کے والی
اونچا ہے نام تیرا
بالا مقام تیرا
حاکم ہے تو جہاں کا
مالک ہے انس و جاں کا
تو قادر و توانا
تو کارساز، دانا
قدرت ہے تیری عالی
حکمت تیری نرالی

تیرے کمال یارب!
ہیں لازوال یارب!

تو نے جو شے بنائی
کیا خوش نما بنائی



پھولوں میں تیری بو ہے — تاروں میں تو ہی تو ہے
کرنوں میں عکس تیرا — ذرّوں میں نقش تیرا
تیری ہی اک جھلک ہے — بجلی میں جو چمک ہے
پربت میں تیری ہیبت — قلزم میں تیری سطوت
موجوں میں زور تیرا — جھرنوں میں شور تیرا
تیری دمک گہر میں — خورشید میں، قمر میں
تاروں کی جگمگاہٹ — تیری ہی مسکراہٹ
ذرے سے کہکشاں تک — دھرتی سے آسماں تک

ہر سو ظہور تیرا
پھیلا ہے نور تیرا

پھولی ہوئی شفق میں — فطرت کے ہر ورق میں
نکہت میں، بوئے گل میں — رنگین روئے گل میں
سبزے کی خامشی میں — پودے کی دلکشی میں
شاخوں کی ہر لچک میں — غنچوں کی ہر چٹک میں
بلبل کی راگنی میں — سیمیں سی چاندنی میں
پھولوں میں، پتیوں میں — شبنم کے موتیوں میں
بیلوں کی کاکلوں میں — نرم سی کونپلوں میں
شاداب پنکھڑی میں — گلشن کی دلبری میں
دنیائے رنگ و بو میں — ہر سمت کاخ و کو میں

جلوہ نواز تو ہے
عشوہ طراز تو ہے

پودا یہ پروان چڑھے

جامعہ نگر

۱۰ دسمبر ۱۹۶۵ء

عزیزی حسین حسان صاحب سلام مسنون

مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ پیامِ تعلیم کا سالنامہ نکل رہا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ مجھے اس رسالے سے دلی تعلق ہے۔ یہ پودا پہلی بار

میں سنہ ۱۹۲۶ء یا سنہ ۱۹۲۷ء میں لگایا اور کئی سال تک اسے

اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ اس کے بعد آپ نے مکتبہ جامعہ کی طرف

سے اس کی آبیاری کی اور یہ خوب پھولا پھلا۔ ایک مدت کے بعد

جب یہ بادِ سموم کے جھونکوں سے مرجھا کر رہ گیا تو اس کے سبھی خادموں

اور قدر دانوں کو اور شاید سب سے زیادہ مجھ کو صدمہ پہنچا۔ مگر شکر

ہے کہ پچھلے سال مکتبہ جامعہ نے اس پودے کو نئے سرے سے

نصب کیا اور پھر اس کی دیکھ ریکھ آپ ہی کے سپرد کی۔ خدا سے دعا ہے

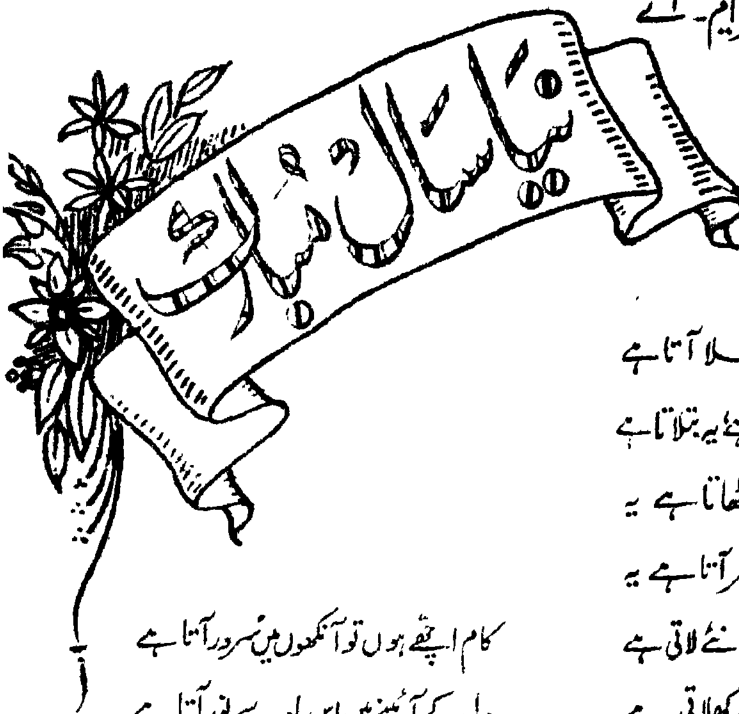
کہ یہ پھر پہلے کی طرح پروان چڑھے اور قوم کے نونہالوں کو ہمیشہ اس کے

میٹھے اور رس بھرے پھل کھانا نصیب ہو۔

دعاگو

عابد حسین

جناب محمد شفیع الدین نیّر ایم۔ اے



ہر نیا سال جو ہر سال چلا آتا ہے
وقت یوں تیزی سے جاتا ہے، یہ بتلاتا ہے
وقت کی قدر ہر اک دل میں بٹھاتا ہے یہ
مجھ کو رحمت کا فرشتہ نظر آتا ہے یہ
اس کی آمد ہی ارادے بھی نئے لاتی ہے
اس کی آمد ہی نئی راہ بھی دکھلاتی ہے
یہ خوشی ہے کہ نئے سال میں ہوگا کچھ کام
اس میں گزرے گی ہر اک صبح، اسی میں ہر شام
اک نئے عزم سے میدان میں ہم آئیں گے
کرکے کچھ کام نئے سال میں دکھلائیں گے
اس کے آنے سے گیا سال بھی یاد آتا ہے
کیا کیا، کیا نہ کیا۔ بات یہ سمجھاتا ہے

کام اچھے ہوں تو آنکھوں میں سرور آتا ہے
دل کے آئینے میں اس یاد سے نور آتا ہے
اس نئے سال کا آنا ہو مبارک سب کو
اک نئی روح کا پانا ہو مبارک سب کو
پھیلے اس طور سے بھارت میں پیامِ تعلیم
ساری دنیا میں نمایاں ہو مقامِ تعلیم

جناب محمد حفیظ الدین

سچّی کہانیاں

قصے کہانیاں بچے سنتے ہی رہتے ہیں۔ جنوں کی، پریوں کی، بادشاہوں کی، فقیروں کی، انسانوں کی، جانوروں کی، زمینوں کی، آسمانوں کی، مگر یہ دل بہلاوے کی باتیں ہوتی ہیں، سب صحیح نہیں ہوتیں۔ آگے جو کہانیاں پڑھنے میں آئیں گی۔ دلچسپ ہوں یا نہ ہوں ان میں سے ایک بھی من گھڑت نہیں ہے۔ سب سچی، اچھی اور معتبر باتیں ہیں۔

ایک لڑکی کا لطیفہ

اگلے زمانے کے صوفی، درویش ہمیشہ باوضو رہتے تھے۔ کبھی بے وضو ہو جائیں تو جب تک وضو نہ کرلیں منہ سے بات نہ کرتے تھے اور اکثر روزہ رکھتے تھے۔ دن میں کھانا پینا ان کے مسلک میں عیب سمجھا جاتا تھا۔

ایک روز ایک صوفی کہیں جا رہا تھا۔ اس کا وضو ٹوٹ گیا۔ راستے میں ایک مکان پر دستک دی۔ ایک لڑکی دروازے پر آئی، درویش بے وضو تھا اس لیے منہ سے کچھ نہ بولا۔ اشارے سے پانی مانگا۔ لڑکی صرف یہ جانتی تھی کہ درویش دن میں روزہ رکھتے ہیں، شام کو افطار کرتے ہیں۔ لڑکی درویش کے اشارے کو پوری طرح نہ سمجھ سکی بس اتنا سمجھی کہ پانی مانگ رہا ہے۔ حیرت زدہ گھر میں آئی اور کہنے لگی امی امی معلوم ہوتا ہے قیامت قریب آگئی ہے۔ ماں نے پوچھا کیا بات ہے بیٹی؟ ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔ لڑکی نے سادگی سے کہا وہ جو درویش نے دہلیز پر دستک دی تھی اس روشن دن میں پینے کے لیے پانی مانگ رہا ہے۔

ماں درویشوں کے آداب سے واقف تھی، معاملہ سمجھ گئی، کہا بیٹی یہ بات نہیں ہے وہ وضو کرنا چاہتا ہے لوٹے میں پانی بھر کر دے دو۔ لڑکی نے پانی دیا تو درویش نے وضو کیا اور اپنی راہ لی۔

اس قصے سے درویشوں کی پاک زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ قصہ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی نے اپنی کتاب خیر المجالس میں بیان کیا ہے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

اٹاوہ مسلم اسکول کے آخری درجے کے طالب علموں کی وداعی دعوت تھی۔ طالب علم اور استاد کھانے میں شریک تھے۔ مولوی بشیر الدین صاحب اس اسکول کے بانی اور مہتمم تھے۔ اپنے عہدے کے علاوہ بڑی عمر اور اچھی خدمات کی وجہ سے ان کی ملک بھر میں شہرت اور عزت تھی۔ خدا نے ان کی عمر میں بہت برکت دی تھی۔ اس دعوت میں وہ بھی تشریف لائے سارا مدرسہ ان کے لیے آنکھیں بچھاتا تھا۔ جدھر جدھر جاتے تھے، طلبا اور اساتذہ بڑے ادب سے تعظیم دیتے تھے۔

ابھی کھانا ختم نہ ہوا تھا کہ وہ فارغ ہونے والے طلبہ کی طرف جا پہنچے، نہ جانے کیا سوجھی کہ ان طلبہ کی پلیٹوں میں پانی انڈیلنے لگے۔ کوئی مسکرادیا، کوئی حیران، گم سم! ۔ کوئی ان کی طرف تکنے لگا گویا کہہ رہا ہو کہ یہ کیا حرکت ہے؟ اور سب نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ پانی ملے ہوئے پھیکے سیٹھے سالن سے کھاتے بھی کس طرح؟ مگر ایک طالب علم تھا جو برابر اسی طرح کھاتا رہا۔ اور اپنے سامنے کا پانی ملا ہوا کھانا پورے اطمینان کے ساتھ ختم کرنے کے بعد مڑ کا عجیب لڑکا تھا یہ ــــ کسی نے پیچھے سے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا شاباش! تم ایک روز بڑے آدمی ہو گے۔ یہ شاباشی دینے والے مولوی بشیر الدین تھے اور شاباشی لینے والا لڑکا ملک کے موجودہ نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے یہ کیسی سچی پیشینگوئی تھی اور کتنا اچھا تجربہ تھا۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ کسی آسان اور مختصر راستے سے وہ اس منزل تک پہنچ گئے۔ بڑی کھکیڑیں اٹھائی ہیں۔ زندگی کی تلخیوں کو شربت کے گھونٹ کی طرح پیا ہے۔ نہ کبھی منہ بنایا نہ کبھی شکوہ کیا۔ پھیکی سیٹھی کڑوی کسیلی جو غذا بھی ملی ہنسی خوشی نوش جان کی خود سنور گئے، اور بہت سوں کو سنوار دیا۔

دوسروں کی خوشی کا خیال

علامہ شبلی کے وطن بندول (اعظم گڑھ) کے پاس ایک گاؤں جیراجپور ہے۔ مشہور عالم اور جامعہ کے استاد مولانا اسلم جیراجپوری یہیں کے رہنے والے تھے۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں دو باپ بیٹے تھے: مولانا عبد الغفور

اور مولانا عبدالودود۔ دونوں جید عالم تھے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عرصے تک استاد بھی رہ چکے تھے۔ چہرے نورانی، دل آئینے کی طرح صاف۔ مولانا عبدالودود ندوے سے حکومت رام پور کی درخواست پر وہاں کے مشہور و معروف عربی مدرسے کے صدر ہو کر رام پور چلے گئے۔ وہیں سے سفر آخرت کیا۔

مولانا عبدالودود اصولِ اخلاق کے پیکر تھے۔ ایک دن انھوں نے ندوے کے دو تین طالب علموں کو کھانے پر بلایا۔ کھانے کھلانے میں مولانا بہت سیرچشم اور فراخ دل تھے۔ طلبا ندوے سے مولانا کی قیام گاہ ڈالی گنج پہنچے۔ اتفاق کی بات تین چار اور انجان طلبہ ملنے آ گئے۔

اس لکھنے والے کو مولانا کی خدمت میں خصوصی نیاز حاصل تھا۔ قرب کے شرف کی وجہ سے مولانا کی عادتوں اور مزاج سے کافی واقفیت ہو گئی تھی۔ خلاف معمول کچھ ایسا محسوس ہوا کہ مولانا پریشان ہیں دو ایک بار اٹھ اٹھ کر باہر گئے۔ آئے خیال ہوا کہ تعداد دگنی ہو گئی ہے اس لیے شاید انتظام میں دقت پیش آ رہی ہے۔ قریب جا کر پوچھا کہ بازار سے کچھ لایا جائے معلوم ہوا [illegible] کچھ عزیز میں کھانے پینے کی چیزیں [illegible] فراوانی ہو رہی تھی۔ دسترخوان بچھا کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولانا بھی شریک ہوئے۔ اس موقع پر بھی صرف اداشناس سمجھ سکے کہ کوئی بات ضرور ہے جسے مولانا کی دائمی متانت اور اعلیٰ ظرفی نے چھپا لیا ہے۔ تھوڑی دیر تک ناؤ نوش کی محفل گرم رہی پھر سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانے چلے گئے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ اس روز مولانا کی ایک بچی سخت بیمار ہو گئی تھی۔ زندگی کی آس نہ رہی تھی، دو ایک دفعہ جو اٹھ اٹھ کر باہر گئے تھے تو حکیم ڈاکٹر کو بلانے گئے تھے۔

نیازمندوں نے گلہ کیا کہ مولانا ایسے موقع پر بھی آپ نے ہمیں خبر نہ ہونے دی تو مسکرا کر فرمانے لگے بھئی علاج معالجے کا جو انتظام ضروری تھا وہ ہو گیا تم لوگوں کو سنا کر مزا کرکرا کرنے سے کیا فائدہ تھا۔

کوئی نہیں جانتا وہ کون تھا

• یہ بات اس وقت کی ہے جب ملک تقسیم نہ ہوا تھا۔ ہندوستان [illegible] ریڈیو کی شروعات [illegible] سب سے پہلے ڈائرکٹر مسٹر فیلڈن ہوئے ان کے

مددگار بخاری صاحب تھے۔ جن کے بہت سے مضمون پطرس کے نام سے شائع ہوئے ہیں وہ بہت قابل اور اچھے آدمی تھے ان کے جاننے والے اب بھی پاکستان و ہندوستان میں بے شمار لوگ ہیں۔ پروفیسر بخاری فیلڈن کے بعد ریڈیو کے ڈائرکٹر بنائے گئے۔

ان کے ایک چھوٹے بھائی تھے یہ چھوٹے بخاری کہلاتے تھے۔ چھوٹے بخاری بھی ریڈیو کے دفتر میں کسی اچھے عہدے پر تھے۔

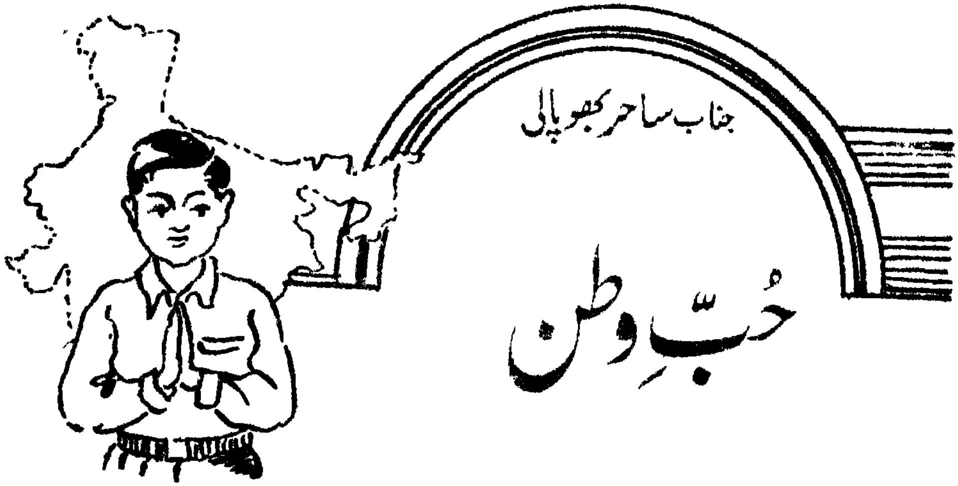
ایک روز۔ چھوٹے بخاری اپنے مالی کے ساتھ ریڈیو والی کوٹھی کے چمن کی بہار دیکھ رہے تھے دیکھتے دیکھتے احاطے کے ایک کنویں کے پاس پہنچ گئے۔ کنویں پر سڑی گلی بلیاں رکھی ہوئی تھیں، مالی اور بخاری صاحب دونوں ان پر چڑھ کر اندر جھانکنے لگے۔ بلیاں کم زور تھیں دو آدمیوں کا بوجھ نہ سہار سکیں، بیچ میں سے ٹوٹ گئیں۔ مالی اور بخاری دونوں کنویں میں جا پڑے۔ کوٹھی کے نوکر چاکر دوڑے مگر کنویں میں اترنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ فائر بریگیڈ کو فون ہوا، اور خبر چند منٹوں میں دور دور تک پہنچ گئی۔

اتفاق سے ایک ٹانگے والا پھٹے حال ٹخ ٹخ کرتا اپنا ٹانگا ہانکے چلا جا رہا تھا۔ اس نے کوٹھی میں جو جماؤ دیکھا تو اپنے گھوڑے تانگے کو سڑک کے کنارے چھوڑ، کنویں کے پاس دوڑ آیا، آن کی آن میں اپنی پگڑی اور رسیوں کی مدد سے کنویں میں اترا، دونوں کو باہر نکال لایا۔

عجیب سماں تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ بخاری صاحب چل بسے۔ ہر طرف سے لوگ دوڑے دوڑے آرہے تھے۔ فائر بریگیڈ، پیدل سوار موٹر نشین ایک جم غفیر ہو گیا۔ اس ہنگامے میں غریب ٹانگے والا، نہ جانے کیا سوچ کر چپکے سے کھسک گیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے درحقیقت وہ چاہتا بھی نہ تھا کہ کوئی اسے جانے اور اس کی بے غرض خدمت کا اسے کوئی صلہ ملے۔ جب لوگوں کے ہوش و حواس بجا ہوئے مبارک سلامت کا غل کم ہوا تو بے غرض محسن کی تلاش شروع ہوئی۔ مگر وہ دن اور آج کا دن کسی کو معلوم نہ ہوا کہ وہ کون تھا، اور کہاں گیا۔

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری ضرور لکھیے ورنہ تعمیل یا جواب میں تاخیر کا امکان ہے۔

منیجر



جناب ساحر بھوپالی

حُبِّ وطن

تیری چاہت میں رہتا ہوں ہر دم مگن میرے نغموں میں ہے تیرا ہی بانکپن
میرے سر میں سمایا ہے سودا ترا میرے دل کو ہے بس ایک تیری لگن

میں ہوں بلبل ترا تو ہے میرا چمن
میرے ہندوستاں میرے پیارے وطن

تیرے دم سے امر ہے کہانی مری تجھ پہ قربان ہے زندگانی مری
تیری گودوں میں کھیلا ہے بچپن مرا تیرے سائے میں سنوری جوانی مری

تیری چاہت سے سرشار ہے میرا من
میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن

تیری سج دھج زمانے میں سب سے جدا ساری دنیا کی تجھ پر بہاریں فدا
تجھ میں مسجد بھی، مندر بھی، گرجا بھی ہیں خاک کا تیری ہر ذرّہ ہے دیوتا
موہ لیتی ہے دل تیری بانکی پھبن
میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن

تجھ میں ہندو مسلماں، سکھ عیسائی ہیں سب ہیں اک قوم آپس میں سب بھائی ہیں
تو ہے گہوارہ انسانی تہذیب کا جتنے مذہب ہیں سب تیرے شیدائی ہیں
تجھ میں بہتی ہیں مل جل کے گنگ و جمن
میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن

تیری عظمت کی خاطر بہارِ چمن گھر سے باندھے ہوئے نکلوں سر سے کفن
ہاتھ میں تیغ اور لب پہ للکار ہو خونِ دشمن سے ہو تر بہ تر پیرہن
پھر ذرا کوئی دیکھے مرا بانکپن
میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن

جناب سید قمر الحسن

فقیر کو

کبھی نہ جھڑکو

بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک امیر آدمی ایک دن اپنی بیوی کے ساتھ بھنا ہوا مرغ کھا رہا تھا۔ اچانک دروازے پر ایک فقیر آیا اور اُس نے صدا دی۔ امیر آدمی باہر نکلا اور بجائے اُسے کچھ دینے کے بے چارے کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد زمانے نے کروٹ لی۔ اس امیر آدمی کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ آہستہ آہستہ اُس کی ساری دولت ختم ہو گئی۔ بے چارہ ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہو گیا۔ مجبور اور پریشان ہو کر اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ بیوی نے دوسرے مرد سے شادی کر لی۔ کافی دن گزر گئے۔

یہ بیوی ایک دن اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ بیٹھی اتفاقاً مرغ ہی کھا رہی تھی۔ اتنے میں کسی فقیر نے دروازے پر سوال کیا" اللہ کے نام پر بھوکے غریب کو ایک ٹکڑا دے

دو۔

شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ "ایک حاجت مند تمہارے دروازے پر آیا ہے۔ جاؤ یہ مرغ اسے دے دو۔" بیوی شوہر کی مرضی دیکھ کر بغیر کسی پس وپیش کے مرغ لے کر باہر آئی اور کہا "سائیں بابا ـــــ یہ حاضر ہے لے لیجیے۔" اور فقیر مرغ لے کر دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

لیکن وہ عورت فقیر کو دیکھ کر سکتے میں رہ گئی اور پھر روتی ہوئی اندر آئی۔ شوہر نے رونے کا سبب پوچھا۔ بیوی نے پہلے تو ٹالا پھر روتے ہوئے قصہ بیان کیا "یہ میرا پہلا شوہر تھا۔ ایک بار ہم دونوں مرغ کھا رہے تھے کہ ایک فقیر آیا اور سوال کیا۔ لیکن اس نے فقیر کو ڈانٹ کر بھگا دیا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بدلہ دیا کہ ہماری ساری دولت و ثروت ختم ہو گئی۔ حتیٰ کہ اس نے مجھے طلاق بھی دے دی اور اس کے کافی دن بعد پھر میں نے تمہارے ساتھ شادی کر لی۔"

اس دوسرے شوہر نے یہ سن کر کہا کہ "خدا کی قسم میں ہی وہ فقیر ہوں جس کو تمہارے پہلے شوہر نے ڈانٹا تھا۔ سائل کو ڈانٹنے کے عذاب میں اللہ نے اس کی ساری دولت چھین کر مجھے دلا دی۔ حتیٰ کہ تم بھی میرے پاس پہونچ گئیں۔"

اللہ تعالیٰ کا کہا ہوا سچ ہوا کہ "وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ" یعنی فقیر کو کبھی نہ جھڑکو۔"

جناب بزمی بھارتی

نئی روشنی



اندھیرے چھٹے روشنی مسکرائی
فلک جگمگایا، زمیں جگمگائی
اُفق کے دریچے سے سورج نے جھانکا
نیا سال آیا، نئی صبح آئی
اٹھو! سونے والوں کو بیدار کردو
پیام محبت سے سرشار کردو
بڑھاؤ قدم اپنی منزل کی جانب
ترقی کی راہوں کو گلزار کردو
ہمالہ کی چوٹی پہ چڑھ کر پکارو
اجنتا کے غاروں کی زلفیں سنوارو
فلک پر مہ و کہکشاں بن کے ابھرو
زمیں کو نئی روشنی سے نکھارو

اُفق کے دریچے سے سورج نے جھانکا
نئی صبح آئی، نیا سال آیا

جناب یوسف ناظم

چچا بھتیجے



ہمارے چچا جان اچھا کماتے ہیں، اچھا
پہنتے ہیں۔ یوں دیکھنے میں انھیں کوئی پریشانی
یا کسی قسم کی تکلیف نہیں لیکن اس کے باوجود
وہ ہمیشہ رنجیدہ اور پریشان رہتے ہیں۔ ہم نے
تو کبھی انھیں خوش نہیں دیکھا جب دیکھو ان کا
منہ پھولا ہوا ہے۔ بھنویں تنی ہوئی ہیں۔ چچا ہمیشہ
دودھاری تلوار بنے رہتے ہیں۔ کبھی ایک
کے سر پر سے کبھی دوسرے کے سر پر
گرے۔ دنیا میں بڑے سے بڑا واقعہ
بھی ہو جائے تو انھیں فکر نہیں ہوتی۔ انھیں فکر

رہتی ہے تو بس اس بات کی کہ یہ شخص صحیح اور کھری اُردو بولے۔ اس کا تلفظ صحیح ہو اور ہر بات میں کوئی نہ کوئی محاورہ ہو۔ محاورے بولنے میں چچا کو کمال حاصل ہے۔ وہ ایک چھوٹا سا جملہ بھی بولیں گے تو اس میں کم سے کم تین محاورے ضرور ہوں گے۔ بات تو خیر وہ کرتے ہی نہیں صرف ڈانٹتے ہیں۔ لیکن ان کی ڈانٹ بھی چٹخارے دار زبان میں ہوتی ہے کہ ڈانٹ کھانے والے کو مٹھائی کھانے کا مزہ آجائے۔ چچا جان کے سامنے زبان کھولنا' اپنی شامت بلانا ہے۔ ادھر زبان کھولی نہیں کہ پکڑی گئی۔ فرمائیں گے" یہ ہم نے کیا سنا۔ یہ مُرغ کس نے کہا! یہ امجد میاں ہوں گے امجد میاں تو سارے گھر کی زبان بگاڑ کر رکھ دیں گے۔ میاں ہم نے تم سے کچھ نہیں تو پچاس بار ضرور کہا ہوگا کہ مُرغ نہیں مُرغ کہا کرو۔ اس کا "ر" ساکن ہے۔ مُرغ کہنے میں اگر تکلیف ہوتی ہو تو مُرغا کہا کرو۔ لیکن خدا کے لیے مُرغ کہہ کر ہمیں چڑایا نہ کرو۔"

لیجیے صاحب۔ صرف ایک لفظ زبان سے نکلا اور چچا جان نے آڑے ہاتھوں لیا۔

تلفظ اور قواعد درست کرنے میں تو چچا جان' جان پر کھیل جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ تو وہ ریلوے اسٹیشن پر ایک اجنبی آدمی سے لپٹ پڑے۔ اس بے چارے نے کہیں غلطی سے کہہ دیا" جلدی کرو' ٹرین پکڑنا ہے۔" یہ سننا تھا کہ چچا جان' جان نہ پہچان لپکے اس کی طرف اور فرمایا "حضرت معاف کیجیے، میرا آپ کا تعارف تو نہیں لیکن آپ کی زبان سے غلط اُردو سن کر میں رہ نہیں سکا۔ حضرت ٹرین پکڑنا صحیح نہیں۔ ٹرین پکڑنی ہے کہنا چاہیے۔ کیوں کہ ٹرین مونث ہے۔"

اب کیا تھا جناب ان حضرت نے ٹرین کا خیال تو چھوڑ دیا اور چچا جان کو پکڑ لیا۔ جب ٹرین نے سیٹی دی تو معاملہ چکا۔ اس پر بھی چچا جان مانے نہیں۔ کہنے لگے کہ "اچھا ہوا وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا ورنہ سارا شہر غلط اُردو بولنے لگتا۔"

چچا جان ہمیشہ اس کوشش میں رہتے

ہیں کہ ان کے بھتیجے اور بھتیجیاں اچھے اچھے محاورے بولنا سیکھیں۔ وہ باری باری سے ایک ایک کو پکڑ پکڑ کر محاورے بولنا سکھاتے ہیں۔ محاورے رٹا کر بچوں کو اسکول میں چھوڑ دینا، چچا جان کا خاص مشغلہ ہے۔ لیکن عجیب بات ہے جب کبھی چچا جان کا رٹایا ہوا محاورہ بچے نے اسکول میں دہرایا وہ ضرور پٹا۔ نجمہ بچاری ایک دن اپنی استانی نزہت آپا سے پٹ گئی۔ اس دن شاید اسکول میں کھانا پکانے کی کلاس ہو رہی تھی۔ کہیں آٹے کا بھوسا اُڑ کر نزہت آپا کے بالوں میں اٹک گیا۔ اپنے چچا کی بھتیجی نجمہ نے فوراً اپنی استانی سے کہا "نزہت آپا آپ کے سر میں تو بھوسا بھرا ہوا ہے"۔

ساری لڑکیاں ہنس پڑیں۔ نزہت آپا غصّے سے لال پیلی ہوگئیں لیکن نجمہ نے دیکھا تک نہیں اور اُن سے کہا، لائیے آپا آپ کا سر صاف کر دوں۔ بس اس کے بعد نزہت آپا نے اپنا سر تو صاف نہیں کیا لیکن نجمہ پر خوب ہاتھ صاف کیا۔

چچا جان کو اپنے سب بھتیجوں میں ممتاز میاں سب سے زیادہ پسند ہیں۔ یوں کہیے انھیں ممتاز پر ناز ہے اور چچا جان کا کہنا ہے کہ ممتاز بہترین محاورے بولتا ہے۔ یہی ممتاز میاں ایک دن اپنے اسکول سے اپنے ابّا کے نام ایک خط لے آئے جو اُن کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھیجا تھا۔ اس خط میں لکھا تھا:

"جناب امتیاز احمد صاحب! آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ آپ کا لڑکا ممتاز احمد جو آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے، بکثرت محاورے بولنے لگا ہے۔ براہِ کرم اس پر نظر رکھیے ورنہ آئندہ چل کر یہ لڑکا ہمارے اسکول کے لیے خطرناک ثابت ہوگا اور ہم اسے رخصت کرنے پر مجبور ہوں گے۔"

یہ خط پڑھ کر ابّا بے حد گھبرائے۔ انھوں نے ممتاز میاں سے دریافت کیا کہ آخر بات کیا ہوئی جو ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایسا خط لکھ مارا۔

ممتاز میاں بولے :" ابّا جی! ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو تو بات بات پر پھول ہونے لگتی ہے اور وہ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔"

ابّا :۔ مجھ سے محاوروں میں باتیں نہ کرو۔ محاورے تم اپنے چچا جان سے بگھارنا۔ مجھے سیدھی سادھی اُردو میں بتلاؤ کہ ہوا کیا؟

ممتاز :۔ ہوا کچھ بھی نہیں ابّا۔ میں نے اپنے تاریخ کے ماسٹر صاحب سے صرف اتنا کہا کہ ماسٹر صاحب تاریخ میں جھانسی کا ذکر تو بہت ہے لیکن جھانسہ کا کہیں ذکر نہیں بس اتنا سننا تھا کہ اُن کے تلووں لگی اور سر تک پہنچی ——— ممتاز یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اتنے میں چچا جان پہنچ گئے۔ اور فرمایا۔

چچا جان :۔ کیا بات ہوئی بیٹے تمہارے منہ سے تو اب پھول جھڑنے لگے ہیں۔

ابّا :۔ جی ہاں! جب ہی تو سارے چمن اجڑ گئے ہیں۔ ——— ممتاز آگے بتلاؤ۔

چچا جان :۔ ہاں ممتاز! ہم بھی تو سنیں کہ تمہارے تاریخ کے ماسٹر صاحب کے تن بدن میں جو آگ لگی، وہ بجھی کیسے؟

ممتاز :۔ چچا جان! آپ ہمارے تاریخ کے ماسٹر صاحب کو نہیں جانتے وہ اتنا اچھا پڑھاتے ہیں کہ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے دادی جان کہانیاں سنا رہی ہیں۔ بس اُن کی ایک ہی بات ذرا کھلتی ہے۔ غصہ ہمیشہ اُن کی ناک پر رہتا ہے۔

ابّا :۔ ممتاز تم ہوش میں ہو یا نہیں۔ میں پوچھ رہا ہوں کہ تم نے اُن سے بحث کیوں کی؟

ممتاز :۔ ابّا میری تو اُن سے صرف دو منٹ بات ہوئی اور اتنی ہی دیر میں اُن کے مزاج کا پارا چڑھ گیا۔

ابّا :۔ پھر محاورہ۔ تم یہ محاورے پر محاورے کیوں بولے چلے جا رہے ہو؟

چچا جان :۔ بھائی صاحب! آپ بھی

باقی صفحہ پر



جناب وقار خلیل

قومی یک جہتی

مہر و محبت کا اک ایواں — جس میں رقصاں صبحِ بہاراں
دھرتی ہے یا تختِ سلیماں — ذرّے ہیں یا ماہِ درخشاں
قومی یک جہتی کے ہاتھوں — ارضِ وطن فردوس بداماں
بستی بستی پیار کا چرچا — قریہ قریہ حُسنِ گلستاں
چپّہ چپّہ لالہ و نسریں — کوچہ کوچہ سنبل و ریحاں
میلوں، تہواروں کی رونق — آنگن آنگن بزمِ چراغاں
ہم سے وفا کے باغ میں خوشبو — بوٹا بوٹا خنداں خنداں
تہذیبوں کے آئینے ہیں — کیسے ہندو، کون مسلماں
ایک حقیقت کے جلوے ہیں — گیتا، وید، مقدس قرآں
آپس میں ہم شیر و شکر ہیں — جاگ اٹھے ہیں ہمارے ارماں
ہم ہیں اک تہذیب کے والی — ہم ہیں اک تاریخ کا عنواں
علم و ادب کے کاشانے میں — ہیرے، موتی، لعلِ بدخشاں
گیت، غزل، افسانہ، کوتیا — بوئے وفا ہر فن میں نمایاں
ظلمت ہم سے آنکھ بچائے — ہم ہیں اب خورشید بداماں
ہم سے شہرِ وفا روشن ہے — ہم دانش کی صبحِ درخشاں

ہم سے وقارِ ہند سلامت
یک جہتی ہے اپنا ایماں

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

امیر خسروؒ کا ایمان

نہ جانے تم نے کبھی امیر خسرو کا نام سنا ہے کہ نہیں۔ یہ ہندوستان کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔

امیر خسرو فقط شاعر ہی نہ تھے بلکہ بڑے عالم فاضل، صوفی اور گانے کے فن کے ماہر بھی تھے۔ ہندوستان کا بچہ بچہ انھیں جانتا ہے۔

ان کی کہہ مکرنیاں، پہیلیاں اور گیت ایسے ہیں کہ جو کوئی انھیں سنتا ہے جی لگا کر سنتا ہے۔

پہیلیاں سنتا ہے تو سوچتا ہے اور دیر تک سوچتا رہتا ہے۔ ذرا تم ان کی پہیلیاں سنو اور دیکھو کہ دیر تک سوچتے رہو گے یا نہیں۔

ترور سے ایک تریا اتری جس نے بہت رجھایا
باپ کا اس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیارا بوجھ پہیلی موری
امیر خسرو یوں کہیں اپنا نام نہ بولی

اس پہیلی کو پڑھو اور سوچو کہ تریا نے اپنے باپ کا نام آدھا بتایا ہے۔ آدھے کو فارسی میں نیم کہتے ہیں آخر میں کہتے ہیں اپنا نام نہ بولی نیم کی نبولی کو ہر ایک جانتا ہے۔ دیکھو نیم بھی آگیا اور نبولی بھی آگئی۔ مگر جب

تم کسی کو یہ پہیلی سُناؤ گے تو وہ چکّر میں آجائے گا اور دیر تک سوچتا رہے گا کہ اس تربا کا باپ کون تھا جس کا نام آدھا بتایا ہے اور جب اسے یہ بتاؤ گے کہ آدھے کو فارسی میں نیم کہتے ہیں اور نبولی کا باپ نیم ہے تو اُچھل پڑے گا اور کہنے لگے گا واہ بھئی واہ !! یہ پہیلی تو خوب ہے جس میں نیم بھی آگیا اور نبولی کا نام بھی آگیا ہے۔

اسی طرح ایک اور پہیلی ہے۔

سُر کاٹو تو امن رہے اور دُم کاٹو تو پیالا
امیر خسرو یوں کہیں رنگ ہے اس کا کالا

یہ جامن ہے۔ کالا رنگ ہے۔ اس کا سَر 'ج' ہے۔ جیم کاٹو تو 'امن' رہ جائے گا۔ 'ن' دُم ہے۔ اسے کاٹ دو تو جام رہ جائے گا۔ جام پیالے کو کہتے ہیں۔ یہ پہیلی کتنی اچھی ہے!

جیسا کہ ہم نے بتایا امیر خسرو شاعر ہی نہ تھے بلکہ ہر فن کے ماہر تھے۔ یہ بادشاہوں کے دربار میں بڑے بڑے عہدوں پر رہے تھے۔

پھر ایک ہی بادشاہ کے دربار میں نہیں، چھ سات بادشاہوں کے دربار میں رہے تھے۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے بادشاہوں کے دربار میں ایک بڑا اور مقدس اور اونچا عہدہ تھا۔ اس عہدہ کو مصحف بر داری کہتے تھے۔ قرآن پاک کا بادشاہ کے سامنے رکھنا اور جب بادشاہ تلاوت ختم کر چکے تو اُٹھا لینا۔

ایسا آدمی جسے یہ عہدہ ملتا تھا بادشاہ کا خاص آدمی سمجھا جاتا تھا۔ بس تو حضرت امیر خسرو بادشاہ کے خاص آدمی تھے۔ امیر خسرو شاہ جلال الدین خلجی کے مصحف بردار بھی تھے اور دربار کے امیروں میں بھی تھے اور اسی لیے دلّی والے انھیں امیر خسرو کہتے تھے اور اب تک اُن کے بھی نام کے ساتھ امیر لگا ہوا ہے

اب وہ کہانی سُنو جسے ہم تمھیں سُنانا چاہتے ہیں۔ امیر خسرو کے پیر و مُرشد کا نام تھا خواجہ نظام الدین اولیاء۔ یہ اتنے بڑے بزرگ اور خدا رسیدہ تھے کہ

بادشاہ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا کرتے تھے۔ مگر نہ تو یہ خود کسی بادشاہ کے پاس جاتے تھے نہ کسی بادشاہ کو اپنے پاس آنے کی اجازت دیتے تھے۔ بادشاہ اُس ڈر سے کہ بغیر اجازت اگر ہم حضرت خواجہ نظام الدین کی خدمت میں جائیں گے تو کہیں بددعا نہ دے دیں، کبھی نہ جاتے تھے۔

یہ بات بھی سب جانتے تھے کہ خواجہ نظام الدین اپنے مریدوں میں سب سے زیادہ امیر خسرو کو چاہتے ہیں اور ان کی شاعری کی قابلیت اور ہر فن میں کامل ہونے کے سبب ان کی ہر سفارش کو جو کسی کی دعا کے لیے کرتے ہیں مان جاتے ہیں۔

جلال الدین خلجی کے دربار میں امیر خسرو بڑی عزت والے عہدہ دار تھے۔ وہ بھی خواجہ نظام الدین کی خدمت میں جانے کی تمنا کرتا رہتا تھا۔ امیر خسرو سے ذکر کرتا تو امیر خسرو جواب دیتے "جہاں پناہ! میرے شیخ دولت مندوں، بڑے سیٹھوں، امیروں اور بادشاہوں سے ملنا نہیں چاہتے۔ خاص کر بادشاہوں سے تو کبھی ملتے ہی نہیں۔ میں عرض کردوں گا میرے شیخ آپ کے لیے دعا کر دیں گے۔" جلال الدین کہتا "خسرو! مجھے تو حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا ہے۔"

ایک دن بولا "خسرو! تم سے ایک بات کہتا ہوں۔ میں نے سوچا ہے حضرت نظام الدین کو خبر نہ دی جائے اور میں اچانک خانقاہ میں پہنچ جاؤں تو پھر تو حضرت مجھ سے مل ہی لیں گے۔ امیر خسرو یہ سُن کر کچھ نہ بولے۔ مگر دربار سے چھٹی ملتے ہی اپنے شیخ خواجہ نظام الدین کو یہ سب باتیں جو بادشاہ نے کہی تھیں، سُنا دیں۔ ان باتوں کو سُن کر شیخ اجودھن (پاک پٹن) چلے گئے جہاں ان کے پیر و مُرشد رہتے تھے۔ خواجہ نظام الدین کے پیر و مُرشد کا نام فرید الدین تھا اور سب لوگ انھیں بابا فرید الدین گنج شکر کہتے تھے۔
بادشاہ کو جب یہ خبر لگی کہ خواجہ نظام الدین

دلّی سے اجودھن چلے گئے ہیں تو وہ سمجھ گیا، ہو نہ ہو امیر خسرو نے میرے اچانک خانقاہ میں پہنچ جانے کی خبر دی ہو گی۔ میں نے فقط ان ہی سے اپنے دل کی بات بتائی تھی۔ بہت غصہ آیا اور امیر خسرو کو طلب کیا۔

بادشاہ نے امیر خسرو سے پوچھا تو امیر خسرو نے بے جھجک اقرار کر لیا کہ میں نے اپنے پیر و مرشد سے آپ کے ارادے کا ذکر کیا تھا۔ پھر کہا۔ "جہاں پناہ! حضور کی ناراضی سے مجھے اپنی جان جانے کا ڈر تھا اور پیر و مرشد کے ناراض ہو جانے سے ایمان جانے کا خطرہ تھا۔ ایسی جان کا رہنا جس میں ایمان سلامت نہ رہے کس کام کا ہے۔ مجھے جان کے مقابلے میں ایمان پیارا ہے۔"

امیر خسرو کی یہ بات بادشاہ کو اچھی لگی۔ یا تو اسے غصہ آ رہا تھا یا خوش ہو گیا اور امیر خسرو کی بڑی تعریف کی۔

تم نے امیر خسرو کی بات سُنی۔ یہ اتنے بڑے درجے کے شاعر تھے کہ ایک بادشاہ نے انھیں ہاتھی کے وزن کے برابر چاندی سونا تلوا کر دے دیا تھا۔ اس بادشاہ کا نام قطب الدین مبارک تھا اور یہ علاء الدین خلجی کا بیٹا تھا۔

جناب سید حرمت الاکرام

وقت

بچو! وقت کی قیمت سمجھو
کیسی ہے یہ دولت سمجھو

کس نے وقت کا مول کیا ہے؟
ایک اک لمحہ بیش بہا ہے

کھوئی دولت لوٹ بھی آئے
گزرا وقت کوئی نہ پائے

کب یہ کسی کی خاطر ٹھہرا
وقت ہے اک بہتا دریا

بہتا دھارا روکا کس نے؟
اس دھارے کو ٹوکا کس نے؟

وقت گنوا کر پچھتاؤ گے
پچھتانے سے کیا پاؤ گے

وقت پہ سوؤ وقت پہ جاگو
وقت کی پابندی سے نہ بھاگو

وقت ہوا اسکول کو جاؤ
اپنا مستقبل چمکاؤ

کھیلو کودو پر یہ سمجھ کر
وقت سے لوٹ آؤ اپنے گھر

وقت پہ جس نے پایا قابو
اس کی اک اک بات ہے جادو

وقت کے ساتھ چلو، اچھا ہے
وقت سے لڑنا کام برا ہے

وقت کی قیمت سمجھو بچو!
اس کو نعمت سمجھو بچو!



ظلم کی ٹہنی

محترمہ آصفہ مجیب

بغداد کے اطراف میں ایک پُر فضا باغ تھا۔ بہشت جیسا۔ سبزہ آنکھوں میں کھبا جاتا۔ شاخوں میں ہزاروں پھول ستاروں کی طرح کھلے ہوئے۔ خوشبو میں بسی ہوئی ہوا لہکتی رہتی۔ وہاں جانور بہت رہتے تھے۔ ایسی اچھی کھلی فضا۔ کھانے پینے کی افراط اور اتنی بہت سی نعمتیں پاکر بہت خوش رہتے سب چین تھا۔

کہیں قریب ہی ایک خونخوار شیر رہتا تھا جو روز اپنی منحوس صورت دکھاکر بیچاروں کا سب عیش اور سکون لوٹ لیتا۔ سارا مزہ مٹی میں ملا دیتا۔ بڑے عذاب میں جان تھی۔

ایک دن سب نے مل کر مشورہ کرکے اس کے پاس پہنچے اور عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر فریاد کی کہ بادشاہ ہم سب آپ کی رعیت ہیں، فرماں بردار ہیں، حضور روز بڑی تکلیف اور مشقت اٹھاکر ہم میں سے ایک کا شکار کرتے ہیں اور کبھی نہیں بھی کرپاتے ہم سب خوف سے لرزا کرتے ہیں ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے اور سرکار ڈھونڈتے ڈھونڈتے پریشان ہوتے ہیں ہم نے بہت سوچا ایک تدبیر ہماری سمجھ میں ایسی آگئی جس میں حضور کا بھی بھلا ہے اور ہمیں بھی سکھ نصیب ہوگا۔ اگر کچھ اعتراض نہ ہو تو ہر وقت کی مصیبت سے ہمیں چھڑائیں خود تشریف نہ لائیں ہم روز ایک شکار ناشتے کے وقت حضور کے کھانے کے لیے بھیجا کریں گے۔ اس فرض کو ادا کرنے میں ہم سے کبھی کوتاہی نہ ہوگی کبھی

بھول چوک نہ ہوگی۔

شیر اس بات پر راضی ہو گیا۔ وہ بے چارے روز قرعہ ڈالتے جس دن جس جانور کا نام نکل آتا اسے وظیفے کے طور پر شیر کے پاس بھیج دیتے۔ ہوتے ہوتے ایک دن خرگوش کا نام نکل آیا۔ زمانے نے اسے تیز بلا کا نشانہ بنایا۔ فکر اور غم سے آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ بے چارے کا ذرا سا منہ نکل آیا۔ ستی گم ہو گئی۔ بس آج سب مزے تج کر موت کے منہ میں چلا جائے! آہ اس میرے بھرے باغ کو الوداع کہے۔ یہ لہلہاتا ہوا سبزہ جو مخمل کی طرح دور تک بچھا ہوا ہے کبھی اس پر لوٹ لگاتا ہے اور میٹھی نیند کے مزے لیتا ہے کبھی سوتے سوتے جاگ کر اچھل کود کرنے لگتا ہے۔ یہ مست مست ہوائیں شیریں چشموں کا خنک پانی۔ لذیذ غذائیں دنیا بھر کی نعمتیں سب ختم۔ ایک خونخوار ظالم کے نفس کی آگ بجھانے کے لیے! کیا اس کی قوت اور حرص کے آگے بزدلی اور کمزوری سے جھک جائے؟

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ پھر اچھل کر بولا:۔

"دوستو ٹھہر ۔ ۔ ۔ میں تم سے تھوڑا دیر کی مہلت مانگتا ہوں۔ پھر اس موذی کے پنجے سے ہمیشہ کے لیے تم سب کو چھڑا دوں گا"

سب نے ایک رائے ہو کر جواب دیا "اچھا۔ ۔ ۔ تھوڑی سی دیر کر کے جانے میں کوئی حرج نہیں تم سے جو بن پڑے کر لو، کیسی غضب میں جان پڑی ہے۔ ہمارا تو جینا دشوار ہو گیا۔ اس ظالم سے کسی کو پناہ نہیں"

خرگوش اتنی دیر ٹھہر کر شیر کے کھانے کا وقت نکل گیا۔ مارے غصے کے وہ دانت پیس رہا تھا۔



خرگوش نرم نرم چال سے چلتا وہاں دبے پاؤں پہنچا دیکھا شیر کی غصے اور بھوک سے بری حالت ہو رہی ہے غیض و غضب سے دُم زمین پر مار رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ دل سے اپنا وعدہ توڑ دینا چاہتا ہے۔ یہ دیکھ کر خرگوش ڈرتے ڈرتے سامنے آیا۔ بہت جھک کر سلام عرض کیا۔

شیر دہاڑا "تم کہاں سے آرہے ہو اور سب جانوروں کا کیا حال ہے۔"

خرگوش نے ادب سے گزارش کی:

"عالی جاہ... سب امن امان اور شانتی ہے۔ انھوں نے دستور کے مطابق ایک خرگوش میرے ساتھ کر کے حضور کے کھانے کو بھیجا تھا۔ راستے میں ایک شیر ملا۔ اور زبردستی اسے ہتھیا لیا بہت کہا کہ چھوڑ دو یہ ہمارے بادشاہ کا کھانا ہے۔ جانوروں کی طرف سے روز ینہ بندھا ہوا ہے تمھارا کوئی حق نہیں ہے۔ پر اس نے ایک نہ سنی۔ بدزبانی پر اتر آیا بولا "بڑا آیا بادشاہ بن کے۔ وہ کون ہوتا ہے کھانے والا میں کھاؤں گا۔ یہ میری شکارگاہ ہے شکار میرا ہے۔ میرا حق ہے۔ تو زیادہ بک بک نہ لگا اپنا رستہ پکڑ۔ اس قدر اپنی بڑائیاں ہانکیں اتنا زور طنطنہ دکھایا کہ میری کچھ نہ چلی۔ وہاں سے سیدھا حضور کی خدمت میں عرض حال کرنے دوڑا آیا۔"

شیر کی حیوانی قوت اور حمیت جوش میں آگئی وہ گھوا پوری طاقت سے گرجا:

"اے خرگوش بتا کہاں ہے وہ بدذات کیا تو



اسے میرے سامنے لا سکتا ہے! میرا سامنا کیا مجھ پر بتاؤں اسے کر میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ تیرے ساتھ جو کیا ہے اس کا اور اپنا بدلا لوں۔ مجھ سے مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ ساری ہیکڑی ابھی نکال دوں گا!"

خرگوش نے آگ پر اور تیل چھڑکا "کیوں نہیں عالی جاہ! ابھی سامنے لاتا ہوں۔ سرکار کی شان میں ایسی ایسی بے ادبی کی بری بری باتیں کیں اور اپنی بڑائی جتائی کہ سن کر تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ سر کچل دوں اور چیل کووں کو کھلاؤں۔ حضور کی جنگل میں پھنسا دیکھوں تو میرے دل کی مراد پوری ہو کمبخت بچ کر کہاں جائے گا۔ ابھی لاتا ہوں روبرو۔"

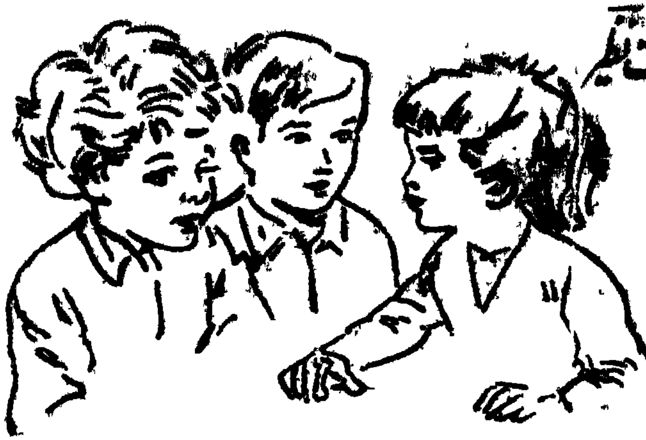
یہ کہہ کر وہ بڑھا۔ شیر طاقت اور غرور کے نشے میں چور غراتا اکڑتا پیچھے پیچھے چلا۔ خرگوش اسے ایک بڑے سے کنویں کے پاس لے آیا۔ کنویں کا پانی اتنا صاف شفاف تھا جیسے آئینہ۔ دیکھنے والے کو اپنی صورت ایسی اور صحیح نظر آتی کہ عکس کو اصل سمجھتا ایک سچا نقشہ کھنچ جاتا۔ خرگوش کنوئیں کی طرف اشارہ کر کے بولا:

"حضور وہ نابکار دشمن اسی کنویں میں ہے مجھے اس سے بڑا ڈر لگ رہا ہے سرکار مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھالیں۔

شیر نے اسے پیٹھ پر چڑھا لیا اور کنویں کے اندر جھانکا۔ پانی میں اپنی اور خرگوش کی صورت دیکھی سمجھا کہ وہی شیر ہے اور خرگوش جو جانوروں سے کھانے کے لیے بھیجا تھا پیٹھ پر لادے ہے۔ خرگوش کو جلدی سے اتار کر کنویں میں پھاند گیا۔ وہ تین غوطے کھائے اور خونخوار ظالم نفس کو دوزخ کے شعلوں کے سپرد کر دیا۔

خرگوش صحیح سلامت وہاں سے لوٹ کر آیا اور جانوروں سے پوری کیفیت اور حال بیان کیا۔ اب وہ سب خدا کا شکر بھیجا کرتے اور خوب سکھ چین سے رہتے تھے۔

جناب سعادت نظیر



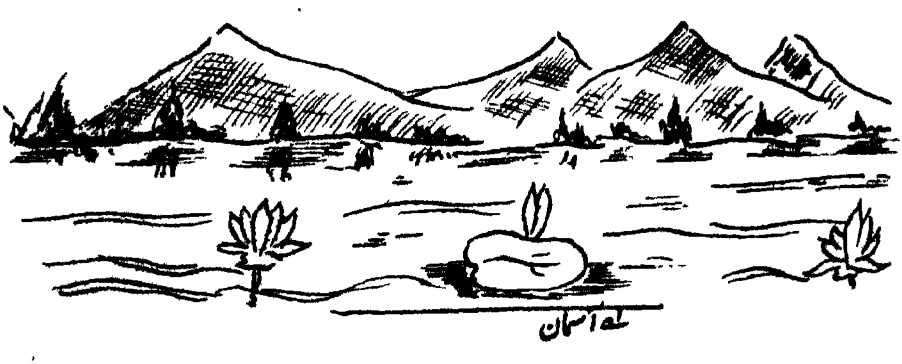
ہندوستانی لڑکوں کا گیت

ہم سے ہی پھولوں کی پھبن ہے   ہم سے ہی شاداب چمن ہے
ہم سے ہی آباد وطن ہے   اور زمیں تاروں کا گگن ہے
ہم کیا ہیں؟ تقدیر وطن کی
ہم سے ہے تعمیر وطن کی
کل کی عظمت، آج کی رفعت   بزم کی رونق، گھر کی زینت
صبح کا نور اور شام کی ظلمت   گلشن گلشن، جنت جنت
پھول کھلے ہیں فکر و نظر کے
سینچا ہے ہم نے خونِ جگر سے

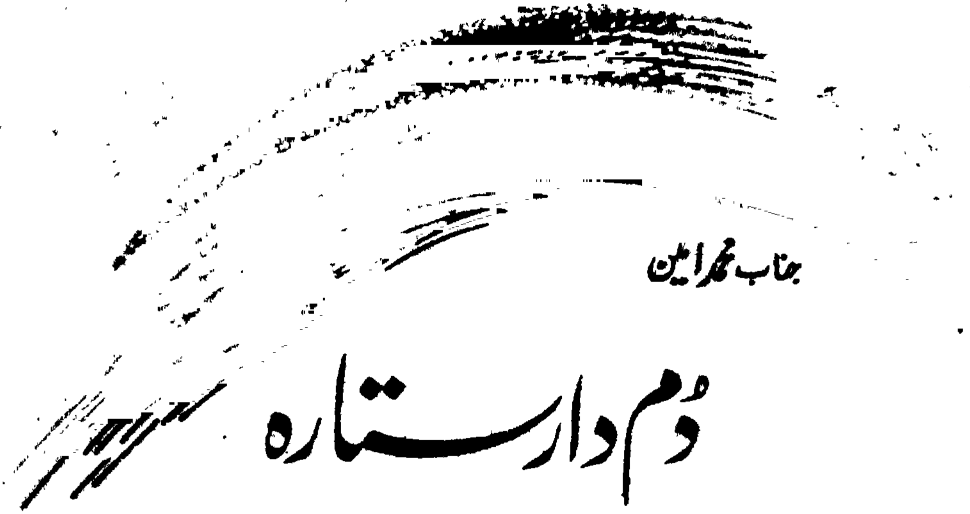
مسجد، مندر، دیر، کلیسا تاج محل، ایلورا، اجنتا
جنتر منتر، قطب منارا گاہے اندھیرا گاہے اُجالا
ہم سے ہے تاریخ وطن کی
رونق ہے ہر نقش کہن کی

کام کی دُھن ہے دل میں ہمارے ٹھنڈی فضائیں ہم ہیں شرارے
توڑ کے لائیں نبھ کے تارے روکیں طوفاں، موڑ دیں دھارے
ہو ہو کر بلوان بڑھیں گے
جنگ میں ہم پروان چڑھیں گے

لاکھ بلائیں راہ میں آئیں لاکھ تلاطم آنکھ دکھائیں
جھکڑ ہوں یا تند ہوائیں وہ بھی ہم سے منہ کی کھائیں
آندھی بن کر تیز چلیں گے
اور منزل پر جاکے رہیں گے



سلمہ احسان



جناب محمد امین

دُم دار ستارہ

"ایکے یا۔ سے کی" نام کا جو دُم دار ستارا ۲۱ر اور ۲۲ر اکتوبر کو دہلی اور ہندوستان میں صبح ۵ بجے آسمان میں شمال مشرق کی طرف نظر آیا تھا اس کے متعلق نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، روس اور جاپان میں ٹوکیو سے بھی خبر آئی تھی ان ملکوں میں بھی یہ دم دار ستارا دکھائی دیا تھا۔

اس کی روشنی بہت تیز تھی اور جاپانی ماہرین نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ یہ ستارا چاند سے بھی زیادہ روشن تھا اور نہایت تیزی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

یہ برابر سورج کے قریب آرہا تھا اس کی رفتار ایک سکنڈ میں ۲۵۰ میل تھی۔ دُم بھی اس کی بہت لمبی تھی اور آسمان میں یا کائنات میں ایک کروڑ میل تک پھیلی ہوئی تھی۔

مگر ۲۲ر اکتوبر کو جب وہ سورج کے قریب بڑھ رہا تھا تو ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا جاپانی ماہرین نے اسے صاف طور سے ٹوٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ وسطی جاپان میں کرونا نام کا مشاہدہ کرنے والا اسٹیشن ہے وہاں سے یہ صاف دکھائی دے رہا تھا اور مسلسل حرکت کرنے کے بعد جب اس کا

فاصلہ سورج سے ۰۰۰ ,۱۲ ,۳۰ میل رہ گیا تھا کہ عین اسی وقت وہ ٹوٹ کر پاش پاش ہو گیا۔

ٹوٹنے اور اس کے ذرات بکھرنے کے باوجود دم دار ستارے کا اصلی حصہ سورج کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا لیکن پھر مشاہدہ کرنے والے اسٹیشن سے وہ گم ہو گیا تھا۔ اس قدر دھندلا ہو گیا تھا کہ نظر نہیں آرہا تھا۔

بعد میں اس دم دار ستارے کے دو معلوم کرنے والے سائنس دانوں میں سے ایک سائنس داں مسٹر تسوتو موسے کی اور دو اور ستاروں کے ماہرین نے مغربی جاپان سے اطلاع دی کہ ٹوٹ جانے کے بعد ۲۵ منٹ تک وہ دم دار ستارا اور اس کی دم دکھائی دیتی رہی لیکن پھر وہ نظروں سے ایسا اوجھل ہوا کہ بالکل غائب ہو گیا۔

اس دم دار ستارے کا نام ایکے یا۔سے کی کیوں تھا؟ دراصل یہ نام دو جاپانی سائنس دانوں کے نام ہیں جنھوں نے کہ پہلے پہل اس کو دریافت کیا تھا۔ انھی کے نام سے یہ مشہور ہو گیا۔

آپ نے بھی اس دم دار ستارے کو دیکھا تھا یا نہیں؟ یہ بہت اچھا موقع تھا۔ اور آپ کم سے کم اگر اسے دیکھ لیتے تو نئے دم دار ستارے کو آپ خوب پہچان لیتے لیکن جاپان میں بعض بچے سوتے رہ گئے ہوں اور انھوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا ہو تو ظاہر ہے "اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت" آگے دوسرا موقع ۱۹۸۶ء میں ملے گا جب کہ ہیلے (مسٹر ہیلے نے اسے سب سے پہلے دریافت کیا تھا اور ان کے کہنے کے مطابق یہ پہلے پہل ۱۹۱۰ء میں دیکھا گیا تھا) نام کا دم دار ستارا دوبارہ دکھائی دے گا۔

عام طور پر لوگ دم دار ستارے کو منحوس سمجھتے ہیں اور جب کبھی وہ نمودار ہوتا ہے تو ان کے خیال میں دنیا میں کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً قحط پڑ جائے یا کوئی بہت بڑا آدمی مر جائے یا دو ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی پہلی تاریخ کو پاکستان نے کھل کر اور اعلانیہ ہمارے ملک کے ایک علاقے (چھمب اور جوڑیا کا علاقہ) پر حملہ کر کے فوجی کارروائی شروع کر دی تھی پھر ۶ ستمبر کو ہندوستان نے اس کے خلاف کارروائی کی اور ہماری فوجیں لاہور سیالکوٹ، اور پونچھ اور کئی دوسرے علاقوں میں پاکستان کے اندر گھس گئیں۔ اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان تین ہفتے تک متواتر جنگ بھی گھمسان کی جنگ ہوتی رہی۔

گویا ثابت ہو گیا کہ دم دار ستارا یقیناً منحوس ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف عام آدمی کا عقیدہ پختہ ہوتا ہے۔ بلکہ علم نجوم کے ماہر اور ستاروں کے علم کی پیشین گوئی کرنے والے بھی ہندوستان پاکستان کے تعلقات بگڑنے کا ذمے دار "ایکے یا۔سے کی" نام کے دم دار ستارے کو ٹھہراتے ہیں بلکہ کہتے یہ ہیں کہ آئندہ ابھی اور اس سے بھی خطرناک حادثے پیش آنے والے ہیں۔

سر دست جو حالات درپیش ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان کی پیشین گوئی غلط نہیں ہوگی۔ لیکن سائنس داں اس کو دوسری نظر سے دیکھتے ہیں اگرچہ ان کا کہنا بھی یہی ہے کہ دُم دار ستارا یقیناً خطرناک ہوتا ہے لیکن خطرناک ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا تعلق براہ راست انسان کی قسمت، روزمرہ کے واقعات اور حادثات سے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ دُم دار ستارے کا تعلق قدرتی حادثات اور زمین پر آنے والے تغیرات سے ہے۔ زمین کی آب و ہوا پر اس کا اثر یقیناً پڑتا ہے۔

دُم دار ستارے کیوں دکھائی دیتے ہیں۔؟ کہاں سے آتے ہیں؟ ان کی کیا خصوصیات ہیں ؟ زمین پر وہ کیا اثر ڈالتے ہیں ؟ یہ اور اسی طرح کے کئی سوال ذہن میں آتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ ان مسائل پر آپ نے کبھی غور کیا ؟

سائنس والوں کا زیادہ تر خیال ہے کہ دُم دار ستارے سورج کے ان بچے کھچے مادے سے بنے ہیں جس سے ہمارے سیارے یا زمین اور دوسرے سیارے وجود میں آئے تھے۔ دُم دار ستارے ایک دو نہیں ہیں ان گنت ہیں شاید لاکھوں کروڑوں ہیں اور زیادہ تر سورج کے چاروں طرف گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان کے مدار (گھومنے یا چکر لگانے کے راستے) اتنے لمبے ہیں کہ سب سے دور جو سیارا پلوٹو ہے اس سے بھی لمبے اور زیادہ فاصلے پر ہیں۔ لیکن ان میں بڑی عجیب بات یہ ہے کہ یہ شاید دکھائی نہیں دیتے۔ جب وہ سورج کے قریب آجاتے ہیں تبھی صاف طور سے دکھائی دیتے ہیں اور ان کی دُم بھی صاف نظر آتی ہے۔

بہرحال کچھ سو دُم دار ستارے ایسے ہیں جن کے مدار کم و بیش معلوم ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض کے چکر لگانے کے گھیرے اتنے لمبے ہیں کہ پلوٹو کے مدار سے بھی بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ جب بھی وہ اپنے راستے پر گردش کرتے ہوئے سورج

کے قریب آتے ہیں تو وہ یک بیک نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یا تو وہ ٹوٹ کر ختم ہو جاتے ہیں یا حرکت کرتے ہوئے اپنے راستے پر غائب ہو جاتے ہیں۔

کچھ دُم دار ستارے ایسے بھی ہیں جن کے مدار بیضاوی شکل کے ہیں اور باوجود کوشش کے سینکڑوں سال کے بعد کہیں جا کر وہ سورج کے قریب آپاتے ہیں۔ ہیلے نام کا دُم دار ستارا اسی قسم کا ایک ستارا تھا جو کہ ۱۹۱۰ء میں نظر آیا تھا اور اب ۱۹۸۶ء میں دوبارہ نظر آئے گا۔

دُم دار ستارے کا جو نیوکلیس یا مرکزی حصہ ہے برف کے ایسے مادوں سے بنا ہوتا ہے جیسے میتھین، امونیا، ہائڈرو کاربن اور پانی۔ ٹوٹنے والے تاروں کے اندر جو مادے ہوتے ہیں وہ بھی دُم دار تارے کی طرح برف کی تہوں میں گھسے رہتے ہیں۔ لوہا، جست، کلسیم، میگنیشیم اور سلی کن وغیرہ۔

جیسے جیسے دُم دار ستارا سورج کے قریب آتا ہے اس کے اندر کی برف پگھل کر بھاپ بن جاتی ہے اور اس کے انجرات اڑنے لگتے ہیں اور ان کے باریک ذرات ٹوٹنے والے تارے یا شہاب ثاقب کے ذرات کی طرح لمبائی میں دور تک پھیل جاتے ہیں۔

جب دُم دار ستارا بالکل سورج کے قریب پہنچ جاتا ہے تو اس کی دُم بھی بن جاتی ہے اور یہ دُم گیس اور باریک گرد کے ذرات کی ہوتی ہے لیکن عموماً یہ دُم سورج کی مخالف سمت میں یا دوسری طرف پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے شاید ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ سورج کے ریڈایشن یعنی شعاع ریزی کا جو دباؤ پڑتا ہے اس کی وجہ سے ذرات گھسٹ کر باہر نکل آتے ہیں اور چمک اٹھتے ہیں۔

جب کبھی کوئی دُم دار ستارا سورج کے قریب آتا ہے تو اس کا کچھ نہ کچھ مادہ بکھر کر ختم ہو جاتا ہے اور اس طرح بار بار ایسا ہونے سے آخر میں وہ دُم دار ستارا خود ہی پاش پاش، یا ختم ہو جاتا ہے۔ اگر دُم دار ستارا سورج کے بہت قریب آجائے تو وہ آناً فاناً بھی ختم ہو سکتا ہے۔

بہر حال ایک دُم دار ستارا ٹوٹتا ہے یا پاش پاش ہو جاتا ہے تو اس کے باریک ذرات ادھر اُدھر شہاب ثاقب یا ٹوٹنے والے تاروں کی شکل میں گرنے لگتے ہیں۔ دُم دار ستارے پر ہی اس لیے کہ وہ ٹوٹتے ہیں اور جب بھی وہ ٹوٹتے ہیں

تو سیاروں کے مابین جو ذرات پھیلے ہوئے ہیں اُن میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے بہت سے ذرات سورج کے دائرہ کشش میں آکر سورج کی طرف کھنچ کر چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سورج کی شدید گرمی کی وجہ سے وہ جل کر خاکستر بن جاتے ہیں اور سورج کے اوپر گر پڑتے ہیں۔ اس طرح ہماری زمین اور دوسرے سیاروں کے کرۂ ہوائی پر زیادہ اثر نہیں پڑتا۔

اگر دُم دار تارا سائز میں بہت بڑا ہو اور وہ ٹوٹ جائے تو اس طرح شہاب ثاقب یا میٹیار (ٹوٹنے والے تارے) کے ذخیرے میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور شہاب ثاقب یا میٹیار کے گرنے کی رفتار زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ میٹیار کے زیادہ ٹوٹ کر گرنے سے کرۂ ہوائی میں ذرات کا تناسب بڑھ جائے گا۔ فضا میں جو نمی رہتی ہے اس طرح اس کے پانی کے قطرے زیادہ بڑے بنیں گے اور وہ زیادہ تیزی کے ساتھ بارش بن بن کر گرنے لگیں گے۔ بارش تیز اور زیادہ ہونے سے کرۂ ہوائی میں نمی کا تناسب گھٹ جائے گا اور پھر زمین سے جو گرمی خارج ہوتی ہے اس کو کرۂ ہوائی کا غلاف روک نہیں سکے گا۔ پھر زمین کی آب و ہوا بدلنے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ درجہ حرارت گرنا شروع ہو جائے گا اور ہمارا ماحول خطرناک حد تک سرد ہو جائے گا۔ زمین پر ایک دم برف کا دور آجائے گا اور انسان کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

آج کل آب و ہوا کے متعلق جو تجربے اور مطالعے کیے جا رہے ہیں ان کی بنا پر یہ قرین قیاس ہے کہ آئندہ ۵۰۰۰ سال کے اندر کسی وقت بھی برف کا دور آسکتا ہے۔ لیکن یہ بات ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ایکے یا۔سے کی نام کا جو دُم دار تارا ۲۱ اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو نظر آیا تھا وہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ اس کے ٹوٹنے سے بہت بڑی تبدیلی کا امکان ہو۔

بعض سائنس داں یہ کہتے ہیں کہ دُم دار تارے اور برف کے دَور دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زمین کی تاریخ میں جب کبھی برف کا دور آیا ہے اس کے آنے کی وجہ سے دُم دار تارے کے ٹوٹنے اور میٹیار کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ بار بار دُم دار تارے ٹوٹنے سے سیاروں کے مابین ذرات کی تعداد بڑھ جاتی ہے اور پھر بارش زیادہ ہونے لگتی ہے، کرۂ ہوائی پتلا یا اس کی تہہ پتلی ہو جاتی ہے اور زمین کی گرمی رک سکتی نہیں

پانی بلکہ بھک سے اڑ جاتی ہے۔ ماحول ٹھنڈا ہو
ہوجاتا ہے اور برفیلا دور آجاتا ہے۔ پہلے اسی
طرح کئی بار ہوچکا ہے۔

اندازہ یہ ہے کہ اس طرح پچھلے دس لاکھ
سالوں کے درمیان زمین کے منطقۂ معتدل
شمالی میں چار بار گلیشیر کا دور دورہ رہ چکا ہے
اور پچھلا دور جو ختم ہوا ہے اس کو گزرے ہوئے
ابھی بمشکل دس ہزار سال ہوئے ہیں۔

لیکن آب و ہوا کی تبدیلی کا ایک معما
ایسا ہے جس کا کوئی حل نہیں ہے۔ وہ یہ کہ پچھلے
دس لاکھ سال سے پہلے زمین پر جو دس کروڑ سال
کا زمانہ گزرا ہے وہ آج کل کے زمانے کے لحاظ
سے بہت گرم تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی طے ہے
کہ ان دس کروڑ سالوں میں کوئی برفیلا دور کبھی
نہیں آیا تھا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا اس زمانے
میں دُم دار ستارے نہیں تھے؟ یا یہ کہ وہ ٹوٹتے
نہیں تھے، پاش پاش نہیں ہوتے تھے؟ ان سے
شہاب ثاقب یا ٹوٹنے والے تاروں کی دھار
نہیں نکلتی تھی؟ آخر اس کا جواب کیا ہوسکتا ہے؟
یہی کہا جاسکتا ہے کہ پچھلے دس لاکھ سالوں میں
جو برف کے دور بار بار آئے ہیں اس کا جواب
ہمیں کہیں اور ڈھونڈھنا چاہیے لیکن یہ ایک
الگ سوال ہے اور آئندہ پھر کبھی کسی موقعے پر
اس پر بحث کی جائے گی۔

جناب اشعر رام نگری



تتلی رانی





تتلی رانی ، تتلی رانی !

رنگ برنگی چھینٹ کی چادر اوڑھے ہوئے تو کیوں آتی ہے ؟
قدم قدم پر گرتی پڑتی اور تھرکتی کیوں آتی ہے ؟
ہم سے اتنا کیوں ڈرتی ہے ، کیوں ہم سے یوں گھبراتی ہے ؟
کون سی ہے تجھ کو حیرانی ؟
تتلی رانی ، تتلی رانی !

میرا چھوٹا سا باغیچہ جس میں میں نے پھول اُگائے
گیندے اور گلاب کے پودے جس میں کھڑے ہیں سر کو اُٹھائے
ان پھولوں کا میٹھا رس تو چپکے چپکے روز چُرائے
تیری چوری ہم نے جانی
تتلی رانی، تتلی رانی!

تو ہے دولھن نئی نویلی سُندر دلکش اور سجیلی
بھولی بھالی تیری ادائیں اور نظر تیری شرمیلی
تیرے بدن کی ریشمی ساڑی لال گلابی نیلی پیلی
فیروزی نارنجی دھانی
تتلی رانی، تتلی رانی!

تتلی تجھ سے پیار ہے مجھ کو، تو مجھ سے کترایا مت کر
جب مجھ سے اتنا ڈرتی ہے، میرے باغ میں آیا مت کر
آئے بھی تو میرے پھولوں کا رس روز چُرایا مت کر
اپنی عادت چھوڑ پُرانی
تتلی رانی، تتلی رانی!

جناب اظہر افسر



مُنّے کا سنترہ

مُنّا : (ایک بھولا سا لڑکا)
کمّو : (مُنّے کی بڑی بہن جو صرف دو سال بڑی ہے)
بھیّا : (مُنّے اور کمّو کا بڑا بھائی)
چچی جان :
ممانی جان :
ماموں جان :

(ایک چھوٹا سا خوب صورت کمرہ۔ کمّو "پیام تعلیم" پڑھ رہی ہے۔ کمّو کی کرسی سے کچھ دور تخت پر مُنّا لیٹا کچھ گنگنا رہا ہے۔ اچانک مُنّا اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے)

مُنّا : کمّو۔
کمّو : ہوں۔
مُنّا : کمّو بہن۔
کمّو : کیا ہے؟
مُنّا : بھئی ادھر دیکھو نا کیا پڑھ رہی ہو؟
کمّو : اب پڑھوں بھی نہیں تمھارے لیے، اپنا پیارا رسالہ 'پیام تعلیم' پڑھ رہی ہوں۔ بولو کیا ہے۔؟
مُنّا : وہ سنترہ تھا نا جو ابّا نے دیا تھا۔ ایک تمھیں ایک مجھے۔
کمّو : ہاں۔
مُنّا : وہ گم ہو گیا۔ جانے کہاں رکھ دیا میں نے

یاد ہی نہیں آتا۔ تم نے دیکھا ہے؟

کمّو: میں کیوں دیکھتی، اپنا سنترہ میں نے الماری میں رکھا ہے۔ تم نے اپنا سنترہ کہاں پھینکا آخر؟

مُنّا: یہی تو یاد نہیں آتا۔ ذرا تم ڈھونڈ دونا۔

کمّو: واہ، میں کیسے ڈھونڈوں۔ جانے کدھر کدھر اپنی چیزیں پھینکتے پھرتے ہو۔ تم بہت خراب ہوگئے ہو۔ اچھا بتاؤ جب سے تم تھے کہاں۔

مُنّا: کہیں بھی نہیں۔

کمّو: کہیں بھی نہیں گیا، جب سے ابّا نے سنترہ دیا ہے لیے لیے پھر رہے ہو اب تک تم تھے کہاں۔ اس کمرے میں تو ابھی آئے ہو۔

مُنّا: بھیّا کے پاس گیا تھا پھر وہاں سے چچی جان کے ہاں چلا گیا تھا۔

کمّو: (منہ بناتے ہوئے) چچی جان کے ہاں چلا گیا تھا۔

مُنّا: چچی جان نے کہا ذرا یہ اون اپنی ممانی جان کو دے دینا۔ ممانی جان کا گھر اپنے گھر سے ملا ہوا ہے ہی میں نے اون لیا اور انھیں دے دیا۔

کمّو: پھر؟

مُنّا: پھر کمّو (سوچتا ہے) اون پھر کمّو میں ماموں جان سے ملنے گیا تھا ان کے کمرے میں۔

کمّو: کیا مصیبت ہے بھئی۔ آؤ پہلے بھیّا سے پوچھیں۔

(کمّو پرچہ رکھ دیتی ہے اور مُنّے کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

* * *

(بھیّا کے پاس۔ بھیّا ٹانگیں پھیلائے کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہے ہیں۔)

کمّو: بھیّا۔

بھیّا: ہوں۔

کمّو: بھیّا۔ ابّا نے مُنّے کو جو سنترہ دیا تھا جانے اس نے وہ سنترہ کہاں رکھ دیا۔

(مُنّا ہونٹ لٹکا کر رونے لگتا ہے)

بھیّا: ارے ارے مُنّے تم تو رونے لگے۔ واہ اتنی سی بات پر کوئی روتا ہے بھلا۔ کمّو میز پر سے دو کیلے مُنّے کو دے دو۔ رو نہیں لو۔

کمّو: (میز پر سے دو کیلے اٹھا کر مُنّے کو دیتی ہے) اب تو خوش ہوگئے مُنّے۔ چلو۔

* * *

مُنّا : کمّو۔

کمّو : ہوں۔

مُنّا : کمّو بہن آؤ سنترہ چچی جان کے ہاں دیکھ لیں شاید وہاں ہو۔

کمّو : چلو۔

* * *

(چچی جان کے پاس۔ چچی جان اپنے بلاؤز پر استری کر رہی ہیں۔)

چچی جان : (کمّو اور مُنّے کو دیکھ کر) اوہ مُنّا، کمّو۔ آؤ آؤ۔

کمّو : چچی جان منّا یہاں سنترہ تو نہیں لایا۔

چچی جان : نہیں تو کیسا سنترہ۔ ہاں ابھی کچھ دیر ہوئی مُنّا میرے پاس آیا تھا۔

کمّو : اس نے اپنا سنترہ کہیں کھو دیا ہے اب رو رہا ہے۔

مُنّا : (رونے لگتا ہے)

چچی جان : ارے ارے رو نہیں بھئی رو نہیں۔ آئیں اپنے منے کو انگور دوں۔ لے بیٹا میرا منّا بڑا اچھا۔

کمّو : اچھا چچی جان اب جاتے ہیں۔ رات کو آؤں گی میں کہانی سننے۔

چچی جان : ہاں ہاں آجانا۔

مُنّا : کمّو وہ پہیلی سنترہ ہی کی ہے نا۔ ایک قلعہ میں نو دس پریاں۔ جب دیکھو تب ہیں رس بھریاں

کمّو : ہاں اس کا جواب سنترہ ہی ہے۔

مُنّا : کمّو بہن شاید میں اپنا سنترہ ممانی جان کے ہاں بھول آیا ہوں۔ چلو ممانی جان کے ہاں دیکھیں۔

کمّو : چلو۔

* * *

(ممانی جان کے پاس ___ ممانی جان بیٹھی سویٹر بن رہی ہیں۔)

ممانی جان : (مُنّے کو دیکھ کر) ارے یہ مُنّا کیوں سسکیاں لے رہا ہے۔ ہیں مُنّے کیا بات ہے؟

کمّو : ممانی جان۔ ابّا نے صبح ہمیں ایک ایک سنترہ دیا تھا۔ مُنّے نے اپنا سنترہ کہیں کھو دیا ہے۔

ممانی جان : ارے ارے رو نہیں ایک سنترہ کے لیے کوئی اتنا روتا ہے۔ لو بیٹیا کمّو یہ انار تو دے دو مُنّے کو (میز سے ایک انار اٹھا کر دیتی ہیں) لو مُنّے ایک سنترہ تم کہیں بھول

آئے تو کیا ہوا اہا نا رے لو۔ اور ہاں بیٹے
ذرا اپنے ماموں جان کو تو باہر بیٹھک
سے اندر بھیج دینا۔

کمو: اچھا ممانی جان۔

* * *

(ماموں جان کے پاس۔ ماموں جان چشمہ
لگائے اخبار پڑھ رہے ہیں۔)

کمو: ماموں جان۔ ممانی جان آپ کو بلا رہی ہیں۔

ماموں جان: کہہ دو ابھی آتے ہیں۔ ارے مگر
یہ منّا کیوں منہ پھلائے کھڑا ہے۔ ایں ایں
بھئی تم تو رونے لگے۔

کمو: کہیں اپنا سنترہ بھول آیا ہے ماموں جان
اور اب رو رہا ہے۔

ماموں جان: واہ بھئی ایک سنترہ کے لیے — لو
ہم تمھیں مٹھائی دیتے ہیں (اخبار رکھ کر پاس
رکھے ہوئے ڈبے میں سے دو لڈو منّے کو
دیتے ہیں) لو کمو تم بھی لو۔ جاؤ مزا کرو۔
اب تو نہیں رو گے نا منّے۔ ایں بولو؟

منّا: جی نہیں (سسکیاں لیتا ہے)

* * *

(وہی کمرہ جس میں پہلے منّا اور کمو بیٹھے تھے۔
کمو اپنا پرچہ سنبھال لیتی ہے۔)

کمو: اب تو خوش ہو گئے ایک سنترہ کے بدلے
کیلے، انگور، انار اور لڈو سب کچھ مل گیا۔

منّا: (انگور دیتا ہے) لو تم بھی کھاؤ تم نے بھی
بہت محنت کی ہے۔

کمو: (انگور کھاتے ہوئے) کچھ یاد آیا۔ آخر
کیا ہوا سنترہ تمھارا۔

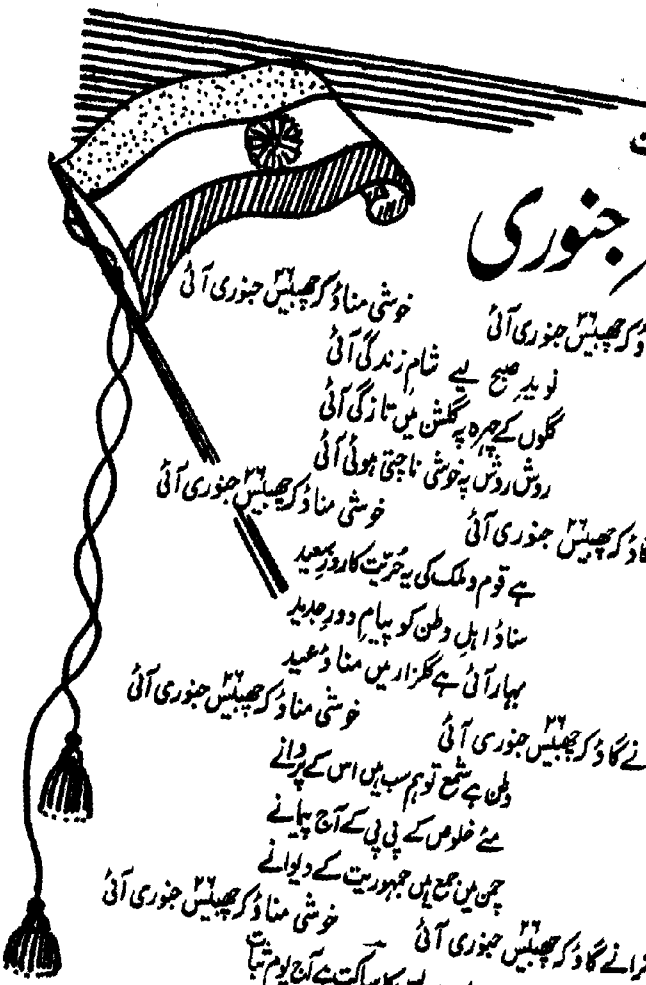
منّا: ارے کمو۔ میں تو بالکل بھول گیا تھا
۔ وہ سنترہ تو —

کمو: ہاں ہاں وہ سنترہ؟

منّا: وہ سنترہ ملا کہاں وہ تو میں نے...
وہ تو تم نے؟
وہ تو میں نے کھا لیا تھا۔ بالکل یاد
نہیں رہا سچ — توبہ ہے اب یاد
آیا۔

(کمو قہقہے لگا رہی ہے)

(پردہ گرجاتا ہے)



جناب محمد عبدالحفیظ ساکت

۲۶ جنوری

خوشی مناؤ کہ چھبیس جنوری آئی
ترانے گاؤ کہ چھبیس جنوری آئی

نوید صبح ہے شام زندگی آئی
گلوں کے چہرہ پہ گلشن میں تازگی آئی
روش روش پہ خوشی ناچتی ہوئی آئی
خوشی مناؤ کہ چھبیس جنوری آئی
ترانے گاؤ کہ چھبیس جنوری آئی

ہے قوم و ملک کی یہ حرّیت کا روزِ سعید
سناؤ اہلِ وطن کو پیام دورِ جدید
بہار آئی ہے گلزار میں مناؤ عید
خوشی مناؤ کہ چھبیس جنوری آئی
ترانے گاؤ کہ چھبیس جنوری آئی

وطن ہے شمع تو ہم سب ہیں اس کے پروانے
مئے خلوص کے پی پی کے آج پیمانے
چمن میں جمع ہیں جمہوریت کے دیوانے
خوشی مناؤ کہ چھبیس جنوری آئی
ترانے گاؤ کہ چھبیس جنوری آئی

ہمارے دیس کا ساکت ہے آج یوم ثبات
زمیں پہ ہونے لگی رنگ و نور کی برسات
ملی ہے جہدِ مسلسل کی قوم کو سوغات
خوشی مناؤ کہ چھبیس جنوری آئی
ترانے گاؤ کہ چھبیس جنوری آئی

صالحہ عابد حسین

پنڈت نہرو اور بچّے



ہمارے محبوب رہنما جواہر لال جی کو بچوں سے جو گہرا سچا پیار تھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بچہ خواہ وہ غریب کا ہو کہ امیر کا، خوب صورت ہو یا بدصورت، صاف ستھرا ہو کہ گندا میلا، تندرست اور چونچال ہو یا بیمار و کمزور، بہترین لباسوں میں سجا بنا کر سامنے لایا جائے یا ننگ دھڑنگ لتھڑے منہ، بہتی ناک سامنے پڑ جائے، اس کو دیکھ کر ان کے دل کے سرچشمے سے محبت کے سوتے پھوٹ اُٹھتے تھے اور اس پر محبت و عنایت کی برکھا شروع کر دیتے۔ آج ہمارے وسیع ہندوستان میں لاکھوں سے زیادہ بچے تو ایسے ہیں (وہ بھی جوان ہو چکے ہیں) جو ذاتی طور پر جواہر لال نہرو کی محبت کے اتھاہ میٹھے ساغر سے امرت کے چند گھونٹ پی چکے ہیں۔ کروڑوں وہ بچّے ہیں جن کو صرف دور سے اپنے پیارے چاچا نہرو کے درشن کرنے کا موقع ملا تھا اور ایسے بھی جو صرف ان کو نام سے جانتے ہیں اور یہ سب جانتے ہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو کتنا چاہتے تھے۔ اور اپنے چاہنے والے کی بد

سچی محبت سے محروم ہوکر یہ کروڑوں بچے ان کی یاد میں عقیدت اور محبت کے موتی نچھاور کرتے رہتے ہیں۔

جواہر لال جی کی بچوں سے محبت کے بے گنت واقعات ہیں جو سبھی لوگ اپنے اپنے انداز میں سناتے رہتے ہیں۔ میری آنکھوں میں بھی اس وقت ایسے کئی دلکش منظر پھر رہے ہیں جن میں سے دو تین آپ کو سنانا چاہتی ہوں۔

۱۹۴۷ء کا ذکر ہے جب میں نے پہلی بار سری نگر میں کشتیوں کے شاندار، رنگ برنگے دلکش جلوس میں دور سے پنڈت جی کا درشن کیا۔ ہندوستان کے بہت بڑے رہنما اور آزادی کے علمبردار اور بہت اچھے ادیب کی حیثیت سے میرے دل میں ان کا بڑا احترام تھا لیکن بچوں سے انھیں کتنا پیار ہے یہ نہ جانتی تھی۔ تین چار دن بعد میرے ایک عزیز کے ہاں ان کی دعوت ہوئی۔ کشمیر اور ہندوستان کے کئی اکابرین مدعو تھے۔ ہم خواتین اس وقت پردے میں تھیں اور چقوں کے پیچھے سے اس دعوت کو دیکھ رہی تھیں۔ البتہ میزبان کی تین چھوٹی چھوٹی بچیاں میزبانی کے فرائض انجام دے رہی تھیں اور سبھی مہمان ان سے دلچسپی لے رہے تھے۔ دعوت ختم ہوئی مہمان روانہ ہونے لگے۔ پنڈت نہرو بھی سب سے مل ملاکر بچیوں کو پیار کرکے موٹر میں بیٹھ گئے۔ اچانک میزبان کی تین سالہ بچی لپک کر موٹر کے دروازے کے سامنے آئی اور اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں شکایت کی...

"پنڈت جی آپ نے میری بہنوں کو پیار کیا، مجھے نہیں" بات پوری ہونے سے پہلے پنڈت جی موٹر کے باہر تھے اور بچی ان کی گود میں تھی جسے وہ بھینچ بھینچ کر پیار کر رہے تھے۔ ان جانے میں ایک بچی سے جو لاپرواہی ہو گئی تھی وہ اس کی دل کھول کر تلافی کرتے رہے۔ ان کی گود میں بچی کا ہنستا معصوم چہرہ یوں لگ رہا تھا جیسے بدر کامل کے قریب زہرہ دمک رہا ہو۔ بچوں سے ان کی محبت کا یہ پہلا نقش میرے دل پر پڑا تھا جو روز بروز گہرا ہی ہوتا گیا۔ زمانہ گزرتا رہا— ہندوستان آزاد ہوا۔ پنڈت جی وزیراعظم بنے۔ مصروفیتیں دس گنا بڑھ گئیں مگر بچوں سے محبت اور دلچسپی گھٹنے کی جگہ اور بڑھتی گئی اب ان کی یہ محبت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی سارے دیس بلکہ دنیا میں مشہور ہو چکی تھی۔ وہ دنیا میں جہاں کہیں جاتے وہاں کے بچے اپنے بڑوں سے بھی زیادہ گرم جوشی، خلوص اور مسرت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرتے تھے۔ اور ان کے اپنے دیس کے

ہر بچے کے دل کی تو یہ سب سے بڑی تمنا ہوتی تھی کہ وہ ایک بار اپنے چاچا کو دیکھ لے۔

میرے ایک عزیز نے ایک فلم منا بنائی جس میں ننھے رومی نے بہت عمدہ کام کیا تھا۔ اس کی خواہش کے مطابق اسے انعام ملا۔ نہرو چاچا سے ملاقات بمبئی سے دہلی آکر، جواہر لال جی سے مل کر ان کے ساتھ تصویریں کھنچوا کر وہ اتنا خوش، اتنا نازاں تھا کہ وہ ساری شہرت اور تعریف جو اس فلم کی بدولت اسے حاصل ہوئی تھی۔ اس کے آگے گرد تھی۔ آج بھی رومی کی پنڈت نہرو اور اندرا جی کے ساتھ لی گئی تصویر میرے کمرے میں لگی ہے۔ اس میں ننھے بھتیجے کے ساتھ کھڑے نہرو چاچا کے چہرے پر نرمی، پیار، ناز کی ایک ایسی کیفیت ہے جو بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک اور سین میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ ایک شادی کا ہنگامہ برپا ہے۔ پنڈت جی دولھا دلہن کو آشیرواد دینے آنے والے ہیں۔ بچوں کی فوج جوش مسرت سے بے قرار ہے کہ چاچا نہرو کو دیکھے گی مگر ڈر رہے ہیں کہ بزرگ ان کو پس منظر میں نہ ڈال دیں کہ ایک لڑکی کہتی ہے "دیکھو جلدی سے لائن بناؤ۔ چاچا نہرو آنے والے ہیں"۔ اور دم بھر میں جھم جھماتے کپڑوں اور زیوروں میں جگمگاتی بچیاں اور چھوٹے چھوٹے بچے قطار باندھے کھڑے تھے۔ جب پنڈت جی موٹر سے اترے تو یہ خود ساختہ استقبالیہ کمیٹی ہنس کر، شرما کر، تالی بجا کر، نعرے لگا کر ان کا استقبال کر رہی ہے۔ پنڈت جی کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا ہے۔ کسی کو پیار کر رہے ہیں، کسی کو چھیڑ رہے ہیں، کسی کو گود میں اٹھا لیا ایک بچے کے ٹوٹے دانتوں پر فقرہ کس رہے ہیں "یہ پھاٹک کس کے لیے بنوایا ہے "ذرا دیر کے لیے وہ دولھا دلہن، میزبان اور مہمانوں سب کو بھول کر ان ننھے منوں کی محبت میں بالکل کھو گئے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے انھیں شروع ہی سے گہرا لگاؤ تھا اور اس کے بچوں سے ملنے کا جب موقع ملتا تشریف لایا کرتے تھے۔ آزادی کے بعد اس ادارے میں بچوں کا ایک تعلیمی میلہ شروع کیا گیا تھا۔ کوئی نو دس سال پہلے کی بات ہے ایک بار بچے خود ہی جا کر پنڈت نہرو کو بلاوا دے آئے "کہ آیئے اور میلہ ہمارا دیکھیے"۔ جھٹ وعدہ کر لیا تعلیمی میلے کا یہ زمانہ یوں بھی اس چھوٹی سی بستی میں بڑی چہل پہل، رنگا رنگی، گہما گہمی کا ہوتا ہے اور پنڈت نہرو کے آنے کی خبر نے تو بچوں، بڑوں، کارکنوں، مہمانوں میزبانوں سب میں ایک نئی روح پھونک دی۔

پنڈت جی وقت سے کچھ پہلے ہی چلے آئے یوں بھی ایک جگہ بہت سے بچوں کو دیکھ کر وہ خوش ہوتے تھے اور یہ تو گویا بچوں کی دنیا ہی تھی۔ میزبانی کے سارے فرائض بچوں کے سپرد تھے۔ اس دن میری طرح جانے کتنے اور لوگ تھے جو رشک سے اپنے بچوں کو دیکھ رہے تھے کہ کاش ان کی جگہ آج ہم بچے ہوتے میری آنکھوں میں وہ منظر اس وقت بھی گھوم رہا ہے کہ ایک بچی اور ایک بچے نے دونوں طرف سے ان کے دونوں ہاتھ تھام رکھے ہیں اور سینکڑوں بچے ان کے چاروں طرف ساتھ ساتھ جامعہ کی ہر ہر عمارت ہر ہر برآمدے، باغ، پارک میں انھیں گھما رہے ہیں۔ یہ نمائش ہے۔ یہ بچوں کی بنائی تصویریں، یہ بینک، یہ ہسٹری کلب، یہ نرد، یہ پنڈال وہ ہر ہر چیز کو شوق، توجہ اور مسرت کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ سوال کر رہے ہیں، سوال پوچھ رہے ہیں۔ فقرے کس رہے ہیں۔ اُن کے حسین چہرے پر اس وقت وہی بچوں کی سی معصومیت اور مسرت ہے جو ان کے سب ننھے منے ساتھیوں کے چہرے پر ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے تاروں کے جھرمٹ میں بدرِ کامل اپنی آب و تاب بکھیر رہا ہو یا ننھی ننھی نیم شگفتہ کلیوں کے درمیان ایک پورا کھلا گلاب لہلہا رہا ہو۔

مگر آخر جواہر لال جی کو بچوں سے اتنی اُلفت کیوں تھی؟ کیا یہ صرف بچوں کے دل رکھنے کی باتیں تھیں؟ یا محض جذباتی محبت تھی؟ یا اس سے گہری کوئی بات تھی جس کی وجہ سے وہ بچوں کو اتنا چاہتے تھے اُن کی اتنی فکر تھی؟

شاعرِ اعظم ٹیگور نے ایک جگہ لکھا ہے "ہر نیا بچہ جو دنیا میں آتا ہے یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا" اس گہری سچائی کو جس طرح ہمارے محبوب رہنما نہرو نے سمجھا اور اس کے لیے عملی قدم اٹھایا وہ دنیا کی تاریخ میں بھی اپنی مثال آپ ہی ہے۔

جواہر لال نہرو نے غلام ہندوستان میں آنکھ کھولی تھی، جو جاہل تھا غریب تھا، رسم و رواج کی قیدوں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہاں ذہنوں پر جالے دماغوں پر زنگ، دلوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہوش سنبھالا تو اپنے محبوب رہبر مہاتما گاندھی کی رہنمائی اور اپنے ان بے مثال دوستوں کے ساتھ جن کو قدرت نے اسی غلام ہندوستان میں غیر معمولی ذہانت، قابلیت، قوتِ عمل، ایثار اور جذبۂ آزادی کی دولت بخش کر بھیجا تھا، اپنے دیس کو آزاد کرانے

کی تحریک چلائی۔ کروڑوں عوام کو ساتھ لیا اور بدیسی راج کو ختم کرنے اور دیس کی دوسری کمزوریوں اور خرابیوں کو دور کرنے کی اَن تھک جد وجہد میں لگ گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں ان کا یہ خواب پورا ہوا۔ ہندوستان آزاد ہوگیا۔ سارے دیس پر ترنگا لہلہا اٹھا اور اس آزاد دیس کی باگ ڈور سونپی گئی جواہر لال نہرو کو!

مگر جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، جواہر لال نہرو صرف ظاہری آزادی نہیں چاہتے تھے جس میں حکومت بدیسیوں کے ہاتھ سے نکل کر دیسی حاکموں کے ہاتھ میں آجائے۔ وہ دلوں کو بدلنے، دماغوں کو بنانے، نئے ذہنوں کی تعمیر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اب ان کا خواب ایک ایسے دیس کا خواب تھا جو دنیا کے سامنے امن وسلامتی کا پیامبر۔ یک جہتی اور وسعتِ نظر کا نمونہ بن کر آسکے، جو صرف اپنے ہی دیس میں نہیں ساری دنیا میں آزادی سلامتی، امن ومحبت کی روشنی پھیلا سکے۔

لیکن نہرو جی جانتے تھے کہ صدیوں کی غلامی اور محکومی کے زہریلے اثرات پُرانے خون سے پوری طرح خارج کرنا ممکن نہیں۔ لیکن ان کا عقیدہ کہ نئی نسلیں جنھوں نے آزاد ہندوستان میں آنکھ کھولی ہے یعنی آزاد بھارت کے آزاد بچے، اس بارِ گراں کو اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے بچّوں کی طرف خاص توجہ دی۔ ہمارے بچّے جو دُہری تہری محکومی کی بیڑیاں پہنے رہتے تھے۔ بچّے جو حکومت کی، بزرگوں کی اور استادوں کی سختی، حکومت اور جبر کا شکار رہتے تھے۔ اُن جانے ہی یں جن کی بھلائی چاہنے والے ان کی جسمانی اور ذہنی باڑھ مار دیتے تھے ان کے لیے جد وجہد کی گئی کہ وہ آزاد فضا میں پلیں۔ ان کے ذہن اور دماغ کے دریچے کھُلے رکھ کر دل کو تنگ نظری اور تعصب سے پاک کرکے ایک عظیم دیس کے سچّے سپوت بناسکیں۔ اور ان سب کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے دیس میں بچّوں کی طرف خاص توجہ دی جانے لگی۔ یہاں تک کہ جواہر لال کا یوم پیدایش ہندوستان اور دوسرے دیسوں میں بچّوں کے دن کے نام سے موسوم ہوگیا۔ اس مبارک دن دیس کے کونے کونے میں بچوں کی تفریح بھلائی اور ترقی کے کام انجام دیئے جاتے ہیں۔ اس دن ان کے لیے نئے نئے اسکول، پارک، بال واڑیاں، نرسری اسکول بنائے جاتے ہیں۔ اُن کے میلے ہوتے ہیں جلسے ہوتے ہیں۔ دلّی اور دلّی کے آس پاس کے

ہزاروں بچے اپنے نہرو چاچا سے ملنے کے لیے جمع ہوتے تھے اور اس دن تو نہرو جی بچوں میں مل کر بالکل بچہ ہی بن جاتے تھے۔ ان کے ہر کھیل، ہر پروگرام میں حصّہ لیتے، کبوتر اڑاتے، ان کو ہار پہناتے، ان کے ساتھ تالیاں بجاتے، دوڑتے بھاگتے اور بچّے اپنے سے اس ذرا بڑے بچّے کے ساتھ اسی اپنایت اور مسرت کے ساتھ کھیلتے تھے جیسے وہ ان کا ہم جولی ہی تو ہے۔

لیکن آہ ان کے پیارے چاچا نہرو کا ہنستا ہوا چہرہ ان بچّوں کے دلوں میں مسرت کے پھول کھلانے کے لیے سامنے نہیں۔ ہم اور ہمارے بچّے .... اپنے محبوب نہرو کی سالگرہ منائیں گے اور ہمیشہ مناتے رہیں گے اس لیے کہ نہرو مرے نہیں امر ہو گئے ہیں مگر کیا صرف ان کو یاد کرنا، ان کی سالگرہ منانا کافی ہے۔ ان کی تعریف کرکے ہی ہم اپنے فرض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں؟ نہیں۔ ان سب سے کہیں زیادہ بڑی کہیں اہم بات یہ ہے کہ جواہر لال نہرو کے دیس کے ہر بچّے کے دل میں ان بے مثال صفات کا پرتو پیدا کیا جائے جو نہرو کی شخصیت کا جزو بن گئی تھیں۔ دیس کی محبت، قومی یک جہتی کا احساس، آزادی کا سچا جذبہ، امن عالم کی جد و جہد کی لگن، انسانیت پر عقیدہ اور ساری دنیا کی برادری کا احساس جو نہرو کے دل میں جلوہ فگن تھا ہمارے دیس کے ہر ہر بچے تک کے دل میں اس کی روشنی پہنچے اور وہ نہرو کا سپاہی بن کر، نہرو کا پیام بر بن کر اپنے دیس کی، قوم کی، انسانیت کی خدمت کا مقدس فرض انجام دینا اپنی زندگی کا مقصد بنا لے وہ فرض جس کو ہمارے پیارے نہرو آخری دم تک انجام دیتے رہے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)



جناب احسن رضوی داناپوری

بھیڑ

میں تو ناواقف سی ہوں طبعِ زمانہ ساز سے
بے خبر دنیا کے ہر بدلے ہوئے انداز سے

سادگی جب بڑھ گئی حد سے حماقت ہو گئی
میں تو خود اپنے لیے جیسے مصیبت ہو گئی

رسم کیا دنیا کی ہے کوئی خبر مجھ کو نہیں
سرد و گرمِ زندگی کا کچھ اثر مجھ کو نہیں

وہ مری خالہ کی بیٹی جس کا بکری نام ہے
ایک دن کہتی تھی مجھ سے "عقل تیری خام ہے"

ہوں تو میں ہم شکل اس کی عقل اس جیسی نہیں
وہ خوشامد جانتی ہے مجھ میں یہ گُن بھی نہیں

اُون کمبل والوں کے ہاتھوں صفایا ہو گئی
رہ گئی چکتی[1] تو وہ بھی گھی کا ڈبا ہو گئی

بھیڑ میرا نام ہے اور بے وقوفی کام ہے
چال تک میری نگوڑی ہر طرف بدنام ہے

[1] چکتی والی بھیڑ کو دنبہ کہتے ہیں

خطرے میں سکون

مولانا عبدالسلام قدوائی



تم نے مولانا شبلی کا نام ضرور سنا ہوگا بھلا کون اردو جاننے والا ان سے ناواقف ہو سکتا ہے! اردو کی ترقی میں مولانا کی کوششوں کا بڑا حصہ ہے۔ ان کے علمی اور تحقیقی مضامین اور بلند پایہ کتابوں نے اردو کو دنیا کی ایک اہم زبان بنانے میں بڑی مدد دی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا نام اردو کی تاریخ میں بہت نمایاں ہے۔ اپنی درسی کتاب میں شاید تم نے ان کا کوئی مضمون پڑھا ہو آگے چل کر جب بڑے ہوگے تو ان کی اونچی کتابیں پڑھوگے اس وقت تمھیں ان کی اہمیت کا پورا اندازہ ہوگا۔

اس وقت ہم تمھیں ایک پُر اثر واقعہ ان کی ایک کتاب سے سنا رہے ہیں۔

مولانا نے بہت سی تاریخی کتابیں لکھی ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہندوستان کے کتب خانوں کے علاوہ دوسرے ملکوں کے اہم کتب خانوں سے فائدہ اٹھانے اور آثار قدیمہ کو دیکھنے کے لیے سفر بھی کیا تھا۔ اس سفر کے واقعات اور مشاہدات ایک کتاب کی صورت میں اسی زمانے میں شائع کر دیے تھے۔ یہ کتاب "سفرنامہ روم و مصر و شام" کے نام سے اب بھی کتب خانوں میں موجود ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے بہت سے پُر اثر واقعات لکھے ہیں جن کو پڑھ کر آج بھی طبیعت متاثر ہوتی ہے۔

ساحل ہند سے جہاز کی روانگی کے چند

دن کی بات ہے کہ مولانا نے ایک دن دیکھا کہ جہاز کے کام کرنے والے کچھ پریشان سے ہیں اور گھبراہٹ کے ساتھ اِدھر اُدھر آ جا رہے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر مولانا کو فکر ہوئی کہ پتہ چلائیں کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ یہ خیال کرکے وہ جہاز کے کپتان کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ جہاز کے کارکن پریشان محسوس ہو رہے ہیں۔ کپتان نے کہا کہ جہاز میں ایک سوراخ ہو گیا ہے جس سے پانی اندر آ رہا ہے ـــــ کوشش کی جا رہی ہے کہ کسی طرح سوراخ جلد سے جلد بند کر دیا جائے تاکہ پانی اندر داخل نہ ہو ورنہ ڈر ہے کہ جہاز ڈوب نہ جائے۔ کوشش جاری ہے لیکن ابھی خطرہ دور نہیں ہوا ہے۔

کپتان کا بیان سن کر مولانا بہت گھبرائے اور گھبرائے ہوئے اپنے رفیق سفر ڈاکٹر آرنلڈ[1] کے کمرے میں پہنچے دیکھا تو وہ کسی کتاب کو غور سے پڑھ رہے ہیں مولانا سمجھے کہ شاید ان کو جہاز کی حالت کی خبر نہیں ہے اس لیے پکار کر کہا کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس وقت جہاز کی کیا حالت ہے؟ پروفیسر آرنلڈ نے جواب دیا "ہاں اس میں سوراخ ہو گیا ہے جس سے خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ کوشش ہو رہی ہے کہ اس خطرے پر قابو حاصل کر لیا جائے اگر سوراخ جلد بند نہ ہوا تو جہاز ڈوب سکتا ہے"۔

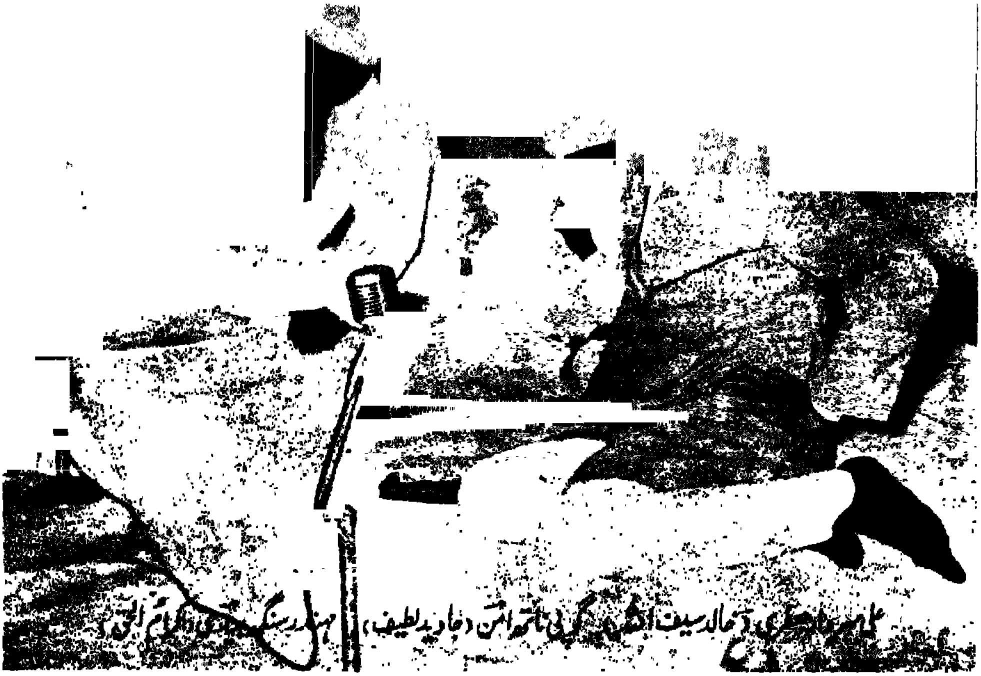
یہ سن کر مولانا حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگے اور فرمایا کہ پھر ایسے خطرناک وقت میں جب جان پر بنی ہو کتاب کے مطالعے کا کیا موقع ہے یہ سن کر پروفیسر آرنلڈ نے کہا کہ گھبراہٹ اور پریشانی سے کیا حاصل ہے اگر جہاز ڈوبنے والا ہی ہے تو دو چار گھنٹے جو زندگی کے ہیں میسر ہیں وہ کسی مفید کام میں صرف ہوں۔

مولانا نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر آرنلڈ کا یہ اطمینان بخش جواب سن کر میں بہت متاثر ہوا۔ نہ صرف یہ کہ ذہنی پریشانی دور ہو گئی بلکہ عزم و استقلال کی ایک بے نظیر مثال سامنے آ گئی۔

یہ واقعہ جب میں نے پہلی بار مولانا کے سفرنامے میں پڑھا تھا اس وقت بھی بڑا اثر ہوا

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

[1] ڈاکٹر آرنلڈ اس زمانے میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں پروفیسر تھے۔ مولانا شبلی بھی اسی کالج میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر آرنلڈ چند ماہ کی رخصت لے کر اسی جہاز سے اپنے وطن جا رہے تھے جس سے مولانا شبلی سیاحت کی غرض سے سفر کر رہے تھے۔



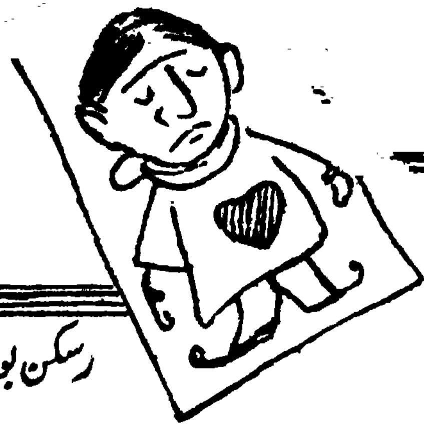
مدرسہ ثانوی کا تمثیلی مشاعرہ







مدرسہ ثانوی جامعہ کے ڈرامے "بھارت رتن" کے دو منظر



چاچی کی ارتھی

رسکن بونڈ   ترجمہ: محترمہ شاکرہ ندیم

پانچ اپریل کو بدھ کے دن شام کے پانچ بجے چاچی کا انتقال ہوا اور مرنے کے ٹھیک بیس منٹ بعد وہ زندہ بھی ہو گئیں۔ کیسی عجیب بات ہے۔ پر یہ سب ہوا کیسے یہ بھی سنیے۔

چاچی بے چاری سیدھی سادی عورت تھیں دن بھر اپنے کام میں لگی رہتی تھیں۔ گھر ماشاءاللہ بھرا پُرا تھا۔ اپنے بچے کچھ کئی بھتیجے بھتیجیاں۔ ان کی وجہ سے اچھا خاصا شور و غل رہتا تھا پر چاچی پر اس شور و غل کا ذرا اثر نہ ہوتا تھا وہ تو بس بڑا اپنے کام کی دھن میں اِدھر اُدھر گھوما کرتی تھیں۔

ان ہی بچوں میں ایک دس سال کا بچہ سنیل بھی تھا اس سے چاچی کو (نہ جانے کیوں) کچھ چڑ سی تھی بات کچھ یہ بھی تھی کہ سنیل کو سمجھنا اس کی اپنی عقل سے باہر تھا۔ وہ چاچی کے اپنے بچوں سے ذرا ذہین اور اچھی شکل کا تھا۔ کچھ تیز مزاج بھی تھا۔ معمولی ڈانٹ ڈپٹ کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ جب سنیل کے ماں باپ دونوں اپنے اپنے دفتر دل کو چلے جاتے تھے تو سنیل کی دیکھ بھال اور کھانے پینے کی ذمہ داری چاچی پر آن پڑتی تھی۔ یہ بات چاچی کو کچھ گراں گزرتی تھی۔ ان ہی باتوں کی وجہ سے چاچی کے غصے کا شکار سنیل کچھ زیادہ ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اس پر ضرورت سے زیادہ برس پڑتی تھیں۔

سنیل چاچی کے مزاج کو خوب سمجھتا تھا اور

پنی شرارتوں سے ان کی خفگی کو اور ہوا دیتا تھا۔ مثلاً ان کو سوتا ہوا دیکھ کر کاغذ کے تھیلوں میں ہوا بھر کر گھونسا مار کر پٹاخہ بجانا اور چاچی کے کپڑوں کو الگنی پر لٹکا ہوا دیکھ کر ان پر طرح طرح کے اعتراض کرنا، چاچی کا دل جلانے کے لیے کافی ہوتا تھا۔

مگر پانچ اپریل کو وہ معمول سے زیادہ جوش میں بھرا ہوا تھا۔ بات یہ ہوئی کہ بھوک کے مارے اس کی آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ وہ سیدھا باورچی خانے میں گھسا کہ کچھ نہ ملے تو شہد ہی چاٹ کر دیکھے۔ بوتل اوپر الماری میں رکھی تھی۔ سنیل صاحب قد کے چھوٹے تھے۔ اس لیے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اتارنے کی کوشش کی۔ انجام یہ ہوا کہ بوتل لڑھک کر فرش پر گری اور پاش پاش ہو گئی۔ سارا شہد زمین پر بکھر گیا۔ چاچی فوراً موقعِ واردات پر پہنچیں اور یہ سین دیکھ کر مارے غصے کے بے قابو ہو گئیں۔ کچھ اور تو سمجھ میں نہ آیا پیر سے چپل اتار سنیل کی خوب اچھی طرح "تاجپوشی" کر دی۔ مزے کی بات یہ کہ سب کرنے کے بعد خود بھی فرش پر بیٹھ کر آنسو بہانے لگیں۔ اگر کوئی اور مارتا تو سنیل اس سے اچھی طرح نپٹ لیتا مگر چاچی کے سامنے رونا چلانا اس کی خودداری کے خلاف تھا۔ بس وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گیا۔

وہ اوپر کوٹھے پر چڑھ گیا۔ یہیں برساتی میں سنیل نے اپنا "کمرہ" بنا رکھا تھا اور وہیں ایک طاق میں اس کی پسندیدہ چیزیں رکھی رہتی تھیں۔ مثلاً پتنگ کی ڈور، چاقو، پتھروں کے ٹکڑے اور لٹو وغیرہ۔ اس نے آتے ہی اپنا چاقو کھولا اور کھڑکی کے کواڑ پر وار کرنا شروع کیے۔ ساتھ ہی بڑبڑاتا بھی جاتا تھا "میں ان کو جان سے مار کر دم لوں گا۔ میں ان کو مار ڈالوں گا۔۔۔۔"

"تم کس کو مار رہے ہو" یہ اس کی بہن مدھو نے پوچھا۔ نہ جانے کب سے وہ اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہوئی تھی یہ اس کی چچازاد بہن تھی یعنی چاچی کی بیٹی۔

"چاچی کو مار ڈالوں گا۔ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہیں، میں بھی ان سے نفرت کرتا ہوں۔ میں سب باتیں جانتا ہوں۔ میں ان کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔" سنیل کا غصے کے مارے برا حال تھا۔

"بھلا تم ان کو کیسے جان سے مار ڈالو گے؟"

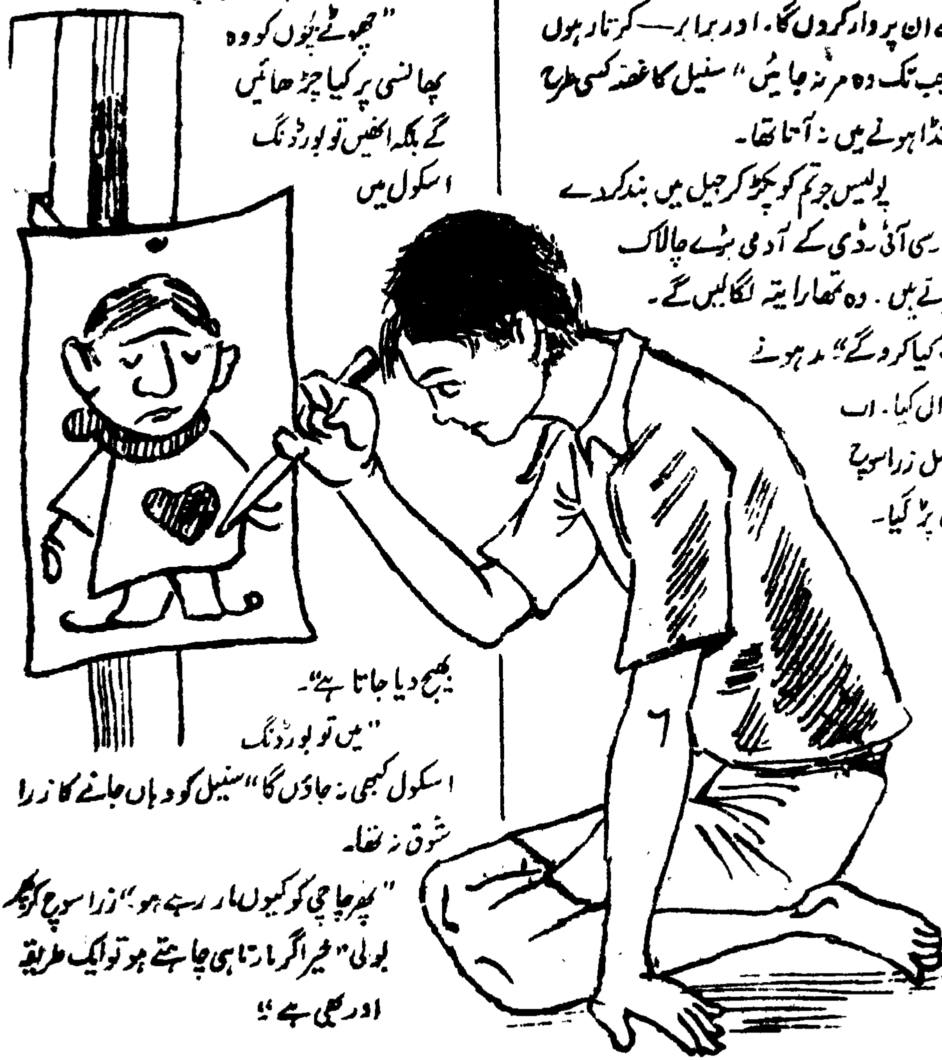
مدھو نے چونک کر پوچھا۔

سنیل نے اپنا چاقو دکھا کر کہا "میں اس چاقو سے ان پر وار کروں گا۔ اور برابر — کرتا رہوں گا جب تک وہ مر نہ جائیں" سنیل کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔

"پولیس جرم کو پکڑ کر جیل میں بند کردے گی۔ سی آئی ڈی کے آدمی بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ وہ تمھارا پتہ لگالیں گے۔ تب کیا کرو گے؟" مدھو نے سوال کیا۔ اب سنیل ذرا سوچ میں پڑ گیا۔

فکر مند ہو کر بولا۔

"کیا وہ مجھے پھانسی پر چڑھا دیں گے؟"



"چھوٹے بچوں کو وہ پھانسی پر کیا چڑھائیں گے بلکہ انھیں تو بورڈنگ اسکول میں بھیج دیا جاتا ہے"۔

"میں تو بورڈنگ اسکول کبھی نہ جاؤں گا" سنیل کو وہاں جانے کا ذرا شوق نہ تھا۔

"پھر چاچی کو کیوں مار رہے ہو" ذرا سوچ کر مدھو بولی "خیر اگر مارنا ہی چاہتے ہو تو ایک طریقہ اور بھی ہے"۔

مدھو نے فوراً کاغذ پنسل نکال کر ایک عورت کی تصویر بنائی اور لال پنسل سے پیٹ کے بیچوں بیچ میں ایک بڑا سا دل بنایا اور بولی "لو اب چاقو سے وار کردو۔"

خوشی اور حیرت کے مارے سنیل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اب تو یہ اس کے لیے مزیدار کھیل ہو گیا۔ مدھو کی عقل کا وہ دل ہی دل میں قائل ہو گیا۔ اس نے جھٹ چاقو اٹھا کر سینے میں گھونپ دیا۔

"اب تو تمھیں تسلی ہوئی؟" مدھو نے پوچھا۔

"بس کیا یہ اتنی ہی دیر کا قصہ تھا۔" سنیل کے دل کو ابھی کہاں تسلی ہوئی تھی۔ "اگر اب بھی تمھاری تسلی نہیں ہوئی تو آؤ ہم مل کر ان کی لاش کو جلانے کا انتظام کریں۔" مدھو نے تجویز پیش کی۔

سنیل تو تیار تھا ہی۔ مدھو نے تصویر کی بتی سی بنائی اور سنیل کے "خزانے" میں سے ماچس نکال کر فوراً اس میں آگ لگا دی۔ دونوں چپ چاپ کاغذ کو جلتے ہوئے دیکھتے رہے۔

"ہائے بے چاری چاچی" مدھو نے افسوس سے کہا۔ سنیل کو بھی کچھ افسوس ہونے لگا وہ بولا:۔ "میرے خیال میں ہم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟ اب ان کی راکھ ندی میں بہا دیں تو کیسا رہے" مدھو نے پھر مشورہ دیا۔

"کون سی ندی میں" سنیل سوچ میں پڑ گیا۔

"ارے وہ جو ہماری نالی ہے اس کام کے لیے تو یہ بہت کافی ہے۔" مدھو نے سب راکھ جمع کی اور بالکونی میں کھڑے ہو کر ہاتھ اچھال کر راکھ دور پھینک دی۔ کچھ راکھ تو انار کے درخت پر بکھر گئی اور کچھ نالی میں گر گئی اور پانی کے ریلے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ مدھو نے جو پلٹ کر دیکھا تو سنیل کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ وہ حیرت سے بولی "ارے تم رو کیوں رہے ہو؟"

"ہائے میری چاچی۔ میں ان کو اس قدر ناپسند بھی نہیں کرتا تھا۔" اب سنیل کو پچھتاوا ہو رہا تھا۔

"پھر تم کیوں ان کو مارنا چاہتے تھے؟" مدھو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"وہ تو ایک دوسرا ہی معاملہ تھا" سنیل بولا۔

"چلو نیچے اترو۔ مجھے ابھی ہوم ورک کرنا ہے۔" جیسے ہی وہ اتر کر نیچے پہنچے۔ چاچی باورچی خانے سے برآمد ہوئیں۔ دیکھتے ہی سنیل بے تابی سے

دوڑا اور لپٹ گیا۔ چاچی سمجھیں کہ یہ بھی اس کی کوئی شرارت ہے اس لیے بولیں "کیوں، کیوں خیریت تو ہے؟"

"کچھ نہیں چاچی میں تم کو بہت چاہتا ہوں۔ تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جانا!"

چاچی کو یقین نہ آیا۔ ظاہر ہے کہ سنیل کا یہ انداز پچھلی حرکتوں سے بہت مختلف تھا مگر سنیل کی آنکھوں میں محبت کے آنسو دیکھ کر ان کا دل پگھل گیا۔ اور وہ پیار سے اس کی پیٹھ تھپتھپاتی ہوئی اسے باورچی خانے میں لے گئیں۔

(السٹریٹڈ ویکلی کے شکریے کے ساتھ)

(بقایا صفحہ ۵۵ کا)

تھا اور آج جب تم کو یہ قصہ سنانے بیٹھا ہوں تو اثر کا وہی حال ہے۔ مزاج کا یہی استقلال طبیعت کی یہی پختگی۔ وقت کی قدر و قیمت کا یہی احساس اور زندگی کو ہر حال میں مفید کاموں میں لگائے رکھنے کا یہی جذبہ قوموں کو ترقی کی چوٹی تک پہنچاتا ہے اور مصیبتوں اور مشکلوں کے ہجوم میں ان کو مسکراتے ہوئے قدم آگے بڑھانے کی ہمت بخشتا ہے۔

جناب سعید عقاب

میرا وطن ہندوستاں

میرا وطن ہندوستاں
ہے واقعی جنت نشاں

کھیتوں کی شادابی میں ہے — یہ لکشمی کی شان ہے
باغوں کی ہریالی میں ہے — شاہِ جہاں کی جان ہے
شہروں کی آبادی میں ہے — پرتاپ کا ارمان ہے
کہسار میں وادی میں ہے — سویا یہاں خانان[1] ہے
ماہِ اخوت ضو فشاں — امن وسکوں کا آشیاں
میرا وطن ہندوستاں — میرا وطن ہندوستاں
ہے واقعی جنت نشاں — ہے واقعی جنت نشاں

لہ عبدالرحیم خان خاناں

نانک کا ہے پیارا وطن
رشیوں کی ہے یہ انجمن
ولیوں کی رفعت کا چمن
اکبر کو تھی اس سے لگن
اک باغ صدہا باغباں
میرا وطن ہندوستاں
ہے واقعی جنّت نشاں

گنگ وجمن کی شوخیاں
صبحِ بنارس کا سماں
شام اودھ کیا ہو بیاں
چاروں طرف رنگینیاں
جیسے فلک پر کہکشاں
میرا وطن ہندوستاں
ہے واقعی جنّت نشاں

نہرو کا یہ پیارا گلاب
گاندھی کی عظمت کا شباب
آزاد کے دل کا رباب
یہ ہے مجسّم انقلاب
جمہوریت کا ترجماں
میرا وطن ہندوستاں
ہے واقعی جنّت نشاں

ہے دشمنوں کی پھر نظر
میرے سنہرے دیس پر
آئے گا جب کوئی ادھر
ہو جا دل کا سینہ سپر
آئے تو وقتِ امتحاں
میرا وطن ہندوستاں
ہے واقعی جنّت نشاں

میرا وطن ہندوستاں
ہے واقعی جنّت نشاں



کہکشاں

جناب عبدالحق خاں

شاگرد :- ماسٹر صاحب! دن ڈھلے جب میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں، اور مجھے شام کا پہلا ستارہ نظر آتا ہے تو عجیب طرح کی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ دھیرے دھیرے تاریکی چھانے لگتی ہے اور ایک ایک کرکے ستارے نکل آتے ہیں۔ میں ان کو گننا شروع کر دیتا ہوں۔ لیکن جلدی ہار جاتا ہوں۔ اور پھر اپنے خیالات میں گم ہو جاتا ہوں۔ میں اکثر سوچتا ہوں فضا کتنی بڑی ہے۔ ماسٹر صاحب کیا آپ مجھے بتا سکیں گے فضا کتنی بڑی ہے کتنی لمبی ہے کتنی چوڑی ہے؟

استاد :- تمہارے سوال پر مجھے دو فلسفیوں کی ایک کہانی یاد آتی ہے۔ ایک بار ایک فلسفی نے دوسرے فلسفی سے کہا "او دیکھیں کون سب سے بڑا عدد بتاتا ہے" دوسرے فلسفی نے یہ سنا تو فکر کے دریا میں ڈوب گیا۔ اور پھر آدھ منٹ تک سوچ کر اس نے کہا جی ہاں سب سے بڑا عدد تین ہے اب پہلا فلسفی فکر کے سمندر میں غوطے لگاتا رہا۔ اور ایک گھنٹے کے بعد اس نے سر اٹھا کر کہا "ٹھیک ہے،

آپ جیتے میں ہارا۔

شاگرد:۔ لیکن پہلے فلسفی نے اتنی جلدی شکست کیوں تسلیم کرلی۔ تین سے بڑا عدد تو میرا تین سال کا بھیا جُنّو بھی بتادے گا۔

استاد:۔ تمھاری بات ٹھیک ہے۔ لیکن فلسفی عقلمند تھا اس نے سوچا اگر وہ چار کہے گا تو دوسرا فلسفی پانچ کہہ دے گا۔ اور پھر یہ چھ کہے گا تو وہ سات کہہ دے گا۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ سو پھر دو سو، ہزار لاکھ اور اربوں کھربوں تک چل کر بھی نامکمل رہے گا۔ اس لیے اس نے اندازہ لگالیا کہ دنیا میں سب سے بڑا عدد کوئی نہیں۔ یہ تو کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔

اسی طرح فضا کی وسعت کا حال ہے جس کی کوئی انتہا نہیں جس کا کوئی اور چھور نہیں۔ ایک اسٹرانومر یا ستاروں کے علم سے ماہر، سائنس داں اپنے ٹیلسکوپ کی مدد سے جب اختر شماری کر لیتا ہے تو کوئی دوسرا اسٹرانومر اس سے بھی زیادہ طاقت کا ٹیلسکوپ لگاتا ہے۔ اور پھر ستاروں کی ایک نئی دنیا اس کے سامنے ہوتی ہے۔ غرض سائنس نے ایک سے ایک بڑا ٹیلکوپ بنایا لیکن ان کی مدد سے اتنا ہی پتہ چل سکا جتنا کہ اقبال نے کہا "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

شاگرد:۔ لیکن جناب ان کی کوئی حد تو ہوگی؟

استاد:۔ ممکن ہے فضا کی کوئی وسعت ہو لیکن اب تک تو اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اب تم سائنس پڑھ رہے ہو بڑے ہو کر اس بات کی تحقیق کرنا۔ شاید تم اس مشکل کو حل کردو۔ ہمارا حال اس پورے عالم میں ایسا ہی ہے جیسا کسی گھنے جنگل میں ایک چیونٹی کا۔ سوچو تو یہ چیونٹی اگر اس جنگل کی وسعت کا حال بتانے کی کوشش کرنے لگے!

شاگرد:۔ یہ تو بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن۔

استاد:۔ ہاں تو بس ایسا ہی ناممکن ہمارے لیے فضا کی پیمائش ہے۔

شاگرد:۔ آپ ہمیں سورج چاند اور دوسرے ستاروں کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں۔ تو کیا انسان نے اس مسئلہ کو حل کرلیا

کر لیا۔

استاد:۔ ہاں انسان نے بہت ترقی کی۔ اور اس مسئلے کو بہت حد تک حل کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس نے ستاروں کی دنیا کا سائز اور شکل معلوم کی ہے۔

شاگرد:۔ جب ہم ستاروں کی دنیا میں نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں۔ کچھ ستارے کم روشن ہیں کچھ زیادہ کچھ علیحدہ علیحدہ بکھرے ہوئے ہیں اور کچھ ایک جگہ جمگھٹ سا لگائے ہیں کہ وہاں ایک سفید سی روشنی کی پٹی نظر آتی ہے۔ آپ ایک دن فرما رہے تھے کہ یہ بھی ستارے ہیں۔

استاد: تم جس سفید روشن پٹی کا ذکر کر رہے ہو یہ دراصل ستارے ہی ہیں۔ پر یہ ہیں بہت پاس پاس اتنے قریب قریب ہیں کہ غیر دھاری جیسے لگتے ہیں۔ یہ پٹی آسمان کے درمیان سے گزرتی ہے۔ اور اسے دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ہم اس پٹی کو کہکشاں کہتے ہیں۔ اس کا انگریزی میں دوسرا نام galaxy ہے۔ یہ یونانی لفظ سے نکلا ہے۔ اس کے معنی بھی دودھ کے ہیں۔

شاگرد:۔ ماسٹر صاحب اسے Milky way کیوں کہتے ہیں؟

استاد:۔ چونکہ ان ستاروں کی یہ پٹی دور سے ایسی ہی تو دکھائی دیتی ہے جیسے دودھ کی بنی ہوئی صاف شفاف سڑک ہو۔

شاگرد:۔ مگر دراصل یہ ہے کیا؟

استاد:۔ مدتوں لوگ اسے دیکھ دیکھ کر اسی طرح کے قصے کہانیاں کہتے رہے جیسے چاند سورج کو دیکھ کر۔

شاگرد:۔ ہاں ماسٹر صاحب چاند میں بھی تو بڑھیا چرخا کات رہی ہے۔

استاد:۔ (ہنس کر) جی ہاں پہلے ایسی ہی بچوں کے بہلانے والی باتیں کہہ کہہ کر لوگ خوش ہوتے تھے۔ سب سے پہلے سر ولیم ہرشل نے اب سے تنو سال پہلے اس کا مطالعہ کیا۔ اور بتایا کہ یہ ایک (ڈسک) کی شکل میں ہونی چاہیئے اور اسی کا خیال ہے کہ سورج اس کے مرکز (centre) میں ہے لیکن اب ہم نے سائنس کی مدد سے زیادہ درست معلومات فضا کے متعلق معلوم کر لی ہیں اور ہمیں اب معلوم ہو گیا ہے کہ سورج اس کے بیچ میں نہیں ہے بلکہ اس کے باہر کے حصہ پر

ہے اور کہکشاں کے ستاروں میں سب سے زیادہ
مدھم ستارہ ہے۔ سائنس دانوں نے اب تک
کہکشاں کے صرف چند ہی ستاروں کے نام تجویز
کئے ہیں۔ یہ بھی ان ستاروں کے جو ان میں سب
سے زیادہ روشن ہیں۔ اور ہم سے بے حد نزدیک
ہیں۔

شاگرد:۔ کیوں سب ستاروں کے کیوں نہیں؟

استاد:۔ اگر سب ستاروں کے نام ہم تجویز کرنے
لگیں تو ہمیں چار ہزار سال لگ جائیں گے۔
وہ بھی اس صورت میں کہ ہم دن رات یہی
کام کرتے رہیں۔ اور نام لینے میں صرف ایک
سکنڈ لگائیں۔ بعض خاص قسم کے ٹیلسکوپ
کی مدد سے فوٹو لیے گئے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا
ہے کہ یہ ننھے ننھے ستارے بظاہر ایک دوسرے
سے بے حد نزدیک ہیں۔ دراصل بہت دور
دور ہیں۔

شاگرد:۔ کیا آپ کا مطلب ہے کہ کہکشاں کے
ستارے ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔

استاد:۔ ہاں۔ درحقیقت Milky way میں
بہت سے ستارے ایک دوسرے سے لگ
بھگ اتنی ہی دور ہیں جتنا کہ بہت سے روشن
ستاروں سے ہماری دنیا یعنی لاکھوں کروڑوں
میل۔

شاگرد:۔ لیکن ہم ستاروں کے درمیان کا
راستہ بھلا کیسے معلوم کر سکتے ہیں؟

استاد:۔ سائنس داں کہکشاں کے ستاروں
کے فاصلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ تو وہ اپنا ایک
مخصوص نمبروں کا طریقہ استعمال کرتے ہیں کیونکہ
اگر وہ ان فاصلوں کو میلوں میں بتانا چاہیں گے
تو وہ لاکھوں کروڑوں بلکہ اربوں میں ختم کریں گے
سیدھے سادے طریقے سے سمجھانے کے لیے کہتے
ہیں کہ فلاں ستارہ سورج سے ۹ روشنی کے سال
دور ہے۔ ایک روشنی کے سال کا اتنا ہی فاصلہ
ہوتا ہے جتنا روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے
تمھیں یاد ہے کہ روشنی کتنی تیزی سے چلتی ہے؟

شاگرد:۔ جی ہاں۔ روشنی ایک سکنڈ میں
۱۸۶۰۰۰ میل سفر کرتی ہے۔

استاد:۔ ٹھیک اور تمھیں یہ بھی معلوم ہے
کہ روشنی ان تمام چیزوں سے زیادہ تیز سفر
کرتی ہے جو دنیا میں موجود ہیں۔ یہ ایک سکنڈ
میں دنیا کے چاروں طرف کم و بیش آٹھ دفعہ
گھوم جائے گی۔

اب اگر ہم روشنی کے سال کا پیمانہ استعمال کریں تو فاصلوں کے بارے میں بڑے دلچسپ اعداد معلوم ہوتے ہیں۔ سورج ہم سے اس قدر نزدیک ہے کہ ہم تک اس کی روشنی صرف آٹھ منٹ میں پہنچ جاتی ہے۔ لیکن نزدیک ترین تارے سے ہم تک روشنی پہنچنے میں کم و بیش چار سال لگیں گے۔ یعنی نزدیک ترین تارے کا ہم سے فاصلہ چار روشنی کے سال ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے جو روشنی رات کو ہم تک پہنچتی ہے۔ اس نے اپنا سفر تاروں کی دنیا سے چار سال پہلے شروع کیا ہوگا۔ کہکشاں میں بعض تارے ایسے ہیں جن کی روشنی نے ہم تک پہنچنے کے لیے مغلوں کے دور سے اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔ اگر تم تاریخ کے ورق پلٹنا چاہتے ہو تو اس سے آسان کوئی طریقہ نہیں کہ تاروں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھو۔ وہ تمھاری آنکھوں میں صدیوں پہلے کی روشنی پہنچا دیں گے۔

شاگرد: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کہکشاں کبھی بھی نہ پہنچ سکیں گے۔

استاد: ہاں اگر ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ کی رفتار سے روشنی کے ساتھ تم بھی سفر کر سکو تو کئی صدیوں بعد تم وہاں پہنچنے کے بارے میں سوچ سکتے ہو۔

شاگرد: کہکشاں کتنی بڑی ہے؟

استاد: ادھر اس مسئلہ پر کافی بحث ہو رہی ہے پہلے کچھ سائنس والوں کا خیال تھا کہ اس کا قطر (Diameter) ۲۰ ہزار روشنی کے سال ہے۔ لیکن اب کچھ سائنس والوں کا خیال ہے کہ شاید یہ اس کے دس گنے سے بھی زیادہ ہے اور اس کے گھیرے کے مرکز کی چوڑائی (Thickness) کوئی دس ہزار روشنی کے سال ہے۔ یہاں تمھیں یہ بھی بتا دوں کہ گھیرے کے مرکز میں سب سے زیادہ تاروں کا جمگھٹا ہے۔ اسی لیے وہ سب سے زیادہ روشن ہے۔ لیکن اگر تم اس کے مرکز کی طرف دیکھو تو بمشکل ہی دکھائی دے گا۔ سائنس دان مدتوں تک (Astronomers) اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ

(باقی صفحہ ۹۳ پر)

آزادی

جناب حمید قریشی سہارن پوری



اچھی ممی ذرا اک بات بتا دو مجھ کو!
میں اگر لان کے باغیچے میں جاتا ہوں کبھی
دفعتاً چیخنے لگتے ہیں پرندے ہر سو
کوئی کٹ کٹ، کوئی چک چک، کوئی کاکا کوکو
کوئی چیں چیں، کوئی کیں کیں، کوئی چاچا، چُوچُو

پھڑپھڑاتے ہیں، پھدکتے ہیں، اُڑا کرتے ہیں
ایک بے چینی سی ہر سمت نظر آتی ہے
میرے جانے سے بدل جاتا ہے یکسر ماحول
جانے کمبختوں کی کیا جان پہ بن جاتی ہے

ممّی:-
بھولے پپّو! تمھیں کچھ یاد نہیں ہے شاید
تم نے پچھلے دنوں پکڑا تھا جو اِک شاما کو
اُن کے دل میں وہی ڈر اور وہی غصہ ہے
یاد ہے اب بھی انھیں تم نے ستایا تھا کبھی
بس اسی واسطے یہ شور ہے یہ غوغا ہے

پپّو:-
نہیں ممّی! کہیں شاما کو ستایا میں نے
خوب دانا دیا، پانی دیا، آرام دیا
اتنا کرنے پہ بھی کھڑکی جو کھلی پھُر سے گئی
اور کم ظرف نے الٹا مجھے الزام دیا

ممّی:-
ٹھیک، تم نے اسے ہر طرح کا آرام دیا
لیکن آزادی سے محروم تو کرنا چاہا
کئی دن پنجرے میں رکھا کئی دن ہاتھوں میں
اور بے چاری کا بازو بھی کترنا چاہا!

بھوکوں مرنا اسے منظور تھا اچھے پپّو
اپنی آزادی گنوانا اُسے منظور نہ تھا
چند کیڑوں پہ گلستاں میں گزر بہتر تھی
قید میں قیمتی دانا اُسے منظور نہ تھا



غبارے لائیں گے

محترمہ رضیہ سجاد ظہیر



میری ننھی سی بہن سونیا، پیار!

میں خیریت سے دہلی پہنچی۔ دہلی بہت بڑا شہر ہے، ہمارے لکھنؤ سے بہت بڑا، مگر ہمارے گھر میں بس تین چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں اس کا بھی کرایہ ڈھائی سو۔ یہاں ٹیکسیاں چلتی ہیں اور بسیں اور اسکوٹر ۔۔۔ جیسا ایک لکھنؤ میں بھی ہم نے دیکھا تھا۔

ابا صاحب ٹیکسی میں چلتے ہیں، ممی اور تقی بھائی اسکوٹر یا بس میں۔ جب ہم لوگ یہاں پہنچے تو پہلے صفائی کی، میں نے دیگچیاں مانجھیں، ممی نے چینی کے برتن دھوئے، کیونکہ ممی نے کہا تم توڑ دو گی۔ سیکھ جاؤ تب دھونا۔

پھر ممی ایک دن مجھے پاس کے ایک اسکول میں لے گئیں، تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم داخلہ نہیں کر سکتے، جب ساٹھ بچے ایک کلاس میں ہو جائیں گے تب دو ٹیچر رکھے جائیں گے اور ابھی پچاس ہیں تو ایک ٹیچر کیسے سنبھالے گی۔ تو ممی نے کہا کہ جب آپ داخل ہی نہیں کریں گے تو ساٹھ کیسے ہوں گے تو وہ بولے گورنمنٹ سے کہیے! ۔۔ پھر ممی نے پوچھا کہ اردو آپ لوگ پڑھاتے ہیں؟ تو کہنے لگے سرکار نے اردو ختم کر دی ہے ۔۔۔ ممی نے کہا دکھائیے کہاں لکھا ہے کہ ختم کر دی، قانون بتائیے۔ تو چپ ہو گئے!

ہمارا داخلہ نہیں ہوا۔ ممی خود پڑھاتی ہیں۔ پھر ہم لوگ مارکیٹ گئے۔ وہاں سب لوگ پنجابی بولتے ہیں، بڑی اچھی اچھی چیزیں بک رہی تھیں پر ممی نے تھوڑی ہی لیں۔ کہنے

لگیں " بیٹی، مہنگی بہت ہیں، ہم لوگ نہیں
خرید سکتے، صرف وہ لوگ لے سکتے ہیں جن کے
پاس بہت سے پیسے ہوں"

پھر ممی نے روٹی پکائی (آٹا میں نے گوندھا
تھا، ممی کے ہاتھ میں درد تھا) ارہر کی دال اور
آلو بیگن کی سبزی پکائی اور رات کے لیے قیمہ۔
ہم لوگ رات کو کھانا نہیں پکاتے، شام کو
ممی اور ابا صاحب کے پاس بہت سے لوگ
ملنے آتے ہیں اور فرصت نہیں ملتی۔ شام ہی
کو ممی لکھتی بھی ہیں اور بہت صبح چار پانچ بجے
سے بھی لکھتی ہیں۔ پھر دس گیارہ بجے سے پکاتی
ہیں وہی ہم لوگ رات کو بھی کھاتے ہیں۔

اور بے بی جو کچھ کھاتی ہیں اس میں
سے میرا بھی حصہ لگتا ہے مگر میں جب کوئی اچھی
چیز کھاتی ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ تم کو
بھی پارسل کردوں۔ یہاں ممی نے میرے لیے
الگ کھٹولا خریدا ہے جو ان ہی کے کمرے
میں بچھتا ہے، بچھونا بھی اچھا ہے، پر مجھے تو
اپنا وہ پلنگ یاد آتا ہے جس کے ایک پائے
کے نیچے پانچ اینٹیں لگی تھیں اور جس پر ہم
پانچ بہنیں ایک ساتھ سوتے تھے، تم تو
اماں کے ساتھ سوتی تھیں اور ننگو بکس پر
ابا بے چارے تین ٹوٹی کرسیاں جوڑ کر اس پر
سوتے تھے۔ میرے ابا کی طبیعت اب کیسی رہ
ہے؟ ممی نے تو وہاں بھی کہا تھا کہ اسپتال جاؤ
پر وہ بے چارے کیسے جاتے۔ دفتر سے پہلے
اور بعد تو بڑے صاحب کے گھر اُن کے گملوں
میں پانی دینے اور سودا لینے جاتے تھے۔

اور ہمارا گھر کیسا ہے؟ اماں نے ممی
کو لکھا تھا کہ دو دن پانی برسا تھا تو ہمارا گھ
ٹپکا ہوگا؟ تم لوگ کدھر سوئے؟ اور بکریاں
کیسی ہیں؟ اماں نے ممی کو لکھا تھا کہ رسو بکریا
چرانے گئی تھی پر اُسے بہت بخار تھا تو وہ
سو گئی تو بکریاں کانجی ہوز چلی گئیں لیکن خد
کا شکر ہے کہ اسی دن نجمہ بی بی ہوسٹل سے
گھر تھوڑی دیر کو آئی تھیں، کچھ کتابیں لینے
تو انھوں نے چھ روپے دے کر بکریوں کو
چھڑوایا۔

ترئی اور کدو کی بیل کیسی ہے۔ ج
ہمارے چھپر پر چڑھی تھی اور جب دال نہیں
ہوتی تھی تو اماں اس میں سے کدو توڑ کر پکا
تھیں، ممی یہاں کدو کبھی نہیں پکاتیں کیونکہ

اباکو کدوا اچھا نہیں لگتا! وہاں تو میں بکریاں چراتی
باتی تھی تو لکڑی بین لاتی تھی، یہاں مٹی کے تیل
اا اسٹوپ جلتا ہے۔ ایک بجلی کا بھی ہے، میرا بہت
ل چاہتا ہے کہ کھٹ سے کرکے اس کو جلا دوں پر
ی ہاتھ نہیں لگانے دیتیں، کہتی ہیں "یہاں
ے۔سی (ڈی۔سی) بجلی ہے، لٹک کر مرجاؤ گی تو
ہم تمھاری اماں کو کیا منہ دکھائیں گے"!

تم مجھے بہت یاد آتی ہو کیونکہ تم دن بھر
یری گود میں لدی رہتی تھیں، میری ننھی سی بہن
سونیا —— تمھیں تو پتہ نہیں تمھارا یہ نام ممی
نے ہی رکھا تھا۔ جب تم پیدا ہوئیں تو سب محلے
الوں نے اماں کو کہا کہ اس کے بس لڑکیاں ہی
دتی ہیں۔ تو وہ بہت روئیں اور ممی نے ان کو بلا
کر خوب ڈانٹا کہ "اب تو ہندوستان میں لڑکیاں
ہر وہ کام کر سکتی ہیں جو لڑکے کرتے ہیں، ہماری تجمہ
بی بی کو دیکھو" پھر تم کو گود میں لے کر پیار کیا
ور کہا "یہ نومبر میں پیدا ہوئی ہے ہم اس کا روسی
ام رکھیں گے"!

جب تم پیدا ہوئی تھیں تو بہت سردی
تی۔ اب یہاں بھی سردی ہونے لگی ہے تم لوگ
ات کو الاؤ جلاتی ہو؟ ایک دن میں نے اور
بے بی نے لکڑیاں جمع کرکے یہاں سڑک پر الاؤ لگایا
سب بچے خوب خوش ہو ہو کر ناچ رہے تھے پھر
ایک عورت بگڑنے لگی۔ وہ بڑی بری ہے، ممی
سے ایک دن کہنے لگی کہ آپ کے ایسے لوگ ہی
نوکروں کا دماغ خراب کرتے ہیں، بھلا نوکر کو جام
اور توس دینے کا کیا مطلب ہے" ویسے اس کا
گھر خوب بڑا ہے۔ بہت اچھے قالین بچھے ہیں اور
چاندی کے گل دان سجے ہیں! اور اس کے پاس
دو موٹریں ہیں۔ ایک دن ممی جا رہی تھیں تو
کہنے لگی "آیئے ہماری موٹر میں چلیے"! ممی نے
کہا "شکریہ، میں پیدل چل لیتی ہوں" میں بھی
ٹوکری لیے ممی کے ساتھ چل رہی تھی مجھے بہت
اچھا لگا کہ ممی اس کی موٹر میں نہیں بیٹھیں۔

اور ہاں —— یہ بتاؤ کہ ہم لوگوں نے
جوتے کے ڈبے میں جو ٹرانسسٹر بنایا تھا وہ ٹوٹ تو
نہیں گیا جس پر میرے ابا نے سوئی اور بٹن سب
لگایا تھا اور جس کے پیچھے چھلو بیٹھ کر گانا گاتی
تھی... "تیرے من کی گنگا اور میرے من کی
جمنا..." جب ہم لوگ آ رہے تھے تو ریل جمنا
پر سے گزر رہی تھی تب ممی نے مجھ کو اور بے بی کو کھڑکی
کے پاس بٹھا دیا کہ "دیکھو اسی دریا میں

ہمایوں بادشاہ آگرے میں کودا تھا اور اُسے
نظام سقے نے بچایا تھا، ہمایوں اور اس کے
ایسے بہت سے بادشاہ ختم ہوگئے مگر نظام
سقہ ابھی تک دریا کنارے پانی بھر رہا ہے۔"
بہت سے بھشتی مشک میں پانی لے رہے تھے
اور ان کی کمر میں بندھے انگوچھے دور سے لال
لال غباروں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔
ہم لکھنؤ آئیں گے تو تم سب چھوٹیوں کے
لیے غبارے لائیں گے۔ کیونکہ ہم کو یاد ہے کہ ایک
دن نیّم اور چھلّو غباروں کے لیے رو رہی تھیں۔
تو اماں نے ان کو ایک تھپڑ مار کر تم لوگوں کو
رو کے دکھلائیں یا غبارے دلائیں۔
بس ایک دن ہم یہاں رو کتے تھے، ممی
نے ہم کو ڈانٹا تھا۔ ایسا ہوا کہ ایک صاحب آئے،
ان کا نام شاعر تھا، ان کے گانے پر ہم اور بے بی
ہنسنے لگے تو ممی نے ہم دونوں کو ڈانٹا کہ جب
شاعر صاحب پڑھیں تو ہنسنا بدتمیزی ہے،
ادب سے کہنا چاہیے " واہ واہ ــ خوب، بہت
خوب، خبردار جو تم لوگ کبھی ہنسے "۔ اب ہم نے
یاد کر لیا ہے، اب وہی کہیں گے!
ہم اردو پڑھتے ہیں لیکن یہ خط ہم آپی

بھائی سے لکھوا رہے ہیں کیونکہ ہمیں ابھی لکھنا ٹھیک نہیں
آتا، لیکن ہم نے ممی سے پڈنگ پکانا سیکھ لیا ہے
اور قیمہ بھی اور فرش خوب چمکا لیتے ہیں ممی کہتی ہیں
"گھر کا کام گھر کے سب لوگوں کو تھوڑا تھوڑا ضرور
کرنا چاہیے۔ اور لڑکیوں کی تو گھر کے کام سے بڑی
عزت ہوتی ہے، ورنہ سب لوگ ان کو پھوہڑ کہیں گے۔"
اچھا اب ہم بس کرتے ہیں، اماں سے کہنا
جلدی جلدی خط لکھا کریں اور ہم لوگ گرمیوں میں
لکھنؤ آئیں گے ــــ اور ہاں ممی کو ایک کہانی
سے کچھ روپے ملے تھے تو انھوں نے نوکی کے
لیے ایک فراک کا کپڑا اور اماں کے لیے چپل اپنے
ایک دوست کے ہاتھ لکھنؤ بھیجی ہے، جب مل جائے
تو لکھنا۔ مُرلی چپراسی اور یاد وچپراسی کو سلام اور
پنڈت اور اس کی بی بی کو ہمارا سلام، پولس
والے منشی جی اور ان کی بیوی کو بھی سلام اور سب
کو پیار۔ خدا کرے میرے ابا کی طبیعت اب
ٹھیک ہو۔ ممی سب کو دعا کہتی ہیں ۔
تمھاری سب کی بہن
سعیدہ
عرف منّو۔

ماں مجھے بھی سپاہی بنادو

جناب عبدالمتین نیاز



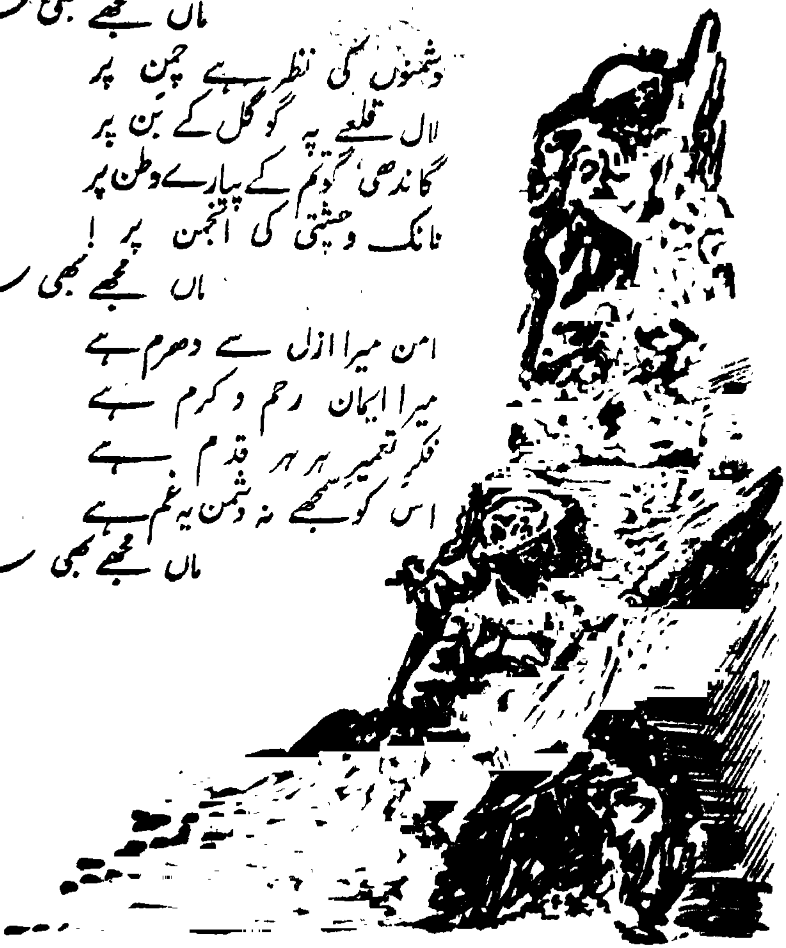
مجھکو الفت ہے اپنے وطن سے
پیار ہے مجھکو اپنے چمن سے
میں نہیں ڈرتا دار و رسن سے
فتح پاکر ہی لوٹوں گا رن سے
ماں مجھے بھی سپاہی بنادو

لاج رکھوں گا میں دھرتی ماں کی
اپنے کشمیر جنت نشاں کی
گنگا جمنا کے آبِ رواں کی
گلشنِ امن ہندوستاں کی
ماں مجھے بھی سپاہی بنادو

وہ بلاتا ہے دیکھو ہمالا!
آج خطرے میں ہے پھر ترنگا
اک پڑوسی کا ہے ہم پہ حملا
کہہ رہے ہیں یہ تاج و اجنتا
ماں مجھے بھی سپاہی بنادو

دشمنوں کی نظر ہے چمن پر
لال قلعے پہ گوکل کے بن پر
گاندھی، گوتم کے پیارے وطن پر
نانک و چشتی کی انجمن پر!
ماں مجھے بھی سپاہی بنادو

امن میرا ازل سے دھرم ہے
میرا ایمان رحم و کرم ہے
فکرِ تعمیر ہر ہر قدم ہے
اس کو سمجھے نہ دشمن یہ غم ہے
ماں مجھے بھی سپاہی بنادو





سید محمد ٹونکی

بچوّں کی صدا

بچے ہنستے اور کھیلتے ہیں۔ جب بہت سے مل جاتے ہیں تو اس خوشی میں دیر تک کھیلتے رہتے ہیں۔ اپنے اپنے گھروں میں اپنے کھیل کی باتیں بڑے جوش سے سُناتے اور اُن ساتھیوں کی تعریف کرتے ہیں جن کا اچھا کھیل سب کی خوشی دوبالا کرتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایسے اچھے دن آتے رہیں جن میں وہ مگن ہوکر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلا اور ہنسا کریں۔

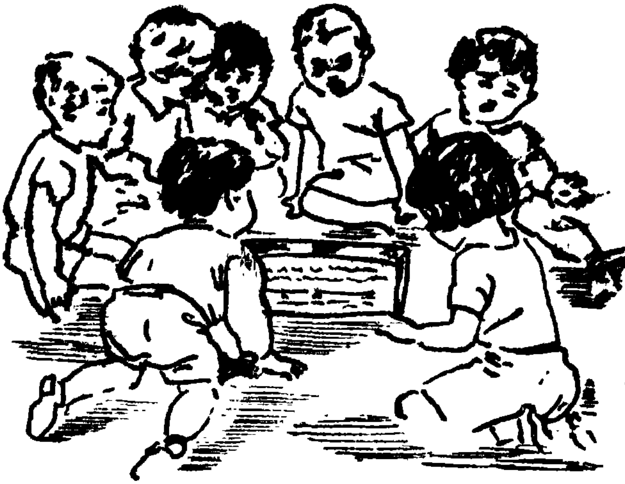
کبھی کبھی ان کے کھیل میں کھنڈت پڑجاتی ہے۔ وہ کسی بات پر لڑپڑتے ہیں' توتو میں میں ہوتی ہے۔ کبھی جھگڑا اتنا بڑھ جاتا ہے کہ آپس میں گُم گُٹوّا ہو جاتی ہے۔ بول چال تک نہیں رہتی۔ لیکن تھوڑے ہی دن جب کھیل کا وقت آتا ہے

تو ان کا دل نہیں مانتا۔ باہر نکل کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے لگتے ہیں اور لڑائی کو بھول جاتے ہیں۔

کچھ دن ہوئے تو انھوں نے خبریں سنیں کہ توپ کے گولے پڑے ایک دو نہیں بہت سے مکان گر پڑے۔ وہ جانتے ہیں کہ مکانوں میں بڑوں کے ساتھ بچے بھی رہتے ہیں۔ ان کا دل دھک سے ہو گیا۔ اُن کے ہنستے کھیلتے ساتھی بے قصور مار دیئے گئے غصہ آیا کہ ہم کھیلتے بچوں کو مارنے والوں سے بدلہ لیں گے۔ اپنی کرکٹ کو تو یاد آئی۔ جن سے کٹّی ہو گئی تھی اُن کے ساتھ دوبارہ کھیلنے کی خوشی یاد آئی۔ سوچا لڑائی تو اچھی نہیں بند ہونی چاہیئے۔

دنیا کے سبھی بچے جانتے ہیں کہ لڑائی اچھی نہیں۔ بند ہونی چاہیے۔ ہمیں لڑنا نہیں ملنا چاہیئے۔ انگلستان کا ایک علاقہ 'ویلز' کہلاتا ہے۔ وہاں کے بچوں نے اپنے ریڈیو سے براڈکاسٹ کیا سُنیئے کیسے پیارے بول ہیں:-





" یہ ویلز ہے! ویلز کے لڑکے لڑکیاں ایک بار پھر تمام قوموں کے لڑکوں، لڑکیوں کو بلا اور سُنا رہے ہیں۔

" ہم جانتے ہیں کہ ہم ایسی دنیا میں رہتے ہیں جو ڈر اور خطروں سے پُر ہے۔ ہم نے خوفناک ایٹم بم کے متعلق سُنا ہے جو انسانی تہذیب کو مٹا سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ ایسے ہتھیاروں سے جو نوعِ انسان کو مٹا سکتے ہیں کہیں زیادہ طاقت ور چیزیں بھی دنیا میں ہیں۔ دماغ، روح، بھروسہ اُمید اور محبت۔ ہم کو اس بات کی خوشی ہے کہ ابھی دنیا میں بہت سی باتیں ہیں جو انسانی حوصلہ کو للکارتی ہیں۔ بہت سی تازہ، زوردار، بے باک، تخلیقی باتیں۔ ہم ان سب نئی طاقتوں کا استقبال کرتے ہیں جو تمام قوموں کو اتنا قریب لا رہی ہیں کہ ایک دن وہ ایک بڑے کُنبے کے ممبر بن جائیں۔

" ہم جو ویلز میں ہیں خاص طور سے یونیسکو[1] کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہم امن کے متعلق اور کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ یہ کہ ہم دنیا بھر کے نوجوانوں میں دوستی پیدا کرنے اور دنیا کی تمام قوموں کی باہمی امداد کے بڑے کام میں کس طرح اس کی مدد کر سکتے ہیں۔

" تمام قوموں کے لڑکو اور لڑکیو! آؤ ہم سب کروڑوں سب ہی

۱؎ آپ نے اقوام متحدہ کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ یونیسکو اسی کی شاخ ہے جو تعلیم، سائنس اور کلچر کے ذریعہ دنیا کی قوموں میں بھائی چارہ اور ساتھ مل کر کام کرنے کی لگن لگاتی ہے۔

کے دوست ہو جائیں اور دشمن کسی کے نہ رہیں۔"

آپ نے ان بچوں کی پیاری باتیں پڑھیں۔ اب جاپانی بچی کے سُریلے بول سنیے اب سے بیس برس پہلے بھیانک لڑائی ختم ہوئی۔ اس میں جاپان پر ایٹم بم گرایا گیا تھا جس نے ہزاروں ننھے ہنستے کھیلتے بچوں کو منٹوں میں جلا کر راکھ کر دیا۔ جاپان پر بم گرانے والے جہاز ملک آسٹریلیا کے اڈے سے اُڑ کر جاپان جاتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک جہاز سے گولا گرا۔ جاپانی لڑکی ہاگی ڈہی کی انورا کا گھر برباد ہوا۔ سید ہاہات بھی جل گیا۔ آگ نے ہات تو جلا دیا مگر انسانی محبت کا جوالا مکھی پھٹ پڑا۔ اُس نے لکھا:-

"آسٹریلیا میں کسی لڑکی کے نام

"مجھے ڈر ہے کہ تم اس خط کو لینا اور جواب دینا پسند نہ کرو گی کیوں کہ میں جاپانی ہوں۔ پھر بھی اُمید کرتی ہوں کہ شاید ایسا نہ ہو۔

"میں تمھاری دشمن نہیں ہوں۔ شاید ہمیں اس سے ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملے کہ میں تم کو بتاؤں کہ میں نے مصیبت جھیلی ہے۔ میرے تین بھائی سو رہے ہیں (مار دیے گئے) اور میرا گھر! وہ تو جل گیا ہے۔ اس سارے ظلم، نفرت اور کھوٹ کے بعد بھی کیا ہم ایسا ڈول نہیں ڈال سکتے کہ دنیا کے دیسوں میں امن، شانتی و خوش حالی ہو۔ میں چاہتی ہوں ایسا ہی ہو۔

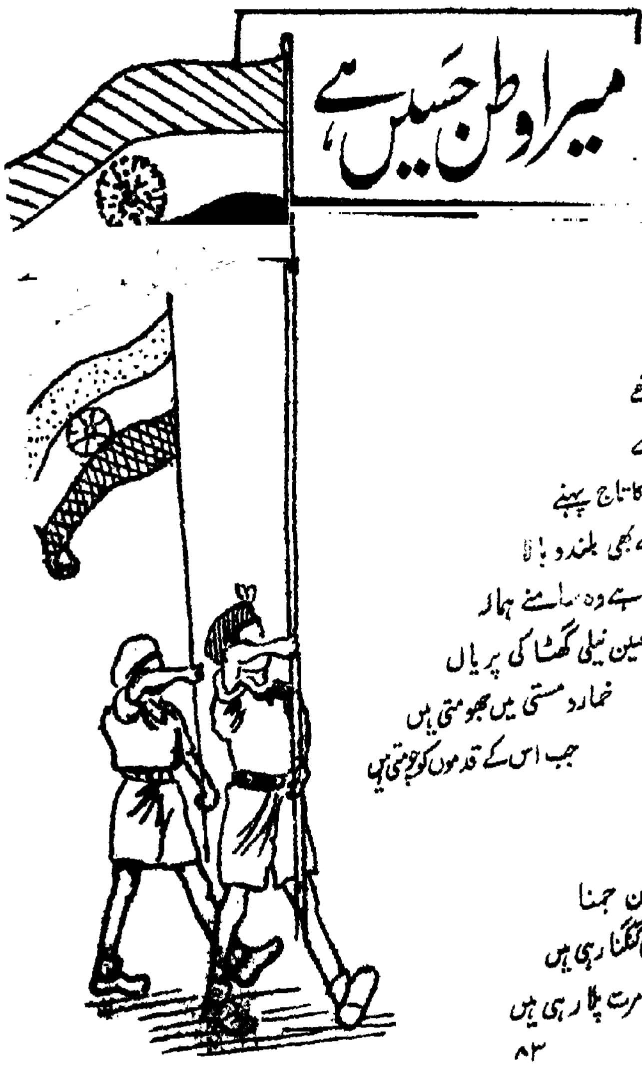
"لڑائی سے جھلسے ہوئے ملک میں بھی (میرا ملک بھی تو اس سے جھلسا ہوا ہے) بہار تو ایک دن ضرور ہی آئے گی یہ تو آئی دکھائی دیتی ہے۔ بیریوں میں پھول ہیں اور دوسرے پیڑوں میں پھل لگ رہے ہیں۔ ان سے خوشی اور زندگی کی گرمی پیدا ہو گی (نفرت کی سرد مہری نہیں) ہم ایسا ڈول ڈالیں کہ بہار کسی ایک ملک ہی میں نہ ہو بلکہ سارے سنسار میں ہو۔

"کیا تم میری بات مانو گی کہ میں یہ خط قلم سے نہیں اپنے دل سے لکھ رہی ہوں۔"

(باقی ص ۱۶۷ پر)

جناب تاج مہجور

میرا وطن حسین ہے



مری نگاہوں سے کوئی دیکھے
مرا وطن کس قدر حسین ہے
سفید پھولوں کا تاج پہنے
خیال سے بھی بلند و بالا
کھڑا ہے وہ سامنے ہمارے
حسین نیلی گھٹا کی پریاں
خمار مستی میں جھومتی ہیں
جب اس کے قدموں کو چومتی ہیں

مری نگاہوں سے کوئی دیکھے
مرا وطن کس قدر حسین ہے
عظیم گنگا حسین جمنا
رواں رواں گنگنا رہی ہیں
زمیں کو امرت پلا رہی ہیں

کھلے ہیں کانٹے بھی پھول بن کر
بہار ہر سو مچل رہی ہے
زمیں سونا اگل رہی ہے

مری نگاہوں سے کوئی دیکھے
مرا وطن کس قدر حسیں ہے

یہ ارضِ گوتم یہ ارضِ گاندھی
یہ ارضِ نانک یہ ارضِ چشتی
یہ بستی رشیوں کی صوفیوں کی
ہے اب بھی مدھوبن کے راستوں میں
سلونے کانہا کے دل کی دھڑکن
سجیلی رادھا کا باورا من

مری نگاہوں سے کوئی دیکھے
مرا وطن کس قدر حسیں ہے

سما گئی ہے دلوں کی دھڑکن
کہیں ایلورا کی مورتوں میں
اجنتا کی صورتوں میں
جو چشمِ اُلفت میں کپکپایا
وہ اشک بھی تاج بن گیا ہے
ہنر کی معراج بن گیا ہے

مری نگاہوں سے کوئی دیکھے
مرا وطن کس قدر حسیں ہے



جناب درگا پرساد شاد سلطانپوری

راکھی بھائی

کردار

۱۔ رضیہ : ایک لڑکی جو آٹھویں میں پڑھتی ہے۔ شوخ اور چنچل۔ عمر تقریباً دس سال۔

۲۔ دیپک : رضیہ کا راکھی بھائی، رضیہ کے ساتھ ہی پڑھتا ہے۔ دیپک بھی رضیہ کی طرح شریر ہے۔ رضیہ کا راکھی بھائی ہونے کی وجہ سے رضیہ کا بہت خیال رکھتا ہے۔

۳۔ توتا رام جی : پنڈت جی عمر تقریباً ۶۰ سال۔ تاریخ پڑھاتے ہیں۔ توتا رام جی ان کا اصلی نام نہیں ہے۔ لڑکے ان کو چڑھانے کے لیے اس نام سے پکارتے ہیں۔

۴۔ پرنسپل صاحب : بہت سنجیدہ اور خوش اخلاق۔ ہر معاملے کو ہنس کر سلجھانا جانتے تھے۔ عمر تقریباً ۴۵ سال۔

۵۔ خلیل : ضمنی کردار۔

۶۔ جلیل : خلیل کا بھائی، جو خلیل کے ساتھ پڑھتا تھا۔

۷۔ بالا رام : چپراسی۔

(اور بہت سے بچے)

پہلا سین

(گھنٹے بجنے کی آواز — ایک، دو — تین
چار، پانچ، چھ — لڑکوں کا دوڑتے ہوئے
کلاس میں آنا — کرسیوں کے اُٹھانے بٹھانے
کی آواز —)

دیپک : بھائیو — خاموش — باادب
ہوشیار — شری شری توتا رام جی تشریف
لارہے ہیں۔ (پکار کی طرح)

(توتا رام جی کا درجے میں داخل ہونا اور
گرجنا —)

توتا رام جی : کون شور مچا رہا تھا کلاس میں
— کون کہہ رہا تھا کہ توتا رام جی تشریف
لارہے ہیں (نقل کرنے کی آواز سے
غصّے کے ساتھ پھر سنبھلتے ہوئے —)
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ مجھے توتا رام
کیوں کہتے ہو — میرا نام توتا رام کب
ہے؟ — تم لوگوں میں کوئی میرا اصلی
نام جانتا ہے۔

رضیہ : میں جانتی ہوں —

توتا رام جی : شاباش — کیا نام ہے میرا
رضیہ بیٹی —

رضیہ : آپ کا نام — آپ کا نام ہے —

توتا رام جی : ہاں ہاں بتاؤ — ڈرو نہیں —

رضیہ : سر — سر آپ کا نام ہے۔

توتا رام جی : بولو۔ بولو — شرماؤ نہیں۔

رضیہ : آپ کا نام ہے (جلدی سے) توتا رام...

توتا رام جی : (آپے سے باہر ہوکر) کیا کہا —
یو گیٹ آوٹ، میں کہتا ہوں — کہتا
نہیں حکم دیتا ہوں کہ سیدھے باہر نکل جا
کلاس سے — ورنہ میں تیری پٹائی کر
دوں گا — تو بھی بہت بدتمیز ہو گئی
ہے —

رضیہ : تو میں جاؤں سر (اطمینان سے)

توتا رام جی : بالکل نکل جا — ورنہ ہاں —

(پھر تھوڑی دیر کے بعد) بچّو! حاضری دو۔

(توتا رام جی کا حاضری لینا)

توتا رام جی : رام منوہر۔

رام منوہر : یس سر۔

توتا رام جی : خلیل۔

خلیل : یس سر۔

توتا رام جی : لطیف

لطیف : یس میڈم۔

توتارام جی : لطیف۔ کھڑے ہو جاؤ ــــ کیا کہا
تونے ــ یس میڈم ــ ارے کبوتر میں میڈم
ہوں! ــ یعنی کہ میں تجھے میڈم نظر آتا ہوں؟
میری چُٹیا تجھے چوٹی معلوم ہوتی ہے اور
یہ دھوتی تجھے ساری نظر آتی ہے ــــ؟
گیٹ آوٹ، گیٹ آوٹ ــــ فوراً نکل
جاؤ ــ

توتارام جی : مس رضیہ۔

رضیہ : یس سر۔

توتارام جی : ارے تو پھر گھس آئی درجے میں،
میں نے تو تجھے باہر نکال دیا تھا؟

رضیہ : میں باہر گئی تو تھی سر۔

توتارام جی : پھر کیسے اندر آگئی؟

رضیہ : پھر کیسے واپس آگئی ــــ بتاؤں؟

توتارام جی : ہاں بتاؤ۔ فوراً بتا دیر نہ کر۔

رضیہ : اس دروازے سے نکل کر گئی تھی اور
اس دروازے سے اندر آگئی۔

توتارام جی : کب آگئی؟

رضیہ : جب آپ سر نیچا کیے ہوئے حاضری لے
رہے تھے اور لطیف سے الجھے ہوئے تھے۔

توتارام جی : تو اس طرح سے آپ واپس آگئیں،
ارے بے وقوف میں پوچھ رہا ہوں کہ تو
کیوں واپس آگئی اور خاص طور سے جب
میں نے تجھے سزا دی تھی۔

رضیہ : سزا آپ نے مجھے کیوں دی تھی یہ تو بتایئے
پہلے ــــ

توتارام جی : اچھا تو اب تجھے سزا دینے کی وجہ
بھی بتانا ہوگی۔ تو نے جو بدتمیزی کی۔

رضیہ : سر میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی مجھ سے
زیادہ تمیزدار اس اسکول میں ہے ہی
کون۔ (لڑکوں کا ہنسنا)

توتارام جی : اچھا بتا تو نے مجھے توتا رام جی
کیوں کہا تھا؟

رضیہ : میں یہ بھی بتاؤں گی اور آپ پوچھیں تو
میں یہ بھی بتاؤں کہ سب لڑکے آپ کو
توتارام کیوں کہتے ہیں۔

توتارام جی : جلدی بتا ــــ

رضیہ : آپ کی آواز بالکل توتے کی طرح ہے
(لڑکوں کا ہنسنا)

توتارام جی : خاموش.... اور

رضیہ : آپ کے ہونٹ توتے کی چونچ کی طرح نکیلے
ہیں۔ اور آپ اڑتے بھی ہیں ۔میرا مطلب

ہے آپ رٹتے بھی ہیں ایک بات کو توتے

کی طرح۔ اور —

توتا رام جی: اور کیا

رضیہ: اور سب سے بڑی وجہ لڑکوں کے چڑھانے

کی یہ ہے کہ آپ تاریخ کا مضمون کچھ اس

طرح پڑھاتے ہیں کہ ہم لوگ بھول جاتے ہیں۔

سب بچے: بالکل ٹھیک۔

توتا رام جی: اچھا میں خراب پڑھاتا ہوں —

میں بالکل توتے کی طرح نظر آتا ہوں —؟

نکل — بھاگ جا کلاس سے — نالائق

ہے۔ ارے بدھو اپنے استاد کی عزت کرنا

سیکھ —

رضیہ: اچھا جانی بدل۔

(قدموں کی آواز)

توتا رام جی: ہاں ہاں — جا —

(تھوڑے وقفے کے بعد)

توتا رام جی: اچھا بچو نکالو تاریخ کی کتاب۔

تم سب لوگ کتاب لائے ہو نا؟

سب بچے: جی ہاں۔

توتا رام جی: اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ شاہجہاں کس

کا بیٹا تھا — تم بتاؤ دیپک۔

دیپک: شاہجہاں کس کا بیٹا تھا؟

توتا رام جی: ہاں یہی پوچھ رہا ہوں۔

دیپک: شاہجہاں بیٹا تھا اور بہت پیارا بیٹا

تھا اپنے ماں باپ کا۔

(سب بچوں کا ہنسنا)

توتا رام جی: ارے گدھے۔ اپنے ماں باپ کے

تو سبھی بیٹے ہوتے ہیں۔ میرا مطلب اس

کے باپ کے نام سے ہے — ہائیں یہ

تیری ڈیسک پر کیا ہے۔

دیپک: جھولا۔

توتا رام جی: اور یہ جھولا اُچک کیوں رہا ہے۔

دیپک: اچک کیوں رہا ہے؟ — اُچکتا کہاں

ہے سر؟ یہ تو جھولا ہے

توتا رام جی: اچھا جی۔ یہ جھولا ہے — یہ تو میں

بھی جانتا ہوں۔ یہ بتا کہ یہ اُچک کیوں

رہا ہے؟

دیپک: کہاں سر۔ یہ دیکھیے بالکل نہیں اُچکتا

— اس میں کچھ نہیں ہے۔ (جھولے پر ہاتھ

رکھ کر)

توتا رام جی: اچھا ابھی بتاتا ہوں کہ اس میں کچھ

نہیں ہے۔

دیپک : سر، سر۔

توتارام جی : اس میں ہے (جھولا کھولنا اور توتے کا اڑنا)

سب بچے : توتا ـــــ

توتارام جی : تم سب بدتمیز ہو میں اسے بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ تم سب نالایق ہو ـــ گدھے ہو ـــ (یہ کہتے ہوئے توتا رام جی کا باہر نکلنا اور گھنٹے کا بجنا)

پرنسپل : کیا بات ہے پنڈت جی (توتارام جی) لڑکوں پر اتنا کیوں برہم ہو رہے ہو آج ـــ

توتارام جی : سر، میں آپ ہی کے پاس آرہا تھا۔ اچھا ہوا آپ مل گئے۔

پرنسپل : کیا بات ہے۔

توتارام جی : میں اس کلاس کو نہیں پڑھا سکتا۔ مجھے آپ مہربانی کرکے کوئی دوسرا کلاس دیدیجیے۔ میری ناک میں دم کر دیا ہے ان بچوں نے۔

پرنسپل : کیا بات ہوئی پنڈت جی یہ بھی تو بتائیے۔

توتارام جی : اب کیا بتائیں آپ سے۔ نہ جانے کیوں اس دیپک کے لڑکے مجھے توتارام کہہ کر پکارتے ہیں۔ میں آج تک ٹالتا گیا کہ بچے ہیں چلو جانے دو ـــ اب ان بچوں سے کون مفت میں الجھے لیکن آج تو ان لوگوں نے کمال ہی کر دیا۔ آپ انھیں سزا دیجیے۔

پرنسپل : سزا بھی دوں گا لیکن پہلے ان کا جرم تو بتائیے پنڈت جی

توتارام جی : وہ جو دیپک ہے نا۔ وہ آج توتا لے کر کلاس میں آگیا۔ صرف مجھے چڑھانے کے لیے

پرنسپل : سچ سچ توتا لے کر آگیا؟ ـــ پنڈت جی آپ مذاق کر رہے ہیں ـــ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا (رک کر) توتا کہیں سے اڑ کر آگیا ہوگا۔

توتارام جی : سر، میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں۔

پرنسپل : اچھا چلیے دفتر میں بتائیے کیا ہوا۔ یہاں ایسی باتیں کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

(قدموں کی آواز ـــ دونوں کا آفس میں آنا ـــ)

پرنسپل (گھنٹی بجا کر) بالارام ـــ

بالارام : کیا ہے سر۔

پرنسپل : بالارام دیکھو پہلے ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے کر آؤ اور پنڈت جی کو پلاؤ۔

توتارام جی: مجھے پیاس بالکل نہیں ہے۔

پرنسپل: خیر! پانی پی کر ٹھنڈے دماغ سے بتایئے کہ کیا ہوا مجھے آپ کی باتوں پر یقین نہیں آرہا ہے۔

(توتارام کا پانی پینا ——— پانی پینے کی آواز ـ گلاس کا رکھنا۔)

توتارام جی: کہنا یہ ہے کہ دیپک جو لڑکا ہے۔

پرنسپل: وہی گھنگھرالے بالوں والا لڑکا۔

توتارام جی: جی ہاں۔

پرنسپل: دیکھنے میں تو وہ سیدھا معلوم ہوتا ہے۔

توتارام جی: صاحب دیکھنے میں سیدھا ہوگا، لیکن بہت شرارتی ہے ——— آج وہی ایک توتا جھولے میں لے کر آگیا۔

پرنسپل: اُسے توتا پالنے کا شوق ہوگا۔ اکثر بچوں کو یہ شوق ہوتا ہے۔

توتارام جی: نہیں صاحب۔ وہ جان بوجھ کر لایا تھا۔ مجھے پریشان کرنے کے لیے۔

پرنسپل: تو پھر بات کیا ہوئی آپ تو یہ بتایئے۔

توتارام جی: میں نے دیکھا کہ اس کے ڈیسک پر ایک جھولا اُچک رہا ہے۔

پرنسپل: پھر کیا ہوا۔

توتارام جی: پھر میں نے پوچھا کہ اس جھولے میں کیا ہے ———

پرنسپل: اور اس نے کہا کچھ نہیں۔

توتارام جی: جی ہاں۔ میں نے کئی بار پوچھا لیکن وہ شرارت کرتا رہا ——— پھر ———

پرنسپل: پھر آپ نے جھولا کھولا۔

توتارام جی: جی ہاں۔

پرنسپل: اور اس میں سے نکلا توتا ——— یہی نا۔

توتارام جی: بالکل یہی ہوا۔

پرنسپل: یہ تو کوئی خاص بات نہیں ——— دیپک کی کیا غلطی ہوئی؟

توتارام جی: کوئی خاص بات نہیں ہے! پورے کلاس کے سامنے میری ہنسی ہوئی۔

پرنسپل: ہنسنے والی بات پر لڑکوں کا ہنسنا لازمی ہے ———

توتارام جی: دیپک کو بلا کر اسے سزا دیجیے۔ اس نے بدتمیزی کی ہے اسے اسکول سے نکال دیا جائے۔ میں ایسی بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر اس سے انڈسپلن پھیلنے کا ڈر ہے۔ میں کہتا ہوں اس لڑکے نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔

پرنسپل: اور اگر وہ آپ سے معافی مانگ لے تو ــــ؟

توتارام جی: معافی مانگنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں اُسے کئی بار معاف کر چکا ہوں۔

(پرنسپل کا رِنگ کرنا اور بالا رام کو بلانا)

بالا رام: کیا حکم ہے سرکار ــــ

پرنسپل: بالا رام جاؤ دیپک کو آٹھویں کلاس سے بلا لاؤ۔

بالا رام: اچھا حضور ــــ

(گھنٹے کے بجنے کی آواز) تیسرا سین۔

پرنسپل: کیوں دیپک تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟

دیپک: جھولا ہے سر۔

پرنسپل: یہ تمہاری ڈیسک پر تھا۔

دیپک: یس سر۔

پرنسپل: اور پنڈت جی کے کھولنے پر اس میں سے ایک توتا نکلا۔

دیپک: یس سر۔

پرنسپل: تو پنڈت جی کی سب باتیں سچ ہیں۔

دیپک: یس سر۔

توتارام جی: دیکھ لیا سرکر میں ایک ایک لفظ صحیح بول رہا تھا۔ اب یقین آیا آپ کو۔

پرنسپل: اچھا آپ جاکر کلاس لیجیے۔ میں اس کو اسکول سے نکال کر دم لوں گا۔ اس قسم کی بدتمیزی مجھے خود پسند نہیں ہے۔ اس لڑکے نے عجیب بات کی ہے۔ اپنے استاد کی بے عزتی۔

(توتا رام جی کا باہر نکلنا اور راستے میں رضیہ کا ملنا۔)

رضیہ: سر دیپک کہاں ہے؟

توتارام جی: (ہنستے ہوئے) وہ پرنسپل کے پاس کھڑا ہے۔ وہ اب اسکول میں نہیں رہ سکتا۔ آج اسے ٹی۔ سی مل جائے گی۔

رضیہ: ٹی۔ سی اور دیپک کو ملے گا؟

توتارام جی: بدتمیز نے کلاس کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اور اب تمہارا نمبر ہی آنے والا ہے۔

(دوڑنے کی آواز)

رضیہ: مے آئی کم اِن سر۔

پرنسپل: یس کم اِن۔

رضیہ: سر۔

پرنسپل: کیا بات ہے۔

رضیہ: کیا آپ نے دیپک کو نکال دیا۔ میرے کہنے کا مطلب ہے اُسے آپ نے ٹی۔ سی دے دیا (ہانپتے ہوئے)

پرنسپل: ابھی نکالا تو نہیں ہے — لیکن اسے مجھے نکالنا ہی پڑے گا۔ دیپک نے اپنے استاد کے ساتھ بہت بدتمیزی کی ہے۔ اسے اس کی سزا تو ملنی ہی چاہیے۔

رضیہ: (سسکنا) سر۔

پرنسپل: لیکن تم کیوں رو رہی ہو۔

رضیہ: (روتے ہوئے) سر دیپک کو نہ نکالیے اس کے بدلے مجھے نکال دیجیے۔

پرنسپل: تمھیں نکال دوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ غلطی تو اس نے کی ہے۔

رضیہ: سر توتا لے کر میں آئی تھی۔ جھولا میرا ہے۔

پرنسپل: توتا لے کر تم آئی تھی؟ لیکن دیپک کہتا ہے کہ توتا لے کر وہ آیا ہے۔ اور جھولا اس کا ہے۔

رضیہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ جھولا میں لائی تھی۔ پنڈت جی نے جب مجھے باہر نکال دیا تھا تو میں نے جھولا دیپک کے پاس رکھ دیا تھا۔

(گھنٹے کا بجنا —)

(سین کا بدلنا)

توتا رام جی: بچو! یہ چھٹا پیریڈ ہے اس میں تمھیں کیا پڑھنا ہے۔

سب بچے: (ایک ساتھ) ہسٹری، جغرافیہ —

توتا رام جی: یہ مضامین بہت مشکل ہیں — ہیں نہ مشکل —

سب بچے: بہت مشکل ہیں سر — (سب ایک ساتھ)

توتا رام جی: ان کے بارے میں کیا مشہور ہے۔

سب بچے: ہسٹری جاگرفی بڑی بے وفا
رات بھر رٹو سویرے صفا

(قدموں کی آواز — پرنسپل کا کلاس میں داخل ہونا)

پرنسپل: بالکل جھوٹ —

سب بچے: جھوٹ؟ —

پرنسپل: ہاں بچو! — یہ مضامین بہت آسان ہیں، اور دلچسپ بھی ہیں۔

سب بچے: مگر پنڈت جی نے تو یہی بتایا ہے۔

پرنسپل: کیوں پنڈت جی آپ نے یہی بتایا ہے بچوں کو —

توتا رام جی: (گھبرا کر) جی سر، جی سر۔

سب بچے (ہنستے ہیں)

پرنسپل: خاموش، خاموش۔

بچو! تاریخ اور جغرافیہ دونوں مضامین بڑے ہی دلچسپ ہیں، اور آسان بھی دل

لگا کر پڑھو اور یاد کرو تو دونوں یاد ہو جاتے
ہیں ۔۔۔ اور ہاں پنڈت جی میں نے دیپک
کو معاف کر دیا ہے۔

توتارام جی: معاف کر دیا آپ نے اس کو ۔۔۔
کیوں سر ۔۔۔!

پرنسپل: وہ نردوش ہے۔ توتا تو رضیہ لائی تھی۔

توتارام جی: پھر رضیہ کو سزا ملنی چاہیے۔

پرنسپل: رضیہ کو میں نے ایمانداری کی وجہ سے
معاف کر دیا۔ اس نے ایمانداری کے ساتھ
سب واقعہ صاف صاف بیان کیا۔ اس لیے۔

توتارام جی: تو آپ نے دونوں کو معاف کر دیا؟

پرنسپل: ہاں دونوں نے معافی مانگ لی۔ اب یہ
آپ کو نہیں کہیں گے۔

توتارام جی: نہیں کہیں گے۔ کیا نہیں کہیں گے۔
(پریشانی اور حیرت کے ساتھ)

سب بچے: توتارام ۔۔۔ (سب ایک ساتھ)

پرنسپل: خاموش۔ کل سے تم لوگوں کی کوئی شکایت
میرے پاس نہ آئے ۔۔۔
(قدموں کی آواز۔)
(گھنٹوں کا بجنا اور بچوں کا کلاس سے
باہر نکلنا)

(اس شور میں رضیہ کا دیپک سے باتیں کرنا)

رضیہ: دیپک کل تم گھر پر ہی رہنا۔ میں آؤں گی
سویرے ۹ بجے۔

دیپک: کیوں رضیہ؟ کیا بات ہے۔

رضیہ: مٹھائی کھلانے۔

دیپک: مٹھائی؟ کس بات کی؟

رضیہ: دیپک تم بالکل بدھو ہو۔۔۔ ارے
کل راکھی ہے نا ۔۔۔

دیپک: تو تم راکھی باندھنے آؤ گی کل ۔۔۔

رضیہ: اور کیا ۔۔۔ اچھا میری بس جا رہی ہے
میں جاتی ہوں (دوڑنے کی آواز ۔۔۔)
ٹا ٹا ۔۔۔ ٹا ٹا ۔۔۔

(موٹر کے جانے کی آواز)

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ بھوپال)

(بقایا صفحے کا)

اس کا سبب معلوم کریں۔ انھوں نے ایک روز اس کا پتہ چلا ہی لیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے اور اس روشن مرکز کے درمیان بہت سے بادل ہیں اور انھوں نے اس منظر کو ہم سے چھپا لیا ہے جو کہکشاں کا سب سے زیادہ حسین اور نظر فریب منظر ہے۔

محترمہ ہاجرہ بیگم

پاگل خانہ

تین جلاہے دیکھا سٹے — دن بھر بیٹھے کپڑا سیتے
ہاتھ سے بیٹ کچھ کر نہ پاتے — اپنا اپنا گانا گاتے
ایک جلاہا تان لگائے — اور دوسرا ڈھول بجائے
تیسرا وہ بلائے — کسی سے کچھ نہ آئے
گھر کے پیچھے تانا بانا — گاتے اپنا اپنا گانا
تینوں جلاہے تن نہ پاتے — سارا دن گاتے بتاتے

ان تینوں کا سن کر گانا
لگتا یہ ہے پاگل خانہ

ہاجرہ

آپ ہی کی شیروانی ہے

جناب مرزا شکور بیگ حیدر آباد

امیر بھائی اور غریب بھائی دو دوست تھے۔ امیر بھائی مالدار تھے مگر اوچھے تھے۔ غریب بھائی غریب تھے مگر خوددار تھے۔ باوجود اس کے دونوں میں بہت محبت تھی اکثر ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ دونوں کو ایک صاحب نے کھانے کی دعوت دی۔ دعوت کے دن امیر بھائی نے کہا "غریب دعوت میں کتنے بجے چلو گے۔ غریب بھائی نے جواب دیا "میں نہیں جاؤں گا۔"

امیر بھائی نے پوچھا "کیوں نہیں"۔ غریب بھائی نے کچھ بات بنادی۔ پھر امیر بھائی کے اصرار پر کہا کہ میری شیروانی پھٹی ہوئی ہے۔ میں نہیں چلوں گا۔ امیر بھائی نے کہا "واہ وا یہ بھی کوئی بات ہے۔ میرے ہاں کئی شیروانیاں ہیں تم جونسی چاہو پسند کر لو۔ دعوت کے بعد لوٹا دینا۔ مگر چلو ضرور" غریب بھائی نے مجبوراً ایک شیروانی پہن لی۔ اس احسان کا شکریہ ادا کیا۔ دعوت کی جگہ قریب تھی۔ شام کا سہانا وقت تھا۔ دونوں پیدل ہی روانہ ہوئے۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ غریب بھائی کے ایک دوست نے دیکھا اور کچھ قریب آکر کہا "کیا غریب بھائی ہیں؟" ابھی غریب بھائی جواب بھی دینے نہ پائے تھے کہ امیر بھائی کہنے لگے جی ہاں غریب بھائی ہیں مگر شیروانی میری ہے۔ غریب بھائی کے دوست ہنسنے لگے۔ غریب بھائی کو سخت ناگوار گزرا۔

جب وہ دوست باتیں کرکے چل دیے تو غریب بھائی نے امیر بھائی سے شکایتی لہجہ میں کہا کہ بھائی شیروانی میری ہے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے آپ سے شیروانی مانگی تو نہیں تھی آپ نے خود ہی پہننے کے لیے دی تھی پھر اس کا بے موقع اظہار کیوں کیا۔ امیر بھائی نے کہا۔ بھئی میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی۔ خیر معاف کر دیجیے اب ایسا نہ ہوگا۔

غریب بھائی نے معاف کر دیا مگر اندر ہی اندر کڑھتے رہے۔ کچھ آگے بڑھے تھے کہ ایک اور ملاقاتی ملے اور پوچھا" غریب بھائی کیا دعوت کا ارادہ ہے"۔ پہلے کی طرح غریب بھائی سے پہلے ہی امیر بھائی بول اٹھے "جی ہاں دعوت کا ارادہ ہے اور شیروانی بھی انہی کی ہے" غریب بھائی کے دوست ہنسنے لگے۔ اور غریب بھائی جل گئے۔ جب وہ دوست چلے گئے تو غریب بھائی نے کچھ بگڑ کر امیر بھائی سے کہا کہ پھر آپ نے شیروانی کا ذکر کیا۔ میں اسے ابھی اتارے دیتا ہوں مجھے آپ کی شیروانی کی ضرورت نہیں۔ امیر بھائی پھر منت سماجت کرنے لگے کہ بھئی پہلے شیروانی کو میں نے اپنی کہا تھا تو آپ بگڑ گئے تھے۔ اس لیے میں نے اس دفعہ یہ کہہ دیا کہ یہ آپ ہی کی ہے پھر بگڑنے کی کیا بات ہے۔ غریب بھائی نے کہا کہ کس نے آپ سے پوچھا تھا کہ شیروانی کس کی ہے۔ آپ شیروانی کا ذکر ہی کیوں کرتے ہیں۔ امیر بھائی نے معافی مانگ لی۔ بات گئی گزری ہوئی

اب دعوت کا مقام قریب آرہا تھا یہاں بھی دکھائی دے رہے تھے کہ غریب بھائی کے ایک روشناس ملے اور کہنے لگے غریب بھائی الگ الگ دعوت کو چلے۔ یہ سن کر ہمیشہ کی طرح امیر بھائی پھر کہہ اٹھے "ہاں بھئی دعوت کو الگ الگ تو جا رہے ہیں مگر شیروانی کا تو ذکر ہی نہیں کر سکتے"۔ یہ سن کر غریب بھائی کے تن بدن میں آگ لگ گئی، صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ شیروانی اتارتے ہوئے کہنے لگے میں آپ کے احسان سے باز آیا۔ آپ کی شیروانی آپ کو مبارک میں دعوت میں نہیں جاؤں گا۔ اگر گیا بھی تو بغیر شیروانی کے جاؤں گا۔ امیر بھائی نے کہا بھئی خفگی کی اب کیا وجہ ہے۔ آپ سے بڑی مشکل ہے میری شیروانی کو میں نے اپنی کہا تو آپ بگڑ گئے۔ میری شیروانی کو آپ کی کہہ دیا تو بھی آپ ناراض ہوئے۔ اب آپ کے منع کرنے سے شیروانی کا کچھ ذکر ہی نہیں کیا تو بھی آپ خفا ہو رہے ہیں۔ وہ لاکھ سمجھاتے تھے مگر غریب بھائی نے شیروانی اتار ان کے حوالے کر دی اور مرزا کا یہ مقطع گنگناتے ہوئے اپنے گھر لوٹ گئے۔

اللہ ہمیں محفوظ رکھے احسان سے اوچھوں کے مرزا
اک بار اگر احسان کیا سو بار جتایا کرتے ہیں

جناب شرف رحمانی

درس

ہو بصیرت تو ذرّے ذرّے سے
کچھ نہ کچھ ہم کو درس ملتے ہیں
راز کیا اس میں ہے یہ غور کرو
روز کانٹوں میں پھول کھلتے ہیں

تیز آندھی ہو سخت بارش ہو
پھول ڈالی پہ ہنستے رہتے ہیں
کس تحمل سے کس دلیری سے
ہو کے خوش زحمتوں کو سہتے ہیں

پست ہمت ذرا سے دکھ میں بھی
زیست کو تلخ تر بناتے ہیں
اشک باری سے کام لے لے کر
ورطۂ غم میں ڈوب جاتے ہیں

اہلِ ہمت تو پھول کی مانند
رنج و غم میں بھی مسکراتے ہیں
سامنے آئے جو غموں کا پہاڑ
چٹکیوں میں اسے اڑاتے ہیں

آگ میں تپ کے جس طرح سونا
دیکھیے کس قدر نکھرتا ہے
سوزِ غم میں اسی طرح گھُل کر
اے شرف آدمی سنورتا ہے

۱ دانائی، ہوشیاری، بینائی ۲ سبق ۳ بھید ۴ زندگی ۵ کڑوا ۶ آنسو بہانا یعنی رو رو کر ۷ بھنور، غم کی بھنور

جناب محمد اکبر الدین صدیقی

مہاراجہ سرکشن پرشاد

چالیس بیالیس سال گذرے ہیں میلاد النبی کا جلسہ ختم ہونے کے بعد مکہ مسجد سے باہر نکلا ۔ یکایک "راجہ دے ۔ راجہ دے" کی آوازیں آنے لگیں فقیروں کے ہجوم نے ایک بڑی سیاہ رنگ کی موٹر کو گھیر لیا تھا ۔ اس میں حیدر آبادی بناوٹ کی سفید دستار پہنے ایک مرد بزرگ کچھ جھکے ہوئے ڈرائیور کے بازو کی بنچ پر بیٹھے تھے اور ان کا ہاتھ باہر نکل کر اٹھنیاں ، چونیاں دوانیاں اور اکنیاں پھینک رہا تھا ۔ میں نے ساتھی سے پوچھا ۔ یہ کون ہیں اس طرح خیرات کرتے جا رہے ہیں ۔ انھوں نے کہا : مہاراجہ کشن پرشاد ۔ ہماری ریاست کے بڑے وزیر ۔ میلاد النبی کے جلسے سے واپس ہو رہے ہیں ۔ وہ ہمیشہ جب بھی کہیں آتے جاتے یا گھر پر ہوتے ہیں تو اسی طرح خیرات کرتے ہیں ۔"

اس کے بعد میں نے سینکڑوں دفعہ مختلف مقامات پر مہاراجہ کو دیکھا اور کچھ بوجھ کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مہاراجہ سے محبت بھی بڑھتی گئی ۔

وہ حیدر آباد کے بڑے وزیر راجہ چندو لال کی بیٹی کی اولاد سے تھے ۔ باپ کا نام ہری کشن اور نانا کا نریندر تھا ۔ وہ ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے اور اپنے نانا کے زیر سایہ فارسی ، عربی ، فقہ ، تفسیر ، منطق اور فلسفہ کی تعلیم پائی ۔ پھکیت ، پٹہ ، بنوٹ گھوڑے کی سواری اور نشانہ بازی بھی سیکھی ۔ بہت دنوں تک ورزش کا بھی شوق رہا ۔ رمل ، نجوم اور جیوتش بھی جانتے تھے ۔ طب کا فن بھی سیکھا ۔ مہاراجہ اپنے نانا راجہ نریندر کے انتقال کے بعد ۱۸۹۳ء میں پیشکار ہوئے اور زمانہ پیشکاری میں جو وزیر کے بعد ریاست کا سب سے بڑا عہدہ تھا مریضوں کو دیکھتے ۔ ان کا علاج کرتے اور اپنے مطب سے مفت دوائیں دیتے تھے ۔ ۱۹۰۱ء میں اعلیٰ حضرت نظام دکن نے مہاراجہ کو اپنا وزیر بنایا ۔ ان کا کام

بہت بڑھ گیا۔ بہت سے مشغلے چھوٹ گئے لیکن مہاراجہ نے شاعروں، عالموں، مشائخوں اور مختلف فنوں کے جاننے والوں سے ملنا جلنا چھوڑا اور نہ شعر کہنے۔ کتابیں لکھنے اور تصویریں اتارنے کا کام چھوڑا۔ وہ اپنے بزرگ نانا راجہ چندو لال کی طرح ادیبوں، شاعروں مشائخوں اور فن کاروں کے بڑے قدر دان تھے۔

مجھے ایسے ایک شخص کا بھی نام معلوم نہیں جو مہاراجہ کا نام سن کر حیدر آباد آیا ہو اور مہاراجہ نے اس کی خاطر داری نہ کی ہو اور روپیہ پیسہ نہ دیا ہو۔ میں نے سنا ہے کہ ترکی، داغ دہلوی، ظہیر دہلوی، جلیل جانشین امیر مینائی، محوی، فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، رتن ناتھ سرشار، نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر، ظفر علی خاں، علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، اور کتنے ہی ایسے بے حساب شعراء ان سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ علامہ اقبال سے تو مہاراجہ کی دوستی بہت گہری تھی۔ مہاراجہ ہندوستان کی تنہا شخصیت ہیں جن کی تعریف میں علامہ اقبال نے قصیدہ کہا ہے۔

مہاراجہ کو اعلیٰ حضرت نظام دکن سے بے حد محبت تھی۔ باتیں کرتے وقت ان کا نام بڑے ادب سے لیتے۔ ان کی مہمان نوازی بہت مشہور تھی اور دسترخوان بہت وسیع تھا۔ مہاراجہ بیکانیر، مہاراجہ میسور، مہاراجہ دھولپور، نواب صاحب خیرپور، نواب صاحب لوہارو، دیوان صاحب دتیا، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور خواجہ حسن نظامی سب ہی آپ کے مہمان رہے ہیں۔

وہ وضع داری، تہذیب، شائستگی اور مروت کے پتلے تھے۔ ان کا مذہب انسانیت تھا۔ انھوں نے کبھی ہندو اور مسلمان کے الفاظ میں بات نہیں کی۔ وہ بڑے نرم دل تھے۔ کسی کی تکلیف نہ دیکھ سکتے تھے۔ کوئی ضرورت مند آتا تو اس کی مدد کرتے، روپیہ پیسہ دیتے اور ضرورت ہوتی تو سفارش بھی کرتے۔ خواجہ حسن نظامی ایک دفعہ حیدر آباد آئے ان کے ساتھ ایک ملازم تھے، میرزا سہراب شاہ۔ یہ بہادر شاہ ظفر کے پہلے ولی عہد کے پوتے تھے جب مہاراجہ کو معلوم ہوا تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ انھوں نے حضور نظام سے سفارش کر کے مرزا صاحب کے نام بیس روپیے ماہوار وظیفہ جاری کرا دیا۔

مہاراجہ کی ڈیوڑھی "ایوان شاد" میں ہر چھٹی تاریخ کو خواجہ اجمیری کی نیاز ہوتی۔ قوالی کی محفل جمتی۔ محرم میں "ایوان شاد" میں علم بٹھائے جاتے اور ذکر شہدا، کربلا کی مجلس ہوتی۔ اس میں حیدر آباد کے سب سے بڑے مقرر نواب بہادر یار جنگ مصائب کربلا بیان کرتے

اور مہاراجہ کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ نکلتی۔

مہاراجہ علم و ادب کے شیدائی تھے۔ اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے اور مضامین بھی لکھتے۔ کئی کتابیں لکھیں ان کی تعداد ساٹھ سے زیادہ ہے۔ اخبار بھی نکالے اور گلدستے بھی چھاپے۔ سینکڑوں مصنفوں کی کتابیں مہاراجہ نے چھپوا دیں۔ جناب عبدالماجد دریابادی نے اپنی ایک کتاب جس کی قیمت آٹھ آنے تھی مہاراجہ کو تحفتاً بھیجی جواب میں مہاراجہ نے دو اشرفی نذر بھیجی۔ ان کی دین کا یہ حال تھا۔

حیدرآباد کے کتنے نوجوانوں کو مہاراجہ کی حوصلہ افزائی نے شاعر اور ادیب بنا دیا۔ ہمارے مقبول شعرا میں میکش مرحوم، سکندر علی وجد اور مخدوم محی الدین نے اچھے شعر پر مہاراجہ سے اشرفیاں وصول کی ہیں۔ وہ جب کبھی نذر دیتے تو سیدھے ہاتھ میں اشرفی لے کر بائیں ہاتھ پر رکھ کر کھڑے ہو جاتے اور شاعر جب اشرفی اٹھا کر جھک کر سلام کرتا تو وہ بھی جھک کر سلام کا جواب دیتے۔

مہاراجہ نے پچاسوں مشاعروں کی صدارت کا فرض انجام دیا ہے۔ پیشکاری کے زمانے میں وزیر بننے کے بعد اور بڑے وزیر ہونے پر بھی وہ صدر رہتے۔ جہاں مشاعرہ ہوتا اکثر سڑک والے بیرونی پھاٹک سے لے کر مشاعرہ کے مقام تک لوگ دائیں بائیں قطار باندھ کر کھڑے ہو جاتے لوگوں کا جہاں ہجوم ہوتا، مہاراجہ وہیں موٹر سے اتر جاتے اور جھک کر سلام کرتے ہوئے پھاٹک میں داخل ہو کر ہال میں آتے اور صدر کی مسند پر کھڑے دس بارہ دفعہ جھکتے ہوئے سلام کر کے بیٹھتے۔ مہاراجہ کے آجانے کے بعد لوگ اتنے خاموش ہو جاتے کہ سوئی گرے تو آواز سن لو، نہ کسی کے سر سے ٹوپی اتری ہوئی نظر آتی۔ نہ محفل میں سگریٹ جلتا۔ نہ ادھم کا ہنگامہ ہوتا نہ غل غپاڑہ، شاعر اپنا کلام پڑھتا۔ حاضرین سے داد حاصل کرتا اور مہاراجہ سے اشرفی۔ تین چار گھنٹے کی یہ باغ و بہار محفل برسوں یاد رہتی۔

مہاراجہ کو بچوں سے بے حد محبت تھی۔ وہ جب کبھی اضلاع میں دورہ پر جاتے تو مدرسوں کا ضرور معائنہ کرتے اور واپس ہوتے وقت طلبا کی تعداد کا لحاظ کرتے ہوئے شیرینی تقسیم کرنے کے لیے پچاس سے دو سو روپے تک عطا فرماتے۔

نواب مہدی نواز جنگ جو تین مہینے پہلے گجرات کی گورنری سے سبک دوش ہوئے ہیں مہاراجہ کے پرائیویٹ سکریٹری رہ چکے ہیں۔ تحریر فرماتے ہیں کہ

"مہاراجہ باہر جانے سے قبل پیشی کی تجوری کا معائنہ کرتے اور یہ اطمینان کر لیتے کہ اس دن کی خیرات کے لیے تجوری کے مختلف خانے جو مختلف سکوں اور نوٹوں



امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین، راشد نُعمانی کو ایک ہزار روپیہ کا نہرو انعام عطا فرما رہے ہیں



مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد



یوسف ناظم



بزمی بھارتی

کے لیے مقرر تھے بھر دیے گئے ہیں اگر تجوری خاطر خواہ معمور نہ ہوتی، ناخوش ہوتے، معمور ہوتی تو مطمئن ہو کر حاجت مندوں کا انتظار شروع کرتے،۔ قلمدان اور تجوری خالی ہو جائے تو بہت خوش نظر آتے تھے اور پھر یہ فکر رہتی تھی کہ جلد سے جلد تجوری بھر دی جائے کہ پھر ہاتھ چلنے لگے۔

باہر جاتے تو سواری میں ان کے بازو ایک تھیلی رکھ دی جاتی جس میں اٹھنیاں، پاولیاں، دوانیاں اور اکنیاں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ سواری کی تجوری ہوتی تھی جس میں کچھ اشرفیاں کچھ نوٹ اور کچھ روپے ہوتے تھے۔ جتنی سواری میں تھیلی کا منہ کھلتا تھا کہیں ٹھہر جائیں تو تجوری کھلتی تھی۔ راستے کی خیرات، مانگنے والوں کی خیرات اور نہ مانگنے والوں کی خیرات۔

مہاراجہ نے دیتے وقت کبھی نظر نہ اٹھائی اور یہ کبھی نہ دیکھا کہ لینے والا کون ہے۔

ان کی سخاوت کے قصے آج بھی ہزاروں کی زبان پر ہیں۔ مہاراجہ نے مئی ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا تو حضور نظام نے فرمایا کہ "پرانی بساط کا آخری مہرہ" اٹھ گیا۔ ماہر القادری نے کہا کہ ان کی موت "وضع داری کا جنازہ" تھی اور بہادر یار جنگ نے کہا کہ "مہاراجہ کی موت دکن کی قدیم تہذیب و شائستگی کی موت تھی۔"

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

جناب دلاور فگار بدایونی

شاعر اور جنگ

ہمارے شاعروں کی فوج ہے اک نیشنل سینا ‏ کوئی آساں سمجھتا ہے ہمارا گھر جلا دینا

ہماری فوج کے جنرل بڑے نامی گرامی ہیں ‏ شکیل و ساحر و مجروح اور ساغر نظامی ہیں

جواب ان کا نہیں ان کی ادب پر درسائی ہیں ‏ غزل ہیں، نظم ہیں، گیتوں ہیں، قطعے ہیں، رباعی ہیں

غزل کی فیلڈ میں ہیرو ملیں گے بے شمار اپنے ‏ عمر اپنے، قمر اپنے، روش اپنے، خمار اپنے

سلام و کیفی و آزاد و عرش اپنے وہ ہیرو ہیں ‏ کہ جن کے سامنے افواج چین و پاک زیرو[1] ہیں

ہمارے شاعروں میں بعض لیفٹیننٹ کرنل ہیں ‏ فنا ہیں، راز ہیں، گلزار ہیں، انور ہیں، بیکل ہیں

نشور و احمدی میجر ہیں اپنی جس ڈویژن کے ‏ اسے کیا ختم کر پائیں گے پیٹن ٹینک دشمن کے

دفاعی نظم کے گولے گرا کر شمسی و عالم ‏ زمانے کو بتا دیں گے کہ کیا ہوتا ہے ایٹم بم

تعجب کیا جو اپنے فوجیوں کے عزم محکم ہیں ‏ فراق صف شکن ان کے سپہ سالار اعظم ہیں

نہیں پروا جو کچھ دشمن بھی شاعر ہیں صحافی ہیں ‏ ہمارے ایک انور صابری لاکھوں میں کافی ہیں

قلم آپس میں ٹکرائیں چلو یوں ہی سہی صاحب ‏ اِدھر بھی جعفری صاحب، اُدھر بھی جعفری صاحب

مزا آئے جو ہند و پاک میں اس طرح فائٹ[2] ہو ‏ مفاعیلن، مفاعیلن بجائے لفٹ رائٹ ہو

دیارِ غیر میں دو چار ہی اس فن کے ماہر ہیں ‏ ہمارے ایک یو۔پی میں سوا دو لاکھ شاعر ہیں

ہماری اب بھی یہ خواہش ہے یہ نوبت نہیں آئے ‏ ہماری اب بھی یہ کوشش کہ یہ طوفان ٹل جائے

فراق و جوش یہ کہہ کر گلے مل جائیں آپس میں ‏ کہ ہم شاعر کبھی مٹنے نہ دیں گے پیار کی رسمیں

قلم کی ایک منزل ہے ادب کا ایک جادہ ہے
فراق و جوش کی دو بوتلیں ہیں ایک بادہ ہے

---

[1] صفر [2] لڑائی

شکاری شہنشاہ

جناب قیصر سرمست



آپ نے شہنشاہ جہاں گیر کے عدل و انصاف کی کہانیاں تو سنی ہوں گی۔ شہنشاہ جہاں گیر زبردست شکاری اور قادر انداز نشانہ باز بھی تھا۔ شہنشاہ نے اپنی زندگی کے حالات ایک کتاب میں لکھے ہیں۔ اسے "تزک جہاں گیری" یا "جہاں گیر نامہ" بھی کہتے ہیں۔ اصل کتاب تو فارسی زبان میں ہے لیکن اگر آپ پڑھنا چاہیں تو اردو میں اس کا ترجمہ بھی مل سکتا ہے۔ بڑی مزیدار کتاب ہے۔ جہاں گیر نے اس کتاب میں جا بجا شکار کا ذکر کیا ہے اور کئی دلچسپ واقعے بھی بیان کیے ہیں۔

اسے جانوروں سے متعلق معلومات فراہم کرنے کا بھی شوق تھا۔ وہ جب بھی کوئی نیا چرند یا پرند دیکھ لیتا تو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتا جب تک اس کے تفصیلی حالات معلوم نہ کر لے اور مصوروں سے ان جانوروں کی تصویریں نہ بنوا لے۔

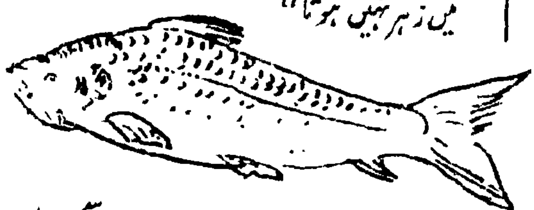
شہنشاہ نے پچاس سال کی عمر تک کل اٹھائیس ہزار پانچ سو جانور شکار کیے۔ کبھی کبھی تو وہ اس کثرت سے شکار کرتا تھا کہ شمار کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔ ایک دن میں اوسطاً ایک سو اڑتیس جانوروں کا شکار کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ ایک مرتبہ جہانگیر نے ایک ہفتے کے اندر نو سو ستر ہرن نر و مادہ اپنی شکارگاہ سمونگر میں شکار کیے۔

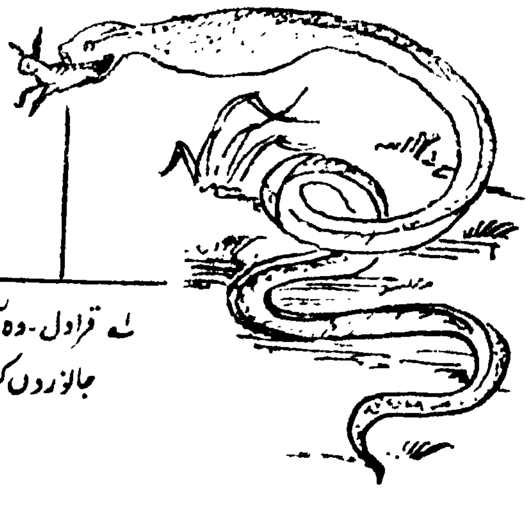
اب بادشاہ کی بہادری اور دلیری کا واقعہ بھی سنیے۔ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب وہ شہزادہ تھا۔ ایک مرتبہ وہ پنجاب میں شکار کھیلنے گیا۔ اچانک ایک بہت ہی بڑا شیر جنگل میں سے نکل

کر اس کی طرف بڑھا۔ جہاں گیر نے نشانہ خوب تاک کر لگایا۔ لیکن اتفاق کی بات کہ خالی گیا۔ پھر کیا تھا شیر غصے سے بے قابو ہو گیا اور حملہ کی غرض سے ہاتھی پر آ گیا۔ شہزادے کو اتنا وقت بھی نہیں ملا کہ تلوار نکال کر شیر پر وار کرتے لیکن شہزادے نے خوب پھرتی دکھائی وہ فوراً دو زانو ہو گیا اور بندوق پلٹ کر کندے سے شیر کے سر پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ جنگل کا یہ بادشاہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

ایک مرتبہ جہاں گیر شکار سے واپس آرہا تھا دیکھا کہ ایک ڈھائی گز لانبا سانپ آدھے خرگوش کو نگل گیا ہے۔ جہاں گیر کے حکم پر قراول[1] اس سانپ کو اس کے پاس اٹھا لائے۔

سانپ کو اٹھانے میں خرگوش اس کے منہ سے نکل گیا۔ جہاں گیر نے حکم دیا کہ خرگوش اس سانپ کے منہ میں دوبارہ دے دو۔ قراول نے بہت کوشش کی جس سے سانپ کا جبڑا پھٹ گیا۔ شہنشاہ نے سانپ کا پیٹ چاک کروا دیا۔ اور بھی اس میں سے ایک پورا کا پورا خرگوش اور نکلا۔ جہاں گیر اپنی کتاب میں لکھتا ہے "ایسے سانپ کو ہندوستان میں چیتل کہتے ہیں۔ یہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اکثر جانوروں کو پورا کا پورا نگل جاتا ہے۔ لیکن ایسے سانپ میں زہر نہیں ہوتا"





اچھا بتائیے ہندوستان میں سب سے مزیدار مچھلی کون سی ہوتی ہے۔ بھئی سچ پوچھیے تو ہمیں بھی نہیں معلوم شہنشاہ جہاں گیر نے یہ بات بھی اس کتاب میں بتا دی ہے۔ ہندوستان کی مچھلی "روہو" ہے۔ پھر "برین" یہ دونوں

[1] قراول۔ وہ آدمی جو شکار کے وقت جانوروں کو گھیر کر لاتے ہیں۔ جانوروں کو جو گھیرتے ہیں اسے ہانکا کہتے ہیں۔



صورت میں بہت مشابہہ ہوتی ہیں۔"

یوں تو اکثر لوگ گوشت کھاتے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کون سے جانور کا گوشت زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ جہاں گیر بُزکوہی (پہاڑی بکری) کے گوشت کے متعلق لکھتا ہے کہ "اس سے زیادہ لذیذ اور خوش ذائقہ گوشت کسی اور جانور کا نہیں حالانکہ اس کا چمڑا انتہائی بدبودار ہوتا ہے۔ بدبو کی انتہا یہ ہے کہ رنگنے کے بعد بھی بو نہیں جاتی۔ کمال یہ ہے کہ گوشت میں مطلق بو نہیں ہوتی۔

کیا آپ نے کبھی جنگلی کیلے کھائے ہیں؟

نہیں۔ مولا کے گھونسلے بھی نہیں دیکھے ہوں گے؟ بھئی بہت کم شکاریوں کو مولا کے گھونسلے نظر آئے ہیں تو بھلا آپ کس طرح دیکھ سکیں گے۔ جہاں گیر مانڈو (مالوہ کا ایک شہر) کی تعریف کرتے ہوئے وہاں کے جنگلی کیلوں اور مولا کے گھونسلے کے بارے میں لکھتا ہے۔ "یہاں دو چیزیں ایسی دیکھیں جو ہندوستان میں کہیں نہیں دیکھی تھیں۔ ایک جنگلی کیلا جو اس قلعہ کے جنگل میں خود رو ہے۔ دوسرے مولا کے گھونسلے (جس کو فارسی میں سیچہ کہتے ہیں) آج تک کسی شکاری نے اس کا گھونسلا نہ دیکھا۔ یہاں اس کا گھونسلا ملا اس میں دو بچے تھے۔"

ایک رنگ (بکری کے خاندان کا ایک جانور) دو من دس سیر کا جہاں گیر کے پاس تھا۔ اس قدر وزنی ہونے کے باوجود اتنا تیز دوڑتا تھا کہ دس بارہ عمدہ شکاری کتے اس کے گرد کو بھی نہیں پا سکتے تھے اور ایک جگہ سفید جانوروں کے بارے میں لکھا ہے۔

"راجہ نرسنگھ دیو نے ایک سفید چیتا نذر کیا اگرچہ اور جانور پرند وچرند سفید میرے چڑیا خانے میں تھے اور میں نے اکثر دیکھے تھے لیکن سفید چیتا نہیں دیکھا تھا۔ اس کے داغ سیاہ ہوتے ہیں اور اس کے[1] نیلے (عام چیتے پر کالے دھبے ہوتے ہیں۔ اور سفید چیتے

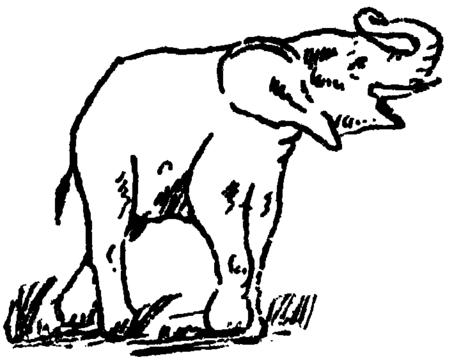
---

[1] چیتے کے علاوہ سفید شیر اور بور بچے بھی ہوتے ہیں سفید بور بچے کو برف کا بور بچہ SNOW LEOPARD کہتے ہیں سیاہ رنگ کے بور بچے اور شیر بھی دیکھے گئے ہیں سیاہ شیر بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ ماہرین ان جانوروں کا رنگ سیاہ اور سفید ہونے کی کیا وجہ بیان کرتے ہیں وہ بھی سن لیجیے۔ ان کا کہنا ہے کہ PIGMENT کی زیادتی کی وجہ سے رنگ سیاہ ہو جاتا ہے جس کو MELANISIM کہتے ہیں، البتہ رنگ کی کمی اور سفیدی بعض شیروں میں دیکھی گئی ہے جس کو ALBUNISIM کہتے ہیں۔

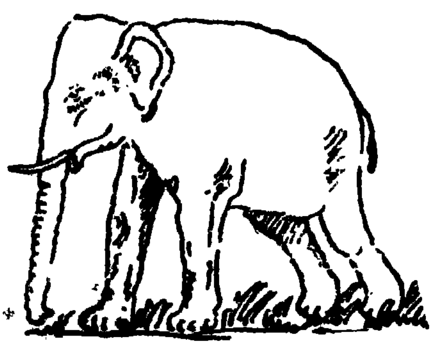
پر نیلے رنگ کے دھبّے ہوتے ہیں سفید شاہین اور شکرہ کو ایران میں "شنقار" کہتے ہیں سفید چڑیا کوا، تیتر اور باڈسی (مور) وغیرہ میرے پاس بھی ہیں۔ اور کالا ہرن ہندوستان کے سوا کہیں نہیں ہوتا۔"

شہنشاہ نے تزک جہاں گیری میں یہ بھی لکھا ہے کہ سارس اپنی مادہ سے بے حد محبت کرتا ہے تو نر بھی اس کی یاد میں گھل گھل کر ختم ہو جاتا ہے جزائر سماترا اور جاوا کے عجیب پرندے کا ذکر بھی تزک میں ملتا ہے۔ اس پرندے کا رنگ توتے کی طرح ہے لیکن اس سے کسی قدر چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی ایک عجیب عادت ہوتی ہے یعنی جس ٹہنی پر اسے بٹھاتے ہیں اسے مضبوطی سے پکڑ کر الٹا اٹک جاتا ہے اور اسی طرح تمام رات لٹکا رہتا ہے۔ اور دن میں پھر سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ پانی بالکل نہیں پیتا بلکہ پانی اس کے لیے زہر کے برابر ہے۔ (ہمیں افسوس ہے کہ اس جانور کا نام نہ معلوم ہو سکا) ہم نے آج تک کسی جانور کے متعلق یہ نہیں سنا تھا کہ وہ پانی بغیر زندہ رہتا ہے۔ لیکن یہ پرندہ نہ صرف زندہ رہتا ہے بلکہ پانی اس کے لیے زہر بھی ہے۔

مقرب خاں (یہ شخص لڑکپن سے شہنشاہ کی



خدمت میں رہا کرتا تھا۔ اور تیر اور بندوق چلانے میں ماہر تھا) نے جہان گیر کے حضور میں ایک افریقی ہاتھی بھیجا ہے جس کے بارے میں وہ لکھتا ہے "ہندوستانی ہاتھیوں سے اس کے کان زیادہ بڑے اور سونڈ اور دُم زیادہ لمبی ہے" اور ایک مرتبہ اس کے بھائی دانیال مرحوم کے گھوڑے اور ہاتھی اس کے سامنے لائے گئے۔ ان ہاتھیوں میں ایک کا نام مست الست تھا۔ وہ ہاتھی شہنشاہ کو پسند آ گیا۔ اور اس نے اس کا نام نور گنج رکھا اور اس ہاتھی میں انتہیں



دوسرے ہاتھیوں سے جو چیز الگ معلوم ہوئی اس کا حال بھی سنو۔ لکھتا ہے "عجیب بات اس ہاتھی میں یہ ہے کہ اس کے کانوں کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے تربوزوں کے برابر گانٹھیں ہیں۔ اور اس کی پیشانی اور سب ہاتھیوں سے زیادہ اٹھی ہوئی ہے"

دیکھا بچو۔ شہنشاہ کی نظر کتنی تیز تھی۔ وہ جانوروں میں ذرا سی بھی غیر معمولی بات کو محسوس کر لیتا تھا۔ اور پھر اپنی کتاب میں محفوظ کر لیتا تھا

اسے پرانے شکاریوں سے معلوم ہوا تھا کہ پہاڑی دُنبے کے سینگ میں ایک کیڑا پیدا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے خارش ہوتی ہے۔ اور جانور اس خارش کی وجہ سے بے چین ہو کر دوسرے جانوروں سے لڑتا ہے اگر کوئی دُنبہ نہ ملے تو درخت یا پتھر سے ٹکریں مارتا ہے تاکہ وہ خارش کم ہو۔ یہ بات شہنشاہ کو عجیب لگی۔ وہ اس کی حقیقت معلوم کرنے کی فکر میں تھا، موقع ملتے ہی اس نے اس کی تحقیق کی اور اس کی حقیقت تک پہنچ گیا۔ لکھتا ہے "جب میں نے تلاش کیا تو وہ کیڑا ایک مادہ کے سینگ میں ملا۔ حالانکہ مادہ نہیں لڑتی۔ معلوم ہوا کہ اس بات کی کچھ حقیقت نہ تھی" بعض اوقات بیگمات، شہزادے اور شہزادیاں بھی شہنشاہ کے ہمراہ ہوتیں اور جی بھر کر شکار کا لطف اٹھاتی تھیں۔

(بقایا صفحہ ۲۴ کا)

غضب ڈھاتے ہیں۔ ممتاز بتا تو رہا ہے کہ ماسٹر جی اس سے خواہ مخواہ ناراض ہو گئے۔ ممکن ہے وہ پہلے سے ہی خار کھائے بیٹھے ہوں۔

ابا:۔ لو ایک اور محاورہ! اگر یہی حال رہا تو پتہ نہیں اس گھر میں مطلب کی بھی کوئی بات ہو سکے گی یا نہیں۔

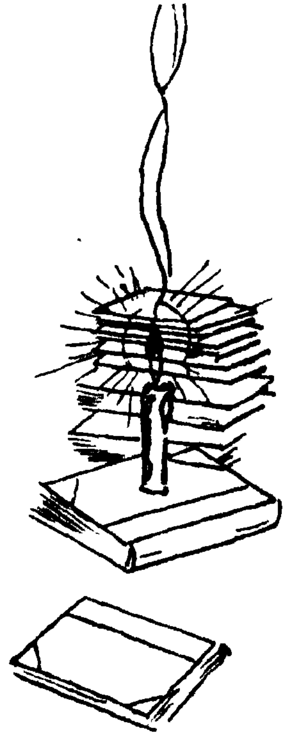
چچا جان:۔ بھائی صاحب! آج کل تو مدرسوں میں آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ ایک ماسٹر نے جا کر ہیڈ ماسٹر کے کان بھر دیے اور ہیڈ ماسٹر نے نوٹ لکھ مارا۔

ابا:۔ اچھا اچھا، کل سے ممتاز تم روز ایک گھنٹہ مجھ سے پڑھا کرو۔ تم اپنے چچا کے پاس بیٹھ بیٹھ کر بہت محاورے سیکھ گئے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہیں تم اسکول میں پٹ نہ جاؤ۔

ممتاز:۔ چچا جان میں نہ کہتا تھا کہ آپ کسی دن میری دُرگت بنوا دیں گے۔ چلیے قصہ پاک ہوا۔ کل سے میری بیٹھک ابا جان کے کمرے میں ہو گی۔

اُردُو

بدیع الزماں خاور

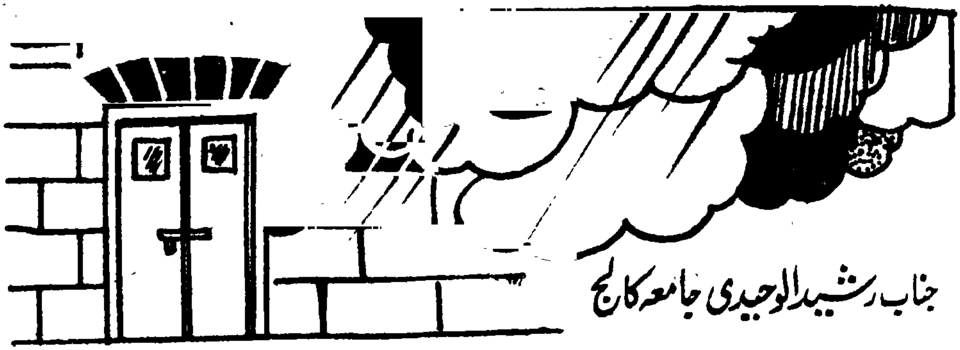


دریائے لطافت ہے اُردو
گلزارِ فصاحت ہے اُردو

میرؔ و غالبؔ ہوں، اکبرؔ ہوں   اقبالؔ ہوں، جوشؔ و اخترؔ ہوں
چکبستؔ ہوں، یا سرشارؔ و شررؔ   حالیؔ ہوں، یا سیمابؔ و جگرؔ
جتنے فن کار ہمارے ہیں
اُردو کے چاند ستارے ہیں

وہ بادہ اس کے جام میں ہے   مقبول جو خاص و عام میں ہے
ہر نغمہ اس کے ساز میں ہے   ہر لے اس کی آواز میں ہے

وہ پھول چمن کی زینت ہے   وہ شمع وطن کی زینت ہے
جس پھول کے ہم دیوانے ہیں
جس شمع کے ہم پروانے ہیں
بچے، بوڑھے، گورے کالے   سب ہیں اُردو کے متوالے
ہر فرق مٹایا ہے اس نے
قوموں کو ملایا ہے اس نے



جناب رشید الوحیدی جامعہ کالج

ہمدردی

ابھی ابھی پانی برس کر تھما ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار اب بھی پڑ رہی ہے۔ آسمان پر کالی کالی بدلی ہر طرف گھری ہے، کبھی کبھی بجلی چمک جاتی ہے جس سے ایک لمحے کے لیے چکاچوندھ ہو جاتی ہے۔ پھر گھُپ اندھیرا۔

حامد اپنے کمرے میں ٹہل رہا ہے، بار بار اس کی نگاہیں دروازے کی جانب اُٹھ جاتی ہیں۔ جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ ہر آہٹ پر چونکتا ہے کبھی ٹہلنے لگتا ہے، ٹہلتے ٹہلتے کبھی میز کے پاس کھڑے ہو کر کتابوں کے ورق الٹتا ہے۔ ایک بار کمرے کے دروازے کے پاس آ کر سنسان سڑک پر جھانکنے لگا دور دور کسی کو نہ پا کر پھر واپس مڑ گیا۔ اور خود بخود بڑبڑانے لگا۔ بے وقوف! ایک ہفتہ امتحان کا باقی ہے، کہہ دیا تھا سویرے سے آجانا، ساتھ مل کر پڑھیں گے ساتھ پڑھنے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

وہ پھر کچھ سوچنے لگا معلوم ہوتا ہے کسی پریشانی میں پھنس گیا ہے۔ یہ سوچ کر مفلر گردن میں لپیٹا، ٹارچ اٹھائی، چھتری لی اور سیٹی بجاتا ہوا باہر سڑک پر آگیا۔ اور اب وہ بجتا بجاتا اپنے غریب دوست اور کلاس فیلو راجندر کے محلے کی طرف جا رہا تھا۔

تھوڑی دور چل کر محلے کی دُکان کے ایک تختے پر کوئی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ خالد نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ ایک لڑکا اپنی میلی سی چادر میں سمٹا ہوا

بیٹھا تھا۔ اور گھٹنوں میں سر جھکائے سسکیاں لے رہا تھا۔

"کون ہے؟" خالد نے قریب جاتے ہوئے پوچھا: "اُف راجندر تم۔ پاگل تم رو رہے ہو! کیا بات ہے۔ میں اتنی دیر سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ اٹھو چلو میرے ساتھ ایک ہفتہ اور باقی ہے امتحان کا۔ چلو کچھ پڑھ لیں۔"

راجندر نے حسرت بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اور ایک موٹا سا آنسو ڈھلک کر گالوں پر بہنے لگا۔

"پیارے خالد! اب امتحان نہیں دے سکوں گا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، "ابا نے اپنی جیسی کوشش کر لی کہیں سے اتنے پیسے نہ مل سکے کہ امتحان کی فیس جمع کر سکوں۔" اور وہ ہچکیاں لینے لگا۔

خالد نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "نہیں نہیں! ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ تمھیں امتحان دینا ہے۔ تم نے ہمیشہ مجھ سے اپنی حالت چھپائی مگر اب یہ نہ ہوگا کہ تم امتحان نہ دو۔ فکر مت کرو راجندر پرماتما پر بھروسا رکھو۔ چلو تیاری کریں خدا کہیں نہ کہیں سے انتظام کر دے گا۔"

اور راجندر تھکے تھکے قدموں سے اس کے ساتھ ہولیا۔ دونوں دوست رات گئے تک پڑھتے رہے۔ زیادہ رات ہونے کی وجہ سے خالد نے اسے گھر نہ جانے دیا۔ اور اپنے پاس سلا لیا۔ راجندر تھوڑی دیر میں سو گیا۔ مگر خالد کو نیند نہ آئی۔ وہ اسی ادھیڑبن میں رہا کہ کہاں سے اس کی فیس کا انتظام کرے۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی، اور وہ سو گیا۔

صبح ذرا دیر سے آنکھ کھلی۔ راجندر جا چکا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر منہ ہاتھ دھوکر ناشتہ کرنے لگا۔ ابھی اس نے چائے پینی شروع کی تھی کہ اس کے ابا نے آواز دی: "خالد خالد"۔ "جی ابا!" اور وہ کود کر اپنے والد کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہاں اس کی امی اس کے دونوں بھائی راشد ماجد اور دو چھوٹی بہنیں راشدہ اور ماجدہ سب جمع تھے۔ سب بہت خوش نظر آ رہے تھے اس کے پہنچتے ہی راشدہ نے آگے بڑھ کر اسے خوش خبری سنائی: "خالد بھیا۔ خالد بھیا ہمارے لیے عید کے کپڑے اور جوتے آ رہے ہیں۔ اسی لیے ابا نے آپ کو بلایا ہے۔" اور اس کے ابا نے

یار سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا خالد۔ تم کیسے کپڑے بنواؤ گے اور جوتا کیسا لوگے؟"

خالد کے ذہن میں رات کی سوچی ہوئی ترکیب کروٹیں لینے لگی۔ اب اس پر عمل کرنے کا وقت آگیا تھا۔ اس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا،

"پیارے ابا جان۔ اس بار تو آپ مجھے پیسے دے دیں میں اپنی پسند کی چیزیں خود خریدنا چاہتا ہوں۔"

"بے وقوف ہوگیا ہے! تجھے کیا پتہ کپڑا اور جوتا کیسے خریدا جاتا ہے۔" اس کی ماں نے جھڑک دیا۔

"امی میں اب بچہ تو نہیں ہوں کہ اتنا ذرا سا کام نہ ہوسکے۔" خالد نے بہت ادب سے جواب دیا۔

"جی ہاں آپ تو ابا کے برابر ہیں نا۔" سعیدہ بیچ میں بول پڑی۔

اس کے ابا نے پھر کہا: "نہیں بیٹے تم میرے ساتھ چلو یا اپنی پسند بتادو میں لے آؤں گا۔"

خالد نے مچل کر کہا: "نہیں ابا اس بار تو آپ میری یہ خواہش پوری کردیں مجھے اپنے دوست کے ساتھ سامان خریدنے دیں۔"

آخر ماں باپ کو بیٹے کے آگے ہار ماننی پڑی اور پورے سو روپے خالد کے ہاتھ میں تھے۔ خالد خوش تھا۔ بہت خوش۔ اس کا دل خوش تھا۔ اس کی ترکیب کامیاب ہوگئی تھی۔ اب وہ بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگا کہ جلدی سے دس بجیں اور ابا دفتر جائیں۔ اور جب دس بجے اس کے ابا دفتر چلے گئے تو وہ بھی کتابیں لے کر پڑھنے کے بہانے نکل پڑا۔ اس کا قدم تیزی سے راجندر کے گھر کی طرف اٹھ رہا تھا۔ اس کی جیب میں سو روپے کے نوٹ تھے جنہیں اس نے احتیاط سے دبا رکھا تھا۔ ایک تنگ گلی میں کھپریل کے گھر کے دروازے پر وہ آواز دینے لگا: "راجندر راجندر۔"

"اندر آجاؤ بیٹا۔" راجندر کی ماں نے اُسے اندر بلا لیا۔

خالد اندر چلا گیا اور اس کی ماں سے پوچھا راجندر کہاں ہے؟

اس کی ماں نے بتایا۔ ذرا سامنے کی دکان پر گیا ہے، ابھی آیا جاتا ہے تم بیٹھو۔ خالد نے موقع اچھا دیکھا، اس کی ماں کے ہاتھ پر سو کا نوٹ رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ راجندر کی فیس کے لیے رکھ لو۔ اُسے نہ بتانا کہ میں نے دیے ہیں ورنہ وہ انکار کردے گا۔ وہ بہت شرمیلا لڑکا ہے۔ اس نے کالج میں کسی پر اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی۔"

اس نے احسان بھری نظروں سے خالد کو دیکھا اور روپے رکھ لیے اور خالد راجندر کے واپس آنے سے پہلے ہی لوٹ آیا۔ ابھی وہ گھر پہنچا ہی تھا کہ راجندر دوڑتا ہوا آیا اور خالد سے لپٹ گیا۔

"پیارے خالد پیارے دوست۔ ابا نے روپے کا انتظام کر لیا۔ اب میں امتحان دے سکوں گا۔ اب میں جاہل نہ رہوں گا۔"

خالد راجندر سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ فخر اور خوشی کے آنسو، ایسی مسرت کے آنسو جو کسی غریب کی مدد کرکے دل کو محسوس ہوتی ہے۔ جسے وہ راجندر سے چھپا کر پی گیا۔

"آخر میں پوچھتا ہوں، نہ تم کپڑے لائے نہ جوتا۔ نہ تمھارے پاس روپیہ ہے۔ تو کیا زمین نگل گئی۔ آسمان کھا گیا۔ بتاتے کیوں نہیں روپیہ کیا ہوا۔ تم کہتے ہو نہ روپیہ نہیں گرا۔ نہ گم ہوا، صحیح صحیح بتاؤ!" اس کے ابا گرج رہے تھے۔

"میں نے منع کیا تھا کہ تم بچے ہو۔ یہ کام تمھارے بس کا نہیں ہے۔ مگر اپنی ضد کے آگے کب کسی کی سنتے ہو۔" امی نے بھی قہر آلود نگاہوں سے گھورا۔

راشد ماجد اور دونوں بہنیں سہمی کھڑی تھیں ان کے سامنے چمکتے جوتے اور نئے کپڑے رکھے تھے۔

اب کے عید میں تمھیں نئے جوتے اور کپڑے تو ملیں گے نہیں، مگر پیسے کا صحیح پتہ بھی دینا ہے کل تک جواب دو، ورنہ خیر نہیں۔ ابا نے آخری فیصلہ سنا دیا۔

ابا...... خالد کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

میرے پاس دھلے ہوئے کپڑے رکھے ہیں۔ میں اپنے جوتے پر پالش کر لوں گا۔ اب جوتے اور کپڑوں کے لیے ضد نہ کروں گا۔ آپ خدا کے لیے خفا نہ ہوں میں سچ سچ بتائے دیتا ہوں ___ اور اس نے ڈرتے ڈرتے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

"شاباش میرے پیارے بیٹے"، باپ نے اٹھ کر اسے چپٹا لیا۔ شریف اور اچھے بچے اسی طرح اپنے ضرورت مند ساتھیوں کی مدد کرتے ہیں ___ تم نے اپنے ایک ضرورت مند دوست کی مدد کی، خدا تمھاری مدد کرے گا ___ لو۔ یہ سو روپے اور جا کر اپنی پسند کے کپڑے اور جوتے لے آؤ۔

ماں باپ کی آنکھیں خوشی اور غرور سے چمک رہی تھیں۔

سچا موتی

بشیر نواز

اک ہے شبانہ بھولی بھالی
باتیں اس کی پیاری پیاری
ہر دم ہنسنا اور ہنسانا
ننھے دل میں ننھے ارماں
کام کہیں تو سن لیتی ہے
گھر سے اس کو پیار بہت ہے
ایک دوپٹہ ایک ہو گڑیا
پھر دنیا کی فکر نہیں کچھ
بچپن بھی کیا شے ہوتا ہے
کاش کہ انساں بچے ہوتے
دھن دولت پر جان نہ کھوتے
تھوڑا پاکر خوش ہو جاتے
پھر کوئی جھگڑا کیوں ہوتا
ساری دنیا پھر یوں ہوتی

شام کو جیسے شفق کی لالی
جو بھی سن لے جائے واری
کام ہے اس کا گانے گانا
چاہے ابا، چاہے اماں
غصے ہوں تو ہنس دیتی ہے
چھوٹا سا سنسار بہت ہے
مل جائے گولی کی پڑیا
درد و غم کا ذکر نہیں کچھ
ایک سہانی لے ہوتا ہے
پیارے ہوتے سچے ہوتے
اس کی خاطر آن نہ کھوتے
ہنستے گاتے موج اڑاتے
"روس" اور "امریکہ" کیوں ہوتا
جیسے کوئی "سچا موتی"



تہذیب کی بنیاد

جناب برکت علی فراق

طالب علموں کی انجمن میں تہذیب کی بنیاد پر بحث ہو رہی تھی۔

عارف میاں بولے: "جناب صدر، ہمارا ملک ہندوستان بہت پرانے زمانے سے مہذب ہے ...."

"جناب والا" موہن لال نے عارف کی بات کاٹی: "یہ غلط ہے۔ سب سے پہلے، ہندوستان سے بھی پہلے، ایران مہذب تھا۔"

"ایران بھی نہیں جناب صدر"۔ مسعود نے کہا: "یونان تھا۔"

"مصر تھا جناب صدر!"

"چین تھا جناب والا۔"

"توران تھا جناب، افغانستان تھا، اٹلی تھا، عرب تھا ......" ایک ہڑبونگ مچ گئی۔

"خاموش! خاموش!!" تاریخ کے استاد نے جو اس بحث کی مجلس کی صدارت کر رہے تھے، ٹوکا، "بھئی، اس طرح بحث تھوڑی ہوتی ہے! ایک وقت میں ایک آدمی کو بولنا چاہیے، جبھی تو ایک کی بات دوسرے سن اور سمجھ سکیں گے۔ آپ لوگوں نے تو بحث کی مجلس کو میلا بنالیا جہاں ہر شخص ہر وقت بولتا رہتا ہے۔"

"جناب والا، یونان میں بہت سے فلسفی پیدا ہوئے تھے، سب سے پہلا مہذب ملک یونان تھا۔" مسعود نے علمیت جتلاتے ہوئے کہا۔

"اور ہندوستان کی شان کا پتہ ہی نہیں جناب کو جہاں کالی داس اور بالمیک جیسے شاعر پیدا ہوئے۔ کالی داس کے ڈرامے شکنتلا کا اب تک جواب نہیں ہو سکا،

حضرت!" عارف نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

" بھئی اس طرح تو فیصلہ ہونا مشکل ہے۔" تاریخ کے استاد بولے۔ "پہلے یہ طے کرنا چاہیے کہ تہذیب کی علامتیں کیا ہیں۔ یہ علامتیں سب سے پہلے جس ملک میں پائی جاتی ہوں گی وہی سب سے پہلا مہذب ملک سمجھا جائے گا۔"

" فلسفے سے بڑھ کر تہذیب کی علامت کیا ہوگی جناب صدر۔" مسعود نے بھروسے کے ساتھ کہا

" شاعری اور ادب جناب والا، تہذیب کی سب سے بڑی علامتیں ہیں۔" عارف میاں نے اختلاف کیا۔

موہن لال نے سنجیدگی کے ساتھ کہا "جناب صدر یہ لوگ پھر بھٹکنے لگے۔ ہمیں طے یہ کرنا ہے کہ فلسفہ ہو یا شاعری، یا ادب۔ یہ سب سے پہلے کس ملک میں موجود تھے۔"

" ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن اس سے بھی ذرا اور گہرائی میں جا کر سوچنا چاہیے۔" صدر نے مشورہ دیا۔ "فلسفہ، شاعری، ادب اور دوسرے بہت سے علم جو انسان سیکھتا ہے، ان سے بھی پہلے ایک چیز کا ہونا ضروری ہے۔ یہ سب چیزیں تو پیداوار ہیں اسی بنیادی چیز کی۔ میری مراد ہے پڑھنے لکھنے کی لیاقت۔ پڑھنا بھی اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک لکھنے کا آرٹ نہ پیدا ہو جائے، ورنہ آدمی پڑھے گا کیا؟ تو ہمیں سب سے پہلے اس بات کا پتہ چلانا چاہیے کہ سب سے پہلے لکھنے اور اسی کے ساتھ پڑھنے کا فن کس ملک میں ایجاد ہوا۔"

" تو جناب صدر، لکھنے کا فن سب سے پہلے ہندوستان ہی میں ایجاد ہوا ہوگا۔" ہندوستان کے عاشق عارف میاں بولے۔

" یونان میں ایجاد ہوا ہوگا جناب والا۔" مسعود نے کہا۔

" جناب، ایران میں ہوا ہوگا۔" "مصر میں ہوا ہوگا۔" "چین میں ہوا ہوگا۔" پھر ہنگامہ برپا ہو گیا۔

" ارے بھئی پھر وہی میلا!!" "ایک وقت میں ایک آدمی بات کرو میاں، صدر صاحب نے ٹوکا۔

" تو جناب محترم! یہ فیصلہ آپ ہی کر دیجیے کہ لکھنے پڑھنے کا فن سب سے پہلے کس ملک میں ایجاد ہوا۔ سب نے ایک زبان ہو کر کہا،

" دیکھو تاریخ میں کوئی بات بغیر ثبوت کے نہیں کہی جاتی ......"

" جبھی تو جناب والا، میں کہتا ہوں سب سے پہلا مہذب ملک ہندوستان تھا، اس لیے کہ لکھنے

پڑھنے کا فن یہاں ایجاد نہ ہوا ہوتا تو کالی داس ڈراما کیسے لکھتا، والمیک نے رامائن کیسے لکھی ہوتی؟"

عارف صاحب نے بیچ ہی میں تاریخ کے استاد کی بات کاٹ دی۔

"میاں تمھاری بات ایک حد تک صحیح ہے۔ اگر مسعود میاں یہ کہیں کہ سب سے پہلا مہذب ملک یونان تھا تو ان کی بھی بات اسی ثبوت کی بنیاد پر صحیح ہوگی مگر تم دونوں یہ بھی تو سوچو کہ ہندوستان اور یونان اور اسی طرح کے اور بھی بہت سے ملکوں میں لکھنے کا فن موجود تو رہا ہوگا۔ لیکن یہ کیوں اور کیسے ضروری ہے کہ انھی نے لکھنے کا فن ایجاد بھی کیا تھا۔ ہوسکتا ہے، فن کی ایجاد کسی اور ملک میں ہوئی ہو، اور یہ دوسرے ملک اس میں ترقی کرکے بہت آگے نکل گئے ہوں۔" تاریخ کے استاد نے استادانہ انداز میں فرمایا۔

خاموشی۔

"تو جناب صدر، علم و ادب، فلسفہ، شاعری وغیرہ کا پتہ تو ہم اس طرح چلا سکتے ہیں کہ ان ملکوں کی کتابوں میں پڑھ لیں۔ لیکن جب لوگ لکھنا جانتے ہی نہ تھے، اور اس حالت میں ظاہر ہے، کتابیں بھی نہ ہوں گی، تو ہم یہ پتہ کیسے چلائیں کہ لکھنا سب سے پہلے کس ملک نے ایجاد کیا؟ عارف میاں کو اپنے ہندوستان کے بارے میں کچھ شبہ محسوس ہوا، کچھ اداس لہجے میں پوچھا۔

"کچھ عرصہ ہوا، ایک نئے علم کا رواج ہوا ہے جسے آثار قدیمہ کا علم کہتے ہیں۔ اس علم میں ہوتا یہ ہے کہ تاریخ کے عالم پرانی عمارتوں اور ان جگہوں کی جہاں وہ سمجھتے ہیں، کسی زمانے میں کوئی بستی یا شہر رہا ہوگا، کھدائی کراتے ہیں۔ زمین کو گہرائی تک کھدواتے چلے جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کھدائیوں میں پرانے سکے، تانبے کی چادریں چوڑی چوڑی ہڈیاں، مٹی کے برتن اور اسی طرح کی اور بہت سی چیزیں نکلتی ہیں جن پر کچھ نہ کچھ لکھا یا کھدا ہوتا ہے۔ یہ عالم ان نشانات کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اندازہ لگا لیتے ہیں کہ یہ کتنے زمانے کی ہوں گی۔

"اسی طرح کی کھدائی پنجاب اور سندھ کے علاقے میں ہوئی، پتہ چلا کہ ان جگہوں پر ہزاروں سال پہلے بڑے بڑے شہر آباد تھے، اور وہ لوگ بہت مہذب تھے اور لکھنا بھی جانتے تھے۔ ان جگہوں کو موہنجوداڑو اور ہڑپا کہتے ہیں۔"

"ملاحظہ فرمایا جناب صدر" عارف میاں

اچھل پڑے"۔ لکھنے کا فن، میں کہتا نہ تھا، سب سے
پہلے ہندوستان میں ایجاد ہوا تھا"۔ عارف میاں
نے پھر استاد کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ
دی۔

عارف کی یہ خوشی دیکھ کر مسعود، موہن لال
اور دوسرے لڑکوں کے چہرے کچھ پھیکے پڑ گئے۔

"عارف میاں" استاد نے ٹوکا"! پہلے
پوری بات سن لیتے ہیں، پھر صدر کی اجازت سے
اپنی بات شروع کرتے ہیں۔ عارف صاحب جھینپ کے
خاموش ہو گئے۔ موہن لال اور ان کے ساتھیوں کے
چہروں پر کچھ چمک پیدا ہوئی۔ "ہاں" صدر صاحب
نے بات پھر شروع کی"۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ موہنجوداڑو
اور ہڑپا کی طرح مصر کے "اہراموں" کی بنیادوں کی بھی
کھدائی کرائی گئی ہے، اور وہاں جو چیزیں بھی ہیں،
ان کے بارے میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ جس زمانے کی
یہ چیزیں ہیں، وہ موہنجوداڑو اور ہڑپا کی تہذیب
سے بھی پہلے کا زمانہ تھا۔ ان کھدائیوں میں چمڑے
ہڈی، برتن اور کپڑے پر بنے ہوئے بہت سے نشانات
بھی نکلے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اس زمانے
کی لکھائی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لکھنے کی
ایجاد سب سے پہلے مصر میں ہوئی تھی اور وہاں سے
ہوتے ہوتے دوسرے ملکوں میں پہنچی جن میں یونان، ایران،
ہندوستان اور چین سب سے پہلے آتے ہیں"۔

"مگر جناب صدر" عارف میاں نے اب دوسرا
راستہ نکالا "ہم لوگ یہ بحث تو کر ہی نہیں رہے
ہیں کہ لکھنے کی ایجاد سب سے پہلے کس ملک میں
ہوئی۔ ہماری بحث کا عنوان تو ہے تہذیب کی بنیاد
یعنی تہذیب کی عمارت کن بنیادوں پر کھڑی کی
جائے......"

"آپ ہی نے تو سب سے پہلے یہ بات چھیڑی
تھی جناب کہ ہندوستان بہت پرانے زمانے سے
مہذب ہے۔ بس یہیں سے یہ بحث چل پڑی"۔ موہن
لال نے انھیں اپنی غلطی یاد دلائی۔

"جناب، یہیں سے شروع کر کے میں یہ کہنے
والا تھا کہ ہم اتنے زمانے سے مہذب ہیں مگر اب ہمارا
کیا حال ہے"۔ عارف میاں آسانی سے ہار ماننے
والے نہیں تھے

"ہاں بھئی، ہماری بات چیت صحیح راستے
سے بھٹک گئی تھی۔ ہمیں غور تو یہ کرنا تھا کہ تہذیب
کی بنیاد کیا ہوتی ہے۔ حالت یہ ہے کہ مصر نے
تہذیب کے بنیادی پتھر یعنی لکھنے کا فن ایجاد
کیا، یونان، ایران، ہندوستان، چین وغیرہ نے

اس فن میں ترقی کی اور تہذیب کے آسمان پر پہنچ گئے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں نے تہذیب انھی سے سیکھی، یہ سب کچھ ہوا لیکن اسی فن میں بھی ملک آج سب سے پیچھے ہیں۔ دوسرے ملکوں کو چھوڑو، ہندوستان ہی کو لو، سنتے ہو عارف میاں ہندوستان ہی کی حالت پر غور کرو، لکھنے پڑھنے کے معاملے میں یہاں کے ۸۰ فیصدی لوگ بالکل کورے ہیں۔ دستخط کرنے کے بجائے انگوٹھے کا نشان لگاتے ہیں۔ یہی حال تھوڑے بہت فرق کے ساتھ خود مصر کا، ایران کا، یونان کا اور چین کا بھی ہے۔"

شمیم صاحب، جو اب تک خاموشی سے سب کی باتیں سنتے رہے تھے، کچھ غصے میں آکر بولے،

"جناب والا، ہمارے ملک کی یہ گت انگریزوں نے بنائی، نہیں تو جیسا عارف صاحب کہہ رہے تھے، ہمارا ملک سب سے زیادہ مہذب تھا۔"

"لیکن اب تو انگریز نہیں رہے شمیم میاں، مان لو ہندوستانیوں کو انگریزوں نے پڑھنا لکھنا سیکھنے کا موقع نہیں دیا، مگر اب تو اپنے ملک کے ہم آپ مالک ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" مجلس کے صدر نے توجہ دلائی۔

"گاؤں گاؤں، محلے محلے اسکول کھول دیے جائیں جناب صدر" مسعود نے جوش میں بھر کر کہنا شروع کیا، "تاکہ ملک کے سب بچے پڑھ لکھ جائیں، پھر کوئی ان پڑھ نہیں رہے گا، انھی بچوں میں سے بہت سے بچے بڑے ہو کر فلسفی بنیں گے، شاعر بنیں گے، سائنسداں بنیں گے، سقراط، کالی داس، غالب اور نیوٹن بنیں گے۔ اور پھر ہم اپنا سر اونچا کرکے کہہ سکیں گے کہ ہمارا ملک سب سے مہذب ہے۔"

"لیکن میاں مسعود جو لوگ بچے نہیں ہیں، بڑے اور بال بچے والے ہو گئے ہیں، اور پڑھنا لکھنا نہیں جانتے ان کا کیا ہوگا؟" تاریخ کے استاد نے سوال کیا: "وہ تو بچوں کے اسکول میں پڑھنے نہیں جائیں گے اور نہ کوئی اسکول انھیں داخل ہی کرے گا۔ تو کیا ان بڑی عمر کے لوگوں کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے؟"

"اور کیا یہی کیا جا سکتا ہے جناب صدر؟ ان بڑی عمر کے لوگوں کا جو کچھ ہونا تھا، وہ تو ہو گیا، اب کچھ ایسا کرنا چاہیے کہ آئندہ یہ حالت نہ ہونے پائے" موہن لال نے مشورہ دیا۔

"مگر موہن لال جی، آپ نے یہ بھی سوچا کہ ہماری حکومت کیسے بنتی ہے، لوگوں کے ووٹ سے ایک پارلیمنٹ منتخب ہوتی ہے، اور پارلیمنٹ کے ممبر اپنے میں سے صدر، وزیر اعظم اور دوسرے وزیر چنتے ہیں، اور

شدہ بھی حکومت کے کام کاج میں برابر رائے مشورہ دیتے رہتے ہیں ۔ ووٹ کا حق تو انھی بڑی عمر کے لوگوں کو حاصل ہے ۔ تو جب تک آج کے چھوٹے چھوٹے بچے بڑے ہو کر ووٹ دینے کے قابل نہیں ہو جاتے، اس وقت تک تو یہی بڑی عمر کے ووٹر حکومت بنائیں گے، جن میں سو میں سے ۸۰ کے حساب سے لوگ تعلیم یافتہ ہونا تو دور رہا، پڑھنا لکھنا تک نہیں جانتے ......"

" اور پڑھنا لکھنا تہذیب کی بنیاد ہے، جب یہ بنیاد ہی غائب ہو تو تہذیب کہاں، اور مہذب لوگ کہاں، تو ثابت ہوا کہ جب تک بچے لکھ پڑھ کر مہذب شہری نہیں بن جاتے، اس وقت تک ہماری حکومت غیر مہذب لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی۔" میمونہ بھی جو اب تک چپ سادھے بیٹھی تھیں، بول اٹھیں۔

" کیا حسابی جواب دیا ہے میمونہ صاحبہ نے جناب صدر، چونکہ ۳ × ۲ = ۶، اور ۲ × ۳ بھی ۶ اور چونکہ ان دونوں میں ۲ مشترک ہے، اس لیے ۳ اور ۳ برابر ہوئے۔ واہ وا، سبحان اللہ" موہن لال نے چٹکی لی، اور پوری مجلس میں قہقہہ پڑ گیا۔

غریب میمونہ کچھ جھینپ سی گئی، مگر اس نے بات بڑے پتے کی کہی تھی۔ تاریخ کے استاد نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

" بھئی یہ ٹھیک نہیں، مہذب بات چیت کی شان یہ ہوتی ہے کہ سب کی بات پر غور کیا جائے، اور جس بات میں وزن ہو، اسے مان لیا جائے۔ میمونہ نے جو بات کہی ہے، اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے یا تو یہ کہو کہ پڑھنا لکھنا تہذیب کی بنیاد ہی نہیں ہے لیکن اگر یہ بات تسلیم کرتے ہو تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو لوگ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے، وہ تہذیب نہیں جانتے، اور اس حالت میں ان کے ووٹوں سے جو پارلیمنٹ اور حکومت بنے گی، وہ غیر مہذب لوگوں کی حکومت ہو گی۔"

" لیکن جناب والا، اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان بڑی عمر کے لوگوں کو بھی پڑھانے کا انتظام کرنا چاہیے تو مشکل یہ پیش آتی ہے کہ بڑی عمر کے لوگ پڑھنا لکھنا سیکھ ہی نہیں سکتے۔" عارف میاں نے جو تہذیب میں ہندوستان کے اول نہ ہونے کا فیصلہ سن کر بہت دیر سے چپ سادھے بیٹھے تھے، زبان کھولی۔

(باقی آئندہ)


میں ابّا سے کہہ دوں گی کہ تم ان کی
قمیض سے پتھر توڑ رہے تھے۔
عملی سبق



آیئے آج آپ کے سامنے ایک انوکھی چیز پیش کریں۔ "جانوروں کا مشاعرہ"۔ یہ بزم خالد رحیم صاحب نے سجائی ہے اور خوب سجائی ہے۔ یہ مشاعرہ غیر طرحی ہے اور غزل، نظم، آزاد نظم وغیرہ اردو شاعری کی سبھی قسمیں آگئی ہیں۔

اس مضمون میں کچھ مشکل لفظ بھی آگئے ہیں۔ یہ لفظ مشاعروں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کی جگہ ہم نے آسان الفاظ نہیں لکھے ہیں۔ مشاعرے کا لطف جاتا رہے گا۔ آپ کو سمجھنے میں دقت ہو تو اپنے اردو کے استاد سے معلوم کر لیجیے گا ——— ایڈیٹر

گیدڑ (سکریٹری) میں آج کے جلسے کی صدارت کے لیے محترم جناب شیر صاحب گرجؔ کا نام تجویز کرتا ہوں۔

(کئی آوازیں ایک ساتھ) ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔

گیدڑ (سکریٹری) اب میں محترم جناب شیر صاحب گرجؔ سے گزارش کروں گا کہ وہ صدارت کی کرسی پر آ کر جلوہ افروز ہوں۔

(شیر صدارت کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور میز پر رکھے ہوئے پروگرام کو پڑھ کر اعلان کرتا ہے)

شیر صاحب گرجؔ: میں جناب سکریٹری صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ ماہانہ مشاعرے کی رپورٹ



پیش کریں۔

(گیدڑ ایک کاغذ لے کے اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے اور مائیک کے سامنے کھڑا ہو کر رپورٹ پڑھنا شروع کرتا ہے)

گیدڑ: (سکریٹری) — محترم صدر اور پیارے دوستو!

یہ ترقی کا زمانہ ہے اور آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وقت جہاں انسانوں نے بہت ساری ترقیاں کیں وہاں ہم جانوروں نے بھی کبھی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔

یہ بات ہمارے لیے باعث فخر ہے کہ ہم نے ہمیشہ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ قدم اٹھایا ہے۔ ہر نئے دور کی اچھائیوں کو اپنایا ہے۔ آج کا مشاعرہ خود اس بات کی گواہی دے گا۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس بزم کے تحت جب بھی مشاعرہ ہوگا غیر طرحی ہوگا۔ کیونکہ طرحی مشاعروں سے ایک بہت بڑا نقصان ہوا۔ ہر شاعر ایک ہی طرح کی شاعری کرنے لگا۔ اور سبھی کے اچھے برے خیالات قافیے اور ردیف کی بندشوں میں جکڑ کر ایک ہی سانچے میں ڈھل گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادب کو ایک ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچا۔

(سکریٹری رپورٹ پڑھنے کے بعد غیر طرحی مشاعرے کا اعلان کرتا ہے اور شعراء کی فہرست لے کر ایک کونے میں مائیک کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔)

لیڈر (سکریٹری) آج کے مشاعرے کا آغاز ہمارے نوجوان شاعر جناب مرغا صاحب ککڑوں کوں سے ہو رہا ہے۔ اب میں جناب مرغ صاحب ککڑوں کوں سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمائیں۔

(مرغا مائیک کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

مرغا: ایک غزل پیشِ خدمت ہے۔

سامعین (سننے والے) ارشاد۔

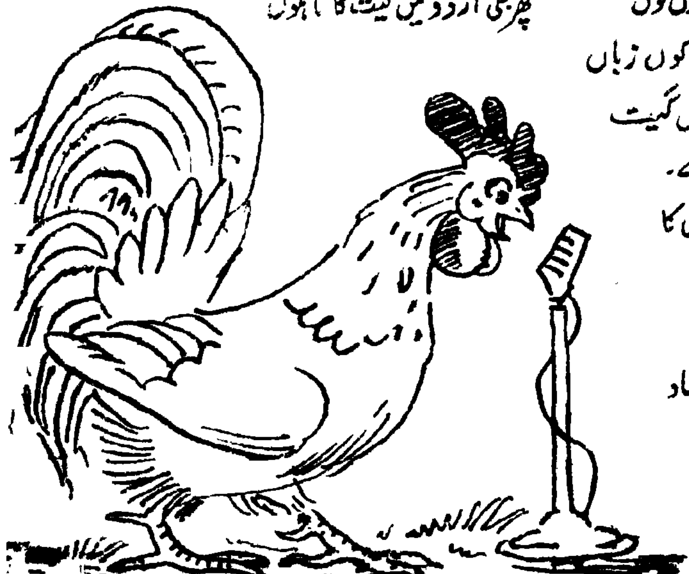
مرغا: عرض کیا ہے ؎

ساز دل پہ ہمیشہ گاتا ہوں — غم کے سائے میں مسکراتا ہوں
روز دے کر اذان وقتِ سحر — سونے والوں کو میں جگاتا ہوں
تھام لیتے ہیں سننے والے دل — جب بھی کوئی غزل سناتا ہوں
یوں تو میری زباں ہے ککڑوں کوں — پھر بھی اردو میں گیت گاتا ہوں

سامعین (سننے والے) ککڑوں کوں زباں ہونے کے باوجود اردو میں گیت گانا واقعی قابلِ قدر ہے۔ خدا کرے یہ اردو نوازی کا جذبہ ہمیشہ قائم رہے۔

مرغا: مقطع ارض کیا ہے۔

سامعین (سننے والے) ارشاد — ارشاد۔



مرغا: وادیٔ عشق کا ہوں میں مرغا   روز الفت کے گیت گاتا ہوں

سامعین (سننے والے) واہ بھئی واہ۔ بڑی پیاری غزل کہی ہے۔

گیدڑ (سکریٹری) اب میں جناب بکری صاحبہ میں سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنا کلام سنا کر سامعین کو محظوظ فرمائیں)

(بکری میں میں کرتی مائیک کے سامنے نزاکت کے ساتھ کھڑی ہو جاتی ہے)

بکری: ایک غزل پیش کرتی ہوں۔

سامعین (سننے والے) ارشاد۔



زندگی یوں تو خوبصورت ہے   سبزیوں کی مگر ضرورت ہے
پھرتی رہتی ہوں اونچے ٹیلوں پر   جنگلوں سے مجھے محبت ہے
کھیت میں دوسروں کے چرتی ہوں   مجھ میں یہ بھی انوکھی عادت ہے

سامعین (سننے والے) واہ بھئی واہ، کیا عادت پائی ہے۔

سبحان اللہ۔

بکری: آگے عرض کیا ہے

سامعین (سننے والے) ارشاد۔

بکری: کب تک میں مناؤں خیر اپنی   ذبح ہونا ہی میری قسمت ہے
کیوں نہیں دیتی دودھ میں زیادہ   میرے مالک کو یہ شکایت ہے

گیدڑ: (سکریٹری) اب میں جناب اونٹ صاحب بانکے سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔

(اونٹ ہلتا ڈولتا مائیک کے سامنے آتا ہے اور بھرائی ہوئی آواز میں پڑھنا شروع کرتا ہے)

اونٹ: ایک غزل حاضر خدمت ہے۔

سامعین (سننے والے) ارشاد۔

اونٹ: یہ کیسے کہوں مجھ میں خامی نہیں   مری کوئی بھی کل تو سیدھی نہیں

کرے مجھ سے کوئی محبت تو کیوں　　مری شکل میں دلکشی بھی نہیں
مرے منہ میں زیرے کا دانہ تو ہے　　بلا سے اگر بھوک مٹتی نہیں
مرے جسم کی ٹیڑھی میڑھی شکن　　کہیں پیچ و خم راستوں کی نہیں

سامعین : (سننے والے) واہ صاحب واہ، بڑی ہی پیاری غزل ہے۔

گیدڑ : (سکریٹری) اب آپ کے سامنے ہمارے نوجوان ترقی پسند شاعر جناب ہرن صاحب آہو تشریف لا رہے ہیں۔ میں ہرن صاحب آہو سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے کلام سے ہمیں محظوظ فرمائیں۔

(ہرن مائیک کے سامنے چھلانگ لگاتا ہوا آجاتا ہے اور ترنم کے ساتھ پڑھنا شروع کرتا ہے)

ہرن : ایک نظم پیش کر رہا ہوں، جس کا عنوان ہے "نیا عزم"

سامعین (سننے والے) ارشاد۔

ہرن :　اونچے ٹیلوں سے پرے، رینگتے سایوں سے پرے
سوچتا ہوں کہ کہیں دور چلا جاؤں گا
مڑ کے دیکھوں گا نہ اک بار وطن کی جانب
اپنی نظریں نہ اٹھاؤں گا چمن کی جانب
سوچتا ہوں کہ کہیں دور چلا جاؤں گا
جہاں چیتا نہ ہو انساں کی طرح سے خونخوار
جہاں مظلوم کے کندھوں پہ نہ ہو ظلم کا بار
سوچتا ہوں کہ کہیں دور چلا جاؤں گا
میں جہاں چوکڑی آزادی سے بھر پاؤں گا
میں اُسی کوہ، اُسی دشت میں بس جاؤں گا
سوچتا ہوں کہ کہیں دور چلا جاؤں گا
اونچے ٹیلے سے پرے، رینگتے سایوں سے پرے



سامعین (سننے والے) واہ بھئی واہ. کیا نظم کہی ہے. بڑی ہی پیاری نظم ہے! "بھرپاؤں گا" کیسے موقع سے کھپایا ہے۔

گیدڑ (سکریٹری) نوجوان شاعر ہرن صاحب آہو کے بعد اب آپ کے سامنے ہمارے کہنہ مشق شاعر جناب گدھا صاحب ڈھینچوں تشریف لا رہے ہیں۔ جو ہمارے اس جنگل کے صفِ اول کے شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔

(گدھا سامنے ہی کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا آہستہ آہستہ مائیک کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ترنم سے پڑھنا شروع کر دیتا ہے)

گدھا: ایک غزل سنئے۔

سامعین (سننے والے) ارشاد

گدھا: عرض کیا ہے۔

سامعین (سننے والے) ارشاد — ارشاد۔

گدھا:

رات دن بوجھ ڈھوتا رہتا ہوں
اپنی قسمت کو روتا رہتا ہوں

کام کرتا ہوں صبح و شام بہت
پھر بھی بدنام ہوتا رہتا ہوں

کپڑے دھوتا ہے جب مرا مالک
میں پڑا دور سوتا رہتا ہوں

ڈھینچوں ڈھینچوں کے راگ میں اکثر
دل کی باتیں سموتا رہتا ہوں

سامعین (سننے والے) بہت خوب، بہت خوب۔

گیدڑ (سکریٹری) اس کے بعد میں جدت پسند شاعر جناب خرگوش صاحب خرگوش سے گزارش کروں گا کہ اپنے کلام سے سامعین (سننے والوں) کو محظوظ اور لطف اندوز فرمائیں۔

(خرگوش کودتا ہوا ڈائس پر آ جاتا ہے اور مائیک کو اس کے قد کے برابر ٹھیک کر دیا جاتا ہے)

خرگوش : لیجیے ایک آزاد نظم سُنیے، عنوان ہے "بے وفا"



دیکھو چمن کی اُدھر[1] تم
آئی بہار
کھلنے لگی چنچل کلی
دیکھو
وہ مدماتی پَوَن[2]
ہر اک کلی کو چومتی
پھر آگئی
پھولوں سے پھر خوشبو اُڑی
خوشبو اُڑی
لیکن یہ کیا آواز ہے
نے سوز ہے
نے ساز ہے
لیکن یہ کیا آواز ہے
شاید کوئی بھونرا اِدھر
پھر آرہا ہے جھوم کے
تم آج پھولوں کے قریب
دیکھو! اُسے جانے نہ دو
وہ "بے وفا" ہے
چوس کر پھولوں کا رس اُڑ جائے گا۔

---

۱ طرف ۲ ہوا

سامعین (سننے والے) سبحان اللہ کیا شاعری کرتے ہیں خرگوش صاحب! بڑی پیاری نظم کہی ہے۔

گیدڑ (سکریٹری) اب میں جناب چوہا صاحب چوں چوں سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے کلام سے ہمیں لطف اندوز فرمائیں۔

(چوہا کودتا ہوا مائیک کے سامنے آجاتا ہے اور ہلکی ہلکی آواز میں پڑھنا شروع کر دیتا ہے)

چوہا: ایک معریٰ نظم پیشِ خدمت ہے عنوان ہے "ڈرتے ہیں"



صرف کہنے کو چھوٹا سا ہوں میں
میں جو چاہوں تو توڑ دوں یہ پہاڑ
یہ مکانوں کی پختہ دیواریں
روک سکتیں نہیں مرا رستہ
لاکھ تہہ خانوں میں کوئی رکھے
گیہوں، چاول کی بوریاں لے کر
میں لگا لوں گا، ایک پل میں سُراغ
اور یہی بات ہے کہ مدّت سے
مجھ سے ڈرتے ہیں، خوف کھاتے ہیں
نفع خور اور لالچی تاجر

سامعین (سننے والے) واہ بھئی واہ کیا خوب طنز کیا ہے آپ نے۔

گیدڑ (سکریٹری) اب میں جناب محترمہ بلّی صاحبہ میاؤں سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے کلام سے نوازیں۔

(بلی ڈائس پر آکر مائیک کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔

بلّی: ایک غزل حاضر خدمت ہے۔

سامعین (سننے والے) ارشاد۔ ارشاد۔

بلّی: عرض کیا ہے۔

سامعین (سننے والے) ارشاد، ارشاد۔

بلّی : جذبی سے معذرت کے ساتھ



ٹھہر واک زور کی آواز لگا لوں تو چلوں
رعب چوہوں پہ ذرا اپنا جما لوں تو چلوں
خواب میں دیکھتی رہتی ہوں ہمیشہ چھیچڑے
کسی گھر سے میں چُرا کر انھیں کھا لوں تو چلوں
حج کو جانے کی تمنا تو ہے مدت سے مگر
نو سو چوہوں کو خوراک اپنی بنا لوں تو چلوں
زہے قسمت کہ میرے بھاگوں سے چھینکا ٹوٹا
بھوک بڑھتی ہوئی میں آج مٹا لوں تو چلوں
دودھ کے دھوکے میں پی رکھی ہے دارو میں نے
ٹھہرو کچھ دیر کہ میں ہوش میں آ لوں تو چلوں

سامعین (سننے والے) بہت خوب، بہت خوب، واہ واہ واہ۔



گیدڑ (سکریٹری) اس کے بعد ہمارے ہر دل عزیز شاعر جناب کُتّا صاحب بھوں سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنا کلام سنا کر محظوظ فرمائیں۔

(کُتّا بھوں بھوں کرتا مائیک کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے پُر درد ترنّم سے پڑھنا شروع کر دیتا ہے)

کُتّا : ایک غزل پیش کر رہا ہوں۔

میں جسے پھول سمجھتا تھا وہ کانٹا نکلا
یعنی یہ شہر تمنا بھی تو صحرا نکلا

زندگی سے جو کبھی اپنی ہوا میں بے زار — موت کو ڈھونڈتا مسجد کی طرف آ نکلا
کام گھر کا ہی کیا، اور نہ کبھی گھاٹ گیا — دھوبی کے گھر سے ہمیشہ ہی میں روتا نکلا
میں جہاں بیٹھا وہاں دُم کو ہلا کر بیٹھا — پھر مری راہ میں کس طرح یہ کانٹا نکلا

سامعین (سننے والے) واہ بھئی واہ، بہت خوب بہت خوب۔

گیدڑ (سکریٹری) اب میں شاعرِ انقلاب جناب گھوڑا صاحب اسپ سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنی انقلابی نظم سے ہمیں نوازیں۔

(گھوڑا دوڑتا ہوا ڈائس پر آجاتا ہے اور مائیک کے سامنے کھڑا ہو کر پُرجوش ترنم سے پڑھنا شروع کر دیتا ہے، اس کا عنوان ہے "امن کا نعرہ")

گھوڑا: کب تک ان زرداروں کے ظلم و ستم سہتا رہوں
پیٹھ پر لادے انھیں میں کو بہ کو پھرتا رہوں
کب تک ان کے ہی اشاروں پر بڑھاؤں میں قدم
کب تک آخر میں رہوں گا ان کا محتاجِ کرم

کہہ دو زرداروں سے ایسا دور بھی اک آئے گا
نوچ کر جب جسم سے مظلوم بوٹی کھائے گا
کس طرح روکے گا کوئی بڑھ کے سیلابِ جنوں
منجمد ہو جائے گا اک دن زمیں پر گر کے خوں

رنگ لا کر ہی رہے گی خون میں لتھڑی یہ شام
ٹوٹ کر رہ جائے گا پھر ظلم کے ہاتھوں کا جام
پھر سنائی جائے گی امن و اماں کی داستاں
امن کے نعروں سے گونجیں گے زمین و آسماں

سامعین (سننے والے) واقعی انقلابی نظم ہے، کیا بات کہی ہے۔ بہت خوب، بہت خوب۔

گیدڑ (سکریٹری) اب میں جناب بندر صاحب بندر سے
گزارش کروں گا کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔
(بندر اچھلتا ہوا مائیک کے سامنے آکر بیٹھ جاتا
ہے)
بندر: میں نے یہ گیت خاص کر بچوں کے لیے کہا ہے۔
(بچے خوشی سے تالیاں بجاتے ہیں)
بندر: کالے منہ کا بندر ہوں میں

مجھ سے میرا نام نہ پوچھو
آؤ مجھ کو پاس سے دیکھو
ہاں ہاں بچو، ہاں ہاں بچو
کالے منہ کا بندر ہوں میں
میں جو دوڑوں خُرخُر کرکے
چھپ جاتے ہیں بڑھے بچے
مجھ سے کیوں ڈرتے ہیں بولو؟
کالے منہ کا بندر ہوں میں

(واہ واہ کی آواز کم آتی ہے مگر تالیوں سے محفل گونجنے لگتی ہے)
گیدڑ (سکریٹری) اب میں جدت پسند شاعر جناب ریچھ صاحب بھالو سے گزارش کروں گا کہ اپنا کلام
سنا کر سامعین (سننے والوں) کو محظوظ فرمائیں۔
(ریچھ جھومتا ہوا ڈائس پر آجاتا ہے)
ریچھ: ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "شکاری کون؟"

کل شب میں نے خواب میں دیکھا



ایک شکاری آکر مجھ سے
پوچھ رہا تھا
شہر کا رستہ
میں نے دل ہی دل میں سوچا
اس کو راہ غلط پر لاکر
کھا جاؤں گا
لیکن جب میں نیند سے جاگا
دیکھا خود ہی قید ہوا تھا

سامعین (سننے والے) واہ کیا اچھوتا خیال ہے۔ بہت خوب، بہت خوب۔

گیدڑ (سکریٹری) اس کے بعد اب میں جناب ہاتھی صاحب فیلؔ سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔

(ہاتھی مائیک کے سامنے آکر کھڑا ہوتا ہے، اور سامعین (سننے والوں) سے معذرت طلب کرتے ہوئے کہتا ہے۔)

ہاتھی: حضرات میں آپ سے معذرت چاہوں گا کیونکہ آج میری طبیعت کچھ ناساز ہے۔ مجھے زکام ہو گیا ہے۔

(یہ کہہ کر ہاتھی واپس لوٹ جاتا ہے اور اپنی کرسی پر جاکر بیٹھ جاتا ہے۔)

گیدڑ (سکریٹری) اب میں محترمہ جناب لومڑی صاحبہ لومڑیؔ سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنا پُرلطف شعر سناکر ہمیں بھی لطف اٹھانے کا موقع دیں۔

(لومڑی مائیک کے سامنے آکر کھڑی ہوجاتی ہے۔)

لومڑی: ایک غزل پیش کرتی ہوں۔

سامعین (سننے والے) ارشاد۔



لومڑی: عرض کیا ہے۔
میں دنیا کو چکر میں لاتی رہوں گی
میں رہزن کو رہبر بناتی رہوں گی
میں دوں گی نہ پیاسوں کو اک بوند پانی
ستاتی ہوں ہر دم ستاتی رہوں گی
مجھے شیر کا ڈر نہ چیتے کا خطرہ
میں باتوں میں سب کو پھنساتی رہوں گی

سامعین (سُننے والے) واہ واہ، بہت خوب۔
(شیر قہر بھری نگاہوں سے لومڑی کی طرف دیکھتا ہے اور زور زور سے گرجنے لگتا ہے۔ شیر کے غصے کو دیکھ کر سامعین (سننے والے) سہم جاتے ہیں۔)

لومڑی: مقطع عرض کیا ہے۔
سامعین (سننے والے) ارشاد۔
لومڑی: میں ہوں لومڑی شیر سے عقلمند
میں طاقت کے سر کو جھکاتی رہوں گی
(سامعین خاموش رہتے ہیں، کسی قسم کی کوئی آواز کہیں سے نہیں آتی ہے)
گیدڑ (سکریٹری) اب میں محترم صدر جناب شیر صاحب گرج سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے کلام سے سامعین کو مستفید فرمائیں۔
(شیر کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور وہ غصے میں گرجتا ہوا مائیک کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے)
شیر: مجھے لومڑی کے چند اشعار پر سخت اعتراض ہے جس سے میری توہین ہوئی ہے۔ اور میں اپنی توہین کسی حالت میں برداشت نہیں کر سکتا۔ بہر حال دو قطعے پیش کر رہا ہوں جسے میں نے ابھی ابھی

لومڑی کے اشعار سے متاثر ہوکر کہے ہیں۔ عرض کیا ہے۔

سامعین (سننے والے) (ربی زبان میں) ارشاد، ارشاد۔

شیر: پہلا قطعہ یوں ہے

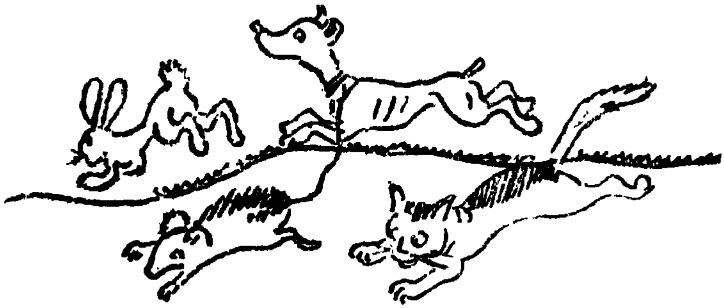
کیا تری زیست تجھے بار ہوئی جاتی ہے
کیا تری موت تجھے پاس نظر آتی ہے
کچھ تو بتا [illegible] تری کیا معنی
بول اے لومڑی کیا سوچ کے گھبراتی ہے

سامعین (سننے والے) واہ واہ، بہت خوب۔

شیر: دوسرا قطعہ یوں ہے

اپنی اُلفت کو میں نفرت میں بدل سکتا ہوں
اپنے پیروں سے تجھے بڑھ کے کچل سکتا ہوں
بھاگ کر میری نگاہوں سے کہیں تو چھپ جا
ورنہ میں تجھ کو تو زندہ بھی نگل سکتا ہوں

(اس کے بعد شیر غصے میں زور زور سے گرجنے لگتا ہے۔ اُس کے غصے کو دیکھ کر سامعین (سننے والے) بھاگ جاتے ہیں اور شکریہ ادا کیے بغیر مشاعرہ ختم ہو جاتا ہے)



جناب فیضی نظامپوری

کارنامہ

ایک دن شیطاں نے شاگردوں سے اپنے یہ کہا
اپنی مرضی کے مطابق میں نے جو چاہا کیا

دیکھتے ہو اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں دوستو!
جانشیں اپنا بنانا چاہتا ہوں دوستو!

سب سے اچھا کارنامہ کر کے جو دکھلائے گا
اے عزیزو جانشیں میرا وہی کہلائے گا

کر رہا ہوں تم کو میں ہوشیار اس کے واسطے
کر لو اپنے آپ کو تیار اس کے واسطے

اس طرح پھیلاؤ دنیا میں طلسمی جال کو
تاکہ کوئی بھی نہ پہچانے تمہاری چال کو

نوعِ انسانی کو بہکانا تمہارا کام ہے
ان کو اپنے دام میں لانا تمہارا کام ہے

مطمئن جو بھی کرے گا مجھ کو اپنے کام سے
خوب مالا مال کر دوں گا اُسے انعام سے

سن کے 'یہ مژدہ' ہوئے وہ سب کے سب ہی شادماں
تھا کٹھن لیکن ہر اک کے واسطے یہ امتحاں

صبح دم نکلے وہ آخر اپنے اپنے کام کو
اور پھر شیطان کی خدمت میں پہنچے شام کو

اپنے اپنے کام پہ سب کو غرور و ناز تھا
جیسے ان کا کارنامہ بھی کوئی اعجاز تھا

اپنے اپنے کام پہ ہر اک کو تھا یہ اعتبار
اس سے بہتر ہو نہیں سکتا کوئی دنیا میں کار

کارناموں کو سنانے کی اجازت مل گئی
رنگ محفل میں جمانے کی اجازت مل گئی

پہلے اک شاگرد نے جھک کر ادب سے یہ کہا
کر دیا ہے میں نے اک بھائی کو بھائی سے جدا
دوسرے نے بڑھ کے آگے فخر سے یہ کہہ دیا
کل میں اک مزدور سے پکی سڑک پر جب ملا
اتنی سی تنخواہ میں کیسے گزر ہوگا ترا
آمرے ہمراہ میرے ذہن میں اک بات ہے
ہر طریقہ کھیل کا پہلے اسے سمجھا دیا
ایک کے دس ہوتے دیکھے جب نظر کے سامنے
گھر گیا خالی، تو وہ بھی ہاتھ خالی گھر گیا
بھوک کی شدت سے بچے سب بلکتے رہ گئے
اس سے بڑھ کر کارنامہ ہو نہیں سکتا کوئی
تیسرا پھر مسکرا کر فخر سے کہنے لگا
کارنامہ اس سے بہتر مجھ سے تم سن لو ذرا
رازدارانہ کہا اُس سے کہ "اے صاحب نظر
"ایک مندر میں کسی نے گوشت لاکر رکھ دیا
"اس خبر کو شائع کر دو اپنے پرچے میں ذرا
میری مرضی کے مطابق کام جب اس نے کیا
برسرِ پیکار پھر ہندو مسلماں ہو گئے

کارنامہ اس جہاں میں ہے مرا سب سے بڑا
جن میں تھی سچی محبت، جن میں سچا پیار تھا
اے حضور اس سے تو بڑھ کر کارنامہ ہے مرا
دیکھ کر تنخواہ اس کے ہاتھ میں، میں نے کہا
دے گا یہ کس کس کو اور تو اس سے کیا کیا لائے گا
لکھ پتی تجھ کو بنا دے گی وہ میری ذات ہے
اور جوئے گھر کا بھی اس کو راستہ دکھلا دیا
رکھ دی اس نے ساری پونجی ایک گھر کے سامنے
اس طرح وہ وقت سے پہلے ہی اپنے مر گیا
نیند بھی آتی نہ تھی، شب بھر سسکتے رہ گئے
بیج یوں تخریب کے تو بو نہیں سکتا کوئی
سچ بتاؤ یہ بھی کوئی کارنامہ ہے بھلا
ایک ایڈیٹر سے میں دفتر ہی میں جاکر ا
میں تمہارے واسطے لایا ہوں اک تازہ خ
کام کر سکتا نہیں کوئی یہ مسلم کے سر
دیکھنا ہے کس طرح دیتے ہو تم اس کو ہم
ہر گلی کوچے میں دیکھا اک نیا محشر
دشمنِ دیں، دشمنِ زر، دشمنِ جاں ہو گ

کھیلتا تھا خون کی ہولی ہر اک پیر و جواں
گو بجتی تھی اک صدائے الحفیظ و الاماں

کچھ نہ پوچھو تھا وہ کیسا بربریت کا سماں
دامنِ انسانیت کی اُڑ رہی تھیں دھجیاں

اب بتاؤ اس سے بڑھ کر ہے کسی کی داستاں
اتنا کہہ کر ہو گیا خاموش وہ جادو بیاں

باری باری کارناموں کو کیا سب نے بیاں
اک سے اک بڑھ کر تھی اُن کی داستانِ خونچکاں

ہاں مگر ان میں سے اک خاموش تھا غمگین تھا
کارنامہ اس کا لیکن کس قدر سنگین تھا

دیکھ کر خاموش، شیطاں نے کیا اس سے سوال
ذرا تو کہنے میں ہے مانع تجھے کس کا خیال

حکمِ شیطاں پا کے وہ بھی یوں سخن گستر ہوا
ہر رگ و پے کے لیے اس کا بیاں نشتر ہوا

ہوں خجل میں کارنامے کو بیاں کرتے ہوئے
شرم آتی ہے مجھے اس کو عیاں کرتے ہوئے

سوئے مکتب جا رہا تھا ایک طفلِ ناتواں
جاتے جاتے آ گیا مجھ کو نظر وہ ناگہاں

چھیڑ دی میں نے پھر اس سے ایک رنگیں داستاں
اور کی میں نے برائی علم کی اس سے بیاں

رفتہ رفتہ میری باتوں سے اُسے رغبت ہوئی
علم و فن سے زندگی بھر کے لیے نفرت ہوئی

پھینک کر بستہ وہیں، وہ مسکراتا چل دیا
"علم ہے بے کار شے" یہ گنگناتا چل دیا

بن گیا آوارہ وہ بھی مدرسے کو چھوڑ کر
ہو گیا برباد آخر، علم سے منہ موڑ کر

سنتے ہی یہ کارنامہ جھوم اٹھا شیطان بھی
مرحبا صد مرحبا کہنے لگا شیطان بھی

آج تو نے کر دیا ہے میرے دل کو شادماں
تو ہوا اس امتحاں میں کامیاب و کامراں

کر دیا تو نے ادا اب میری شاگردی کا حق
در حقیقت میرے تخت و تاج پر ہے تیرا حق

کارنامہ یہ ترا سب سے بڑا ہے بالیقیں
فخر سے کہتا ہوں میں ہے تو ہی میرا جانشیں

زمین کی کشش

جناب اکرام احمد

ہر روز آپ دیکھتے ہیں کہ پیڑوں کے پتے جھڑ کر نیچے گر جاتے ہیں۔ کٹی ہوئی پتنگ بھی آہستہ آہستہ نیچے آجاتی ہے۔ ایک پتھر کو زور سے اوپر پھینکیے، پھر تھوڑی دیر میں وہ بھی واپس آگیا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ بندوق کی گولی اوپر کی طرف فائر کی جائے تو وہ واپس زمین کی طرف نہ آتی ہو بلکہ سیدھی آسمان کی طرف چلتی چلی جاتی ہو۔ اگر آپ کے پاس ہوائی بندوق ہو تو تجربہ کرکے دیکھیے، معلوم ہوگا کہ وہ بھی تھوڑی دیر بعد زمین پر آگری۔ غرض آپ جتنا مشاہدہ کیجیے اور سوچیے یہی معلوم ہوگا کہ ہر چیز زمین پر گرتی ہے۔ پرانے زمانے کے بڑے بڑے قلعہ اور محل بھی ڈھے کر زمین پر آگئے۔

کیا کبھی آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ سب چیزیں زمین کی طرف ہی کیوں آتی ہیں؟ پہلی بار اس پر سر اسحاق نیوٹن نے سوچا۔ طویل مشاہدہ اور تجربے کے بعد انھوں نے دریافت کیا کہ زمین ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

گویا سوکھے پتے اور کٹی پتنگ یہ دونوں چیزیں اسی لیے نیچے گریں کہ زمین نے انھیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ پرانے مکانات کے پتھروں کو بھی زمین ہر وقت اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ جہاں کمزور ہوئے اور نیچے گرے۔ آپ جہاز میں بیٹھ کر زمین سے دور جانا چاہتے ہیں اور زمین آپ کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ جہاں جہاز میں خرابی ہوئی اور

زمین کی اسی کشش کی وجہ سے نیچے گر گیا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ زمین کی کشش کتنی نقصان دہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو جہاز کبھی نہ گرتا۔ جس طرح چاہتے ہم ہواؤں میں اڑتے پھرتے بندوق کی گولی کو چاند پر داغ دیتے۔ کتنا مزا آتا!

لیکن یہ خیال مناسب نہیں۔ جہاں دو ایک نقصان نظر آرہے ہیں وہاں اس کشش کے فائدے بھی ہیں بہت سے فائدے۔ دیکھیے ہوا سے آپ کی ٹوپی اڑی مگر زمین نے اسے کھینچ لیا اور آپ نے دوڑ کر زمین سے اُسے اٹھا لیا۔ اگر زمین نہ کھینچتی تو پتہ نہیں یہ کہاں پہنچتی، چاند پر، سورج پر یا اس سے بھی اور آگے!

آپ کا دل آم کھانے کو چاہتا ہے یا پپیتا توڑنے کو۔ ایک لمبا بانس لیا اور نیچے گرا لیا۔ لیکن یہ نیچے گرا کیوں؟ زمین کی کشش کے باعث۔ اگر یہ کشش نہ ہوتی تو معلوم نہیں یہ دونوں کے دونوں کس تارے میں جاکر پہنچتے اور آپ خالی ہاتھ منھ بسورتے رہ جاتے۔

آپ ذرا سا گلاس ٹیڑھا کرکے آسانی سے پانی پی لیتے ہیں۔ کبھی گلاس سے پانی آپ کے منھ میں کیسے آگیا۔ اس کو بھی زمین نے اپنی طرف کھینچا تھا ورنہ پانی گلاس سے باہر نہیں نکلتا۔ خیر چلیے پانی منھ میں آگیا۔ اب یہ حلق سے نیچے پیٹ میں گیا تو خود بخود چلا گیا۔ یا اندر سے کسی چیز نے اسے کھینچ لیا۔ اک ذرا سوچیے تو معلوم ہوگا کہ یہ بھی زمین کی کشش کا کرشمہ ہے۔ اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے حلق سے نوالہ کیسے نیچے اُترتا ہوگا۔

یہ تو تھیں چند معمولی مثالیں۔ اب ذرا اور آگے چلیں۔ کبھی آپ نے برسات میں سائیکل کی پہیے کی طرف دیکھا ہے؟ کس قدر کیچڑ لگی رہتی ہے۔ ذرا زور سے گھمایئے لیجیے۔ کیچڑ اِدھر اُدھر اچھلنے لگی۔ آپ کی زمین بھی تو ہر وقت گھومتی رہتی ہے۔ پھر یہ سمندروں اور ندیوں کا پانی زمین سے دور کیوں نہیں؟ اس کی وجہ بھی وہ زمین کی کشش ہے۔

تمام درخت، مکان، مکانوں کا سامان۔ میز پر رکھی ہوئی کتاب۔ غرض ہر چیز کو زمین اپنی طرف کھینچے رہتی ہے۔ اسی لیے یوں کہیے کہ یہ سب زمین سے چپکی ہوئی ہیں۔ ایسا نہ ہو تو کوئی چیز نہ رہتی سب اِدھر اُدھر جا گرتیں۔ یہاں تک کہ ہمارے چاروں طرف جو ہوا ہے وہ بھی اڑ جاتی ہے اُسے بھی زمین کھینچے ہوئے ہے۔

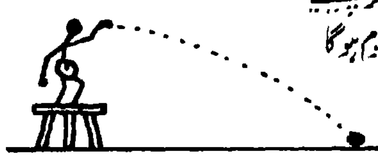
آپ نے خلائی جہازوں کے بارے میں سُنا

ہوگا۔ ابھی حال ہی میں امریکہ نے جیمنی ۷ نام کا ایک خلائی جہاز چھوڑا تھا اس میں دو آدمی بیٹھے تھے اور زمین کے گرد چکر کھا رہے تھے۔ اگر زمین میں کشش نہ ہوتی تو یہ اس طرح زمین کے گرد چکر نہ کھا سکتے آپ کو ہم مختصر طور پر بتاتے ہیں کہ یہ کیسے گھومتے ہیں۔ اگر آپ فرمایش کریں گے تو آئندہ کبھی تفصیل سے لکھیں گے۔

ایک تجربہ کیجیے۔ ایک پتھر جتنی دور پھینک سکتے ہیں پھینکیے۔ اب کسی مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر پھر پتھر پھینکیے، آپ دیکھیں گے

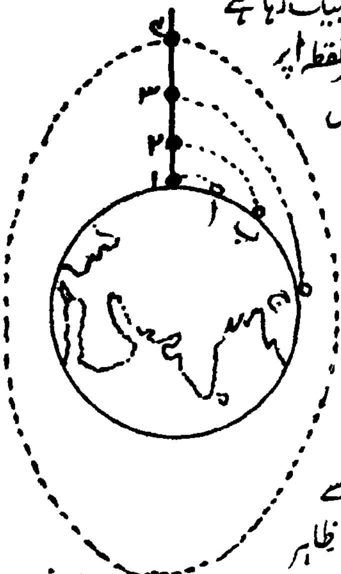


اس بار پتھر زیادہ دور ہوگیا اب کسی قریب کے مینار پر کھڑے ہو کر پھینکیے معلوم ہوگا



کہ پتھر اور دور گیا۔ آپ کو ایسا محسوس ہونے لگا ہوگا کہ اگر اور اونچائی پر کھڑے ہو کر پتھر پھینکا جائے تو وہ کافی دور جا کر گرے گا۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہماری زمین گول ہے۔ اب مان لیجیے کہ ایک شخص ا نقطہ پر کھڑا ہو کر پتھر پھینک رہا ہے اس کا پتھر نقطہ ا پر گرا۔ یہی شخص کسی اونچی جگہ نقطہ



۲ پر کھڑا ہوگیا، اور اسی طاقت سے پتھر پھینکا ظاہر ہے اس بار پتھر پہلے کی نسبت دور جائے گا۔ یعنی نقطہ ب پر گرے گا۔ اب یہ شخص کسی بہت اونچے پہاڑ (۳) پر کھڑا ہوگیا اور پھر پتھر پھینکا اور مان لیجیے اس بار پتھر ج پر گرا۔ اور نقطہ ا قطب شمالی ہے تو نقطہ ج خط استوا پر ہوا۔ تصویر میں اسی جگہ سے زمین نیچے کو گھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ شخص اور کافی اونچائی سے پتھر پھینکے تو وہ پتھر زمین

(باقی صفحہ ۱۵۱ پر)

نیا سال

جناب مُنیر الحسن منیرؔ

(۱)

فلک پر بھی تم جگمگا کر دکھاؤ
دیے علم کے تم ہر اک سو جلاؤ
جو غافل پڑے ہیں انھیں بھی جگاؤ
نئے سال میں کام یہ کر دکھاؤ

(۲)

وطن کی ترقی کو مقصد بناؤ
قدم اپنا آگے بڑھا کر دکھاؤ
برائی سے تم اپنا دامن بچاؤ
نئے سال میں کام یہ کر دکھاؤ

(۳)

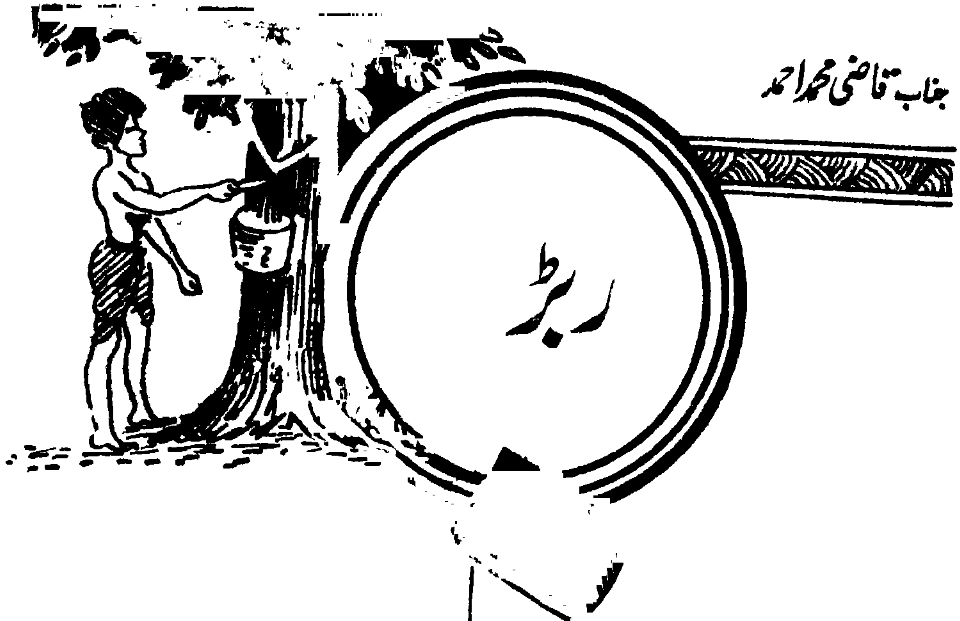
مسرت کا دنیا میں ڈنکا بجاؤ
نصیبوں کو تم اپنے روشن بناؤ
خوشی کی کرن ہر طرف جگمگاؤ
نئے سال میں کام یہ کر دکھاؤ

(۴)

کسی کو نہ دنیا میں ہرگز ستاؤ
ہر اک سے محبت سے تم پیش آؤ
خوشی کے ترانے جہاں کو سناؤ
نئے سال میں کام یہ کر دکھاؤ

(۵)

منیرؔ آرزو کے دِیوں کو جلاؤ
امنگیں نئی لے کے میداں میں آؤ
زمانہ کو کچھ اپنے جوہر دکھاؤ
نئے سال میں کام یہ کر دکھاؤ



ربڑ

جناب قاضی محمد احمد

موجودہ زمانے میں ربڑ اور ربڑ سے بنی ہوئی چیزوں کا استعمال اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ربڑ ضروریات زندگی کا ایک اہم جز ہے۔ زندگی کا ایک اہم جز نہیں تو موجودہ تہذیب کا اہم جز تو ضرور ہے۔ ہم سڑکوں پر لاکھوں اور کروڑوں جو گاڑیاں دیکھتے ہیں وہ اسی کی بدولت ہیں۔ طرح طرح کے جوتے اس سے تیار ہوتے ہیں۔ برسات میں جو برساتیاں ہم لوگ استعمال کرتے ہیں وہ اسی سے تیار ہوتی ہیں۔ اور اپنا لکھا ہوا آپ اسی ربڑ سے مٹاتے ہیں۔ اس طرح سینکڑوں اور ہزاروں استعمال انسان نے ربڑ کے معلوم کر لیے ہیں لیکن شاید آپ کو اس کا اندازہ نہ ہو کہ ہمیں یہ اہم چیز معلوم ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔

اب سے لگ بھگ ساڑھے چار سو سال پہلے کولمبس امریکہ پہنچا تو اس نے وہاں کے باشندوں کو ایک گیند سے کھیلتے دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک درخت کا دودھ ہے جسے وہ جما کر ٹھوس کر لیتے ہیں کولمبس اس انوکھے تحفے کو لے کر یورپ والوں نے عرصے تک اس

کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اٹھارویں صدی کے آخری حصے میں اس کے کچھ بھاگ کھلے انگلستان کے ایک کیمیاگر پریسٹلے نے معلوم کیا کہ اس سے پنسل کا نشان مٹایا جا سکتا ہے بس تب ہی سے اس کا نام ربر پڑا۔ ۱۸۱۲ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک شخص میکنٹاش نے معلوم کیا کہ بارش سے بچنے کے لیے برساتیاں بنائی جا سکتی ہیں لیکن اس کی برساتی میں یہ خرابی تھی کہ زیادہ گرمی میں یہ گوند کی طرح چپکنے لگتی تھی اور جاڑوں میں سلوٹیں پڑنے لگتی تھیں۔ لیکن ۱۸۴۲ء میں چارلس گوڈایر نے معلوم کر لیا کہ اگر خام ربڑ کو گندھک سے صاف کیا جائے تو یہ خامیاں دور ہو جاتی ہیں۔ بس اس کا معلوم ہونا تھا کہ ربڑ کے بوٹ اور جوتے بھی بننے لگے۔ ۱۸۸۸ء میں جان بائڈ ڈن لپ نامی ایک شخص نے ٹائر کی ایجاد کی۔ ڈن لپ کی اس ایجاد کی بدولت پہلے سائیکل اس کے بعد موٹروں، بسوں اور ٹرک وغیرہ کے پہیے بننے لگے۔

جیسے جیسے ربڑ کے نئے نئے استعمال معلوم ہوتے گئے ربڑ کی مانگ بڑھتی گئی۔ اس بڑھتی ہوئی ضرورت کو جنوبی امریکہ کے جنگلات پوری نہیں کر سکتے تھے کیونکہ پورے دن کی محنت کے بعد چند ربڑ کے درخت مل پاتے تھے۔

۱۸۷۶ء میں انگلستان کے ایک سائنسداں سر ہنری وہم نے برازیل (جنوبی امریکہ) سے ربڑ کے بیج حاصل کیے اور انھیں لندن کے قریب باٹینیکل گارڈن میں لگایا۔ یہاں اس کے پودے کچھ بڑے ہوئے تو انھیں لنکا اور ہندوستان میں منتقل کر دیا ان ملکوں کی آب و ہوا برازیل کی آب و ہوا سے ملتی جلتی ہے۔ ان علاقوں میں اس کے پودوں نے بہت اچھی نشو و نما پائی۔ بعد میں یہاں سے ان درختوں کے بیج جزائر شرق الہند اور ملایا بھیجے گئے یہاں کی آب و ہوا ربڑ کے لیے لنکا اور ہندوستان سے بھی بہتر ثابت ہوئی اور کافی رقبے پر اس کے باغات لگائے گئے۔ بعد میں یہاں سے ربڑ کی کاشت پورے جنوب مشرقی ایشیا میں پھیل گئی اور روز بروز اس کی کاشت کا رقبہ بڑھتا گیا۔

۱۹۰۰ء تقریباً ۵۰۰۰ ایکڑ رقبہ پر ربڑ کے باغات ایشیا میں لگ گئے تھے لیکن اس سال کاشت کی ہوئی ربڑ کی پیداوار صرف ۵ ٹن تھی اور خود رو جنگلات سے حاصل کی ہوئی

ربڑ کی پیداوار ۵۴۰۰۰ چون ہزار ٹن تھی۔
۱۹۱۳ء میں دونوں کی پیداوار برابر ہوگئی۔
۱۹۲۲ء میں کاشت کی ہوئی ربڑ کی پیداوار ۳۴۰۰۰۰ تین لاکھ چالیس ہزار ٹن ہوگئی اور جنگلات سے حاصل کی ہوئی ربڑ کی پیداوار صرف تیئس ہزار ۲۳۰۰۰ رہ گئی۔ غرض کہ ربڑ کی کاشت میں رقبہ بڑھتا گیا اور جنگلی ربڑ کی اہمیت کم ہوتی گئی۔ اس وقت دنیا میں تقریباً ۷۰۰۰۰۰۰ ستر لاکھ ایکڑ رقبہ ربڑ کی کاشت میں ہے اور سالانہ پیداوار اکیس لاکھ ٹن ہے تقریباً ۹۶ فیصدی ربڑ باغات سے حاصل ہوتی ہے اور صرف ۴ فیصدی ربڑ جنگلات سے حاصل کی جاتی ہے۔

جنگلی ربڑ برازیل، کولمبیا، وینیزویلا، پیرو، اکواڈور، کانگو اور خلیج گنی کے ساحلی علاقوں کے جنگلات سے حاصل کی جاتی ہے۔
کاشت کی ہوئی ربڑ کے باغات زیادہ تر ایشیا میں انڈونیشیا۔ ملایا، لنکا، سیام، فلپائن، انڈو چین اور برما میں ہیں۔ تقریباً ۷۵ فیصدی دنیا کی ربڑ انڈونیشیا اور ملایا میں پیدا ہوتی ہے۔ ایشیا کے علاوہ ربڑ کی کاشت اب برازیل، کانگو، لائبیریا نائیجیریا، گھانا اور مشرقی افریقہ میں بھی شروع ہو گئی ہے۔ لیکن اب بھی دنیا کی ۹۰ فیصدی ربڑ ایشیا میں ہی پیدا ہوتی ہے۔

لیکن ربڑ کی ضرورت اتنی بڑھ گئی ہے کہ مصنوعی ربڑ بھی بننے لگی ہے۔ مصنوعی ربڑ کا ایک بہت بڑا کارخانہ خود ہمارے دیس میں ہے۔ یہ بریلی کے قریب فتح گنج کے علاقے میں ہے۔

ہندوستان میں ربڑ کے باغات کیرالا، مدراس اور میسور میں ہیں۔ ان ریاستوں میں تقریباً ڈھائی لاکھ ایکڑ رقبہ اس کی کاشت میں ہے اور سالانہ پیداوار چھبیس ہزار ٹن ہے۔


یہ تحفہ اسے دے دیجیے جس نے میرے
پڑوسی کا ریڈیو چرایا ہے۔

جناب مجیب احمد خاں

دِلّی دُور ہے



مجیب احمد خاں صاحب کی ایک لمبی کہانی آپ ـــــ پچھلے پرچوں میں پڑھ چکے ہیں. کتنی مزے دا
کتنی دلچسپ تھی. اس کہانی کو بھی پڑھیے. یہ بھی اتنی ہی دلچسپ اتنی ہی مزیدار ہے. پڑھنے والوں کے دلو
میں بلند ہمتی اور اولوالعزمی کا جذبہ پیدا کرتی ہے. یہ اتنی لمبی نہیں ہے. اگلے پرچہ میں ختم ہو جائے گی.

ایڈیٹر

یہ اُن دنوں کی بات ہے
جب ہندوستان میں مغلوں کی حکومت
اپنے عروج پر تھی۔ یوں تو سبھی مغل بادشاہ
اپنے حسن انتظام، انصاف اور رعایا پروری
کے لیے مشہور ہیں لیکن شہنشاہ جہانگیر
میں تو یہ خوبیاں یوں کہیے کہ کوٹ کوٹ کر
بھری تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس نے
قلعہ کے صدر دروازے
کے باہر ایک زنجیر لٹکوا دی تھی۔
صبح یا شام، دوپہر یا آدھی رات،
جب بھی کسی پر مصیبت آتی وہ قلعے
کے دروازے پر آکر اس زنجیر
کو کھینچتا۔ زنجیر کھینچنے سے قلعے اور
شاہی محل کے مختلف حصوں میں
لگی ہوئی بہت سی گھنٹیاں ایک ساتھ
بج اٹھتیں۔ گھنٹیوں کی آواز سن کر
جہانگیر جس حالت میں ہوتا فوراً
دروازے پر آجاتا اور فریادی
کی فریاد سن کر اس کے دکھ درد کو
دور کرتا۔ جب بادشاہ ایسا ہو تو بھلا
اس کے راج میں آرام اور چین کی
کیا کمی۔

ہاں تو یہ اسی زمانے کی بات ہے
جب ہندوستان میں جہانگیر کا راج تھا۔
جہانگیر اپنی ملکہ نورجہاں کو بے انتہا چاہتا
تھا۔ نورجہاں تھی بہت عقلمند وہ راج
کے کام میں بھی جہانگیر کا ہاتھ بٹاتی اکثر
بڑے اور اہم کام نورجہاں کے مشورے



سے انجام پاتے۔

ایک مرتبہ بادشاہ سلامت کسی ضروری کام سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ ملکہ نورجہاں دلی میں تھی۔ راج پاٹ کے کاموں اور سرحد کی بغاوت کو دبانے میں بادشاہ کو وہاں خلافِ اُمید بہت دن رُکنا پڑا۔ جب ان کاموں سے کچھ فرصت ملی تو ایک دن بادشاہ کو ملکہ کی یاد آئی۔ دل بے چین ہوگیا۔ ابھی کچھ دنوں کا کام اور باقی تھا۔ اس لیے فوری واپسی ممکن نہ تھی۔ جس کام سے وہ لاہور آیا تھا اس کے پورا ہوجانے سے جو خوشی اُسے ہو رہی تھی وہ جاتی رہی اور اس پر اداسی چھا گئی۔

درباریوں اور مصاحبوں نے جب یکایک بادشاہ کو اُداس دیکھا تو سب کے سب گھبرا گئے۔ کوئی مورچھل ہلانے لگا۔ کوئی گلاب پاش لے کر آگے بڑھا، کسی نے شربت پیش کرنا چاہا تو کوئی شاہی طبیب کو بلانے دوڑا۔ لیکن جہانگیر نے سب کو روک دیا۔ جس محفل میں ابھی قہقہے گونج رہے تھے وہاں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ سب لوگ حیران و پریشان دم بخود بیٹھے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر بات کیا ہوئی۔

چند لمحے بعد ایک منہ لگے مصاحب نے جان کی امان مانگتے ہوئے مزاج پوچھا لیکن جہانگیر خاموش رہا اور تھوڑے وقفہ بعد اُس کی آواز آئی

"تخلیہ" یہ سُنتے ہی تمام درباری خاموشی سے اُٹھ کر باہر چلے گئے مُغل بادشاہوں کا یہی دستور تھا۔ جب وہ تنہائی چاہتے تھے تو "تخلیہ" کہہ دیتے تھے اور سارے درباری سلام کر کے رُخصت ہوجاتے تھے۔ محفل خالی ہوجاتی تھی۔

چند منٹ کے بعد جہانگیر کی تالی کی آواز آئی۔ باہر کھڑے ہوئے خاص خادموں میں سے ایک خادم سر جھکائے بادشاہ سلامت کے سامنے آیا۔ باادب ہو کر سلامی دی اور حکم کا منتظر

خاموش کھڑا ہوگیا۔ بادشاہ نے نگاہ اُٹھا کر
دیکھا اور کہا "رقاصہ۔"

خادم سلامی دیتا ہوا اُلٹے پاؤں
وٹا اور تھوڑی ہی دیر میں پھر محفل جم گئی۔
شاہی مصاحب اپنے اپنے رُتبے
کے مطابق بیٹھ گئے۔ رقاصہ بھڑکیلا لباس
پہنے داخل ہوئی۔ پہلے مجرا پیش کیا اور
پھر پوری محفل چھم چھما چھم کی آواز، طبلے کی
تھاپ اور سُریلے گانوں سے گونج
اٹھی۔ بادشاہ نے بھی بہت کوشش
کی کہ کسی نہ کسی طرح ناچ گانے سے
ل بہل جائے لیکن ملکہ کی یاد کچھ اس طرح
تی رہی کہ بادشاہ کو ناچ گانا بھی بُرا لگنے
ا۔ یکایک اُس نے ہاتھ اُٹھایا۔ ہاتھ کے
ٹھتے ہی جو جہاں تھا وہیں سر جھکائے
اموش ہوگیا۔ محفل پھر برخاست ہوگئی۔
دشاہی محل پر ایک بار پھر اُداسی برسنے
لی۔

تھوڑی ہی دیر میں بادشاہ کی تالی
ی آواز سُن کر ایک خادم پھر دوڑ اور
لامی دے کر باادب کھڑا ہوگیا۔ جہانگیر

کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر وزیر کو بلانے کا حکم دیا۔ فوراً ہی وزیر حاضر ہوا۔ جھک کر تین سلام کیے اور اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ بادشاہ اب بھی خاموش تھے اور ٹکٹکی وزیر کو دیکھ رہے تھے۔ آخر کار وزیر نے ہمت کر کے کہا۔

"جہاں پناہ نے غلام کو یاد فرمایا ہے۔"

بادشاہ جیسے کسی خیال سے چونک اُٹھے۔

"ہاں! ما بدولت ہی نے تمھیں یاد کیا ہے۔ اے ہمارے لائق وزیر! کیا اس وقت ہمارے لشکر یا لاہور میں کوئی ایسا بھی شخص موجود ہے جو کل دن بھر میں دلّی پہنچ جائے اور ہماری ملکہ کو ہمارا پیغام دے کر اس کا جواب پرسوں رات تک ہمارے حضور میں پیش کر دے۔ ہم ایسے شخص کو منہ مانگا انعام دیں گے۔ مالا مال کر دیں گے ہم اُسے۔ ہے تمہاری نظر میں کوئی ایسا جواں مرد جو ہمارا یہ کام انجام دے سکے۔"

وزیر نے باادب ہو کر جواب دیا۔ "جہاں پناہ بندہ کو اُمید ہے کہ عالی جاہ کے جاں نثاروں

یں کوئی نہ کوئی ایسا باہمت ضرور مل جائے گا۔ غلام کو اجازت دی جائے کہ ایسے آدمی کو تلاش کرے۔ انشاء اللہ یہ غلام شام ہونے سے پہلے ہی اس کو لےکر شرفِ باریابی حاصل کرے گا۔"

"اجازت ہے۔" جہانگیر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ اور تھوڑی ہی دیر کے بعد پورے شہر لاہور اور شاہی لشکر میں ڈھنڈورچیوں کی آواز گونجنے لگی۔

"خلقِ خدا کی، ملک شہنشاہ جہانگیر کا، حکم وزیر سلامت کا، جو کوئی شخص ظلِ سبحانی کا پیغام ایک دن میں دلی پہنچا کر دوسرے دن جواب لے کر لوٹ آئے گا وہ شاہی خزانے سے منہ مانگا انعام پائے گا۔"

یہ خبر سنتے ہی لوگ جوق در جوق وزیر کے محل کے سامنے والے میدان میں جمع ہونے لگے۔ طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک کہتا کوئی خاص ہی بات ہوگی جس کی اطلاع دلی فوراً پہنچانا ضروری ہے۔ دوسرا کہتا کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی دشمن حملہ کرنے والا ہے اور بادشاہ سلامت دلی سے اور فوج بلانا چاہتے ہیں۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں۔ مجمع میں ایک طرف کچھ لوگ اتنے کم وقت میں دلی تک جانے اور واپس لوٹنے کے امکانات پر بحث کر رہے تھے۔ ایک نے کہا:

"بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آٹھ دن کی راہ دو دن میں طے ہو جائے۔" دوسرا بولا: "اگر کسی طرح آدمی ایک دن میں دلی پہنچ بھی جائے تو دوسرے دن واپس لاہور آجانا تو بالکل ہی ناممکن ہے۔" تیسرا بولا: "دوسرے دن لوٹ آنا تو واقعی ممکن نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ دلی پہنچ کر ایک دن آرام کر لے اور تیسرے دن لاہور واپس آجائے۔" ان کی باتیں سن کر پاس کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے کہا: "اگر تیسرے دن واپس آسکتا ہے تو پھر دوسرے دن بھی آسکتا ہے۔"

پہلے شخص نے کہا: "بھیا تیری اٹھتی جوانی ہے۔ بدن میں گرم گرم خون

دوڑ رہا ہے۔ تو ہی ایسا کر سکتا ہے۔ ہمارے بس کی تو بات نہیں کہ سات آٹھ سو میل کا سفر دو دن میں طے کرلیں۔"

نوجوان نے کہا: "شیخ جی میں پٹھان کا بچہ ہوں۔ میری رگوں میں باپ دادا کا وہ خون گردش کر رہا ہے جو انھوں نے بابر، ہمایوں، اور جلالی اکبر کے ادنیٰ اشاروں پر بہایا تھا۔ جہاں گیر جیسے انصاف پسند اور رعایا کے ساتھ اولاد کا سا برتاؤ کرنے والے شہنشاہ کے لیے میں ناممکن کو بھی ممکن بنانے کی ہمت رکھتا ہوں۔"

شیخ جی نے جواب دیا: "تو پھر کیجیے بسم اللہ اور کر دیجیے اپنا نام پیش۔"

نوجوان نے کہا: "شیخ جی! موقع آنے دو۔ نام بھی پیش کر دوں گا۔"

اتنی دیر میں شاہی نقارے کی آواز گونجی۔ مجمع ایک دم خاموش ہو گیا۔ نقیب نے آواز لگائی:

"کون ہے جو آج ہمت اور مردانگی کے میدان میں سرفرازی حاصل کرے۔ کون ہے جو شاہوں کے شاہ جہانگیر کی خوشنودی حاصل کرے؟ کون ہے جو سرکاری خزانے سے منہ مانگا انعام پائے؟"

چاروں طرف خاموشی طاری تھی۔

نقارہ پھر گونجا۔ نقیب نے پھر آواز لگائی:

"کہاں ہیں وہ بہادر، کہاں ہیں وہ سورما، کہاں ہیں وہ ہمت والے جن کی رگوں میں سورماؤں کا خون ہے۔ جن کی ہمت کو وہ پہاڑ سے ٹکر لینے والی ہے؟"

مجمع اب بھی خاموش تھا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

اس وقت شیخ جی نے مسکرا کر نوجوان کو دیکھا اور کہا:

"کیوں میاں! کیا لاہور سے دلی تک کے فاصلے نے خون خشک کر دیا۔ کہاں گئی تمہاری وہ گرمی اور ہمت؟ —— میاں صاحب زادے کہنے اور کرنے میں بڑا بل ہے۔ وہ ادھر ہی ....."

(باقی آئندہ)

لطیفے

مجسٹریٹ: "تم اپنی صفائی میں کوئی گواہ پیش کرنا چاہتے ہو؟"

ملزم: "خدا میرا گواہ ہے۔"

مجسٹریٹ: "نہیں نہیں کوئی ایسا گواہ پیش کرو جسے ہم بھی جانتے ہوں"

مجسٹریٹ: "تمھاری عمر کتنی ہے؟"

ملزم: "باپ کی عمر سے آدھی"

مجسٹریٹ "تمھارے باپ کی عمر کتنی ہے؟"

ملزم: "میری عمر سے دوگنی۔"

مجسٹریٹ: (جھنجھلا کر) تمھارا جنم کب ہوا تھا؟"

ملزم: "(خوش ہو کر) "کیا حضور میرا جنم دن (سالگرہ) منائیں گے؟

(وجے کمار کشمیری مدرسہ ثانوی جامعہ)

استاد: "بتاؤ رشید گدھے کو گدھا کیوں کہتے ہیں؟"

رشید: اس لیے کہ وہ گدھا ہوتا ہے۔

دوکان دار: "ارے بھائی ماجد تم کل روپیہ کھوٹا دے گئے تھے یہ تو چلتا ہی نہیں۔"

ماجد: "واہ جناب کل تو میں نے اسے آپ کے سامنے فرش پر چلا کر دکھا دیا تھا۔"

شاد آکولوٹی

نسیم: "وہ بات ہمیشہ تول کر اور ٹھہر ٹھہر کر کرتے ہیں۔"

نعیم: "اچھا!"

نسیم: "ہاں بھئی بے چارے کافی ہکلاتے ہیں!"

عادل: "میرے بھائی یورپ سے واپس آئے تو جہاز سے اترتے ہی اپنے دیس کی خاک کو چوم لیا!"

رشید: "اللہ دری حب الوطنی"

عادل: "حب الوطنی نہیں — کیلے کا چھلکا"

فتح چند: "ارے بھئی ڈرنے کی کیا بات ہے بس شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا چاہیے"

خورشید: مگر بھئی میں تو بھینگا ہوں"

محمود: "لو مجیدہ اب ناصرہ کے گلے مل جاؤ — ہو چکی نا لڑائی بس اب ختم کرو"

ناصرہ: (گلے مل کر) "مجیدہ جو کچھ تم میرے لیے دعا کرتی ہو خدا تمھارے حق میں پورا کرے"

مجیدہ (چیخ کر) "لو دیکھو اب کون ہے لڑائی کی جڑ"

ایک سیلانی: توبہ توبہ وہاں اتنی ٹھنڈ تھی کہ موم بتی کی لو جم کر رہ جاتی تھی۔ ہم اُسے پھونک مار کر بجھا بھی نہیں سکتے تھے"

سننے والوں میں سے ایک: ارے یہ تو کچھ بھی نہیں، جہاں ہم رہتے تھے وہاں سردی کا یہ حال تھا کہ الفاظ بھی ہمارے منہ سے برف کی ڈلیوں کی طرح نکلتے تھے ہم انھیں چمچے میں ڈال کر گرم کرتے تھے اور ان پر کان دھرتے تھے کہ کہنے والے نے کہا کیا"

نذیر: "میرے پاس ایک سفید مرغی ہے جو بھورے انڈے دیتی ہے"

ناصر: "دیتی ہوگی۔ اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے؟"

نذیر "اچھا! — تو کیا تم ایسا کر سکتے ہو"

انعام: "بھئی میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ میں باوا آدم ہوتا"

اقبال: (تعجب سے) "کیوں — خیر تو ہے"

انعام: "تاکہ میں کوئی لطیفہ سناتا تو لوگ یہ نہ کہہ سکتے کہ اوہو ہمارا سنا ہوا ہے"

گاہک: "ارے بھئی یہ کیا بلا ہے۔ چائے یا کافی؟ اس میں سے تو مٹی کے تیل کی بو آتی ہے"

بیرا: "مٹی کے تیل کی بو آتی ہے حضور تو یہ چائے ہوگی۔ ہماری کافی سے تو عام طور پر تارپین کے تیل کی بو آتی ہے۔"

(صفیہ خاتون مدرسہ ثانوی)

جناب فوق فاروقی

تتلی رانی



تو ہے اک خوب صورت کہانی
تتلی رانی ، مری تتلی رانی

پھول کرتے ہیں تجھ سے محبت
پیاری پیاری سی ہے تیری رنگت
تیرے پر ہیں بڑے خوب صورت

تجھ سے باغوں میں ہے زندگانی
تتلی رانی مری تتلی رانی

باغ میں ہر طرف گھومتی ہے
لالہ و گل کا منہ چومتی ہے
شاخ پر بیٹھ کر جھومتی ہے

باعمل ہے تری زندگانی
تتلی رانی مری تتلی رانی

آجا آجا مرے پاس آجا
اپنے جیسا مجھے بھی بنا جا
آکے اڑنا مجھے بھی سکھا جا!

مجھ پہ بھی کر ذرا مہربانی
تتلی رانی مری تتلی رانی

جناب سید منیر الحسن

جامعہ کا تعلیمی میلا

عام طور پر میلے کی تیاری جامعہ میں ہفتوں نہیں مہینوں پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ میلے کی تیاری کے لیے میلا کمیٹی بن جاتی ہے۔ یہ کمیٹی اپنی سہولت کے لیے بہت سی اور کمیٹیاں بناتی ہے۔ یہ سب کمیٹیاں ماتحت کمیٹیاں کہلاتی ہیں اور پھر سب کی سب اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتی ہیں۔

ہمیشہ کی طرح اب کے بھی یہ کمیٹیاں بن چکی تھیں۔ تھوڑا بہت کام بھی شروع ہو چکا تھا۔ اچانک ملک میں حالات خراب ہو گئے۔ اتنے خراب ہو گئے، اتنے خراب ہو گئے کہ انتظام کرنے والے حیران تھے کہ اب کے میلا کیا بھی جائے یا ملتوی کر دیا جائے۔ اسی شش و پنج میں بہت سا وقت گزر گیا۔

بارے خدا خدا کر کے حالات میں خوشگوار تبدیلی آئی پر اب وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ پھر بھی میلا کمیٹی نے یہی طے کیا کہ میلا کیا جائے اور ضرور کیا جائے۔

اس فیصلے کا ہونا تھا کہ جامعہ کے پورے علاقے میں جیسے نئی زندگی آگئی۔ ہر ادارے میں زور شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں اور پورے جامعہ نگر میں ایک عجیب چہل پہل، عجیب زندگی نظر آنے لگی۔

گیارہ نومبر کو میلا ہونے والا تھا نو نومبر کو قریب قریب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ بازار سج گیا دکانیں لگ گئیں۔ یہ مدرسہ ابتدائی کا ٹی اسٹال (چائے کی دکان) ہے۔ یہ جامعہ کالج کا ٹی اسٹال ہے۔ یہ شفیق کلب کا اسٹال ہے۔ بازار میں لوٹیے سیدھی طرف کو مکتبہ جامعہ کی کتابوں کی دکان ہے۔ اس سے ملی ہوئی بالک ماتا سنٹر کی لڑکیوں کی بنائی ہوئی چیزوں کی دکان ہے اور آگے بڑھیے تو بہت بڑا پنڈال نظر آئے گا یہ خاص جلسہ گاہ ہے۔ یہ مردوں کے لیے ہے، عورتوں کا انتظام الگ ہے۔ مدرسہ ابتدائی اور ثانوی کی شاندار عمارتوں کے بیچ کا علاقہ دلہن کی طرح سجا

ہوا ہے اور بجلی کی رنگ برنگی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔

ارے ارے باتوں باتوں میں ہم آپ کو کہاں لے آئے۔ آیئے پہلے مدرسہ ابتدائی کی عمارت کی طرف چلیں یہ دیکھیے مدرسہ کے گیٹ پر کھلی فضا میں نرسری کے سامان کی نمائش ہے ہجوم کی بھیڑ ہے اور اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور پھر اور کمروں کی طرف آیئے یہاں ابتدائی کے بچوں کے کام کی نمائش ہے۔ اصل میں پروجیکٹوں کا کام ہے جو ابتدائی کے بچے اپنی مرضی سے چن کر استاد کی نگرانی میں چلاتے ہیں۔ مدرسہ ابتدائی میں تعلیم مشغلوں یا پروجیکٹوں کے ذریعے دی جاتی ہے۔ دیکھیے یہاں آپ کو تمام مضامین، اسلامیات اردو ہندی انگریزی معلومات حرفہ ڈرائنگ اور حساب کا کام اس طرح ایک ساتھ مربوط طریقے سے رکھا ہوا نظر آتا ہے کہ بے ساختہ واہ واہ نکل جاتی ہے۔

اسی طرح مدرسہ ابتدائی کے بالکل مقابل مدرسہ ثانوی کی عمارت میں جہاں کے لڑکوں کے سائنس جغرافیہ وغیرہ کے کاموں کی نمائش دیکھیے۔ استادوں کے مدرسے نے، آرٹس انسٹی ٹیوٹ نے اپنی اپنی نمائشیں الگ سجائی ہیں۔

دس نومبر کو سہ پہر کو کانووکیشن کا جلسہ تھا اس میں جامعہ کالج اور رورل انسٹی ٹیوٹ آرٹس انسٹی ٹیوٹ ٹیچرس ٹریننگ کالج کے طالب علموں کو سندیں دی گئیں۔ امیر جامعہ یا چانسلر (جناب ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ ہند) شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) جناب پروفیسر مجیب نے رپورٹ پڑھ کر سنائی خواجہ غلام السیدین نے کانووکیشن ایڈریس پڑھ کر سنایا۔

۱۱ نومبر کی صبح بڑی سہانی صبح تھی۔ ہر چھوٹے بڑے کا دل امنگوں اور ولولے سے بھرا ہوا تھا۔ ساڑھے نو بجے جناب بھگوان سنگھ سہائے کمشنر دلی کارپوریشن نے میلے کا افتتاح کیا پھر چھوٹے بچوں یعنی جامعہ نرسری اور بال ماتا سنٹر، کئی نرسری اسکولوں کا پروگرام شروع ہوا۔ بڑے مزے کا پروگرام تھا اور بہت ہی پسند کیا گیا۔ خاص کر ایک ننھے منے ڈرامے "ریل کا انجن" پر خوب تالیاں بجیں۔

شام کو تین بجے "قومی یک جہتی اور تعلیم" پر ٹریننگ کالج کی طرف سے ایک سمپوزیم ہوا جامعہ کے اور باہر کے تعلیمی ماہروں نے اس سمپوزیم میں حصہ لیا۔ لوگوں نے بڑی دلچسپی سے ان کی تقریریں سنیں۔

اسی وقت دوسرے پنڈال میں بھی عورتوں کا ایک خاص جلسہ تھا۔ تقریر کا عنوان تھا "کھانے پینے کی چیزوں کو کیسے محفوظ رکھا جائے" عورتوں کے

مطلب کی چیز تھی انھوں نے اس پروگرام میں بہت دلچسپی لی۔

رات کو آٹھ بجے تفریحی پروگرام شروع ہوئے سب سے پہلے مدرسہ ابتدائی کے بچوں نے اپنا ڈراما "تیسیا کا پھل" پیش کیا۔ ڈرامے کی کہانی جتنی دلچسپ تھی۔ بچوں نے اتنے ہی دلچسپ انداز میں اسے پیش کیا۔

دوسرا ڈراما آرٹ انسٹی ٹیوٹ کے طالب علموں نے پیش کیا۔ اس کا نام "جمیلہ" تھا۔ یہ بھی خاص طور سے پسند کیا گیا۔ سب سے آخر میں مدرسہ ثانوی کی طرف سے تمثیلی مشاعرہ تھا۔ بیدوقت کے مشہور اور زندہ شاعروں کی نقل تھی اور بہت کامیاب (تصویریں دیکھ کر آپ کو تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے گا)

دوسرے دن دس بجے صبح جامعہ کالج کی طرف سے محفل موسیقی کا پروگرام پیش کیا گیا۔ اور بہت ہی دلچسپ رہا۔ ان جلسوں میں اور تقریبوں میں کچھ فوجی جوان بھی آئے تھے۔ انھوں نے ان پروگراموں میں غیر معمولی دلچسپی ظاہر کی۔

شام کو دو بجے نہرو ٹرافی کے مقابلے شروع ہوئے۔ یہ اس سال کی بالکل نئی چیز ہے۔ مدرسہ ابتدائی نے یہ بہت اچھا قدم اٹھایا ہے۔ مقابلوں میں یہ چیزیں شامل تھیں۔ نظم پڑھنا، کہانی سنانا۔ تصویریں دیکھ کر کہانی تیار کرنا وغیرہ۔ مدرسہ ابتدائی سمیت دہلی کے سولہ مدرسوں نے ان مقابلوں میں حصہ لیا۔ مجموعی حیثیت سے سب سے زیادہ نمبر مدرسہ ابتدائی نے حاصل کیے ٹرافی کا مستحق مدرسہ ابتدائی تھا۔ دوسرا نمبر لاجپت نگر گرلز اسکول کا تھا لیکن جامعہ کی روایت کے مطابق ٹرافی لاجپت نگر اسکول کو دی گئی۔ اس کے علاوہ اول دوم سوم آنے والے طالب علموں کو کپ انعام میں دیے گئے۔ انعام ہمارے شیخ الجامعہ یا وائس چانسلر صاحب نے تقسیم فرمائے۔

اس دن بھی تین بجے سے دوسرے پنڈال میں عودتوں کا جلسہ الگ ہوا۔

رات کو آٹھ بجے تین ڈرامے پیش کیے گئے "بھارت رتن" مدرسہ ثانوی کی طرف سے "ہائے بیتا جی" مدرل انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے "شیشے کی دیوار" استادوں کے مدرسے یا ٹیچرس کالج کی طرف سے۔ آج کے یہ تینوں ڈرامے بہت کامیاب رہے خصوصاً پہلا ڈراما بہت پسند کیا گیا۔

تیرہ نومبر کو گاندھی ٹرافی کے مقابلے شروع ہوئے۔ اس کا اہتمام ہمارا مدرسہ ثانوی (ہائر سکنڈری اسکول) کرتا ہے۔ ان مقابلوں میں وقت کے وقت عنوان دیکھ کر مضمون لکھنے کا اور پینٹنگ یا مصوری کا مقابلہ ۱۲ نومبر کو ہو چکا تھا۔ مصوری کے مقابلے میں دہلی پبلک اسکول کی ایک لڑکی اول آئی تھی اور اختر میڈل کی مستحق قرار پائی تھی۔ مضمون کے مقابلے میں تین زبانوں اردو انگریزی

اللہ ہندی میں ہوئے۔ اردو مقابلے میں خلیق احمد (عربک ہائر سکنڈری اسکول) اول آئے تھے۔

آج کے دن مونو ایکٹنگ، گروپ سانگ فوک سانگ نظمیں یا غزلیں پڑھنے کے مقابلے تھے مجموعی حیثیت سے مدرسہ ثانوی کے نمبر سب سے زیادہ تھے دوسرا نمبر سرہار کورٹ بٹلر ہائر سکنڈری اسکول کا تھا۔ جامعہ کی روایت کے مطابق ٹرافی بٹلر اسکول کو دی گئی۔ کل کی طرح آج بھی پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

تیسرے پہر کو مکتبہ جامعہ کی طرف سے "فن اور فن کار" کے عنوان کے ماتحت "کاروانِ نظم" کا پروگرام پیش کیا گیا۔ مکتبہ جامعہ ہر سال، اس طرح کا پروگرام پیش کرتا ہے حسب معمول یہ پروگرام بھی بہت کامیاب رہا۔

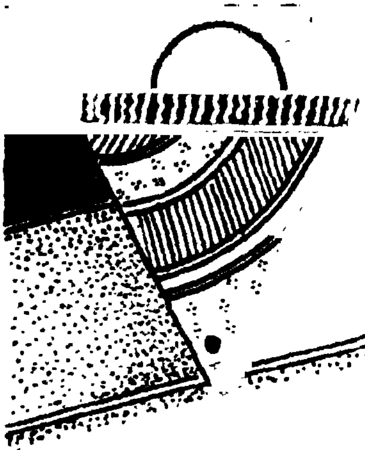
شام کو ڈراما سوسائٹی کی طرف سے ڈراما "ظاہر و باطن" دکھایا گیا۔ یوں تو دلی کے لوگ تینوں دن اس میلے میں بڑے شوق سے شریک ہوتے ہیں لیکن ڈراما سوسائیٹی کا ڈراما بہت معیاری ہوتا ہے اس لیے اتنی بھیڑ ہو جاتی ہے کہ جامعہ والوں کے لیے اسے دکھانے کا دوسرے دن انتظام کیا جاتا ہے۔

(بقایا ص ۱۴۰ کا)

پر نہیں گرے گا بلکہ زمین کے چاروں طرف گھوم پھر نقطہ ۳ پر پہنچنے کی کوشش کرے گا اور اس طرح وہ مسلسل چکر کھاتا رہے گا۔

اتنی قوت اور اونچائی سے پتھر پھینکنا ممکن نہیں یہ تو سمجھانے کے لیے ایک مثال تھی۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ خلائی جہاز ایک راکٹ پر رکھ دیا جاتا ہے۔ اور راکٹ کو سیدھا آسمان کی طرف داغا جاتا ہے کئی سو میل اوپر اٹھ کر یہ راکٹ خلائی جہاز کو اسی طرح سے پھینکتا ہے جیسے کوئی آدمی پتھر۔ اور بس یہ خلائی جہاز بار بار چکر لگاتا رہتا ہے جب تک اس کو زمین پر لانے کی کوئی اور ترکیب نہ کی جائے یہ گردش کرتا رہتا ہے۔

تو دیکھا آپ نے زمین کی کشش کتنے کام کی ہے۔ یہ نہ ہو تو ہمارا کھانا پینا، چلنا پھرنا، مکان دکان سب غائب ہو جاتے۔

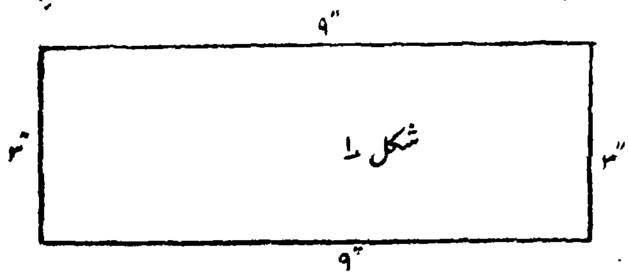


کرامتی پاکٹ

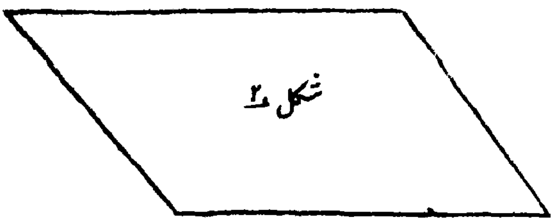
تحریر خورشید عبداللہ اورنگ آبادی

لو بچو پچھلے ماہ آپ نے اقبال بھیا سے جادو کا بٹوا بنانا سیکھا تھا اب کرامتی پاکٹ بھی سیکھ لیجیے۔

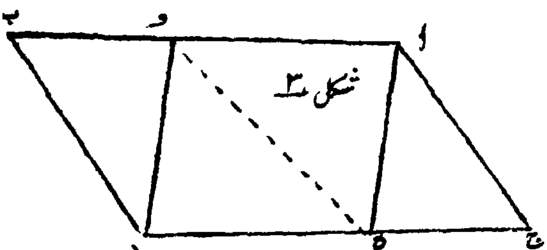
۱- ایک مستطیل نما کاغذ جو ۹ انچ لمبا اور تین انچ چوڑا ہو لیجیے۔

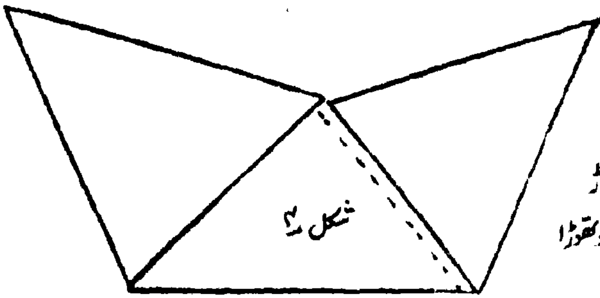


۲- پھر اسے دی ہوئی شکل ۲ کی طرح کاٹ لیجیے۔



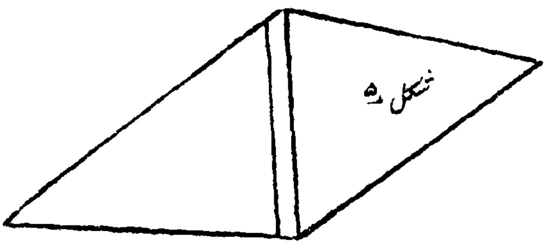
۳- دی ہوئی شکل ۳ کی طرح اس پر نشان لگائیے اس طرح کہ اس میں چار مثلث تیار ہو جائیں۔





مثلث ا ج ہ مثلث و د ب
چھوٹے ہوں بہ نسبت مثلث ا ہ و اور
مثلث ہ و د کے۔

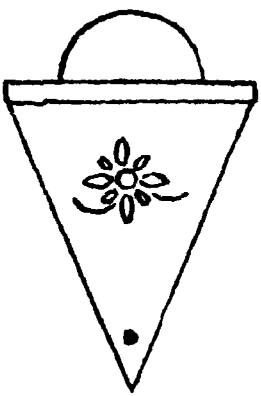
۴۔ پھر ہ د کو شکل ۴ کی طرح موڑ دیجیے۔ مثلثات کو برابر کرنے کے لیے آپ کو تھوڑا بہت قینچی سے کاٹ کر ٹھیک کر لینا ہوگا۔



۵۔ نوک ج کو نقطہ د پر پلیٹ دیجیے شکل ۵ کی طرح۔

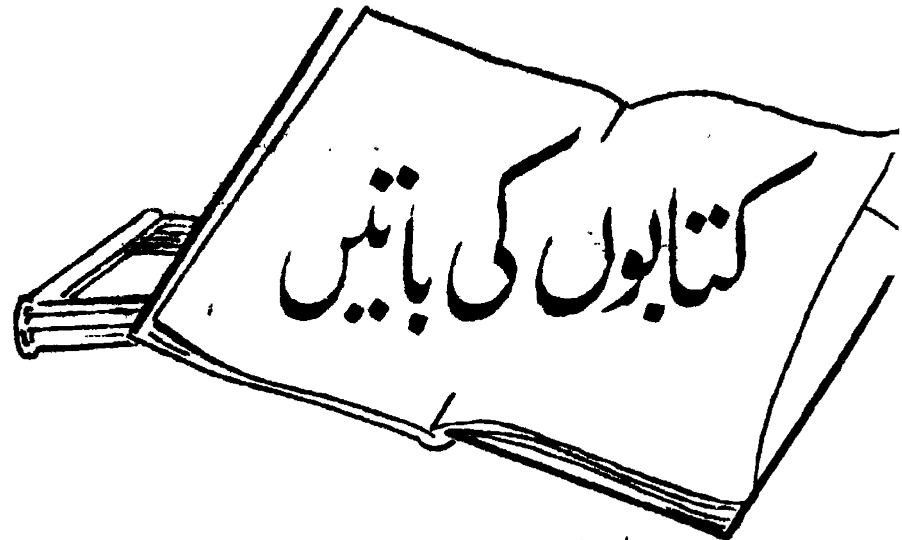
۶۔ نوک ب کو نقطہ ہ پر پیچھے کی جانب موڑ دیجیے۔ نقطہ ج اور ب پر بٹن لگا دیجیے۔

نقطہ ا اور د کے درمیان دھاگا پرو دیجیے۔



لیجیے کراماتی پاکٹ تیار ہو گیا اس کے ایک جانب لال دائرہ اور دوسری جانب ہرا دائرہ بنا دیجیے اب اپنے دوست سے اس میں پیسے رکھنے کو کہیے۔ وہ اگر لال دائرے کی جانب رکھے تو آپ انھیں ہرے دائرے کی جانب سے بٹن کھول کر پیسے دے سکتے ہیں لیجیے اب آپ کو پہلے سے پیسے چھپانے کی بھی ضرورت نہیں۔ سب کے سامنے علی الاعلان آپ دوسری جانب سے نکال کر دے سکتے ہیں۔ کہیے آیا نا مزہ!

معلّم



ایک طالب علم کی کہانی

عبدالغفار مدہولی

آج مدہولی صاحب استادوں کے استاد ہیں یعنی جامعہ کے اندر استادوں کے مدرسے میں پڑھاتے ہیں۔ اُن کی عمر ساٹھ سال ہے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی پڑھنے پڑھانے میں گزاری ہے یا کتابیں لکھی ہیں۔ بہت سی کتابیں۔ کچھ بچوں کے لیے، کچھ بڑوں کے لیے۔ ان کی دو تین کتابوں پر مرکزی سرکار کی طرف سے انعام بھی مل چکا ہے: 'ایک طالب علم کی کہانی' پر بھی انھیں انعام دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ان کی آپ بیتی ہے۔ ان کے اپنے بچپن اور لڑکپن کی کہانی اور خود ان کی اپنی زبانی۔ اسے پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ بچپن میں ان کی دلچسپیاں کیا تھیں۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے کیسے حاصل کی۔ جامعہ تک کیونکر پہنچے۔ کس طرح ایک استاد کا کھانا پکا کر جامعہ میں اپنے ٹھہرنے کا انتظام کیا۔ پھر کیسے آٹھ روپیہ ماہوار کی نوکری سے جامعہ میں کام شروع کیا اور کیوں سات آٹھ سال کے اندر اندر جامعہ ہی میں مدرسہ ابتدائی کے نگران بنا دیے گئے۔ بس یہ کہانی یہیں آکر رک جاتی ہے۔

اس کہانی میں ایک اچھے اور سچے آدمی کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ اور اس میں سچائی کی مٹھاس بھری

ہوئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اسے پڑھ کر ہمت بھی بندھتی ہے۔ بات کہنے کا ڈھنگ بالکل سیدھا سادا اور آسان ہے لیکن ہر بات ایسی ہے کہ جی میں بٹھالی جائے۔

"ایک طالب علم کی کہانی" کو کہانی کہیے یا کسی کی زندگی کے حالات سمجھیے۔ اسے ایک سبق مان لیجیے یا حکایت۔ ایسی ہی کتابیں پڑھنے سے نگاہ سیدھی رہتی ہے، دل مضبوط ہوتا ہے قدم آگے بڑھتا ہے۔

پانچ ناول

۱۔ ستاروں کی سیر (کرشن چندر)
۲۔ خرگوش کا سپنا (کرشن چندر)
۳۔ تین اناڑی (عصمت چغتائی)
۴۔ جن حسن عبدالرحمن حصہ اول (ایل لاگن)
۵۔ جن حسن عبدالرحمن " دوم (ایل لاگن)

بھلا ایسا کون ہوگا جسے قصہ کہانی پسند نہ ہو۔ چھوٹے چھوٹے بچے اماں بلکہ دادی اماں اور نانی اماں سے کہانیاں سنتے ہیں جب خود پڑھنے لگتے ہیں تو کتابوں سے دوستی کرتے ہیں۔ یوں تو اردو میں ہر سال بہت سی کتابیں خاص طور پر بچوں کے لیے چھپتی ہیں لیکن ان میں اچھے لکھنے والوں کی اچھی چھپی ہوئی کتابیں کم ہی ہوتی ہیں۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ کرشن چندر جیسے مشہور لکھنے والے نے آپ کے لیے ستاروں کی سیر لکھ دی۔ کرشن چندر کی شہرت اس وقت دور دور پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی کہانیوں کو دنیا کے کئی ملکوں نے اپنی زبانوں میں چھاپا ہے۔ اس سے پہلے وہ "الٹا درخت"، "چڑیوں کی الف لیلے"، اور "لال تاج" بچوں کے لیے لکھ چکے ہیں۔ لیکن "ستاروں کی سیر" کچھ اور ہی چیز ہے۔ آج کل آپ سنتے اور پڑھتے ہوں گے کہ چاند پر پہنچنے کی کوشش برابر جاری ہیں۔ اس کتاب میں اسی گیان دھیان کے سہارے سے آپ کے لیے ایک پوری کہانی یا داستان

تیار کردی گئی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ سیر کرنے والے آپ جیسے تین بچے ہیں جو ایک نہایت ہی اچھے کام کے لیے جاتے ہیں یعنی 'امن کی فاختہ' ڈھونڈنے۔

'ستاروں کی سیر' میں آج کل کی چند سائنسی ترقیوں کو کچھ خیال کے پر لگا کر کرشن چندر نے لکھ دیا ہے۔ لیکن عجب نہیں کہ آپ ہی 'ان ہونی' باتوں میں سے کسی نہ کسی کے کرنے یا برتنے والے بنیں۔ لیکن شرط صرف ایک ہے کہ دنیا کے لوگ امن چین کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سیکھ جائیں۔

'خرگوش کا سینا' تو میاں خرگوش کے کارناموں کی داستان ہے۔ پوری کتاب میں ان کی زندگی کے الگ الگ واقعات لکھے گئے ہیں۔ لیکن سب مل کر ان کی ایک پوری تصویر بھی بنا لیتے ہیں۔ آپ نے بہت سی ایسی کہانیاں پڑھی ہوں گی جن میں کسی خرگوش کا ذکر آیا ہو۔ اس کتاب کے میاں خرگوش کو کرشن چندر نے افریقی لوک کہانیوں سے لیا ہے۔ لوک کہانیوں سے یہ مطلب ہے کہ عام طور پر دیہاتی زندگی میں جیسی کہانیاں ایک دوسرے سے سنی سنائی برسوں سے مشہور چلی آتی ہیں۔ ہاں۔ تو یہ میاں خرگوش دل کے اچھے ہیں۔ کسی کو ستانا نہیں جانتے۔ سب کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں لیکن ننھے پن کی وجہ سے ان پر آئے دن مصیبت آتی رہتی ہے۔ مگر وہ اپنی سمجھ بوجھ سے کام لے کر اپنے سے کہیں بڑے اور زبردست جانوروں کو جیت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اب آپ ہی سمجھیں کہ میاں خرگوش کی زندگی کیا بتاتی ہے۔ کرشن چندر کی بڑی خوبی تو یہی ہے کہ میاں خرگوش سے متعلق دلچسپ باتیں بڑے اچھے انداز میں سنا دیں اور بغیر کچھ کہے وہ سب کچھ کہہ دیا جسے سمجھنے کی ہم سب کو ضرورت ہے۔

'تین اناڑی' سچ یہ ہے کہ اناڑی بالکل نہیں ہیں۔ شریر ضرور ہیں۔ لیکن نہ بدتمیز ہیں اور نہ بیوقوف۔ ہر بچے کی عمر اسے اپنے مطابق شرارت کا حق دیتی ہے۔ آپ سب کا بھی یہ حق ہے۔ بس ذرا دیکھ لیجیے کہ یہ 'اناڑی' کیسے ہیں۔ آپ ہی جیسے یہ تین بچے ہیں۔ پھر بھی بہت سے بچوں سے کتنے مختلف۔ ان کی شوخیاں اور بھولے پن کی حرکتیں ایک طرف بڑوں کو گدگداتی ہیں اور انھیں جتاتی ہیں کہ بچوں کو کس نظر سے دیکھنا چاہیے اور دوسری طرف بچوں کو اپنی چال ڈھال درست کرنے میں مدد کرتی ہیں۔ اچھے بچے، صرف بڑے ہو کر ہی اچھے انسان نہیں بنتے بلکہ ان کا بچپن بھی گھر کی رونق ہوا کرتا ہے۔

عصمت چغتائی ایک خاص ڈھنگ سے لکھتی ہیں۔ ان کا تیکھا پن مشہور ہے۔ اس کتاب میں ان کے لکھنے کا ڈھنگ جھلکتا ہے۔ بات کا مزا بھی موجود ہے اور زبان کا چٹخارا بھی۔

آپ نے دیو، پری اور جن، بھوت کے قصے سنے بھی ہوں گے اور پڑھے بھی۔ کیسی کیسی حیرت میں ڈالنے والی باتیں کہی جاتی ہیں۔ ایک سے ایک نرالی اور انوکھی۔ عام طور پر یہ کہانیاں کچھ اچھا اثر نہیں ڈالتیں۔ کہیں انسان کی بے بسی دکھائی دیتی ہے تو کہیں نرے اتفاقات کی دنیا۔ لیکن جن حسن عبدالرحمٰن کی داستان اس ڈگر سے بالکل ہٹی ہوئی ہے۔ یہ ایک روسی کا کارنامہ ہے جس کا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے۔ ترجمے کی زبان میں روانی اور بے ساختگی ہے۔ اس داستان سے آج کی اس ترقی یافتہ دنیا اور اس کے رہنے والوں کی بڑائی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جن کے علاوہ اس کہانی میں تین اور خاص طور پر شریک ہیں۔ اور یہ تینوں بچے ہیں۔ بالکل آپ جیسے سمجھ دار اور ہونہار۔ ان میں سے ایک نے ایک جن حسن عبدالرحمٰن کو صراحی میں سے نکالا تھا۔ یہ صراحی اسے دریا میں ملی تھی۔ پھر یہ جن اس بچے کو اپنا آقا ماننے لگا اور ..... اور میں کیوں بتاؤں۔

یہ پانچوں کتابیں ناول ہیں یعنی ایسی داستانیں یا قصے ہیں جن میں بھرپور طریقے پر واقعات بیان ہوئے ہیں سب بچوں کے لیے نمونے کے ناول کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کی لکھائی چھپائی بھی بہت صاف ستھری ہے۔

نئے سال کی آمد پر ایک نیا رعایتی اعلان!

آپ بھی اس سے فائدہ اٹھائیے اور اپنے بزرگوں کو بھی اس پر آمادہ کیجیے۔ اس لیے ان کی آج کی خریدی ہوئی کتاب کل آپ کے کام آئے گی۔ مکتبہ جامعہ کی نئی اسکیم کے تحت آپ کو بغیر محصول ڈاک ادا کیے اصل قیمت پر کتابیں گھر بیٹھے مل سکتی ہیں۔ اگر آپ اس رعایت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو آج ہی ایک کارڈ لکھ کر مکتبہ جامعہ بک کلب کے قواعد طلب کیجیے۔۔۔!

اِدھر اُدھر سے

آؤ سکھی سیر کو چلیں

آج کل دلّی میں ایک سرکس آیا ہوا ہے جیمنی سرکس۔ اس سرکس کی دو سہیلیوں لیلا اور شانتا کو سیر کی سوجھی۔ اتنے بڑے شہر میں پہلی دفعہ جو آئی تھیں۔ اتفاق سے انھیں موقع بھی مل گیا۔ ان کا مہاوت انھیں پانی پلانے لے جا رہا تھا۔ بس اسی وقت یہ بھاگ نکلیں۔ سرکس کے باہر نکل کر انھوں نے سوچا کہاں جائیں۔ دلّی میں تو سیر کی بہت سی جگہیں ہیں۔ قطب مینار، لال قلعہ، جامع مسجد، پارلیمنٹ ہاؤس، راشٹرپتی بھون، دہلی گیٹ۔ شانتا نے کہا چلو بھئی پہلے چڑیا گھر چلیں وہاں اپنی برادری والوں سے ملاقات ہو جائے گی پھر نہ جانے کب موقع ملے، اس کے بعد چلو بچوں کا پارک چلیں۔ سنا ہے وہاں دلچسپی کی بہت سی چیزیں ہیں۔ لیلا فوراً راضی ہو گئی۔

پر انھیں کوئی راستہ دکھانے والا تو تھا نہیں اس لیے وہ ایک طرف کو چل پڑیں۔ چلتے چلتے کشمیری گیٹ کے سامنے بڑے ڈاک خانے کے پاس نکل آئیں۔ لیلا نے شانتا سے کہا "آؤ بہن ذرا اس ڈاک خانے چلیں شاید ہمارا کوئی خط آیا ہو۔" اور جواب کا انتظار کیے بغیر لیلا نے ڈاک خانے کی کھڑکی میں سونڈ ڈال کر کہا "کیوں جناب ہمارے نام کا بھی کوئی خط ہے؟"

پر ڈاک خانے والے تو اس انوکھے سوالی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ جواب تو کیا دیتے کرسیاں چھوڑ جدھر کو منہ ہوا بھاگ پڑے۔ لیلا کو ان کے اس برتاؤ پر بڑا تاؤ آیا۔ کھسیانی ہو کر دروازہ کے اندر گھس گئی غصے میں آکر میزوں کرسیوں کو توڑنے پھوڑنے لگی۔

اتنے میں اچانک سرکس والے پہنچ گئے۔ پولیس بھی آگئی۔ دونوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ سرکس لے جانے لگے۔ دونوں ڈر رہی تھیں کہ نہ جانے سرکس کا مالک انھیں کیا سزا دے گا۔ پر وہ بھلا آدمی تھا۔ اس نے کچھ

نہیں کہا مگر یہ دونوں بڑی اداس تھیں۔ اپنے جی میں کہہ رہی تھیں، یہ انسان بھی عجیب ہیں اگر ہم ذرا ادھر اُدھر گشت کر لیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا۔

(ترجمہ شاکرہ ندیم)

خلا میں دو طیاروں کا مِلن

امریکہ نے اسی مہینے خلائی پرواز کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ ۱۵ دسمبر کو جیمنی ۶ے اور جیمنی ۷ے نام کے دو طیارے خلا میں ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے۔ ان کے درمیان کوئی ۶ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ یہ دونوں طیارے کچھ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ پرواز کرتے رہے۔ جیمنی ۶ے نے پہلے جیمنی ۷ے کے ارد گرد چکر لگایا اور اس کے بعد اس کے قریب آ کر اڑنے لگا۔ دونوں طیاروں کے چلانے والوں نے خلا میں ایک دوسرے کی بہت سی تصویریں بھی اُتاریں۔

ماسکو میں ٹیگور کلب

ماسکو کے ایک اسکول میں رابندر ناتھ ٹیگور کلب تقریباً دو سال سے قائم ہے۔ اس اسکول کے یہ کم سن شہری ہندوستانی لڑکوں سے خط کتابت کرتے ہیں اور کتابوں اور تصویروں کا تبادلہ بھی کرتے ہیں۔ سوویت دیس کے قریب قریب سبھی بچوں کو چچا نہرو سے محبت اور عقیدت ہے۔ ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اسکول میں ان کے لیے بھی ایک یادگار گوشہ قائم کیا گیا ہے۔ اس یادگار گوشے کے لیے بچے کچھ سامان ازبکستان کی راجدھانی "تاشقند" سے لائے ہیں۔

اس اسکول میں ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہندوستانی "بچوں کے دن" کے موقع پر (یعنی ۱۴ نومبر) ایک بڑے میلے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں ماسکو کالج کے ہندوستانی طالب علموں، ہندوستانی سفارت خانے کے لوگوں نے اور ان کے بچوں نے بھی شرکت کی۔ ماسکو اسکول کے بچوں نے اس موقع پر راگ رنگ کی محفل بھی جمائی۔ انھوں نے سوویت اور ہندوستانی شاعروں کی نظمیں سنائیں۔ دل کش ڈرامے اور ناچ پیش کیے۔

ہندوستان کی کٹھ پتلیاں یورپ میں

بھارت کے مشہور فن کار شری دیوی لال سامر اور ان کے ساتھی کٹھ پتلی کا تماشا دکھانے یورپ گئے تھے۔ رومانیہ کی راجدھانی بخارسٹ میں کٹھ پتلیوں کے بین الاقوامی مقابلے میں انھیں پہلا انعام ملا تھا۔ مغربی جرمنی میں خاص طور پر انھیں مقبولیت حاصل ہوئی۔

یہاں کے ۲۶ شعبوں میں انھیں فن کا کمال دکھانے کا موقع ملا۔

بچوں کی پارلیمنٹ

نئی دہلی میں ہمایوں روڈ پر جونیر ماڈل اسکول میں دس سے ۱۳ دسمبر تک بچوں کی بین الاقوامی اسمبلی کے اجلاس ہوئے۔ اسمبلی میں بچوں کی پارلیمنٹ کا افتتاح دس سالہ روسی طالب علم ساشا ایرودین نے کیا۔ یہ تقریب چاچا نہرو کی یاد میں منائی گئی اور اس میں چالیس ملکوں کے بچے شریک ہوئے۔ پارلیمنٹ میں اس عنوان پر بحث کی گئی۔ "دنیا کو اس قابل بنایا جائے کہ سب آرام و اطمینان سے زندگی گزار سکیں۔"

سوویت رکن ساشا ایرودین اور ساشا کلیف نے دنیا کے سارے بچوں کی تعلیم کے لیے آواز بلند کی۔ بچوں نے اپنا میگنا کارٹا یا عہدنامہ بھی منظور کیا۔ اس میں پانچ طرح کی آزادیوں کا اعلان کیا گیا۔ (۱) بھوک سے نجات (۲) بیماریوں سے نجات (۳) جہالت سے نجات (۴) جسمانی اور ذہنی تکلیفوں سے نجات۔ (۵) لڑائی اور بم سے نجات۔ اپنے اس میگنا کارٹا میں بچوں نے اس بات پر بہت افسوس ظاہر کیا کہ دنیا کے آدھے حصے میں بچوں کو پیٹ بھر کر کھانے کا سہارا ابھی نہیں ہے۔

سمرسٹ ماہم چل بسے

سولہ دسمبر (۶۵ء) کو سمرسٹ ماہم اس دنیا سے چل بسے مرتے وقت ان کی عمر ۹۱ سال تھی۔ یہ بہت بڑے ناول نگار تھے۔ اچھے اچھے ناول لکھتے تھے، ڈرامے لکھتے تھے افسانے لکھتے تھے۔ ان کی کتابیں ساری دنیا میں مقبول تھیں دنیا کی قریب قریب سبھی مشہور زبانوں میں ان کی کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اب تک لگ بھگ دس کروڑ کتابیں بک چکی ہیں۔ یوں سمجھیے کہ دنیا کے انتہائی دولت مند مصنف تھے۔ انھوں نے اپنی دولت کا بہت بڑا حصہ انگلستان کے مصنفوں کی سوسائٹی کو دے دیا۔ اس لیے دے دیا کہ پریشان حال اور بیمار مصنفوں کی مدد کی جائے۔

بقیہ "بچوں کی صدا"

(بقایا ص ۸۲ کا)

اس محبت کے سیلاب میں اپنے جلے ہوئے ہات کو بالکل بھول جاتی ہے۔ اس بچی کے خط کو پڑھتے وقت اس پر پھر دھیان دیجیے۔ "یہ خط قلم سے نہیں دل سے لکھ رہی ہوں۔"

بچوں کی صدا! اور کتنی پیاری صدا!



(پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے کوہ نور پرنٹنگ پریس میں چھپواکر جامعہ نگر نئی دہلی سے شا

خاکہ نمبر ایک

سنہ ۱۶۰۰ء	سنہ ۲۰۰۰ء	ا	ز	ہ	ہ	د	ج	ب
سنہ ۱۷۰۰ء	سنہ ۲۱۰۰ء	ج	ب	ا	ز	و	ہ	د
سنہ ۱۸۰۰ء	سنہ ۲۲۰۰ء	ہ	د	ج	ب	ا	ز	و
سنہ ۱۹۰۰ء	سنہ ۲۳۰۰ء	ز	و	ہ	د	ج	ب	ا
		۰۰	۱	۲	۳	۴	↑	۵
		۶	۷	۸	↑	۹	۱۰	۱۱
		۱۲	↑	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	↑
		۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	↑	۲۱	۲۲
		۲۳	۲۴	↑	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸
			۲۹	۳۰	۳۱	۳۲	↑	۳۳
		۳۴	۳۵	۳۶	↑	۳۷	۳۸	۳۹
		۴۰	↑	۴۱	۴۲	۴۳	۴۴	↑
		۴۵	۴۶	۴۷	۴۸	↑	۴۹	۵۰
		۵۱	۵۲	↑	۵۳	۵۴	۵۵	۵۶
			۵۷	۵۸	۵۹	۶۰	↑	۶۱
		۶۲	۶۳	۶۴	↑	۶۵	۶۶	۶۷
		۶۸	↑	۶۹	۷۰	۷۱	۷۲	↑
		۷۳	۷۴	۷۵	۷۶	↑	۷۷	۷۸
		۷۹	۸۰	↑	۸۱	۸۲	۸۳	۸۴
			۸۵	۸۶	۸۷	۸۸	↑	۸۹
		۹۰	۹۱	۹۲	↑	۹۳	۹۴	۹۵
		۹۶	↑	۹۷	۹۸	۹۹		

[illegible] ۱۹۴۲ء [illegible]

[illegible] ہندوستان کے مستقبل کے لیے آپ ۱۹۴۲ء [illegible]

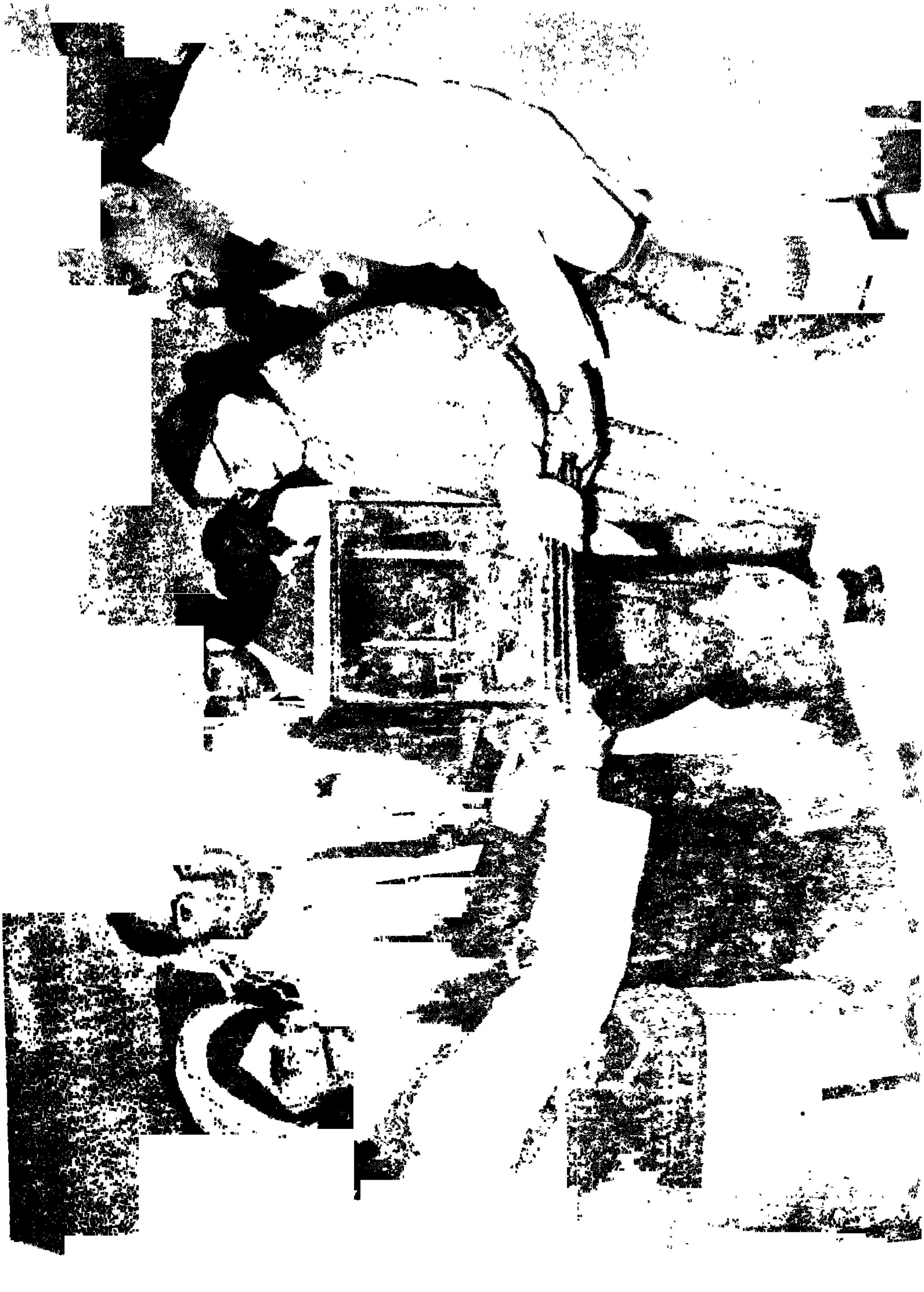
[illegible] ۱۹۴۷ء کے دور اور ۱۹۵۲ء کے سامنے کے جو [illegible]

[illegible] ہندوستان [illegible] کی [illegible]

[illegible]

[illegible] سال بعد [illegible]

[illegible]



January, 1966.

Regd. No. D. 1457.

Payam -i- Taleem

New Delhi-25.

Title and Pictures Printed at Liberty Art Press, Delhi.

پیامِ تعلیم



پیدائش

۲ر اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ء

وفات

۱۱ر جنوری سنہ ۱۹۶۶ء





جلد ۳ فروری ۱۹۶۶ء شمارہ ۲

ایڈیٹر:- محمد حسین حسّان ندوی

آرٹسٹ: گلیڈون میسی

سالانہ چندہ پانچ روپے

فی پرچہ پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

بمبئی آفس

پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

فہرست

تصاویر :

سرورق ۔ لال بہادر شاستری
دوسرا صفحہ ۔ منشی تلوک چند محروم



ابھی کوئی اٹھارہ انیس مہینے پہلے ہمارے دیس میں ایک زبردست حادثہ ہوا تھا۔ ہمارے محبوب رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کی موت سے سارے ہندوستان بلکہ ساری دنیا پر غم و الم کے بادل چھا گئے تھے۔ ابھی یہ بادل پوری طرح چھٹنے بھی نہ پائے تھے کہ گیارہ جنوری ۱۹۶۶ء کی رات کو پنڈت جی کے جانشین شری لال بہادر شاستری اپنے وطن سے دور اچانک اس دنیا سے چل بسے۔ سدا نام رہے اللہ کا۔

شاستری جی کل اٹھارہ مہینے دیس کے وزیراعظم رہے اس تھوڑی سی مدت میں دیس کی کشتی کے اس ناخدا اس سرپھرے ملاح کو طوفانوں سے لڑنا پڑا تھا۔ اور اپنی سوجھ بوجھ اپنے پکے ارادے کے سہارے وہ اس کشتی کو صحیح سلامت کنارے پر لے آیا تھا اس نے پوری قوم کا سر اونچا کر دیا تھا۔

پر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تاشقند کی کانفرنس کی شاندار کامیابی کی خبر سے ہندوستان پاکستان اور تمام ملکوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ چند ہی گھنٹے بعد کانفرنس کا ہیرو اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ خوشی کے نقارے ابھی بجنے بھی نہ پائے تھے کہ ماتم کی صفیں بچھ گئیں۔

پرماتما شاستری جی کی آتما کو شانتی دے۔ ان کی دھرم پتنی شریمتی للتا دیوی اور ان کی اولاد کو صبر و سکون عطا کرے وہ بظاہر ہم سے جُدا ہو گئے

ہیں پر جن اچھی باتوں: صلح و صفائی۔ امن و امان کی خاطر ان کی جان گئی ہے ان اچھی باتوں کا جب تک چلن رہے گا۔ شاستری جی بھی امر رہیں گے۔

پچھلے برس اردو کے بہت سے ادیب بہت سے شاعر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان میں حضرت تلوک چند محروم کو ہم آپ سب سے زیادہ جانتے پہچانتے ہیں۔ ان کی موت کا ہمیں سب سے زیادہ صدمہ ہے۔

حضرت محروم آپ کے رسالے کے صحیح معنوں میں سرپرست تھے۔ بہت ہی شفیق سرپرست پیام تعلیم نکالنے سے پہلے ہم نے ان سے نظم لکھنے کی درخواست کی تو بڑی خوشی سے ہماری درخواست کو قبول فرمایا۔ اور خود "پیام تعلیم" پر ایک نظم مرحمت فرمائی (یہ نظم آپ اگست ۱۹۶۴ء کے پرچے میں پڑھیے۔)

حضرت محروم اردو کے بہت بڑے شاعر تھے۔ سر اقبال اور سر عبدالقادر کے ساتھیوں میں تھے۔ لگ بھگ ساٹھ برس تک اردو کی خدمت کی۔ ہمارے آپ کے لیے تو سب سے بڑی بات یہ کہ بچوں کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کی نظموں کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں اور خوب مقبول ہوئے ہیں۔ ہم اس غم میں ان کے صاحبزادے محب محترم جناب جگن ناتھ آزاد کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ خدا انھیں اور ان کے دوسرے عزیزوں کو صبر و سکون کی توفیق عطا کرے۔

ہمیں افسوس ہے کہ چند در چند مجبوریوں کی وجہ سے آپ کا سالنامہ بہت دیر میں شائع ہو سکا۔ اور نئے سال کی جگہ عید کا تحفہ بن گیا۔ بہت سے پیامیوں کو یہ خاص عید کے دن ملا۔ ان پیامیوں کو یہ تحفہ بہت پسند آیا ہے اور انھوں نے اس کے بارے میں بہت اچھی رائیں لکھی ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ یہ خط اگلے پرچے میں چھاپ دیں۔ آپ بھی اپنی رائے بہت جلد ہمیں لکھ کر بھیج دیں۔

اور ہاں بھئی ہماری طرف سے عید کی مبارکباد قبول کیجیے۔ اس پرچے میں عید پر ایک نظم چھپ رہی ہے۔ یقین ہے کہ آپ اسے پسند کریں گے۔

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

جناب بزمی بھارتی

عید

عید کی بھی خوشی ہے کیسی خوشی
بوڑھے، بچے، جوان مرد و زن
پھول کی طرح مسکراتے ہیں
گلستان بن رہا ہے ہر آنگن
روزہ داروں کا خیر ذکر ہی کیا
آج بے روزہ دار بھی خوش ہیں
حسب مقدور خوش ہے مفلس بھی
اور آسودہ[1] کار بھی خوش ہیں
آج آپس میں مل رہے ہیں گلے
پھول کی طرح مہکے مہکے بدن
کاش دل بھی یوں ہی ملیں بزمی
جس طرح مل رہے ہیں گنگ و جمن

---

[1] امیر

لال بہادر شاستری

مغل سرائے کا نام تو آپ نے اکثر سنا ہوگا۔ یہاں ریلوے کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ پورب پچھم اتر دکھن قریب قریب سبھی علاقوں کی ریل گاڑیاں یہاں سے گزرتی ہیں۔ بنارس سے یہ جگہ کوئی سات میل دور ہے۔

یہیں بہت بڑی ریلوے کالونی ہے۔ اس کالونی یا بستی میں ایک بزرگ شاردا پرساد رہتے تھے۔ یہ ایک پرائمری اسکول میں استاد تھے۔

یہ اب سے کوئی باسٹھ برس (۲ اکتوبر ۱۹۰۴ء) پہلے کی بات ہے ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ ماں باپ نے اس بچے کا نام لال بہادر رکھا۔ شاردا پرساد بے چارے غریب آدمی تھے۔ بھلا اس زمانے کے پرائمری ٹیچر کی حیثیت ہی کیا! شاید اسی وجہ سے وہ اس نوکری کو چھوڑ کر الہ آباد چلے گئے تھے اور محرر مال ہو گئے تھے۔

لال بہادر ابھی ڈیڑھ برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور ان کی ماں انھیں اپنے باپ کے گھر لے گئیں۔ کہتے ہیں الہ آباد میں لال بہادر ایک بار کھو گئے تھے اور بڑی مشکل سے ملے تھے۔ الہ آباد میں سنگم پر کوئی مذہبی میلا تھا۔ لال بہادر کی اماں انھیں گود میں لیے میلے میں جا رہی تھیں۔ بھیڑ بہت تھی۔ دھکا پیل میں ننھے لال بہادر ان کی گود سے نکل گئے اور گرے بھی کہاں ــــ ایک گوالے کی ٹوکری میں!

اس بات سے گھر بھر کو پریشانی ہوئی۔ چاروں طرف تلاش شروع ہوئی۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد آخر پتہ چل گیا۔ یہ ننھے میاں اسی

گوالے کے گھر میں کلکاریاں مار رہے تھے۔ پہلے تو اس گوالے نے بچّہ دینے سے انکار کر دیا کہنے لگا "میں اسے گلئے کا دودھ پلاؤں گا، مکھن کھلاؤں گا۔ خوب آرام سے رکھوں گا"، پر بچّے کی ماں کا اداس چہرہ دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا اور لال بہادر کو ان کی ماتا کے حوالے کر دیا۔

کوئی دس سال کی عمر تک لال بہادر اپنے نانا کے گھر رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے چھٹا درجہ پاس کر لیا۔ ان کے نانا کا گھر خوب بھرا پرا تھا۔ بہت بڑا کنبہ تھا۔ سب ہنسی خوشی مل جل کے رہتے تھے۔ لال بہادر کے دل و دماغ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔

ثانوی یا ہائی اسکول کی تعلیم کے لیے لال بہادر بنارس بھیجے گئے۔ یہاں ان کے ایک چچا بنارس میونسپلٹی میں ہیڈ کلرک تھے۔ لال بہادر انھی کے گھر رہے۔ یہ بہت نیک اور شریف بزرگ تھے۔ اپنے ہونہار بھتیجے کے ساتھ بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ بھتیجے پر بھی اپنے چچا کی نیکی، شرافت اور خوش اخلاقی کا بہت خوشگوار اثر ہوا۔

لال بہادر جی کی تعلیم کا یہ زمانہ بڑی تنگدستی کا زمانہ تھا۔ بے چاروں کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ اپنے لیے ہاکی یا فٹ بال خرید سکتے۔ کپڑے کے چیتھڑوں کی ایک گیند بنالی تھی اسی سے اپنے غریب ساتھیوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

ایک بار اپنے اسکول کے ساتھیوں کے ساتھ کہیں میلا دیکھنے گئے۔ واپسی میں ان کے ساتھی کرایہ دے کر کشتی میں بیٹھ گئے اُن کی جیب خالی تھی۔ پر اس سے ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے، گنگا میں کود پڑے اور تیر کر دوسرے کنارے پہنچ گئے۔

۱۹۱۵ء میں مہاتما گاندھی ہندو یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھنے بنارس تشریف لائے۔ لال بہادر جی اس وقت گیارہ برس کے تھے۔ اس وقت گاندھی جی کی تقریر سن کر ان کے دل پر بہت اثر ہوا۔

پھر ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی نے نان کوآپریشن کی تحریک چلائی۔ لال بہادر اس وقت میٹرک یا اسکول سرٹیفکٹ کا امتحان دینے والے تھے۔ انھوں نے اس سال دوبارہ گاندھی جی کی تقریر سنی اور اتنے متاثر ہوئے کہ سرکاری مدد سے چلنے والے اسکول کا بائیکاٹ کر دیا۔

جس طرح نان کوآپریشن یا ترکِ موالات کے سلسلے میں علی گڑھ میں ہماری جامعہ قائم ہوئی

تھی اسی طرح بنارس میں کاشی ودیاپیٹھ کے نام سے ایک قومی تعلیمی ادارہ وجود میں آیا مشہور فلسفی ڈاکٹر بھگوان داس اس کے پرنسپل تھے۔ لال بہادر جی اس ادارے میں شامل ہو گئے بہت محنت سے پڑھا اور شاستری (بی اے) کی ڈگری لی۔ لال بہادر شاستری اس امتحان میں اول آئے۔

شاستری کا امتحان پاس کرکے لال بہادر شاستری سرونٹس آف دی پیوپل سوسائٹی کے ممبر بن گئے۔ یہاں انھیں عوام یا جنتا کی خدمت کا موقع ملا۔ شاستری جی بڑے خلوص۔ بہت تن دہی سے جنتا کی خدمت میں لگ گئے اور اسی زمانے میں ان کی قابلیت، اور سوجھ بوجھ کے جوہر کھلے۔

۱۹۲۷ء میں ان کی شادی شری متی للتا دیوی سے ہوئی۔ انھوں نے جہیز میں صرف ایک چرخا اور کھدر کا چند گز کپڑا لیا حالانکہ ان کے خسر جہیز میں بہت کچھ دے سکتے تھے۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ پنڈت جی نے اس قیمتی لعل کی قدر وقیمت کو پرکھ لیا۔ شاستری جی پر بھی پنڈت جی کا بہت اثر ہوا۔ وہ کانگریس کی قومی تحریک میں شامل ہو گئے، بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ کئی بار جیل بھی گئے۔

۱۹۴۶ء میں یوپی میں کانگریس کی حکومت بنی تو وہ اس کے پارلیمنٹری سکریٹری بنے اور بعد میں پولیس اور ٹرانسپورٹ کے وزیر بنائے گئے۔

۱۹۵۱ء میں شاستری جی راجیہ سبھا کے ممبر بنے اور وزارت کے مختلف عہدوں پر کام کیا آخر میں امور داخلہ کے وزیر مقرر ہوئے۔ مرکزی حکومت میں یہ وزارت سب سے اہم سمجھی جاتی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں کامراج پلان کے تحت مرکز کے دوسرے وزیروں کے ساتھ انھوں نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ مگر پنڈت جواہر لال نہرو ان کی انتظامی قابلیت سوجھ بوجھ، تن دہی سے اس قدر متاثر تھے کہ انھیں پھر وزارت میں لے لیا گیا۔ اس مرتبہ زیادہ تر وہ پنڈت جی کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اور مئی ۱۹۶۴ء میں پنڈت جی کے انتقال کا حادثہ پیش آیا تو وہی متفقہ طور پر ان کے جانشین یعنی مرکزی وزیر اعظم بنائے گئے اور اس عہدے کو انھوں نے جس خوبصورتی سے سنبھالا ہم آپ سب جانتے ہیں۔

ان کی وزارت کا زمانہ دیس کے لیے انتہائی پریشانی کا زمانہ تھا۔ چین سے لاگ ڈانٹ چلی آرہی تھی پاکستان الگ آنکھیں دکھا رہا تھا۔ آخر اس

نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ شاستری جی کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا پر وہ اپنی سوجھ بوجھ کی بدولت اپنے مضبوط ارادے کی بدولت اس کڑی آزمائش سے سرخ روئی کے ساتھ کامیاب ہوئے اور پورے دیس کے ہیرو بن گئے۔

اور جب یہ لڑائی ختم ہوئی تو اس سے بھی سخت مرحلہ پیش آیا۔ یہ تاشقند کی صلح کانفرنس تھی۔ شاستری جی نے یہاں بھی معجزہ کر دکھایا اور آپس میں صلح کر کے اور امن و امان کا پیمان وفا باندھ کر ہی دم لیا۔ شاستری جی جو سچ پوچھو تو لڑائی کے نہیں امن کے پجاری تھے اور امن کی یہ لڑائی جیت کے وہ امن کے ہیرو بن گئے ——— پاکستان ہندوستان کی اٹھارہ سال کی دشمنی دوستی میں بدل گئی۔

ہندوستان میں جس وقت کانفرنس کی کامیابی کی خبریں پہنچیں تو پورے دیس میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ پر ایسا لگتا ہے کہ امن کا یہ مجاہد اس بزم ہستی میں اس دنیا میں اپنا کام پورا کر چکا تھا اور پرماتما نے اس پیارے بندے کو اپنے پاس بلا لیا۔ شاستری جی کو اردو زبان اور اردو شاعری سے خاصی دلچسپی تھی ۱۲ سال کی عمر سے غالب کا یہ شعر اکثر گنگناتے رہتے تھے۔

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اور یہ شعر حرف بہ حرف ان پر پورا اترا۔

عجیب بات ہے کہ جس دن تاشقند کانفرنس کی خبر پہنچی اس کے چند ہی گھنٹے بعد امن کے اس دیوتا کی اچانک موت کی خبر نے سارے دیس کو غم والم میں مبتلا کر دیا۔ ہندوستان پر ہی نہیں ساری دنیا پر غم والم کے بادل چھا گئے۔

لال بہادر شاستری نے تاشقند معاہدے کے فوراً بعد اپنے ساتھی سردار سوارن سنگھ (وزیرخارجہ) سے جو آخری بات کہی تھی وہ بھی سن لیجیے:۔

"ہم نے اس لڑائی (ہندپاکستان کی لڑائی) میں اپنی پوری طاقت لگا دی تھی اور اب امن کے لیے ہمیں اپنی پوری طاقت لگانا ہے"!

شاستری جی کی طبیعت میں بڑی سادگی تھی۔ بہت انکسار تھا۔ سادگی کا اندازہ تو اس سے کیجیے کہ مئی ۱۹۶۵ء میں جب وہ روس کے سفر پر گئے تو ان کے جسم پر کھدر کی اونی شیروانی اور کھدر کی سفید دھوتی تھی۔ اور سفید سوتی موزے پہنے تھے۔ روس میں ایک امریکی نامہ نگار تو انھیں دیکھتے ہی چیخ اٹھا

(باقی ۲۱ پر)

جناب مہر ورولوی



بھارت ماتا کے دو لال

آہ، ابھی آنکھوں کے آنسو خشک نہ ہونے پائے تھے
آہ، ابھی تک نہرو جی کے غم میں دل مرجھائے تھے
وقت نے دل پر اور اچانک دوسرا سنکٹ[1] ڈال دیا
آشاؤں کے تاج محل کو لوٹ لیا، پامال کیا
حسنِ عمل سے یکجہتی کا مارگ[2] دکھایا تھا جس نے
بھارت پاک ملن کا سر پر بار اٹھایا تھا جس نے
کوسی گن کی چال کو جس نے جان لیا، پہچان لیا
امن کی خاطر دشمن کا بھی جس نے کہنا مان لیا
آج وہ، یعنی لال بہادر، منہ دنیا سے موڑ گیا
آشاؤں کے دیپ جلا کر دل کو تڑپتا چھوڑ گیا

---

[1] مشکل [2] راستہ

جناب شمیم حنفی

ایک درویش شاعر



یہ مضمون شمیم صاحب نے سالنامے کے لیے لکھا تھا۔ افسوس ہے کہ وقت پر نہیں ملا۔ اسی لیے اس پرچے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ غور سے پڑھیے کتنا دلچسپ اور پیارا مضمون ہے۔ ایڈیٹر۔

اگر آپ مجھ سے یہ سوال کریں کہ اردو زبان کے تمام شاعروں میں سب سے زیادہ دلچسپ شاعری اور شخصیت کس کی رہی ہے تو میں فوراً نظیر اکبر آبادی کا نام لوں گا۔

آپ میں سے بہت سے پیامیوں نے شہر آگرہ ضرور دیکھا ہوگا۔ وہی آگرہ جہاں دنیا کی سب سے خوب صورت عمارت " تاج محل " ہے۔ اب سے بہت عرصے پہلے آگرہ کا نام اکبر آباد تھا۔ نظیر نے اپنی زندگی کے تقریباً ستر برس اسی شہر میں گزارے اس لیے انھیں اکبر آبادی کہتے

ہے۔ یوں ان کی پیدائش ۱۷۳۵ء میں دلّی میں ہوئی تھی۔ لیکن نادر شاہ اور اس کے بعد احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دلّی کو اتنا اجاڑ دیا تھا کہ دلّی والے اپنا وطن چھوڑ کر سکون اور اطمینان کی تلاش میں دوسری جگہوں کو جا رہے تھے۔ نظیرؔ کی والدہ آگرے کی رہنے والی تھیں اس لیے انھوں نے دلّی چھوڑنے کے بعد آگرے ہی کا رُخ کیا اور یہ جگہ انھیں اتنی پسند آئی کہ مرتے دم تک یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

اب آپ نظیرؔ ہی کی زبان میں ان کا حلیہ سنیئے ـــــ

کہتے ہیں جس کو نظیرؔ سنیئے ٹک اس کا بیاں
تھا وہ معلّم غریب، بزدل و ترسندہ جاں[1]

فضل نے اللہ کے اس کو دیا عمر بھر
عزت و حرمت کے ساتھ، پارچہ[2] و آب و ناں

سُست روش[3]، پست قد، سانولا ہندی نژاد
تن بھی کچھ ایسا ہی تھا، قد کے موافق میاں

ماتھے پہ اک خال تھا، چھوٹا سا مَسّے کے طور
تھا وہ بڑا آنکھ اور ، ابروؤں کے درمیاں

وضع سُبک اس کی تھی، تس پہ نہ رکھتا تھا رِیش[4]
مونچھیں تھیں اور کانوں پر پٹے بھی تھے پنبہ ساں[5]

یہ نظیرؔ اکبر آبادی تھے۔ عوام کے شاعر جنھیں ان کے زمانے میں آگرے کا ہر آدمی جانتا تھا اور ان سے محبت کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام شاعروں کی طرح نظیرؔ لوگوں سے الگ تھلگ، کھوئے کھوئے سے اور مردُم بیزار نہیں رہتے تھے بلکہ زندگی اور زندہ دلوں سے پیار کرنے والے سیدھے سادے آدمی کی طرح لوگوں میں گھل مل کر رہتے تھے، لوگوں کی خوشی اور غم میں برابر کے شریک ہوتے تھے، لوگوں کی پریشانی اور مصیبت پر کُڑھتے تھے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ جس زبان میں شعر کہتے تھے وہ اتنی دلچسپ اور آسان ہوتی تھی کہ پڑھے لکھے یا ان پڑھ سبھی اچھی طرح سمجھتے تھے اور لُطف اُٹھاتے تھے۔

نظیرؔ سے پہلے بھی ہماری زبان اردو میں کئی اچھے شاعر ہوئے لیکن ان کی شاعری میں وہ رنگا رنگی اور دلکشی نہیں جو نظیرؔ کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ فارسی اور عربی زبان اور ادب کے اثر سے اردو شاعری میں زیادہ تر ایسی ہی باتیں کہی جاتی تھیں جیسی

---

[1] ڈرپوک [2] کپڑا [3] پانی، روٹی۔ [4] چال، یعنی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے۔ [5] داڑھی۔

---

[1] مشکل

عربی اور فارسی شاعر کہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے تک عام طور پر شاعر یا تو غزلیں کہتے تھے جن میں زیادہ حسن اور محبت کی باتیں ہوتی تھیں یا پھر قصیدے کہتے تھے جن میں کسی بادشاہ، راجا، نواب یا امیر کی تعریفیں ہوتی تھیں تاکہ وہ خوش ہو کر انعام و اکرام عطا کرے۔ نظیر درویش صفت آدمی تھے۔ سیدھی سادی زندگی بسر کرنے والے، مال و دولت سے بے پروا، عام انسانوں سے محبت کرنے والے اس لیے انھوں نے اپنے کو نہ تو صرف حسن و محبت کی باتوں میں الجھایا اور نہ عیش و آرام کے لالچ میں امیروں کی جھوٹی تعریفیں کیں۔

نظیر کو اپنے وطن آگرہ اور اپنے ملک ہندوستان کے ذرّے ذرّے سے محبت تھی۔ ہندوستان کے موسم، ہندوستان کے پہاڑ، دریا اور آبشار، ہندوستان کے پھول پتّے، چرند پرند، ہندوستان کے میلے ٹھیلے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہوار اور رسم و رواج، یہ تمام چیزیں نظیر کو دل سے پیاری تھیں۔ اسی لیے ان کی شاعری میں ہمیں ہندوستانی زندگی کی سچی تصویریں نظر آتی ہیں۔ وہ بلبل کے ترانوں سے زیادہ کوئل کی کوک اور پپیہے کی "پی کہاں!" کے عاشق ہیں۔ انھیں عید کے جشن اور شب برات کی چہل پہل کے ساتھ دیوالی، دسہرہ، بسنت اور جنم اشٹمی کی مسرتوں سے بھی پیار ہے۔ وہ شیخ سلیم چشتیؒ کے ساتھ ساتھ گرو نانک اور کرشن جی کے راگ بھی الاپتے ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی ہندو اور مسلمان نہیں بلکہ سب کے سب انسان ہیں۔

شہر آگرہ اور آگرے کے باشندوں سے نظیر کو اتنی گہری محبت تھی کہ باہر سے بلاوے آنے پر بھی وہ کہیں نہیں گئے۔ اودھ کے نواب سعادت علی خاں نے بھی ان کی شہرت سن کر انھیں اپنے دربار میں بلانا چاہا لیکن نظیر نے یہ جواب دے دیا کہ —— "میں کسی بھی ایسی جگہ نہیں جا سکتا جہاں سے شہر اکبر آباد کی دیواریں نظر نہ آتی ہوں"۔ آگرے میں وہ ایک لالہ بلاس رام کے بچّوں کو پڑھاتے تھے اور لالہ جی کے گھر سے جو کچھ مل جاتا تھا اسی میں خوش تھے۔ شاید لالہ جی ہی کے بچوں کے لیے نظیر نے گلہری، ریچھ، کبوتر، اژدہے اور بلبل پر نظمیں کہی تھیں، بڑی خوب صورت اور دلچسپ نظمیں جنھیں بچّے پسند کر سکیں۔ بچّوں ہی کے لیے انھوں نے "کوّے اور ہرن کی دوستی"، "پودنے اور گرگٹ کی لڑائی"، اور "ریچھ کے قصّے"

پر بھی بڑی مزیدار نظمیں کہی ہیں۔ "تربوز" "ککڑی" اور "تل کے لڈوؤں" پر بھی نظیر نے ایسی نظمیں کہی ہیں کہ انھیں پڑھتے وقت ان چیزوں کا مزا آجاتا ہے اب ذرا آپ بھی ان کا لطف اٹھا لیجیے :۔

سب سے پہلے آگرے کی ککڑیوں کا مزا دیکھیے۔

چھوٹے میں برگِ گل ہے، کھانے میں گرگری ہے ۔۔۔ گرمی کے مارنے کو اک تیر کی سرّی سے ہے

آنکھوں میں سکھ کلیجے ٹھنڈک ہری بھری ہے ۔۔۔ ککڑی نہ کہیے اس کو، ککڑی نہیں پری سے ہے

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی

اب تربوز کی مٹھاس اور ٹھنڈک کا بیان سنیے۔

میٹھے اور سرد ہیں اتنے کہ ذرا نام لیے ۔۔۔ ہونٹھ چپکے ہیں جدا، دانت ہیں کڑکڑ بجتے

شب کو دو چار منگا کر جو تراشے میں نے ۔۔۔ کیا کہوں میں کہ مٹھائی میں وہ کیسے نکلے

کوئی اولا، کوئی مصری، کوئی شکّر تربوز

اور اب جاڑے کے موسم میں تل کے لڈوؤں کا لطف اٹھائیے:۔

جاڑے میں پھر خدا نے کھلوائے تل کے لڈّو ۔۔۔ ہر اک خوانچے میں دکھلائے تل کے لڈّو

کوچے گلی میں ہر جا، بکوائے تل کے لڈّو ۔۔۔ ہم کو بھی ہیں گے دل سے خوش آئے تل کے لڈّو

جیتے رہے تو یارو، پھر کھائے تل کے لڈّو

ہمارے ملک کی برسات کا منظر کتنا اچھا اور سہانا ہوتا ہے، نظیر کی زبان میں اس کا بیان سنیے:۔

جنگل سب اپنے تن پر، ہریالی سج رہے ہیں ۔۔۔ گل، پھول، جھاڑ، بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں

جھڑ کر رہی ہیں جھڑیاں، نالے اُمنڈ رہے ہیں ۔۔۔ برسے ہے مینھ جھڑا جھڑ، بادل گھمنڈ رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ان اشعار سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ نظیر کتنے دلکش طریقے سے اپنی باتیں کہتے ہیں۔ ان باتوں

۱؎ پھول کا پتہ ۔۔۔ ۲؎ جیسی

سے یہ خیال بھی ہو سکتا ہے کہ نظیر بس ایسی ہی باتیں کہتے تھے جو دلچسپ اور مزیدار ہوں۔ لیکن — ایسا نہیں ہے انھوں نے اسی سیدھے سادے طریقے سے بڑے پتے کی باتیں بھی کہی ہیں۔ نیکی اور بدی، موت اور زندگی، خوشی اور غم، مفلسی اور امارت، روٹی اور پیسہ، ان موضوعات پر بھی نظیر نے بڑی پیاری نظمیں کہی ہیں انسان اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ اس میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خرابیاں بھی۔ نظیر ان دونوں باتوں پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کی ایک نظم "آدمی" کا یہ بند دیکھیے :-

پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں نماز یاں　　اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ہماری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ "روٹی" ہے۔ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتا. نظیر نے یہ بات کتنے دلکش پیرائے میں بیان کی ہے —

جس جا پہ ہانڈی، چولھا، توا اور تنور ہے　　خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آگ جو جلتی حضور ہے　　جتنے ہیں نور، ان میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

اب ذرا "دنیا" کے بارے میں میاں نظیر کی بات سُنیے۔ آپ نے وہ مثل سُنی ہوگی کہ "جیسا کروگے ویسا بھروگے"، نظیر نے یہی بات اس طرح کہی ہے —

جو اور کسی کا مان رکھے تو اس کو بھی ارمان ملے　　جو پان کھلادے پان ملے، جو روٹی دے تو نان[1] ملے
نقصان کرے نقصان ملے، احسان کرے احسان ملے　　جو جیسا جس کے ساتھ کرے، پھر ویسا اُس کو آن ملے
کچھ دیر نہیں، اندھیر نہیں، انصاف عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے، یاں سودا دست[2] بدستی ہے

بچپن کا زمانہ بھی کیا زمانہ ہے! ہر انسان سب سے زیادہ اپنے بچپن ہی کو یاد کرتا ہے کیونکہ یہی وہ

---

[1] روٹی　　[2] اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔

دن ہیں جب وہ زندگی کی تمام الجھنوں سے محفوظ رہتا ہے۔ امیر اور غریب، گورے اور کالے، سب کا بچپن ایک جیسا معصوم ہوتا ہے۔ نظیر کے الفاظ میں —

موٹے ہوں یا کہ دُبلے گورے ہوں یا کہ کالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

موت زندگی کی سب سے اٹل حقیقت ہے۔ موت ہی قدرت کی وہ ادا ہے جس کے سامنے ہر علم اور ہر سائنس عاجز ہے۔ انسان کی دولت، علم، شہرت اور عزت، کوئی بھی چیز اسے موت سے نہیں بچا سکتی۔ دیکھیے نظیر نے کتنی سیدھی سادی زبان میں یہ خیال ظاہر کیا ہے۔

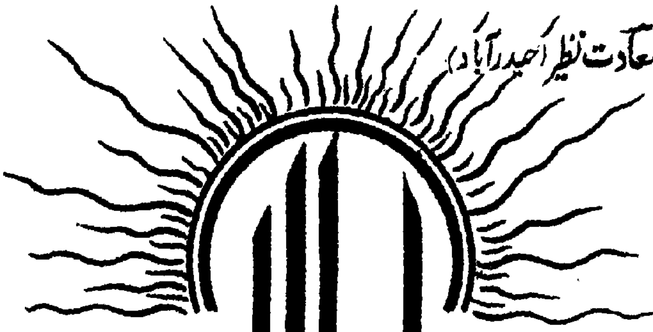
کیا بدھیا، بھینسا، بیل شتر[1]، کیا گوئیں پلّا سر بھارا کیا گیہوں، چاول، موٹھ مٹر، کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ تھے میاں نظیر! ایک درویش شاعر جن کی زبان زندگی کی زبان ہے، سادہ، سہل، میٹھی بھولی بھالی اور دلچسپ۔ اور جن کی شاعری ہماری زندگی کی رنگا رنگی اور ہمارے وطن کی خوشبوؤں سے بھری ہوئی ہے۔ جو صرف اپنے خوابوں کی باتیں نہیں کرتے بلکہ ہم سب کے دل کی بات کہتے ہیں۔ ۱۸۳۰ء میں ہمارا یہ انسان دوست شاعر بنجاروں کی طرح دنیا کی یہ بستی چھوڑ کر موت کی اس وادی میں چلا گیا جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آ سکتا۔ لیکن نظیر نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہمیشہ کے لیے خود کو زندہ کر لیا ہے۔ ہم انھیں ہمیشہ محبت سے یاد کریں گے۔ ان کی باتیں کریں گے۔ ان کے اشعار دہرائیں گے۔ نظیر کی مقبولیت کا اندازہ آپ صرف اسی ایک بات سے لگا سکتے ہیں کہ جب ان کا انتقال ہوا تو مسلمانوں کے دونوں فرقوں، سنیّوں اور شیعوں نے اپنے اپنے طریقے سے ان کے جنازے کی نماز پڑھی اور ان کے ہندو دوست ان کے جنازے کی چادر لے گئے کیونکہ وہ سب کے شاعر تھے، سب کے دوست، سب کو پیار کرنے والے اور سب کے پیارے!

---

[1] اونٹ

حضرت سعادت نظیر (حیدرآباد)



اجالا

اے میرے ہم خیالو — مشرق کے رہنے والو
لو، پَو وہ پھٹ رہی ہے — تاریکی چھٹ رہی ہے
کرنیں سنہری پھوٹیں — نکھریں فضائیں نکھریں
وہ آفتاب اُبھرا — ہونے لگا اُجالا
بھاگا، اندھیرا بھاگا — جاگا، زمانہ جاگا
جاگی چمن کی قسمت — بیدار ہے مسرت
حرکت ہی میں ہے برکت — محنت ہی میں ہے راحت
کس شام کی سحر ہے — آباد ہر نگر ہے
لائی سحر وہ تحفے — جو نور ہیں نظر کے
ساماں ہیں خوشی کے — منظر ہیں زندگی کے

آکاش جگمگایا
سنسار مسکرایا

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم

ایک مدت سے محروم صاحب کا کلام، مدرسوں میں پڑھایا جا رہا ہے میں نے سب سے پہلے چھٹی جماعت میں ان کی ایک نظم پڑھی تھی۔ اور اب میرے بچے ان کی نظمیں پڑھا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ گھر ایسے بھی ہوں جہاں تین نسلوں نے محروم صاحب کی زندگی ہی میں اُن کی نظمیں اپنی تعلیم کے زمانے میں پڑھی ہوں۔ شاید ہی ایسی مقبولیت کسی اور شاعر کو اپنی زندگی میں نصیب ہوئی ہو۔ لیکن اب محروم صاحب مرحوم ہو چکے ہیں۔ ان کا انتقال ۶ جنوری ۱۹۶۶ء کو دہلی میں ہوا۔ ان کے اُٹھ جانے سے اردو کی محفل اپنے ایک پیارے بزرگ سے محروم ہو گئی۔ جس سے اس کی عزت بڑھتی تھی اور ہمت بندھتی تھی۔ جس کی بات میں اردو کی سچی مٹھاس موجود تھی اور جو اپنی ذات میں اردو کا اصلی جوہر رکھتا تھا یعنی دیس پریم اور آپس کا میل ملاپ۔ جو صرف ایک اچھا شاعر ہی نہ تھا بلکہ ایک اچھا انسان بھی تھا۔

محروم صاحب کا نام تلوک چند تھا۔ وہ یکم جولائی ۱۸۸۷ء کو دریائے سندھ کے کنارے مغربی پنجاب کے اندر میانوالی کے ضلع میں کاجران والا نام کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ عیسیٰ خیل کے مڈل اسکول اور بنوں کے ہائی اسکول میں تعلیم پائی۔ شروع سے لے کر دسویں جماعت تک برابر اوّل درجے میں کامیاب ہوتے رہے۔ اس کے بعد سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے معلّمی کی سند حاصل کی اور استاد بن گئے۔ ملازمت کے زمانے میں ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں راولپنڈی کے چھاؤنی بورڈ اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اور فوراً گارڈن

کالج راولپنڈی میں اردو اور فارسی کے لکچرر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو وہ کسی طور دہلی آ گئے۔ یہاں کچھ مدّت تیج اخبار میں کام کیا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی میں تقریباً دس سال تک لکچرر رہے۔ عمر کا باقی حصّہ دہلی میں ہی اپنے لائق بیٹے اردو کے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد کے پاس رہ کر اردو کی خاموش خدمت میں گزارا۔

محروم صاحب اپنے اسکول کے زمانے میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر میں انھوں نے اپنی مشہور نظم "چڑیا کی زاری" لکھی تھی۔ ان کی نظمیں بہت جلد اپنے زمانے کے مشہور رسالوں میں چھپنے لگی تھیں۔ ۱۹۳۲ء میں پہلی بار اُن کی نظموں کا مجموعہ 'گنج معانی' چھپا۔ اس نے ان کی شہرت اور پھیلا دی۔ نظموں سے ان کی درد بھری طبیعت اور محبت کی نیت کا احساس ہوتا تھا۔ ان کے یہاں ایک ایسا خلوص نظر آیا جس نے اپنی طرف متوجہ کر کے چھوڑا۔ کلام کا اخلاق کی طرف کچھ ایسا جھکاؤ تھا کہ مدرسے کے طالب علموں کے لیے وہ ہر طریقے سے موزوں نظر آیا۔ زبان بھی صاف تھی۔ اپنی کچھ ایسی ہی خصوصیات کی وجہ سے ان کی نظمیں عام طور پر مدرسوں کے اندر اردو کی کتابوں میں شامل کی جانے لگیں۔

مناظر قدرت کی نظمیں عموماً آسان اور دلچسپ ہیں۔ مثلاً ان کی نظم "بلبلا" کا پہلا بند سنیے۔

پھُولا ہوا ہے کس لیے؟ کیا بلبلے میں ہے — اللہ! کون سی یہ ہوا بلبلے میں ہے
اُف! کس قدر غرور بھرا بلبلے میں ہے — فرعون کوئی آ کے چھپا بلبلے میں ہے؟
کتنا ابھار، کتنی اکڑ، کیسی شان ہے
پانی کی ایک بوند میں کیا آن بان ہے!

یہاں پر تو ان کی طبیعت کا رنگ ذرا دَبا دَبا ہے۔ لیکن اخلاقی نظموں میں تو بات صاف صاف ہے مگر لطف اور پیار کے ساتھ۔ ذرا 'جگانے کی گھڑی' کے یہ پہلے تین شعر پڑھیے۔

وقتِ سحر ہے، سونے والو — دھیان کدھر ہے، سونے والو
جاگو نیند کے اے متوالو — لُطفِ سحر کو کھونے والو
جاگ اُٹھا ہے پتّا پتّا — غفلت کیسی؟ سونا کیسا؟

محرّوم صاحب کی نظموں کا دوسرا مجموعہ 'کاروان وطن' ہے جس میں ساری کی ساری وطنی نظمیں شامل ہیں جن سے ان کی وطن دوستی کا پتہ چلتا ہے۔

نظموں کے علاوہ محرّوم صاحب کو اپنی رباعیوں کی وجہ سے بھی اچھی خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ یہاں کی ادھیڑ عمر کا کلام ہیں۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں رباعیات کا ایک مجموعہ چھپا۔ ذرا ایک آسان رباعی سنیے:۔

آٹا مصنوعی اور گھی مصنوعی ۔۔۔ مل جاتے ہیں دودھ اور دہی مصنوعی
مصنوعی ہیں زندگی کے سارے ساماں ۔۔۔ کیونکر نہ ہو اپنی زندگی مصنوعی

رباعی لکھنا کچھ آسان نہیں۔ لیکن محرّوم صاحب نے لفظی گورکھ دھندے سے دور رہ کر سادگی کے ساتھ علم و حکمت کی باتیں اپنی رباعیات میں بیان کی ہیں۔

لیکن خصوصیت کے ساتھ محرّوم صاحب اپنی ان نظموں کے لیے یاد رکھے جائیں گے جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھیں۔ انھوں نے ہمیشہ بچوں کو یاد رکھا اور اُس وقت ان کے لیے لکھنا شروع کیا جب کہ بہت کم شاعر اس طرف دھیان دیتے تھے۔ ان کی نظموں کا ایک باقاعدہ مجموعہ 'بہارِ طفلی' کے نام سے سنہ ۱۹۶۰ء میں بڑے صاف ستھرے انداز سے سامنے آیا۔ 'ہمارا دلیش'، 'کتاب'، 'محنت'، 'ہم ہرگز جھوٹ نہ بولیں گے'، 'تندرستی ہزار نعمت ہے'، 'برسات'، اور بہت سی ایسی نظمیں اس مجموعے میں موجود ہیں جو ہر بچے کو زبانی یاد ہونی چاہئیں۔ بچوں کی نظموں کا دوسرا مجموعہ 'بچوں کی دنیا' پہلے مجموعے کی سی سج دھج لیے ہوئے سنہ ۱۹۶۲ء میں نکلا۔ اس کی نظمیں کچھ اور بھی آسان ہیں جن سے کچھ اور چھوٹے بچے تک لطف اٹھا سکتے ہیں۔ 'دعا'، 'خدا کی قدرت'، 'میری کتاب'، 'گنگا' اور 'کھیتی باڑی' اس مجموعے کی اچھی نظموں میں سے چند کے نام ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ محرّوم صاحب کی نظمیں بچوں کے اخلاق کو بڑے اچھے انداز سے سنوارتی ہیں اردو کے نامور شاعروں میں ایسے بہت کم ہیں جنھوں نے بچوں کی طرف توجہ کی ہو۔ محرّوم صاحب نے جس طرح اور جس قدر بچوں کا خیال رکھا ہے، اس کا اندازہ انھیں بڑے ہو کر ہوگا

ان کا ذکر کرتے کرتے ان کی آواز کانوں میں گونجنے لگتی ہے۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔

اے پیارے لڑکو اے نونہالو
نیت کو اپنی اونچا اٹھالو
دل میں تم اپنے رکھو ہمیشہ
اچھے ارادے
اونچے ارادے

لال بہادر شاستری

(بقایا ص ۹)

ندایا! شاستری تو اس ٹھنڈ میں جم کر رہ جائیں گے"۔
شاستری جی کے ایک لڑکپن کے ساتھی ان کے بارے میں لکھتے ہیں :۔
"لڑکپن میں بھی شری لال بہادر شاستری کے طور طریق ان کے ہم سبق ساتھیوں کا دل موہ لیتے تھے۔ وہ تنہائی پسند اور خاموش طبیعت کے تھے۔ بہت شرمیلے تھے اور ظاہری نمود سے بچتے تھے۔ ....ان کے پستہ قد سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دل کے نرم اور ارادے کے کمزور ہوں گے۔ مگر یہ بات بہت کم لوگ جانتے تھے کہ وہ مستقل مزاج ہیں....اگر وہ ایک مرتبہ کسی کام کو کرنے کا ارادہ کر لیتے تھے تو کوئی ان کے فیصلے میں تبدیلی نہیں لاسکتا تھا.....
وہ نہ تو مظاہرے یا نکتے نہ بڑے بڑے الفاظ کہنے کے عادی تھے اس لیے لوگ انھیں پرکھنے میں دھوکا کھا جاتے تھے"۔



جناب وقار خلیل

بہارِ طفلی کا شاعر

(جناب محروم صاحب کی شعری خدمات کو خراج عقیدت)

اخلاق کے پھولوں کی ہے اس میں مہکار
محروم کی عظمت کا ہے سب کو اقرار
بچوں کی گلستاں ہے "بہارِ طفلی"
یا دیس کے تاروں کا چمکتا سنسار

اطفال کے اخلاق کی گلکاری ہے
آئینۂ آداب کی زرکاری ہے
محروم سے شاعر کی "بہارِ طفلی"
گل رنگ شعاعوں کی گہرباری ہے

گر دیس کے تاروں کو جگانا چاہو
اسلاف کی راہوں پہ چلانا چاہو
ہے تحفۂ محروم "بہارِ طفلی"
پھولوں کو جو گلزار بنانا چاہو

بمبئی کے چوہے



محترمہ عائشہ یوسف ناظم

بمبئی کی آب و ہوا صرف چوہوں کو راس آتی ہے ورنہ بمبئی میں آدمی تو کسی نہ کسی بیماری کا شکار ہی رہتا ہے۔ بیمار نہ ہو تو بھی آدمی یہاں کچھ زیادہ صحت مند نظر نہیں آتا۔ البتہ یہاں کے جس چوہے کو دیکھو کسی شاہی محل کا مصاحب معلوم ہوتا ہے۔ نہایت ہٹا کٹا، کسا ہوا جسم، وزن بھی دس بارہ کلوگرام سے شاید ہی کم ہو!

بعض چوہے تو بلی سے بھی زیادہ وزنی ہوتے ہوں گے۔ آدمی اگر بہت موٹا ہو جائے تو کسی کام کا نہیں رہتا۔ نہ تو وہ پھرتی کے ساتھ ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ سکتا ہے نہ تیزی سے سڑک پار کر سکتا ہے نہ ریل میں چڑھ سکتا ہے نہ بس پکڑ سکتا ہے۔ بہت موٹا آدمی بس شاعری کر سکتا ہے۔

لیکن بمبئی کا چوہا باوجود بہت موٹا ہونے کے اس قدر پھرتیلا ہوتا ہے گویا سو گز کی دوڑ کا ہیرو ہو۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ان چوہوں میں کشتی کے مقابلے ہوئے ہوں گے۔ اور یہ چوہے دن کے وقت اکسر سائز بھی کرتے ہوں گے۔ تاکہ جسم بنا رہے اور کشتی میں ہارنا نہ پڑے۔

بمبئی کے چوہے دیہاتوں کے چوہوں کی طرح بدھو اور نکمے نہیں ہوا کرتے۔ یہ چوہے جانتے ہیں کہ بڑے شہروں میں کیسے زندگی گذاری جاتی ہے چھوٹی عمر سے ہی پانی کے پائپ پر چڑھنے کی مشق کرتے ہیں۔ اور آٹھ دس منزلوں تک کی عمارتوں پر آسانی سے چڑھ جاتے ہیں۔ ان

چوہوں کو اگر باضابطہ ٹریننگ دی جائے تو شاید یہ ہمالیہ کی چوٹی پر بھی چڑھ جائیں۔ یہ ہائی جمپ اور لانگ جمپ کے بھی ماہر ہوتے ہیں اور اگر انھیں کسی سرکس میں کرتب دکھانے کا موقعہ ملے تو اسی پر اپنا کتھک ناچ بھی دکھا سکیں گے۔

بمبئی کے چوہے بڑی ہوشیاری سے اپنے رہنے کی جگہ کا انتخاب کرتے ہیں اور بڑے سے بڑا اسٹر لاک ہومز بھی ان کے رہنے کی جگہ نہیں معلوم کر سکتا۔ یہ لوگ دن میں انڈر گراؤنڈ یا روپوش ہو جاتے ہیں۔ اور صرف رات میں اپنا کاروبار جاری رکھتے ہیں۔ رات میں اندھیرا ہوا نہیں کہ یہ چوہے بڑی آزادی اور بے باکی کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکل پڑے۔ گھر کے ہر کمرے کی یوں تلاشی لیتے ہیں جیسے کسی نے ان کا مال چرا کر کہیں چھپا دیا ہو۔

اب ان کی تفتیش میں گھر کی چیزیں درہم برہم ہو جائیں ان کی بلا سے۔ گھر کے برتن ٹوٹ جائیں تو ان کو کیا فکر۔ بمبئی کے چوہے بادشاہوں کی طرح جلوس کی شکل میں آتے ہیں۔ کبھی فقیروں کی طرح اکیلے نہیں۔ اور گھروں میں چاروں طرف یوں پھیل جاتے ہیں جیسے گھروں کی حفاظت کا کام انہی کے ذمے ہے۔ اور اگر یہ پہرہ نہ دیں گے تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔

اگر کسی میں ہمت ہو تو واقعی ان کی پریڈ دیکھنی چاہیے۔ کمرے میں ایک سمت سے دوسری سمت وہ اس قدر تیزی سے جاتے ہیں جیسے کوئی بہت ضروری کام انھیں یاد آگیا ہو۔ چھت پر سے نیچے یوں کودتے ہیں جیسے سوئمنگ پول میں مشاق تیراک چھلانگ لگاتے ہیں اور کبھی نیچے سے اوپر کی طرف یوں بھاگ کر چڑھتے نظر آتے ہیں جیسے کہ جھاڑ بندر (بمبئی کی طرف کا کھیل) کھیل رہے ہوں۔ اگر چوہوں کی صورت شکل اچھی ہوتی اور وہ نقصان نہ پہنچاتے تو ان کی یہ ساری ادائیں بڑی پیاری تھیں۔ لیکن ان چوہوں کی نیت چینیوں کی طرح خراب ہوتی ہے اور پھر وہ اتنے ڈھیٹ ہوتے ہیں کہ بس جی چاہتا ہے خنجر بھونک دیں۔

چوہے ہم نے بہت دیکھے ہیں بالخصوص دیہاتوں کے چوہے تو اتنے شریف ہوتے ہیں کہ آدمی کا سایہ دیکھیں تو میلوں دور بھاگ جائیں لیکن بمبئی کے چوہے اللہ ہی رحم کرے! بلیاں ان سے ڈر کر بھاگ جائیں یہ چوہے بلیوں

کے قابو میں آ بھی نہیں سکتے۔

خود ہم پر ایسا واقعہ گزرا ہے کہ جب بھی اس کی یاد آتی ہے ہم کانپ جاتے ہیں۔ رات میں کوئی بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔ ہم اچھی خاصی گہری نیند سو رہے تھے کہ بالکونی میں کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے سوچا ضرور یہ ہمارے کرم فرما چوہے شاہ صاحب قبلہ ہوں گے۔ آنکھ کھول کر ادھر اُدھر دیکھا تو پہلے تو کچھ نظر نہ آیا چوہے میاں کے دیدار کے شوق میں ہم پھر نیند کی طرف مایل نہ ہو سکے اور ہم نے سوچا کہ اس کھٹ پٹ کا راز دریافت کرنا چاہیے۔ ٹارچ جلا کر دیکھا۔ اپنے سرہانے ہی ایک نہایت تندرست و توانا چوہے کو بیٹھا پایا۔ ٹارچ کی روشنی ان پر پڑی بھی، انھوں نے شرمانا یا جھجکنا ضروری نہیں سمجھا بلکہ الٹا ہمیں ہی یوں گھورنے لگے گویا ہم سے ہی کوئی قصور ہو گیا ہو اور ہم ہی نے ان کی مصروفیات میں خلل ڈال دیا ہو۔ ان کے جلال او غصے سے ہم واقعی ڈر گئے۔ اور ہم نے اسی میں بہتری سمجھی کہ ٹارچ بند کر دیں اور اپنی شکست مان لیں۔ ہم تو سمجھے تھے کہ شاید وہ ہم پر حملہ بھی کر دیں گے۔ لیکن معلوم نہیں اللہ میاں نے ان کے دل میں کیسے رحم ڈال دیا اور وہ خود ہی چپکے سے دوسری طرف چلے گئے۔

بمبئی کے چوہوں کو گننے کا کام کسی سے نہ ہو سکا۔ بمبئی میں لاکھوں کروڑوں گھر ہیں اور ہر گھر میں کم سے کم پندرہ چوہے ضرور رہتے ہیں اور بڑے آرام سے رہتے ہیں۔ ممکن ہے یہی چوہے کبھی کبھار باہر جا کر دیہاتوں کے چوہوں کو بھی بلا لاتے ہوں بطور مہمان۔ بمبئی کے چوہوں پر ہر سال بھاری رقم خرچ کی جاتی ہے۔ انھیں پکڑنے کے لیے باضابطہ ملازم رکھے جاتے ہیں لیکن چوہے کب کس کے بس میں آتے ہیں۔ ایک چوہے کا جنازہ نکلتا ہے تو دس پیدا بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک ہی چوہے کی اولاد آٹھ دس سال میں لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔

چندہ ہمیشہ منی آرڈر سے بھیجیے۔ دی۔ پی منگانے میں آپ کا نقصان ہے۔

سالانہ خریدار خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیں۔

منیجر۔

محترمہ ہاجرہ بیگم



بھوندو چوبے

آتا متھراجی کا پنڈا
ہاتھ میں لے کر موٹا ڈنڈا
ڈٹ کر کھانا ان کا کام
بھوندو چوبے ان کا نام
جہاں کہیں بھی دعوت ہوتی
پہنے اپنا کُرتا دھوتی
لمبے لمبے قدم بڑھاتا
پہنچ سبھی سے پہلے جاتا
کھاتا یہ پیڑے متھرا کے
اور کچوری خوش خوش ہوکے
حلوا پوری ڈٹ کر کھائے
پھر مٹھائی چٹ کر جائے
کھاپی کر جاتا ہے لیٹ
بہت بڑا ہے اس کا پیٹ

جناب سید احمد علی آزاد

علی گڑھ میں تین سال

کسی پچھلے پرچے میں سید احمد علی صاحب کا ایک دلچسپ مضمون "اقبال نرائن" چھپا تھا۔ پیامیوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اس مضمون میں سید احمد علی صاحب نے جامعہ کی پرانی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ چالیس بیالیس سال پہلے کی کہانی ہے۔ بہت ہی دلچسپ کہانی ہے۔ مضمون میں جن لوگوں کے نام ہیں ان میں سے کچھ تو اللہ کو پیارے ہوئے جو زندہ ہیں وہ اسے پڑھیں گے تو یقیناً ان یادوں میں کھو جائیں گے اور اس زمانہ کی جامعہ کی تصویر آنکھوں تلے پھرنے لگے گی۔

ایڈیٹر

ترک موالات کے سلسلے میں اسکول چھوڑے ہوئے دو سال ہو چکے تھے

اس عرصہ میں خلافت اور کانگریس کے کارکن کی حیثیت سے شہر شہر اور گاؤں

گاؤں کام کرتے رہے۔ کبھی سید محمد ٹونکی صاحب کے ساتھ دورہ ہوتا، کبھی محمد علی بنارسی کے ساتھ۔ کبھی میں تنہا کام کرتا۔

لیکن چوری چورا[1] کے واقعہ کے بعد کانگریس اور خلافت کے تمام ہنگامی کام ختم ہو گئے۔ اس لیے دوبارہ تعلیم شروع کرنے کا سوال سامنے تھا۔ دوبارہ داخلہ کے لیے ہم لوگوں کے لیے انگریزی اسکولوں کے راستے بند تھے۔ اور ہم لوگ بھی ایک دفعہ ان مدرسوں سے نکلنے کے بعد پھر ان مدرسوں میں پڑھنا اپنی خودداری کے خلاف سمجھتے تھے۔

جگہ جگہ قومی اسکول اور کالج کھل گئے تھے۔ خود بنارس میں کاشی ودیا پیٹھ کا ادارہ قائم ہو چکا تھا جس میں جے نرائن ہائی اسکول کی تعلیم کا بائیکاٹ کرنے کے بعد چار یا چھ مہینے تک میں نے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ جناب کرپلانی صاحب ہم لوگوں کو انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔

بہت غور و فکر کے بعد سید برادرز فوٹوگرافر کے مشورہ سے میرے اور اُن کے تینوں لڑکوں سید محمد علی، سید ارشد علی اور سید سرفراز علی کو جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔

ہم لوگ یکم جولائی ۱۹۲۲ء کو علی گڈھ پہونچے اور چندینا (چن ڈینا) کوٹھی میں ٹھہرائے گئے۔ رات کا کھانا کھا کر تقریباً ساڑھے دس بجے سو گئے۔ ریل کے سفر کی تھکن تھی اس لیے ہم سب ہی غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ اچانک ہم لوگوں کی چارپائیاں اُلٹ دی گئیں۔ ہم لوگ گھاس پر پڑے ہوئے تھے۔ ہمارے اوپر ہمارے بستر تھے اور اس کے اوپر چارپائیاں تھیں جن کے نیچے ہم دبے

---

[1] چوری چورا گورکھپور کے ضلع میں ایک گاؤں یا قصبہ ہے۔ یہاں پولیس اسٹیشن بھی ہے۔ یہاں کے لوگ ضرورت سے زیادہ جوش میں آکر تشدد پر اتر آئے تھے۔ تھانے کو بھی جلا دیا تھا۔ ہمارے باپو مہاتما گاندھی کو جونہی یہ خبر ملی انھوں نے اس تحریک کو بند کر دیا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اُن کی تحریک کی بنیاد عدم تشدد پر تھی۔

ہوئے تھے۔

چوں کہ ایسا تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا اس لیے سمجھے کہ زلزلہ آگیا ہے۔ کافی دیر تک سہمے ہوئے پڑے رہے۔ محمد علی ہم سب میں بڑے تھے۔ کہنے لگے "علی گڈھ کی روایت کے مطابق کسی نے چارپائیاں اُلٹ دی ہیں۔ اُٹھو کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔" معلوم ہوا کہ اس اکیٹوٹی کے ہیرو کنور اشرف علی صاحب تھے جنہوں نے اُسی سال بی۔ اے۔ کا امتحان جامعہ سے پاس کیا تھا اور چندینا کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

چندینا کوٹھی میں چند دن قیام کے بعد اسکول کے تمام طلباء فرید منزل میں منتقل ہو گئے۔ یہ کوٹھی ڈگی (تالاب) کے قریب تھی۔ یہیں چند عمارتوں میں اسکول اور کالج کے طلباء کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ یہیں تعلیم ختم ہونے کے بعد دن کا کھانا تمام طالب علم اور اُستاد مل کر کھاتے تھے۔ اس کو محمد علی ہال کہتے تھے۔ یہ ہال تعلیم اور نمازوں کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔

فرید منزل کے اتالیق جناب مولانا شرف الدین صاحب تھے۔ کالج میں اردو بورڈنگ میں پانچوں وقت کی نماز پڑھایا کرتے تھے۔ زندہ دل اُستاد تھے۔ پان بہت کھاتے تھے۔ بورڈنگ کے طلباء ان سے قصّوں کی فرمایش کر کے قصّے سُنا کرتے تھے جن کا تعلق عام طور پر ان کی زندگی کے تجربوں سے ہوتا تھا۔ یہ قصے پڑھائی کے گھنٹوں میں بھی ہوتے تھے اور اگر کہیں محمود صاحب نے کوئی دینی مسئلہ چھیڑ دیا تو پورا گھنٹہ اسی میں صرف ہو جاتا تھا اس طرح قصے زیادہ پڑھائی کم ہوتی تھی۔

بورڈنگ کے ساتھیوں میں محمود حسین خاں، ڈاکٹر انور حیدر آبادی، محمد عمار وقق سیوہاروی، غلام حسین رنگونی، فیاض حسین لوتھانی، محمد رفیق مرادآبادی، قاضی عبدالحمید قاضی محمد علی براری بہت نمایاں تھے۔ بنارسی ساتھیوں میں محمد علی کالج میں تھے اس لیے بنگالی کوٹھی میں رہتے تھے۔ میں ارشد علی اور سرفراز علی فرید منزل میں تھے۔ ۱۹۲۲ء میں اسکول کے لڑکوں کی تعداد

بہت کم تھی لیکن دوسرے سال تعداد زیادہ ہوگئی، تو فرید منزل کے سامنے ایک اور بورڈنگ کرایے پر لے لی گئی نام تھا "رحمٰن منزل"۔

ان دونوں بورڈنگوں میں ساتویں جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک کے طلباء رہتے تھے۔ دوسرے سال جناب حافظ فیاض احمد صاحب ہمارے اتالیق مقرر ہوئے۔ حافظ صاحب بورڈنگ سے کچھ دور آمر مصطفٰے صاحب کی کوٹھی میں رہتے تھے۔

مانیٹروں کا انتخاب ہوا تو محمود صاحب جنرل مانیٹر، سمیع الدین صاحب، نعمت اللہ صاحب، مسعود احمد صاحب اور ارشد علی کھانا مانیٹر اور میں نماز مانیٹر مقرر ہوئے۔ ان بورڈنگوں میں بھی عام طور سے مسلم یونیورسٹی ہاسٹل کی تمام روایات پر عمل ہوتا رہتا تھا کسی کی چارپائی اُلٹ دینا۔ کسی کی چارپائی کھیت میں رکھ آنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ پارٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ نئے آنے والے طلباء پر اچانک حملہ ہوتا تھا اور خوف بے وقوف بنائے جاتے تھے۔ زبان کے معاملہ میں بہاریوں کی کافی کھچائی ہوتی رہتی تھی۔

ہم لوگ رحمٰن منزل میں رہتے تھے جنوب جانب تمام کمروں میں مانیٹر رہتے تھے۔ اور ان کمروں کے سامنے پانچ چھ قدم کے فاصلہ پر پاخانے تھے جن میں ان دونوں بورڈنگوں کے سولڑکے جاتے رہتے تھے۔ پاخانے کی بدبو سے ہر وقت طبیعت مکدر رہتی تھی۔ حافظ صاحب سے روز اس کی شکایت کرتے رہتے تھے۔

آخر نئے پاخانوں کی تعمیر شروع ہوگئی۔ لیکن کام بہت آہستہ آہستہ ہورہا تھا۔ کرایہ کے مکانوں کے کام اسی طرح ہوا کرتے تھے۔ قدمچے توبن گئے تھے۔ دیواریں بھی اتنی ہوگئی تھیں کہ آدمی بیٹھ جائے تو نظر نہ آئے۔ لیکن پلاسٹر نہیں ہورہا تھا اس لیے افتتاح بھی نہیں ہورہا تھا۔

ایک دن خوب بارش ہوئی اور جو بھی پاخانے گیا، خوب بھیگا۔ اس لیے کہ

ان پرانے پاخانوں کا بوسیدہ پھوس کا چھپر بارش کے بعد بھی ٹپکتا رہا۔ محمود صاحب نے ہم سب مانیٹروں سے تذکرہ کیا۔ طے ہوا کہ اس کو گرا دیا جائے اور پاخانوں کو توڑ کر ہموار کر دیا جائے۔ گیارہ بجے رات کو جب تمام طلباء سو گئے اور حافظ صاحب کا چکر (راؤنڈ) بھی ختم ہو گیا تو تمام مانیٹر چھپر والی کے ڈنڈے لے کر نکل آئے اور دیواروں کی اینٹیں گرانا شروع کر دیں جو مٹی کے گارے سے چُنی ہوئی تھیں۔

اس کارروائی کے دوران معلوم ہوا کہ ایک پاخانے میں سمیع الدین احمد صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ نعمت اللہ انصاری اور مسعود احمد انصاری نے منع کرنے کے باوجود اسی پاخانے کو گرانا شروع کر دیا۔ ارشد بھی ساتھ ہو لیے۔ اس زیادتی نے راز فاش کر دیا۔ سمیع نے حافظ صاحب کو تمام لڑکوں کے نام بتلا دیے جو پاخانے گرانے میں شریک تھے۔ خیر ایک بجے تک تمام پاخانے بالکل گرا دیے گئے۔ صرف ملبہ رہ گیا اور اس ملبہ پر ایک چھپر والی کے ڈنڈے کے ساتھ یہ شعر لٹکا دیا گیا۔

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کاں آباداں کنند
می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

یعنی ہر پرانے گھر کو جب (نئے سرے سے) آباد کرتے ہیں تو پہلے اس کی بنیاد کو ختم کر دیتے ہیں۔

دوسرے دن صبح کا منظر بھی دلچسپ رہا۔ تمام طلباء لوٹا لیے لیے اِدھر اُدھر کھیتوں میں بیٹھے نظر آئے۔

دوسرے دن حافظ صاحب آئے اور ہم لوگوں پر بہت خفا ہوئے۔ بہت ڈانٹا۔ ہم سب کو بورڈنگ سے نکال دیا گیا۔ اور محمد علی ہال کے ساتھ ملے ہوئے ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں ہم لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ڈائننگ ہال، نماز کا کمرہ، پاخانہ سب ہی چیزیں یہاں موجود تھیں۔ پہلے کی طرح دور سے نہیں آنا پڑتا تھا۔ ہاں بورڈنگ کے تمام طلباء سے علیحدہ کر دیے گئے تھے۔

اُن سے ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ انیٹری سے بھی علیحدہ کر دیے گئے تھے۔
لیکن دوسرے دن نئے پاخانوں پر پلاسٹر ہو گیا اور وہ استعمال ہونے لگے ایک ہفتہ بعد ہمارا قصور بھی معاف کر دیا گیا گیا اور ہم پھر بورڈنگ میں آ گئے۔

۲

دوسرے سال اگست میں پوری جامعہ کے طلباء کا ہردوا گنج میں پکنک منانے کا پروگرام بنا۔ ہردوا گنج علی گڈھ سے دو یا تین اسٹیشن دور علی گڈھ بریلی لائن پر ہے۔ یہاں گنگا سے نہر نکالی گئی ہے۔ نہر کے کنارے کنارے دور تک آموں کے باغ ہیں۔ تمام طلباء اور اساتذہ ریل سے ہردوا گنج پہنچ گئے اور تمام سامان رفتہ رفتہ پلیٹ فارم سے گنگا کے کنارے آم کے ایک باغ میں منتقل ہونے لگا۔

مولانا سعد انصاری جو اس وقت کالج کے طالب علم تھے اسٹیشن کے پاخانے میں رفع حاجت کے لیے گئے۔ لوٹا پاخانے کی دیوار پر رکھ کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ کسی نے لوگوں کی نظر بچا کر لوٹا وہاں سے غائب کر دیا۔ اب ان بیچاروں پر جو عالم بے بسی اور بے کسی کا طاری ہوا وہ ان کی چیخ پکار سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ادھر ہم سب کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ بہرحال بہت دیر کے بعد اُن کو اس مصیبت سے نجات ملی۔ کسی نے دوسرا لوٹا پانی سے بھر کر دیوار پر رکھ دیا۔

جب تمام طلباء اور اساتذہ باغ میں منتقل ہو گئے تو گنگا میں نہانے کا پروگرام بنا۔ طلباء اور اساتذہ نے کنارے پر نہانا شروع کیا۔ اچانک چار چھوٹے چھوٹے لڑکے گنگا کے بہاؤ پر بہہ گئے گو وہ تیرنا جانتے تھے لیکن پانی کا تیز ریلا سب کو پل کے نیچے لیے جا رہا تھا جہاں پہونچ کر تاریکی اور پل کے اندر کم گنجائش کی وجہ سے وہ سب یقیناً ڈوب جاتے۔ محمد ابراہیم صاحب مدراسی تیرتے ہوئے ان بچوں کے پاس پہونچے

پر واپس نہ آسکے۔ اور پُل کے نیچے بچّوں
کے ساتھ جانے لگے۔ میں اوپر کی منزل
سے گنگا کے بہاؤ پر کودنے کے لیے تیار
تھا کہ حافظ فیاض احمد صاحب نے چیخ کر
کہا "احمد علی ان بچّوں کو بچاؤ۔" میں فوراً
نیچے کی منزل پر آیا اور پانی میں کود پڑا۔
ایک لڑکے نے میری پیٹھ پکڑلی۔ اس کی
پیٹھ دوسرے لڑکے نے۔ اسی طرح
باقی دونوں لڑکوں اور ابراہیم صاحب
نے ایک دوسرے کی پیٹھ پکڑلی۔ اس
حالت میں صرف ہاتھ سے تیر سکتا تھا۔
پانی پر پیر نہیں مار سکتا تھا۔ میں نے دیوار
کا رُخ کیا۔ اور جلد ہی پانی کے تیز دھارے
سے نکل آیا جو سب کو پُل کے نیچے
لیے جارہا تھا۔

اکبر علی صاحب نے کئی پگڑیاں
جوڑکر اوپر سے لٹکا رکھی تھیں۔ تھوڑی
دیر میں پگڑی کا سرا میرے ہاتھ میں
آگیا اور تمام لوگ بہ حفاظت کنارے پر
آگئے۔ اس حادثہ کے بعد لوگوں پر پھر
پکنک کا اثر غالب آگیا۔ آموں کا پروگرام
ہوا۔ پھر کبڈی ہوئی اور ایک دوسرے پر
گٹھلیاں اور چھلکے پھینکے گئے اور ان پروگراموں
میں اس حادثہ کو لوگ بھول گئے۔ حافظ
صاحب کہا کرتے تھے کہ تمہاری یہ
کارگزاری جامعہ میں ملازمت کا سبب
بن گئی۔

۳

ہمارے استادوں میں ایک
عبدالکریم فاروقی تھے۔ وہ ہمارے
ہیڈ ماسٹر بھی تھے اور دسویں کو انگریزی
بھی پڑھاتے تھے۔ "اُلّو کا چچہ" اُن کا
تکیہ کلام تھا۔ اس قسم کی انوکھی ترکیبیں وہ
اکثر ایجاد کرتے تھے اور معمّر ہونے کی
وجہ سے بلا جھجک استعمال کرتے تھے
وہ گالی تو نہیں دیتے تھے لیکن جب
اُنھیں غصہ آتا تھا تو کہتے تھے " اے
اُلّو کے چچے تیری کیا سمجھ میں آئے گا۔"

اب ہم لوگ رحمٰن منزل سے
منتقل ہوکر نئی بارک میں آگئے تھے
اس بارک سے متصل علی گڈھ کے انگریز

سول سرجن کی کوٹھی تھی اور اُن کے مُرغے اور مرغیاں اس پارک میں بھی چگنے آجاتے تھے۔

ایک دن منظور حسین بہاری نے ایک مُرغ پکڑا۔ سمیع الدین نے ذبح کیا اور پکایا۔ عبدالکریم فاروقی صاحب سے محمود صاحب نے کہا کہ آج آپ کی دعوت ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور ڈائننگ ہال کے پھیکے سالن کے مقابلہ میں مزیدار مُرغ کا سالن بڑی رغبت سے کھایا۔

دوسرے دن سول سرجن نے خواجہ عبدالمجید صاحب کو، جو اُس وقت جامعہ کے شیخ الجامعہ تھے، مُرغ کی چوری کے بارے میں لکھا۔ خواجہ صاحب نے اس کی تحقیق کے لیے ہیڈ ماسٹر عبدالکریم فاروقی صاحب کو لکھا۔ اب جو فاروقی صاحب کو اس اسکیم کا علم ہوا تو اپنے مخصوص جملوں سے محمود صاحب اور سمیع الدین صاحب کی خوب تواضع کی۔ ادھر ہم طلباء کا، جن کو اس اسکیم کا بعد میں علم ہوا، ہنستے ہنستے پیٹ پھول گیا۔ مُرغ کی قیمت ساڑھے چار روپے ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے پاس سے بھجوائی۔

۴

محمود حسین خاں، ڈاکٹر انور اور محمد فاروق ثانوی پنجم میں تھے جو اس وقت ایف۔ اے فائنل کے برابر تھا۔ بہار کے ولی الحق اور اُن کے ساتھی عبدالمتین ثانوی سوم میں تھے جو میٹرک کے برابر تھا ولی الحق شاعر بھی تھے اور بات چیت میں تیزی اور طرّاری بھی بہت تھی۔ ان میں لیڈری کے جراثیم اسی وقت سے نظر آرہے تھے۔ ان کی جا و بے جا شیخی سے پورا بورڈنگ نالاں تھا۔

انھیں مہذب طریقہ پر سزا دینے کے لیے قوّالی کا پروگرام بنایا گیا۔ ایک کمرے میں چارپائی اُلٹ کر اور اُس پر کئی لحاف وغیرہ جمع کر کے ایک قبر بنائی گئی قوّالی گانے پر میں اور منظور حسین مقرر کیے گئے۔ محمود اور سمیع الدین قوّالی کی دھن پر

حال اور قوال کے لیے چنے گئے. اور باقی لڑکے تالیاں بجانے اور قوالی کے مصرعوں کو دہرانے کے لیے مقرر ہوئے اگربتی اور لوبان جلاکر مصنوعی قبر کے پاس رکھ دیا گیا. تمام لوگوں کو عطر لگایا گیا.

ادھر قوالی شروع ہوئی اور اُدھر محمود حسین اور سمیع الدین کو حال آنا شروع ہوا. حال کی کیفیت جھومنے اور ہاتھوں کی گردش سے بڑھتے بڑھتے کھڑے ہو ہو جانے کی طرف رجوع ہوئی. جیسے جیسے قوالی اپنے عروج پر آنے لگی. جھومنا' ہاتھوں کا گردش کرنا' اور کھڑے ہو جانا' جلدی جلدی ہونے لگا ادھر دوسرے سامعین بھی مبتلائے حال ہوگئے. اس کے بعد پھر تڑاتڑ' دھما دھم کی آوازیں قال اور حال پر غالب آگئیں اور ولی الحق کی اتنی پٹائی ہوئی کہ اُسے جان بچانا مشکل ہوگیا. وہ غالباً اس قدر سنجیدہ حملہ کے لیے تیار نہ تھے بے تحاشا جان بچاکر بھاگے. ادھر ہمارے محمود صاحب پر غشی طاری ہوئی اور وہ بے ہوش ہوگئے. انھیں کرسی پر ڈال دیا گیا. بہرحال ساری اداکاری اس طرح انجام پائی کہ سارا بورڈنگ یہی سمجھتا رہا کہ محمود صاحب کو زبردست حال آگیا تھا.

بورڈنگ کی زندگی' خاص کر کالج اسٹیج میں' اکٹیویٹی کے لیے بے چین ہوتی ہے. یہ ایک متحرک زندگی ہوتی ہے. اس میں جمود نہیں ہوتا. ایسے میں تو کوئی ہمدرد اور صحیح راہنما جائے اور ایسی بے چین طبیعتوں کو صحیح راستہ پر ڈال دے تو یہ بڑا کام ہے. طلباء کی اسکیموں کا رُخ صحیح سمتوں میں موڑا جاسکتا ہے ورنہ یونی ورسٹی کے اندر اور باہر اس قسم کے مظاہرے ہوتے رہیں گے جیسے آج کل ہمارے دیس میں ہو رہے ہیں.

۵

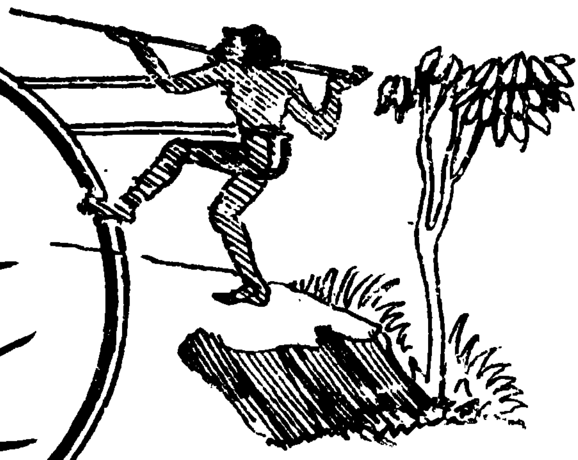
جامعہ کے تین طالب علم مسلم یونیورسٹی سے پرائیوٹ امتحان دینے کے لیے میٹرک کے کورس کی تیاری کر رہے تھے اور جامعہ سے پورا اسکالرشپ بھی لے رہے تھے. اس تیاری کی وجہ سے کلاس کا کوئی کام نہیں کرتے تھے. بورڈنگ

کے بیشتر طلبا ان کے خلاف تھے۔ یہ
سب ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔
...ے میں اس امتحان کی تیاری کو
...ی کامیابی سے چھپا رہے تھے لیکن
...ورڈنگ میں اس کی مخالفت دن بہ دن
...بڑھتی جا رہی تھی۔ کئی چھوٹی چھوٹی جھڑپیں
...بھی ہو چکی تھیں۔ ہمارے اتالیق محمد ابراہیم
مدراسی تھے (بس برائے نام اتالیق تھے)۔
ایک دن صبح کی نماز کے لیے طلباء
اُٹھے تو ولی الحق وغیرہ کے کمرے کے
سامنے برآمدے میں تاگے سے
بندھے ہوئے رنگ برنگ کے
کپڑے جن کے کنارے جلے ہوئے
تھے لٹکے ہوئے نظر آئے۔ اُدھر
کمرے میں امتحان دینے والے ایک
لڑکے نے رونا شروع کر دیا کہ میری
چار شیروانیاں غائب ہیں۔ شاید انھیں جلایا
اور ان کی کترنیں یہاں لٹکا دی گئی ہیں اب بورڈ
کے طلباء کی توجہ ان لڑکوں کے امتحان وغیرہ
کی طرف سے ہٹ کر ان کے کپڑوں کے
جلائے جانے کی طرف ہو گئی۔ ایک ہفتہ
کے بعد پھر چار پانچ کترنیں صبح صبح ان لوگوں
کے کمرے کے سامنے لٹکی ہوئی نظر آنے
لگیں۔ اس مرتبہ اسی گروہ کے ایک اور صاحب
واویلا کرتے نظر آئے کہ میری شیروانیاں
جلا دی گئیں۔ ایسا دو تین دفعہ ہوا۔ اس کے
بعد بورڈنگ کے سارے طلباء کی ہمدردی
ان طلباء کے ساتھ ہو گئی۔ مخالفت نے اور
بھی سنگین صورت اختیار کر لی۔ اس حالت
میں کوئی بھی ان کے امتحان وغیرہ کی تیاری
کا تذکرہ نہیں کرتا تھا۔ پھر بھی کچھ لوگ
اس واقعہ کی تہہ تک پہونچنے کی کوشش
میں لگے رہے۔ ان لوگوں نے ایک
دن موقع پا کر ان لڑکوں کا بکس کھول ڈالا۔
دیکھا تو بکس میں طرح طرح کے کپڑوں کی
کترنیں جمع ہیں۔ ایک آدھ ٹکڑے کا
کنارا بھی جلا ہوا تھا۔ تحقیقات کے لیے
کترنیں لے کر شہر گئے اور پتہ لگا یا کہ یہ
کسی درزی کی دکان سے لائی گئی ہیں۔ اور
کون لایا ہے۔ پتہ چلا کہ دو لڑکے آتے
تھے اور کترنیں لے جاتے تھے کہ
لالٹین صاف کریں گے۔ ان میں سے

(باقی صفحہ ۶ پر)

جناب خالد عرفان

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ



دیکھیے، ہمارے زمانے میں دنیا نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ ہم آپ ہوا میں اڑ سکتے ہیں، ریڈیو کے ذریعے ہزاروں میل دور کی آوازیں سن سکتے ہیں، ریڈیو کے ذریعے ہزاروں میل کی دوری پر تصویریں بھیج سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، دنیا کے اس کرّے کو، اس کے ہوا کے حلقے کو پھلانگ کر چاند تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے اسپتنک آدمیوں کو بٹھا کر زمین سے سینکڑوں میل اوپر دنیا کے چکر پر چکر لگا رہے ہیں۔

مگر یہ ساری ترقی پلک جھپکتے میں تو نہیں ہو گئی! ہزاروں لاکھوں سال کے بعد ہم ترقی کی اس منزل پر پہنچے ہیں۔ شروع شروع میں تو ترقی کی طرف ہمارا قدم دھیرے دھیرے، بہت ہی دھیرے بڑھ رہا تھا۔

کہتے ہیں اب سے لاکھوں برس پہلے انسان جانوروں سے زیادہ قریب تھا۔ نہ رہنے کو گھر نہ کھانے کو اناج، نہ پہننے کو کپڑا۔ پر ایک نعمت خدا نے اسے شروع سے دے رکھی تھی۔ بھلا بتائیے تو کیا؟ — عقل اور سمجھ بوجھ —— اسی کی بدولت وہ برابر آگے کی طرف قدم بڑھاتا رہا۔

انسان کی تاریخ یا اس کی ترقی کی تاریخ کا

کھوج لگانے والے زیادہ سے زیادہ بارہ ہزار برس پہلے تک کا کھوج لگا سکے ہیں۔ ان کے خیال میں انسان اب سے بارہ ہزار سال پہلے پتھر کے اوزار بنانے لگا تھا۔ پھر یہ کام وہ ہڈیوں سے لینے لگا۔ پھر اسے تانبے کی دھات کا پتہ چلا تو وہ تانبے سے اپنا اوزار بنانے لگا۔ پھر اس کے بعد اسے دوسری مختلف دھاتوں کا اور سب سے آخر میں یعنی اب سے ایک ہزار برس پہلے لوہے کا پتہ چلا۔ اب سے ایک ہزار سال پہلے کے انسان نے بہت ترقی کر لی تھی۔ وہ ڈھنگ سے رہنے سہنے لگا تھا، گاؤں، محلے اور شہر آباد ہو رہے تھے۔ پہیے کا استعمال بھی اسے معلوم ہو گیا تھا۔

شاید تمھارے دل میں سوال پیدا ہو کہ آخر ان کھوج لگانے والوں نے ان سب باتوں کا کھوج کیسے لگایا۔ تو بھئی سب سے پہلے تو وہ ٹوٹے پھوٹے کھنڈر ہیں جنھیں آثار قدیمہ کہتے ہیں مختلف اوزار، زیور اور برتن وغیرہ یا جو مٹی کے ٹیلوں کو کھود کر نکالے گئے ہیں۔

مگر نہیں ایک ذریعہ اور بھی ہے۔ ہماری آپ کی طرح جیتا جاگتا! آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا۔ کہ دنیا میں آج بھی ایسے علاقے ہیں جہاں اب بھی انسان اسی طرح رہتا سہتا ہے جس طرح اب سے ہزاروں سال پہلے رہتا بستا تھا۔

ایسے وحشی یا نیم تہذیب یافتہ قبیلے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دور کیوں جائیے ہمارے اپنے ہاں آسام کے ناگا قبیلوں اور مدھیہ پردیش کے آدی باسی قبیلے کے لوگوں کو دیکھیے۔ اگر ہماری زندگی کی کوئی چھاپ ان پر نہ پڑے تو وہ صدیوں تک اسی پرانے ڈھنگ پر زندگی گزارتے رہیں۔ اس طرح کے لوگ اسٹریلیا، جنوبی افریقہ، ایشیا، یورپ اور امریکہ کے بعض علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان کی تہذیب پتھر کے زمانے کی تہذیب سے ملتی جلتی ہے۔ یہ لوگ شکار پر گزارا کرتے ہیں۔ نہیں تو جنگلی پھل اور ترکاریاں تلاش کر کے کھا لیتے ہیں۔

کوے دادا کی کہانی تو آپ نے پڑھی ہے اس سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ان لوگوں کی زندگی دراصل شکار میں مہارت اور غذا حاصل کرنے کے طریقوں کو اپنانے میں صرف ہوتی ہے۔ ان کے لیے غذا خریدنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اپنی غذا خود حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کی تمام ضرورتیں صرف غذا اور اس کو حاصل

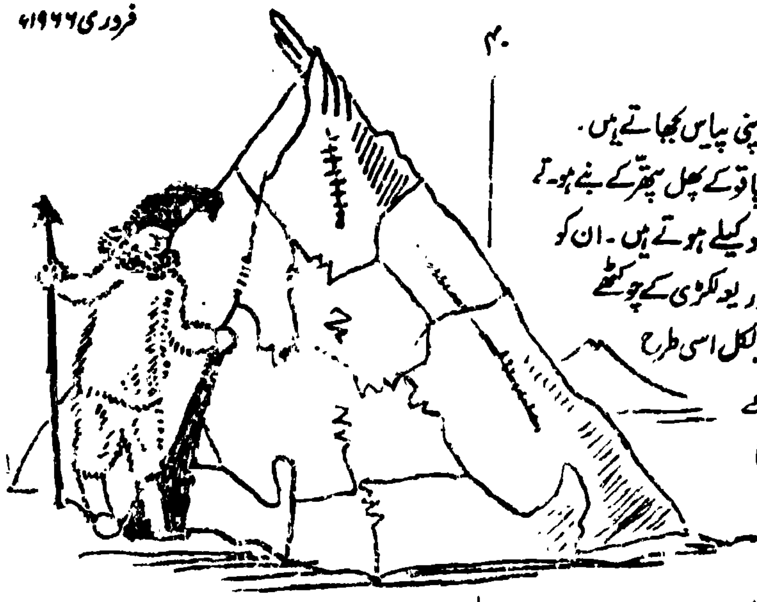
کرنے کے اوزاروں تک محدود ہوتی ہیں۔ اور وہ جس علاقے میں رہتے ہیں وہیں سے پوری ہو جاتی ہیں۔

شکار کی قسم کا تعلق بھی علاقے سے ہوتا ہے۔ مثلاً ملایا کے جنگلوں میں بسنے والے سیمانگ قبیلے کے لوگوں کو پرندے، گلہریاں اور کبھی کبھار جنگلی سور جیسے بڑے بڑے جانوروں کا شکار کرنا پڑتا ہے۔ اس علاقے میں نباتاتی غذا کی افراط ہے لیکن افریقہ کے جنگلوں میں غذا حاصل کرنے کے لیے ہرن اور دوسرے بڑے جانوروں کا شکار کرنا پڑتا ہے۔ صحرائے کالاہاری اور دوسرے بنجر علاقوں میں کہیں کہیں اکّا دکّا پودے نظر آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کی زندگی خانہ بدوشی کی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ کچھ عرصہ بعد وہاں جانوروں کا چارہ اور زندگی کا دوسرا سامان ختم ہو جاتا ہے تو بیچارے اپنے خیمے اکھاڑ غذا کی تلاش میں پھر سرگرم سفر ہو جاتے ہیں۔

یہ لوگ عموماً قبیلوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ شکار کے لیے ہر قبیلے کا ایک خاص علاقہ ہوتا ہے۔ عمر رسیدہ اور تجربہ کار بہادر آدمی کو سردار چنا جاتا ہے۔ اس چناؤ کے طریقے کا اندازہ آپ کو "انوکھا چناؤ" پڑھ کر ہو گیا ہوگا۔

یہ لوگ اکثر نیزہ یا نوکیلے بانس پھینک کر شکار کرتے ہیں۔ ان کے پاس تیر کمان نہیں ہوتے۔ ان کا ایک اور ہتھیار ہوتا ہے بڑا عجیب، بڑا انوکھا۔ ہوتا تو چھوٹا ہے لیکن کچھ اس طرح مڑا ہوتا ہے کہ جب بھی نشانہ پر نہ لگے تو پھینکنے والے کی طرف ہی لوٹ کر آجائے۔ ان لوگوں کو نیزہ پھینکنے میں کافی مہارت ہوتی ہے۔ بہت دور تک ٹھیک نشانہ پر نیزہ پھینک سکتے ہیں۔ ہتھیاروں کے سروں پر پتھر یا نوکیلی لکڑیاں لگی ہوتی ہیں۔ افریقہ اور ملایا کے قبائیلی ان کی نوک کو زہر میں بجھا لیتے ہیں تاکہ شکار جلد ختم ہو اور وہ آسانی سے غذا حاصل کرلیں۔ ایک آدھ قبیلے میں تیر کمان کا رواج بھی ہے۔

قبائیلی خاندانوں میں شکار عموماً مرد کرتے ہیں۔ عورتیں نباتاتی غذا اکٹھا کرتی ہیں۔ غذا قدرتی ریشے، چھال یا بالوں کی بنی ہوئی تھیلیوں میں لائی جاتی ہے۔ چھالوں کو باہم باندھ کر بھی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں بنالی جاتی ہیں۔ ان کے اوزاروں میں ایک نوکیلی لکڑی بڑی اہم ہوتی ہے جو تین فٹ لمبی ہوتی ہے اور جس سے اس کی جڑیں کھودی جاتی ہیں یا پانی کی کمی ہو تو یہ جڑیں بہت کام آتی ہیں



لوگ ان ہی کو چوس کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔
کلہاڑی اور چاقو کے پھل پتھر کے بنے ہوتے ہیں۔ یہ بڑے تیز اور نوکیلے ہوتے ہیں۔ ان کو گاڑھے مادے کے ذریعہ لکڑی کے چوکھٹے میں جوڑ لیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح قدیم پتھر کے زمانے میں جوڑا جاتا تھا۔ ان کے ہاں کپڑے کا رواج نہیں۔ تن ڈھانکنے کے لیے جو چیز وہ استعمال کرتے ہیں یا تو درختوں کے ریشوں اور چھالوں کا یا جانوروں کی کھال کا بنا ہوتا ہے۔ ان ہی چیزوں کو پناہ گاہوں کی تعمیر میں بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ افریقہ کے قبائیلی زمین میں دو چار تنوں کو گاڑ کر ان پر پتے یا کھالیں ڈال دیتے ہیں اور ان کی عارضی پناہ گاہ تیار ہو جاتی ہے۔

صحرا یا جنگل میں بسنے والے ان قبائیلی لوگوں کے لیے پانی حاصل کرنا بہت کٹھن مسئلہ ہوتا ہے۔ گھر بار کے سامان کے ساتھ انھیں پانی بھی اپنے کندھوں پر لیے لیے پھرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے وہ شتر مرغ کے انڈے نما خول استعمال کرتے ہیں یا موٹے تنے کو اندر سے کھوکھلا بنا لیتے ہیں۔

ایک بات سن کر تو آپ حیران رہ جائیں گے۔ آگ جس کو آپ اتنی آسانی سے دیاسلائی کی تیلی رگڑ کر حاصل کر لیتے ہیں، ہزار دو ہزار نہیں اب سے کوئی پانچ لاکھ سال پہلے سے استعمال ہوتی آئی ہے۔ ہے نا تعجب کی بات! قبائیلی آگ کی بڑی قدر کرتے ہیں، وہ اس کو لکڑی کے برتنوں میں ساتھ لے جاتے ہیں۔ اگر کبھی یہ بجھ جائے تو دو سوکھی لکڑیوں کو باہم اتنا رگڑتے ہیں کہ د

گرم ہو کر جل اٹھیں۔ اسی طریقے سے صدیوں پہلے آگ سلگائی جاتی تھی۔

ان نیم تہذیب یافتہ لوگوں میں جو پتھر کے زمانے کے درمیانی دور کی تہذیب کے آج علم بردار کہے جا سکتے ہیں، ٹنڈرا کے علاقوں میں بسنے والے اسکیمو اور شمال مشرقی ساحلی امریکہ میں رہنے والے انڈین مشہور ہیں (اسکیمو شمالی کناڈا اور گرین لینڈ میں بھی رہتے ہیں) ان کی زندگی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ان کا گزارا محض شکار پر ہوتا ہے۔ سردیوں میں سیل مچھلی اور دوسری مچھلیوں کا شکار کر لیتے ہیں اور گرما کی مختصر مدت میں رینڈیر کا۔ اس کے علاوہ گرمی کے دنوں میں کہیں کہیں اگنے والی نباتاتی غذا بھی جمع کر لیتے ہیں۔ وہ جن جانوروں کا شکار کرتے ہیں ان کی کوئی چیز ضائع نہیں ہونے دیتے۔ جانوروں کے چمڑوں کو ان ہی کی آنتوں سے سی کر جسم پر لپٹے رہنے والے تنگ اور چست لباس تیار کر لیتے ہیں

ان سرد علاقوں میں سوئی سب سے ضروری آلہ ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو نہ گرم کپڑے سل سکیں نہ یہ لوگ زندہ رہ سکیں۔ اسکیمو کی سوئیاں ہڈی کی بنی ہوتی ہیں۔ ہڈیاں صرف اسی کام نہیں آتیں۔ ان علاقوں میں لکڑی بالکل نہیں ملتی۔ ملتی ہے تو شاذ و نادر۔ اسی لیے لکڑیوں کی جگہ ہڈیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ تیر کمان بنیں گے تو ہڈی کے، چاقو، کلہاڑی اور دیگر اوزار بنیں گے تو اسی کے یہاں تک کہ کشتیاں بھی ہڈی سے بنائی جاتی ہیں۔

ان علاقوں میں بعض اوقات تانبا نکل آتا ہے۔ اس سے چمڑا صاف کرنے یا گوشت کاٹنے کے اوزار بنا لیے جاتے ہیں۔ ویسے قلعی دھات حاصل کرنے کا طریقہ وہ نہیں جانتے۔ ہاں اتنا ہے کہ وہ شکاریوں اور خانہ بدوشوں کی جماعتیں بنا کر رہتے ہیں، اس طرح ان میں سماجی شعور ہوتا ہے۔ ان کے لباس، خیمے اور کشتیوں کے اوپری خول چمڑے کے بنے ہوتے ہیں۔

ان سرد علاقوں میں بسنے والوں کے برخلاف ساحلی علاقے میں رہنے والے قبائیلی خانہ بدوش نہیں ہوتے۔ ان کی غذا بھی مچھلی ہوتی ہے اور حصول معاش کا ذریعہ بھی۔ اسی لیے ساحل سمندر سے لگ کر ان کے چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد ہوتے ہیں۔ یہ لکڑی کے مکان بناتے ہیں۔ اور ان کا سماجی شعور زیادہ قوی ہوتا ہے۔ ہاں البتہ انھیں کاشتکاری

سے کچھ یوں ہی سا تعلق ہوتا ہے اور وہ نباتاتی غذا کے لیے قدرتی پیداوار پر تکیہ کرتے ہیں۔

ہاں سائبیریا کے علاقے میں رہنے والے خانہ بدوش اپنے رینڈیر اور گھوڑوں کو لے کر نئی نئی چراگاہوں کی تلاش ہی نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اور کسی تالاب یا ندی کے کنارے کی شاداب اور زرخیز زمین میں ہل چلا کر اناج بھی اگا لیتے ہیں۔ گائے پالتے ہیں اور اس کا دودھ دوہتے ہیں۔ ان کی رہائش کی مدت موسم کی تبدیلی پر منحصر ہوتی ہے۔ افریقی کاشتکاروں کو لوہا پگھلانا بھی آتا ہے لیکن ان کے طریقے اتنے قدیم ابتدائی اور بھونڈے ہوتے ہیں کہ بس انھیں لوہے کے زمانے میں رہنے والا کہا جا سکتا ہے۔

ان وحشی قبیلوں کے رہن سہن، رسموں اور عقیدوں کا اگر آپ تاریخ سے پہلے کے قدیم زمانے کے رہن سہن اور رسم و رواج سے مقابلہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ انسان نے شکاری کی حیثیت سے ترقی کرتے کرتے آج کی جماعتی زندگی کی بنیاد ڈالی ہے۔ جیسے جیسے کھیتی کے طریقے سدھرتے گئے اور کم وقت میں زیادہ غذا حاصل کی جانے لگی وہ دوسرے مشغلوں کی طرف توجہ دینے لگے۔ ان ہی دنوں میں انھوں نے مٹی کے برتن بنائے، لکڑی کا سامان تیار کیا۔ کپڑا بننا شروع کیا۔ تجارت کی بنیاد ڈالی اور آج تجارت صنعت و حرفت اور سائنس کی ترقی پر ہی دنیا کی ترقی کا انحصار ہے۔





جناب اخلاق سہسوانی

گڑیا کی شادی

بتائیں تمھیں ہم یہ ہے دھوم کیسی؟
ہے آج اپنی نسرین کی گڑیا کی شادی

بڑے ٹھاٹ سے ہو رہی ہے یہ شادی
زباں پر یہی بات ہے ہر کسی کی!

گھر آئی ہے آج اس کے ہر اک سہیلی
قریشہ ہے، نجمہ ہے اور لاجونتی

صبیحہ بھی، میری بھی، اور رکمنی بھی
انیسہ بھی، بشریٰ بھی اور شانتی بھی

جسے دیکھیے ہے وہ مسرور شاداں
فراہم ہے ہر اک مسرت کا ساماں

یکا یک یہ بچوں نے اُودھم مچائی
وہ بارات آئی، وہ بارات آئی

عجب شان سے سلمہ پروین کا گڈا
وہ آتا ہے نسرین کی گڑیا کا دولہا

ورانڈے میں سارے براتی ہیں بیٹھے — لو کھانا بھی لے آئے محمود و رادھے
کوئی حوصلا دیکھے نسرین بی کا — دیا ہے بڑا ہی مزیدار کھانا
یہ بریانی و شیرمال اور قلیہ — یہ فیرینی، یہ کوفتے اور زردہ
پلنگ اور کیک اور مرغ مسلّم — کہاں تک گنائیں تمھیں دوستو ہم!
ہوئی جب ہر اک رسم شادی کی پوری — تو تیاری ہونے لگی رخصتی کی
جہیز آداب صحن میں رکھ لیا ہے — چلو چل کے دیکھیں کہ کیا کیا دیا ہے
ضرورت کی ہر چیز ہے اور ستھری — یہ صوفہ، یہ ٹیبل، یہ کرسی مسہری
یہ ٹی سیٹ ہے اور یہ پیالے، یہ پرچیں — یہ ڈونگے، پلیٹیں، یہ جگ اور رکابیں
یہ ساری، بلاؤز، یہ شلوار، جمپر — یہ قالین، تکیہ، یہ چادر، یہ بستر
حقیقت یہ ہے اُس نے جو بھی دیا ہے — خدا رکھے دل کھول کر ہی دیا ہے
چلی جب کہ سسرال نسریں کی گڑیا — ہر اک آنکھ پرنم، ہر اک دل میں غم تھا

ہیں سلمہ بہت آج مسرور و شاداں
خدا راس لائے خوشی کے یہ ساماں

جناب مشہود مفتی

چڑیا گھر



یہ دنیا بہت بڑا
چڑیا گھر ہے' بہت ہی بڑا۔
یہاں لاکھوں' کروڑوں قسم
کے پنچھی اور پکھیرو بستے ہیں
ان میں بہت سوں کے متعلق
انسان بہت کچھ جان گیا ہے۔ پر ابھی بہت
ایسے ہیں جن کے متعلق ہمیں آپ کو کچھ معلوم
نہیں یا بہت کم معلوم ہے۔

اور پھر اتنے بڑے چڑیا گھر کی سیر
کے لیے بہت بڑی عمر چاہیے۔ یقین کیجیے
آپ گھومتے گھومتے اور دیکھتے دیکھتے
بوڑھے ہو جائیں گے لیکن پورا چڑیا گھر
نہ دیکھ پائیں گے۔ اچھا آئیے آج اس
چڑیا گھر کے چند باسیوں سے تو آپ کو
ملوا ہی دیں۔

سب سے پہلے آپ
"ہیرنگ گل" سے ملیے۔

یہ بڑی بھولی چڑیا ہے۔ عام خیال
ہے کہ یہ اپنا گھونسلا نہیں بھول سکتی۔
لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ گل گھونسلا بھول سکتی



ہے. ہاں گھونسلے کی جگہ نہیں بھولتی. اگر آپ اس کا گھونسلا اس جگہ سے ایک دو فٹ آگے یا پیچھے سرکا دیں تو چڑیا گھونسلے والی جگہ پر جا کر بیٹھ جائے گی، چند فٹ کے فاصلہ پر رکھے ہوئے گھونسلے کو نہ پہچان سکے گی.

برف کے پنچھی

بحر منجمد شمالی کا شمار دنیا کے سرد ترین خطوں میں کیا جاتا ہے. یہاں تیز برفیلی ہوائیں سال کے بیشتر حصہ تک چلتی ہیں. یہ ہوائیں برف کے وسیع میدانوں میں ایک خاص قسم کی گھاس کے بیج بکھیرتی رہتی ہیں. سرد موسم گزرنے کے بعد ان بیجوں سے بہت چھوٹی گھاس اُگتی ہے یہی اس خطہ کی ننھی چڑیوں کی غذا ہوتی ہے. کہتے ہیں خدا نے ہر جانور کا رزق اُتارا ہے. یہ گھاس چڑیوں کی غذا ہوتی ہے اور یہ چڑیاں اس خطّے کے عقابوں کا نوالہ بنتی ہیں. یہ عقاب کافی بڑا پرندہ ہوتا ہے. یہ زمین پر اُترتے اُترتے اپنا پنجہ بڑھا کر ان چڑیوں کو دبوچ لیتا ہے. لیکن یہ چڑیاں بھی کم چالاک نہیں. جو پنجے میں پھنس گئیں تو پھنس گئیں





۔ تی عقاب کے جھپٹتے
۔ ن برف میں اس طرح
۔ مس جاتی ہیں جیسے
۔ وطہ خور چڑیا پانی میں ڈبکی
۔ گا جائے۔

کارمورینٹ

غوطہ خور چڑیا کے ذکر پر کارمورینٹ
۔ یاد آگئی۔

یہ چڑیا چین اور جاپان کے ساحل پر پائی جاتی ہے۔ بہت سے مچھیروں نے اس چڑیا کو اپنا روزی کمانے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ سمندر میں غوطہ لگا کر مچھلی نکال لینے کی ماہر ہوتی ہے مچھیرے چھوٹی مچھلی کے شکار کے لیے اس چڑیا کو کام میں لاتے ہیں۔ یہ بڑی پھرتی اور مستعدی سے دن بھر مچھلیاں





پکڑتی اور کشتی میں جمع کرتی رہتی ہے۔ شام کو اس کی شکار کی ہوئی مچھلیوں کا ایک حصہ اسے اس کی محنت کے صلہ میں دیا جاتا ہے۔ مچھیرے اس کی گردن میں ایک چھلّہ پنہا دیتے ہیں تاکہ یہ مچھلی نہ نگل سکے۔

ایل

اکثر اوقات کارمورینٹ ایک مخصوص مچھلی پکڑ لیتی ہے اس کو "ایل" Eel کہتے ہیں۔ یہ سانپ کے مانند لانبی ہوتی ہے۔ کارمورینٹ اسے نگلنا چاہتی ہے اور مچھلی سانپ کی طرح اس کی گردن جکڑ لیتی ہے۔ کارمورینٹ کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ گھبرا کر وہ مچھلی کو چھوڑ دیتی ہے یا پھر مچھلی اس کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

تیراک چڑیا

یہ جنوبی امریکہ کے جنگلوں میں ملتی ہے۔ عموماً چھوٹے موٹے دریاؤں کے کنارے درختوں پر اپنا گھونسلے بناتی ہے۔ اس کے بچے اُڑنے کے قابل نہیں ہوتے تو انھیں اپنی زندگی کے لیے بارہا پانی میں چھلانگ لگانی پڑتی ہے۔

اس کے بچے اپنے پنجوں سے بہ آسانی درخت پر چڑھ کر گھونسلے تک پہونچ جاتے ہیں۔ سانپ یا کوئی دوسرا خطرہ محسوس کرتے ہی یہ چڑیا سیٹی جیسی آواز میں چیخ مارتی ہے اور اس کے بچے فوراً پانی



میں چھلانگ لگا کر غائب ہو جاتے ہیں خطرہ ٹل جانے پر یہ اپنے سر پانی کی سطح سے باہر نکالتے ہیں پھر تیرتے ہوئے کنارے تک آکر دھیرے دھیرے پیڑ پر چڑھ جاتے ہیں۔

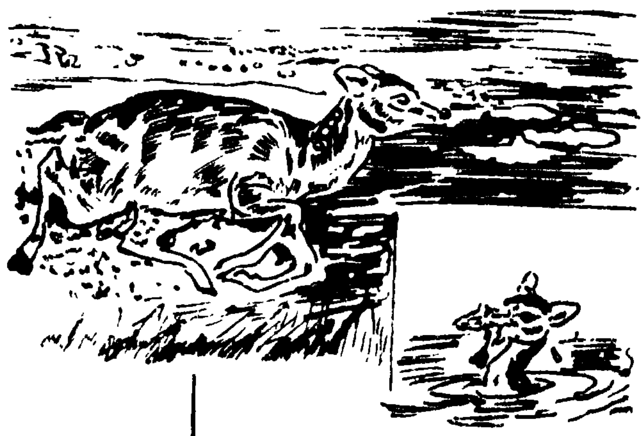


تیراک ہرن

افریقہ کا یہ جانور بالکل چھوٹے ہرن جیسا ہوتا ہے۔ یہ کل ایک فٹ اونچا ہوتا ہے۔ اس کا وزن پانچ چھ پونڈ سے زائد نہیں ہوتا۔ یہ خشکی اور



تری دونوں کا جانور ہے۔ خطرہ کی بو پاتے ہی پانی میں کود کر غائب ہو جاتا ہے۔

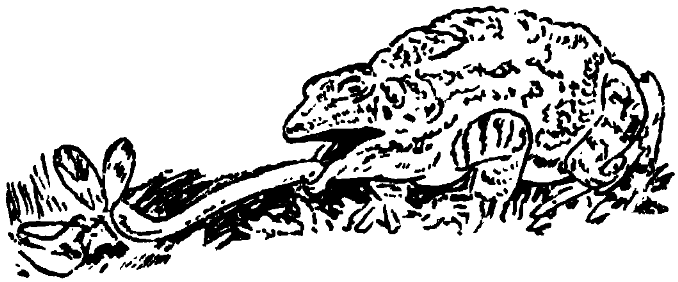


یہ ہرن بڑا مشاق قسم کا تیراک ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ مچھلیاں بڑے شوق سے کھاتا ہے۔

چیونٹی خور

آسٹریلیا کے اس جانور کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ اس کی زبان بہت لمبی ہوتی ہے۔ زبان کا تعلق اس کے سینہ کی ہڈی سے ہوتا ہے دور بیٹھے کیڑے مکوڑوں کو آسانی کے ساتھ زبان بڑھا کر ہضم کرجاتا ہے یہ انوکھے ڈھنگ سے شکار کرتا ہے۔

یہ اپنی زبان زمین پر بچھا دیتا ہے۔ زبان کو گوشت کا لوتھڑا سمجھ کر کیڑے مکوڑے اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں جب اچھی طرح سے اس کی زبان پر کیڑے مکوڑے چپک جاتے ہیں تو یہ اپنی زبان



کھینچ کر منہ کے اندر کرلیتا ہے اور بیک وقت سیکڑوں کا شکار کر لیتا ہے ۔

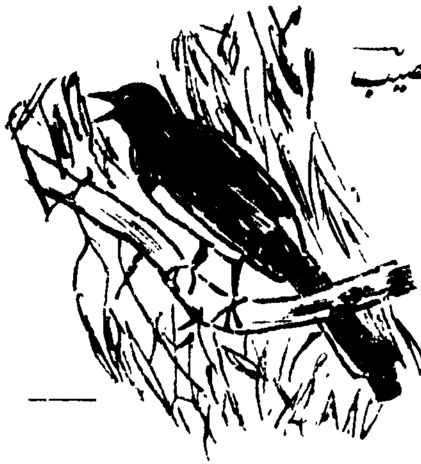




گائے اور بیلوں کو زبان سے ناک صاف کرتے آپ نے دیکھا ہے۔ ایک چوپایہ نیل گائے کے مانند ہوتا ہے۔ یہ اپنی لمبی زبان سے اپنے کان تک صاف کرڈالتا ہے۔ اچھا بتایئے اس کا کیا نام ہے اور کہاں پایا جاتا ہے ۔

اقبال نصیب

اُڑ چل



اے میرے خوش نُما کوّے مدرسے کی طرف اُڑ چل
وہاں ہم آج سب مِل جُل کے آزادی منائیں گے
مٹھائی، سیب، حلوے خوب خوش ہو ہو کے کھائیں گے
اُچھلتے کودتے علم و عمل کے گیت گائیں گے
تجھے بھی اپنے حصّے میں سے ہم برفی کھلائیں گے
ہمارے مدرسے کو اُڑ کے چل اے خوش نُما پنچھی

جدھر چاہے فضاؤں میں تو اونچا اڑتا رہتا ہے
ابھی ہم ننھے منّے مدرسے میں پڑھنے والے ہیں
ہمارے واسطے لیکن تو اک اُڑتا کھلونا ہے
ہمارے مدرسے کو اُڑ کے چل اے خوش نُما پنچھی

جواں ہو کر اُڑیں گے ہم بھی نیلے آسمانوں پر
بہادر بن کے چھا جائیں گے دشمن کے ٹھکانوں پر
وطن کے واسطے ہم شوق سے اسکول جاتے ہیں
تجھے ہم دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اُونچی اُڑانوں پر
ہمارے مدرسے کو اُڑ کے چل اے خوش نما پنچھی

دعائیں دیتے ہیں ماں باپ جب اسکول جاتے ہیں
بڑے ہی پیار سے وہ اپنے سینے سے لگاتے ہیں
مٹھائی پھل ہمیں روزانہ وہ دیتے ہیں کھانے کو
تجھے بھی ہم کھلائیں گے جو ہم روزانہ کھاتے ہیں
ہمارے مدرسے کو اُڑ کے چل اے خوش نما پنچھی







جناب اعجاز اختر، اندور

سائنس کیا ہے؟

جے ٹنڈال نے کہا ہے ۔

"ہمیں خدا نے خیالات کی دولت دی ہے۔ اور ہم اس کے ذریعے اس اندھیرے کو، (جو ہمارے خیالات کی دنیا کو گھیرے ہوئے ہے) روشنی میں بدل سکتے ہیں۔"

سائنس کا مقصد صرف یہ ہے کہ قدرت کی ان تمام چیزوں کو روشنی میں لائے جو ہم سے چھپی ہوئی ہیں۔ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں۔

سائنس کا علم ہمیں یہ بات بتاتا ہے کہ کوئی چیز کتنی گرم ہے یا کتنی ٹھنڈی ہے، اور کس حالت میں ہے۔

لفظ سائنس لاطینی لفظ "سیو (Scio) سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں "جاننا"۔ اس طرح ہم سائنس کو معلومات یا Knowledge کہہ سکتے ہیں جیسا اسپنسر (Spencer) نے کہا ہے۔

Science is Organised Knowledge

(سائنس ایک منظم اور مرتب معلومات ہے)

علم طبیعات' فزکس کے ذریعے ہمارا تعارف بجلی، روشنی اور مقناطیس وغیرہ کے بارے میں کراتا ہے تو علم کیمیا (chemistry) کے ذریعے ہمیں مادہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اسی طرح علم حیات یا زندگی کا علم (بالوجی) ہمیں جانوروں اور پودوں وغیرہ کے بارے میں اور علم نجوم یا اسٹرالوجی یعنی ستاروں کا علم ستاروں اور سیاروں کی حقیقت ظاہر کرتا ہے۔

اور یہ سبھی سائنس کی شاخیں ہیں۔

سائنس ہمیں انھیں باتوں سے آشنا

کراتا ہے مثلاً وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہیرا بھی کوئلے کی ایک قسم ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ نمک (جسے سائنس میں سوڈیم کلورائڈ کہتے ہیں) سوڈیم جیسی خطرناک دھات اور کلورین جیسی زہریلی گیس سے بنتا ہے اور یہ بھی کہ پانی، جو پتلا اور رقیق ہوتا ہے، دو گیسوں ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مل کر بنا ہے۔

علم نجوم نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ آیا زہرہ سیارے پر زندگی ممکن ہے؟ اور یہ بھی بتایا کہ مشتری کے گیارہ چاند ہیں جب کہ زمین کا صرف ایک چاند ہے۔

یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے۔

جب گلیلیو نے یہ بات ثابت کی تو اس دور کے لوگوں نے کہا ــ

"ناممکن! ناممکن! جس زمین پر ہم رہ رہے ہیں بھلا وہ گردش بھی کر سکتی ہے۔ اگر وہ گردش کرتی ہوتی تو سارے انسان خلا میں گر نہ پڑتے۔

مگر یہ حقیقت تھی اور بعد میں ساری دنیا نے اس حقیقت کو جان لیا مان لیا۔ اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ ماضی کے تجربوں کو حال کے سائنس دانوں نے غلط ثابت کر دیا۔ مثلاً ڈالٹن کا اور اس سے پہلے عرب عالموں کا کہنا تھا کہ ایٹم ایسا ذرّہ ہے جو دوبارہ تقسیم نہیں کیا جا سکتا مگر بعد میں یہ ثابت کر دیا گیا کہ ایٹم کے بھی تین حصّے ہو سکتے ہیں جو الکٹران، نیوٹران اور پروٹان ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مستقبل حال کے سائنسی تجربات کو غلط ثابت کر دے۔

اگر ہم سائنس کے علم پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارے تمام سوالات کا جواب سائنس دے سکتا ہے یا دے گا۔ مثلاً نیوٹن نے ایک بار دیکھا کہ سیب کے درخت سے ایک سیب زمین پر گر گیا۔ اس نے سوچا "یہ سیب زمین پر پر کیوں گرا۔ آسمان کی طرف کیوں نہ اڑ گیا؟" اور جلد ہی وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس نے اصول کشش (gravitation) معلوم کر لیا۔ نیوٹن کے دماغ میں جو سوال اٹھا تھا اس کا جواب سائنس نے اس طرح دے دیا۔

سائنس نے انسانی زندگی کو جو فائدے دیے ہیں وہ تو قابلِ ذکر ہیں ہی مگر اس سے نقصان بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً ہائیڈروجن بم جیسی ایجاد بھی سائنسی ہے۔

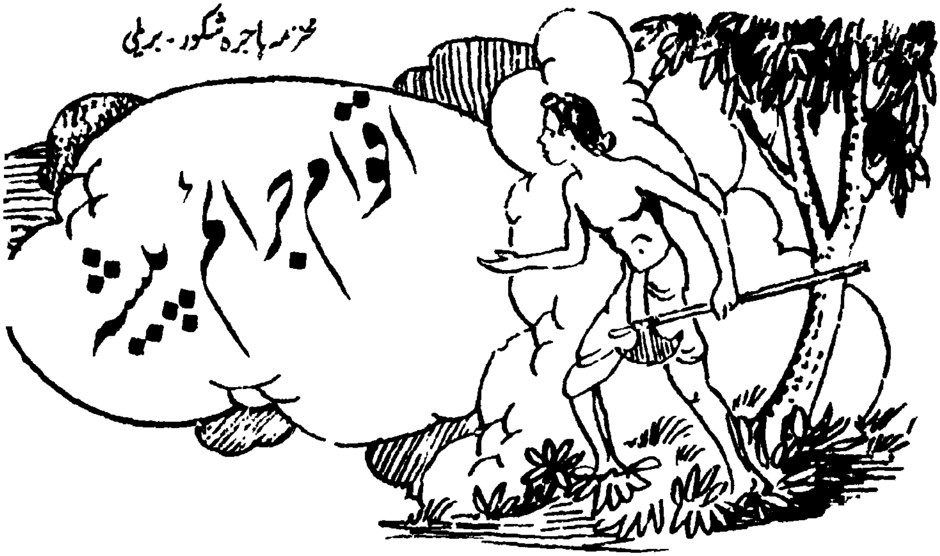
ہائیڈروجن بم جو اگر وہیں پھٹ جائے تو ۴ میل کے رقبے تک زندگی کے تمام آثار ختم ہو جائیں اور ۲۰ میل تک کی تمام جلد جلنے والی چیزیں جل جائیں اور جب اس کے ذرات کے بادل اٹھیں تو وہ ۱۳۰۰ میل کے تمام آثارِ حیات کو نیست و نابود کر دیں۔ اسی طرح الفرڈ نوبل نے، جس کے نام کا نوبل انعام آج بھی قائم ہے، ڈائنا میٹ ایجاد کر کے دنیا کے لیے بہت بڑا خطرہ پیدا کر دیا ـــ

مختصر یہ کہ سائنس کی بنیاد سچائی اور حقیقت کی تلاش پر ہے اس لیے اس کو ترقی ہوئی ہے۔ سائنس کی ترقی کا خاص زمانہ ۱۸۰۰ء سے موجودہ زمانے تک مانا جاتا ہے۔ اور اب سائنس اتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ شاید مستقبل میں انسان کا ہر کام مشین کرنے لگے مگر اس ترقی کا حال معلوم کرنے کے لیے ہمیں سائنس دانوں کے حالات اور ان کے سائنسی کارنامے معلوم کرنا ہوں گے اور اسی قسم کا سلسلہ "ہمارے سائنس داں" کے عنوان سے "پیام تعلیم" میں شروع کیا جا رہا ہے۔

اس سلسلے کی پہلی کڑی آپ اگلے پرچے میں پڑھیے۔


"کیا تمھارے ابا گھر میں ہیں؟"
"میں ابھی ان سے پوچھ کر بتاتا ہوں!"

محترمہ ہاجرہ شکور - بریلی



یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان کی زیادہ تر آبادی گاؤں میں ہے اور کل بائیس فیصدی شہروں میں رہتی ہے۔ لیکن شاید یہ نہ جانتے ہوں کہ بھارت کی چار فیصدی آبادی گھنے جنگلوں میں رہتی ہے۔ جنگل میں رہنے کی وجہ سے ان لوگوں کو ہم آپ جنگلی بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہ لوگ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اسی لیے ان کو قبائلی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ پڑھائی لکھائی میں پچھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے رسم و رواج اور رہن سہن بھی ہمارے لیے بہت عجیب ہیں۔

ان میں بھی سب سے زیادہ عجیب قبائلی وہ ہیں جن کا پیشہ ہی جرم کرنا ہوتا ہے۔ راس کماری سے لے کر کشمیر تک اور پنجاب سے لے کر آسام تک اس قسم کے قبیلے پھیلے ہوئے ہیں۔ ان قبیلوں کے نام بھی بڑے عجیب و غریب ہیں ڈھینور، کولی، جھنجھ، بھامتا وغیرہ ان میں زیادہ مشہور ہیں۔ ویسے ان کی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہے۔ بھارت کی پچھلی مردم شماری میں ان کی تعداد پونے تین لاکھ بتائی گئی تھی۔ یہ قبیلے ہم لوگوں کے قریب آنا پسند نہیں

کرتے اس لیے ہم ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ ٹھیک طرح سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب بنے اور کب پھیلے۔ عام خیال یہ ہے کہ جب آریہ ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو کچھ دراوڑ لوگ گھنے جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے اور پھر وہیں بس گئے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی پیدائش یورپ کی جپسی قوم کی طرح ہوئی ہے۔ کھانا اور کپڑا آسانی سے جنگل میں نہیں ملتا اس لیے ان کو چھین جھپٹ کرنے کی ضرورت پڑی۔ بعد میں یہی ان کی عادت بن گئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رانا پرتاپ کے وہ ساتھی جو مغلوں سے بدلہ لینے کے لیے پہاڑوں کی طرف نکل گئے تھے پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ بہرحال ان قبیلوں کی پیدائش کا سبب کچھ طے نہیں ہے۔

جرائم پیشہ قبیلے ہندوستان کے دوسرے قبیلوں سے بہت مختلف ہیں۔ یہ کسی حد تک ترقی یافتہ بھی ہیں۔ دیوی دیوتاؤں اور جادو ٹونے پر ان کا اعتقاد ہے مگر دوسری طرف ان کے اپنے خفیہ کوڈ اور اشارے دیکھ کر انھیں جنگلی کہنے کو دل نہیں چاہتا۔ ان کو بھیس بدلنا بہت اچھی طرح آتا ہے۔ کبھی کبھار دکھاوے کے طور پر یہ کوئی اور پیشہ اختیار کر لیتے ہیں جیسے ناچنا گانا یا کھیتی باڑی کرنا مگر یہ سب تو دکھاوا ہوتا ہے ورنہ اصلی آمدنی دوسری طرح سے ہوتی ہے۔

ہندوستان میں لگ بھگ چالیس جرائم پیشہ قبیلے ہیں۔ ہر قبیلے کا کام الگ ہے۔ پہاڑوں اور پتھریلی زمین پر بسنے والے قبیلے جانور چرا کر بیچتے ہیں۔ شہروں کے قریب بسنے والے نقب زنی کرتے ہیں مدھیہ پردیش کے قبیلے ڈاکہ ڈالنے کو بہادری سمجھتے ہیں۔ پہاڑوں میں بسنے والے "چھپر بند" نامی قبیلے کے لوگ نقلی سکّے بناتے ہیں۔ ان کے پاس اس کام کے لیے مشینیں تک ہوتی ہیں۔

لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ مجرم قبیلے بہادر ضرور ہوتے ہیں۔ اور ان کے اپنے اصول بھی ہوتے ہیں جیسے 'زالو' ڈاکہ ڈالنے کو بہادری سمجھتے ہیں اور چوری کو بزدلی۔ "بھامتا" اپنے گاؤں سے پچاس میل تک چوری نہیں کرتے" ہر بارہ قبیلے کے لوگ آپس میں بے حد وفادار ہوتے ہیں اور گرفتار ہونے پر فوراً خودکشی کر لیتے ہیں۔

ان کا ڈسپلن بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر دس بارہ خاندانوں کا ایک گروہ بنا کر خانہ بدوشوں کی طرح گھومتے ہیں۔ ہر گروہ میں ایک پنچایت ہوتی ہے اس کا مکھیا ہوتا ہے۔ قبیلے کا سردار یا مکھیا اپنے ساتھیوں کو گرفتاری سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ چوری وغیرہ کی اسکیم بناتا ہے اس کے علاوہ چوری کے مال کی کھپت کے لیے بازار تلاش کرتا ہے۔ ہر قبیلے میں کچھ جاسوس بھی ہوتے ہیں۔ یہ عام طور پر لڑکیاں ہوتی ہیں۔ یہ بھکارنوں یا پھیرے والیوں کے بھیس میں جاسوسی کرتی ہیں اور واپس آکر سردار کو خبر دیتی ہیں۔

آج کل ہماری سرکار نے ان کے سدھار کا کام شروع کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کو جیلوں میں بھرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ان کے لیے مناسب کام تلاش کیے جاتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے اچھا کام فوجی ہو جانے کا ہے کیونکہ یہ چالاک بہادر، پھرتیلے اور بے حد جفاکش ہوتے ہیں۔

★

علی گڑھ کے تین سال

ایک تو پیتا رکھے ہوئے ہے اور دوسرے کے منہ پر چیچک کے داغ ہیں۔ اب تحقیقات مکمل ہو چکی تھی اور بورڈنگ کے طلبا کو ساری حقیقت معلوم ہو چکی تھی۔ محمود صاحب نے شیخ الجامعہ خواجہ عبدالمجید صاحب سے ساری باتیں کہیں اور کہا کہ ان کو اب نکال دیا جائے ورنہ جھگڑا ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ تینوں نکال دیے گئے۔

بچوں سے باتیں

(بقایا صفحہ ۲)

اس پرچے میں زیادہ تر وہی مضمون چھپ رہے ہیں جنھیں کسی نہ کسی وجہ سے سالنامے میں جگہ نہ مل سکی تھی۔ اس لیے مجیب احمد خاں صاحب کی مسلسل کہانی "دلّی دور ہے" اور برکت علی صاحب فراق کے دلچسپ مضمون "تہذیب کی بنیاد" کے لیے گنجائش نہ نکل سکی۔ یہ دونوں اب اگلے پرچے میں چھپیں گے۔

کماری خورشید عبداللہ اورنگ آباد

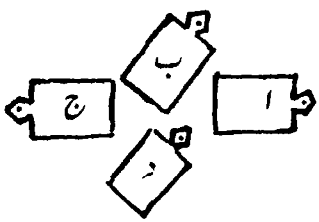
پالی ہم نے منزل پالی

(ا) امی اپنی بھولی بھالی
(ب) بلقیس بجیا پھولوں کی ڈالی
(پ) پاپا بھی ہیں اپنے ہنس مکھ
آہا ہم تو مزے کریں گے
(ت) تارے جگ مگ کرتے دیکھو
(ٹ) ٹک ٹک دیکھ رہے ہیں ہم کو
(ث) ثابت اس سے ہوا یہ بچو!
گویا ہم ہیں پھول زمیں کے
(ج) جام جلیبی جس نے کھایا
(چ) چاچا جی کا وہ من بھایا

(ح) حلوا سوہن اور مٹھائی
پودینے کی چٹنی آئی
(خ) خربوزہ تربوز کی قاشیں
(د) دادی جی سے چل کر لے لیں
(ڈ) ڈربہ کھولو مرغا کاٹو
جھٹ پٹ جھٹ پٹ کاٹو کھاؤ
(ذ) ذال کا جھگڑا سامنے آیا
(ر) راہ کٹھن ہے مقصد اونچا
(ڑ) ڑ بھی اپنا دوست بنا ہے
گٹ گٹ گٹ گٹ ریوڑی کھاؤ

(ز) زاہد حافظ سب نے ڈھونڈا
(ژ) ژ نہ کہیں قرآن میں پایا
(س) سینہ تان کے اردو بولی
یہ تو میرے دامن میں ہے
(ش) شبنم موتی بن کر چمکی
(ص) صبح ہوئی ہے دنیا جاگی
(ض) ضد کو چھوڑو آؤ اٹھو
رونا کیسا ہنسنا سیکھو
(ط) طوطی، توتا، بلبل، مینا
(ظ) ظاہر باطن ایک ہے ان کا
(ع) عادی ہیں یہ سب اڑنے کے
ہم بھی اڑ کر چاند میں پہنچیں
(غ) غازی بن کر گھر آئے ہیں
(ف) فکر نہیں ہے کچھ بھی دل میں

(ق) قاضی جی کو شہر کا خدشہ
ہم کو نہیں ہے کوئی خطرہ
(ک) کاغذ، پنسل، تختی، کاپی
(گ) گاجر، مولی، میدا، سوجی
(ل) لال، گلابی، نیلے، پیلے
رنگ برنگے پھول کھلے ہیں
(م) مونگ کے لڈو اور ملائی
(ن) نارنگی بھی ہم نے کھائی
(و) وہ بھی نعمت یہ بھی نعمت
اب تو خوشی سے جھومو گاؤ
(ھ) ہمت ہم نے کبھی نہ ہاری
(ء) ء (ہمزہ) بھی ہے کتنی پیاری
(ی) یارو! آخر منزل پالی
پالی ہم نے منزل پالی



بڑوں کی کوشش



وہ پھر واپس آئی

کچھ دنوں پہلے کی بات ہے۔ لڑائی بھارت اور پاکستان میں چل رہی تھی۔ رات کو جب ہم کھانا کھانے بیٹھے تو ہم لوگوں میں یہی قصہ چل پڑا۔ میرا بھائی ہمیں پاکستانی چھاپہ ماروں اور بم گرنے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میرے دل میں تو پہلے بھی اس بات کے لیے خیال تھا کہ دیکھوں بم کیسا ہوتا ہے؟ اور گرنے پر کیا ہوتا ہے؟ خیر اس کو دل میں لیے سو گئی۔

رات کو جب میں نندیا دیوی کی گود میں تھی کہ خوابوں کی نگری میں جا پہنچی۔ وہاں جا کر میں ایک دم سے سہم گئی۔ آپ پوچھیں گے کیسے؟ تو سنیے۔ جیوں ہی وہاں پہنچی ایک دم بم گرنے لگے۔ وہ بھی ہمارے گھر کے اوپر۔ میرے بھائی باہر کھیل رہے تھے۔ میں اپنی امی جان کے ساتھ اندر تھی۔ امی تو گھبرانے لگیں اور باہر کی طرف بھاگنے کی کوشش کرنے لگیں۔ لیکن میں نے انھیں روکا۔ پر وہ کہاں رکنے والی تھیں۔ میرا ہاتھ چھڑایا اور بھائیوں کے پاس باہر چلی گئیں۔

خیر میں تو باہر نہ جا سکی کیوں کہ جیوں ہی میں نے باہر جانے کی کوشش کی تو ہمارے گھر کے بیچ والی دیوار گر پڑی۔ میں اندر ہی رہ گئی۔ مجھے بہت غصہ آیا کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر بھائیوں کے پاس چلی گئیں۔ اچھا خدا تو اپنے ساتھ ہے۔ یہی سوچ کر میں وہیں بیٹھ گئی۔ اتنے میں کیا دیکھا کہ باہر آگ کی لپٹیں اڑ رہی تھیں۔

امی جان نے اب مجھے پکارنا شروع کیا۔

میں نے آواز سنی بھی لیکن راستہ تو ویسے بھی نہ تھا اور غصّہ بھی تھا۔ اس لیے میں بولی نہیں۔ امّی نے بہت پکارا اور پکارتی ہوئی دوسری طرف سے آ گئیں۔ آ کر جیوں ہی میرے بازو کو پکڑا ویسے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا لیکن وہاں تو کچھ نہ تھا۔ میں چارپائی پر تھی اور امّی اٹھا رہی تھیں۔ امّی نے میری حیرانگی کا کارن پوچھا تو میں نے پورا قصّہ سنا دیا۔ وہ تو جھٹ چلّا پڑیں "نہ اس طرح کبھی مت سوچنا، رات بھی یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے بم دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اب ہوگیا نہ شوق پورا۔" میں کہاں چپ رہنے والی تھی جھٹ بول پڑی۔ اس سے کیا؟ یہ تو خالی خواب تھا۔

سنتوش آریہ
(دوسرا سال)

دل کی بات

جاڑے کا موسم آنے والا تھا۔ میرے من میں آیا کہ کوئی جرسی بنوانی چاہیئے لیکن کس سے بنوائی جائے۔ میری سمجھ میں اس بارے میں کچھ بھی نہ آیا۔ کیونکہ میرا کوئی بھی عزیز اس کام میں اتنا ماہر نہ تھا۔ مگر پھر دیکھا کہ موسم تو اس بار کچھ گرم سا ہے تو میں نے اپنے دماغ سے اس بات کو نکال دیا۔ اس خیال کے کافی دن بعد ایک دن پھر خیال آیا کہ سردی کافی پڑنے لگی ہے۔ کوئی جرسی نہیں تو سوئٹر ہی بنوایا جائے۔

اس خیال کے آتے ہی بنا سوچے سمجھے ہی میں ایک سوئٹر کی اون لے آیا۔ اون لے آنے کے بعد پھر یہی مسئلہ سامنے آیا کہ سوئٹر کس سے بنوایا جائے۔ لیکن اس کا جواب تو بہت دن پہلے بھی نہیں پایا تھا۔ میں نے سوچا اپنے کسی شہری ساتھی سے ہی کہنا چاہیئے۔ لیکن اس سے بھی معلوم کرنے پر یہی جواب ملا کہ میری کوئی ایسی جان پہچان نہیں جو سوئٹر بن دے۔

اب میں بالکل مایوس تھا۔ اس بات کی تانا بانی میں رات کو سونے کے وقت کر رہا تھا کہ ایک بڑا لاجواب خیال آیا کہ کیا سولہ ہم جماعت (لڑکیاں) ہوتے ہوئے بھی سوئٹر نہیں بنا جائے گا۔ اس بات کو صحیح مان کر میں اس رات سو گیا۔ صبح ہوئی تو اس الجھے سنسار میں میرے اس خیال نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ میری ہمت اپنے کسی بھی ہم جماعت ساتھی سے یہ کہنے کی نہ پڑی

کہ "میرا ایک سوٹر بن دیجیے"۔

رات ہوئی اور پھر خیالوں نے ہمت پکڑی اور یہ سوچ کر سو گیا کہ کل کہوں گا کل ہوئی پھر نہ جانے کیوں ہمت نہ ہوئی اور نہ کہہ سکا۔ اس طرح کئی دن ہو جانے پر آج میں بالکل مایوس تھا میرے ایک عزیز ساتھی نے میری اس مایوسی کی وجہ پوچھی میرے منہ سے یہی الفاظ نکل پائے کہ بس دل کی بات دل ہی میں رہنے دو کیونکہ یہ دوش ہمارا نہیں بلکہ ہماری سماج کا ہے یہ ہماری تعلیم کا نقص ہے۔

سجے پرکاش

(دوسرا سال)

دو خواہشیں

گرمی کی چھٹیاں ہر سال آتی رہتی ہیں اور ختم بھی ہو جاتی ہیں ہمیں بھی ۳۰ اپریل کو کالج سے چھٹی ملی۔ ہم سب نے طے کیا کہ اس سال کی چھٹیاں ہم پنجاب میں جا کر بتائیں گے۔ اور سب گھر والے پنجاب جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ میں اپنے دل میں نئی امنگیں لیے ہوئے تھی اور خدا سے یہی دعا کرتی کہ جلد ۵ مئی آئے اور ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں مگر دن کمبخت بیتنے پر ہی نہ آتے تھے۔ میں یہ چاہ رہی تھی کہ کاش میرے بھی پنکھ ہوتے تو اڑ کے چلی جاتی ہم سب جانے کی تیاریاں کر رہے تھے مگر انسان کچھ سوچتا ہے پر خدا کچھ اور ہی کرتا ہے۔ ۳ مئی کا دن تھا۔ ہمارے گھر سب گھر والے کسی کی شادی پر گئے تھے۔ میں اکیلی ہی گھر پر تھی۔ میرے ساتھ میری دادی بھی تھیں۔ شام کا وقت تھا۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا رہی تھیں بجلی چمک رہی تھی۔ کالے کالے بادل رہ رہ کر گرج رہے تھے۔ میرا دل نہ جانے کیوں اداس تھا ایسا لگ رہا تھا کہ یہ دن کسی دکھ کا سندیش لانے والا ہے۔ رات کا وقت تھا۔ میری دادی نے جو کئی دنوں سے بیمار تھیں مجھ سے کہا بیٹا چائے بنا دو ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ میں چائے بنانے کے لیے باورچی خانے میں گئی مجھ سے اس دن سٹوو ہی نہ جل رہا تھا۔ شاید وہ آخری بار دادی کو چائے نہ پلانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اتنے میں میری دادی نے مجھ کو آواز دی میں سٹوو جلا کر اندر جیوں ہی گئی کیا دیکھا دادی کے پران نکل چکے تھے میں بڑے زور زور سے رونے لگی۔ آس پاس کے لوگ ہمارے گھر میں آگئے اور مجھے دلاسا دینے

لگے۔ میرے آنسو نہ تھمے۔ میری دادی چل بسیں اور میری حسرتیں من میں رہ گئیں۔

صفیہ کوہلی

(سال دوم)

اپنی زندگی کی کہانی

جب میں پیدا ہوئی تو ہمارے گھر کی حالت بہت اچھی تھی لیکن میرے پیدا ہوتے ہی ایک ان ہونی گھٹنا گھٹی۔ وہ یہ کہ ہندوستان اور پاکستان دو حصوں میں بٹ گئے۔ جس کا نتیجہ بڑا برا ہے۔ خاص کر میرے گھر والوں پر اس کا بڑا برا اثر پڑا۔ ہمارے والد صاحب کو اپنی عزت کا خاص خیال رہتا تھا وہ اپنے وطن کی خاطر خود دشمنوں سے لڑے۔ خیر اب آگے سنیے۔ کسی طرح سے ہم لوگ بچ گئے اور دلّی میں آ گئے۔ اب میں دھیرے دھیرے بڑی ہونے لگی۔ جب میں پانچ سال کی ہوئی تو مجھے مدرسے بھیجا گیا۔ ابھی مشکل سے دو ہی دن گئی تھی کہ ہمارے والد صاحب ہمیں گاؤں میں لے گئے اور میں وہاں ایک مدرسے میں پڑھنے لگی جو کہ گھر سے پانچ میل دور تھا۔ وہاں میں قدرت کی چیزوں کو دیکھنے میں بڑا سکھ پاتی تھی۔ میں نے وہاں پر دوسرے درجے تک تعلیم پائی۔ اور پھر ہم وہاں سے جگادھری آ گئے۔ وہاں ہم بہت کم عرصے رہے۔ جس سے میں تعلیم نہ حاصل کر سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے کھانسی بخار ہو گیا تھا جو کافی عرصے تک رہا۔ وہاں سے ہم انبالا آئے اور تقریب چار سال تک انبالا میں رہے۔ پانچویں جماعت تک میں نے وہاں تعلیم پائی۔ تیسری سے پانچویں تک میں اپنی جماعت میں اوّل آتی رہی۔ جس کی وجہ سے میرے استاد اور میرے ساتھی سب ہی مجھے چاہنے لگے۔ اور سب مجھ سے بڑا پیار کرتے جہاں مجھے اتنے چاہنے والے ملے تھے وہاں کچھ جلنے والے بھی تھے۔ ان کو میرا اوّل درجے پر آنا اور سب ہی سے پیار کا ملنا بھاتا نہیں تھا۔ اور وہ جلتے رہتے تھے مگر میں کبھی ان کی پرواہ بھی نہ کرتی اور اپنی محنت میں لگی رہتی۔ جب میں چھٹے درجے میں آئی تو مجھے مدرسے کی طرف سے شملے لے جایا گیا۔ اس دن میں بہت ہی خوش نظر آتی تھی۔ لیکن ان سے بھی بڑھ کر خوشی کا دن وہ تھا جب میں شملے سے واپس آئی تھی اور سنا تھا کہ ۶ ستمبر کو دلّی جانے والے ہیں خیر انتظار کرتے کرتے

یہ دن بھی آگیا اور میں بنا اپنی کسی سہیلی سے ملے دلّی کے لیے روانہ ہو گئی۔ اس دن میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہی تھی کیونکہ اب میں ان سہیلیوں سے بہت دور تھی جو کہ کبھی سدا میرے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ اب کسی طرح سے اپنے دل کو حوصلہ دیا۔

شاید آپ کو یہ جان کر بھی میرے ساتھ ہمدردی ہو اس دن میں بڑی دکھی تھی جس دن مجھے دلّی کے کسی بھی اسکول میں داخلہ نہ مل رہا تھا لیکن پھر بھی میں نے اپنا دل نہ توڑا اور جگہ جگہ جاتی رہی۔ خیر ہار کر ایک اسکول میں گئی تو انھوں نے میری سند دیکھی اور اوّل درجے آنے کے کارن داخلہ دے دیا۔ آٹھویں درجے تک میں اوّل آتی رہی جس سے میرے استاد بڑے خوش رہتے۔ اب کچھ تو پڑھائی زوردار تھی اور کچھ میں بھی بیمار رہنے لگی اور اوّل درجہ نہ پا سکی۔ ۱۱ویں جماعت میں دوسرے درجے میں پاس ہوئی۔ اب سوال یہ اٹھا کر آگے کیا کیا جائے۔ ہمارے گھر میں سب مجھے بیسک کرانا چاہتے تھے لیکن میری تمنا تھی آگے پڑھنے کی جو پوری نہ ہو سکی اور میں کسی طرح سے جامعہ میں آ گئی آگے کیا ہوا آپ سب جانتے ہوں گے۔

سدیش ڈاور جامعہ
دوسرا سال



ننھا رشید: "میری بلّی تو اپنا نام بھی لے سکتی ہے۔"

نیاز: (حیرت سے) "بھلا کیا نام ہے اس کا۔"

رشید: "میاؤں۔"

شام کے وقت ایک پاگل نے پاگل خانے کی دیوار پر چڑھ کر ندی کنارے مچھلی کا شکار کھیلنے والے کو دیکھا اور پکار کر کہا: "کہو بھئی کیا ہو رہا ہے۔"

شکاری: "مچھلی پکڑ رہا ہوں۔"

پاگل: "کب سے یہاں بیٹھے ہو۔"

شکاری: "صبح سے۔"

پاگل: "کوئی مچھلی پھنسی؟"

شکاری: "ابھی تک تو کوئی نہیں پھنسی۔"

پاگل: (مسکرا کر) تو یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ اندر آ جاؤ تمھیں تو ہمارے ساتھ ہونا چاہیے۔"

ڈرائنگ ماسٹر: "ارے یہ سفید کاغذ مجھے کیوں دے رہے ہو اس میں تصویر کہاں ہے۔"

شاگرد: "تصویر! یہ تو ماسٹر صاحب بڑے معرکے کی تصویر ہے۔ گھاس کا کھیت اور بکری گائے۔"

ماسٹر: "مگر اس میں گھاس کہاں ہے۔"

شاگرد: "اسے تو گائے چر گئی ماسٹر صاحب!"

ماسٹر: "اور گائے؟"

شاگرد: "بھلا وہ اس قدر بے وقوف تھی کہ گھاس کا کھیت چرنے کے بعد بھی وہاں ٹھہری رہتی۔"

★

صحافی

اِدھر اُدھر سے

شاستری جی کی موت پر روسی بچوں کا اظہار غم

ہندوستان کے وزیر اعظم شری لال بہادر شاستری کی اچانک موت پر اظہار تعزیت کے لیے ماسکو بورڈنگ اسکول ۱۹ کے بچوں نے گیارہ جنوری کی صبح کو ایک جلسہ منعقد کیا۔ (اس اسکول میں ہندی پڑھائی جاتی ہے)

اسکول میں ایک اونچی جگہ پر شری لال بہادر شاستری کی تصویر رکھی تھی۔ یہاں سجاوٹ اس انداز سے کی گئی تھی کہ سوگ کا اظہار ہوتا تھا۔ بچے اس تصویر کے ارد گرد کھڑے تھے ان کے چہروں پر اداسی تھی۔ سب بچوں نے ایک منٹ تک خاموش کھڑے ہو کر لال بہادر شاستری کی یاد کو خراج عقیدت پیش کیا۔

جلسہ ختم ہونے پر تمام بچے لال بہادر شاستری کی تصویر والے چبوترے کے چاروں طرف کھڑے رہے اور اپنی ہم مکتب ہندوستانی بچی منی لال شاہ سے اور اس کی معرفت تمام ہندوستانی بچوں سے اظہار تعزیت کیا۔ جن کے ساتھ لال بہادر شاستری کی خواہش کے مطابق وہ گہرے تعلقات رکھنا چاہتے ہیں

ابھی پچھلے دنوں ایر انڈیا انٹرنیشنل کا ہوائی جہاز آلپس کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ جہاز کے عملے کے علاوہ ۱۰۵ مسافر ختم ہو گئے۔ یہ کا ایک ـــــ کلچرل وفد ہندوستان کا دورہ

کرکے بلجیم واپس جا رہا تھا وہ بھی اس حادثے کی نذر ہوگیا۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے مشہور سائنس داں شری بھابھا بھی اسی جہاز میں تھے۔ شاستری جی کی موت کے بعد ہندوستان کا یہ سب سے بڑا حادثہ ہے۔ بھابھا صاحب اٹمک انرجی کمیشن کے چیرمین تھے اور انھوں نے اپنے کام کو بہت آگے بڑھالیا تھا۔

جرمنی میں گڑیوں کا اسپتال

ہمارے ہندوستانی گھروں میں مائیں پہلے بچوں کے لیے کپڑوں کی گڑیاں ہاتھ سے تیار کر دیتی تھیں پر اب اس مشین کے زمانے میں اُن کی وہ قدر نہیں رہی۔ بازار سے جیسی چاہو گڑیا خرید لاؤ۔ اب ان ہی کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ بچے بہت شوق سے انھیں خرید کر لاتے ہیں لیکن اگر ان کے چوٹ پھینٹ لگ جائے یا دوسرے لفظوں میں یہ ٹوٹ پھوٹ جائیں تو ان کے علاج کا کوئی انتظام نہیں کوئی ڈاکٹر نہیں کوئی اسپتال نہیں۔ ہاں سنتے ہیں مغربی جرمنی کے ہر بڑے شہر میں ایسے اسپتال یا کارخانے قائم ہیں اور یہ کاروبار برابر ترقی کر رہا ہے۔ بہت سی بچیاں نئی گڑیوں کی جگہ اپنی پرانی گڑیوں کو پھر سے نیا دیکھنا چاہتی ہیں چنانچہ ان کی کسی پیاری گڑیا کے بال جھڑ جاتے ہیں یا ہاتھ پیر ٹوٹ جاتے ہیں تو اسے مرمت کے لیے گڑیوں کے اسپتال بھیج دیا جاتا ہے۔ کرسمس کے زمانے میں ان کارخانوں یا اسپتالوں کا کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ ایک اسپتال کی تصویر اسی پرچے کے آخر میں دیکھیے۔

گڑیوں کی دنیا

دہلی میں بچوں کی کتابیں چھاپنے کا ایک بہت بڑا ادارہ ہے۔ اس ادارے کے صدر دفتر کی عمارت کا نام "نہرو ہاؤس" رکھا گیا ہے۔ اس کی جانب سے ہر سال بچوں کی پینٹنگ کا عظیم الشان مقابلہ ہوتا ہے۔ اس مقابلے میں دنیا کے مختلف ملکوں کے بچے حصہ لیتے ہیں۔

اس نہرو ہاؤس میں اب گڑیوں کا ایک عجائب گھر قائم کیا گیا ہے۔ اس میں تمام دنیا کی رنگ برنگی گڑیاں اور کٹھ پتلیاں رکھی گئی ہیں۔ اسے گڑیوں کا عجائب خانہ نہیں گڑیوں کی دنیا کہیے جہاں ہر ملک کی گڑیاں اپنی مخصوص پوشاک میں دیکھنے کو مل جائیں گی۔ کبھی دہلی آنا ہو تو گڑیوں

ی اس دنیا کو ضرور دیکھیے۔

چلتا پھرتا چڑیا گھر

لندن میں مکان کئی کئی منزل کے ہوتے ہیں بہت سے بچے ایسے مکانوں میں رہتے ہیں اور انھیں کئی کئی منزلیں پار کرکے اپنے گھروں تک پہنچنا ہوتا ہے۔ ان گھروں میں رہنے والے بچے اپنے یہاں پالتو جانور نہیں رکھ پاتے۔ اور روز روز چڑیا خانے آکر جانوروں سے دل بہلانا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لندن کی چڑیا گھر کی کونسل نے اب اس کا ایک حل تلاش کر لیا ہے۔ کونسل نے دو بہت بڑی بڑی گاڑیاں بنائی ہیں۔ ان گاڑیوں میں لندن کے چڑیا گھر کے بھانت بھانت کے جانور اپنے اپنے پنجروں میں بیٹھ کر سیر کرتے ہیں۔ جب یہ گاڑیاں کسی کھلے میدان میں یا کسی چھوٹے سے باغ میں پہنچتی ہیں تو ان جانوروں کو تار کے ایک گھیرے کے اندر آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لیجیے اب یہ میدان چڑیا خانہ بن گیا۔ اپنے اپنے گھروں کے اندر یہ جانور آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں۔

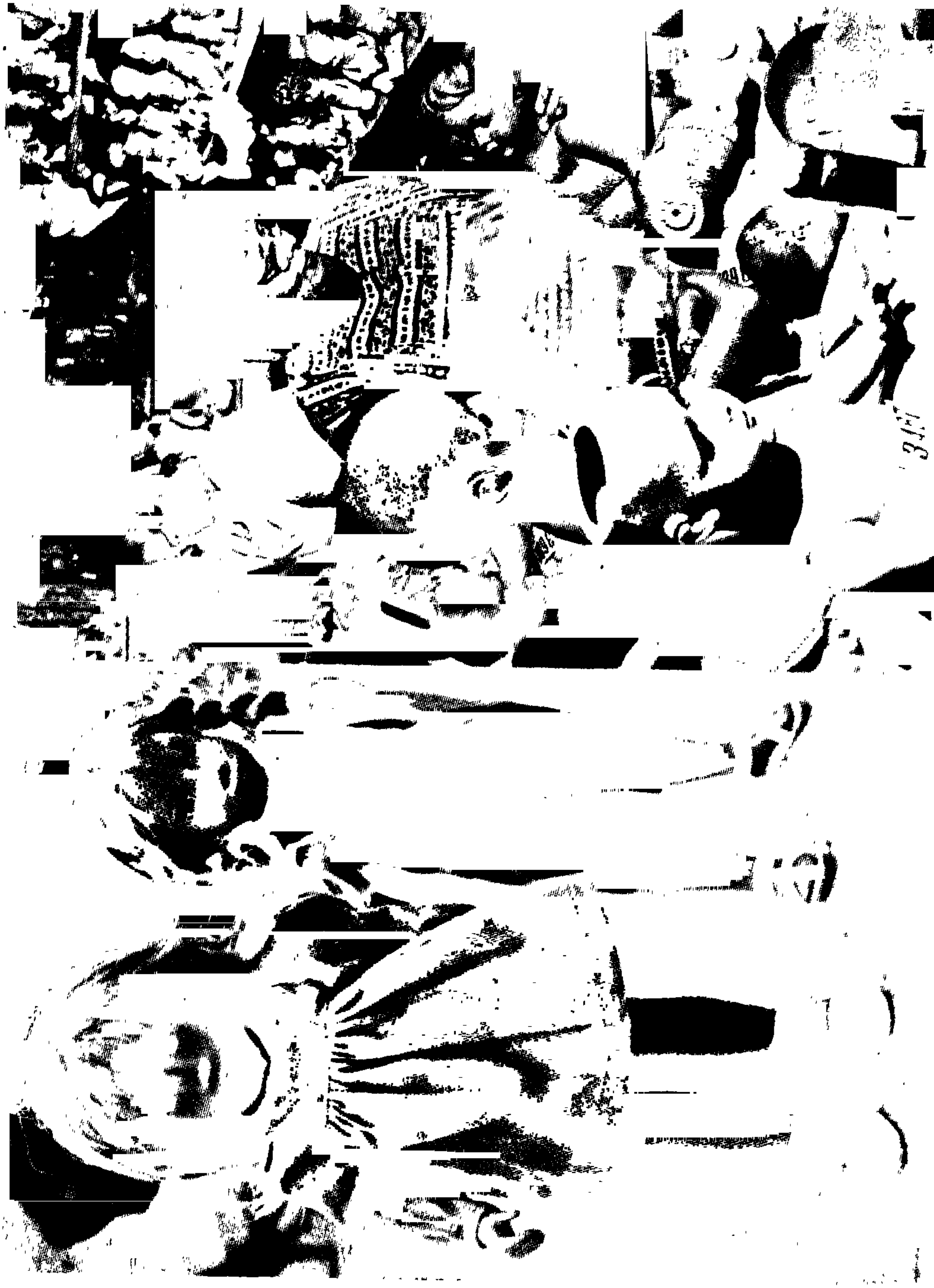
شام کو یہ جانور چڑیا خانے واپس آجاتے ہیں اور صبح پھر روانہ ہو جاتے ہیں۔ آس پاس کے بچے ان باغوں میں آکر ننھے منے بچوں کے ساتھ کھیل کود سکتے ہیں۔ چڑیا گھر کے رکھوالے بچوں کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ پالتو جانوروں کو کس طرح رکھنا چاہیے۔ ان سے کس طرح کھیلنا چاہیے جس سے انھیں نقصان بھی نہ پہنچے اور ان کا دل بھی بہل جائے۔ جلد ہی لندن میں اس طرح کے کچھ اور بھی چلتے پھرتے چڑیا گھر بنائے جائیں گے۔

روشنی میں فلمیں دیکھی جاسکتی ہیں

آپ نے فلم دیکھی ہوگی۔ فلمیں اندھیرے کمروں میں دکھائی جاتی ہیں۔ روشنی میں فلم صاف نظر نہیں آتی۔ اب جرمنی میں ایک ایسا پردہ ایجاد کیا گیا ہے جس پر روشنی میں بھی فلمیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس خاص پردے پر فلم پروجیکٹر پیچھے کی طرف سے آئینے کی مدد سے عکس ڈالتا ہے۔ اس سے روشنی میں بھی فلم صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس پردے کے رواج سے کھلے کمروں اور میدانوں میں دن کے وقت بھی فلمیں دیکھی جاسکیں گی۔ جہاں اندھیرا کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا جاسکتا ہے



(پرنٹر پبلشر سید احمد دلی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے کوہ نور پریس لال کنواں، دہلی سے چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا)



February, 1966. Regd. No. D. 1457.

Payam -i- Taleem

New Delhi-25.

پیام تعلیم



ننھے پیامی



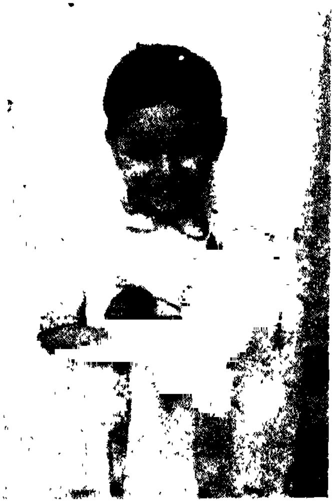
کہکشاں بیگم
عمر ۴ سال



یاسمین، بمبئی
عمر ۱½ سال



شہلا۔ مینا۔ شمع



مسعود اختر
عمر ۳ سال



پیام تعلیم
دہلی

جلد ۳ — مارچ ۱۹۶۶ء — شمارہ ۳

ایڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی

آرٹسٹ: گلیڈون میس

سالانہ چندہ: — پانچ روپے

فی پرچہ: — پچاس پیسے

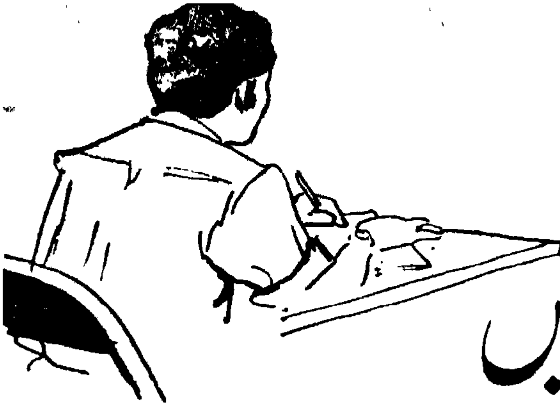
بمبئی آفس

پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵



سرورق: سرورق کی تصویر بمبئی کے مسٹر انیس، اے چودھری کا عطیہ ہے۔



بچوں سے باتیں

ابھی جولائی ۱۹۶۵ء کی بات ہے جامعہ کے بہت محترم استاد اختر حسین فاروقی ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے۔ مشکل سے آٹھ نو مہینے ہوئے ہوں گے کہ ہمارے ایک اور ساتھی حافظ نبی احمد صاحب (۶ر فروری ۱۹۶۶ء) داغ مفارقت دے گئے۔

حافظ نبی احمد صاحب نے شروع سے آخر تک جامعہ میں پڑھا۔ بہت نیک، شریف اور محنتی طالب علم تھے۔ جامعہ سے بی۔ اے کی ڈگری لینے کے بعد کلکتہ میں لائبریری سائنس کی ٹریننگ لی اور جامعہ لائبریری کا کام ان کے سپرد کر دیا گیا۔ پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے، کام پسند کا تھا، خوب جی لگا کے محنت کی۔ لائبریری سائنس کے ماہر ہوگئے۔ اسی سلسلے میں امریکہ بھی ہو آئے۔ ٹکٹ جمع کرنے کا شوق تھا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے 'پیام تعلیم' کے لیے ٹکٹوں کی خبریں فراہم کرنے کا کام اپنے ذمے لیا اور بڑی ذمے داری کے ساتھ نباہا۔ ہم نے ان کے دو عزیز ساتھیوں محمد طیب صاحب اور برکت علی صاحب فراقؔ سے درخواست کی ہے۔ انھوں نے ہماری مدد فرمائی تو کسی اگلے پرچے میں اِن کے تفصیلی حالات شائع کریں گے۔

ہم نے سالنامے میں سالگرہ تحفے کی تجویز پیش کی تھی۔ پیامیوں نے اسے بہت پسند کیا۔ تو اب یہ کیجیے کہ اپنی پیدائش کی تاریخ ہمیں لکھ بھیجیے۔ نمبر خریداری بھی۔ دیکھیے بھول لیے گا نہیں جوں ہی آپ کا خط ہمیں ملے گا ایک حقیر تحفہ ہم

آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

سالنامے کو پیامیوں نے اور ان کے بزرگوں نے سبھی نے پسند کیا۔ اس طرح کے خط برابر وصول ہو رہے ہیں۔ ان میں سے چند کا خلاصہ اس پرچے میں چھپ رہا ہے۔ اپنے اور بہت سے پیامیوں کی رائے کا ہمیں خاص طور سے انتظار ہے۔

آپ نے اخباروں میں روسی سپتنک لونا ۹ کی خبر تو پڑھی ہوگی۔ یہ کامیابی کے ساتھ چاند پر اتر گیا ہے۔ ہمارے ایک مضمون نگار رشید ابو عبیدی صاحب نے اس پر ایک دلچسپ اور انوکھی نظم لکھی ہے۔ اسے ہم اگلے پرچے میں چھاپ رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ بھی اسے مزے لے کر پڑھیں گے

آپ کے سالنامے پر اخباروں کے تبصرے برابر موصول ہو رہے ہیں۔ ہم ان اخباروں اور رسالوں کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتے ہیں ... روزنامہ انقلاب بمبئی۔ آندھرا پنچ حیدرآباد۔ ذوالقرنین بدایوں۔ انکشاف جھانسی۔ رسالہ نونہال ٹائمس بمبئی۔ روزنامہ دعوت دہلی۔ روزنامہ الجمعیۃ دہلی۔ امید ہے کہ دوسرے اخبارات و رسائل جلد اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

اس پانچ چھ مہینے کے عرصے میں بچوں کے کئی پرچے چھپنے لگے ہیں۔ سالی گاؤں سے اردو کامک نکل رہا ہے، بریلی سے بچپن نکلنے لگا ہے بمبئی سے نونہال ٹائمز۔ ان میں سے اردو کامک دو ماہی ہے باقی دونوں ماہوار ہیں۔ خدا کرے یہ زندہ رہیں اور خوب ترقی کریں۔

لکھنؤ کا کلیاں بھی بڑی پابندی سے نکل رہا ہے ابھی ابھی اس کا سالنامہ ہمیں ملا ہے۔ اور بھی لکھنؤ کا ننھا منا ٹانی بھی خوب پھر پرزے نکال رہا ہے۔ تھوڑے دنوں میں یہ اپنا سالنامہ اور عید نمبر دو خاص نمبر نکال چکا ہے۔

سالنامے میں سید حرمت الاکرام صاحب کی ایک نظم چھپی ہے (صفحہ ۳) اس میں تیسرے شعر کا دوسرا مصرع غلط چھپ گیا ہے۔ صحیح یوں ہے۔ گزرا وقت نہ کوئی پائے گا گیارہویں شعر میں دوسرے مصرعے میں بڑا کی جگہ برا چھپ گیا ہے۔ پیامی ٹھیک کر لیں۔

جناب برق بہاری

خدا کے دربار میں

مٹا میں خدایا تجھے چھوڑ کر
کہیں سکھ نہ پایا تجھے چھوڑ کر
خطا کار اپنی نگاہوں میں ہوں
بہت غم اٹھایا تجھے چھوڑ کر
نہ دیکھی جہاں میں مروت کہیں
عبث دل لگایا تجھے چھوڑ کر
ہے دنیا میں ہر سمت مکر و دغا
کہیں حق نہ پایا تجھے چھوڑ کر
ہیں بے کیف گل اور گلستاں سبھی
ہمیں کچھ نہ بھایا تجھے چھوڑ کر
جو دل تیری الفت کا گنجینہ تھا
اسے پھر نہ پایا تجھے چھوڑ کر
تجھی سے تھی آباد جنت مری
جہنم بسایا تجھے چھوڑ کر



بچوں کے نام ایک خط

جناب یوسف ناظم

(یہ خط بچوں کے والدین بھی پڑھ سکتے ہیں۔ وہ پڑھ لیں تو ہمارا جاتا کیا ہے؟)

پیام تعلیم پڑھنے والے بچو!

ہم نے سنا ہے کہ تم ہمارا کوئی نام رکھنا چاہتے ہو۔ نام رکھنا کوئی اچھی بات نہیں۔ تم خود سوچو اگر کوئی تمھارا نام رکھنا شروع کر دے تو بس بسورتے رہ جاؤ گے۔ اور یوں بھی تمھیں ہمارے نام پر کیوں اعتراض ہے۔ اچھا خاصا نام ہے۔ اب رہا رشتہ لگانے کا سوال تو بھائی میرے سب رشتے ناتے پرانے ہو چکے۔ اس سے پہلے تمھارے کتنے چچا گزر چکے۔ کتنے ہی لوگ ماموں جان بنے اور کچھ نہ کر سکے۔ آج بھی کتنے بھائی جان ہیں۔ اب ہمیں کیا تم پھوپھا جان بناؤ گے یا خالو جان؟ یہ تو بڑے دور کے رشتے ہوئے چچا اور ماموں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آئینہ سامنے رکھا ہوا ہے۔ خالو اور پھوپھا کی مثال ایسی ہے جیسے ہیر کٹنگ سیلون میں کوئی تمھارے سر کے پیچھے آئینہ لے کر کھڑا ہو اور کہے دیکھو تو سہی بال ٹھیک سے کٹے ہیں نا۔ مطلب ہمارا کہنے کا یہ ہے کہ چچا اور ماموں کے علاوہ دوسرے سارے رشتے دار، ڈائرکٹ رشتے دار نہیں ہوتے۔ پھوپھا کا رشتہ بنتا ہے

پھوپھی کی وجہ سے اور خالو جان آتے ہیں خالہ جان
کی وجہ سے۔ یہ سب امپورٹ کئے ہوئے لوگ
ہوتے ہیں۔ اپنے گھر کے لوگوں کی بات ان میں کہاں۔
اس لیے بچو ہم پھوپھا اور خالو بن کر بدلیسی نہیں
کہلانا چاہتے۔ تم اگر ہمیں کسی رشتے سے یاد ہی
کرنا چاہتے ہو تو کوئی قریبی رشتہ ڈھونڈو لیکن
نیا بھی ہو۔۔۔ اچھا کہو تایا جان کیسا رہے گا؟
تایا جان اب تک کوئی پیدا بھی نہیں ہوئے ہیں
اور پھر اس میں بزرگی بھی ہے۔ تایا جان کا درجہ
چچا جان سے اونچا ہی ہے۔ بعض گھروں میں
تایا جان کو بڑے ابا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔
لیکن ہم بڑے کا لفظ لگانا نہیں چاہتے۔ بڑے
کا لفظ وہی بڑے ہی کے ساتھ اچھا لگتا ہے۔
ہمارا خیال ہے تایا جان ٹھیک رہے گا۔ تم لوگ
ادب قاعدے سے بھی رہو گے اور رشتہ بھی قائم
رہے گا۔ بعض چچاؤں کا تو بچے مذاق بھی اڑاتے
ہیں اور چچاؤں سے بڑی بے تکلفی سے پیش آتے
ہیں۔ تایا کے ساتھ البتہ بچے شرارت نہیں کر سکتے۔
تایا کچھ مرشد نما قسم کی چیز ہوا کرتے ہیں نا۔ تایا پائے
بھی بہت کم گھروں میں جاتے ہیں۔ تم اگر ڈھونڈنے
نکلو تو شاید مشکل سے دو چار گھروں میں تایا تمھیں
ملیں۔ یہ لوگ اپنی بزرگی کی وجہ سے بھتیجوں کے ساتھ
رہتے نہیں۔ ہاں چچاؤں کو پوچھو تو ہر گھر میں دو چار
مل جائیں گے اور پھر یوں بھی باہر سے جو بھی ملنے
آتا ہے چچا کہلاتا ہے۔ خود تمھارے ابا کہتے ہیں بیٹے
مسعود چچا آتے ہیں انھیں سلام کرو۔ امی فرماتی
ہیں اے لو للّو یہ پان تو لے کر رشید چچا کو دے آؤ۔
یعنی گھر میں جو آئے چچا۔ سڑک کا ہر چلنے والا چچا۔ بس
میں بازو کی سیٹ پر بیٹھنے والا شخص چچا۔ اب تم
ان چچاؤں میں ہمیں نہ ملاؤ اور اگر چچا بننا ہی
ہے تو ہمیں تایا جان کے پیارے پیارے نام سے
یاد کرو۔ ہم تم سے بہت دور رہتے ہیں اس لیے یہ
رشتہ موزوں بھی معلوم ہوگا۔ اور ہمیں بھی محسوس ہوگا کہ
ہم کچھ اہم آدمی ہیں۔ تایاؤں کے زیادہ فرائض بھی نہیں ہوا کرتے۔
بچوں کو نہلانا، سینما دکھانا، پارک پہنچانا۔ ان کے کپڑے
وغیرہ سلوانا وہ بیمار ہو جائیں تو دواخانے پہنچانا یہ سب کام
چچاؤں کے ہوتے ہیں۔ کس کی مجال ہے کہ ایسے کام تایاؤں
سے لے سکے۔ اس لیے اے بچو ہم تایا بن کر واقعی خوش
ہوں گے۔ اور تم کو بھی خوش ہونا ہی چاہیے۔ پہلے
تمھارے کوئی تایا تھے ہی نہیں گھر بیٹھے ہم مل
گئے۔۔۔ کہو کیسی رہی؟

★

ماں کی لوری



جناب ذوالنورین صدیقی مستورؔ

نیند کا آنچل لہرائے
منّا میرا سو جائے

منّا میرا پیارا ہے
نیل گگن کا تارا ہے
بھولے بھالے منّا کو
آکر چندا بہلائے
منّا میرا سو جائے

لال پری اب آئے گی
دودھ بتاشے لائے گی
اندر کا بھیجا وہ تحفہ
بیٹھ کے میرا راجا کھائے
منّا میرا سو جائے

تیری بھولی بھالی صورت
جیسے مرمر کی ہو مورت
دیکھ کے تیرے بھولے پن کو
پھول چمن کا شرمائے
منّا میرا سو جائے

دھرتی کو آکاش بنانا
خوشیوں کے تو دیپ جلانا
سر پہ میرے منّا کے
غم کا نہ بادل منڈلائے
منّا میرا سو جائے

اونچی تیری قسمت ہو
نازل تجھ پر رحمت ہو
سو جا راج دلارے تو
امّاں تیری لوری گائے
منّا میرا سو جائے

نندیا میرے گھر آئے
منّا میرا سو جائے

آمنہ ابوالحسن

ننھّی کلی

محترمہ آمنہ ابوالحسن نے یہ کہانی سالنامے کے لیے لکھی تھی مگر ہمارے پاس یہ اس وقت پہنچی جب پرچہ تیار ہو چکا تھا۔ اب یہ اس پرچے میں شائع کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ محترمہ آمنہ ابوالحسن ہماری اس معذرت کو قبول فرمائیں گی۔ دیکھیے کتنی پیاری، کتنی مزیدار کہانی ہے۔

ایڈیٹر

وہ ایک ننھّی کلی تھی۔ پورے باغ میں تمام پھولوں کے بیچ رہتی تھی۔ ننھّی ننھّی نازک نازک ــــــ!

دو سُرخ گلاب اس کے ماں باپ تھے اور وہ اکیلی کلی ان کی آنکھوں کا تارا۔ ایک دن صبح کے وقت وہ اپنے معمول کے مطابق تمام پھولوں کے درمیان بیٹھی ہنس رہی تھی، ایک بھونرا آیا۔ باری باری اُس نے سب پھولوں کے چکّر لگائے اور آخر میں ننھّی کلی کے پاس آ بیٹھا۔

کلی ڈر گئی۔ وہ جھک کے اپنے ماں باپ کی خوبصورت پتیوں میں چھپ گئی۔ بھونرا ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ "اری ننھّی نادان کلی، مجھ سے کیوں ڈرتی ہے باہر نکل آ۔ اس دُنیا میں میرا کوئی دوست نہیں۔ آج سے ہم دونوں دوست بن جائیں گے۔ میں تیری حفاظت کروں گا!"

کلی پتیوں کی اوٹ سے باہر نکل آئی ــــ دونوں دوست بن گئے۔ کچھ لمحے گزرے پھر ایک تتلی آئی۔ رنگین اور خوب صورت تتلی۔ اس نے

دور ایک کلی کو دیکھا جو ہنس ہنس کر بھونرے سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ حیران رہ گئی اور اڑ کے پاس آئی۔

ننھی کلی نے دیکھا اور ڈر گئی۔ اس نے بھونرے سے کہا "دیکھو میرے دشمن کہیں یہ رنگین تتلی میرا رس نہ چوس لے۔"

بھونرا ہنس پڑا اور کہنے لگا — "ڈرو مت میری خوب صورت کلی — میں تمھاری حفاظت کروں گا —"

جب تتلی قریب آئی تو بھونرے نے سلام کیا اور پوچھا — "کہو بی تتلی کہاں کے ارادے ہیں —؟"

تتلی نے ہنس کر سلام کا جواب دیا اور کہنے لگی — "میں پرسوں سے اس باغ میں آئی ہوں لیکن آج تک میں نے اتنی خوب صورت کلی نہیں دیکھی۔ آج مدت کے بعد اس نازک کلی نے میرا من موہ لیا۔ نہ ڈر اے پیاری کلی میں تجھے نقصان نہیں پہنچاؤں گی تو مجھے بھی اپنا دوست بنالے —"

کلی نے جب یہ میٹھی میٹھی باتیں سنیں تو پتوں کی اوٹ سے باہر نکل آئی اور وہ تینوں دوست بن گئے —

صبح تب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کلی کو گدگدا کر جگاتی اور شبنم اس کا منہ دھلاتی تو کلی کا چہرہ چمکنے لگتا پھر بھونرا اٹھتا اور پھر تتلی تب تینوں مل کر سیر کرتے۔

کچھ دن یوں ہی گزرے۔ ایک دن انھیں باغ کے آخری کونے سے اچانک کسی کے گانے کی آواز آئی۔ میٹھی اور سریلی آواز! کلی چونک گئی۔ اس نے اپنے دوستوں کو بھی وہ گیت سنایا۔ بھونرے نے کلی کو اپنی پیٹھ پر بٹھالیا اور اس میٹھے گیت کی تلاش میں نکلے۔ تتلی سندیسہ لائی اور انھیں ایک بلبل نظر آیا جو ایک خوب صورت گلاب پر بیٹھا گا رہا تھا۔ کلی کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ اس نے گانا بند کر دیا۔ اڑ کے کلی کے پاس آیا۔ کلی ڈر گئی۔ لیکن بلبل نے کہا — "اے میری ننھی شہزادی خوف نہ کھا۔ میں تجھے نقصان نہ پہنچاؤں گا۔ اس باغ میں واقعی تو سب سے خوب صورت ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ تیری جیسی نازک اور خوب صورت کلی اس باغ میں ہے۔ آج تو کلی ہے لیکن کل جب تو ایک خوشنما پھول بن جائے گی تو مجھے مت بھولنا۔ میں تیری خوب صورتی کے گیت گاؤں گا۔

ور سارا باغ جھوم جائے گا۔"

اس روز سے بُلبُل بھی کلی، بھونرے اور تتلی کا دوست بن گیا۔ چاروں دوست مزے سے رہنے لگے۔ کلی، بھونرا، تتلی اور بُلبُل۔ کچھ دن اور بیتے۔ پھر ایک صبح جب بھونرا اٹھا تو کلی اپنی جگہ نہ تھی۔ اس نے تتلی کو اٹھایا۔ وہ رونے لگی۔ دونوں نے تلاش شروع کی لیکن کلی نہ ملی۔ پھر بُلبُل آیا۔ وہ یہ سن کر پریشان ہوگیا۔ اس نے اڑ اڑ کر باغ کا کونا کونا چھان مارا لیکن کلی کا پتہ نہ ملا۔ تینوں نے ایک ایک پھول سے پوچھا لیکن کوئی کلی کا پتہ نہ بتا سکا۔ آخر کار ایک ننھا پودا جو کلی کے پاس ہی رہتا تھا کہنے لگا — "سنو، میں بتاؤں —" تینوں دوست بے چینی سے سننے لگے۔ پودے نے کہا — "آج بہت صبح جب ہم سب سو رہے تھے ایک شخص آیا اور ننھی کلی کو توڑ لے گیا۔ کلی نے بہت غل مچایا لیکن کوئی نہ اٹھا۔ آخر کار بہت ہی رنجیدہ اور غمگین وہ اس شخص کے ساتھ چلی گئی اور جاتے جاتے کہہ گئی کہ میرے دوستوں کو میرا سلام پہنچا دینا اور کہنا غفلت کا نتیجہ ہمیشہ برا ہوتا ہے جب کسی چیز کو اپنی حفاظت میں لو تو اس کی پوری طرح خبر گیری کرو جب بھی فرض سے غفلت کرو گے بہت نقصان اٹھاؤ گے"!!

تینوں دوست رو پڑے — انھوں نے اپنے سر جھکا لیے اور خاموش چلے گئے۔ نہ جانے کہاں —!

شاید کلی کی تلاش میں — لیکن کھوئی ہوئی چیزیں بہت کم واپس ملتی ہیں۔ شاید بھونرا اور تتلی اب بھی اُسی کلی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور بُلبُل غمگین گیت گاتا ہے۔ پر وقت گزر جانے کے بعد یہ ساری کوششیں کتنی لاحاصل۔!!

جناب عابد اظہر

ہر مال ملے گا ۔۔۔۔۔؟

ہر قسم کا تیار ہے مال آؤ عزیزو !
"آرڈر کرو بک" اور ابھی لکھواؤ عزیزو !
گھر بیٹھے جو چاہو ، وہی بن جاؤ عزیزو !
چھوٹا سا تخلص رکھو ، چھپواؤ عزیزو !

بننا ہو جو شاعر تو غزل مجھ سے منگا لو

شاعر بھی ہوں ، ناظم بھی ہوں ، نثار بھی ہوں میں
غالب بھی ہوں ، آتش بھی ہوں ، سرشار بھی ہوں میں
فن خیز بھی فن ساز بھی فن کار بھی ہوں میں
کیا عرض کروں ، ان دنوں بیکار بھی ہوں میں

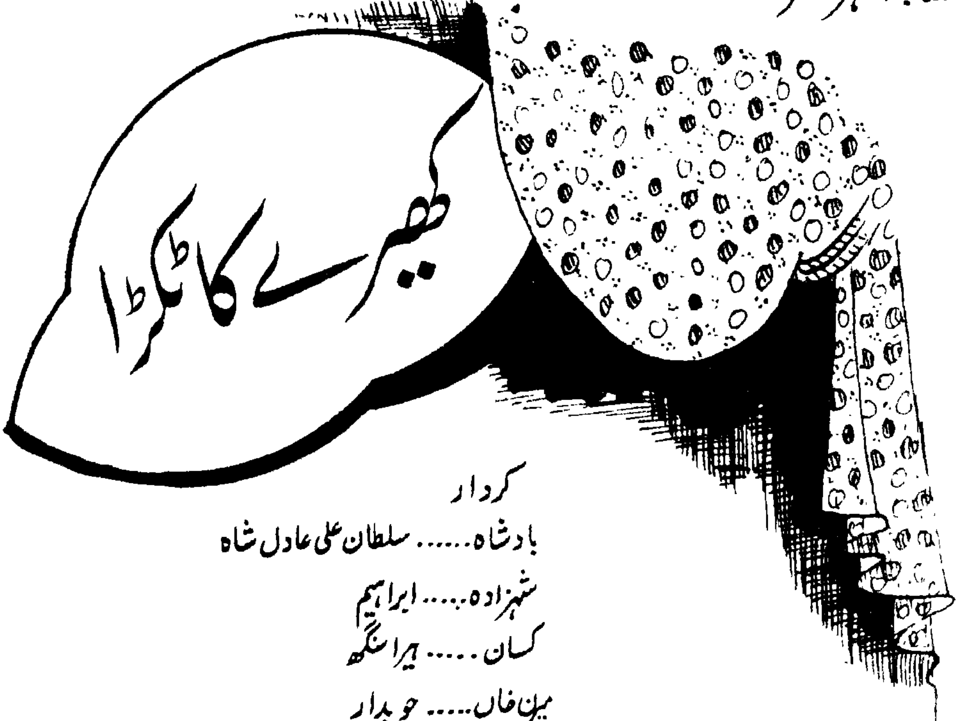
افسانہ لکھانا ہو تو افسانہ لکھا لو

منھ پھر گیا غالب کا ، وہ مضمون لکھا ہے ؟
دنیا میں جواب اس کا کوئی دے نہ سکا ہے !
دیوان جو غالب کا ہے میرا ہی کہا ہے !
اس چھوٹے سے مضمون میں ثابت یہ کیا ہے ؟

مضمون لکھانا ہو تو مضمون لکھا لو

جناب اظہر افسر

کھیرے کا ٹکڑا



کردار

بادشاہ..... سلطان علی عادل شاہ

شہزادہ..... ابراہیم

کسان..... ہیرا سنگھ

میرن خاں..... چوبدار

آج سے کوئی چار سو سال پہلے کی بات ہے کہ بیجاپور کے بادشاہ سلطان علی عادل شاہ کا بھتیجا شہزادہ ابراہیم بیجاپور کے ایک محل ماہ برج کی چھت پر ٹہل رہا تھا کہ اسے آواز سنائی دی

میرن خاں : خداوند نعمت، نوشیروانِ ثانی، حاتم دوم والئ بیجاپور، سلطان علی عادل شاہ۔ محل ماہ برج میں تشریف فرما ہو رہے ہیں۔

(ازرق برق لباس پہنے سلطان علی عادل شاہ داخل ہوتا ہے۔ شہزادہ ابراہیم ٹہلتا ٹہلتا رک جاتا ہے اور بادشاہ کو تسلیمات بجالاتا ہے)

شہزادہ : تسلیمات بجالاتا ہوں چچا حضور۔

بادشاہ: سلامت رہو۔ سدا خوش رہو۔ ابراہیم شاہ۔

شہزادہ: چچا حضور۔

بادشاہ: ہم جب بُرج میں داخل ہوئے تو تم مسکرا رہے تھے۔۔

شہزادہ: گستاخی معاف ہو چچا حضور، غلام اس وقت بھی مسکراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔

بادشاہ: کیا بات ہے؟

شہزادہ: چچا حضور نے آج صبح ایک شخص کو حکم دیا تھا کہ وہ جس قدر دولت شاہی خزانے سے لے جانا چاہتا ہے، لے جائے۔

بادشاہ: ہاں ابراہیم، ہم تو بالکل بھول گئے تھے کیا ہوا اس غریب کا؟

شہزادہ: حکم عالی کے مطابق اسے شاہی خزانے پر پہنچا دیا گیا، وہاں اس نے بڑے سوچ بچار کے بعد ہزار ہزار ہُنوں کے بیس توڑے اپنے سر اور کندھوں پر اٹھائے۔ لیکن ـــ

بادشاہ: لیکن ـــ؟

شہزادہ: لیکن اس بوجھ کے بعد وہ اپنی جگہ سے حرکت ہی نہ کر سکا۔

بادشاہ: پھر ـــ؟

شہزادہ: پھر چچا حضور، اُس نے ایک ایک کر کے چار توڑے اپنے سر سے اتارے تب بھی وہ اس قابل نہ ہو سکا کہ باہر نکل جائے۔ لاچار ہو کر دو توڑے اُس نے اور کم کیے۔ پھر سولہ وزنی اشرفیوں سے بھرپور توڑے لے کر وہ سسکتا رینگتا کسی طرح شاہی خزانے سے باہر نکل آیا۔۔

بادشاہ: (قہقہہ لگاتا ہے) خوب بہت خوب۔

(میرن خاں چوبدار ہاتھ باندھے حاضر ہوتا ہے)

شہزادہ: کیا کہنا چاہتے ہو میرن خاں؟

میرن خاں: ہیرا سنگھ درِ دولت پر کھڑا ہے شہزادہ سلامت۔

شہزادہ: اس سے کہو پھر کسی وقت آئے۔ اگر وہ کچھ لایا ہے تو شاہی توشہ خانے میں جمع کروا دو۔

بادشاہ: کون آیا ہے ابراہیم شاہ۔

شہزادہ: ایک کسان ہے چچا حضور اپنے کھیت

کی کچھ ترکاری خدمت عالی میں پیش کرنا چاہتا ہے۔

بادشاہ: میرن خاں، اسے یہیں بلالو۔

شہزادہ: یہاں چچا حضور؟

بادشاہ: ہاں ہاں کیا حرج ہے دیکھیں وہ کیا ترکاری لایا ہے، کون ہے یہ کسان۔

شہزادہ: ہیرا سنگھ اس کا نام ہے چچا حضور۔ فصیل کے باہر اس کے کچھ کھیت ہیں۔

بادشاہ: جاؤ میرن خاں، ہیرا سنگھ کو یہیں بھیج دو۔

(میرن خاں چلا جاتا ہے)

شہزادہ: پچھلی دفعہ لڑائی میں فوجوں کے گزرنے کی وجہ سے ہیرا سنگھ کے کچھ کھیت اجڑ گئے ہیں۔ اور گولہ بارود کے پھٹنے سے زمین کھیتی کے قابل نہیں رہی ہے۔ اب بڑی تھوڑی سی زمین پر جو اس کے قبضے میں ہے اس پر یہ ترکاریاں بو کر گزر بسر کرتا ہے۔

(ہیرا سنگھ سر پر ایک بڑا سا ٹوکرا اٹھائے ہوئے ہانپتا ہوا داخل ہوتا ہے)

بادشاہ: آؤ آؤ، ڈرو نہیں۔ تمھارا کورنش ہم نے قبول کیا۔ ٹوکرا نیچے رکھ دو۔

(ہیرا سنگھ ٹوکرا سر سے اتار کر نیچے رکھتا ہے۔)

بادشاہ: کیا ہے اس ٹوکرے میں۔

کسان: میں بہت گریب آدمی ہوں حجور۔ تھوڑی سی جمین (زمین) پر ترکاری بولیتا ہوں اب کے کچھ کھیرے اور ککڑیاں ہوئی ہیں۔ وہ میں حجور کے لیے.....

بادشاہ: خوب بہت خوب۔ یہ تو بہت نرم اور کنولی کنولی ککڑیاں ہیں۔ بہت عمدہ کھیرے



ہیں۔خوب۔ ہیرا ہمارے لیے کھیرا لایا ہے۔
لو اپنے ہاتھوں سے ہمیں ایک کھیرا چھیل
کردو۔

کسان: اوہ۔ حجور آپ نے ایک کنکڑ کو سورج
کا درجہ دے دیا۔ میں اور حجور آپ کو۔۔۔

بادشاہ: ہاں ہاں ایسے تروتازہ کھیرے دیکھ کر
کون ہے جو چکھے بغیر رہ سکے۔ تم چھیلو۔
(ہیرا سنگھ کمر سے چاقو نکال کر ایک
کھیرا چھیلتا اور ٹکڑے دونوں ہاتھوں
پر رکھ کر پیش کرتا ہے۔)

بادشاہ: ہاں ہاں لاؤ۔ ریورے ٹکڑے لیتا
ہے) واہ خوب (کھاتا جاتا ہے اور تعریف
کرتا جاتا ہے) واہ۔ ابراہیم شاہ۔ بہت
عمدہ کھیرا ہے جیسی رنگت ویسا ہی مزہ۔

شہزادہ: چچا حضور۔

بادشاہ: ہم نے تمھاری موجودگی میں کوئی چیز
اکیلے نہیں کھائی۔

شہزادہ: لیکن چچا حضور۔

بادشاہ: اس وقت کھیرے کے یہ ٹکڑے تمھیں
نہیں ملیں گے۔ سب کے سب ہم کھائیں
گے۔ واہ خوب بہت مزیدار ہیں ہیرا سنگھ۔

کسان: حجور۔

بادشاہ: ہم تمھارے اس تحفے سے بہت خوش
ہوئے۔ آج ہمارا جی کئی دنوں سے ایسے
تازہ تازہ کھیروں اور ککڑیوں کے لیے
ترس رہا تھا ہم چاہتے ہیں اس محل کے
شمال میں جو زمین ہے تم اس پر کاشت
کرو۔

کسان: حجور۔

بادشاہ: ہاں ہاں یہ ساری زمین آج سے تمھاری
ہے ــــ امیر خاص سے تم اس کی حدیں معلوم
کرلینا۔ کافی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

کسان: حجور۔ حجور مجھے بول نہیں ملتے کریں کیا کہوں
حجور۔ حجور ہم گریبوں کے سر پر ہجاروں
سال سلامت رہیں۔ حجور نے مجھ پر وہ
دیا کی ہے جسے میری اولاد کی اولاد اور
اس کی اولاد بھی نہیں بھول سکتی۔

بادشاہ: میرن خاں۔ ہیرا سنگھ کو امیر خاص
کے پاس پہنچا دو۔ جاؤ، ہیرا سنگھ جاؤ۔
(ہیرا سنگھ جھک جھک کر سلام کرتا ہوا چلا
جاتا ہے)

بادشاہ: ابراہیم شاہ۔

شہزادہ: چچا حضور۔

بادشاہ: کھیرے کا ایک ٹکڑا بچ رہا ہے اگر چاہو تو تم بھی چکھ سکتے ہو۔

شہزادہ: حکم عالی میں کبھی نہیں ٹال سکتا۔

بادشاہ: تو پھر لو۔ چکھو (ایک ٹکڑا شہزادہ کو دیتا ہے)

شہزادہ: (بڑے ادب سے ٹکڑا لیتا ہے اور چکھتا ہے پھر بُرا سا منہ بنا کر) چچا حضور یہ تو....

بادشاہ: کیا ہوا۔

شہزادہ: گستاخی معاف ہو چچا حضور۔ یہ تو زہر ہو رہا ہے، نہایت کڑوا ہے۔ ایک ٹکڑے نے حلق تک کڑوا کر دیا۔ اف (تھوکنے لگتا ہے) کوئی ہے۔ پانی لاؤ۔ اور آپ نے چچا حضور سارا کھیرا نوش فرمایا۔ اف!

بادشاہ: ابراہیم شاہ۔ آہستہ آہستہ۔ کہیں میری ماں یا کوئی اور نہ سن لے اور بات اس کسان تک نہ پہنچ جائے۔ ہم کبھی تمھیں کھیرے کا یہ ٹکڑا نہ دیتے۔ لیکن تم ہمارے خون ہو، ہمارے بھتیجے ہو۔ ہمارے کوئی اولاد نہیں۔ ہمارے بعد یہ حکومت تمھیں سنبھالنی ہے۔ تمھیں ہی اپنی رعایا کا دل موہنا ہے۔ تمھاری طرف سے کبھی کسی وقت ایسی کوئی حرکت نہ ہونی چاہیے جس سے ان غریبوں اور محتاجوں کے دل کو ٹھیس لگے جن پر تم حکومت کرتے ہو۔ سب سے بڑا بادشاہ وہی ہے جو حکومت اور ظلم سے نہیں محبت سے دلوں کو جیتا ہے۔ ہر مذہب اور طبقے کے لوگوں کو اپنا سمجھتا ہے۔ آؤ ہم نے تمھارا منہ کڑوا کیا ہے نا اب میٹھا بھی کر دیں۔ آؤ۔

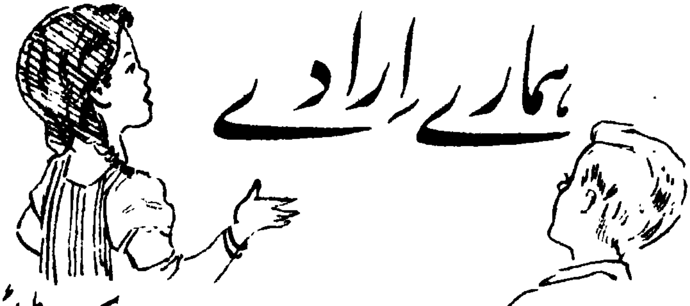
(بادشاہ آگے آگے اور شہزادہ پیچھے پیچھے اسٹیج سے باہر چلے جاتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)



جناب زین العابدین راہی دھولیوی

ہمارے ارادے



اپنا مقصود جب تک نہ پائیں گے ہم
سختیاں راستوں کی اٹھائیں گے ہم

راہ اپنی قدم دو قدم کی نہیں
آسمانوں کو منزل بنائیں گے ہم

اب نہ ہوگا جہاں میں یہ ظلم و ستم
پیار کرنا سبھی کو سکھائیں گے ہم

سینچ کر اپنے خوں کی ہر اِک بوند سے
ہر بیاباں کو گلشن بنائیں گے ہم

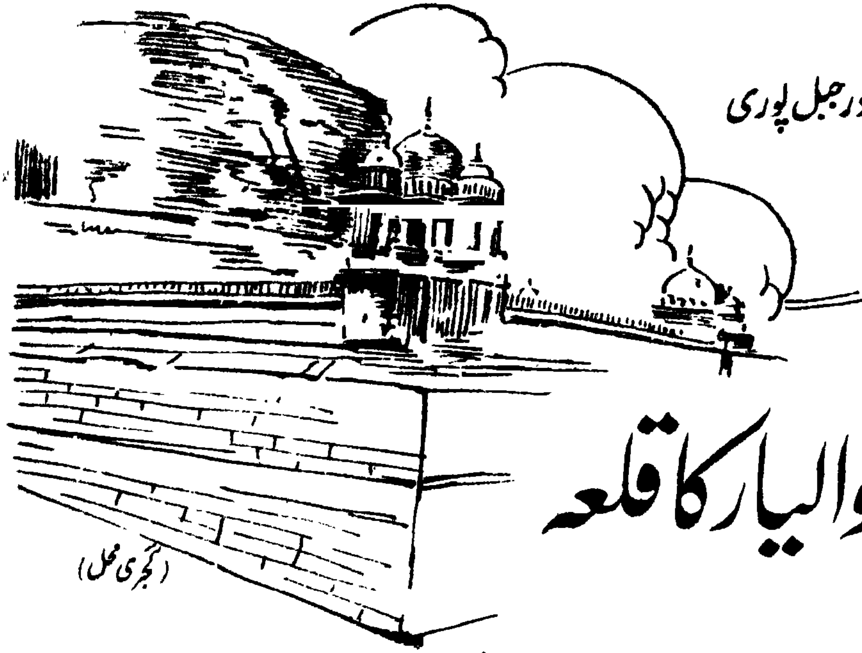
کرکے خدمت سدا ملک اور قوم کی
اِک بڑا نام دُنیا میں پائیں گے ہم

لاکھ بجلی گرے بھی تو کچھ غم نہیں
پھر بھی اپنا گلستاں سجائیں گے ہم

پیار "اردو" سے ہے، اس زباں کیلیے
جان تک اپنی راہی لُٹائیں گے ہم

جناب خاور جبل پوری

گوالیار کا قلعہ


(گجری محل)

ہندوستان کی مشہور تاریخی عماتوں کی طرح گوالیار کا قلعہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ جب آپ دہلی سے بمبئی یا بمبئی سے دہلی کے لیے سفر میں، ریل کی کھڑکی سے باہر قدرتی حسین منظروں کی سیر کر رہے ہوں گے، تو گوالیار کا اسٹیشن آنے سے پہلے ہی، دور سے مغرب کی طرف ایک اونچی اور لمبی پہاڑی پر کچھ عمارتیں نظر آئیں گی۔ یہی گوالیار کا وہ مشہور قلعہ ہے۔ جس کا ذکر اہمیت اور تفصیل کے ساتھ تاریخی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

یہ قلعہ تین سو فٹ اونچی، دو میل لمبی اور کچھ کم آدھا میل چوڑی بندھیا چل کی ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ سامنے ہی قلعے کے کوٹ میں ایک بڑا سا ڈراؤنا پھاٹک اپنا منہ کھولے کھڑا ہے۔ یہ اتنا اونچا اور اتنا چوڑا ہے کہ ایک ساتھ دو ہاتھی آسانی کے ساتھ اس میں سے نکل جاتے ہیں۔

قلعے کے اندر ایک ٹیڑھی میڑھی سڑک نکلی ہے جو چھوٹی پہاڑی کی سڑک سے جا کر مل گئی ہے۔ اس قلعے میں بنے ہوئے ساس بہو کے مندر، بھگوان کی مورتیوں اور پرانے زمانے میں بنے

ہوئے جین مندروں کے ساتھ ہی مسلمان بادشاہوں
کے بنوائے ہوئے مندر بھی موجود ہیں۔

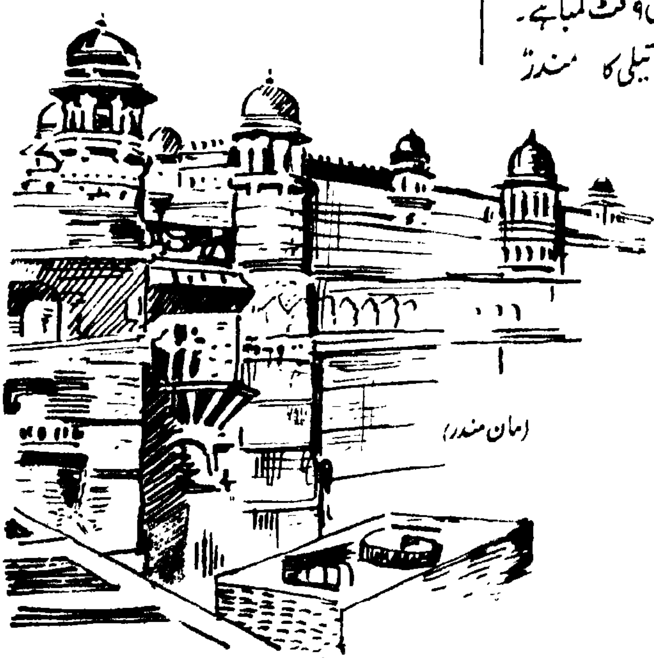
جہاں ہمایوں کا محل بنا تھا وہیں مان سنگھ محل کے شمالی حصے میں دو سو نوے فٹ لمبا اور ایک سو اسی فٹ چوڑا جہاں گیری مندر بنا ہوا ہے۔

جین دھرم کے پیشواؤں کی کچھ مورتیں دو سو فٹ کی ہیں جو ابلورا کی مورتیوں کی طرح جالیوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک مورتی ۵۷ فٹ کی ہے جس کا ایک پاؤں ۹ فٹ لمبا ہے۔

قلعے کے مغربی حصے میں "تیلی کا مندر" ہے جسے کسی تیلی نے بنوایا تھا۔ یا تلنگانہ (فوجی سپاہیوں) کا نام بگڑ کر تیلی رہ گیا ہوگا ___ اس مندر کی اندرونی سجاوٹ پرانی ہندوستانی تہذیب اور تعمیری فن کا اچھا نمونہ ہے۔

اس قلعے پر سلطان محمود غزنوی اور دوسرے مسلمان بادشاہوں کا بھی قبضہ رہا ہے۔ تیموری حملوں کے وقت تونور راجپوت قابض ہوگئے تھے۔ شیر شاہ اور اس کے بیٹے اسلام شاہ نے اس قلعے کو پایۂ تخت کی حیثیت دی تھی۔ پھر یہ کبھی جاٹوں اور کبھی مرہٹوں کے قبضے میں چلا گیا اور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۶ء تک انگریزوں کے قبضے میں رہا۔

۱۸۵۷ء میں غدر کی لڑائی کے وقت جھانسی کی مشہور رانی لکشمی بائی نے گوالیار سے ہی انگریزوں کے خلاف آخری جنگ کر کے اپنی جان دی تھی۔ رانی لکشمی بائی کا مجسمہ اس کی



(مان مندر)

یادگاریں اس جگہ نصب ہے۔

مہاراجہ جیواجی راؤ سندھیا نے کافی خرچ اور بڑی کوششوں سے ایک حصہ (مُرار جس میں انگریزی چھاؤنی تھی) اور قلعہ انگریزوں کے چنگل سے نکال کر اپنی ریاست میں ملالیا تھا۔

یہ قلعہ بہت زیادہ مضبوط ہے اس کی برجوں سے بندوقوں اور توپوں کے ذریعہ دشمن کی فوج پر حملہ کیا جاتا تھا۔

اس قلعہ کا مشرقی دروازہ گوالیار کی بستی میں ہے۔ قلعے کے اوپر جاکر دیکھنے سے بستیاں (گوالیار، مُرار، لشکر) اچھی طرح سے نظر آتی ہیں۔ اتنی اونچائی سے دیکھنے پر گوالیار ایک چھوٹا سا محل نظر آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی عمارتیں، بونے سے آدمی، سکڑی ہوئی سڑکیں اور ان پر کھلونے کی طرح رینگتی ہوئی موٹریں۔ گوالیار کے مشہور بزرگ محمد غوث گوالیاری کا مزار۔ پرانے زمانے کے چھوٹے چھوٹے باغ۔ مسجدیں اور مندر فریم میں جڑی ہوئی تصویروں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔

اس قلعے میں راجہ مان سنگھ کے بنائے ہوئے مان مندر کی صنعت کاری دیکھنے کے قابل ہے، مان محل کے اوپر خوب صورت برجیاں بنی ہوئی ہیں اور اس کی دیواروں پچی کاری کے دل کش نمونے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رنگین اور قیمتی پتھروں کے خوشنما نگینے دیواروں پر جڑ دیے گئے ہیں۔

پرانے زمانے کے راجاؤں نے گرمیوں میں آرام کرنے کے لیے ہمیشہ ٹھنڈے رہنے والے کئی تہہ خانے بنوائے تھے۔ ان تہہ خانوں سے مغل شاہی دور میں قید خانوں کا کام بھی لیا گیا ہے۔

قلعے میں ایک بادل محل (ہنڈولا دوار) بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ بادل محل کے دروازے پر ایک بڑا جھولا تھا اور قلعے میں آنے جانے والے اس پر جھولا کرتے تھے۔

اس قلعے سے متعلق کچھ دلچسپ کہانیاں بھی سنی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ قلعے کو ہزاروں سال پہلے جنات کے فولادی ہاتھوں نے راتوں رات تعمیر کیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اس سے پیشتر یہاں ایک پہاڑ اور گھنا جنگل تھا اور اس پہاڑ پر گوالیا نامی بہت بڑے مہاتما رہتے تھے۔ شاید اسی

مناسبت سے یہاں کی بستی کا نام گوالیار مشہور ہو گیا ہے۔

ایک دن اس گھنے اور ڈراونے جنگل میں کوئی راجہ شکار کھیلتا ہوا آنکلا۔ اس راجہ نے پہاڑ پر آنکھیں بند کر کے بیٹھے ہوئے مہاتما کے درشن کر کے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور زار زار رونے لگا۔ مہاتما نے آنکھیں کھول دیں۔ راجہ نے کہا "پرماتما کی کرپا سے میرے پاس دھن دولت، عزت حکومت سب کچھ موجود ہے لیکن ایک موذی مرض (کوڑھ) نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔ علاج کرتے کرتے پریشان ہو گیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

اُس مہاتما نے قریب ہی بنے ہوئے پانی کے حوض سے تھوڑا پانی راجہ کو پلا دیا اور خدا کی قدرت سے وہ آن کی آن میں اچھا بھلا ہو گیا۔

اس خوشی میں راجہ نے اس چھوٹے حوض کو بڑا اور گہرا کرا دیا اور ساتھ ہی اپنے قبضے میں ہونے والے جنات سے رات بھر میں قلعہ بھی بنوا دیا۔

اس راجہ کا نام سورسین تھا اس لیے اس بڑے تالاب کا نام "سورج کنڈ" رکھا۔ اسی راجہ کو گوالیار کا سب سے پہلا راجہ بتایا جاتا ہے۔

اس قلعے میں رہنے والے راجہ مان سنگھ کی ہرن جیسی خوب صورت آنکھوں والی ایک گوجری رانی کا نام مرگ نینی تھا اس رانی کے لیے مان سنگھ نے گوجری محل بنوایا جو اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔

یہ رانی گوالیار سے تین میل دور "رائی" گاؤں کے ایک غریب کسان کی لڑکی تھی ـــــ ایک دن مان سنگھ شکار کی دھن میں رائی گاؤں سے ملے ہوئے جنگل میں گھس گیا۔ وہاں اس نے دو جنگلی بھینسوں کو لڑتے ہوئے دیکھا اور وہ گھوڑے سے اتر کر اُن کا تماشا دیکھنے لگا۔ اتفاق سے اس وقت ایک سڈول، خوب صورت اور تندرست لڑکی گاؤں سے ندی کی طرف آتی ہوئی نظر آئی، یہ ندی اسی جنگل میں بہہ رہی تھی جہاں راجہ جنگلی بھینسوں کا تماشا دیکھنے میں مصروف تھا۔

راجہ نے اوپر سے پکار کر کہا "وہیں رک جاؤ نہیں تو یہ بھینسے تمھیں کچل دیں گے" شاید اس لڑکی نے راجہ کی آواز نہیں سنی یا جان بوجھ کر سنی ان سنی کر گئی اور آگے بڑھ کر اپنے مضبوط

ہاتھوں سے بھینسوں کے سینگ پکڑ کر انھیں ایک طرف دھکیل دیا اور ندی سے پانی لے کر گاؤں میں واپس چلی گئی۔

مان سنگھ اس لڑکی کی ؟ اور شجاعت دیکھ کر دنگ رہ گیا اور اس لڑکی کو اپنی رانی بنانے کا فیصلہ کر لیا اور گوالیار آتے ہی سلسلہ جنبانی شروع کر دی ـــــ لڑکی نے اس شرط پر اس کی درخواست قبول کی کہ میں ہمیشہ اپنے ہی گاؤں کا تازہ اور شفاف پانی پیا کروں گی اور اپنے لیے علیحدہ ایک محل بنوا کر اسی محل میں رہوں گی۔

راجہ نے بڑی خوشی سے دونوں شرطیں مان کر اس سے شادی کر لی ـــــ قلعے میں گوجری محل بنوا دیا، اور رانی گاؤں کی ندی سے قلعے تک پانی پہنچانے کے لیے پتھر کے بڑے بڑے نل لگوا دیے جن میں سے کچھ اب بھی گوجری محل میں موجود ہیں۔

مرگ نینی ہمیشہ اپنے ہی گاؤں کی ندی کا پانی پیتی اور اسی پانی میں عطر ملا کر نہایا کرتی تھی ـــــ گوجری محل کے صحن میں خوبصورت کیاریاں اور اونچے فوارے بنائے گئے تھے۔ اور رات دن عیش و عشرت اور ناچ رنگ کی محفلیں سجائی جاتی تھیں ـــــ آج کل اس محل کو عجائب گھر بنا دیا گیا ہے۔



جناب عالم قریشی مرادآبادی

امتحان کا نتیجہ

مرے گلشن کے اے معصوم پھولو! مسکراؤ تم
بہارِ جاوداں بن کر زمانے بھر پہ چھاؤ تم

تمہارے بخت کا کاتب بھی جس کو دیکھ کر ہنس دے
خود ایسا خوشنما تقدیر کا خاکہ بناؤ تم

جہالت اور یہ تاریکیاں عالم سے مٹ جائیں
چراغِ علم کی اے نونہالو! لو بڑھاؤ تم

یقیناً محنتوں کا پھل تمہیں ہر سال ملتا ہے
مزہ جب ہے کہ ہر مضمون میں اوّل ہی آؤ تم

جو دولت بخش دی تم کو تمہارے عزمِ محکم نے
یہ دولت کیا ہے؟ اہلِ بزم کو آکر بتاؤ تم

تمہارے ہاتھ سے ہرگز نہ چھوٹے علم کا دامن
پڑھو محنت سے اپنی زندگی روشن بناؤ تم

یہ کہنا سرپرستوں سے تم اپنے اپنے گھر جا کر
کہ ہم پھر پاس ہو آئے کلیجے سے لگاؤ تم

تمنا ہے یہ عالم کی خدا ہر سال تم سب کو
کرم سے پاس کر دے قوم کا رتبہ بڑھاؤ تم

جناب مجیب احمد خاں

دِلّی دُور ہے

(۲)

نوجوان کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا۔ اس نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ مار کر کہا: "خاموش ہم پیچھے ہٹنے والوں میں نہیں ہیں۔ ہم جو کہتے ہیں کر کے بھی دکھا دیتے ہیں۔ ہم ۔ ۔ ۔ ۔"

اتنے میں نقارہ پھر بجا۔ نقیب چیخ کر کہہ رہا تھا "کہاں ہیں بہادر ماں باپ کے وہ بہادر سپوت؟ کہاں ہیں وہ ہمت والے جن کی رگوں میں ان کے جاں باز بزرگوں کا خون جوش مار رہا ہے؟ کیا اتنے بڑے مجمع میں، ان ہزاروں آدمیوں میں ایک بھی ایسا باہمت نہیں جو ظلّ سبحانی شہنشاہ جہاں گیر کے اس فرمان کو بجا لائے؟"

اور دوسرے لمحے ایک طرف ہلکا سا شور ہوا۔ ایک نوجوان مجمع کو چیرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہی نوجوان ——— سر اٹھائے، پُر استقلال قدموں سے نقیب کی طرف جا رہا تھا۔ لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا "پاگل ہے" کوئی کہتا "جوانی کا جوش ہے" کوئی کہتا "کسی نے سمجھایا نہیں شاید!"

اتنے میں نوجوان نقیب کے پاس پہنچ گیا اور بلند آواز سے بولا:

"میں ہوں اپنے بہادر باپ دادا کا اصلی نمونہ، میں ہوں بہادر پٹھان قوم کا ایک ادنیٰ فرد ——— مجھے مال و دولت کی ہوس نہیں، مجھے عزت و اقتدار کی پرواہ نہیں، مجھے دولت نہیں چاہیے۔ مجھے رتبہ نہیں چاہیے۔ مجھے صرف

شہنشاہ کی خوشنودی اور اپنی قوم کا وقار چاہیے۔ میں شہنشاہ کا پیغام دلّی پہنچانے اور اس کا جواب مقررہ وقت کے اندر لانے کے لیے بے چین ہوں۔"

نوجوان کو اسی وقت شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔

باہمت نوجوان کے چہرے اور اس کے عزم استقلال کو دیکھ کر جہاں گیر کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے نوجوان کے ہمت کی داد دی۔ اپنا پیغام اپنے ہاتھوں سے اس کے سپرد کیا اور وزیر کو حکم دیا کہ نوجوان کی خواہش کے مطابق اس کے زادِ راہ کا فوری انتظام کیا جائے اور شاہی قاصد کا امتیازی نشان دے کر علی الصبح رخصت کیا جائے۔

اور صبح سورج نکلنے سے بہت پہلے وہ بہادر نوجوان شاہی قاصد کی حیثیت سے دلّی کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا ہوا سے باتیں کرنے والا گھوڑا چشم زدن میں رخصت کرنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب تیزی کے ساتھ سفر کرنے کے لیے اونٹ یا گھوڑے ہی کام میں لائے جاتے تھے۔ کیونکہ ان سے زیادہ تیز رفتار کوئی دوسری سواری تھی ہی نہیں۔ آج کل کا زمانہ ہوتا تو یہ فاصلہ ہوائی جہاز کے ذریعے چار گھنٹے کے اندر ہی طے ہو جاتا۔ مگر اس زمانے میں بھلا ہوائی جہاز کہاں؟ اس وقت تو کوئی شخص یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ایک ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے جب لاہور سے دہلی تک کا سفر دو گھنٹے میں بھی طے ہو جایا کرے گا۔ پھر ان دنوں آج کل کی سی اچھی سڑکیں بھی نہ تھیں۔ ٹیڑھے میڑھے ناہموار راستے جنگلوں کے بیچ سے ہو کر گزرنا، اونچی نیچی پہاڑیوں کو پار کرنا، نہ جانے کتنی ندی نالے بیچ میں اور ان سب دقتوں کے علاوہ ڈاکوؤں اور لٹیروں کا خطرہ۔ غرض کہ اس زمانے میں سفر میں قسم قسم کی ہزاروں مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ناکوں چنے چبانا پڑتے تھے تب کہیں مسافر منزل مقصود پر پہنچ پاتا تھا۔ مگر وہ نوجوان بہادری اور ہمت کے ساتھ سفر پہ کمر باندھے، گھوڑے کی باگ ڈھیلی کیے، منزل پر منزل مارتا دلّی کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ دوپہر سے پہلے دو ایک جگہ اُترا، خود پانی پیا، گھوڑے کو بھی پلایا اور پھر سوار ——— فراٹے بھرتا آگے بڑھ گیا۔

وفادار گھوڑا برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ نوجوان اسے بار بار چمکارتا، تھپتھپاتا۔ کبھی کہتا آج میری، میرے اجداد کی بلکہ میری پوری قوم کی لاج تیرے ہی ہاتھ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے قول کو پورا نہ کرسکوں اور میرے خاندان کے نام پر حرف آجائے۔ کبھی کہتا تو نے میرے باپ کے ساتھ جو وفاداری کی ہے وہی میرے ساتھ بھی نبھانا۔ غرض اسی طرح گھوڑے سے باتیں کرتا منزل کا دھیان لگائے چلا جا رہا تھا۔

دوپہر تک اس نے آدھا فاصلہ طے کیا۔ اگلی منزل پر اُترا۔ اس کا گھوڑا بہت تھک چکا تھا۔ اس کی رفتار میں صبح والی تیزی نہ رہی تھی۔ اس لیے منزل کے داروغہ کو اس نے شاہی پروانہ دکھایا اور اپنا گھوڑا اس کے سپرد کرکے ایک دوسرا تازہ دم گھوڑا لیا۔ چلتے وقت نوجوان نے اپنے گھوڑے کو مخاطب کرکے کہا:

"وفادار ساتھی! زندگی رہی تو کل ہمارا تمھارا پھر ساتھ ہوگا"۔ یہ کہہ کر اس نے نئے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا طرارے بھرتا دلّی کی طرف سرپٹ دوڑ پڑا۔

ابھی نوجوان نے صرف تین چوتھائی سفر طے کیا تھا کہ دن ڈھلنے لگا، دھوپ کی سختی کم ہونے لگی۔ یہ محسوس کرکے سوار کچھ گھبرا سا گیا۔ گھوڑے کو چابک رسید کیا اور وہ سرپٹ دوڑنے لگا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد نوجوان نے ایسا محسوس کیا جیسے اس کا جسم شل ہو گیا ہے، پھر ایسا لگا کہ جیسے اس کے ہاتھ سے باگ چھوٹی جاتی ہو، لیکن نوجوان نے جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اگلی منزل پر اُس نے خرجی سے وہ شربت نکال کر پیا جو چلتے وقت وزیر نے اس کو دیا تھا، شربت پیتے ہی اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے جسم میں نئی جان اور طاقت آگئی ہو۔

منزل کے داروغہ نے نوجوان کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا "گھبرایئے نہیں خدا پر بھروسہ رکھیے۔ ابھی کافی وقت ہے اگر آپ اس رفتار سے چلتے رہیں گے تو سورج ڈوبنے تک دلّی ضرور پہنچ جائیں گے"۔

نوجوان کو کچھ تسکین ہوئی اور وہ ڈھلتے ہوئے سورج کو امید و بیم کی نظروں سے دیکھتا ہوا پھر سوار ہو گیا۔ ابھی اُسے ایک چوتھائی فاصلہ اور طے کرنا تھا اور سورج ڈوبنے میں صرف دو ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ وہ باگ اُٹھائے تیزی

سے دلّی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ہر منزل پر کسی نہ کسی سے پوچھ لیتا: "بھائی! ابھی دلّی کتنی دور ہے" اور لوگ اسے کوئی نہ کوئی ہمت بندھانے والا جواب دے دیتے۔ ایک منزل اور گزری، پھر دوسری، پھر تیسری ـــــ اب دلّی تک صرف تین ہی منزل کا فاصلہ رہ گیا تھا مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چوتھی منزل آنے سے پہلے گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور وہیں جان دے دی۔ سوار کے بھی معمولی چوٹ آئی۔ اب تو وہ بہت ہراساں ہوا۔ دلّی پہنچنے کی امید جاتی رہی۔ لیکن اس وقت شہنشاہ جہاں گیر کی صورت اس کی نظروں کے سامنے پھر گئی۔ اسے اپنے اس وعدہ کا خیال آیا جو چلتے وقت شہنشاہ سے کیا تھا۔ اس نے اپنی رہی سہی ہمت سے کام لیا۔ گھوڑے کو اسی حال میں وہیں چھوڑا اور پیغام سینے سے لگائے پاپیادہ آگے بھاگا۔ تھوڑی دیر میں اگلی منزل پر پہنچ گیا اور شاہی حکم دکھا کر دوسرا گھوڑا طلب کیا۔ گھوڑے کے انتخاب میں اس نے وقت گنوانا مناسب نہ سمجھا۔ جو گھوڑا آیا اس پر سوار ہو دلّی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب سورج کی کرنیں اپنی چمک بھی کھو چکی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے سورج کے چہرے پر مردنی سی چھاتی جا رہی تھی اور وہ دن بھر کا تھکا ماندہ پچھم کی پہاڑی دامن میں چھپنے کے لیے بے چین معلوم ہو رہا تھا۔ بس اب وہ ڈوبا ہی چاہتا تھا۔

نوجوان نے جو گھوڑا اب لیا تھا وہ کچھ ایسا تیز نہ تھا ایڑ پر ایڑ اور چابک پر چابک لگانے کے باوجود گھوڑا اپنی مرضی سے چل رہا تھا۔ گھوڑے کی اس حرکت پر سوار کو بہت جھنجھلاہٹ محسوس ہو رہی تھی مگر وہ مجبور تھا۔ اسے ابھی کم و بیش بیس کوس کا فاصلہ اور طے کرنا تھا۔

کچھ دور چل کر اس نے ایک راہ گیر سے پوچھا: "بھیا! ابھی دلّی کتنی دور ہے؟"

راہ گیر نے کہا: "کچھ ایسی زیادہ دور تو نہیں ہے سوار۔ ہمت سے کام لوگے تو گھڑی دو گھڑی رات گئے تک ضرور پہنچ جاؤگے۔"

سوار نے سوچا جب تین دن کا راستہ اس وقت تک طے کر لیا ہے تو پھر یہ دو تین گھڑی کا راستہ سورج ڈوبنے کے دو ایک گھنٹے کے بعد ضرور ہی طے ہو جائے گا۔ اس نے گھوڑے کی گردن کو تھپتھپا کر ایڑ لگائی اور تیزی سے دلّی کی طرف دوڑنے لگا۔

مگر جس تیزی سے گھوڑا دلّی کی طرف جارہا تھا اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ سورج پہاڑیوں کے پیچھے چھپتا جا رہا تھا۔ سوار نے ایک منزل اور طے کرلی لیکن اب سورج پچھم کی پہاڑیوں کی اوٹ لے چکا تھا۔ کسی نہ کسی طرح دوسری منزل بھی گزر گئی۔ نوجوان وقت کی کمی کے خیال سے منزل پر بھی نہیں رُکا۔ اب شفق کی سرخی بھی زائل ہونے لگی تھی، اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وقت اور راستے کا اندازہ کرنا مشکل ہونے لگا تھا۔ جیسے جیسے اندھیرا بڑھ رہا تھا نوجوان کا دل بھی بیٹھتا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رات کی سیاہی پھیلتی جا رہی ہے اور دلّی ابھی نہ جانے کتنی دور ہے۔ اگر آج نہ پہنچ سکا تو میرے ساتھ میرے اجداد کی عزّت بھی خاک میں مل جائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوگئی۔ اسے ایک بار پھر بے انتہا تھکن محسوس ہونے لگی۔ دل ڈوبنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے جسم کا ہر حصّہ شل ہو گیا ہو۔ دماغ کام نہ کر رہا ہو مگر اس حال میں بھی وہ آگے بڑھتا رہا۔ اسے امید تھی کہ بس اب وہ دلّی کی حدود کے اندر قدم رکھنے ہی والا ہے۔

یکایک راستے سے ہٹ کر ایک طرف کو اسے چراغ کی دھندلی روشنی نظر پڑی۔ اس نے گھوڑا اسی طرف موڑ دیا۔ نہ جانے کیوں؟ پاس پہنچا تو اسے ایک جھونپڑی نظر آئی جس کے دروازے پر ایک معمر عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ قریب ہی چولھے میں آگ جل رہی تھی۔ نوجوان کو شدت کی پیاس لگی ہوئی تھی۔ اس نے بڑھیا کو سلام کیا اور پانی مانگا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہی بیٹھے پانی پیا اور خالی کٹورہ واپس دیتے ہوئے بڑی حسرت کے ساتھ بڑھیا سے پوچھا:

"ماں! کیا ابھی دلّی دور ہے؟"

بڑھیا نے پوپلے منہ سے اپنے خاص لہجے میں جواب دیا۔

"نوج! دلّی دور ہے۔"

نوجوان کو امید تھی کہ بڑھیا کہے گی کہ اب وہ دلّی سے بہت ہی قریب ہے۔ لیکن بڑھیا کے جواب نے اس کی امّید پر پانی پھیر دیا اس نے سنا کہ جیسے بڑھیا کہہ رہی ہو — "ہنوز دلّی دور است" اور جیسے ہی اس کے کانوں میں بڑھیا کی یہ آواز

پڑی اس کی ہمت لوٹ گئی، اس کے اعضا نے جواب دیدیا۔ اس کے جسم کی بچی کھچی طاقت جیسے کسی نے چوس لی ہو، اس کے دماغ پر جیسے تاریکی ہی تاریکی چھا گئی ـــــ بڑی ہی خوفناک تاریکی! اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور ـــــ دوسرے ہی لمحے وہ مٹی کے بے جان تودے کی مانند گھوڑے کی پیٹھ سے زمین پر آرہا۔ اس کی ہمت، اس کے اس استقلال اور اس کے ارادوں پر موت غالب آگئی تھی۔

سوار کو اس طرح یکایک گرتے دیکھ کر بڑھیا گھبرا گئی اس نے سوار کی نبض دیکھی اور پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن محسوس کرنا چاہی ـــــ مگر زندگی کے کوئی آثار نہ پائے۔ اس نے اپنے لڑکے کو آواز دی۔ اس کا لڑکا شاہی محل کے محافظوں کے دستے میں غلام تھا اور چھٹی لے کر ماں کو دیکھنے آیا ہوا تھا جب اس نے سوار کو دیکھا تو اس کے لباس اور امتیازی نشان سے پہچان لیا کہ یہ شاہی قاصد ہے لیکن اسے حیرت یہ ہو رہی تھی کہ اتنی کم عمری میں شہنشاہ نے اس کو شاہی قاصد مقرر کر دیا تھا۔ اس نے جب سوار کی لاش کی تلاشی لی تو شاہی پیغام کا سربمہر لفافہ مل گیا۔ سوار کی لاش ماں کے سپرد کی، پیغام کو خریطے میں رکھا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر قلعہ کی طرف سرپٹ روانہ ہو گیا۔

رات کی خوفناک تاریکی پھیل چکی تھی، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا مگر یہ سپاہی راستے سے خوب واقف تھا۔ قلعہ دہلی یہاں سے صرف پانچ چھ میل دور پر تھا۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں قلعے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ شاہی پیغام دیکھ کر دربان نے قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ سپاہی اندر داخل ہوا اور ملکہ نورجہاں کے حضور میں باریابی حاصل کی۔ شاہی پیغام دیا اور نوجوان قاصد کے مرنے کی خبر سنائی۔ نورجہاں کو شہنشاہ کا محبت نامہ پا کر جتنی خوشی ہوئی تھی اس سے زیادہ افسوس اس بہادر کی موت کی خبر سن کر ہوا۔ اور جب اس نے خط میں پڑھا کہ اس نوجوان نے ایک ہی دن میں لاہور سے دہلی پہنچ جانے کا وعدہ کیا تھا تو اسے اور بھی رنج ہوا۔ یہ خیال کر کے کہ نوجوان اپنی منزل سے چند ہی میل پہلے موت کی نیند سو گیا، نورجہاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

دوسرے ہی دن علی الصبح نورجہاں نے چند سوار لاہور کی طرف روانہ کیے۔ ان سواروں نے نورجہاں کے پیغام کے ساتھ ہی قاصد کی موت کی خبر بھی جہاں گیر کو دی۔ جہاں گیر کو اس باہمت اور بہادر نوجوان کی موت کا بے حد صدمہ ہوا۔ اس کے ضمیر نے ملامت کی کہ تو نے ایک ذرا سی بات کے لیے ایسے بہادر اور جانباز انسان کو ہاتھ سے کھو دیا۔ ایسے باہمت اور بڑا استقلال آدمی سے تو بڑے بڑے کام لیے جا سکتے تھے۔ مگر اب پچھتانے اور افسوس کرنے سے کیا ہوتا ہے ——

دوسرے دن شہنشاہ کے حکم سے پورے لشکر اور سارے شہر لاہور میں بہادر نوجوان کا سوگ منایا گیا۔

اُدھر نورجہاں کے حکم سے اس نوجوان کا جنازہ شاہی شان و شوکت کے ساتھ اٹھایا گیا اور اسی جگہ دفن کیا گیا جہاں اس نے دم توڑا تھا۔ جس دن نوجوان گھوڑے کی پیٹھ سے زمین پر گرا تھا تو اس کے ساتھ اس کی امیدوں کا محل بھی ڈھے گیا تھا لیکن اس کی، اس کے اجداد کی، اس کی پوری قوم کی عزت کو چار چاند لگ گئے۔ اس کی رگوں میں بہادروں کا جوش مارتا ہوا خون تو سرد پڑ گیا تھا لیکن اس کا نام زندہ جاوید ہو گیا۔

کچھ دنوں کے بعد جب جہاں گیر دلّی لوٹا تو اس نے بہادر نوجوان کی قبر پر ایک مقبرہ تعمیر کرایا۔ یہ مقبرہ "پیک کا مقبرہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ دلّی سے پانچ میل پچھم کی جانب یہ اب بھی موجود ہے اور راہگیروں کو محبت و وفاداری کا سبق دیتا ہے۔



جناب اعجاز اختر اندور

چند پرانے سائنس داں

عزیزی اعجاز اختر کا ایک مضمون "سائنس کیا ہے" فروری کے پرچے میں چھپ چکا ہے۔ آپ نے اسے پسند کیا تھا۔ اس مضمون کا یہ دوسرا حصہ ہے۔ عزیزی اعجاز اختر کو سائنس سے بہت دلچسپی ہے۔ یہ مضمون بھی آپ یہی سمجھ کر پڑھیے کہ یہ آپ کے پیامی بھائی کا لکھا ہوا ہے۔

ایڈیٹر

ارسطو

یوں تو سائنس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ جب سے یہ دنیا بنی ہے تب ہی سے انسان چھپے ہوئے بھیدوں کو کھولنے کی جستجو کرتا رہا ہے۔

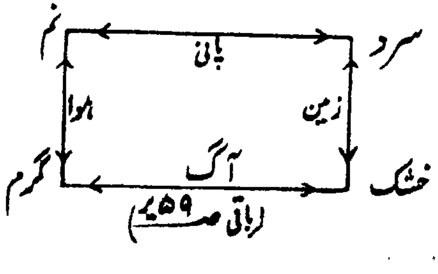
سائنس کی ابتدائی تاریخ میں ارسطو ہی وہ سائنس داں تھا جس نے سائنس کے بارے میں پہلی بار سوچ وچار کیا تھا۔ ارسطو کو لوگ فلسفی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ مگر وہ سائنسداں بھی تھا۔

فلسفی ہونے کی وجہ سے وہ ہر بات پر غور کرکے اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا اور اس نے فلسفے کے کئی اصولوں کے ساتھ سائنس کے بھی اصول بنائے۔

ارسطو مقدونیہ کے شاہی حکیم نکومس کا بیٹا تھا۔ وہ ۳۸۴ ق۔م میں یونانی شہر اسٹیگرا میں پیدا ہوا۔

وہ اسٹیگرا سے ایتھنز اس لیے آیا تھا کہ افلاطون سے فلسفہ پڑھے۔ اس وقت افلاطون

۲ سال کے لیے سمندر پار گیا ہوا تھا۔
لوگ اسے ایک باغ میں لے گئے جہاں افلاطونؔ
کے شاگرد رہتے تھے۔
مگر ارسطو وہاں نہیں رہا۔ اس نے
افلاطون کی غیر حاضری میں ایک مکان لیا اور
بہت سی کتابیں جمع کر کے ان کا مطالعہ شروع کیا۔
کہا جاتا ہے کہ ارسطو رات کے وقت سیسہ
کی ایک وزنی چیز اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا اور
اس کے بالکل نیچے ایک پیتل کا برتن رکھتا تھا۔
جب اسے پڑھتے پڑھتے نیند آ جاتی تو سیسہ
کی چیز اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پیتل کے برتن
پر گرتی اور اس آواز سے چونک کر ارسطو پھر
اٹھ جاتا تھا اور پڑھنا شروع کر دیتا۔
جب افلاطون لوٹا تو ارسطو کو بہت
ذہین پایا۔
۲۰ سال تک ارسطو اپنے استاد افلاطون
کے ساتھ رہا پھر وہ سکندرِ اعظم کو پڑھانے
کے لیے مقدونیہ بلا لیا گیا۔ اس نے سکندر کو
۱۲ سال تک پڑھایا۔ جب سکندر بادشاہ بنا
تو ارسطو ایتھنز (Athens) لوٹ گیا اور
اپنا مدرسہ قائم کیا جس میں اس وقت کے بہت
سے عالم تھے۔
بعد میں بہت سے لوگ اس سے جلنے لگے۔
ان کا کہنا تھا کہ ارسطو لوگوں کو مذہب کے
خلاف اکساتا ہے۔ انھوں نے ارسطو کو پریشان کیا۔
یہاں تک کہ وہ ایتھنز سے بھاگ گیا اور
اسی سال جنگل میں ۳۲۲ ق۔م میں انتقال کیا۔
ارسطو نے یہ اصول بنایا کہ دنیا میں صرف
چار عناصر (Elements) ہیں — زمین۔ پانی۔
ہوا اور آگ۔
اس نے اپنے اصول کا اظہار اس طرح کیا۔
ہوا نم اور گرم ہے۔
آگ خشک اور گرم ہے۔
زمین خشک اور سرد ہے۔
پانی سرد اور نم ہے۔
اس نے کہا کہ دنیا میں تمام چیزیں انھیں عناصر
کے ذریعے بنی ہیں۔ اس نے اس اصول کو ایک مستطیل
کے ذریعے دکھایا۔ یہ مستطیل ارسطو کے مستطیل کے نام
سے مشہور ہے۔ وہ یہ ہے۔



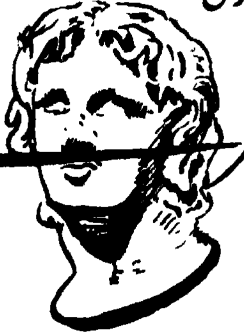
(باقی صـ۵۹ پر)

جناب سید محمد شفیع تمنّا کلکتوی

چل بنجارے ہنستا گاتا

چل بنجارے ہنستا گاتا !
سب سے اپنی پریت بڑھاتا
بھول کے ساری ریت پرانی　　　　دُہرادے اک نئی کہانی
نئے جگت سے جوڑے ناتا
چل بنجارے ہنستا گاتا
کرے سب سے بھائی چارہ　　　　یہی ایک ہو تیرا نعرہ
سب کو چل یہ گیت سناتا
چل بنجارے ہنستا گاتا
مل جائے گی تجھ کو منزل　　　　ٹل جائے گی ساری مشکل
چلتا جا تو قدم بڑھاتا
چل بنجارے ہنستا گاتا
نفرت کا ہو جہاں اندھیرا　　　　وہاں یہی بس کام ہو تیرا
بڑھ الفت کے دیپ جلاتا
چل بنجارے ہنستا گاتا

جناب شکیل جاوید امروہوی



تم میرے دوست ہو بھائی

کردار

سکندر .... مکڈونیہ (مقدونیہ) کا راجا

پورس .... جہلم کا راجا

سیلے یوکس.......... سکندر کا جرنیل

امی .... ٹیکسلا کا راجا

منظر: چاندنی رات

(سکندرِاعظم، سیلے یوکس اور امی جہلم ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے ہیں)

سکندر: "غالباً پورس پر حملہ کرنے کے لیے سب کچھ تیار ہے؟"

سیلے یوکس: "جہاں پناہ سب کچھ تیار ہے — صرف آپ کے اشارے کی دیر ہے، ہم سپاہی ہیں اور....."

سکندر: "ہاں... ہاں! ہم سپاہی ہیں لیکن اس سے پہلے ہم انسان ہیں۔ ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اپنی فوج پورس کے مقابلے میں لانے سے پہلے ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ عام انسان کے روپ میں، اس سے ملنا چاہتے ہیں"

سیلے یوکس: "مگر جہاں پناہ! یہ کیسے ممکن ہے —؟"

سکندر: "سب کچھ ممکن ہے، اگر ہم چاہیں تو.... ہم کل ہی پورس کے پاس جائیں گے اور اگر ہو سکا تو بغیر کسی

جد وجہد کے اسے فتح کرنے کی کوشش کریں گے۔"

سیلے یوکس : " لیکن جہاں پناہ ! آپ اسے اتنا طول کیوں دے رہے ہیں ۔۔۔؟"

سکندر : " اس کا دل جیتنے کی کوشش ضروری ہے، سیلے یوکس ! جاؤ ! ہمارے پہننے کے واسطے دوسرے کپڑے لاؤ۔ ہم داڑھی بھی لگائیں گے ۔۔۔ ہاں ! داڑھی بھی (قہقہہ) جاؤ ! ہمارے واسطے ایک داڑھی بھی تلاش کرو، ہم نہیں چاہتے کہ پورس کو پتہ لگے کہ ہم کون ہیں ۔۔!"

سیلے یوکس : " بہت اچھا جہاں پناہ !" (سیلے یوکس چلا جاتا ہے)

امی : " سکندر اعظم ! تم پورس کو اپنی طرف کرنے میں ناکام رہو گے ۔"

سکندر : " ہاں میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوا ہوں ۔۔ میں ضرور فتح کروں گا یہ میری سرشت میں ہے، اور یہ ایک اچھی بات ہے کہ وہ تم جیسا نہیں ہے ۔۔!"

امی : " یعنی ۔۔؟!"

سکندر : " ہم اور تم صرف اپنا اپنا مطلب نکالنے کی غرض سے دوست بنے ہیں ۔ تم میری مدد اس لیے کر رہے ہو کہ میں بھی تمھاری مدد کروں یاد رکھو ! سچے دوست اپنے نجی فائدے کا اپنے ذاتی مفاد کا ہرگز خیال نہیں کرتے ۔"

امی : " لیکن سکندر ! میں تو تمھیں دوست سمجھ کر مدد کی آرزو رکھتا ہوں ۔۔۔ ہم ہمیشہ دوست رہیں گے ۔ تمھاری اس قیمتی مدد کے بعد بھی ایک دوسرے کے دوست رہیں گے ۔"

سکندر : " تم ٹھیک کہتے ہو مگر اس وقت کی دوستی تو بالکل اپنے اپنے فائدے کی خاطر ہے ۔ میں گنگا ندی تک بڑھنا چاہتا ہوں تم چاہتے ہو کہ میں پورس کو ہرا دوں ۔۔۔ اب ہم کسی اور دن یہ باتیں کریں گے، اب جاؤ سو رہو، شب بخیر ۔۔!"

امی : " سکندر اعظم کو شب بخیر !"

دوسرا سین

(دریائے جہلم پر پورس کا دربار پڑوسی سردار اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہیں ۔۔۔)

پورس : " سکندر مقدونیہ کا راجہ جہلم ندی کے دوسرے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے ! امی اس کے ساتھ مل چکا ہے ۔ اس نے اس آڑے

وقت ہمیں دھوکا دیا ہے۔"

پہلا سردار: "لعنت ہے اس پر اس نے ایک بہت بڑا اپرادھ (گناہ) کیا ہے۔"

دوسرا سردار: "بزدل ہے اس نے صرف اپنا ہی سوچا ہے۔"

تیسرا سردار: "اس نے اپنے آپ کو دیس سے آگے رکھا ہے۔"

پورس: "لیکن ہمارا کیا حال ہے؟"

سب یک زبان ہوکر: "ہم سب ہوشیار ہیں۔"

پورس: "شاباش"

سب: "مہاراج دھیراج! ہم سب ایک دل ایک زبان ہیں۔ دشمن کی فوج کے سامنے لوہے کی دیوار ہیں۔ پورس امر رہے۔"

پورس: "کیا تم سچ مچ سکندر کو پیچھے بھگانے میں میرا ساتھ دوگے؟"

پہلا سردار: "ہم سب آپ کے ساتھ ہیں،.... ہم اسے پیچھے مار ہٹائیں گے۔"

دوسرا سردار: "ہم ایک ایک کر کے لڑ مریں گے۔ خون کا آخری قطرہ بہادیں گے۔"

تیسرا سردار: "وہ ہماری زمین پر اپنا پاؤں کبھی نہ رکھنے پائے گا۔"

پورس: "حقیقت میں یہ بہادری کے بول ہیں لیکن۔۔"

(دربان داخل ہوتا ہے۔

دربان: "مہاراج! ایک آدمی باہر ڈیوڑھی پر کھڑا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں سکندر کے پاس سے آیا ہوں، کیا میں اسے اندر آنے دوں؟"

پورس: "اجازت ہے۔"

(دربان چلا جاتا ہے)

پورس: "بھئی! اب ہم سنیں گے کہ سکندر کیا کہتا ہے۔؟"

(ایک داڑھی والا آدمی اندر داخل ہوتا ہے)

آنے والا: (رقعہ دکھاتے ہوئے) "سکندر اعظم کی طرف سے پورس امر رہے۔"

پورس: (ایک سردار سے) "اس رقعہ کو لے کر پڑھو!"

سردار: (پڑھتا ہے) "جہلم کے راجہ پورس کو خوش آمدید! میں سکندر اعظم ندی کے دوسرے کنارے کھڑا ہوں اور ٹیکسلا کا راجہ امبی میرے ساتھ ہے۔ میں تمہارے دیس میں سے ہو کر گنگا ندی تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ یہ میں ضرور کروں گا۔ مجھے کوئی چیز روک نہیں سکتی، کیا ہی اچھا ہو کہ تم مہربانی

کرکے مجھے ایسا کرنے کی اجازت دو ـــ!"

پورس: "سردارو! تمھیں اس کے جواب میں کیا کہنا ہے؟"

سب سردار: "نہیں! ــ نہیں! ــ وہ ندی کو پار نہیں کرسکتا، وہ ہمارے راج سے ہرگز نہیں گزرے گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو ہم مرجائیں گے لیکن اُسے آگے نہ بڑھنے دیں گے۔"

پورس: (سکندر کے آدمی سے) "یہ ہمارا جواب ہے۔ سکندر ہمارے راج میں سے ہوکر نہیں گزر سکتا۔"

آنے والا: "کیا مجھے بولنے کی اجازت مل سکتی ہے؟"

پورس: "ہاں، ہاں! کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

آنے والا: "میں سکندر کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ جو کچھ کہتا ہے کرگزرتا ہے ـــ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اسے جانے دیجیے!"

پورس: "وہ ایسا ہرگز نہیں کرسکتا ـــ وہ ہمارے راج سے ہوکر نہیں گزر سکتا۔"

آنے والا: "مہاراج! ــ پھر سوچ لیجیے! اس سے پہلے کہ بہت دیر ہوجائے۔"

پورس: "تمھارے الفاظ مجھے خوفزدہ نہیں کرسکتے ہم نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ہم لڑتے لڑتے مرجائیں گے لیکن تمھارے راجا کو من مانی نہ کرنے دیں گے ــ، جاؤ اور اپنے راجا سے جاکر کہہ دو۔!"

آنے والا: "سکندر بہادروں کی قدر کرتا ہے لیکن..."

پہلا سردار: "وہ گھمنڈ سے باتیں کرتا ہے اگر اس کی داڑھی نہ ہوتی تو یہ شاید...!"

پورس: "نہیں! نہیں۔ سکندر ایسا کام نہیں کرسکتا، بہادر راجہ اپنے آپ کو داڑھی کے پیچھے نہیں چھپائے گا۔"

آنے والا: "تم اس کے ساتھ انصاف نہیں کررہے ہو (داڑھی کھینچ کر اتار پھینکتا ہے) میں سکندر ہوں!"

(چاروں طرف شور مچ جاتا ہے)

سب سردار: "اسے مار ڈالو ــ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردو۔!"

پورس: "نہیں، نہیں! یہ چاہے سکندر ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ ہمارے پاس اس کے سپاہی کے روپ میں آیا ہے۔ ہمیں اسے ہرگز نہیں چھونا چاہیے ـــ اگر تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہو!"

سکندر: "ہاں! میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن کیا تم سنو گے ــ؟"

پورس: "خوشی سے اگر تم سکندر کے آدمی کے

روپ میں بولو تو —"

پہلا سردار: "ہم اس کی بات سُننا نہیں چاہتے"۔

دوسرا سردار: "ہم اسے یہیں اور ابھی سزا دیں گے"۔

تیسرا سردار: "تم چلے جاؤ نہیں تو ...."

پورس: "سردارو، ہمیں اس طرح نہیں بولنا چاہیے یہ ہمیں زیب نہیں دیتا — ہم بہادر ہیں ڈرتے نہیں اسے بولنے دو"۔

سکندر: "میں سپاہی کے روپ میں اس لیے آیا تھا کہ پورس سے مل سکوں، اور اسے جان سکوں، اب ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم دوست بن سکتے ہیں اگر ...."

پورس: "سپاہی، تم واپس جاؤ!! اور سکندر اعظم سے کہہ دو کہ ہماری تلواریں اس کا جواب دیں گی"۔

سکندر: "اچھا میں اس سے یہ کہہ دوں گا"۔ (واپس جاتے ہوئے پورس کو دیکھتا ہے اور دل میں سوچتا ہے)

"میں یہ تو جانتا تھا کہ پورس کتنا بہادر ہے اور اپنے دیس سے کتنی محبت رکھتا ہے۔ پر آج مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ کتنا بڑا دل رکھتا ہے"۔ (سکندر چلا جاتا ہے)

تیسرا سین

(لڑائی کے بعد جھیلم پر سکندر کا دربار)

سکندر: "دوستو! تقدیر ہمارے ساتھ تھی اور ہم جیت گئے۔ راجہ پورس چاہے ہمارا دشمن ہو لیکن وہ ایک بہادر آدمی ہے۔ میں نے اُسے بلوایا ہے"۔

(دربان اندر داخل ہوتا ہے)

دربان: "جہاں پناہ! پورس باہر کھڑا انتظار کر رہا ہے"۔

سکندر: "اسے عزت کے ساتھ اندر لے آؤ"۔

(دربان چلا جاتا ہے)

سکندر: "دوستو! پورس اب ہمارے بھائی سینک کے روپ میں آ رہا ہے"۔

(پورس اپنا زخمی بازو ایک جھولے میں ڈالے اندر آتا ہے، سب کھڑے ہو جاتے ہیں)

سکندر: "بہادر راجہ! اب تم میرے بارے میں کیا خیال رکھتے ہو"۔

پورس: "لوگ تمھیں سکندر اعظم کہتے ہیں اور میں تمھیں "گھمنڈی سکندر" کہتا ہوں!!

مجھ سے بھی بڑے راجا تمھارے ساتھ لڑیں
گے اور شاید تم گنگا مائی تک نہ پہنچ سکو۔
پھر بھی تم مجھے بتاؤ کہ تم میرے ساتھ کیا سلوک
کرنا چاہتے ہو ـــ؟"

سکندر: "میں تم سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟"

پورس: "ہاں پوچھ سکتے ہو۔!"

سکندر: "اگر میں تمھاری جگہ پر ہوتا تو تم میرے
ساتھ کیا کرتے۔؟"

پورس: "جیسا ایک راجا لڑائی کے بعد دوسرے
راجا کے ساتھ کرتا ہے۔"

سکندر: "ہاہاہا! ـــ خوب کہا ـــ ایک راجا دوسرے
راجا کا تخت نہیں چھینتا (سکندر اعظم تخت
سے اتر کر نیچے آجاتا ہے) "تم میرے دوست
ہو، بھائی ہو ـــ اِمی! آگے آؤ! پورس کے
دوست بن جاؤ! (دونوں کے ہاتھ ملاتا ہے)
تم نے میرے ساتھ شامل ہو کر گناہ کیا،
ان لوگوں کی طرح جو میری طرح تمھارے
دیس میں آئے .... آؤ اب ایک ہو کر اپنا
فرض ادا کرو اپنے ملک کی حفاظت کرو،
اور اب میں وہاں جاؤں گا جہاں مجھے میری
تقدیر لے جائے۔ بھائی پورس! اپنی راجگدی
پر بیٹھو، یہ تمھاری ہے پورس امر رہے۔!"

پورس تعجب بھری نگاہوں سے سکندر اعظم
کی طرف دیکھتا ہے اور راج گدی پر بیٹھ
جاتا ہے۔
سکندر اعظم اور اس کے آدمی چلے جاتے ہیں!

(پردہ گرتا ہے)

(مرکزی خیال انگریزی سے)


آگ تو بجھ جائے گی مگر میری چینی کی بوریاں !!

جناب محمد امین ایم ، اے

چاند پر اُترنا

محترم امین صاحب نے یہ مضمون ہماری درخواست پر بہت محنت سے لکھا ہے۔ لونا ۹ کے کامیابی کے ساتھ چاند پر اترنے کی وجہ سے مضمون کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے یہ مضمون تین قسطوں میں چھپے گا۔ تیسری قسط میں لونا ۹ کی مفصل کہانی ہو گی۔
ایڈیٹر

سنا ہے تین سال بعد امریکہ تین خلا بازوں کو خلا میں اڑائے گا اور یہ لوگ چاند سے صرف سو میل اوپر رہ کر اس کے مدار پر چکر لگائیں گے۔ اس کے بعد حالات سازگار رہے اور منصوبہ کامیاب ثابت ہوا تو ان خلا بازوں میں سے دو اپنے اپولو جہاز یا راکٹ کو چھوڑ کر بارہ ٹن وزن کے شٹل یا خلائی ڈبے میں بیٹھ کر چاند پر اتریں گے۔ اترنے کے بعد اگر محفوظ یا زندہ و سلامت رہے تو چاند کی سطح کی چھان بین کریں گے اور اپنا کام مکمل کر کے پھر زمین پر واپس لوٹ آئیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو انسان کا پرانا خواب پورا ہو جائے گا اور چاند ستاروں کی سیر کے سلسلے میں پہلا اسٹیشن ثابت ہو گا۔

لیکن کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ چاند پر قدم رکھنے کے بعد انسان کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یوں تو سائنسداں بہت عرصے سے اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ چاند پر

رہنا سہنا اور بود و باش اختیار کر قطعی ناممکن ہے اور سائنس نے جیسے جیسے ترقی کی مصنوعی چاند، راکٹ، ٹل اسٹار اور ایکو اڑائے گئے ان میں فٹ کئے ہوئے بہت سے آلوں کی مدد سے اور نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ آج ایک نہیں سینکڑوں سائنس داں تحقیق کے مرکزوں اور بیسیوں یونیورسٹیوں میں اور صنعتی تجربہ گاہوں میں وقت کی دوڑ کے خلاف مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایسے طریقے، ذریعے اور ایسی تدبیریں اختیار کی جائیں کہ خلاباز چاند پر پہنچ کر مشکل میں نہ پڑیں یا خطروں سے محفوظ رہیں۔

اپولو کا پروجیکٹ کامیاب بنانے کے سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش ہے کہ چاند پر پہنچنے کے بعد انسان کو وہاں کے خلائی ماحول میں کیونکر محفوظ رکھا جائے گا پھر چاند میں کشش کی قوت اتنی کم ہے، اتنی کم ہے.........

..... ہلکی گیس یعنی آکسیجن اور نائٹروجن کو بھی خلا میں منتقل ہو جانے یا اڑ جانے سے نہیں روک سکتی۔ ایسی حال میں گاڈرڈ کے خلائی اڑان کے مرکز میں یہ تجربہ کر کے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ بھاری گیس یعنی کرپٹان، ذے نان، کاربن ڈائی آکسائڈ اور سلفر ڈائی آکسائڈ کو سورج سے آنے والی ہوا یعنی طاقت ور پروٹان کی لہریں (جو سورج کی شعاعوں کے ساتھ نکل کر برابر خلا میں آتی رہتی ہیں) سب طرح کی گیسوں کو صاف اڑالے جاتی ہیں۔

اس طرح چاند کے کرۂ ہوائی کے متعلق جو جدید ترین پیمایش کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاند کا ثقل زمین کے ثقل سے ایک کروڑ ارب کا صرف ایک حصّہ ہے۔

چاند کی سطح پر کتنا زبردست خلا ہے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے لیکن کسی مضبوط دھات کا بنا ہوا کیپسول یا ڈبا خلا کی چوسنے والی زبردست طاقت کو جھیل سکتا ہے اگرچہ صرف ایک شخص کے لیے لچک دار خاص یا ایرکنڈیشن خلا کا لباس بنانا جو سب طرح کی روک تھام کر سکے بہت مشکل ہے۔ مارشل خلا کی اڑان کے مرکز میں تجربہ کر کے یہ دیکھا گیا ہے کہ عام حالات میں جو دھاتیں سخت اور ٹھوس ثابت ہوتی ہیں چاند کے خلا کے ماحول میں کمزور پڑ جاتی ہیں یا تیزی سے خراب ہونے لگتی ہیں۔ پلاسٹک کے بنے ہوئے ریشے سخت ہو جاتے ہیں اور پھر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اگر ہلکی دھات کی بنی چیز

استعمال کی جائے تو دو گھنٹے کھلی فضا میں رکھتے ہی پگھلنے لگتی ہے اور اس میں گہرے گڈھے پڑ جاتے ہیں۔ اس طرح چاند کی جانچ پڑتال کرنے والا سیاح اپنے خلا کے جہاز سے باہر رہ کر جتنی دیر تک کام کرے گا اس سے اس کا لباس پگھل جانے کا اندیشہ رہے گا۔ علاوہ اس کے ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ اترتے وقت سیاح کسی گڑھے میں نہ گر جائے اور اس سے اس کے لباس میں رگڑ کی وجہ سے یا تیزی سے گرنے کی وجہ سے سوراخ نہ ہو جائیں اور پھر چاند کے خلائی ماحول میں کھلی فضا کے اندر نکل آنے میں، جو خطرہ ہے وہ اس کی لپیٹ میں نہ آجائے اور فوراً ختم نہ ہو جائے۔

ایسے حادثے کا ردِعمل صحیح صحیح بتانا ابھی ممکن نہیں ہے۔ لیکن خلا کے ایک تجربے سے ایک معنی خیز اشارہ ملتا ہے۔ چار سال ہوئے زمین سے ۹۰ میل کی بلندی پر زحل نام کے راکٹ میں اڑان کے دوران اس کی پہلی منزل سے جب سوٹن پانی یک بیک گرایا گیا تو عجیب و غریب کرشمہ پیش آیا حالانکہ اس اونچائی پر کرہ ہوائی چاند کے کرۂ ہوائی سے کئی ہزار گنا زیادہ گہرا ہے۔ ڈاکٹر ورن ہروان بران نے یہ تصدیق کی کہ پانی جیسے ہی گرایا گیا وہ سچ مچ پھٹ گیا اور ہر سمت میں پھیلنے لگا اور اس کی رفتار ایک سیکنڈ میں ایک میل سے زیادہ تھی۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خلا کے لباس میں اگر کہیں سوراخ ہو گیا تو موت کا فرشتہ سر پر نازل ہو جائے گا اور سیاح کے جسم میں جتنے بھی سیال مادے ہوں گے وہ ابخرات بن کر اڑ جائیں گے۔

ایسی ناگہانی موت سے بچنے کے لیے انجنیر اور کیمیا کے ماہرین ایسی دھاتیں معلوم کرنے اور ایجاد کرنے کے لیے برابر کوشش کر رہے ہیں جو اپنی شکل بگڑنے نہ دیں اور چاند پر پہنچ کر خدانخواستہ کسی قسم کا حادثہ پیش آجائے تو وہ جھیل جائیں اور کمزور نہ ثابت ہوں۔ اس قسم کا ایک لباس یا سوٹ بلکہ دو سوٹوں کو آزمایا جا رہا ہے۔ ایک اندرونی لباس ہے جس میں ہوا کا انتظام ہوگا کہ خلا کا مسافر سانس لے سکے۔ دوسرا لباس جھولا نما ہوگا اور ایر کنڈیشن ہوگا۔ اس طرح اُمید کی جاتی ہے کہ اگر حادثہ ہو بھی گیا تو اس کا باہری ڈھانچہ پھٹ جائے گا لیکن اندر کا لباس محفوظ رہے گا اور سیاح پر کوئی ضرب نہ آئے گی۔

چاند پر پہنچ کر دوسرا بڑا خطرہ ان گنت شہاب ثاقب کا ہے۔ یہ ہر وقت بمباری کرتے رہتے ہیں یا دھماکے کے ساتھ گرتے رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان کی لپیٹ سے کیونکر بچا جائے۔ ہماری زمین پر بھی یہ کچھ کم نہیں گرتے ہماری زمین کا کرۂ ہوائی ہمیں محفوظ رکھتا ہے لیکن چاند پر جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور شہاب ثاقب اور ٹوٹنے والے تارے دھڑا دھڑ گرتے ہیں اور ان کی رفتار فی سیکنڈ ایک لاکھ فٹ سے کم نہیں ہوتی۔ پھر ان سے کیونکر بچا جائے؟

چاند پر سوراخوں کی بھرمار ہے شہاب ثاقب نے اس کی سطح کو چھید ڈالا ہے۔ ان میں سے بعض گڑھے بہت بڑے ہیں یعنی ان کا قطر ۱۴۰ میل ہے۔ یہ دوربین سے صاف طور سے دکھائی دیتے ہیں لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ ان بھاری گڑھوں سے خلا کی تحقیق کرنے والے ماہرین پریشان نہیں ہیں۔ حساب لگا کر یہ معلوم کیا جا چکا ہے کہ سائز میں بہت بڑے بڑے شہاب ثاقب ۵۰,۰۰۰ سال میں گر کر صرف ایک بار اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ ہاں چھوٹے گڑھے زیادہ خطرناک ہیں۔ یہ دیاسلائی کی تیلی کے سرے کے برابر سے ریت کے ذرات کے برابر ہیں۔ ان کی تعداد چاند کے ایک حصے پر بہت ہے۔ خلا کی چھان بین کرنے کے سلسلے میں مصنوعی چاند اڑا کر جو اعداد و شمار جمع کیے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ چاند کے ہر مربع گز پر ایک منٹ کی قلیل مدت میں کم سے کم ۶۰ چھوٹے چھوٹے گڑھے بنتے ہوں گے۔ لیبوریٹری میں تجربہ کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے شہاب ثاقب یعنی لوہے، شیشے اور پلاسٹک کے ذروں کو ایک خاص نشانے پر ایک سیکنڈ میں ۲۳,۰۰۰ فٹ کی رفتار سے فائر کیا جائے تو اس ہلکی سی رفتار کے باوجود چھوٹے چھوٹے یہ ذرات جب ٹکراتے تھے تو اپنے قطر سے چالیس گنا چوڑا اور گہرا گڑھا بنا دیتے تھے۔

اس طرح انجینیر جن کو پہلے ہی سے معلوم ہے کہ سیاح کے سوٹ میں شہاب ثاقب اور ان کے ذرات ٹکرا کر جو چھید کرنے کی کوشش کریں گے اس کی روک تھام کے لیے ان کو توقع ہے کہ لباس میں گوندنما قسم کی کسی ایسی دھات کی گوٹ لگائیں گے کہ جیسے ہی سوٹ میں کوئی پنکچر یا سوراخ ہو وہ اپنے آپ اسی وقت جڑ بھی جائے۔ اس طرح خلاباز کو مہلت مل جائے گی۔ یا کم سے کم

(باقی صفحہ ۶۷ پر)

جناب رشید الوحیدی جامعہ

چاند پر

مدرسہ ابتدائی جامعہ ملیہ میں صبح کو ترانے کے بعد اہم خبریں سنائی جاتی ہیں، چاند پر روس کے لونا ۹ کے پہنچنے کی خبر سن کر ایک طالبہ عارفہ بیگم نے اپنے تاثرات اس طرح ظاہر کیے۔

استاد: آج ہی روس سے دلچسپ خبر آئی ہے
ساری دنیا پہ مسرت کی گھٹا چھائی ہے

روس نے چاند کی دنیا کو کیا ہے تسخیر[1]
ساری دنیا میں چھپی جس کی نمایاں[2] تصویر
کام آ ہی گئی سائنس کی آخر تدبیر
اس طرح کرتا ہے انسان بلندی کو اسیر[3]
بچو! اب چاند کی دنیا میں رہیں گے چل کر
وہیں اسکول کھلے گا وہیں بنوائیں گے گھر
یہ سڑک، کھیت یہ بازار، یہ پل اور یہ نہر
ڈالی ڈالی پہ چڑیوں کی چہک شام و سحر
یہ حسیں باغ یہ پھول اور یہ پیڑوں کی قطار
رات دن ٹیکسی، لاری کی گرج اور پکار
یہ حسیں تاج محل، لال قلعہ، شالیمار
مقبرہ شاہ ہمایوں کا، اجنتا کا یہ غار

---

[1] فتح کر لینا [2] صاف صاف [3] قابو میں کرنا

اب یہ سب چیز ہمیں چاند پہ مل جائے گی

سب بچے خوشی سے تالی بجاتے ہیں مگر ایک طالبہ خاموش کھڑی ہے اور پوچھنے پر بتاتی ہے۔

لڑکی: سوچتی ہوں یہ ستم روس نے کیوں توڑا ہے
ہائے بچوں کو کہیں کا بھی نہیں چھوڑا ہے

چاند پر جا کے چٹانوں کی کھدائی ہوگی
جنگ سرمایے کی، دولت کی لڑائی ہوگی
کہیں اک ملک کا اُس ملک پہ قبضہ ہوگا
سرحدوں پر کہیں لڑ جائے گا فوجی دستا
بادشاہوں میں کبھی جنگ کے ساماں ہوں گے
اور آپس میں کبھی صلح کے پیماں ہوں گے
جامع مسجد کہیں ہوگی تو کہیں تاج محل
برلا مندر کہیں ہوگا تو کہیں راج محل
کتنے ہی گوتم و گاندھی کا جنم ہوگا وہاں
ہوگا اکبر کوئی بابر تو کوئی شاہجہاں

آپ تو خوش ہیں کہ دنیا نئی مل جائے گی
مجھ کو یہ غم ہے مصیبت نئی سر آئے گی
چاند کے ٹیلوں کا سروے[1] نہیں ہوگا ہم سے
اپنے اسکول میں کر لیتے ہیں جانے کیسے

سوچتی ہوں کہ یوں ہی کون سی کم کٹھن تاریخ
کیسے پڑھ پائیں گے اب چاند کی لمبی تاریخ

---

[1] وعدہ [2] زمین کو ناپنا (جغرافیہ میں ہوتا ہے)



آسکر وائلڈ ترجمہ: محسن عثمانی ندوی

خود غرض دیو

ننھے بچوں کا معمول تھا کہ سرِ شام اسکول سے لوٹتے ہوئے دیو کے چمن میں پہنچ جاتے تھے اور وہاں دیر تک کھیل کود میں مصروف رہتے تھے۔

یہ بہت بڑا خوب صورت چمن تھا۔ خاص طور پر بہار کے موسم میں اس کی رعنائی دیکھنے کے قابل تھی۔ ہر طرف ہریالی اور نرم اور سرسبز گھاس تھی۔ سبز پوش میدان میں جا بجا خوش رنگ پھول ایسے خوب صورت نظر آتے جیسے نیلے آسمان میں چمکتے ہوئے ستارے۔ چمن کی ایک جانب شفتالو کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ بہار کے موسم میں ان میں رنگ برنگ کے پھول کھلتے تھے یہ پھولوں سے ڈھکے ہوئے بے انتہا خوب صورت نظر آتے تھے۔ ہر طرح کے پھل دار اور پھول دار درخت بھی تھے۔

بلبلیں چمن میں آکر بیٹھتی اور سُریلی آواز میں نغمے الاپتیں۔ ان کی مدھ بھری آوازوں کو سننے کے لیے بچے ہمہ تن شوق ہو جاتے تھے اور کچھ دیر کے لیے اپنا کھیل روک دیتے تھے۔

خدا کا کرنا ایک دن چمن کا مالک — دیو واپس آگیا۔ یہ اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا اور پورے سات برس کے بعد لوٹا تھا۔ دیو کا عالیشان محل چمن کے اندر تھا۔ دیو جب چمن میں واپس آیا تو اس نے وہاں ننھے بچوں کو کھیلتے دیکھا۔ دیو بہت خود غرض تھا۔ اس کو بچوں کا آنا اور کھیلنا سخت ناگوار ہوا۔

"خبردار! تم سب یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے زور سے گرج کر کہا۔ "یہ چمن صرف میرا ہے" یہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ صرف

میرے رہنے اور کھیلنے کے لیے ہے۔"
سنگ دل دیو کی بھیانک آواز سن کر ننھے بچے سہم گئے اور کھیل کود چھوڑ کر چمن سے بھاگ گئے۔

دیو نے چمن کے چاروں طرف اونچی دیوار بنوا لی تاکہ کوئی اندر داخل نہ ہو سکے اور دروازہ پر ایک تختی لٹکا دی جس پر لکھا ہوا تھا:—
"چمن کے اندر آنا سخت جرم ہے۔"
اب ننھے بچوں کے کھیلنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ یہ سڑک پر کھیلنے کی کوشش کرتے تھے لیکن دھول اور گرد سے ان کے کپڑے میلے اور سنگریزوں سے ان کے پیر زخمی ہو جاتے تھے۔ سڑک پر کھیلنا مشکل اور خطرناک تھا۔ اب بے چارے بچے اسکول سے واپس ہوتے ہوئے چمن کو حسرت سے دیکھتے تھے اور اس کے چاروں طرف گھومتے تھے۔ ان سہانے دنوں کو یاد کرتے تھے جب وہ چمن میں کھیلا کرتے تھے۔

"افسوس اب ہم لوگ چمن میں کبھی نہیں کھیل سکیں گے"، بچے غمگین ہو کر آپس میں کہتے تھے۔

ایک برس گزر گیا۔ پھر بہار کا موسم آیا۔ زمین کا ہر خطہ گلزار ہو گیا باغ اور راغ سرسبز اور شاداب ہو گئے۔ شگفتہ و شاداب پھولوں کی عطر میں بسی ہوئی خوشبو دور دور تک مہک اٹھی۔ پرندوں کے چہچہانے سے ہر چمن معمور ہو گیا۔ لیکن دیو کے چمن میں نہ پھول کھلے نہ بہار آئی۔ وہاں زمستانی ہوائیں شور مچاتی تھیں۔ نرم اور مخملی گھاس کے بجائے برف سے میدان ڈھکا ہوا تھا۔ درختوں میں شگوفے بھی نہیں لگے۔ ایک بار ایک باغیچے نے سر اٹھایا لیکن جب اس کی نگاہ دیوار پر لٹکی ہوئی تختی پر پڑی تو غمگین ہو کر اس نے بھی سر جھکا لیا اور روپوش ہو گیا۔ پھولوں کے تختے، پودے اور پتے برف سے ڈھکے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہار کے نہ آنے سے پورا چمن کفن پوش ہے۔ سخت سردی اور برفانی ہواؤں نے درختوں کو روپہلا بنا دیا تھا۔ اس بہار نارسیدہ چمن میں ہر وقت طوفانی ہوائیں چلتی رہتیں۔ تیز و تند ہواؤں اور ژالہ باری کے سبب سے نازک پودے اور درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہتیں۔
خود غرض اور سنگ دل دیو کو بہار نہ آنے پر سخت حیرت تھی۔ اس موسم میں ہر چمن بوقلموں پھولوں سے کفِ گلفروش بنا ہوا ہے۔ پیراہن گل

کی خوشبو سے ہر چمن معطر ہے۔ آخر صرف اسی کا چمن بہار نا آشنا کیوں ہے؟

اس کے چمن میں بہار کیوں نہ آئی؟

پھول کیوں نہ کھلے؟

دیو کو موسم پر سخت تعجب تھا۔

ہر برس بہار کے دن آتے اور گزر جاتے۔ اس کا چمن اپنی حالت پر رہتا۔ جب ہر جگہ درخت پھولوں کے بوجھ سے زمین پر جھک جاتے، پھولوں کی ڈالیاں رنگ برنگ کے پھولوں کو اپنے دامن میں لیے جھولا جھولتیں، اس چمن کے پیڑ اور پودے بے برگ و بار اور ہر پھول سے خالی ہوتے تھے۔ بادِ زمستان کے جھکڑ، برف اور اولے کے سوا پورے چمن میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔

صبح کا وقت تھا۔ معمول کے مطابق دیو بستر پر دراز تھا۔ ناگہاں اس کے کان میں سریلے نغمے کی آواز آنے لگی۔ پرندوں نے برسوں سے اس کے چمن میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ چمن سے باہر بادشاہ وقت کا جلوس گزر رہا ہوگا۔ یہ نغمہ یقیناً اسی کا ہے۔ لیکن پھر اسے اپنا خیال غلط محسوس ہوا، فوراً اٹھا اور کھڑکی سے اپنے ویران چمن کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ روٹھی ہوئی بہار چمن میں لوٹ آئی ہے۔

دیو نے پورے چمن پر نظر ڈالی۔ اسے ایک عجیب سماں نظر آیا۔ چمن کی دیوار میں ایک جگہ بڑا سوراخ تھا۔ ننھے بچے اس سے اندر داخل ہو گئے تھے اور کھیل کود رہے تھے۔ بہت سے بچے درختوں کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ درختوں نے اپنی آغوشِ باغ ہستی کے ان مسکراتے ہوئے پھولوں کے لیے کھول دی تھی۔ ننھے مہمانوں کی میزبانی کے لیے درختوں میں میٹھے اور رسیلے پھل لگ گئے تھے۔ پتوں سے بھری ہوئی بہاردار ٹہنیاں ننھے بچوں کے سروں پر اس طرح جھوم رہی تھیں جیسے مورچھل ہلا رہی ہوں۔ خوش نوا پرندوں کی زمزمہ سنجی دل کو لبھاتی تھی۔ رنگ برنگ کے پھولوں سے پھر یہ چمن "فردوس بروئے زمیں" بن گیا تھا۔

لیکن چمن کا ایک کنج ابھی تک رنگِ بہار سے محروم تھا۔ یہ چمن کا سب سے دور افتادہ حصہ تھا۔ وہاں پر پہلے جیسی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ایک خوب صورت اور بہت کمسن بچہ اپنے ساتھیوں سے الگ وہاں کھڑا ہوا تھا۔ بچہ اتنا کوتاہ قد تھا کہ وہ درخت پر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے ہاتھوں

سے درخت کی ٹہنیوں کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔
بچہ رنجیدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔
وہ رونے لگا۔

"پیارے بچے! مت روؤ اور ڈالیاں پکڑ کر اوپر چڑھ آؤ"

درخت نے کہا۔

اور پھر درخت کی ڈالیاں زمین بوس ہو گئیں۔
لیکن بچہ بہت کم سن تھا وہ جھکی ہوئی ڈالیوں کے سہارے بھی نہیں چڑھ سکتا تھا۔

اپنے محل سے دیو نے یہ منظر دیکھا اس کا دل موم کی طرح نرم ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ کتنا سنگ دل اور خود غرض تھا۔ بہار کی بے رخی اس کی سنگ دلی اور خود غرضی کی وجہ سے تھی۔ اسے آج بہار کے نہ آنے کا سبب معلوم ہو گیا تھا۔ اسے اپنی سنگ دلی اور بچوں کے ساتھ برے سلوک پر افسوس تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ اس کمسن بچے کو اٹھا کر درخت کی شاخ پر بٹھا دے تاکہ یہ حصہ بھی چمن کے دوسرے حصوں کی طرح گل بداماں اور زعفران زار ہو جائے۔ اس نے طے کر لیا کہ چمن کی دیوار کو مسمار کر دے گا اور تمام بچوں کو اس سے اندر آنے کی اجازت دیدے گا۔

دیو اپنے محل سے نکل کر چمن میں آیا۔ ننھے بچوں نے جوں ہی اسے دیکھا ڈر کے مارے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بچوں کے نکلتے ہی چمن بے رونق ہو گیا۔ پھول فوراً مرجھا گئے۔ برف کی تہہ جمنا شروع ہو گئی۔ چمن کے دور افتادہ کنج میں کھڑا ہوا سب سے کمسن بچہ دیو کی شکل نہ دیکھ سکا تھا کیونکہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اس لیے وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ دیو خاموشی کے ساتھ اس بچے کے نزدیک پہنچا۔ نرمی کے ساتھ بچے کو اٹھا کر درخت کی ایک ڈالی پر بٹھا دیا۔ اچانک درخت کا رنگ بدل گیا۔ پھول کھل اٹھے اور چڑیوں نے آکر چہکار شروع کیا۔ بچے نے دیو کو محبت بھری نگاہ سے دیکھا اور دل میں اس کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا۔ کمسن بچے کے دل میں کوئی خوف نہ تھا۔

باہر سے بچوں نے جو یہ رنگ دیکھا اور دیو کا بدلا ہوا رویہ پایا تو پھر دندناتے ہوئے چمن میں گھس آئے۔ ان کے آتے ہی بہار بھی چمن میں آگئی۔

"بچو! یہ چمن اب تمہارا ہے" دیو نے کہا
"تم یہاں شوق سے کھیلو تمہیں اب کوئی نہیں

رو کے گا"۔

چمن کی دیوار دیو نے توڑ دی تاکہ بچے آسانی کے ساتھ روز چمن میں آسکیں۔ بچوں کے دل سے ڈر نکل گیا۔ دوسرے روز جب وہ آئے تو دن بھر دیو کے ساتھ مل کر کھیلتے رہے۔ شام کے وقت جب بچے جانے لگے تو دیو نے اس کمسن بچے کو نہیں دیکھا جو کل چمن کے کنج میں رو رہا تھا۔ دیو اس بچے کو بہت زیادہ چاہنے لگا تھا کیونکہ وہ ان سب میں کم عمر اور خوب صورت تھا۔ اس نے بچوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا مگر کوئی بھی اس کے بارے میں کچھ نہ بتلا سکا۔ ان میں سے کسی نے پہلے اس بچے کو نہیں دیکھا تھا۔ دیو افسردہ ہو گیا۔ ننھے بچے روز چمن میں کھیلنے کے لیے آتے تھے لیکن وہ سب سے کمسن اور خوب صورت بچہ پھر کبھی نظر نہ آیا۔ دیو اس بچے کو یاد کرتا اور غمگین ہو جاتا۔

کئی برس گزر گئے، گل ہائے رنگا رنگ سے چمن کی زینت تھی۔ پھولوں کے جنت نگاہ جلوے اور پرندوں کے فردوس گوش نغمے بچوں کو روزانہ کشاں کشاں چمن میں کھینچ کر لے آتے تھے۔ بچے چمن میں کھیلتے رہے اور خوش ہوتے رہے۔ اب دیو بوڑھا ہو گیا تھا۔ بڑھاپے نے اس کو کمزور کر دیا تھا۔ اب وہ صرف بیٹھ کر بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھ خوش ہوتا اور بہار سے لُطف اندوز ہوتا تھا۔

سردیوں کی ایک صبح تھی، بہار ابھی نہیں آئی تھی اب ہر سال بہار اس کے چمن کو نوازتی تھی اور اس کے چمن میں سب سے زیادہ پھول کھلتے تھے۔ اچانک اس کی نگاہ کھڑکی سے چمن کے ایک کنج پر پڑی۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے دیکھا کہ موسم بہار کے شروع ہونے سے پہلے وہاں کے درخت بے انتہا خوب صورت ہیں۔ درختوں کی ڈالیاں سنہری ہیں اور ان میں چاندی کی طرح چمکتے ہوئے میوے لگے ہیں۔ سفید پھولوں سے تمام درخت لدے ہوئے ہیں۔ اور ایک درخت کے نیچے وہی کمسن بچہ خاموش کھڑا ہے۔

دیو محل سے نکل کر لپکتا ہوا اس بچے کے قریب آیا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ لیکن جو کچھ اس نے دیکھا اس کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس خوب صورت بچے کے ہاتھ پیر زخمی ہیں اور ان سے خون نکل رہا ہے۔ دیو غصّے سے سرخ ہو گیا اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

"پیارے بچے تمھیں کس نے زخمی کیا ہے؟"
دیو نے پوچھا۔ "میں اس کا انتقام لوں گا اور زخمی کرنے والے شخص کو سخت سزا دوں گا۔"
"یہ محبت اور پیار کے زخم ہیں۔"
یہ اس معصوم بچے کا جواب تھا۔ اس کے چہرے پر نور برس رہا تھا۔
دیو کے دل میں ایک عجیب سا خیال اتر گیا۔
"مگر تم کون ہو؟" دیو نے سوال کیا۔
لیکن فوراً ہی ایک خاص اندرونی احساس سے اس کا چہرہ چمک اٹھا اور اس سے قبل کہ وہ اپنے سوال کا جواب سنتا عقیدت اور احترام کے ساتھ معصوم بچے کے سامنے جھک گیا۔
معصوم بچے کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
"تم نے اے رحمدل اور مہربان دیو! مجھے اپنے چمن میں ایک بار کھیلنے دیا اس کے انعام میں اب تم کو میں اپنے ساتھ اپنے خاص چمن میں لے جاؤں گا۔ یہ جنت کا چمن ہوگا۔"
دیو نے معصوم بچے کی آواز سنی۔
دوسرے روز جب بچے اسکول سے واپس آکر چمن میں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ دیو ایک درخت کے نیچے بے جان پڑا ہوا ہے اور خوش رنگ اور خوشبودار پھولوں سے اس کا پورا بدن ڈھکا ہوا ہے۔

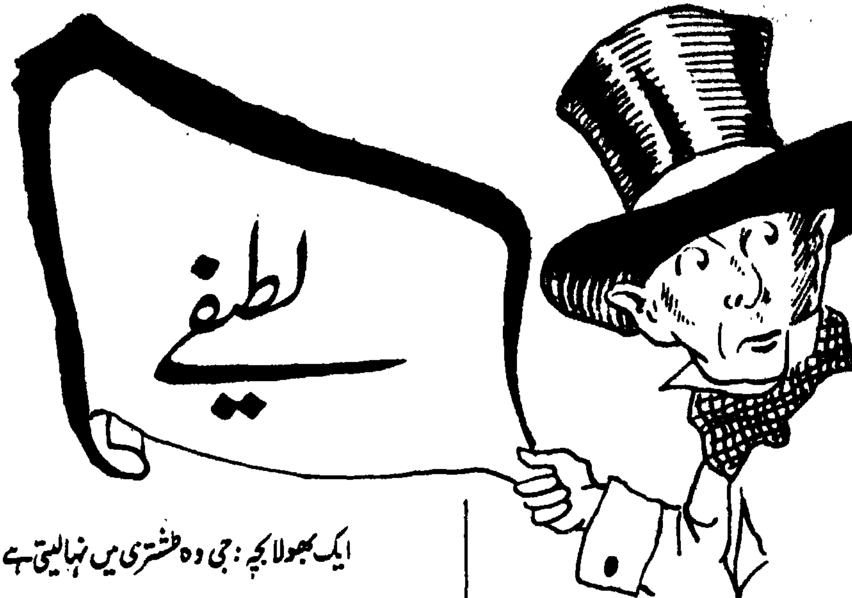
جناب سخا امروہوی

بنوں گا سپاہی

بڑھ کے میں بھی بنوں گا سپاہی
یہ میرا عہد ہے میرے بھائی
مجھ کو ہے پیار ایسا وطن سے
جیسے بلبل کو اپنے چمن سے
اس پہ آنے نہ دوں گا تباہی
بڑھ کے میں بھی بنوں گا سپاہی

ذرّے ذرّے کو سورج بنا کر
دیپ گھی کے جلاؤں گا گھر گھر
منہ چھپائے گی شب کی سیاہی
بڑھ کے میں بھی بنوں گا سپاہی

نام اونچا وطن کا کروں گا
اس کی خاطر جیوں گا، مروں گا
ہر کٹھن راہ کا بن کے راہی
بڑھ کے میں بھی بنوں گا سپاہی



ہیڈ کلرک : کیا موت کے بعد یا آخرت کی زندگی پر تمھارا عقیدہ ہے۔

کلرک : جی ہاں کیوں نہیں۔

ہیڈ کلرک : پھر تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ کل تم نے اپنے دادا میاں کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے چھٹی لی تھی۔ اور تمھارے جانے کے کچھ دیر بعد وہ خود تمھیں دیکھنے دفتر میں آئے تھے

چڑیوں کی عادتوں کا ذکر کرتے ہوئے استانی بچوں سے پوچھا اچھا بتاؤ بچو غیری کیا کر سکتی ہے میں نہیں کر سکتی؟

ایک بھولا بچہ : جی وہ طشتری میں نہا لیتی ہے۔

ماں : بڑے شرم کی بات ہے تم اسکول میں جو پڑھتے ہو گھر آتے آتے بھول جاتے ہو۔ نسیم کو دیکھو سب کچھ یاد رکھتا ہے۔

شوکت : جی امی تو میرا اسکول میرے گھر سے بہت دور بھی تو ہے۔

رشید جلا بھنا گھر میں آیا۔ امی اسے دیکھتے ہی بولیں "پھر وہی لڑائی جھگڑا" میں نے تم سے کہا تھا جب بہت غصہ آئے تو سو تک گنتی گننے لگو۔

رشید (غصے میں) جی آپ نے کہا تھا مگر نصیر کی امی تو نصیر سے کہتی ہیں تم پچاسی تک گنا کرو۔

فوجی ڈاکٹر: (نوجوان مریض سے) کیا تم سمجھتے ہو کہ اچھے سپاہی بن سکتے ہو۔
نوجوان: جی کیوں نہیں۔ مجھے ایک بندوق دے کر دیکھیے۔ کوئی میرے ہاتھ پر گولی مارے تو میں اپنے بازو سے گھوڑا دبا دوں گا۔ بازو بےکار ہو جائے تو پیر سے کام لوں گا۔ پیر میں گولی لگ جائے تو اپنے دانتوں سے بندوق چلا لوں گا۔
ڈاکٹر: بہت خوب! بہت خوب!!
نوجوان: تو آپ اب بتائیے کیا میں بزدل ہوں؟

ایک شیر نے چیتے سے حاکمانہ انداز میں پوچھا:
اس جنگل کا سردار کون ہے؟
چیتا بولا: حضور آپ۔
پھر ریچھ ملا۔ شیر نے وہی سوال پوچھا۔
ریچھ نے وہی جواب دیا حضور آپ
اتنے میں میاں ہاتھی جھومتے جھامتے اسی طرف آرہے تھے۔ شیر ان سے بھی وہی سوال کر بیٹھا۔ ہاتھی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ انھیں اپنی سونڈ میں لپیٹ دور ایک درخت پر پھینک دیا۔ جنگل کے سردار صاحب اچھے خاصے زخمی ہوگئے، کراہتے ہوئے ہاتھی کے پاس آئے بولے:- کیوں جناب آپ کو میری باتوں کا جواب نہیں معلوم تھا تو بھی یہ اکھڑپن دکھانے کی کیا ضرورت تھی!

قبرستان میں ایک گورکن کی جھونپڑی کے سامنے ایک گدھا مرا پڑا تھا۔ اس نے کہیں جاکر چنگی والوں کو فون کیا۔
چنگی والے کلرک اس سے مذاق کیا۔
ارے بھئی تو پریشانی کی کیا بات ہے۔ اسے دفن کردو تمھارا تو کام ہی یہ ہے۔
گورکن نے بہت دھیمے لہجے میں جواب دیا۔
جی حضور آپ سچ کہتے ہیں۔ پر میں نے سوچا ذرا اس کے رشتے داروں کو خبر کردوں۔

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری ضرور لکھیے ورنہ تعمیل یا جواب میں تاخیر کا امکان ہے۔

منیجر

بڑوں کی کوششیں

ٹیچرس ٹریننگ کالج کے دوسرے سال کے طالب علموں سے ان کے استاد عبدالغفار مہولی صاحب نے فرمایش کی تھی کہ اپنی زندگی کی کہانی لکھیں اور پوری آزادی سے لکھیں۔ سال دوم کے طالب علموں نے غفار صاحب کی خواہش کے مطابق مضمون لکھے۔ نمونے کے طور پر دو مضمون نیچے دیے جاتے ہیں۔ بہت دلچسپ ہیں۔ پیامی انھیں ضرور شوق سے پڑھیں گے۔

ایڈیٹر

اپنی زندگی کی کہانی

میں چراغ دہلی میں پیدا ہوئی۔ لیکن میری زندگی کا بہت وقت دہلی میں بیتا ہے۔ میں نے پانچویں جماعت تک دہلی میں تعلیم پائی ہے۔ اس کے بعد ہم سب اپنی جنم بھومی چراغ دہلی آگئے، کیونکہ ہماری جایداد یہیں پر ہے۔ میں نے چراغ دہلی میں ہی مڈل پاس کیا۔ یہاں بیسک اسکول ہے۔ مجھے اسکول اب بہت پسند ہے۔ سبھی استانیاں مجھے چاہتی تھیں کیونکہ میں اپنی جماعت میں پڑھنے میں سب سے ہوشیار تھی۔ مجھے یہ دھیان کئی بار آتا کہ اب اسکول چھوڑ کر جانا ہے تو دکھ ہوگا۔ آخرکار یہ دن بھی آگیا۔

میں نویں کلاس میں مالویہ نگر کے اسکول میں داخل ہوئی۔ یہاں کی ٹیچر سوچتی تھی کہ یہ لڑکیاں"

تو گاؤں کی ہیں انھیں کچھ نہ آتا ہوگا۔ اس نے ہمارا نام چراغ دہلی ڈال دیا۔ ہم سبھی سہیلیاں آدھی چھٹی میں یہ بیٹھ کے سوچتے کہ اس ٹیچر کی زبان سے یہ شبد کیسے ہٹائیں کیونکہ ابھی داخل ہوئے تھوڑے دن ہوئے تھے۔ میں اپنی ٹیم میں سب کی سردار تھی۔ میں کہتی کہ ایک دن آنے والا ہے جب ہم اس ٹیچر کا خیال بدل دیں گے۔

کچھ دنوں بعد ہماری پڑھائی شروع ہوئی۔ ہماری ٹیچر نے ہمیں نہرو جی کے جنم دن کے بارے میں ایک مضمون گھر سے یاد کر کے لانے کے لیے کہا۔ چھٹی کے بعد میں نے اپنی سب سکھیوں سے کہا کہ سب یہ مضمون اچھی طرح یاد کر کے آنا۔ اب موقع ہے کہ اس ٹیچر کے دل سے یہ خیال نکال دیں۔ سب کو میری بات بہت پسند آئی۔

دوسرے دن ہم سب جیسے ہی کمرے میں جاکر بیٹھے تو ٹیچر نے یاد دلانے کے لیے کہا۔ سب یاد کر کے آئے؟ ہم سب نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔ ٹیچر مضمون سننے لگی۔ سب سے پہلے انھوں نے مجھ سے سنانے کو کہا۔ اور میرے نزدیک آکر کھڑی ہوگئیں۔ اور پہلے ہی سے بولنے لگیں کہ اگر تم نے نہیں سنایا تو کھڑی کر دوں گی۔ میں نے کہا اگر مجھے نہیں آئے گا تو ضرور کھڑا کیجیے گا پہلے سن تو لیجیے۔ میری یہ بات سن کے ساری کلاس ٹیچر کی بات پر ہنسنے لگی اور ٹیچر سے میری بات کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔ میں نے دیکھتے ہی دیکھتے سنا دیا اور پھر بولی کہ آپ نے چراغ دہلی کو جیسا سمجھا ہے ویسا نہیں ہے۔ انھوں نے مجھے شاباشی دی۔ اس دن سے اُن کی زبان پر یہ شبد آیا ہی نہیں اور میری سکھیاں بولیں۔ اُرمِلا تمھاری ترکیب اچھی رہی۔ اس طرح کوئی بات نہیں ہوئی۔ اب میں ٹیچرس کالج جامعہ میں ٹیچر ٹریننگ لے رہی ہوں۔

اُرمِلا کوشک

بیسک دوسرا سال جامعہ

میری زندگی کی کہانی

سبھی لوگ اپنی اپنی زندگی کی کہانی سناتے ہیں۔ میں نے بھی کئی سے اُن کی زندگی کی کہانی سنی۔ جس نے بھی کہانی سنائی خاص طور پر اپنی زندگی کی تبدیلیاں بتائیں۔ میری زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں۔ میری عادتیں،

میری باتیں، میرا چال چلن ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔ پھر بھی اتنی تبدیلی ضرور ہوئی ہے کہ میں پہلے چھوٹا تھا اور اب بڑا ہو گیا ہوں۔ اتنی زندگی میں بہت کچھ سیکھا، کچھ تجربے کیے، اور بہت سی باتوں کا ذہن پر اثر ہوا۔ میں نے اپنی زندگی میں تعلیم پائی پہلے ابتدائی مدرسے میں پھر مڈل میں پھر ہائی اسکول میں۔ اس کے بعد کالج میں اور اب استادوں کے مدرسے میں تعلیم پا رہا ہوں۔ اگر میں بھی اپنی تعلیم اپنے تجربے اور اپنی زندگی کی باتیں کسی کو سناؤں یا لکھوں تو یہ میری زندگی کی کہانی ہوگی۔

پرائمری اسکول میں میں نے اپنے گاؤں ہی میں پڑھا۔ وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب میں پہلے دن مدرسے گیا۔ میں نے پہلے ہی دن ایک لڑکے کے ہاتھ کا انگوٹھا اپنے دانتوں سے کاٹ دیا۔ اس کی سزا میں مجھے کھونٹی پر لٹکا دیا گیا۔ کھونٹی کے نیچے اینٹیں رکھ دی تھیں کہ اگر کھونٹی چھوڑ دے گا تو اینٹوں پر پڑے گا۔ میں کھونٹی پر لٹکا روتا رہا۔ چھٹی ہونے پر گھر گیا اور جا کر کہا کہ میں مدرسے نہیں جاؤں گا۔ وہاں پر تو کھونٹی پر لٹکائے جاتے ہیں۔ پھر سمجھائے جانے پر دوسرے دن مدرسے گیا تو پھر کوئی شرارت کرنے پر پٹائی ہوئی

اس طرح میری پٹائی قریب قریب روز ہونے لگی۔ بس میرا من پڑھنے سے ہٹ گیا۔ اس کی وجہ سے میں آٹھویں جماعت میں پڑھنے سے بھاگتا رہا۔ لڑکے روز مجھے گھر سے پکڑ کر لے جاتے تھے اس طرح میں گھر میں ماں سے پٹتا اور مدرسے میں ماسٹر جی سے۔ پٹائی ہونے کے باوجود میں مدرسے میں من لگا کر پڑھتا تھا۔ اور امتحان میں اوّل آتا تھا۔ جب میں نویں جماعت میں پہنچا تو کچھ سمجھ دار ہو گیا تھا۔ اس لیے جی لگا کر پڑھنے لگا اور روزانہ مدرسے جاتا تھا۔ اس وجہ سے میں دسویں جماعت میں اوّل درجے میں پاس ہوا۔ پھر بارھویں میں لاپرواہ ہو گیا تھا کیونکہ ساتھی ہی ایسے ملے۔ اور اس وجہ سے میں بارھویں جماعت میں سوم پاس ہوا۔ میں کبھی اپنا کام پورا نہ کرتا تھا۔ یہ میری عادت بن گئی تھی۔ اور اسی عادت کی وجہ سے میں آج بھی پریشان ہوں۔ آج بھی اپنا کام وقت پر نہیں کر سکتا کیونکہ یہ میری عادت ہے۔ میں اس عادت کو چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ لیکن چھوڑ نہیں پاتا پتہ نہیں کیوں۔ میں اب استادوں کے مدرسے میں پڑھ رہا ہوں۔ یہاں پر بھی میں

اپنی اس خراب عادت کے کارن وقت پر کام نہیں کر پاتا ہوں۔ اور ہر کام میں ہر ایک سے پیچھے رہ جاتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں یہ بات سب سے خراب سیکھی۔ پتہ نہیں میں اپنی اس عادت کو چھوڑ پاؤں گا یا نہیں۔ ویسے تو زندگی کی کہانی بہت بڑی ہے۔ لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے اتنی ہی لکھ رہا ہوں۔

کرشن چندر
بیسک دوسرا سال جامعہ

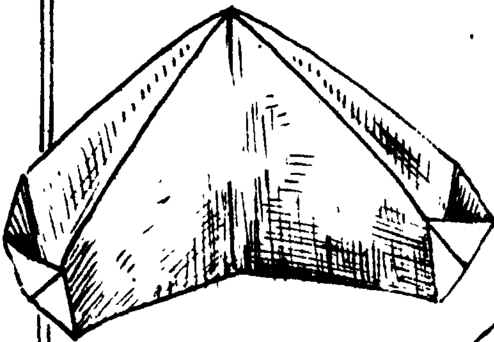
(بقایا صفحہ ۳۳ کا)

اس نے اس اصول کو اس طرح ثابت کیا۔ جب لکڑی جلتی ہے تو شعلہ آگ کی موجودگی دکھاتا ہے۔ نکلنے والا دھواں ہوا کا وجود ثابت کرتا ہے۔ اس کی آواز اور ابال پانی کی موجودگی کی گواہی دیتے ہیں۔ اور باقی ماندہ راکھ آخری عنصر یعنی زمین کی موجودگی کا اظہار کرتا ہے —

مگر بعد میں یہ ثابت کر دیا گیا کہ دنیا میں ۱۰۲ عناصر ہیں کیونڈش اور لیوا شیر نے پانی پر تجربات کر کے ثابت کیا کہ وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کا مرکب ہے۔ اور پانی ایک عنصر نہیں۔ اسی طرح رابرٹ بائل نے ہوا پر تجربات کیے۔ اور ثابت کیا کہ ہوا کچھ عنصر کا مرکب ہے نہ کہ خود ایک عنصر ہے۔

اسی طرح "آگ ایک عنصر نہیں ہے"، یہ بھی اسٹال نامی سائنس داں نے ثابت کر دیا ہے۔ اور یہ بھی ثابت کر دیا گیا کہ زمین خود ایک عنصر نہیں بلکہ کئی عناصر آکسیجن، لوہا، کیلشیم، پوٹیشیم اور سوڈیم وغیرہ سے مل کر بنی ہیں۔

اور اس طرح ارسطو کا اصول غلط ثابت کر دیا گیا۔



جناب اقبال مہدی

خاصدان بنائیے

پرانے زمانے میں بادشاہوں اور امیر لوگوں کے لیے جو کھانا خاص طور پر تیار کیا جاتا تھا اسے "خاصہ" کہتے تھے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا لیکن اس زمانے کی ایک یادگار "خاصدان" کا لفظ اب بھی استعمال ہوتا ہے۔

آج کل کچھ لوگ "خاصدان" اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کھانا رکھ کر سفر میں ساتھ لے جاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر "خاصدان" اس برتن کو کہا جاتا ہے جس میں پان کی گلوریاں رکھ کر مہمانوں کو پیش کی جاتی ہیں۔

ان دنوں پان کھانے کا رواج بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ پان کے بجائے اب لوگ سونف، الائچی اور مصری وغیرہ سے مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔

یہ چیزیں مہمانوں کے سامنے رکھنے کے لیے مختلف طرح کی خانے دار طشتریاں یا کھلے ہوئے ڈبے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایسی طشتریوں یا ڈبوں کو بھی ہم "خاصدان" کہہ سکتے ہیں۔

اِس قسم کا ایک "خاصدان" کاغذ تہہ کرکے بھی بنایا جا سکتا ہے اور چھوٹے بچوں کی دعوتوں میں بخوبی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اگر آپ بڑوں کو بھی ایسے خاصدان میں سونف، الائچی وغیرہ رکھ کر پیش کریں تو وہ نہ صرف آپ

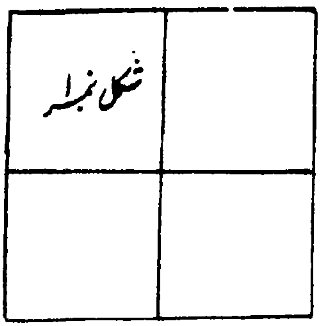
کی کاریگری کی داد دیں گے بلکہ یہ دیکھ کر اور بھی خوش ہوں گے کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے خاصدان تیار کرکے ان کی "خاص" تواضع کی ہے۔

ہر مہذب انسان اپنے مہمان کی عزت اور تواضع کرتا ہے۔

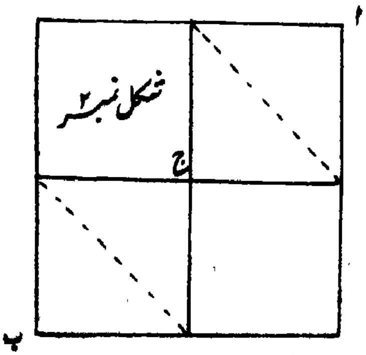
قیمتی سے قیمتی برتن استعمال کرکے بھی ہمیں وہ خوشی حاصل نہیں ہو سکتی جو اپنی بنائی ہوئی چیز استعمال کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

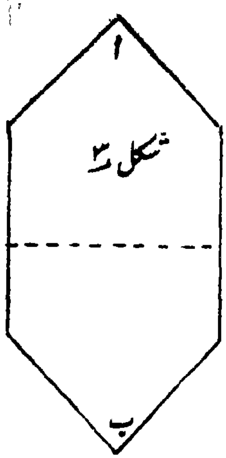
"کاغذ کا خاصدان" بنانے کے لیے آپ ذرا دبیز اور بھاری کاغذ لیجیے۔ کاغذ ایک طرف سے رنگین یا چمکدار پنّی کا ہو تو خاصدان خوشنما رہے گا۔

۱۔ مربع شکل کا کاغذ لیجیے۔ رنگین یا چمکدار سطح نیچے رکھیے۔



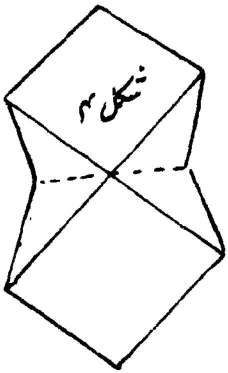
۲۔ لمبائی اور چوڑائی کے کناروں پر کاغذ کو دہرا کیجیے۔ موڑوں پر شکن ڈالیے اور کاغذ کو پھر اسی طرح کھول لیجیے۔ (شکل ۲)



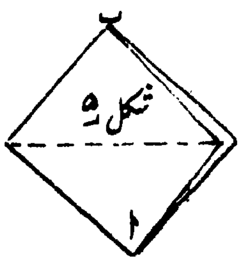


۳۔ شکل ۲ کے کونہ ا اور ب کو نقطہ دار خطوط پر موڑ کر نقطہ ج پر ملا دیجیے۔ موڑ کو اچھی طرح دبا دیجیے۔

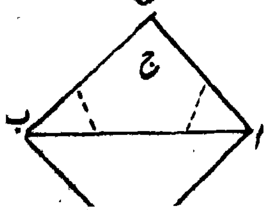
۴۔ کاغذ کو پلٹ کر رکھیے۔ رنگین یا چمک دار سطح اوپر آ جائے گی۔ شکل ۳ کے نقطے دار خط پر موڑ کر کونہ ا کو کونہ ب پر لے آیئے۔ موڑ پر شکن ڈالیے اور صرف اس موڑ کو پھر کھول دیجیے۔



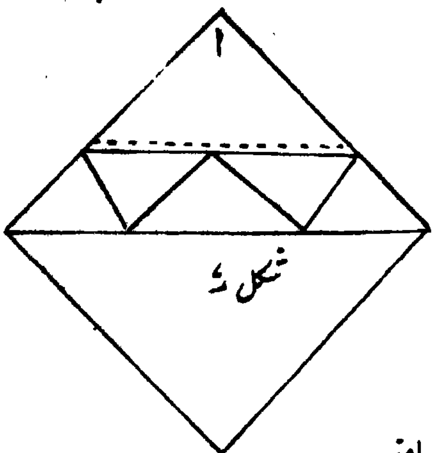
۵۔ ابھری ہوئی اور دبی ہوئی شکنوں پر کاغذ کو شکل ۴ کی طرح تہہ کرتے ہوئے شکل ۵ جیسا کر لیجیے۔



۶۔ شکل ۵ کے کونہ ا کی اوپر کی پرت کو کونہ ب سے ملا کر اس پرت کو نقطہ دار خط پر موڑیے۔ موڑ کر اچھی طرح دبا دیجیے۔



۷۔ شکل ۶ کے کونہ ا اور کونہ ب کی اوپر کی

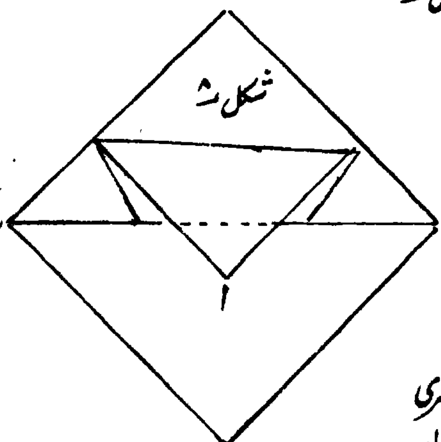


پرت کو اٹھا کر نقطے دار خطوط پر اس طرح موڑیے کہ کونہ ا اور کونہ ب نقطہ ج پر مل جائیں۔

۸۔ شکل ۷ کے کونہ ا کی اوپر کی پرت کو نقطہ دار خط پر نیچے کی طرف موڑیے۔

۹۔ عمل ۸ کے بعد کونہ ا شکل ۸ کے کنارہ ب ج کے نیچے نکل آئے گا۔ اس کو نقطہ دار خط پر کنارہ ب ج کی اوپر کی پرت کے پیچھے لے جا کر موڑ دیجیے۔

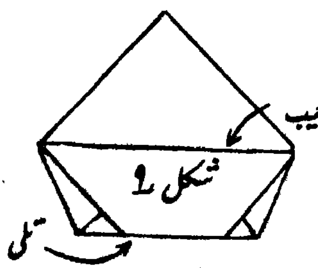
۱۰۔ کاغذ کو پلٹ کر نیچے کی سطح اوپر لے آئیے۔ آپ کے سامنے ۵ جیسی شکل ہوگی۔ عمل ۶، ۷، ۸ اور ۹ کو پھر دہرائیے۔ کاغذ شکل ۹ کی طرح تہہ ہو جائے گا۔



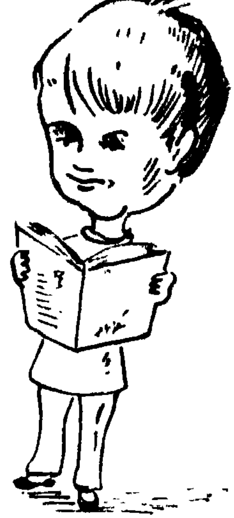
۱۱۔ اس تہہ کیے ہوئے کاغذ کو دونوں ہاتھوں میں اٹھائیے۔ دونوں جانب کی جیبوں میں انگوٹھے ڈالیے اور تلی میں دونوں ہاتھوں کی سب سے چھوٹی، اس کے برابر والی اور بیچ کی انگلیاں ڈال کر احتیاط کے ساتھ اس شکل کی طرح کھول لیجیے۔ جو مضمون کے شروع میں بنی ہوئی ہے۔

ایک جیب میں سونف رکھیے، دوسری میں الائچی یا مصری کی ڈلیاں اور خلوص و محبت کے ساتھ پُر تکلف طریقے سے مہمان کو پیش کیجیے۔

مہمان چھوٹے ہوں یا بڑے، آپ کی محبت سے متاثر ہوں گے۔ آپ کا سلیقہ دیکھ کر خوش ہوں گے اور آپ کی ہنرمندی کی داد دیں گے۔



سالنامے کو دیکھ کر



خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ۔

۳۱ جنوری ۱۹۶۶ء

برادر کرم گستر۔ سلام ورحمت

'پیام تعلیم' کا سالنامہ ملا جس کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ حمد سے ابتدا کی گئی اور پھر بڑے سلیقے سے تمام مضامین مرتب کیے گئے۔ سب سے پہلے اپنے محسن اساتذہ مولانا عبدالغفور و مولانا عبدالودود حیراجپوری رحمہما اللہ مدرسین ندوۃ العلما کی یاد سے دل شاد ہوا پھر حضرت امیر خسروؒ کا جو واقعہ آپ نے درج اشاعت کیا ہے اسے پڑھ کر روح کو بالیدگی نصیب ہوئی۔ سچ ہے " پہلے ایمان پھر سب کچھ"

دُم دار ستارہ اور کہکشاں کے متعلق مقالے معلوماتی اور بڑے دلچسپ ہیں۔ اور کمال یہ کہ دونوں مقالے اس انداز سے لکھے گئے ہیں کہ کمسن طلبہ بھی اسے سمجھ سکیں۔

امید کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

والسلام

ناچیز غلام حسنین ندوی عفرلہٗ

شمشاد ادیب صاحب سے سالنامہ ملا....

دیکھ کر جی خوش ہوگیا ... اس میں اخلاقی، تعلیمی، معلوماتی اور تفریحی ادب کو بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے .... بچے قوم کی امانت ہیں اور اس امانت

کی جس دیانت اور بے غرضی سے ادارہ "پیام تعلیم" دیکھ بھال کر رہا ہے اس کے لیے میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

حمید قریشی سہارنپور

'پیام تعلیم' کا سالنامہ آپ نے جس خلوص اور ریاضت کے ساتھ شائع کیا ہے اس کے لیے آپ زبانی مبارک باد کے الفاظ سے کہیں بالاتر ہیں۔

حفیظ اڑیسہ اردو پبلشرس، اڑیسہ

محترمی!

اس جنگی دور میں اتنا خوب صورت سالنامہ نکالنا واقعی باہمت لوگوں کا کام ہے اور میں سمجھتا ہوں آپ کے اس عظیم کارنامہ کی داد نہ دینا آپ کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔

تدبیر جاوید بریکی۔ بریلی

رنگا رنگ ندرتوں، جدتوں اور خوبیوں سے معمور 'پیام تعلیم' کا سالنامہ ۱۹۶۶ء موصول ہوا شکریہ "پیام تعلیم" کے لیے تن دہی، جس جانفشانی سے آپ کر رہے ہیں یہ نمبر ایک ادنیٰ مثال ہے آپ نے جس خلوص اور حوصلے سے یہ سالنامہ پیش کیا ہے وہ اس ہمت شکن دور میں آپ کے عزم جواں کا اعجاز ہے۔ اس عظیم پیش کش کے لیے اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مناظر عاشق ہرگانوی

محبی!

سالنامہ بہر اعتبار قابل تحسین ہے، اچھے مضامین کے ساتھ ساتھ آپ نے اسے خاکوں اور تصویروں سے بھی مزین کر دیا ہے۔ اس سے پیامیوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوگا اور 'پیام تعلیم' کی ظاہری دیدہ زیبی بھی بڑھ جائے گی۔ میری طرف سے مبارکباد حاضر ہے۔

حرمت الاکرام، مرزاپور

سالنامہ عید کے دن ملا۔ واقعی آپ کے ہاتھوں کے بارے میں جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اتنی خوب صورتی سے سالنامے کو ترتیب دیا ہے کہ جی چاہتا ہے اُن ہاتھوں کو چوم لوں اتنا حسین پرچہ میں نے شاید ہی دیکھا ہو واقعی آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

جہانگیر احمد، بریلی

آل انڈیا ریڈیو،
حیدرآباد،

محترمی حسان صاحب!

تسلیمات۔ "پیام تعلیم" کا سالنامہ ملا۔ ایسا پیارا ایسا خوب صورت سالنامہ آپ نے نکالا ہے کہ دل خوش ہو گیا۔ مجھے تو سچ جانیے بے اختیار "پیام تعلیم" کے پرانے سالنامے یاد آ گئے۔ سن ۴۲ء، ۴۳ء والے

تصویریں، کہانیاں، نظمیں، ڈرامے، مضامین سبھی چیزیں عمدہ ہیں۔ خاص طور پر ان کی ترتیب خوب ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ بچے اس سالنامے کو بے حد پسند کریں گے۔

ان دنوں بچوں کے کئی سالنامے میرے پاس آئے ہیں لیکن میں بلا جھجک کہہ سکتا ہوں کہ ان سارے پرچوں میں "پیام تعلیم" سب سے دلکش، سب سے پیارا اور مضامین کے اعتبار سے سب سے زیادہ مفید ہے۔ پرچہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کے پیچھے کس قدر ان تھک محنت کی گئی ہے، میں آپ کی کاوشوں سے ۴۵ء، ۴۶ء سے واقف ہوں آپ میں ایک بار پھر وہی قدیم جوش و خروش ابھر آیا ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ کی یہ محنتیں رنگ لائیں اور 'پیام تعلیم' ترویج و اشاعت کے اعتبار سے اس معراج پر پہنچ جائے جس کے آپ بھی خواب دیکھ رہے ہیں اور میں بھی۔

اظہر افسر، حیدرآباد

محترمی!

نئے سال کا جو لاجواب تحفہ آپ نے "پیام تعلیم" کی صورت میں بھیجا ہے اس کے لیے مشکور ہوں۔

ٹائیٹل دیکھتے ہی طبیعت خوش ہو گئی، اور مضامین پڑھنے کے بعد تو سوائے واہ واہ کے اور کچھ نہ کہہ سکا۔

آپ کی کوششوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

قیصر سرمست، حیدرآباد

آپ کا ارسال کردہ 'پیام تعلیم' کا پیارا پیارا سالنامہ ملا۔ سمجھ میں نہیں آتا کس طرح اس ذرہ نوازی کا شکریہ ادا کروں۔

آپ نے بہت حسین مجموعہ ترتیب دیا ہے جس کے لیے آپ یقیناً قابلِ صد ستایش ہیں، سبھی

(باقی صـــ پر)

نظمیں، کہانیاں اور مضامین، نہایت دلچسپ مفید اور معلوماتی ہیں لکھنے والے بھی مشہور و معروف ہیں۔

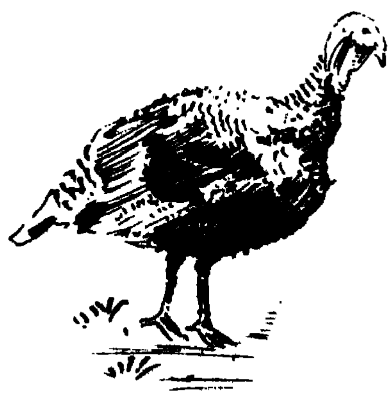
احمد رحیم علوی، لکھنو

آپ نے جس ترتیب سے مضامین، ڈرامے، نظمیں وغیرہ قلمبند کی ہیں ویسا اور کوئی رسالہ نہیں کر سکتا۔

اس سال کا سالنامہ پچھلے سالناموں سے بہترین تھا۔ ہمارے اسکول کے طلبا نے دل دے کر جنوری کا پیامِ تعلیم پڑھا۔

میری طرف سے اور باقی طلبا کی طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

صاحبزادہ اشرف کمو کا طالب علم
ہائیر سکنڈری اسکول۔ بارہ مولہ۔ کشمیر



چاند پر اُترنا

(بقایا صفحہ ۴۵ کا)

اس کو موقع یا اتنا وقت مل جائے گا کہ وہ اپنے جہاز تک واپس آسکے۔

لیکن خلا کے جہاز میں اگر کوئی شہاب ثاقب گھس گیا تو اس کے اندر کا مسافر اگر مرے گا نہیں تو بہت شدت سے زخمی ضرور ہو جائے گا۔ امریکا کی ٹکساس کی ریاست میں ڈلس کے اندر لنگ ٹمکو واٹ کی ریسرچ لیبوریٹری میں کئی ڈاکٹروں (جیسے چارلس گل، الن تھامپسن اور ورن اسٹم برج) نے چوہوں پر جو تجربے کئے ہیں وہ خطرناک ہیں۔ چوہوں کو ایسی جگہ رکھا گیا تھا کہ وہ ایک خول میں بند تھے۔ اس خول کو تیزی کے ساتھ کرۂ ہوائی میں سے اڑایا گیا۔ اسی وقت باہر سے ایک سخت چیز نے آکر ٹکر ماری۔ اس خول میں سوراخ ہو گیا، دھات پگھل گئی۔ اس خول میں سو فیصدی آکسیجن بھری ہوئی تھی۔ لیکن دھماکا لگتے ہی چوہے مر گئے اور جل کر خاک ہو گئے۔

(باقی اگلے پرچے میں)



روسی راکٹ چاند پر اتر گیا

جب سے خلائی پرواز کا سلسلہ شروع ہوا ہے چاند پر راکٹ اتارنے کی کوشش میں، روس اور امریکہ کے خلاباز لگے ہوئے ہیں۔ امریکہ نے جیمنی نام کے طیاروں کی مدد سے چاند تک پہنچنے کے لیے ضروری معلومات حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ادھر روس نے لونا نام کے خلائی طیاروں کے ذریعے اپنی کوشش جاری رکھیں۔ مگر اب تک کوئی راکٹ چاند پر نہیں اتر سکا تھا۔ کوئی راکٹ چاند کے قریب سے گزر کر آگے نکل گیا تو کوئی چاند پر اترتے اترتے چور چور ہو گیا۔ چاند کے گرد کئی طیارے منڈلائے مگر اس کی سطح پر اترنے میں کامیابی ایک روسی طیارے کو ہوئی۔ یہ روسی طیارہ جس کا نام لونا ۹ ہے فروری کی تیسری تاریخ کو چاند کی سطح پر اترا۔ یہ حیرت انگیز خبر سن کر دنیا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لونا ۹ نے چاند کی سطح کی متعدد تصویریں کھینچ کر بھیجی ہیں۔ اب ان تصویروں کی مدد سے چاند پر انسان کو بھیجنے کی کوشش اور تیزی سے شروع ہو جائے گی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ جون کے مہینے میں امریکہ بھی ایک راکٹ چاند پر اتارے گا۔

اس سلسلے کی ایک دلچسپ خبر بھی سنتے چلیے۔ بغداد کے ایک سوداگر نے اپنی بچی کا نام اسی راکٹ لونا ۹ کے نام پر لونا رکھا ہے۔ سوداگر کی یہ ننھی بچی بھی چاند پر لونا کے اترنے کے ۶ دن بعد پیدا ہوئی۔

کاٹو تو خون نہیں

یہ محاورہ تو آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ اس کا مفہوم بھی آپ سمجھتے ہوں گے۔ یہ اس موقع استعمال کیا جاتا ہے جب کوئی آدمی ڈرا ہوا ہو۔ یعنی اس پر ڈر کی وہ کیفیت طاری ہو کہ اس کا خون سرد پڑ جائے اور اگر بدن کاٹا جائے تو خون نہ نکلے۔

مگر اب تو سچ مچ ایک ایسے چاقو کی ایجاد ہو گئی ہے جس سے آپریشن کرنے پر بدن سے خون نہیں نکلے گا۔ ابھی کوئی دو مہینے پہلے cincinnati یونیورسٹی کے دو سرجن، ڈاکٹر ٹامس براؤن اور ڈاکٹر بریوس ہنڈرسن نے اس طرح کے ایک چاقو سے جسم کے ایک بہت نازک حصے کا آپریشن کیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس چاقو کی مدد سے اب جسم کے ایسے اندرونی حصوں کا آپریشن کرنا آسان ہو جائے گا جہاں آپریشن سے نکلنے والے خون سے تکلیف کے اور بڑھ جانے کا ڈر رہتا ہے۔

اس سے بھی اونچی بات سنیے

ماسکو (نوودستی) زہریلے جراثیم کے ایک ماہر سائنسداں بائیکووسکی نے چیچک، پولیو اور دوسرے بھیانک متعدی امراض پھیلانے والے زہریلے جرثوموں کا مطالعہ کیا۔ اور بہت ہی چھوٹے الکٹرونک آلات کی مدد سے پہلی بار عمل جراحی کے ذریعے "جرثومے" کے کئی ٹکڑے کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ زہریلے جرثومے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ انھیں طاقت ور خوردبین کی مدد سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

دنیا میں لمبی عمر کا ریکارڈ

اب تک دنیا میں لمبی عمر کے لوگوں کے بارے میں جتنی معلومات ہے۔ اس کے لحاظ سے دنیا میں لمبی عمر کا ریکارڈ ایک انگریز ٹامس کار نے قائم کیا۔ اس کا جنم ۱۵۸۸ء میں ہوا تھا اور موت ۱۷۹۵ء میں ہوئی۔ یعنی اس نے ۲۰۷ سال کی عمر پائی۔ اس نے اپنی زندگی میں برطانیہ کے تخت پر بارہ بادشاہ دیکھے۔

کاکیشیا کے لمبی عمر کے لوگ

روس کی ایک ریاست آذربائیجان ہے۔ اس

ریاست کے سب سے بوڑھے باشندے نظر بابا مصطفےٰ نے اس مہینے میں اپنا ۱۴۰واں جنم دن بہت دھوم دھام سے منایا۔ اس موقع پر نظر بابا کے کنبے کے لوگوں نے بلکہ سارے گاؤں نے خوشی منائی۔ یہ گاؤں کاکیشیا پہاڑ کے جنگلی علاقے میں واقع ہے۔

کاکیشیا کا علاقہ لمبی عمر کے لوگوں کے لیے مشہور ہے۔ روس میں ۱۹۵۹ء کی مردم شماری سے معلوم ہوا ہے کہ اس علاقے کے ہر ڈیڑھ سو میں سے ایک آدمی کی عمر سو سال سے اوپر ہوتی ہے۔ یہ لوگ بہت صحت مند اور محنتی ہوتے ہیں۔ یہاں ۱۶۰ سال تک کی عمر کے لوگ آج بھی موجود ہیں۔

نظر بابا اپنی خوراک کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ صبح سویرے نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ بھیڑ کا پنیر کھاتے ہیں۔ دن میں ایک بار گوشت بھی کھاتے ہیں مگر ان کی خوراک زیادہ تر خشک پھل، سبزی اور مکھن وغیرہ ہے۔ وہ محنت سے کام کرتے ہیں اور پاک زندگی بسر کرتے ہیں۔

چار ہزار سال پرانی کشتی

مصر کے اہرام کے بارے میں آپ کو معلومات ہوں گی۔ یہ اہرام مصر کے قدیم زمانے کے بادشاہوں کے مقبرے ہیں جن میں ان کی لاش محفوظ کر کے رکھ دی جاتی تھی۔

ان اہراموں میں قدیم زمانے کی بہت سی چیزیں محفوظ ملی ہیں۔ انھیں اہراموں میں سے ایک اہرام کے اندر سے کوئی دس بارہ سال پہلے ایک بہت بڑی کشتی کا ڈھانچہ ملا تھا بالکل ٹوٹی پھوٹی حالت میں۔ اس کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ تمام ٹکڑوں کو پھر سے جمع کر کے اسے کشتی کی شکل دینے میں دو سال کا وقت لگ گیا۔ قدیم زمانے کی چیزوں کا مطالعہ کرنے والے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ کشتی ۴۰۰۰ سال پرانی ہے۔ ان لوگوں کو اس بات پر تعجب ہے کہ لکڑی کی بنی ہوئی یہ کشتی اتنے زمانے تک کس طرح بچی رہ گئی۔ یہ کشتی کوئی ۱۴۰ فٹ لمبی ہے یہ آج کی دنیا کی سب سے قدیم کشتی ہے۔ اس عجوبہ کشتی کو محفوظ رکھنے کے لیے مصر میں ان دنوں ایک خاص طرح کا عجائب خانہ بنانے کی تیاری کی جا رہی ہے۔

بنگال میں لمبی عمر کا ریکارڈ

ہمارے ملک میں بھی لمبی عمر کے لوگ موجود ہیں! ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ مرشد آباد کے ضلع میں ۱۶۰ سال کی عمر کے ایک صاحب رہتے تھے۔ یہ بنگال میں سب سے لمبی عمر کا ریکارڈ ہے۔ اسی ضلع میں ۱۵۰ سال کی عمر کی ایک خاتون بھی موجود تھیں۔ اسی مردم شماری کی رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ کلکتے میں ۳۲۴ آدمیوں کی عمر سو سال سے اوپر تھی جن میں ۲۸۸ عورتیں تھیں۔


رنگ بھریے

فارم IV   حسب قاعدہ ۸   بابت "پیام تعلیم" نئی دہلی

۱۔ مقام اشاعت : جامعہ نگر نئی دہلی   ۲۔ وقفۂ اشاعت : ماہنامہ

۳۔ پرنٹر کا نام : سید احمد ولی ۔ قومیت : ہندوستانی ۔ پتہ : جامعہ نگر ، نئی دہلی

۴۔ پبلشر کا نام : سید احمد ولی ۔ قومیت : ہندوستانی ۔ پتہ : جامعہ نگر ، نئی دہلی

۵۔ ایڈیٹر کا نام : محمد حسین حسّان ۔ قومیت : ہندوستانی ۔ پتہ : جامعہ نگر ، نئی دہلی

۶۔ مالکان کے نام و پتے : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۔ چیرمین پروفیسر محمد مجیب جامعہ نگر ، نئی دہلی

ڈائرکٹرز : ۱۔ سید مجتبیٰ حسین زیدی ، جامعہ نگر ، نئی دہلی

۲۔ ڈاکٹر عبدالعلیم ۳۲ یونیورسٹی روڈ ، علی گڑھ

۳۔ مسٹر ایم آر چنائے مہر بلڈنگ ۔ چوپاٹی ، بمبئی ۷

۴۔ مسٹر ایم ایچ ہاشم پریم جی ، ۵۵ گھوگا اسٹریٹ ، بمبئی ۱

۵۔ ہز ہائی نس نواب اقبال محمد خاں آف پالن پور ، کف پریڈ ، کولابہ ، بمبئی

۶۔ کرنل بشیر حسین زیدی ایم ۔ پی ۶ راجندر پرشاد روڈ نئی دہلی

۷۔ ضیاء الحسن فاروقی ، پرنسپل جامعہ کالج ، جامعہ نگر ، نئی دہلی

کمپنی کے سرمایہ کے ۱ فیصدی سے زیادہ کے حصے دار :

جامعہ ملیہ اسلامیہ ، جامعہ نگر ، نئی دہلی ۔

اسلام جیم خانہ ۔ کینیڈی سی فیس ، بمبئی

میں سید احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں ۔

دستخط احمد ولی

پبلشر

۲۸ فروری ۱۹۶۶ء

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا ۔

اُستادوں اور بچّوں کے لیے عبدالغفار صاحب مُدہولی کی کتابیں

اُستادوں اور بڑوں کے لیے

۱. **جامعہ کا طریقہ** قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے
اس میں بچّوں کو کام اور مشغلوں کے ذریعے اُرْدُو، ہندی سکھانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

۲. **کھیل کے ذریعے تعلیم** (حصہ اوّل) قیمت ۲ روپے
پہلے حصے میں پہلی جماعت میں زبان اور حساب سکھانے کے کھیل درج ہیں۔ دوسرے حصے میں دوسری جماعت کے کھیل ہیں قیمت ایک روپیہ

۳. **چند پروجکٹ** قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے
جامعہ کے مدرسہ ابتدائی اور ثانوی میں جو پروجکٹ چلائے گئے ہیں، ان میں سے چند منتخب پروجکٹ یک جا شائع کر دیئے گئے ہیں۔

۴. **اُرْدُو املا سکھانے کا آسان طریقہ** قیمت ۵ پیسے
اس طریقہ کے سکھاتے ہی بچے صحیح املا لکھ لیتے ہیں، نیز اُردو رسم خط کے لیے انجمن ترقی اُرْدُو نے جو علامتیں تجویز کی ہیں، ان کی خوبیاں بتائی گئی ہیں۔

۵. **مدرسہ ابتدائی کی کہانی** قیمت دو روپے
جامعہ کے مدرسہ ابتدائی کو چند سال میں نمونہ کا مدرسہ کس طرح بنایا گیا ہے۔ اس کتاب پر مرکزی حکومت نے انعام دیا ہے۔

۶. **جامعہ کی کہانی** حصہ اوّل قیمت: ۶ روپے
جامعہ کے تعلیمی کاموں کی رُوداد کے علاوہ اس کے اتار چڑھاؤ کو کہانی کے انداز میں بیان کیا گیا ہے، یہ جامعہ کی تاریخ بھی ہے، اس میں دو درجن تصویریں ہیں۔ صفحات پانچ سو

بچّوں کے لیے

۱. **کیمپ فائر کی نقلیں** (دو حصے) ہر حصے کی قیمت ۵۰ پیسے
اس میں کیمپ فائر میں کھیلنے کے لیے طرح طرح کی نقلیں دی گئی ہیں، اس کتاب پر حکومت کی طرف سے انعام ملا ہے۔

۲. **ایک طالب علم کی کہانی** قیمت ۲ روپے
اس میں مُدہولی صاحب نے اپنی طالب علمی کے زمانے کے حالات کہانی کی صورت میں لکھے ہیں۔ مرکزی حکومت نے اس کتاب پر انعام دیا ہے۔

۳. **چوری کی عادت** (ڈراما) قیمت ۵۰ پیسے
ایک بچّے کی چوری کی عادت کیسے چھڑائی گئی۔

۴. **جھوٹا لڑکا** (ڈراما) قیمت ۳۰ پیسے
بچّے جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔

۵. **غیر ذمّہ دار لڑکا** (ڈراما) قیمت ۵۰ پیسے
بچّے ذمّہ دار ہوتے ہیں یا غیر ذمّہ دار۔

۶. **سال بھر کی دل چسپیاں** قیمت ۵۰ پیسے
موسم اور تہوار کی جو دل چسپیاں سال بھر میں آتی ہیں انھیں معلوماتی طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔

۷. **اُرْدُو تاش** قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے
اس کے کھیلنے سے لفظ اسی طرح بنتے ہیں جس طرح یہ لکھے جاتے ہیں۔

۸. **اُرْدُو کا بُنیادی قاعدہ اور بُنیادی پہلی کتاب**
یہ درسی کتابیں ہیں۔

نوٹ: کھیل کے ذریعے تعلیم، جامعہ کا طریقہ، کیمپ فائر کی نقلیں، چوری کی عادت، یہ کتابیں ہندی میں بھی ملتی ہیں۔

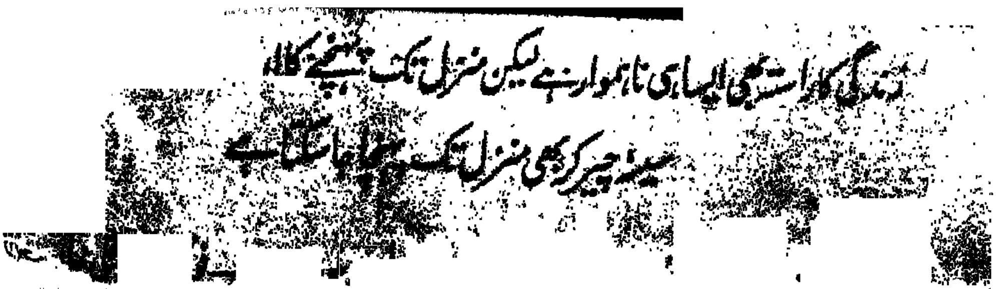
March 1966. Regd. No. D. 1457.

Payam -i- Taleem

New Delhi-25.

Title Printed at Liberty Art Press, Delhi.




زندگی کا راستہ بھی ایسا ہی ناہموار ہے لیکن منزل تک پہنچنے کا
سینہ چیر کر بھی منزل تک پہنچا جا سکتا ہے


چودھری

ریاست جموں و کشمیر میں تمام تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

پیام تعلیم دہلی



جلد ۳ — اپریل ۱۹۶۶ء — شمارہ ۴

ایڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی

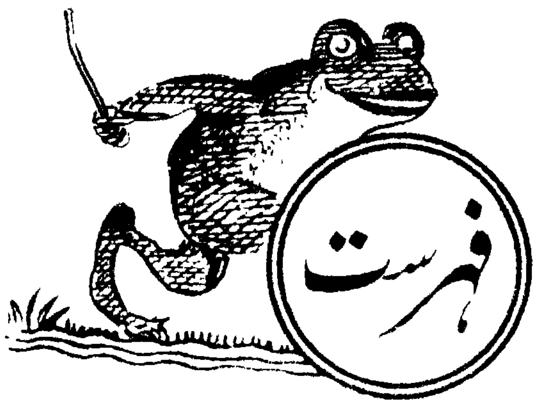
آرٹسٹ: گلیڈون میسی

سالانہ چندہ: — پانچ روپے

فی پرچہ: — پچاس پیسے

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

بمبئی آفس:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ ۱ جے جے ہسپتال بمبئی



فہرست



بچّوں سے باتیں

پیامیوں کو عید مبارک !

بھئی اپنے سالنامے کو تو آپ نے بہت پسند کیا۔ اب تک اس کے بارے میں ہمارے پاس مبارکباد کے خط چلے آ رہے ہیں۔ اس پرچے میں تو گنجائش نہ نکل سکی اگلے پرچے میں ہم انھیں چھاپ سکیں گے۔

"بچوں کے نام ایک خط" پیامیوں نے بہت مزے لے لے کر پڑھا۔ ان کا خیال ہے کہ نانا میاں تو خوب ہاتھ آ گئے۔ ان کا اصرار ہے کہ آئندہ یوسف ناظم صاحب کے ساتھ "نانا جان" کے الفاظ ضرور بڑھا دیئے جائیں۔ بھئی یہ تجویز بڑی خوشی سے منظور ہے۔ یوسف صاحب تو پہلے لکھ چکے ہیں "اے بچو ہم نانا بن کر واقعی خوش ہوں گے"۔ تو بھئی ہمیں آپ کی اور آپ کے "نانا جان" کی دونوں کی خوشی منظور ہے۔

فروری کے پیام تعلیم میں ایک مضمون "بمبئی کے چوہے" چھپا تھا۔ یہ بھی آپ لوگوں نے بہت پسند کیا۔ بہت سے پیامیوں کی خواہش ہے کہ ان سے ایسے مزے مزے کے مضمون برابر لکھوایئے۔ ہمیں امید ہے کہ محترمہ عائشہ یوسف ناظم پیامیوں کی اس خواہش کا احترام کریں گی۔

پیدائش کی تاریخ کے سلسلے میں بہت سے پیامیوں کے خط آنے لگے ہیں۔ چند پیامیوں کو سالگرہ کا تحفہ بھی بھیجا گیا اور انھوں نے ہمارے اس

تحفے کو بہت محبت، بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کا بڑا امان کیا۔

اقبال مہدی صاحب کے مضمون بچوں میں خاص طور سے مقبول ہیں۔ مگر خود انھیں اس بات کی فکر ہے کہ پیامی ان کی بتائی ہوئی باتوں کو اچھی طرح سمجھ بھی لیتے ہیں اور چیزوں کو کامیابی کے ساتھ بنا بھی لیتے ہیں؟ تو بھئی آپ اُن کی تشفی کر دیجیے۔ ایک خط لکھ کر ہمیں بھیج دیجیے۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو وہ بھی لکھیے۔ ہم یہ خط ان تک پہنچا دیں گے۔

مارچ کے پیام تعلیم کا ٹائٹل، اندر کی تصویریں، مضمون، نکھری ستھری لکھائی چھپائی غرض سبھی چیزیں پیامیوں کو پسند آئیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ تصویریں اور زیادہ دیں۔ دعا کیجیے کہ ہمیں کامیابی ہو اور پرچے کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے جو تجویزیں ہمارے ذہن میں ہیں ان سب پر ہم جلد سے جلد عمل کر سکیں۔

پیام تعلیم کی تصویروں کے سلسلے میں ہمیں اپنے بہت ہی عزیز ساتھی شاہد علی خاں صاحب انچارج شاخ مکتبہ بمبئی سے خاص مدد ملی ہے۔ اس پرچے کی تصویریں بھی انھی کی نوازشوں کا مجموعہ ہیں۔ ٹائٹل کی تصویر بھی انھی کا عطیہ ہے۔ آئندہ کے لیے بھی انھوں نے بہت کچھ وعدہ کیا ہے۔

ہمارے پیامی بھی ہمیں اچھی اچھی تصویریں بھیجیں۔ معیار کے مطابق ہوئیں تو بڑی خوشی سے شائع کی جائیں گی۔ ننھے پیامیوں کے فوٹو خاص طور سے قابل قبول ہوں گے۔

کچھ مجبوریوں کی وجہ سے سالنامے کی اشاعت میں دیر ہو گئی تھی۔ پر اب ہم پوری کوشش کے بعد آپ کے پیام تعلیم کو وقت پر لے آئے ہیں۔ اس لیے آپ کو پرچہ وقت پر نہ ملے تو زیادہ سے زیادہ پانچ تاریخ تک پیام تعلیم کے منیجر صاحب کو اطلاع دے دیجیے۔ اس کے بعد پیام تعلیم انھی پیامیوں کو بھیجا جا سکے گا جو اپنے خط کے ساتھ ۲۵ پیسے کے ٹکٹ بھیجیں گے۔

★



جناب سعادت نظیر

میرا وطن

زمین آسمان میں
غرض کہ دو جہان میں

میرا وطن حسین ہے
گلوں کی سرزمین ہے

یہ علم و فن کی انجمن
یہ پریم چند[۲] کا وطن
یہ دل فروز مدرسے
یہ مسجدیں، یہ بت کدے

یہ سور داس[۳] کا گگن
یہ میر[۱] و داغ کا چمن
یہ کام گھر، یہ محکمے
یہ شان دار مقبرے

---

۱ شاعر اور گویا ۲ ناول نگار ۳ شاعر

یہ شہر، گاؤں، بستیاں　　یہ رومانی وادیاں
یہ پستیاں، بلندیاں　　ہمالیہ کی چوٹیاں

یہ نقش سب وطن کے ہیں
یہ گل مرے چمن کے ہیں

ہر ایک پھول ہے حسیں　　نظر فریب، دل نشیں
فضا ہے کیف آفریں　　یہاں کہیں خزاں نہیں
کہیں پہ آبشار ہے　　کہیں پہ جوئے بار ہے
کہیں پہ سبزہ زار ہے　　چمن چمن بہار ہے

مرا وطن حسین ہے
گلوں کی سرزمین ہے

وفا کا پاسبان ہے　　کہ قائل اک جہان ہے
عجیب اس کی شان ہے　　انوکھی آن بان ہے
سلامت اس کا بانکپن　　سلامت اس کی انجمن
نثار اس پہ جان و تن　　شگفتہ اس کا ہر چمن

مرا وطن حسین ہے
گلوں کی سرزمین ہے

تایا جان یوسف ناظم

روتری کلب

انجمن کے بڑے ہال میں بیسوں لڑکے جمع ہیں۔ ہال کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہر طرف کاغذی بیلیں اور غبارے لٹک رہے ہیں۔ دیواروں پر رنگ برنگے کاغذ لگے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ اقوال اور اشعار بھی لکھے ہیں۔ ڈائس کے پیچھے سُرخ کپڑے پر نہایت شاندار حروف میں "روتری کلب زندہ باد" لکھا ہوا ہے۔ ایک جگہ ایک مصرعہ لکھا ہوا ہے ؏

روتری میں جو مزا ہے وہ کسی شے میں نہیں

ایک دوسری جگہ کپڑے پر ایک شعر کڑھا ہوا ہے ؎

روتری جو کر نہیں سکتے
پیٹ اپنا وہ بھر نہیں سکتے

دیواروں پر کچھ تصویریں بھی لگی ہیں۔ ایک تصویر میں ایک صاحبزادے اپنا منہ کھولے اکڑوں بیٹھے ہیں اور کئی لڑکے ان کے گرد انھیں منائے کھڑے ہیں۔ ایک اور تصویر میں ایک لاڈلے میاں، کھانے کی میز پر ہڑتال کیے ہوئے بیٹھے ہیں اور ان کی ممی انھیں کھانا کھلانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ غرض سارے ہال میں سجاوٹ کی ایسی ہی چیزیں ہیں۔ ہال لڑکوں سے بھرا ہوا ہے، ہر طرف کھسر پسر ہو رہی ہے۔ قہقہے بھی چل رہے ہیں۔ سبھی کو جلسے کے شروع ہونے کا انتظار ہے۔ کچھ لڑکے چیخ بھی رہے ہیں — "روترو جلسہ شروع کر دو،

جلسہ شروع کر دو" "جلسہ شروع کرنے میں تو روتری مت کرو ــــــ"

لیجیے مائکروفون پر اعلان ہو رہا ہے۔

سکریٹری: دوستو ــــ دوستو! (کھنکار کر) یہاں تو کوئی سنتا ہی نہیں۔ شاید ان میں کوئی ہمارا دوست نہیں۔ اچھا لو [بہت اونچی آوازیں] دشمنو! سنو اور اچھی طرح سنو! ہمارا جلسہ اب شروع ہونے والا ہے (دشمنو کا لفظ سن کر سب خاموش ہو جاتے ہیں) یہ جلسہ اپنی قسم کا پہلا جلسہ ہے کیونکہ ایسا جلسہ ملک کے کیا دنیا کے کسی کونے میں بھی نہیں ہوا ہے۔ یہ جلسہ ہے روتری کلب کا پہلا جلسہ ــــ میں خود روتری کلب کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اس کے بارے میں صدر صاحب آپ کو ساری باتیں بتلائیں گے ــــ میرا کام تو صرف جلسے کی صدارت کے لیے ایک نام پیش کرنا ہے ــــ (کھنکارتا ہے) دشمنو! میں اس جلسے کی صدارت کے لیے جناب قربان میاں کا نام پیش کرتا ہوں۔ (تالیاں) جناب قربان میاں، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، روتے ہوئے پیدا ہوئے تھے بلکہ جب وہ پیدا ہوئے تو ان کے گھر میں سب کے سب رو رہے تھے۔ دشمنو! پوچھو کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قربان میاں اپنے گھر میں گیارھویں بچے تھے (سبحان اللہ ماشاءاللہ کی آوازیں) صرف یہی نہیں قربان میاں میں اس کے علاوہ بھی بہت سی خوبیاں ہیں اور ان خوبیوں کی گنتی ابھی جاری ہے۔ جب کبھی ان کی خوبیاں گنی جاتی ہیں گننے والے روتری کرتے ہیں اور گنتی غلط ہو جاتی ہے اس لیے میں صرف یہی کہوں گا کہ ان میں سینکڑوں خوبیاں ہیں۔ مثلاً یہ کہ پیدائش کے بعد جب ان کے کان میں اذان دی گئی تو قربان میاں بہت روئے۔ قربان میاں اب سولہ سال کے ہو گئے ہیں لیکن جب بھی اذان سنتے ہیں رو دیتے ہیں اور اس طرف بھاگتے ہیں جس طرف مسجد نہیں ہوتی۔ قربان میاں کی عمر اسکول میں تو سولہ سال لکھی ہوئی ہے لیکن ان کا پرانا نوکر رحمن بیان کرتا ہے کہ وہ قربان میاں کے ہاں اٹھارہ سال سے ملازم ہے اور جب وہ نوکری پر چڑھا تھا تو قربان میاں گھر میں روتے ہوئے موجود تھے (تالیاں) دشمنو! کیوں خوش ہو کر تالیاں بجاتے ہو۔ اصل بات تو کچھ اور ہی ہے، قربان میاں کی اتی کا خیال ہے کہ اسکول میں ان کی عمر ان کے والد نے بھول کر غلطی سے زیادہ لکھوا دی ہے۔ ان کی اتی کہتی ہیں کہ قربان میاں کو ابھی چودھواں شروع ہوا ہے (اور تالیاں) لیکن دشمنو! ہمیں ان کی عمر سے

کیا کرنا ہے۔ ہمیں تو کام ہے ان کی قابلیت سے۔ مشہور ہے کہ قربان میاں کو جب اسکول میں داخل کرانے کا وقت آیا تو انھیں ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسکول لانا پڑا تھا اور اس دن قربان میاں اتنا روئے تھے کہ نہ صرف ان کے بلکہ ان کے چار بڑے بھائیوں کے کپڑے بھی بھیگ گئے تھے (تالیاں) قربان میاں کی روتری کے واقعات تو آپ نے سنے ہی ہوں گے۔ ایک مرتبہ کرکیٹ کھیلتے ہوئے جب ان کی وکٹ اڑ گئی تھی تو قربان میاں اَڑ گئے تھے کہ وہ آوٹ نہیں ہوئے اور انھوں نے امپائر کو بتلایا کہ کرکیٹ فیلڈ پر ایک کُتّے کے آجانے کی وجہ سے ان کی توجہ ہٹ گئی تھی اور امپائر نے انھیں دوبارہ کھیلنے کا موقع دیا۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت تو نہیں لیکن لوگ کہتے ہیں کہ قربان میاں نے اپنے سارے امتحان بھی روتری کرکے ہی پاس کیے تھے (تالیاں) اس لیے دشمنو! میں چاہتا ہوں کہ آج کے اس اہم اور انوکھے جلسے کی صدارت قربان میاں ہی کریں۔ اب چندر موہن جی میرے اس خیال کی تائید کریں گے۔ (تالیاں)

چندر موہن جی : بھائیو! مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ میں اپنے دوست اشرف حسین کی تحریک کی تائید کرتا ہوں کیونکہ میں بھی سمجھتا ہوں کہ اس جلسے کی صدارت کے لیے سب سے موزوں شخص قربان میاں ہی ہیں۔ قربان میاں نے پچھلی دیوالی کے موقعے پر میرے ہاں دعوت کھائی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے عید پر ضرور شیر خرما کھلائیں گے لیکن قربان میاں اس وعدے کو بالکل بھول گئے اور میں جب بھی انھیں یاد دلاتا ہوں وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ چندر موہن بھیّا شکر ہی نہیں ملتی۔ تو بھائیو ایسا ہی شخص روتری کلب کے جلسے کی صدارت کر سکتا ہے (تالیاں) قربان میاں صاحب سے میں آپ سب کی طرف سے کہوں گا کہ وہ کوئی نخرا نہ کریں اور صدارت کی کرسی پر تشریف لائیں۔ ان کا صدر بننا پہلے ہی سے طے ہے اس لیے دوستو! اگر وہ کوئی ایسی بات کہیں کہ وہ تیار نہیں ہیں تو آپ بالکل یقین نہ کریں۔ (تالیاں)

(قربان میاں صدارت کی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اشرف حسین انھیں پھولوں کا ہار پہناتے ہیں اور لڑکے تالیاں پیٹتے ہیں۔)

قربان میاں : بڑے بھائیو، برابر کے لڑکو اور چھوٹے بچو! میں اس جلسے کی صدارت کے لیے پہلے

ہی سے راضی تھا لیکن جلسے کا دستور یہی ہے کہ صدارت کی تحریک ہو، اس کی تائید ہو اور پھر صدر، صدارت کی کرسی پر بیٹھے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اب یہ دستور بدلنا چاہیے۔ زمانہ اب تیزی سے بدل رہا ہے اور اگر ہم نے جلسوں کا سسٹم نہیں بدلا تو ہم سب پیچھے رہ جائیں گے اور آگے چلنے والے لوگ ہمارے لیے پیچھے پلٹ کر نہیں آئیں گے اس لیے آئندہ جلسوں میں اب تحریک اور تائید جیسی فضول باتیں نہیں ہوں گی. میں سیدھا کرسی پر آکر بیٹھ جاؤں گا اور آپ لوگ فوراً تالیاں بجا دیں گے۔

بھائیو اور لڑکو۔ آپ پوچھیں گے کہ آج کا یہ جلسہ کیوں ہو رہا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جلسہ تو ہونا ہی چاہیے۔ کیونکہ آج کل کا زمانہ بہت نازک ہے اور اگر کسی دن جلسہ نہ ہو تو لوگ پوچھتے ہیں کہ آج کوئی جلسہ کیوں نہیں ہوا۔ لیکن آج کا جلسہ، جلسوں کے سلسلے کی کوئی کڑی نہیں بلکہ یہ بہت اہم جلسہ ہے۔ آج ہم ایک کلب کی بنیاد ڈال رہے ہیں اور اس کلب کا نام ہے 'روتری کلب'۔ آپ کے چچا، ماموں یا خود ابا ممکن ہے شہر کے روتری کلب کے ممبر ہوں۔ روتری کلب ساری دنیا میں قائم ہیں لیکن اس کلب میں بچوں کو ممبر نہیں بنایا جاتا۔ یہ کھلی زیادتی ہے اور بچوں پر ظلم ہے (تالیاں) ـــــ ہم یہ ظلم نہیں سہیں گے۔ ہم بچے ہیں اور ملک کے ہر کلب میں ہمارا برابر کا حصّہ ہونا چاہیے۔ ہمیں چونکہ ہمارا حصّہ نہیں ملا ہے اس لیے ہم اپنا الگ کلب قائم کریں گے۔ (تالیاں) بھائیو اور لڑکو! اس ملک کو مضبوط اور مقبول بنانے کا کام آپ سب کا ہے۔ میں اب اس کلب کے دستور اور اس کے مقصد کے بارے میں آپ کو تفصیلی باتیں بتلانا چاہتا ہوں۔

ہمارا روتری کلب سب کے لیے کھلا ہوگا۔ ہم بچے ہیں نا! اس لیے ہمارا دل چھوٹا نہیں ہے۔ بڑے بوڑھے لوگ بھی ہمارے کلب کے ممبر بن سکیں گے۔ دوستو یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ بڑی عمر کے لوگوں کو اس کلب سے دور رکھنے میں ہمیں کیا مل جائے گا؟ ہے نا دوستو! اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ بڑے بوڑھے لوگ بھی روتری کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے تجربے سے ہمارے کلب کو فائدہ ہی پہنچے گا اور ہم روتری کرنے کے نت نئے طریقوں سے واقف ہو سکیں گے ـــــ (تالیاں)

ایک لڑکا: میں اپنے نانا جان کو ضرور اس کلب کا ممبر بناؤں گا۔ وہ بہت اچھی روتری کرتے ہیں۔

قربان میاں: دوستو! ہمارے کلب کے ممبر تو سب بن سکیں گے لیکن اس کا صدر وہی بن سکے گا جس کی عمر اٹھارہ سال

سے کم ہو۔ ہم نے سنا ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد آدمی جھجکنے لگتا ہے اور ٹھیک طور پر روتری نہیں کرنے پاتا اور اس کی یہ حالت اٹھاون سال کی عمر تک برقرار رہتی ہے۔ اٹھاون سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد آدمی سنا ہے پھر روتری کرنے پر مائل ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اٹھاون سال کے ہوں گے انھیں ہم اپنے کلب کا کوچ بنا دیں گے کیونکہ اس کلب کا مقصد یہ ہوگا کہ روتری کے پرانے اور بے ڈھنگے طریقوں کو بدلا جائے اور روتری کا نیا فیشن رائج کیا جائے۔ یہ زمانہ نئی باتوں کا ہے۔ ہر چیز نئی ہونی چاہیے۔ اب روتری کچھ اس طریقے پر ہونی چاہیے کہ وہ روتری تو ضرور ہو لیکن معلوم نہ ہو کہ روتری کی جا رہی ہے ـــــ اگر ہم یہ مقصد اپنے طور پر نہ حاصل کر سکے تو ہم اپنے کلب کے لیے چند کوچ باہر سے بلائیں گے۔

ایک آواز: یہ کوچ کیا ہے ـــ؟ کیا اس پر ہمارے ممبر بیٹھا کریں گے۔

قربان میاں: یہ وہ کوچ نہیں ہے بلکہ جس طرح کرکیٹ، ٹینس، فٹ بال وغیرہ کی ٹرننگ دینے کے لیے کوچ ہوتے ہیں نا! اسی طرح ہمیں چند روتری ماسٹروں کی خدمات درکار ہوں گی۔

ایک آواز: ٹھیک ہے، ٹھیک ہے لیکن انھیں باہر سے بلانے کی کیا ضرورت ہے؟

قربان میاں: خیر اس مسئلے پر بعد میں غور کیا جائے گا ـــ ایک اور اہم بات جو مجھے آپ سے کہنی ہے وہ اس کلب کی فیس کے بارے میں ہے ـــ دوستو! اس کلب کی کوئی فیس نہیں ہوگی (تالیاں) تالیاں بجا کر خوش نہ ہوئیے اگر فیس نہ ہوگی تو کلب چلے گا کیسے؟ اس کلب کے لیے ہم چندہ جمع کریں گے۔ روتری کلب کا فرض ہے کہ اس کے ممبروں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اس کلب کا خرچ ان لوگوں کو دینا ہوگا جو اس کے ممبر نہ ہوں (تالیاں)۔ ہم اپنے کلب کے ممبروں کو بڑے بڑے شہروں کی سیر بھی کرائیں گے۔ سینما اور سرکس بھی دکھلائیں گے۔ اور چند سال بعد ہم ایک "روتری نمائش" بھی کریں گے۔ (تالیاں)

دوستو! اب یہ جلسہ برخاست ہونا چاہیے کیونکہ آپ لوگ بہت تالیاں بجا رہے ہیں۔ اب آپ لوگ اپنے اپنے گھر جائیے اور اپنے والدین سے کہہ دیجیے کہ آپ نے اپنا الگ کلب قائم کر لیا ہے اور اگر وہ کہیں آپ کو اس کلب کا ممبر بننے کی ضرورت نہیں تو آپ روتری پر اتر آئیے ـــــ آیندہ جلسے کی اطلاع آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گی۔

(پردہ)

جناب کوثر اعظمی

دھرتی کو گلزار بناؤ



چُن چُن کانٹے دور ہٹاؤ
پریم کے پگ پگ پھول کھلاؤ
راج دلارو! ہوش میں آؤ
فرض اپنا تم بھول نہ جاؤ
دھرتی کو گلزار بناؤ

چھائی ہے چو اور اُداسی
بیاکل ہیں سنسار کے باسی
دھرتی ساری پریم کی پیاسی
پریم کی سندر جوت جگاؤ
دھرتی کو گلزار بناؤ

جگ جیون کے تم رکھوالے
پریم چلن کے تم متوالے
گلشن گلشن ہنستے لالے
ڈالی ڈالی دیپ جلاؤ
دھرتی کو گلزار بناؤ

ہنستے جاؤ، گاتے جاؤ
آگے پاؤں بڑھاتے جاؤ
بگڑے کام بناتے جاؤ
نفرت کی دیواریں ڈھاؤ
دھرتی کو گلزار بناؤ

ابن بطوطہ

چاند کے مہینوں کا حساب لگایا جائے تو اب سے چھ سو بیاسی ۶۸۲ برس پہلے مغربی ملکوں کے شہر طنجہ میں ایک بچہ پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام محمد تھا اور اس کے باپ کا نام عبداللہ تھا۔

یہ بچہ جب بائیس برس کا جوان ہوا تو اسے دنیا دیکھنے کا شوق ہوا اور یہ اپنے ماں باپ اور گھر کے چین آرام کو چھوڑ کر سفر پر چل کھڑا ہوا۔

اس نے بڑے بڑے ملکوں کی سیر کی۔ ترکوں کے شہر دیکھے، افریقہ میں پھرا۔ مکہ گیا، مدینہ گیا۔ اور دنیا کے سب سے بڑے ملک ہندوستان اور چین کی سیر کی۔ پھر اس کا نام ابن بطوطہ سیاح مشہور ہو گیا۔

اس کے بڑی مزے دار باتیں ہیں۔ خشکی کے سفر کی اور پانی کے سفر کی۔ سمندر کے جزیروں کی اور جنگلوں کی۔

یاد رکھنا یہ ابن بطوطہ کے سفر کی داستانیں ہیں تمھیں اس کا نام یاد رکھنے کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ آگے چل کر ہم اس کے سفر کی داستانیں سنانا چاہتے ہیں۔

یوں تو دنیا میں بڑے بڑے سیاح اور مسافر گزرے ہیں اور ان کے سفرنامے ہیں، مگر جو بات ابن بطوطہ کے سفر کی باتوں میں ہے وہ کسی میں نہیں ہے۔ یہ بڑے بڑے بادشاہوں سے ملا، امیروں سے ملاقاتیں کیں، درویشوں کو دیکھا، جزیروں میں گیا، جہاز کا سفر کیا۔ ہزاروں کوس خشکی میں پھرا، اور وہ چیزیں دیکھیں کہ جب تم انھیں سنو گے تو حیران ہو جاؤ گے۔

اچھا تو اب اس کی داستانیں اور سفر کی باتیں اسی کی زبان سے سننے کو تیار ہو جاؤ!

ابن بطوطہ کے سفر کی کہانی ابن بطوطہ کی زبانی۔

میں ابن بطوطہ ہوں۔ مجھے دنیا دیکھنے کا شوق ہوا تو میرے جی میں سب سے پہلے یہ آیا کہ مکہ شریف

اور مدینہ طیبہ جاؤں۔

مکہ جس میں بیت اللہ، اللہ کا گھر ہے اور مدینہ جس میں خدا کے رسول محمد صلے اللہ علیہ وسلم اپنے مرقد مبارک میں آرام فرما رہے ہیں۔

گھر سے چلا تو راستے میں بیسوں شہر آئے میں سوداگروں کے قافلے کے ساتھ تھا جو تجارت کا سامان لے کر جا رہے تھے۔

پہلا شہر تلمسان آیا جہاں کا بادشاہ ابوتاشقین عبدالرحمٰن تھا۔ پھر تونس ہو کر الجزائر پہنچ گیا۔ یہاں میری ملاقات ابوعبداللہ زبیدی سے ہوئی۔ ان دنوں مجھے بخار آ رہا تھا۔ ابوعبداللہ زبیدی نے میری بڑی خاطر کی اور کہنے لگے ایسی حالت میں کہ تمھیں بخار ہے سفر نہ کرنا چاہیے۔ تم میرے پاس رہو، تندرست ہو کر سفر کرنا اچھا ہے۔

میں نے کہا زبیدی صاحب میں مکہ اور مدینہ کی نیت سے سفر کر رہا ہوں۔ راستے میں موت بھی آ جائے تو کیا ہے نیت کا پھل مجھے مل جائے گا۔ تندرستی اور بیماری تو ساتھ ساتھ رہتی ہے۔

بے چارے زبیدی صاحب خاموش ہو گئے، اور میں گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔

اب میں نے قافلے کا ساتھ چھوڑ دیا خیال یہ ہوا کہ لٹیرے قافلوں پر حملہ کرتے ہیں اکیلے مسافر کو نہیں ستاتے۔ راستے میں بخار تیز ہوا تو پگڑی سے اپنے آپ کو گھوڑے سے کس لیا۔ کہیں گر نہ پڑوں۔

سفر کرتا رہا۔ شہر پر شہر آتے رہے، تونس سے قابس اور قابس سے طرابلس الغرب پہنچا۔ چار مہینے کے سفر کے بعد اسکندریہ پہنچ گیا۔ یہ مہینہ انگریزی حساب سے اپریل کا تھا پانچ تاریخ تھی اور سال ۱۳۲۶ء تھا۔

اسکندریہ

اسکندریہ بڑا شہر ہے جہاں اونچے اونچے محل اور لمبے چوڑے بازار ہیں، شہر کے باہر ایک بہت اونچی پتھر کی لاٹ کھڑی ہے۔ یہ لاٹ اتنی موٹی اور اتنی اونچی ہے کہ دیکھ کر عقل دنگ ہو جاتی ہے۔

اسکندریہ کی لنگرگاہ جہاں کشتیاں اور جہاز ٹھہرتے ہیں اتنی عظیم الشان ہے کہ میں نے اپنے پورے سفر میں اتنی بڑی لنگرگاہ نہیں دیکھی۔ اسکندریہ کے

عجائبات میں شہر کے باہر کھجوروں کے جھنڈ میں ایک مینارہ بنا ہوا ہے، نیچے چار چبوترے ہیں جن پر مینارہ ٹکا ہوا ہے معلوم نہیں کس زمانے میں بنایا گیا ہے۔

اسکندریہ کے درویش

اسکندریہ میں بڑے بڑے درویش ہیں، ان میں شاہ برہان الدین بڑے درجے کے درویش ہیں۔ میں جب ان سے ملنے گیا تو مجھے دیکھتے ہی فرمایا تیراجی دنیا کی سیر کو چاہتا ہے، میں نے عرض کیا۔ جی تو چاہتا ہے مگر مشکل ہے۔ فرمایا سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی، پھر فرمایا جب تو ہندوستان جائے تو سندھ میں میرے بھائی رکن الدین سے پنجاب میں فریدالدین سے اور چین میں میرے ہم نام برہان الدین سے ملاقات ہوگی۔ ان سب سے میرا سلام کہنا۔

میں سوچنے لگا کیا اتنا بڑا سفر میری قسمت میں لکھا ہے؟ خدا کی قدرت کہ جو کچھ شیخ نے فرمایا تھا وہی ہوا اور میں نے لاکھوں کوس کا سفر کیا۔ ہندوستان کا بھی، چین کا بھی اور سندھ کا بھی اور جن بزرگوں کا شیخ نے نام لیا تھا ان سب سے ملاقات ہوئی۔

رخصت کرتے وقت شیخ نے مجھے کچھ روپیے دیے جب تک یہ روپیے میرے پاس رہے کبھی خرچ کی تنگی نہ ہوی۔

ہندوستان کے سمندری سفر میں ڈاکوؤں نے ہمارا جہاز لوٹا تو یہ روپیے بھی لوٹ لئے جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہا۔

ایک دوسرے بزرگ

اسی طرح ایک دوسرے بزرگ سے ملاقات ہوئی کمبل کا چوغہ پہنے ہوئے تھے، میں جب ان سے ملنے گیا تو بڑی خاطر کی، گرمی کی راتیں تھیں فرمایا خانقاہ کی چھت پر سوجاؤ کوٹھے پر گرمی کم ہے نیند اچھی آئے گی۔

چھت پر پہنچا تو پانی سے بھرا گھڑا، ایک چٹائی اور وضو کے لیے لوٹا رکھا تھا، سویا تو بڑے آرام کی نیند آئی۔

سوتے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑے اڑنے والے جانور پر سوار ہوں اور وہ مجھے قبلہ کی طرف اڑا کرلے گیا ہے، پھر اتر کی طرف، پھر دکن کی طرف پھر پورب کو لیے چلا گیا ہے۔ او

اندھیرے میں جہاں دور تک سبزہ پھیلا ہوا ہے چھوڑ دیا ہے۔ صبح اٹھا تو شیخ نے مجھ سے پوچھا کیا تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ میں نے پورا خواب سنایا تو فرمایا تمھیں حج کی سعادت حاصل ہوگی، مدینہ پاک کی حاضری میسر آئے گی۔ عراق، ترکوں کے شہروں اور ہندوستان کی سیر کروگے۔ ہندوستان میں مدت تک رہوگے، اور میرے دینی بھائی (دل شاد ہند) سے ملاقات ہوگی اور وہ تمھیں ایک بڑی مصیبت سے بچائے گا۔ یہ کہہ کر کچھ پیسے دیے اور روٹی دے کر رخصت کر دیا۔

ایسا باکمال درویش میں نے عمر بھر نہیں دیکھا۔ ہاں ہندوستان میں ایک بڑے کامل سے ملاقات ہوئی جن کا نام سیدی مولے تھا۔
پھرتے پھراتے مصر، قاہرہ پہنچا۔

قاہرہ میں بارہ ہزار سقّے ہیں جو پانی بھرتے ہیں، کرایہ پر چلنے والے تیس ہزار خچّر اور گدھے ہیں، ۳۶ ہزار کشتیاں ہیں جو مصر سے دمیاط تک سامان لاد کر آتی جاتی رہتی ہیں۔

یہی مصر ہے جس میں فرعون نے خدائی کا دعوے کیا تھا۔ یہاں بڑی بڑی حویلیاں ہیں امیروں کے بنگلے ہیں، اونچے اونچے محل ہیں۔ بازاروں میں اتنی بھیڑ ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ بڑے بڑے عالم ہیں۔ اچھی بری، سب طرح کی مخلوق یہاں بستی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کا موجیں مارتا ہوا سمندر ہے جو ہر طرف سے چڑھتا چلا آتا ہے۔

مسجدیں

مصر کی مسجدیں اتنی رونق دار ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ پانچوں وقت نمازیوں سے کھچا کھچ بھر جاتی ہیں۔

مسجد حضرت عمرا بن خاص

ان میں ایک مسجد عمرا بن خاص کی مسجد ہے۔
یہ وہی عمرا بن خاص ہیں جو امیر معاویہ کے زمانے میں مصر کے گورنر تھے اور باتدبیر لوگوں میں تھے۔

مصر میں اسکولوں اور مدرسوں کی گنتی بھی مشکل ہے۔ گلی گلی اسکول اور مدرسے ہیں۔ ہر طرف علم کا چرچا ہے، شفا خانے بھی کثرت سے ہیں۔ بیماروں کے آرام کا ایسا اچھا انتظام ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ ایک شفا خانہ ہے

جس کا روزانہ خرچ ساڑھے تین ہزار کا ہے۔
اب تم ہی سوچو کہ یہ شفا خانہ کیسا ہوگا۔

مصر کی خانقاہیں

مصر کے امیروں کو خانقاہیں بنانے کا بڑا شوق ہے۔ ان خانقاہوں میں دور دور سے درویش آکر ٹھہرتے ہیں اور ہر ایک کے لیے دل پسند کھانے کا انتظام ہے۔ گرمی میں درویشوں کو ٹھنڈے اور سردی میں گرم کپڑے بنائے جاتے ہیں، اوپر کے خرچ کے لیے الگ ملتا ہے۔ کم سے کم دس ورنہ بیس روپیہ ماہانہ۔ حجامت اور صابن کا خرچ الگ ملتا ہے۔

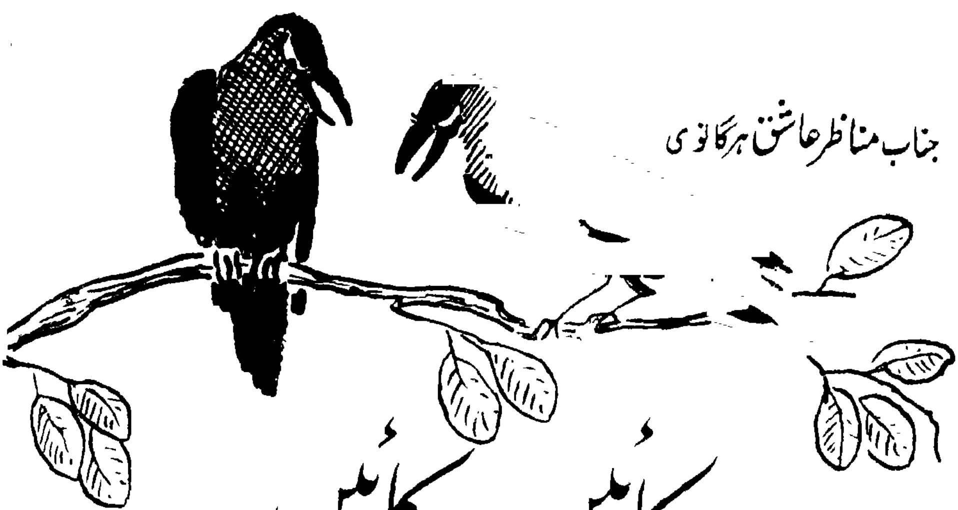
درویشوں کا کام

ان درویشوں کا کام یہ ہے کہ پانچوں وقت جماعت سے نماز پڑھیں۔ رات کو خانقاہ سے باہر نہ جائیں۔ یہ درویش صبح صبح مصلے بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں اوّل قرآن پاک پڑھتے ہیں تبارک الذی کی سورت، پھر انا فتحنا کی سورت پھر عم یتساءلون۔ اس کے بعد ایک پارہ تلاوت کرتے ہیں۔ پھر ایک قاری بلند آواز سے کلام پاک پڑھتا ہے۔ عصر کی نماز کا وقت آتا ہے تو جس طرح صبح کی نماز میں سورتیں پڑھی جاتی ہیں اسی ترتیب سے پڑھتے ہیں۔

جب کوئی نیا درویش آتا ہے تو اس کی وضع دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔
کمر کسی ہوئی، داہنے ہاتھ میں لوہے کی جریب، بائیں ہاتھ میں لوٹا کندھے پر جا نماز۔ جوں ہی دربان دیکھتا ہے کھڑا ہو جاتا ہے۔ حال پوچھتا ہے اور پھر اس نئے درویش کو ٹھہرنے اور رہنے کی جگہ بتا دیتا ہے۔

بال بچّے والے درویشوں کی خانقاہیں الگ ہیں اور کنواروں کی الگ ہیں۔

جناب مناظر عاشق ہرگانوی



کائیں ..... کائیں

آج کی یا دو چار سو سال کی نہیں ہزاروں سال پہلے کی بات ہے، اس وقت ہمارے دیس میں بہت سے لوگ جانوروں کی بولی کو اچھی طرح سمجھ لیتے تھے ـــ ان جانوروں میں درندے، پرندے، چرندے سبھی تھے اور ان کی بولیوں کو سمجھنے والے لوگ "علم زجر" کے ماہر یا اہلِ کمال سمجھے جاتے تھے۔

آیئے! آج آپ کو ہزار سال پہلے کا واقعہ سنائیں۔ جھوٹ سچ راوی کی گردن پر، اسے کہانی سمجھ کر نظر انداز مت کیجیے گا بلکہ اس یقین کے ساتھ پڑھیے گا کہ ہزار سال پہلے ہمارے پُرکھے زجر کا علم یعنی جانوروں کی بولی جانتے تھے۔

صابور[1] نامی مقام سے ایک تاجر نے خشکی کے راستے سے لوبارہ[1] جانے کا ارادہ کیا۔ پہلے وہ وہاں کے مقامی راجہ کے پاس پہنچا اور درخواست کی کہ "اے جہاں پناہ! میں تجارت کی غرض سے لوبارہ جانا چاہتا ہوں۔ آپ میری اور میرے مال کی حفاظت کے لیے ایک آدمی ساتھ کر دیں تو کرم ہوگا۔"

---

[1] یہ دونوں جگہیں ہندوستان کا ساحلی شہر اور بندرگاہ تھیں۔

"بہتر!" راجہ نے جواب دیا اور اپنے دربار کے ایک پیادے کو تاجر کے ساتھ کر دیا

دونوں آدمی اپنے ساتھ کھانا اور دوسرا ضروری سامان ساتھ لے کر سفر پر روانہ ہوگئے۔ دونوں چلتے رہے ـــ چلتے رہے، یہاں تک کہ ھابور سے میلوں دور باہر نکل آئے۔ اب دو تو تھک گئے تھے اور انھیں بھوک اور پیاس معلوم ہو رہی تھی۔ چلتے چلتے انھیں پانی سے بھرا تالاب اور تالاب کے کنارے ایک باغ نظر آیا تو تھوڑی دیر ستانے اور کھانے پینے کے لیے وہیں ٹھہر گئے۔

آرام کرنے کے بعد دونوں نے تالاب میں ہاتھ منہ دھویا اور چاول اور ترکاری نکال کر کھانے لگے۔ جب چاول کا آخری لقمہ بھی ان کے منہ میں چلا گیا تو اسی وقت ایک کوا ایک پیڑ پر سے اتر کر ان کے سامنے تھوڑے فاصلے پر آ کر بیٹھ گیا اور "کائیں کائیں" کرنے لگا۔

"آپ جانتے ہیں یہ کوا کیا کہہ رہا ہے؟" تاجر کے رفیق نے کہا۔

"نہیں" تاجر نے جواب دیا۔

"یہ کہہ رہا ہے کہ جس چاول کو تم لوگوں نے کھایا ہے اس میں میرا بھی حصّہ تھا اور میں اس کو ضرور کھا کر رہوں گا!"

"لیکن اب یہ بے چارہ کیسے کھا سکے گا؟" تاجر نے اپنے رفیق کی اس "منطق" کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ مانیں یا نہ مانیں مگر کوا یہی کہہ رہا ہے" تاجر کے رفیق نے بے بسی سے کہا ـــ پھر چند لمحے کے لیے وہاں سناٹا چھا گیا جیسے کوے کی کائیں کائیں نے توڑا۔ وہ باغ کی دوسری سمت اڑتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

دونوں نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور آگے روانہ ہوگئے ـــ دونوں مزے سے اپنا سفر طے کرتے رہے اور چلتے چلتے پانچ چھ میل آگے نکل آنے کے بعد اچانک انھوں نے چند آدمیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا اور تاجر نے محسوس کیا کہ اس کا ساتھی کچھ پریشان ہو رہا ہے اور اضطراب کی حالت میں ہے۔ ابھی وہ اس سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ خود بخود بڑبڑایا "میں ان لوگوں سے لڑنا چاہتا ہوں"

"کیوں؟" تاجر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مجھ میں اور ان لوگوں میں بہت پرانی دشمنی ہے اور آج جب سامنا ہوا ہے تو...."

ابھی وہ کہہ ہی رہا تھا کہ آنے والوں میں سے ایک نے خنجر نکال لیا اور باقی اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے زمین پر پچھاڑ کر خنجر اس کے پیٹ میں گھونپ دیا اور اس کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ تاجر کو کچھ سوچنے سمجھنے یا مداخلت کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔

اپنے ساتھی کو مرتے دیکھ کر تاجر نے بھاگنا چاہا مگر اس کے پاؤں مَن مَن بھر وزنی ہو گئے چلنے کی سکت باقی نہ رہی، اس کی سانس پھول گئی اور آنکھوں تلے اندھیرا چھاتا چلا گیا ـــــ اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے صرف اتنا سنا کہ وہ لوگ اس سے کہہ رہے تھے "تم کیوں ڈرتے ہو، ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں، دشمنی تو اس شخص سے تھی اور اب یہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔"

جب اسے ہوش آیا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کوّے پر پڑی جو انھیں تالاب کے کنارے نظر آیا تھا اور اب مرے ہوئے ساتھی کے پھٹے ہوئے پیٹ سے چوچاول باہر نکل پڑے تھے انھیں چُن چُن کر کھا رہا تھا ـــــ حیرت سے تاجر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اس نے محسوس کیا کہ اس کا ذہن ایک بار پھر ڈوبتا چلا جا رہا ہے ـــــ تاریکیوں میں ـــــ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں۔

جناب یعقوب راہی

میرے گاؤں کے ننھے بالک

ہے وشواس یہ ننھے بالک
بن جائیں گے نہرو گاندھی
دنیا پر یوں چھا جائیں گے
علم و عمل کی جیسے آندھی
کوئی وطن کا ہوگا سپاہی
کوئی ہوگا قوم کا رہبر
فخرِ گلستاں بن جائیں گے
نازِ چمن کو ہوگا ان ہی پر
دنیا سے بیگانہ ہو کر
کھیل رہے ہیں آج آنگن میں
اِن کو دیکھ کے یوں لگتا ہے
جیسے کھِلے ہوں پھول چمن میں
علم و عمل کی اچھی باتیں
اِن کو سِکھانا فرض ہے اپنا
خدمتِ قوم و وطن کا رستہ
اِن کو دِکھانا فرض ہے اپنا

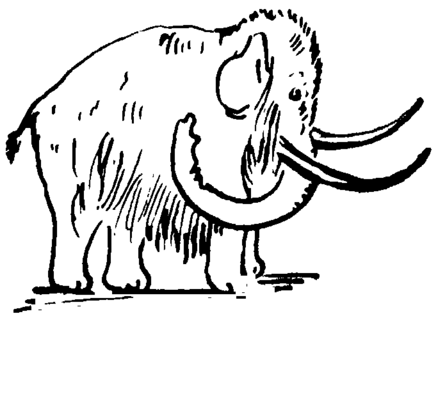
جناب شمس رحمانی قریشی



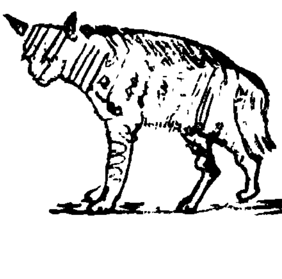
کچھ انوکھے جانور

لیجیے آج ہم آپ کو ایسے چند جانوروں کے بارے میں معلومات کراتے ہیں جن کے نام کم ہی سننے میں آتے ہیں۔ توقع ہے پسند آئے گا۔

میمتھ :۔ چونکہ یہ جانور اس دور میں نایاب ہے اس لیے اگر آپ ہاتھی اور میمتھ کی تصویریں دیکھیں گے تو پہچان نہ سکیں گے کہ کون سی تصویر ہاتھی کی ہے اور کون سی میمتھ کی۔ دونوں جانور ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ یہ اب سے لاکھوں برس پہلے دنیا میں پایا جاتا تھا۔ شمالی امریکہ میں اس کے وجود کے ثبوت ملتے ہیں ماہرین کا خیال ہے کہ یہ ہاتھی کے جیسا ہوتا تھا۔ میمتھ کے دانت اوپر کی طرف مڑے ہوئے لمبے اور پتلے ہوتے تھے جسم پر موٹے اور لمبے بال ہوتے تھے۔ اور یہ سیاہ فام ہوتا تھا۔



جرک :۔ یہ جانور کتے کی قوم سے ہے اس کی عادت گیدڑ کی عادت سے بہت ملتی جلتی



ہے۔ گوشت کھاتا ہے اپنے سے چھوٹے جانوروں کا شکار کرتا ہے جیسے بھیڑ بکری وغیرہ۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک ذرا چھوٹے قد کا ہوتا ہے اس کے پورے جسم کا رنگ یکساں ہوتا ہے دوسرا بڑا اور زیادہ خطرناک ہوتا ہے اس کے جسم پر دھبّے دھبّے ہوتے ہیں یہ ایشیا اور افریقہ دونوں برّعظموں میں پایا جاتا ہے۔

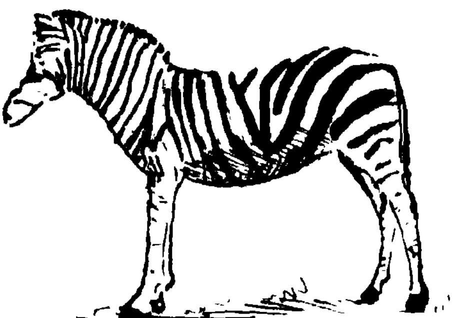
شتر مرغ: یہ تو بیشتر لوگ جانتے ہیں کہ یہ ایک پرندہ ہے اور اس سے بڑا اور کوئی پرندہ نہیں لیکن جسم کے بھاری ہونے کی وجہ سے یہ اڑ نہیں سکتا پھر بھی اس قدر



تیز دوڑتا ہے کہ تیز رو گھوڑا دوڑ کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ صحرائی علاقوں میں پائے جاتے ہیں انھیں پالا بھی جاتا ہے۔ گھاس پوس اس کی خاص غذا ہے۔

دریائی گھوڑا: یہ ۱۲-۱۳ فٹ لمبا ہوتا ہے وہیل کے بعد یہ وزن میں دوسرے نمبر پر ہے۔ یہ ڈراؤنا جانور ہے اس کا منھ دانت اور سر بہت بڑا ہوتا ہے اس کا کھانا گھاس پوس اور درختوں کے پتّے ہیں یہ صرف افریقہ کے دریاؤں میں پایا جاتا ہے۔

زبرا: اس کے جسم پر بہت خوب صورت

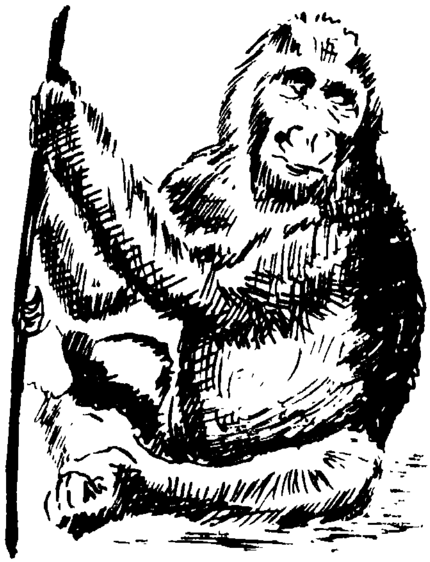


دھاریاں ہوتی ہیں۔ یہ گھوڑے سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ اسے گھوڑے کی ایک

جنگلی ذات کہہ سکتے ہیں۔ اس کا کھانا پینا وہی گھاس پوس ہے جو گھوڑا کھاتا ہے اسے لیے ہم اس کو افریقہ کا گھوڑا بھی کہہ سکتے ہیں۔

زرّاف :۔ یہ بڑا ہی خوبصورت اور عجیب جانور ہے اس کے جسم پر خوب صورت دھاریاں ہوتی ہیں اس کی لمبی گردن چلتے وقت لچکتی ہوئی اور بھی خوش نما معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ٹانگیں بھی کافی لمبی ہوتی ہیں ۔ اونچی ٹانگیں اس کے لیے بہت مفید ہیں انھی کی بدولت اونچے اونچے درختوں سے اپنی غذا فراہم کر لیتا ہے اونچی گردن سے دور دور تک کی چیز آسانی سے دیکھ لیتا ہے اور اپنے دشمن سے بھی آسانی سے بچ جاتا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے اونچا جانور ہے اور اونٹ کی طرح کئی دن تک بغیر پانی پیے رہ سکتا ہے۔

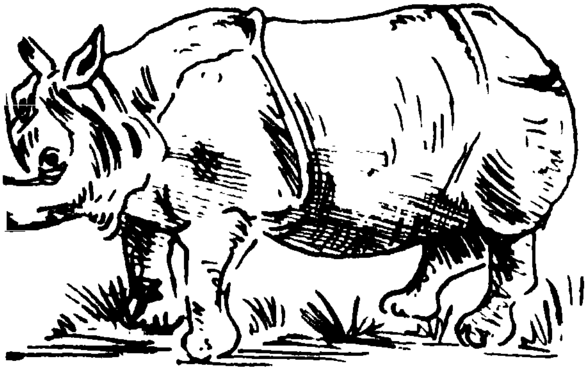
بن مانس :۔ یہ بندر کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے ویسے تو ان کی بہت قسمیں ہوتی ہیں جن میں دو خاص ہیں گوریلا اور چم پانزی۔ گوریلا بہت خطرناک ہوتا ہے اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے یہ بہت ہوشیار جانور ہے ایک بار دہلی کے چڑیا گھر میں کچھ لوگ بن مانس کے



کے قریب کھڑے ہو کر اس کی شوخ مزاجی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ایک شخص نے دوسرے شخص سے بن مانس کو سگریٹ دینے کے لیے کہا اس شخص نے منھ اٹھا کر منع کر دیا۔ بن مانس یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے قریب آکر منع کرنے والے کے اتنے زور کا طمانچہ رسید کیا کہ اپنے تیز پنجوں سے شکل بدل دی۔

ببون :۔ جنوبی افریقہ میں زیادہ اور مغربی افریقہ میں کم پائے جاتے ہیں۔ یہ بندر کی قسم کا ہے۔ عام جانوروں کی طرح یہ کوئی خطرناک

جانور نہیں ہوتا۔ ہمارے یہاں کے کتے بلیوں کی طرح افریقہ میں عام ہوتا ہے۔ یہ انسان سے ڈرتا ہے۔ چوری چھپے رات کو اپنی غذا کی تلاش میں گھومتا ہے۔ یہ میدانی حصوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔



گینڈا: اس کی شکل خوفناک ہوتی ہے۔ افریقی گینڈے کے دو سینگ ہوتے ہیں۔ ہندوستانی گینڈے کے صرف ایک۔ گینڈا سیاہ فام ہوتا ہے۔ ہاتھی سے دوسرے نمبر پر جسامت میں اور چہرے کے علاوہ باقی جسم جنگلی بھینسے سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہ گھاس پوس اور درختوں کے پتوں پر بسر کرتا ہے۔ یہ جنوبی افریقہ اور حبش میں کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

جناب شاہد اختر کلکتوی

ہندی بچّوں کا ترانہ

ہم ہیں ہندوستانی
ہم سب ہندوستانی

ذرّہ ذرّہ اس مٹّی کا اپنی آنکھ کا تارا
اس کے دریاؤں کا پانی جیسے شہد کی دھارا
اس کی صبح اُمنگوں والی اس کی شام سُہانی
ہم ہیں ہندوستانی
ہم سب ہندوستانی
بھارت کا ترنگا لے کر مِل کر قدم اُٹھائیں
زندہ قوموں کی مانند ہم آگے بڑھتے جائیں
جب بھی اس کو پڑے ضرورت ہم سب دیں قُربانی

ہم ہیں ہندوستانی
ہم سب ہندوستانی

تہذیب کی بنیاد

(۲)

تہذیب کی بنیاد کی پہلی قسط سالنامے میں چھپی تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ پیامیوں نے اس مضمون کو عام طور پر پسند کیا۔ اب ہم اس کی دوسری قسط چھاپ رہے ہیں۔ قاعدے سے یہ دوسری قسط سالنامے کے بعد ہی والے پرچے میں چھپنی چاہیے تھی، لیکن بھی بہت سے مضمون جو سالنامے میں چھپنے کے لیے آئے تھے، اس میں چھپنے سے رہ گئے تھے۔ پہلے ان کا حق تھا، اس لیے سالنامے کے بعد والے پرچے میں ہم نے زیادہ تر وہی مضمون چھاپے۔

پہلی قسط میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ بڑی عمر کے اَن پڑھ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کی کیوں ضرورت ہے۔ اس قسط میں یہ بتایا گیا ہے کہ صرف اَن پڑھ لوگوں ہی کو پڑھنا لکھنا سکھانے کی ضرورت نہیں ہے، پڑھے لکھے لوگوں کو بھی تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔ طالب علم اس کام میں بڑی مدد کر سکتے ہیں کیونکہ ان کی تعداد بڑی ہوتی ہے۔ پھر یہ سمجھایا گیا ہے کہ طالب علم یہ کام کس طرح کر سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کو مضمون کا یہ حصہ بھی پسند آئے گا۔

۔ ایڈیٹر۔

"یہی بات سوچ کر تو جناب صدر میں نے بھی کہا تھا کہ آخر کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔" موہن لال نے عارف کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ہمیں جو بات نہ معلوم ہو، اس کے بارے میں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر یہی بات ہوتی تو آج نہ ریلیں ہوتیں، نہ ہوائی جہاز، نہ چاند پر جانے والے راکٹ۔ اب سے دس بارہ سال پہلے کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ انسان چاند تاروں تک پہنچ سکتا ہے، اب معلوم ہوا کہ چاند تاروں پر پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ بات ممکن ہے، اگرچہ پہلے کسی کو معلوم نہیں تھی۔ اسی قاعدے سے یہ بات بھی اب ثابت ہو گئی ہے کہ بڑی عمر کے لوگ بھی پڑھنا لکھنا ہی نہیں، گہرے سے گہرا علم بھی سیکھ سکتے ہیں۔"

"ریاضی اور سائنس بھی جناب صدر؟" میمونہ سائنس گروپ کی طالبہ تھی۔

"ہاں بیٹی، ریاضی اور سائنس بھی، ادب اور فلسفہ بھی، اور کیا کچھ نہیں"، تاریخ کے استاد نے یقین دلایا۔ "اور اسی بنیاد پر اب بڑی عمر کے لوگوں کو بھی تعلیم دینے کا فن ایجاد ہو گیا ہے، اسی طرح جیسے ننھے بچوں اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم دینے کا فن ہے۔ اور یہ فن جسے بالغوں کی تعلیم یا انگریزی میں 'اڈلٹ ایجوکیشن' کہتے ہیں، بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

"جی ہاں ضروری تو ہونا ہی چاہیے تاکہ ہم اپنے ملک کے ۸۰ فیصدی ان پڑھ لوگوں کو پڑھا لکھا کر مہذب بنا سکیں"، مسعود نے سنجیدگی سے کہا۔

"اسی لیے ضروری نہیں کہ ان پڑھ بالغوں کو پڑھنا لکھنا سکھانا ضروری ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ پڑھے لکھے بالغوں کو بھی تعلیم دینا ضروری ہے"، استاد نے اصلاح کی۔

"پڑھے لکھے بالغوں کی تعلیم جناب صدر! یہ بات تو سمجھ میں نہیں آئی"، بہت سے طلباء ایک ساتھ بول پڑے۔

"اس بات کو میری مثال سے سمجھو۔ میں بالغ ہوں۔ بڑی عمر کا آدمی، ہوں کہ نہیں؟"

"جی ہاں جناب والا"، بہت سی آوازیں ایک ساتھ۔

"میں نے تاریخ پڑھی ہے۔ تاریخ کی باتیں جانتا ہوں۔ لیکن مجھ سے اگر میمونہ پوچھ لے کہ ماسٹر صاحب Velocity اور Speed

ین کیا فرق ہے ؟" تو میں اسی طرح ہکا بکا اس منہ تکتا رہ جاؤں گا جیسے ایک اَن پڑھ کے ہاتھ میں کتاب دے دی جائے تو وہ ہکا بکا رہ جائے گا۔ اس طرح میں ایک سائنس داں سے پوچھ لوں کہ "جناب مغلیہ سلطنت کا زوال کیوں ہوا ؟" تو سائنس داں صاحب بغلیں جھانکنے لگیں گے۔ پورے طور پر مہذب اور تعلیم یافتہ انسان اُس شخص کو کہتے ہیں جو زندگی میں کام آنے والے تمام علوم سے تھوڑا بہت واقف ہو۔ یہ بالغوں کی تعلیم اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہے۔ اور یہ وہ کام ہے کہ کم سے کم اَن پڑھوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کا کام کہ اس میں ہر پڑھا لکھا شخص حصّہ لے سکتا ہے۔" تاریخ کے استاد نے وضاحت کی۔

"ہم لوگ بھی جناب صدر، جو ابھی خود تعلیم حاصل کر رہے ہیں ؟" بہت سی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔

"جی ہاں، آپ لوگ بھی، اور آپ لوگ زیادہ کام کر سکتے ہیں اس لیے کہ آپ لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔

"ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن" مدرسے کی گھنٹی بجی اور بات چیت کا سلسلہ ملتوی ہو گیا۔

دوسرے ہفتے کا جلسہ

آج کے جلسے میں بڑا جوش تھا۔ لڑکوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ بالغوں کو تعلیم دینے کے کام میں طالب علم بھی حصّہ لے سکتے ہیں۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ طالب علم کس طرح حصّہ لے سکتے ہیں۔ عارف میاں خاص طور پر بڑی بے صبری سے جلسہ شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ مسعود سے کہنے لگے:۔

"بھئی میں نے تو کام شروع بھی کر دیا ہے۔ میرے گھر کے پاس کھیتوں پر کام کرنے والے بہت سے مزدور رہتے ہیں۔ میرا بڑا ناک میں دم کرتے تھے:......

تاریخ کے استاد صدارت کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"کس نے ناک میں دم کر دیا تھا عارف میاں؟"

"یہی اَن پڑھ مزدوروں نے جناب صدر، جب دیکھیے، عارف میاں عارف میاں کی آواز آ رہی ہے۔ میاں ذرا میری چھٹی لکھ دو، عارف میاں

زرا منیا ڈر کا فارم بھردو..... ماسٹر صاحب یہ حالت تھی کہ اسکول جانے کے لیے تیار ہوں ادھر ان کے تقاضے، ناک میں دم تھا۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے....."

"مگر حاضری میں اکثر جماعت سے الگ کھڑا بھی تو ہونا پڑتا تھا۔" مسعود نے دبی زبان میں چٹکی لی۔

"مگر آپ نے کبھی جماعت سے غیر حاضر نہیں دیکھا ہوگا جناب، مجھے خط لکھتے لکھتے اتنی مشق ہوگئی کہ ان کام بھی کر دیتا ہوں اور دوڑ بھاگ کر اپنی جماعت میں بھی آجاتا ہوں۔ میں پڑھا لکھا آدمی ہوں، ان پڑھ کے کام سے منہ موڑ کر خدا کی ناشکری نہیں کروں گا.... اور آپ بھی تو نکالے جاتے ہیں، آپ کون سا پہاڑ توڑتے رہتے ہیں؟" عارف نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

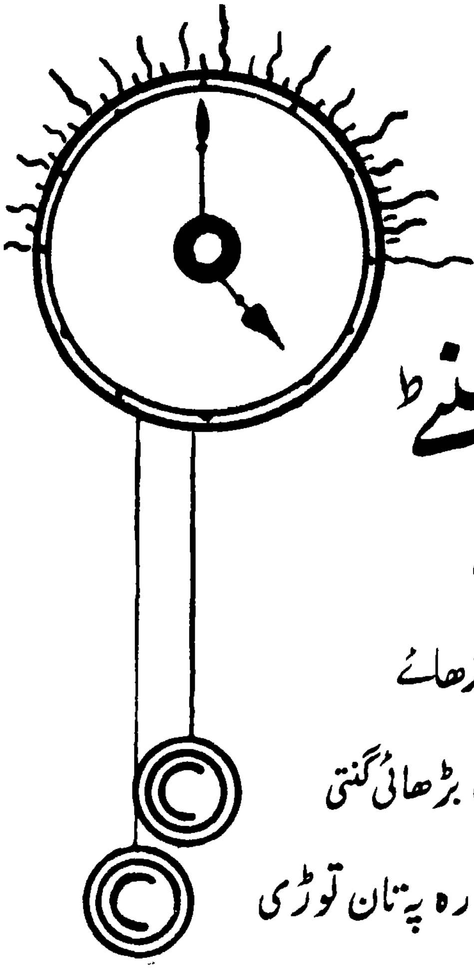
مسعود صاحب عارف میاں کی حاضر جوابی سے کچھ خاموش سے ہوگئے تھے، اب موقع پاکر پھر چھیڑا۔

"عارف میاں، یہ خدا کی ناشکری والا معاملہ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"جی ہاں جمعے تک کی نماز تو پڑھتے نہیں کہتے ہیں، خدا کی ناشکری نہیں کرتا۔" موہن لال نے بھی مسعود کے سُر میں سُر ملایا۔

"ہمارے ابّا نے، ماسٹر صاحب!" عارف میاں استاد کی پناہ ڈھونڈھتے ہوئے صفائی پیش کرنے لگے "مجھے اپنے استاد کی ایک بات سنائی تھی۔ وہ کہتے تھے جن لوگوں کے پاس مال ہے وہ خدا کا شکر اس طرح ادا کریں کہ جن لوگوں کے پاس مال نہیں ہے، انھیں اپنے مال میں سے حصّہ دیں، جن لوگوں کے پاس طاقت اور صحت ہے، وہ کمزوروں کو اپنی طاقت اور صحت میں سے حصّہ دے کر خدا کا شکر ادا کریں اور جن لوگوں کے پاس علم ہے، وہ اپنے علم میں سے بے علم لوگوں کو حصّہ دے کر خدا کا شکر ادا کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو خدا کی ناشکری ہوگی اور خدا اپنی ناشکری کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ بات تو میں جانتا ہی تھا، اس دن آپ نے حوصلہ بڑھایا تو میں نے سوچا، اب خدا کی ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔ جو لوگ خط لکھنے اور منیا ڈر فارم بھرنے کی فرمایش کر کر کے مجھے تنگ کیا کرتے ہیں، انھیں پڑھانا شروع کر دیا.... تو کبھی کبھی

(باقی صفحہ ۴۲ پر)



جناب معین شمسی ۔ کلکتہ

نیند کے گھنٹے

قدرت نے پانچ گھنٹے سونے کو ہیں بنائے
دستور نے ہمارے جو سات تک بڑھائے
پھر کاہلی نے ان کی نو تک بڑھائی گنتی
لیکن شعارِ بد نے گیارہ پہ تان توڑی
جو دیر تک ہیں سوتے، بے ہویں نمائش و کاہل
ورنہ کہیں بھلے بھی کرتے ہیں وقت زائل

انگریزی "درگوز رہائم" Hours of Sleep کا ترجمہ



دوستی   فوٹو: ایس۔ اے۔ چودھری



لوللفی
ایک سال



کہکشا
عمر ۸،



زرینہ بانو کھتری
عمر ایک سال



دو ۲ جڑواں بچے

مشتاق
عمر ۸ سال

مسلم
عمر ۸ سال



نغمہ
دو سال

رباب
ایک سال



محمد جاوید کھتری
عمر ڈیڑھ سال



محترمہ رفعت اختر علی گڑھ

انوکھا سواگت

ہم سب امتحان سے فرصت پا چکے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ دن بھر گپیں ہانکنے اور کھیلنے کودنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ ہم تلے اوپر کے بہن بھائی دن بھر گھر میں اودھم مچائے رکھتے۔ کھیلتے کودتے، لڑتے جھگڑتے، کھاتے پیتے اور سو جاتے۔ لمبے لمبے اکتا دینے والے دن ان ہی ہنگاموں میں بیت جاتے۔ اتفاق سے ان ہی دنوں ہماری چچی بھی ہمارے گھر آگئیں۔ ان کے دو چھوٹے بچے پپو اور گڈی ہمارے ہم عمر تھے۔ بس پھر کیا تھا، ہماری تو عید ہو گئی ـــــ

آخر جب اس کھیل کود سے جی گھبرا گیا تو میں نے سوچا کہیں پکنک منانے چلیں ـــ میں نے یہ تجویز بے بی، ننھی، گوٹو، پپو اور گڈی کے سامنے رکھی۔ سب خوش ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ سب بچوں نے مل کر طے کیا کہ کل صبح سویرے میڈیکل کالج کی عمارت دیکھنے چلیں۔ یہ ابھی بن رہی تھی اور ہمارے گھر سے کافی دور تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ہم سب تو بچے تھے، اکیلے کیسے

جائیں گے؟ اگر ہمت بھی کریں تو امّی ابا کہاں جانے دیں گے۔ ہم سب سوچ میں پڑ گئے — اچانک ہی ہماری چچازاد بہن گڈّی نے اپنی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں کو نچاتے ہوئے کہا، "ارے میں بتاؤں، بھائی جان اور باجی کو ساتھ لے چلیں" اور سچ جانیئے سب ہی اس تجویز پر اچھل پڑے۔

اتنے میں گوٹو بولی: پر بھئی بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا — ہم سب ہی جانتے تھے کہ بھائی جان خاص کر باجی کو کہیں ساتھ لے جانا بہت ہی مشکل تھا۔ باجی پر تو افسانہ نگاری کی دھن سوار رہتی۔ کہیں آنے جانے سے بہت گھبراتی تھیں۔ رہے بھائی جان تو انھیں گھومنے پھرنے سے فرصت نہ تھی۔ وہ بھی بس اپنے دوستوں کے ساتھ۔

غرض ہم لوگوں کے منہ پھر لٹک گئے۔ آخر یہی طے کیا گیا کہ سب ساتھ مل کر چلیں اور دونوں کو ساتھ چلنے پر تیار کریں۔ اور جناب ہماری آدھی درجن پلٹن نے بھائی جان اور باجی کے مشترکہ کمرے پر ہلّہ بول دیا — باجی کوئی نئی کہانی لکھنے میں مدہوش تھیں اور بھائی جان کہیں جانے کیلیے پر تول رہے تھے۔

بھائی جان اور باجی دونوں ہم بچوں کی نت نئی شرارت سے عاجز تھے۔ ہم سب نے جیسے ہی ان کے کمرے میں قدم رکھا، بھائی جان گھبرا کر باجی سے بولے،

"روحی، خدا خیر کرے آج یہ شیطانوں کی ٹولی ہمارے کمرے میں بھی آگئی!"

باجی نے چونک کر سر اٹھایا اور ہم لوگوں کو آتے دیکھ کر ایک دم کرسی چھوڑ کر کھڑی ہوگئیں اور تیوری چڑھا کر بولیں — "خبردار میرے کمرے میں قدم نہ رکھنا"۔ لیکن ننھی، گڈّی اور گوٹو دوڑ کر باجی سے لپٹ گئے۔ میں، بے بی اور بیّو بھائی جان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے —

اور جب ہم نے اپنا مُدعا ان دونوں کے سامنے نہایت معصومیت سے بیان کیا — تو پہلے تو دونوں نے ہمارے ساتھ کہیں بھی جانے سے صاف انکار کر دیا — پر ہم کہاں ٹلنے والے تھے — ہم نے بہت ضد کی اور خوب خوشامدیں کیں آخر بے چاروں کو ہار ماننی پڑی اور دونوں راضی ہو گئے —

اور ہم سب اپنی فتح پر اکڑتے، ہنستے، مسکراتے ان کے کمرے سے باہر آگئے —

مارے خوشی کے اُس رات ہم لوگ ٹھیک

سے سو بھی نہ سکے۔ خدا خدا کرکے رات کٹی ——
ابھی ہلکا ہلکا اندھیرا ہی تھا کہ ہم بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ سب بچوں کو منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلنے کی تاکید کرکے باورچی خانے میں جا پہنچی۔ ہمارے خانساماں صاحب تو اتنے سویرے آ نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا میں نے فوراً ہی آگ جلا کر چائے کا پانی کھولانے کو رکھ دیا۔ ناشتے کے لیے رات ہی ہم نے بہت سی چیزیں، مٹھائی حلوہ، نمکین بسکٹ اور پھل وغیرہ ایک ٹوکری میں بھر لیے تھے۔ بے بی نے وہ سب چیزیں کار میں جاکر رکھیں اور میں نے تھرماس میں چائے بھر کر بے بی کو دیدی کہ وہ یہ اس کو بھی کار میں رکھ آئے۔ اب گوٹو نے بھائی جان اور باجی کو جاکر جگایا۔ کچھ نہ پوچھیے بڑے نخروں سے دونوں اٹھے۔ اور اس طرح تیار ہونے چلے جیسے ہمارے اوپر بہت احسان کر رہے ہوں —— سب بچے پہلے ہی منہ ہاتھ دھو اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر کار میں جا بیٹھے تھے۔ ادھر میں اور بے بی بھی تیار ہوگئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد بھائی جان، باجی، میں اور بے بی باہر آئے اور سب کے ساتھ کار میں بیٹھ گئے۔ آخر بھائی جان نے اسٹرینگ سنبھال لیا۔ اور ہماری کار ہوا کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی ——

صبح کا سماں بڑا سہانا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ مرغ اذان دے رہے تھے اور کوئل اپنی پیاری آواز میں آم کے درخت پر بیٹھی اپنا راگ الاپ رہی تھی۔ میں آپ کو کیا بتاؤں اس وقت کیسا اچھا لگ رہا تھا۔ ہم بچوں نے خوب ادھم مچا رکھا تھا۔ کوئی گا رہا تھا کوئی تالیاں بجا رہا تھا۔ کوئی ہنس رہا تھا۔ پہلے تو بھائی جان اور باجی نے ہمیں شور و غل کرنے سے منع کیا لیکن پھر وہ بھی ہماری شرارتوں میں شریک ہوگئے اور ہمارا لطف دوبالا ہوگیا۔

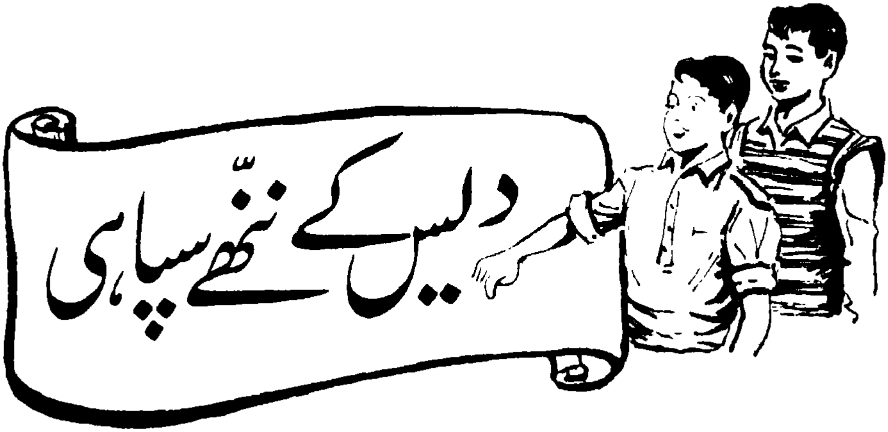
خیر چلتے چلتے ہماری کار گاندھی پارک میں پہنچ گئی۔ بھائی جان نے کار روکی ہم لوگ اتر پڑے۔ باغ میں بہت سے لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے تھے۔ بہت سے لوگ اِدھر اُدھر چہل قدمی کر رہے تھے۔ بڑوں کے علاوہ وہاں بہت سے بچے تھے۔ کچھ بچے کھیل رہے تھے، کچھ جھولا جھول رہے تھے اور بعض لڑکے کسرت کر رہے تھے —— ہم سب بھی جھولے

کی طرف بھاگے اور جھولنے لگے۔ بھائی جان اور باجی نے گراموفون کھول لیا اور لتا منگیشکر کی مدھر آواز فضا میں گونج اٹھی۔

کھیل کود کر تھک گئے تو ہم سب بھی گراموفون کے پاس جا بیٹھے۔ اور بھوک بھوک کی رٹ لگائی۔ باجی نے ناشتے دان کھولا اور ہم سب ناشتے پر اس طرح پل پڑے جس طرح مکھیاں مٹھائی سے لپٹ جاتی ہیں۔ خوب پیٹ بھر کر مزے دار چیزیں کھائیں اور چائے پی۔ جب پیٹ بھرا تو پھر چہلیں سوجھیں اور ہم لوگ باغ کی ہری بھری گھاس پر کبھی لوٹیں لگانے لگے۔ پھر بھائی جان اور باجی کے اصرار پر پھر سے کار میں سوار ہو گئے اور کار میڈیکل کالج کی عمارت کی طرف دوڑنے لگی۔ دس منٹ بعد وہاں پہنچ گئے۔ ہم لوگ کار سے اتر کر عمارت کے چاروں طرف پھیل گئے۔ نیچے کا حصہ دیکھنے کے بعد اوپر چڑھے اور پھر تیسری اور آخری منزل پر جا پہنچے۔ تیسری منزل پر جا کر ہم نے نیچے جھانکا۔ یہاں سے گاندھی پارک اور رہائشی مکانات نظر آرہے تھے۔ ہماری کار ایک طرف کھڑی ہوئی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ سامنے سڑک پر لوگ ادھر سے اُدھر جا رہے تھے۔ نیچے کے حصے میں ابھی تک چند مزدور پڑے سو رہے تھے، کچھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ایک مزدور کی چارپائی کے پاس دو کتے کھڑے تھے۔ ان کتوں نے جو ہمیں جھانکتے دیکھا تو اوپر منہ اٹھا کر زور زور سے بھونکنے لگے۔ ہم سب اُن کو بھونکتے دیکھ کر بہت ہنسے اور اوپر ہی سے انھیں خاموش رہنے کو کہا۔ لیکن اسی وقت چاروں طرف سے وہاں کئی کتے آگئے۔ اور سب نے ایک ساتھ مل کر بھونکنا شروع کر دیا۔ اُن کی آواز سے سب مزدوروں نے بھی منہ اٹھا کر ہمیں دیکھا اور کتوں کو خاموش رہنے کو کہا۔ پھر ہم نے دیکھا اُن کتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے ہوں اور بے تحاشا عمارت کے اس حصے کی طرف بھاگے جہاں سے اوپر چڑھنے کا راستہ تھا۔ اب تو ہم لوگوں کے حواس گم ہو گئے۔ ہم سب گھبرا کر چیخے اور نیچے دیکھ کر مزدوروں سے ڈانٹ کر کہا "انھیں روکو نا! دیکھ کیا رہے ہو"۔ دو مزدور لکڑیاں لے کر

کتوں کے پیچھے بھاگے۔ اور باقی آدمیوں نے نیچے ہی سے انھیں پکارنا شروع کر دیا۔ مگر کتے کہاں ماننے والے تھے۔ اتنی ہی دیر میں وہ ہمارے پاس پہنچ گئے تھے اور قریب تھا کہ ہم سے لپٹ جائیں کہ وہ مزدور آگئے اور انھوں نے بڑی مشکل سے انھیں آگے بڑھنے سے روکا۔ اور نیچے کی طرف بھگانا چاہا ـــــ وہ کتے نیچے جانے کے بجائے دوڑ دوڑ کر ہماری طرف آرہے تھے۔ یہ تعداد میں آٹھ نو سے کم نہ تھے۔ ہم لوگ مارے ڈر کے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے بغرض بڑی مشکل سے انھیں مار کر نیچے بھیجا ـــــ ہم لوگوں کی حالت خراب تھی۔ ایک مزدور ہمارے ساتھ ہی رہا۔ اور ہمیں ہماری کار تک پہنچا آیا۔ اور کار جب تک چل نہیں پڑی کتے اسی طرح منہ اٹھا اٹھا کر بھونکتے رہے۔

سب بچوں کی شوخی و شرارت ہوا ہو چکی تھی۔ سب سہمے ہوئے اور خاموش تھے۔ یہاں تک کہ بھائی جان اور باجی بھی بالکل چپ تھے۔ اس طرح ہمیں گھور رہے تھے جیسے ساری غلطی ہماری ہو اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ ہم سب ہی اُن دونوں کو زبردستی اپنے ساتھ لائے تھے۔ جب کار عمارت کی حدود سے باہر نکل گئی تب ہمارے حواس درست ہوئے۔ بھائی اور باجی نے گھر جا کر ہماری جو گت بنائی وہ ظاہر ہی ہے۔ حالانکہ ہم باجی سے برابر کہتے رہے کہ ہماری وجہ سے آپ کو کہانی کے لیے ایک نیا پلاٹ مل گیا۔ مگر باجی کی تیوری چڑھی ہی رہی۔ گو کہ یہ سچ ہے کہ انھوں نے چند ہی دن بعد اس واقعے کی کہانی لکھ ڈالی۔ جو کسی ماہنامہ پرچے میں چھپ بھی چکی ہے ـــــ بہرحال کتوں نے ہمارا جس طرح سواگت کیا وہ ہمیشہ یاد رہے گا آپ مانیں نہ مانیں ہمارے لیے تو یہ ایک چھوٹا موٹا انڈونیچر ہو گیا۔



ہم سب ننھے منے بچے   رکھشک[1] ہندوستان کے

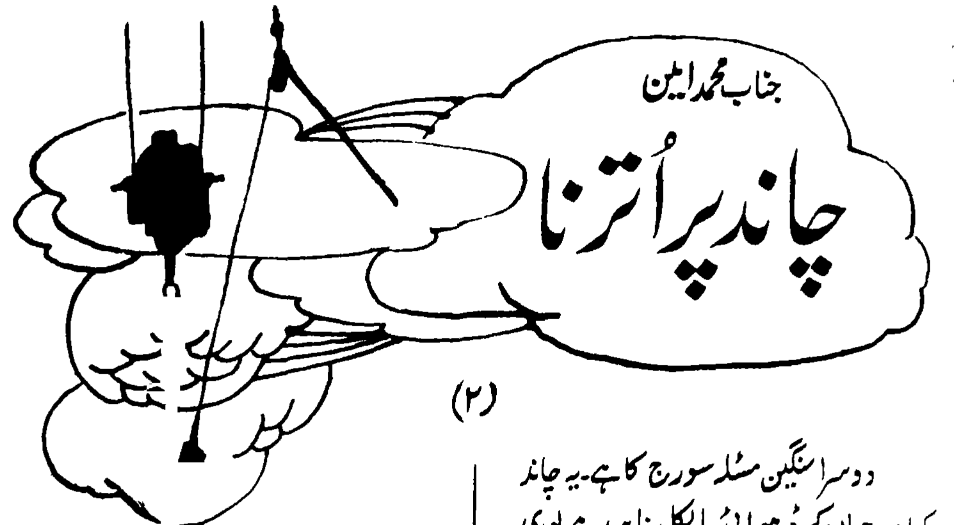
امن کا حامی دیس ہمارا   سب سے پریم ہمارا نعرا
سکھا گیا جو نہرو پیارا   وہ آدرش ہے سب سے نیارا

اپنا ہو یا کوئی پرایا   دوست ہیں ہر انسان کے
ہم سب ننھے منے بچے   رکھشک ہندوستان کے

دیس ہمارا سُندر سُندر   جنت کا ایک روپ زمیں پر
بھارت کی ہر بات منوہر   چھوٹے بڑے سب ایک برابر

ہم ہیں تن من دھن سے صدقے   اپنے دیس کی شان کے
ہم سب ننھے منے بچے   رکھشک ہندوستان کے

---
[1] محافظ



جناب محمد امین

چاند پر اُترنا

(۲)

دوسرا سنگین مسئلہ سورج کا ہے۔ یہ چاند کے اوپر جہاں کرۂ ہوائی بالکل ناپید ہے پوری آب و تاب کے ساتھ نہایت خطرناک طریقے سے چمکتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سورج کے نسبتاً "خاموش دور" (سورج ہمیشہ ایک دور سے نہیں گزرتا۔ کبھی اس میں طوفان آتے ہیں، کبھی خاموشی چھا جاتی ہے) میں بھی اس کے گردنا (خارجی لپٹوں) میں سے اکس رے کی شدت کی لہریں، گاما نام کی لہریں، نیوٹران، پروٹان اور الکٹران آتی رہتی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جب سورج میں طوفان آتے ہیں تو بہت ہی خطرناک اور طاقت ور قسم کے ذرّات آتے رہتے ہیں اوران کی رفتار ایک سیکنڈ میں ایک ہزار میل سے زیادہ ہوتی ہے۔ جب کبھی سورج میں ہنگامہ



برپا ہوتا ہے یا طوفان آتے ہیں تو چاند کے اوپر سورج کی حدت یا گرمی سو گنا تیز ہو جاتی ہے۔ انگلستان کے پروفیسر برنارڈ لول (جو ابھی حال میں سوویت اکیڈمی آف سائنس کے مہمان

کے طور پر روس میں وہاں کے خلائی تجربہ گاہوں کا دورہ کرنے گئے تھے) کا کہنا ہے کہ سورج کی بڑھتی ہوئی حدّت اور خلا باز کو چاند کی سطح سے زندہ واپس لانے کی دقت نے روسیوں کے ارادے پست کر دیے ہیں۔

اس کے باوجود خلا کے سوٹ کی ڈیزائن بنانے والے ماہرین کو توقع ہے کہ وہ ایسا لباس بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے جو خلا باز کو سورج کی تپش سے محفوظ رکھے گا لیکن طاقتور اور تیز پروٹان اور بیچ بیچ میں کسی خطرناک طوفانی لہروں کے خلاف محفوظ رکھنے کا سوال ٹیڑھا ہے۔ بہرحال کوشش برابر جاری ہے اور لباس کو اتنا موٹا بنانا پڑے گا کہ اس کا پہننے والا یعنی خلا باز مرنے نہ پائے۔

بہت تیز آنے والے پروٹان کو ہم دوربین کی مدد سے دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں اور اس کے بارے میں خلا باز کو آگاہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح خطرناک طوفانوں کی وجہ سے ریڈیو کی آواز میں جو بار بار گڑبڑ ہوتی ہے اُن سب کو سمجھا جا سکتا ہے اور وہ ذرّے جو زمین کے اوپر وان اُلن کے ریڈی ایشن کے خطے میں مقناطیسی طوفان پیدا کرتے ہیں اُن کو پہچانا جا سکتا ہے اور مشاہدے کے ذریعے ریڈی ایشن کی حدّت یا گرمی میں جو غیر معمولی تیزی پیدا ہوتی ہے اس کی وارننگ کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ریڈیو کی مدد سے چاند کی سیاحت کرنے والے مسافر کو آگاہ کیا جا سکتا ہے کہ خطرے کے وقت وہ کس طرح اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ یا تو وہ اپنے اترنے والے جہاز میں بھاگ کر پناہ لے سکتا ہے یا پھر وہ چاند کو چھوڑ کر بھاگ جائے اور اس کے اوپر گھومنے والے خلا کے جہاز میں واپس چلا جائے۔

اس سلسلے میں بعض سائنس والوں کا اندازِ فکر بالکل نرالا ہے۔ اپولو کا جو موجودہ پروجیکٹ ہے اس کے منصوبے کے مطابق چاند میں جو دو ہفتے کا دن ہوگا تو اس کے لحاظ سے دوپہر کے بعد چاند پر قدم رکھنا مناسب ہوگا لیکن لاک ہڑ کی سورج کی تجربہ گاہ کے ڈاکٹر ایچ۔ بی۔ کول مین اور نیشنل ایروناٹکس اور خلا کے ایڈمنسٹریشن کے ڈاکٹر یوجین شومیکر دونوں اس کے مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ چاند پر جب رات ہو اس وقت وہاں اترنا چاہیے تاکہ چاند خود بھی خلا باز کی مدد کر سکے اور سورج کی خطرناک اور چکا چوندھ کرنے

والی شعاعوں سے محفوظ رکھ سکے۔

سوال یہ نہیں ہے کہ رات کو اترتے وقت چاند پر بڑا اندھیرا رہے گا۔ زمین کے سمندر، بادل، ان سب کی وجہ سے وہاں بڑی روشنی رہے گی اور چاند سے جتنی روشنی ہم کو ملتی ہے اس سے پانچ گنا زیادہ تیز روشنی چاند والوں کو زمین سے ملے گی۔ چاند کے رقبے سے زمین کی سطح کا رقبہ چودہ گنا بڑا ہے اس طرح زمین کی چمک چاند کی چمک کے مقابلے میں ستر گنا زیادہ تیز ہوگی۔ ڈاکٹر کول مین اور شو میکر کا کہنا ہے کہ "زمین کی یہ چمکیلی روشنی سیاحوں کو کسی چیز کا مشاہدہ کرنے اور دیکھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آنے دے گی بلکہ چاند کے افق تک وہ آسانی سے دیکھ سکیں گے اور اپنے باریک سے باریک آلوں کی عدد کو بھی وہ صحیح صحیح پڑھ سکیں گے۔"

بہرحال خلاباز جب بھی اتریں گے اُن کو بڑے غضب اور شدت کی گرمی اور سردی سے پالا پڑے گا۔ چاند پر جب رات ہوتی ہے تو اس کی سطح کا درجۂ حرارت ۱۸۵ ڈگری نفی سینٹی گریڈ (فرن ہائٹ کے حساب سے صفر سے ۳۰۰ ڈگری نیچے یا نفی) کے آس پاس منڈلاتا رہتا ہے۔ اس بلا کی اور برف سے زیادہ ٹھنڈی فضا میں مؤثر سے مؤثر دھات جو کہ اب تک معلوم کی جا چکی ہے وہ بھی ایک سیاح کو زیادہ دیر تک منجمد ہونے سے نہیں بچا سکتی جب تک کوئی ایسی ترکیب نہ ہو کہ اس کا سوٹ مسلسل گرم رہے۔

دن میں کیا حالت ہوگی؟ چاند کا درجۂ حرارت دن میں پانی کے نقطۂ اُبال سے بہت اوپر رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ایک سیاح روشنی والے حصّے سے سایے میں قدم رکھے گا تو اسے زبردست اتار چڑھاؤ سے پالا پڑے گا اور ایک دم درجۂ حرارت تین سو ڈگری گر جائے گا۔ ماہرین اور انجینیئر یہ جاننے سے قاصر ہیں کہ درجۂ حرارت کے اتنے اتار چڑھاؤ میں وہ کون سی ایسی ترکیب کریں کہ خلاباز شدت کو جھیل جائے۔

خلا کے متعلق تحقیق کرنے والے بہت سے سائنس والوں کو ایک اور بھی خطرہ ہے۔ وہ یہ کہ چاند پر گرد کی ایک تہہ بیٹھی ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے چاند پر اترنا اگر ناممکن نہیں تو کم سے کم مشکل ضرور ہے۔ چاند کی سطح سے ٹکرا کر راڈر کے سگنل جو آتے ہیں ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاند کی سطح بہت ملائم اور چکنی ہے۔

حالانکہ پہلے ایسا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چاند پر اونچے پہاڑ ہیں اور بہت گہری گہری وادیاں اور گڑھے بھی ہیں۔ لیکن چاند کے بعض حصّوں میں ہموار میدان بھی ہیں۔

چاند گرہن کے وقت وہاں کا درجۂ حرارت بہت گر جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں بہت ہی مہین گرد و غبار کی تہہ بیٹھی ہوئی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ کروڑوں اربوں سال سے گرمی اور سردی کا جو اُتار چڑھاؤ ہوتا رہا ہے اس سے چٹانیں گھس رہی ہیں اور ریڈی ایشن اور شہاب ثاقب کے جو دھاکے ہوتے ہیں ان کی وجہ سے چٹانیں پس کر پاؤڈر کے مانند باریک ہوتی جا رہی ہیں۔

مشاہدہ اور تحقیق کرنے والے قریب قریب سبھی سائنس داں اس بات سے متفق ہیں کہ چاند پر گرد ہے لیکن اختلاف کا نقطہ یہ ہے کہ گرد کی تہہ کتنی موٹی ہے۔ نوبل پرائز ونر ڈاکٹر ہیرلڈ یوری کا دعویٰ ہے کہ گرد کی تہہ موٹی نہیں ہے بلکہ ایک جھلّی کے مانند ہے جس کی موٹائی ایک انچ کے آٹھویں حصّہ کے برابر ہے۔ مشی گن یونیورسٹی کی ریڈیو لاجی لیبوریٹری کے پروفیسر کے۔ ایم۔ سیگل کی دلیل ہے کہ راڈر اور تھرمل کے جو اعداد و شمار ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرد کی تہہ چاند پر صرف چند میٹر موٹی ہے لیکن کارنل یونیورسٹی کی ریڈیو فزکس اور خلا کے ریسرچ کے مرکز کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ٹامس گولڈ کا دعویٰ ہے کہ چاند کی ۴ ارب سال کی لمبی تاریخ کی مدت میں اگر سال بہ سال اس کی چٹانیں گھسنے کی رفتار ہلکی سے ہلکی بھی ہو تو اس کے حساب سے گرد کی تہہ کم سے کم ایک میل سے کم موٹی نہیں ہوگی۔ نیشنل ایروناٹکس اور خلا کے اڈمنسٹریشن کے ڈاکٹر ہومر نیول نے امریکہ کی کانگریس کی خلا کی کمیٹی کے سامنے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ "واقعتاً چاند کی سطح پر کوئی اس قسم کی جالا نما چیز اگر موجود ہے تو خطرہ ہے کہ چاند پر اترنے والا پہلا خلا کا جہاز گرد کی تہہ میں دھنس کر ہماری نظروں سے غائب نہ ہو جائے"۔

روسی سائنس داں بھی چاند کی سطح کا مطالعہ بڑی تندہی سے کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چاند کی سطح کیچڑ نما ہے۔ کوئی اس پر قدم رکھے گا تو اس میں چپک جائے گا جیسے مکھی گڑ میں

چپک جاتی ہے۔

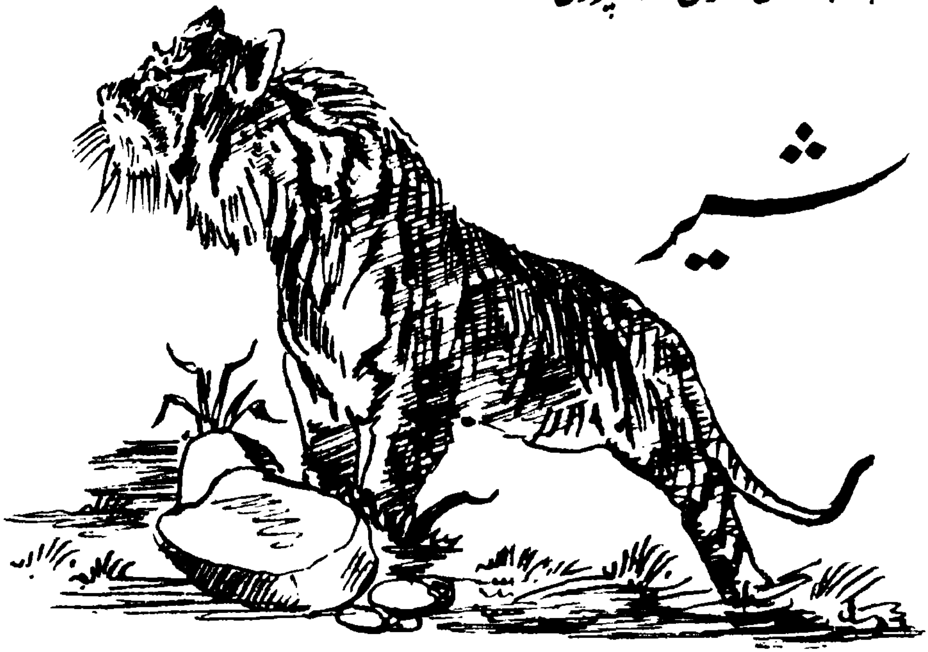
سائنس دانوں کو اپنے سوالوں کے جواب اسی وقت مل سکتے ہیں جب وہاں بغیر انسان کے خلا کا جہاز اترے گا اور اس میں پیمائش کرنے والے آلے اور ٹیلی ویژن کے کیمرے فٹ ہوں گے اور وہ ریڈی ایشن چھوٹے چھوٹے شہاب ثاقب اور گرد و غبار کے بارے میں بتائیں گے۔ نیشنل ایرو ناٹکس اور خلا کے اڈمنسٹریشن کا فیصلہ ہے کہ سنہ ۱۹۶۷ء تک انسان چاند پر ضرور اتر جائے گا گویا صرف تین سال میں یعنی اس قلیل مدت میں سائنسدانوں کو چاند کے متعلق ہر طرح کی معلومات فراہم کرنی ہے تاکہ پریشانی نہ ہو۔

چاند کے متعلق جو لوگ تحقیق کر رہے ہیں اُن کو خدشہ ہے کہ ممکن ہے کہ وقت متعینہ کے اندر اندر ہم کو سب باتوں کا علم نہ ہو سکے۔ پھر اس صورت میں بھلا کیا ہو گا؟

اس کا حل؟ — اس کا حل یہ نہیں ہے کہ امریکہ اور روس دونوں اپنے ریسرچ کی رفتار کم کر دیں بلکہ یہ ہے کہ اپولو کا جو پلان ہے امریکا کے سائنس دانوں کو چاہیئے کہ رفتہ رفتہ اسے کامیاب بناتے چلیں۔ چاند پر انسان کو بھیجنے کا فیصلہ اسی وقت کیا جائے جبکہ چاند کے متعلق جتنی راز کی باتیں ہیں ان سب کا حال اچھی طرح معلوم ہو جائے۔ روس نے پچھلے سال یعنی ۱۹۶۵ء میں چاند پر وہاں کے حالات معلوم کرنے کے لیے ایک راکٹ اتارنے کی کوشش کی تھی لیکن افسوس! کہ یہ راکٹ چاند کی سطح سے جا کر ٹکرا گیا اور اس طرح اس کے آلے اور دوسری مشینیں ٹوٹ کر پاش پاش ہو گئیں۔ مکمل حالات معلوم ہونے کے بعد ہی انسان کو وہاں بھیجا جائے تاکہ حالات سے باخبر رہنے والی دنیا یہ جان سکے کہ انسان کی حفاظت کے لیے جتنے بھی ممکن طریقے تھے وہ استعمال کیے گئے اور حفاظت سے اتارنے اور صحیح و سالم واپس لانے کے سلسلے میں سائنس نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

جناب احسن رضوی دانا پوری

شیر



سر سے پا تک ایک ہیبت ہوں میں جنگل کی پناہ
بن میں ہے میری حکومت، میں یہاں کا بادشاہ

نام میں ہے دبدبہ میرے تو صورت پر وقار
کانپتی ہے راجدھانی گونجتی ہے جب ڈکار

رخ ہوا تبدیل کرتی ہے میری آواز سے
سانس لیتی ہے زمیں سہمے ہوئے انداز سے

طنطنہ ہے ٹھاٹ میں شوکت ہے میری چال میں
اینڈتا ہوں جھوم کر خود نشۂ اقبال میں

میں بیابانِ عمل میں ہوں متاعِ افتخار
زندگی کی میں تڑپ ہوں زندگی میری شکار

ایک پُر اسرار دہشت میری خاموشی میں ہے
چشم پوشی میرے قانونِ سزا کوشی میں ہے

زور خود اعلان کرتا ہے کہ کس سے زیر ہوں
حوصلہ آواز دیتا ہے کہ ہاں میں شیر ہوں

یہ فاعلن کیا ہے

جناب احمد وقار واثقی

(رضوان احمد فاعلن، فاعلن مفاعیلن کی گردان کر رہا ہے اور کچھ لکھتا جا رہا ہے۔)

جاوید: (آتے ہوئے) اوہو، منّے میاں یہ فاعلن کی رٹ کیوں لگا رکھی ہے؟ کیا شاعری شروع کر دی؟

رضوان: ارے! بھائی جان!! کچھ نہیں یوں ہی لکھ رہا تھا۔

جاوید: آخر کیا لکھ رہے تھے، ہمیں بھی تو بتاؤ۔

رضوان: کل بڑے بھائی جان نے فاعلن فاعلن کرتے ہوئے ایک شعر لکھ لیا تھا، میں نے سوچا میں بھی لکھ لوں۔

جاوید: ہوں، یہ بات ہے،... پھر لکھا کچھ؟

رضوان: اوں ہُنہ .... آپ بتائیے نا یہ فاعلن کیا ہے اور شعر کیسے لکھتے ہیں؟

جاوید: صاحبزادے ابھی کچھ پڑھو، کیا ملے گا تمھیں اس چکر میں پھنس کر۔

رضوان: مگر میں کچھ سمجھنا چاہتا ہوں۔ اسکول میں سب لڑکے مجھ سے شعروں کے مطلب پوچھتے ہیں۔ کہتے ہیں تم شاعر کے لڑکے ہو

بتاؤ؟ پہلے یہ بتایئے شعر کہتے کسے ہیں؟؟

جاوید: کسی ایک مضمون کو دو مصرعوں یعنی سطروں میں لکھ دیا جائے۔

رضوان: جیسے .... میں چچا جان کو لکھوں
بہت دنوں سے سلمیٰ آپا کا خط نہیں آیا
کیا وہ ہم سے ناراض ہو گئی ہیں

جاوید: نہیں، یہ تو نثر ہو گئی، شعر نہیں بنا۔ شعر میں وزن ہوتا ہے، وہ گایا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک لے ہوتی ہے۔ اس مضمون کو اس طرح لکھیں تو شعر بن جائے گا۔

سلمیٰ آپا کا خط نہیں آیا
ہم سے ناراض ہو گئی ہیں کیا

رضوان: واقعی یہ تو شعر بن گیا، میں اسے گا سکتا ہوں، مگر یہ شعر میں وزن کیا معنی! شعر میں یہ باٹ ترازو کہاں سے آ گئے؟ ابا میاں کے پاس تو باٹ ترازو کچھ بھی نہیں پر وہ شعر لکھ سکتے ہیں۔

جاوید: باٹ اور ترازو شاعر کے ذہن میں رہتے ہیں۔

رضوان: خوب ..... اپنی سمجھ میں تو خاک نہیں آیا۔

جاوید: سمجھ جاؤ گے، کوشش کرو، شاعر لفظوں کو اس ترتیب سے لکھتا ہے کہ اس میں لے پیدا ہو جاتی ہے۔

رضوان: یہ بات تو سمجھ لی مگر وہ باٹ والی بات؟

جاوید: ابھی تم جو الفاظ گنگنا رہے تھے نا، فاعلن مفاعیلن یہی باٹ ہیں۔

رضوان: بھائی جان آپ تو پہیلیاں بجھا رہے ہیں یہ فاعلن مفاعیلن ایسا معما ہیں جنھیں کوئی حل نہیں کر سکتا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے!

جاوید: میرے عزیز سمجھنے کی بات تو ایسی ہے کہ بہت سے بڑے بڑے پڑھے لکھے بھی اسے نہیں سمجھ سکتے۔

رضوان: تو پھر ہم بھی سمجھ کر کیا کریں گے؟ کون سر کھپائے، پڑھے لکھے تو مانے جائیں گے نا؟

جاوید: ہاں ٹھیک ہے، مگر ایک بات ہے، اگر تم شاعر بن گئے تو اس کے بغیر بڑی کمی رہے گی؟

رضوان: بھائی جان اس بات سے دو سوال پیدا ہوں گے۔ پہلا تو یہ کہ اس کے جانے بغیر لوگ شاعر بھی بن جاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ

کیا شاعر بننا ضروری ہے؟

جاوید: ہاں بہت سے موزوں طبع لوگ اس علم کے بغیر بھی شعر لکھ لیتے ہیں، مگر کہیں کہیں ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ سوال یہ کہ شاعر بننا ضروری ہے کہ نہیں؟ یہ کوئی ضروری نہیں، مگر شعر کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس علم سے واقف ہونا ضروری ہے۔

رضوان: ہوں... مطلب یہ کہ اس کے بغیر ایک کمی رہ جاتی ہے کیا نام ہے اس علم کا۔

جاوید: اسے علم عروض کہتے ہیں۔

رضوان: تھوڑا بہت تو سمجھا ہی دیجیے کبھی کام آئے گا۔

جاوید: تم نے "پیام تعلیم" کے 'سالنامے' میں سید حرمت الاکرام صاحب کی نظم 'دقت' ضرور پڑھی ہوگی۔

رضوان: ہاں ہاں کیوں نہیں اچھی نظم ہے۔

بچو وقت کی قیمت سمجھو
کیسی ہے یہ دولت سمجھو

جاوید: دیکھو اس کے باٹ میں فعلن، فعلن فعلن کیسی فعلن ہے یہ فعلن، دولت فعلن ہے، سمجھو فعلن۔

رضوان: آہا، سمجھ میں آگیا؟

جاوید: کیا سمجھے؟

رضوان: 'فعلن' میں چار حرف ہیں اسی طرح 'کیسی' میں بھی چار حرف ہیں دونوں ایک وزن کے ہوگئے۔

جاوید: اچھا اگر کسی مصرعہ کا پہلا لفظ کیسی کے بجائے 'کسی کی' ہو تو کون سا رکن یعنی باٹ کام میں لوگے۔

رضوان: کسی... کی.... آں... فعلن... نہیں۔ کسی کی پہلا حرف ساکن ہے.... مفاعیلن نہیں.... اس میں حرف زیادہ ہیں.... کسی کی۔ فعولن... فعولن ہوا۔

جاوید: شاباش بالکل سمجھ گئے۔ اچھا علامہ اقبال کا ترانہ تو تم اسکول میں پڑھتے ہی ہو، اس کا وزن بتاؤ۔

کون سا ترانہ.... سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا.... اس کا وزن.. سارے فعلن، جہاں سے فعولن، اچھا فعلن ہندوستان مفاعلن، ہمارا فعولن۔

بالکل ٹھیک، تم کو جو طریقہ بتایا اس پر تم نے ٹھیک ٹھیک عمل کیا، مگر یہ ارکان

ترانے کے نہیں بنے اس کے ارکان ہیں
مفعول، فاعلاتن، مفعول فاعلاتن۔

رضوان: ہوں!..... تو... تو بھائی جان یہ لفظ جہاں کا ج' سارے سے مل جائے گا

جاوید: ہاں یہ باتیں تم جب تفصیل سے علم عروض اگلی کلاسوں میں پڑھوگے تو سمجھ جاؤ گے۔ تم نے بہت کچھ سمجھ لیا اب زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں آئندہ چھٹی کے روز کچھ اور باتیں بتائیں گے۔

رضوان: شکریہ۔

(بقایا صفحہ ۲۷ کا)

ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسکول کا کام نہیں ہوتا اور مجھے جماعت سے ....“ عارف میاں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

”نہیں نہیں، دل چھوٹا نہ کرو عارف میاں تم بہت اچھا کام کر رہے ہو، خدا مبارک کرے“! تاریخ کے استاد نے عارف میاں کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا ”مسعود اور موہن لال میاں تم لوگ بڑے ہو، بڑے اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ محبت سے پیش آتے ہیں، اور عارف میاں نے تو بہت اچھا کام شروع کیا ہے۔ تم لوگوں کو تو ان کی ہمت بڑھانی چاہیے“

”کمزوروں کو اپنی طاقت اور صحت میں سے حصہ کیسے دیا جا سکتا ہے ماسٹر صاحب“ شمیم میاں ڈیل ڈول کے لحاظ سے ذرا کچھ پہلوان واقع ہوئے تھے۔

”کمزوروں کو طاقت وروں کے حملے سے محفوظ رکھ کر، اور بیماروں کی خدمت کرکے، جیسے میمونہ ہے اس کو کوئی ستائے تو اس کی مدد کرکے، کیوں عارف میاں!“ ماسٹر صاحب نے عارف کے آنسو پونچھنے کی غرض سے انھیں مخاطب کیا۔

(باقی آئندہ)



چند پرانے سائنس داں

آرشمیدس

آرشمیدس ۲۸۷ ق۔م میں سریکوس (سسلی) میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد ایک اچھے حساب داں تھے۔

بچپن میں آرشمیدس نے اسکندریہ (یونان) میں تعلیم حاصل کی۔ اس کی ایجادوں میں گھڑیاں، پانی کے اسکروز (Water screws) اور ونڈلاسیز (wind lasses) وغیرہ اور بہت سی مشینیں بیان کی جاتی ہیں۔

جب روم والوں نے سریکوس پر حملہ کیا تو آرشمیدس نے اپنے بادشاہ کو بہت سے سیدھے (Plane) اور ابھرے ہوئے (concave mirror) شیشے بنوانے کا مشورہ دیا اور پھر آرشمیدس نے ان کے ذریعے سورج کی روشنی منعکس (Reflect) کی اور اس طاقت کے ذریعے روم والوں کو برباد کیا۔

اس کی سب سے بڑی تحقیق آرشمیدس کا اصول (Archimedes Principle) ہے۔ اس کی تحقیق کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔

سسلی کے بادشاہ ہیرو نے ایک بار ایک سونے کا تاج بنوایا۔ جب تاج بن گیا تو شاہ نے اعلان کیا۔

"جو اس سونے کے تاج کو اصلی یا نقلی ثابت کرے گا اسے انعام واکرام سے نوازا جائے گا!"

مگر شرط یہ تھی کہ وہ تاج توڑا نہ جائے۔ اور بغیر تاج توڑے کوئی بھی کچھ ثابت نہ کر سکتا تھا۔ آرشمیدس نے کچھ دن تک غور کیا مگر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

ایک بار وہ ایک ٹب میں نہا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ اس کے وزن کی وجہ سے پانی کی سطح کچھ بڑھ گئی۔

اور اس نے سوچا کہ مختلف وزن والی چیزیں جب پانی میں ڈالی جائیں گی تو وہ مختلف حجم کا پانی ہٹائیں گی۔ اور اس تحقیق کے ذریعے آرشمیدس سونے کے تاج کو اصلی یا نقلی ثابت کر سکتا تھا۔

وہ اپنی کھوج پر اتنا خوش ہوا کہ ٹب سے فوراً کودا اور دوڑ کر بادشاہ کے محل کی طرف گیا۔ وہ چیختا جا رہا تھا ــــ

"یوریکا ــ یوریکا [یونانی زبان ــــ میں نے پالیا ــ میں نے پالیا۔]

یہاں تک کہ وہ خوشی میں اپنا لباس پہننا بھی بھول گیا۔

اس کے بعد ۲۱۲ ق.م میں روم کا حملہ پھر ہوا۔ رومی سپاہیوں نے شہر پناہ اور دروازہ توڑ دیا۔

کچھ رومی سپاہی آرشمیدس کے گھر میں داخل ہوئے۔ وہ اس وقت ریت پر جیومیٹری کی ایک شکل بنا کر اس میں کھویا ہوا تھا۔ اس کو رومی سپاہیوں نے للکارا ــ

"سامنے آؤ"

مگر آرشمیدس اپنی شکل میں محو تھا جب رومی آرشمیدس کی شکل کے قریب آئے تو وہ چیخا ــــ

"مجھے مار دو ــــ مگر میری شکل مت بگاڑو"

اور یہ تھے اس عظیم سائنس داں کے آخری الفاظ۔ اور پھر وہ قتل کر دیا گیا۔ اور اس کی وہ شکل بھی مٹ گئی۔



جناب حافظ باقوی

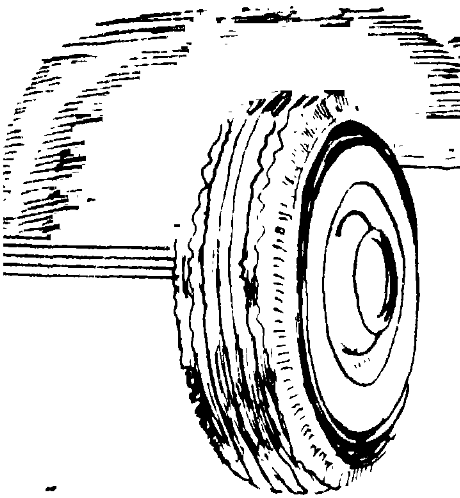
شہزادی نکہت

ہے یہ چمن کی راج دلاری — اس کی حکومت کیاری کیاری
پھول ہی اس کا راج بھون ہے — راجا گل، یہ اس کی دلہن ہے
جب یہ چلے گلشن میں مہک کر — دل کی کلی کھل جائے چٹک کر
اتنی لطیف اور ایسی کومل — آنکھ سے پھر بھی ہے وہ اوجھل
اس پہ فدا شبنم کے موتی — باغ نہ ہوتا یہ جو نہ ہوتی
ریشۂ گل ہے اس کی سجیا[1] — اس پہ یہ سوئے میٹھی نندیا
نور کے تڑکے چھوڑ کے بستر — بادِ صبا کے رتھ پہ چڑھ کر
سیر کو ہر دن جاتی ہے یہ — کیا ہی من کو بھاتی ہے یہ
نورِ سحر سے دل ہیں روشن — اس سے مہکا سارا گلشن

بچو! تم ہو پھول کی صورت
تم میں بھی ہو "پسج" کی نکہت

---

[1] سیج



جناب ریاض آفندی

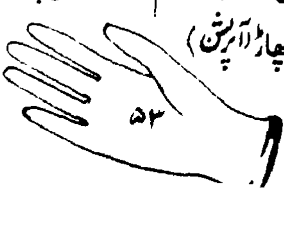
چارلس گڈّایر

بچو! کیا کبھی تم نے اپنی اچھلنے کودنے والی گول مٹول گیند پر غور کیا ہے؟ کیا تم نے کبھی موٹر، لاری، بس، سائیکل اور ہوائی جہاز کے پہیوں کے بارے میں سوچا ہے؟ کبھی تم نے اس چھوٹی سی چیز کے متعلق معلوم کرنے کی کوشش کی ہے جو پنسل یا روشنائی کے لکھے کو مٹاتی ہے؟ بجلی کے قمقموں کو جس وائر کے ساتھ جوڑا جاتا ہے، کیا کبھی تم نے اس کی بناوٹ کے بارے میں کسی سے پوچھ تاچھ کی ہے؟ اور نہ جانے ایسی کتنی بے شمار چیزیں ہیں جنھیں تم روز کسی نہ کسی طرح استعمال ہوتے ہوئے دیکھتے ہو، لیکن شاید کبھی تم نے ان کے بارے میں یہ جاننے کی کوشش نہیں کی ہوگی کہ وہ کس چیز کی بنی ہیں؟ کس طرح بنی ہیں؟ مثلاً چھوٹے بچوں کا نپل ہی لے لو جس سے وہ دودھ پیتے ہیں، دستانے جنھیں ڈاکٹر چیر پھاڑ (آپریشن) کے وقت اپنے ہاتھوں میں پہنتا ہے۔ برساتی اور جوتے جنھیں تم برسات کے موسم میں اپنے بچاؤ کے لیے پہنتے ہو۔

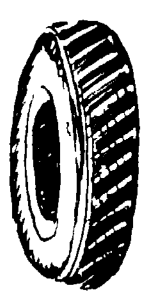


اب اگر ہم تم سے یہ پوچھیں کہ یہ تمام چیزیں کس سے بنی ہیں؟ تو تم کہو گے کہ لو یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! لیکن ذرا یہ تو بتاؤ کہ اس بے کار سی شے کو کام میں لانے کا گر تمھیں کس نے بتایا؟ اچھا! اب خاموش ہو گئے!! خیر جانے دو ہم ہی تمھیں بتاتے ہیں۔

اپنے دیس میں رہتے سہتے، گھومتے پھرتے،



بہت دن ہوئے ہیں۔ اس اثنا میں تم نے کیا کہیں گڈ ایر کا نام پڑھا یا سنا ہے۔ ہمارے خیال سے اگر تم نے پڑھا نہیں تو سنا ضرور ہوگا۔ اصل میں یہ نام ایک بہت بڑے کارخانے کا ہے، جہاں پر بسوں، موٹروں،



لاریوں، سائیکلوں کے پہیے بنائے جاتے ہیں، اور اسی نام سے یہ پہیے مشہور بھی ہیں۔ شاید اب تم پوچھو گے کہ اس کارخانے کا نام گڈ ایئر کیوں ہے؟ تمھارا سوال بالکل بجا ہے۔ اور ہم یہی چاہتے تھے کہ تم ہم سے یہ سوال پوچھو۔ تو آؤ تمھارے اس سوال کا جواب ذرا تفصیل سے دیں

ہمارے دیس سے دور بہت دور مغرب کی طرف ایک دوسرا دیس ہے جسے ہم سب امریکہ کہتے ہیں۔ ہاں وہی امریکہ جس کے صدر جان کینڈی تھے۔ اور جو ہمارے چاچا نہرو کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ تو اسی جان کینڈی کے دیس میں ایک غریب شخص رہا کرتا تھا۔ جس کا نام چارلس گڈ ایئر تھا۔ چارلس گڈ ایر غریب تھا، لیکن تھا بڑا ہوشیار اور چالاک۔ بس ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچا کرتا۔ اور ہمیشہ نئی نئی چیزیں بنانے کی فکر میں رہتا۔ اسے ایک روز کسی کام کے لیے لوہے کے کھل بندن کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ لوہار کی دوکان پر گیا۔ لوہار نے اسے بہت سارے کھل بندن بتلائے، لیکن اسے پسند نہیں آئے۔ البتہ انھیں دیکھ کر ایک عجیب وغریب خیال اس کے ذہن میں آیا اور بس اس خیال کے آتے ہی وہ دوکان سے واپس ہوا۔ دوکاندار نے اسے بلاتے ہوئے کہا: "صاحب اس سے اچھی چیز آپ کو کہیں نہیں ملے گی"۔ گڈ ایئر نے جواب دیا: "میں اس سے بھی اچھی چیز آپ کو بنا کر بتاؤں گا"۔ دوکاندار نے حیرت سے پوچھا: "کس طرح؟"، گڈ ایئر نے کہا: "میں لوہے کی بجائے ربڑ کا کھل بندن بناؤں گا جو لوہے کے اس کھل بندن سے بہت اچھا ہوگا"۔ دوکاندار نے کہا: "صاحب ربڑ تو سب سے خراب چیز ہے۔ گرمی میں پگھل کر پھیلتا ہے اور اس میں بدبو آتی ہے، سردی میں سکڑ کر سخت ہو جاتا ہے اور ٹوٹ جاتا ہے"۔ لیکن گڈ ایئر نے اس کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا اور وہاں سے چل دیا۔

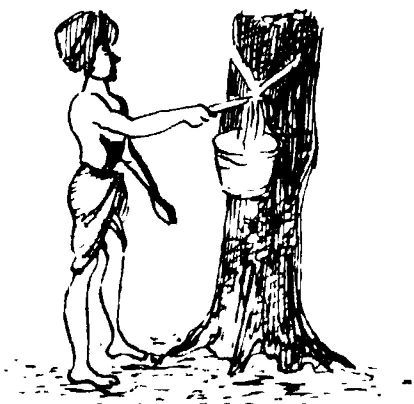
اس کے بعد سے وہ دن رات ربڑ کے متعلق سوچا کرتا۔ اس کے علاوہ اس کے دماغ میں اور کوئی بات نہیں ہوتی۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے اس کے ذہن پر ربڑ ہی سوار رہتا۔ وہ روزانہ باورچی خانے میں ربڑ کو

پکاتا، اس میں طرح طرح کی دوائیاں ملاتا کبھی اسے پھیلا کر سکھانے کو رکھتا۔ کبھی مختلف قسم کے سانچوں میں ڈال کر اسے ٹھوس صورت میں بدلنے کی سوچتا غرض وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی بھی طرح وہ ایسا ربڑ تیار کرے جس پر گرمی اور سردی کا کوئی اثر نہ ہو۔

کئی تجربے کرنے کے بعد ایک شام گندھک ملا ہوا ربڑ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چولھے پر گرا اس وقت اسے دیکھ کر تعجب ہوا کہ گرنے کے بعد چولھے کی حرارت سے نہ وہ پھیلا، نہ اس میں کسی قسم کی بدلوائی، اور نہ وہ ٹوٹا۔ بس یہ معمولی سی بات اس کی کامیابی کا راز بنی۔ اس کے بعد اس نے مختلف تجربات کے ذریعے ربڑ کو اس قابل بنایا کہ اس سے موٹر، بس، لاری، سائیکل، ہوائی جہاز کے پہیے، کھلونے، پمپ، دستانے، برساتیاں، جوتے، گیند، تھیلیاں، پٹے، بوتلیں اور دوسری استعمال کی چیزیں بنا سکیں۔

گڈ ایئر جس زمانے میں ربڑ پر تجربات کر رہا تھا اس وقت اس کی عجیب سی حالت تھی۔ اس زمانے میں لوگ اسے دیکھ کر کہتے کہ اگر تم ایک ایسے آدمی کو دیکھو جس کے سر پر ربڑ کی ٹوپی ہو، جو ربڑ کے جوتے، ٹائی اور صدری پہنتا ہو اور جس کے ہاتھ میں ربڑ کا خالی پاکٹ ہو تو سمجھ لو کہ وہی چارلس گڈ ایئر ہے۔ اس کے اس حلیے کو دیکھ کر لوگوں نے اسے 'ربڑ مین' کہنا شروع کر دیا تھا۔

اب یہ بات تو تمھیں معلوم ہو گئی کہ کس نے دنیا کو ربڑ کے استعمال سے واقف کرایا ؛ لیکن شاید اب بھی یہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آئی ہو گی کہ جس ربڑ سے یہ تمام چیزیں بنتی ہیں وہ بذات خود کیا چیز ہے ؟ آؤ چلتے چلتے یہ بات بھی معلوم کر لیں۔

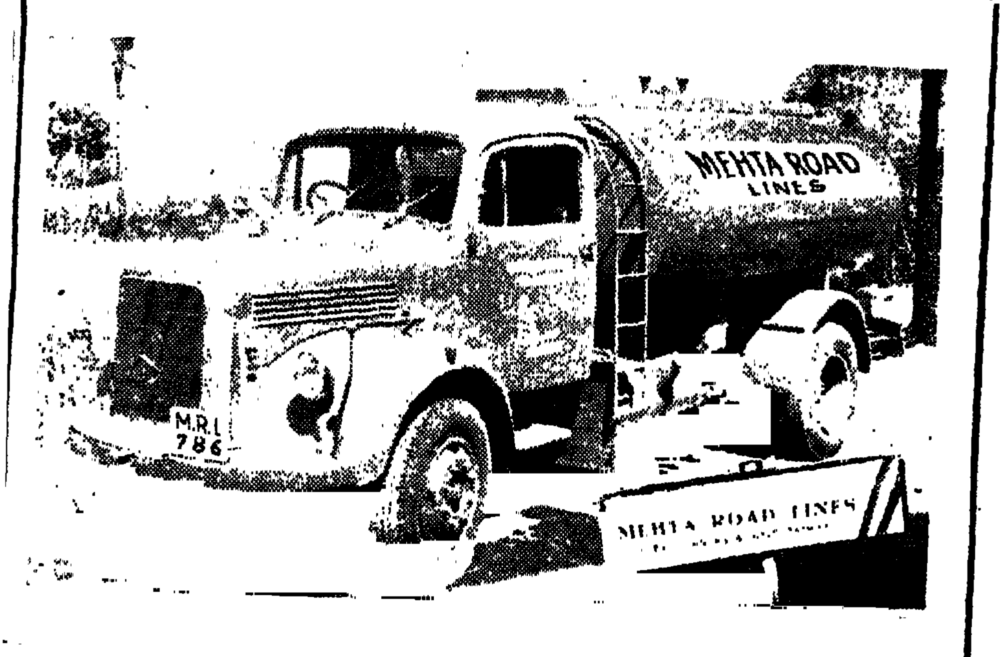


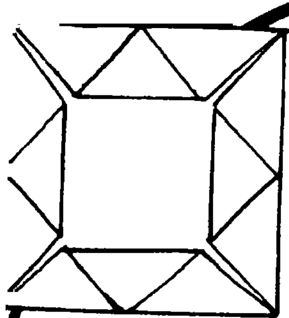
ربڑ کے درخت ہوتے ہیں۔ اس درخت کے تنوں سے ایک قسم کا رس نکلتا ہے۔ اس رس کو پکا کر ربڑ بناتے ہیں۔ اس کے درخت گرم خطوں کے جنگلات میں پائے جاتے ہیں۔ گرم خطوں سے مراد

خط استوا کے قریب کے علاقے مثلاً دریائے ایمزن اور دریائے کانگو کی وادیوں، جزائر شرق الہند، جزائر غرب الہند، برما، سیلون اور ملایا۔

درخت کے تنوں سے رس نکالنے کے لیے اس کے تنوں کو ترچھا کاٹ کر ایک برتن ان سے باندھ دیا جاتا ہے۔ جب برتن رس سے بھر جاتے ہیں تو اس وقت ایک گاڑی جس میں ایک بڑی سی ٹنکی لگی ہوتی ہے، آکر ان برتنوں کا رس اکٹھا کر لیتی ہے اور سب جمع کیا ہوا رس ربڑ کے کارخانوں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں پر رس کو پکا کر اسے ٹھوس ربڑ کی شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے، اور پھر اس ٹھوس ربڑ سے ہمارے استعمال کی اور ضروریات کی تمام چیزیں بنتی ہیں۔

تو یہ ہے اس ربڑ کی کہانی جس کے استعمال سے ہم دو تین سو سال پہلے ناواقف تھے۔ یہ چارلس گڈ ایئر کی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے کہ آج ربڑ ہماری ضرورتوں کو پورا کر رہا ہے۔





جناب اقبال مہدی

فوٹو فریم

"فوٹو" اور "فریم" دونوں انگریزی زبان کے لفظ ہیں۔ میں نے بہت سوچا کہ "فوٹو فریم" کو اردو میں کیا کہیں گے "تصویر کا چوکھٹا؟"

"تصویر" تو اچھا لفظ ہے۔ سننے میں بھلا معلوم ہوتا ہے، لیکن "چوکھٹے" کا لفظ کھٹکتا ہے جیسے کسی نے کان پر کھٹ سے ہتوڑا مار دیا ہو۔ پھر یہ بھی ہے کہ آدمی کے چہرے کو بھی کبھی کبھی "چوکھٹا" کہہ دیا جاتا ہے۔

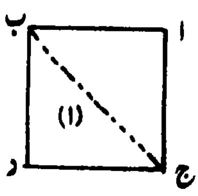
خیر! "چوکھٹا" اچھا ہو یا برا، اپنی تصویر ہر شخص کو اچھی لگتی ہے اور وہ اس کو احتیاط سے رکھنا چاہتا ہے۔

اپنے عزیزوں اور دوستوں کی تصویریں بھی اپنے پاس جمع رکھنے کی خواہش ہم سب کو ہوتی ہے۔

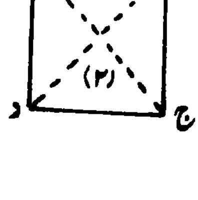
ایسی تصویروں کو محفوظ رکھنے کے لیے خاص طرح کی کاپیاں استعمال کی جاتی ہیں جنھیں البم کہتے ہیں۔

کچھ تصویریں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اخباروں اور رسالوں میں چھپتی ہیں اور جنھیں کاٹ کر ہم اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسی تصویروں کو جمع رکھنا ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ کچھ لوگ انھیں کاپی کے صفحوں پر چپکا لیتے ہیں ورنہ یہ عام طور پر اِدھر اُدھر بکھری پھرتی ہیں اور ضائع ہو جاتی ہیں۔

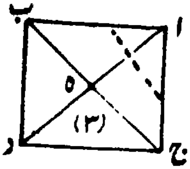
تصویروں کو محفوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ انھیں سجا کر رکھنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔
کسی تصویر کو سجانے کا عام طریقہ یہ ہے کہ اسے کسی مڑے کاغذ پر لگا کر رکھا جائے اس طرح تصویر کچھ "اُبھر" آتی ہے، "اُجاگر" ہو جاتی ہے یا "نمایاں" ہو جاتی ہے۔
تصویر کے پیچھے لگائے جانے والے اس "پشتی کاغذ" کے رنگ، اُس کے حاشیے کی لمبائی چوڑائی اور اس کے نقش و نگار کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔
رنگ ایسا پسند کرنا چاہیے جس پر تصویر کِھل جائے۔
حاشیے کی چوڑائی تصویر کی لمبائی، چوڑائی اور اس کی اہمیت کی نسبت سے کم یا زیادہ ہونی چاہیے۔
حاشیے کے نقش و نگار تصویر کی سادگی کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ جس تصویر میں باریکیاں زیادہ ہوں اس کا حاشیہ سادہ اور یکساں رنگ کا ہونا چاہیے۔
تصویریں سجانے کے لیے طرح طرح کے پشتی کاغذ بازار میں ملتے ہیں۔ بازار میں کیا نہیں ملتا؛ سب ہی کچھ مل جاتا ہے سوائے اس خوشی کے جو اپنا کام خود کرنے سے حاصل ہوتی ہے!
اپنی تصویریں خود سجا کر رکھنے کی ترکیب بہت آسان ہے۔ یہ نسخہ "کم خرچ" بھی ہے اور "بالا نشین" بھی۔



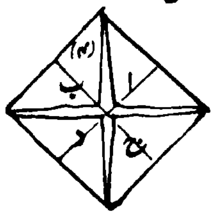
عمل نمبر ۱۔ ایک مربع کاغذ لیجیے۔ آمنے سامنے کے کونے (شکل ۱) ا اور د کو ملا کر وتر ب ج پر موڑیے اور دبا کر شکن ڈالیے۔ کاغذ کو کھول لیجیے۔



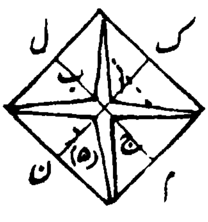
عمل نمبر ۲۔ اب مربع کے دوسرے دو کونوں ب اور ج (شکل ۲) کو ملا کر دوسرے وتر ا د پر کاغذ کو موڑیے۔ شکن ڈالیے اور کاغذ کھول لیجیے۔



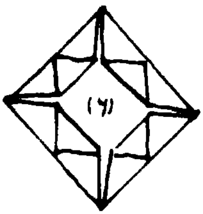
عمل نمبر۳۔ کونہ ا کو نقطہ ہ (شکل ۳) پر رکھ کر موڑ کو دبا دیجیے۔



عمل نمبر۴۔ اسی طرح کونہ ب، ج اور د کو بھی نقطہ ہ پر رکھ کر موڑوں کو دبا دیجیے۔ کاغذ شکل ۴ کی طرح تہہ ہو جائے گا۔



عمل نمبر۵۔ شکل ۵ کے کونہ ا کو نقطہ ک سے ملا کر موڑ کو دبا دیجیے (عمل نمبر ۱ اور ۲ کی وجہ سے شکل اک کاغذ پر پہلے ہی سے پڑی ہوئی ہوگی۔)



عمل نمبر۶۔ اسی طرح کونہ ب کو نقطہ ل سے کونہ ج کو نقطہ م سے اور کونہ د کو نقطہ ن سے ملا کر موڑوں کو دبا دیجیے۔ کاغذ شکل ۶ کی طرح تہہ ہو جائے گا۔

یہ آپ کا تیار کیا ہوا "فوٹو فریم" ہے۔ اس کے اندر لگی ہوئی تصویر محفوظ بھی رہے گی اور خوبصورت بھی لگے گی۔

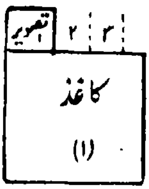
اگر فریم ایسے کاغذ سے بنایا جائے جو دونوں طرف سے ایک جیسے رنگ کا نہ ہو تو یہ اور بھی خوبصورت نظر آئے گا۔

فریم کے لیے کاغذ اور اس کا رنگ، تصویر کے کاغذ اور اس کے رنگ کی مناسبت سے پسند کرنا چاہیے۔ اگر تصویر موٹے کاغذ کی ہو تو فریم کے لیے بھی موٹا کاغذ لینا چاہیے۔

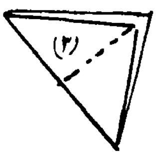
اس فریم میں مربع شکل کی تصویر ہی لگائی جا سکتی ہے۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ جو تصویر اس فریم کے اندر لگائی جائے گی وہ چاروں طرف سے تھوڑی تھوڑی فریم کے اندر چھپ جائے گی۔ اس کے لیے اخبار یا رسالے میں سے تصویر کاٹتے وقت اسے چاروں طرف سے کم از کم دو سوت بڑھا کر کاٹنا چاہیے۔ تصویر کو فریم کے اندر چپکا لینا چاہیے کہ وہ اپنی جگہ پر قائم رہیں۔

تصویریں چھوٹی بھی ہوتی ہیں اور بڑی بھی۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ فریم ایسا بنے جو تصویر پر بالکل ٹھیک آئے، نہ بڑا رہے نہ چھوٹا تو فریم کے لیے کاغذ اتنا بڑا لیجیے جس کے وِتر (شکل ۱ اور ۲) تصویر کے لمبائی سے چار گنا ہوں۔

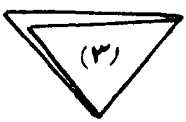
اس پیمایش کی آسان ترکیب یہ ہے۔



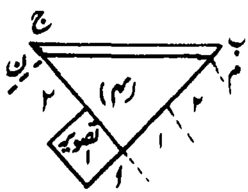
عمل نمبر ۱۔ ایک ایسا چوکور کاغذ لیجیے جس کا کنارہ تصویر کے کنارے سے کم از کم تین گنا بڑا ہو (شکل نمبر ۱)



عمل نمبر ۲۔ اس کاغذ کو کسی ایک وِتر پر بج کی طرف دُہرا کیجیے۔



عمل نمبر ۳۔ اسی وِتر پر کاغذ کو پھر موڑ کر شکل بج کی طرف چوہرا کر لیجیے۔



عمل نمبر ۴۔ شکل ۱ کے کونے اسے دونوں کناروں اب اور اج پر تصویر کے ایک کنارے کی لمبائی سے دُگنے فاصلے پر نشان م اور ن لگا دیجیے۔ خط م ن سے باہر کا (خط کشیدہ) کاغذ فاضل

ہے۔ اس کو کاٹ کر الگ کر دیجیے۔ مثلث ا م ن کے چوہرے کان کو کھول لیجیے کھلنے کے بعد یہ مربع شکل کا ہوگا۔ اس مربع کاغذ سے بنایا ہوا فریم آپ کی تصویر کے لیے بالکل درست رہے گا۔

اگر آپ کو ایسے فوٹو فریم بنانے کی اتنی مشق ہو جائے کہ آپ ہر تصویر کے لیے ٹھیک ناپ کا فریم بنانے لگیں تو آپ کے ساتھ مجھے بھی خوشی ہوگی۔ لیکن آپ مجھ سے یہ نہ پوچھیے گا کہ فریم کے کاغذ کا وتر، تصویر کے ایک کنارے سے چار گنا بڑا کیوں ہونا چاہیے؟ کیونکہ یہ سوال میں خود آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔

اگر اس سوال کا جواب آپ خود دے سکتے ہیں تو آپ ہوشیار ہی نہیں سمجھدار بھی ہیں۔ اگر یہ پہیلی آپ نہ بوجھ سکیں تو اتنا پتا یہ ہے۔

i. پہلے تصویر کے ایک کنارے کی لمبائی ناپیے پھر
ii. جب کاغذ شکل ۳ کی طرح ہو تو ا ہ کا فاصلہ ناپیے اور
iii. جب کاغذ شکل ۷ کی طرح تہہ ہو تو اک کا فاصلہ ناپیے

یہ تینوں ناپ لکھ کر اپنے سامنے رکھیے اور اس اتے پتے کے ذریعے جواب تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔
اگر اس کے بعد بھی آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو ہار کر اپنے کسی بزرگ یا استاد سے معلوم کر لیجیے۔

ایک دن کا مدرسہ

مدرسہ ابتدائی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک بچّوں کی حکومت ہے۔ اس حکومت کے تحت سال میں ایک دفعہ ایک دن کا مدرسہ ہوتا ہے۔ بچّوں کی حکومت کا صدر ایک دن کے مدرسے کا ہیڈ ماسٹر ہوتا ہے اور ممبران پارلیمنٹ کے مشورہ سے تمام جماعتوں کے لیے استاد مقرر کرتا ہے۔ یہی استاد اس دن پڑھاتے ہیں۔ مدرسے کے روزانہ پڑھانے والے استاد اور ہیڈ ماسٹر اس دن کہیں دور پکنک منانے چلے جاتے ہیں۔ یہ نظم ابتدائی ششم کے چند طالب علموں نے مل کر لکھی اور ترانے میں سنائی۔

ایک دن کا مدرسہ ہے دل ہمارا شاد ہے	لڑکے ہی شاگرد ہیں اور لڑکا ہی استاد ہے	قمر رضا ۱۱ سال
ابتدائی کے گئے استاد سارے ٹور پر	صرف لڑکوں ہی کے دم سے مدرسہ آباد ہے	" " " "
ایک لڑکا بن گیا نگراں اس اسکول کا	درجہ درجہ میں پڑھانے کے لیے استاد ہے	اقبال آگرہ " "
کوئی فائز ہے اتالیقی پہ کوئی آیا جان	بچّہ بچّہ خوش نظر آتا ہے اور آزاد ہے	نشاط بیگم " "
سب نے مل کر لیا ہے مدرسہ کا انتظام	کوئی چپراسی بنا ہے اور کوئی استاد ہے	" " " "
ہر جماعت میں نیا ساماں نظر آنے لگا	ہر جگہ رونق ہے، سارا مدرسہ آباد ہے	عامرہ " "
بن گئے ناظم کتب خانہ کے بس مسٹر عقیل	اور ششم میں ہمارا ساتھی ہی استاد ہے	شمیم ۱۳ "
حضرت اقبال استقبالیہ کے رکن ہیں	مدرسہ کوشش سے سب کی کس قدر آباد ہے	" " "
لڑکے ہی شاگرد ہیں اور لڑکے ہی استاد ہیں	ٹیچروں کے جانے سے بھی مدرسہ آباد ہے	خورشید ۱۱ "
ایک دن کے مدرسہ کا ہو رہا ہے انتظام	کس قدر مسرور ہیں ہم دل ہمارا شاد ہے	" " "
اپنی آزادی کا سب کو آج بھی احساس ہے	کل تلک ساتھی تھا میرا آج وہ استاد ہے	آصف " :
بعد چھٹی کھانا مل کر ساتھی اپنا کھائیں گے	مدرسہ لڑکوں کے دم سے کس قدر آباد ہے	" "

بڑوں کی کوششیں

یہ راز کیا ہے؟

زندگی کے موڑ پر کئی گھٹنائیں ہوتی رہتی ہیں کچھ گھٹنائیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیشہ کے لیے دل میں گھر کر لیتی ہیں ۔ اُن گھٹناؤں میں سے ایک دردناک گھٹنا یہ ہے جس کا بیان میں کر رہی ہوں ....

توسنو.... آج میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ٹھیک ویسے جیسے برساتی نالا رات کے گہرے اندھیرے میں بھی لگاتار بہتا ہے ۔

شام کے وقت میں بازار گئی ۔ آتے وقت شام کی چہل پہل، لوگوں کا شور سنا ۔ کوئی زور زور ہنس رہا تھا تو کوئی منہ میں پان دبائے نئی فلموں پر بحث کر رہا تھا ۔ ایک طرف کھلکھلاتی ہوئی بہاریں اور دوسری طرف سونا جیون ۔ ایک طرف ہنسی، اُدھر آنسو ۔ ایک بھکارن ایک دوکان پر پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہاتھ میں ڈبّا لیے جس میں کچھ کھوٹے پیسے کھن کھن کرتی ہوئی سب کے آگے آنچل (دامن) پھیلا رہی تھی ۔ کوئی بھی اُس کی طرف نہ دیکھتا ۔ کچھ اُس کو نفرت بھری نگاہ سے دیکھ کر منہ پھیر لیتے، اُس پر کسی کو رحم نہ آتا ۔ وہ ایک درخت کے سہارے کھڑی ہو گئی اور آنے جانے والوں کو لالچ بھری نظروں سے دیکھ کر ڈبّا آگے کر دیتی ۔ اس کا چہرہ اور میلے کپڑوں سے لپٹا ہوا جسم ایک سوکھے تالاب کی طرح لگ رہا تھا ۔

اُس کی اس حالت کو دیکھ کر میری آنکھوں

سے آنسو بہہ نکلے میں نے اسے ۱۲ پیسے دیے
"رام بھلا کرے تیرا"۔ یہ کہہ کر اس کی آواز ہلکی ہوگئی۔
وہ اچانک گر گئی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ اور کہنے
لگے کہ کیا ہوا۔ ایک لڑکا بھاگا بھاگا آیا ہائے
میری مالا تو راکھ ہو گئی" اور وہ بھی گر پڑا۔
اس کے کپڑوں کو ہلایا اچانک بھیڑ کی آنکھیں
پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نوٹوں کے بنڈل! اتنی بہت
سی ریزگاری سب گننے لگے۔ ٹوٹل ہوا پانچ سو
روپیہ۔ اور وہ مری پڑی تھی!

سنیہہ کوہلی (جامعہ دوسرا سال)

'پیام تعلیم' کا چندہ منی آرڈر سے بھیجیں

آپ کا فائدہ ہے!

وی، پی کے ذریعے پرچہ منگوانے

میں ۶۵ پیسے زیادہ خرچ ہوتے ہیں اور

اکثر غیر معمولی تاخیر بھی ہوتی ہے۔

منیجر



لطیفے



استاد نے درجے میں بچوں سے پوچھا کیوں بھئی تم جنت میں جانا چاہتے ہو نا۔ اچھا جو جنت میں جانا چاہتا ہے ہاتھ اٹھائے۔

سبھی بچوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ بس ایک رشید گم سم بیٹھا رہا۔ استاد نے مسکرا کر پوچھا: کیوں میاں رشید تم جنت میں نہیں جانا چاہتے؟

رشید: جی ماسٹر صاحب۔ جانا کیوں نہیں چاہتا پر امی نے تاکید کی ہے کہ مدرسے کی چھٹی ہوتے ہی سیدھے گھر آؤ۔

استاد: (غصے سے) اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو تم پڑھاتے وقت باتیں کر رہے تھے۔

شاگرد: جی ماسٹر صاحب۔ آپ کا خیال تو کچھ غلط ہی ہے۔ میں سوتے میں باتیں نہیں کرتا۔

ایک دفعہ لال ہندیوں کے علاقے میں سیلاب آگیا۔ فوراً ہیلی کوپٹر بھیجے گئے کہ انھیں اس علاقے سے نکال لائیں۔ کام شروع ہو گیا۔ پر ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ لال ہندیوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ہوا بازوں کو شبہ ہوا۔ انھوں نے گنتی شروع کی پتہ چلا کہ گاؤں میں جتنے ریڈ انڈین ہیں یہ گنتی ان سے تیس فی صدی زیادہ ہے۔

اصل میں ہیلی کوپٹر سے اترنے کے بعد یہ تیرتے ہوئے پھر اپنے گاؤں لوٹ جاتے تھے اور ہیلی کوپٹر پر سوار ہو جاتے تھے۔ اس میں انھیں مزہ آ رہا تھا۔

آدھی رات بیت گئی تھی۔ مہمان صاحب تھے کہ ٹلتے ہی نہیں تھے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے بھائی صاحب میرا جی تو سیر کو چاہتا ہے۔ مگر پیسے نہیں ہیں۔

میزبان جھٹ سے بول اٹھا۔ ارے ارے بہت ہی اچھا خیال ہے (جیبیں ٹٹولتے ہوئے) کتنے پیسوں کی ضرورت ہے۔

بچوں کی کوششیں

عید کے دن سب بچے مل کر
پہنچے منّے بھائی کے گھر
شیر، سویّاں پھلکی کھا کے
باتیں سب یوں کرنے لگے
سب سے پہلے بولا نفیس
روزے رکھّے میں نے بیس
اس کے بعد یہ بولی عذرا
روزے ہوئے ہیں میرے بارہ
جوش میں آکر بولا انیس
میں نے رکھّے پورے تئیس
اس کے بعد یہ بولی سارہ
میں نے رکھّے ہیں اٹھارہ
کامل بولا میں نے روزے
سب سے کم رمضان میں رکھّے
کیونکہ میں ہوں سب سے چھوٹا
اس لیے روزہ ایک ہی رکھا
مُنّا تھا کھڑکی کے باہر
بچّوں کی یہ باتیں سن کر
تُتلا تُتلا کر ..یوں بولا
میں نے رکھے پورے سولہا
مُنّے کی اس بات کو سن کر
اچھلے کودے سب خوش ہوکر

مشہود الزار سہیل (ابتدائی جامعہ)

ولیم ٹیل

ہمارے دیس سے بہت دور پچھم کی طرف ایک بڑا خوبصورت ملک ہے۔ سوئٹزرلینڈ یا سوئٹسان آپ نے یہ نام اکثر سنا ہوگا۔

اب سے بہت دنوں پہلے اس دیس میں ایک بہت بہادر آدمی گزرا ہے۔ اس کا نام ولیم ٹیل تھا۔ وہ بہت اچھا شکاری تھا۔ شکار کے شوق میں جنگلوں اور پہاڑوں میں گھومتا پھرتا تھا۔

ایک دن اس کا گزر ایک گاؤں میں ہوا۔ اس کا چھوٹا لڑکا بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہاں ایک جگہ اونچے سے بانس پر ٹوپی لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے گاؤں والوں سے پوچھا: بانس پر یہ ٹوپی کیسی۔

لوگوں نے کہا یہ بادشاہ کی ٹوپی ہے تمھیں اس کے آگے جھکنا ہوگا۔ ولیم ٹیل نے فوراً جواب دیا میں تو سوائے ایک خدا کے کسی کے آگے نہیں جھکتا۔ لوگ اسے پکڑ کر کپتان کے پاس لے گئے۔ کپتان بہت بگڑا کہنے لگا۔ تم اس کے آگے نہ جھکو گے تو جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اتنے میں بھیڑ سے ایک آواز آئی ولیم ٹیل بہت اچھا نشانے باز ہے۔ یہ بات کپتان نے سن لی اور بولا۔ ہم اس کا امتحان لیں گے۔

اس نے ولیم ٹیل کے لڑکے کے سر پر ایک سیب رکھوا دیا اور کہا اس پر نشانہ لگاؤ ٹھیک بیٹھے گا تو خیر ورنہ تمھیں پھانسی دیدی جائے گی۔

ولیم ٹیل بہت پریشان ہوا۔ پر اس کے لڑکے نے کہا۔ میرے باپ کا نشانہ کبھی نہیں چوک سکتا۔ یہ سن کر ولیم ٹیل کا دل بڑھا۔ اس نے تیر کمان کے چلّے پر چڑھا دیا۔ لڑکا چٹان کی طرح جما کھڑا رہا۔

اچانک تیر کمان سے چھوٹا دیکھتے دیکھتے سیب کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ مجمع میں شور مچ گیا کپتان نے نشانے کی تعریف کی ولیم ٹیل کو چھوڑ دیا۔

تھوڑے ہی دنوں بعد ولیم ٹیل نے بہت سی فوج جمع کی اور بادشاہ سے لڑ کر دیس کو آزاد کرایا۔ سوئٹسان کے لوگ آج تک اس کی بہادری کے قصّے سناتے ہیں۔

وجے کمار کشمیری (جامعہ ثانوی)

بانسری والا جادوگر

آج سے پانچ سو سال پہلے سمندر پار ایک شہر ہیلن تھا: اس شہر میں بہت خطرناک چوہے رہتے تھے۔ کتوں سے لڑ پڑتے تھے بلیوں کو مار

ڈالتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچوّں کو کاٹ لیتے تھے۔ غرض شہر والوں کو بہت پریشان کرتے تھے۔

آخر ایک دن شہر کے لوگ تنگ آکر حاکم کے پاس گئے اور اس سے سارا ماجرا بیان کیا۔ اور حاکم سے درخواست کی کہ آپ ہمارا چوہوں سے پیچھا چھڑانے کی کوئی ترکیب کیجیے۔ دوسرے دن حاکم شہر نے اپنے دوستوں اور شہر کے معزز لوگوں کو مشورے کے لیے جمع کیا اور چوہوں سے پیچھا چھڑانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ اتنے میں ایک لمبا سا آدمی داخل ہوا۔ یہ سر سے پیر تک ایک لمبا سا کوٹ پہنے تھا۔ یہ کوٹ آدھا سرخ تھا آدھا پیلا تھا۔ اس لمبے آدمی نے کہا اگر آپ مجھے ایک ہزار اشرفیاں دیں تو میں ان چوہوں سے آپ لوگوں کا پیچھا چھڑا دوں گا۔ شہر کے حاکم نے کہا۔ اگر آپ نے ہمارا ان چوہوں سے پیچھا چھڑا دیا تو ہم اس سے بھی زیادہ دینے کے لیے تیار ہیں۔

یہ لمبا آدمی وہاں سے نکل کر سڑک پر آیا اور اپنے کوٹ سے ایک بانسری نکالی اور بجاتا ہوا سڑک پر چل دیا۔ بانسری میں سے ایک نہایت سریلی آواز نکلی جس کو سن کر چوہے چوہیاں اور ان کے بچوّں کی فوج کی فوج نکل نکل کر بانسری والے کے آس پاس جمع ہونے لگے۔ بانسری والا ندی کی طرف چل دیا اس کے پیچھے تمام چوہے تھے جو آ آکر ندی میں گرنے لگے اس طرح تمام چوہے پانی میں ڈوب گئے۔

جب شہر والوں کو پتہ چلا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

پھر دوبارہ بانسری والا حاکم کے محل پر آیا اور ایک ہزار اشرفیاں مانگیں لیکن حاکم شہر نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور پانچ سو اشرفیاں دینے لگا۔ بانسری والے نے کہا میں ایک ہزار سے ایک بھی کم نہ لوں گا اور جب اس نے دیکھا کہ حاکم شہر اپنا وعدہ پورا نہیں کرے گا تو وہ واپس سڑک پر آگیا۔

اب اس نے دوبارہ اپنے ہونٹوں سے بانسری لگائی اس بار پہلے سے بھی زیادہ ایک سریلی آواز نکلی جس کو سن کر گھروں سے بچے اور بچیاں نکل آئے اور بانسری والے کے آس پاس جمع ہونے لگے اب آگے آگے بانسری والا اور پیچھے پیچھے بچے پہاڑ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ جب سب لوگ پہاڑ پر پہنچ گئے تو پہاڑ کے ایک غار میں سے ایک عجیب جادو کا دروازہ

کھلا جس میں تیزی سے بانسری والا جادوگر اور اس کے پیچھے بچے داخل ہوگئے اور دروازہ بند ہوگیا اور پھر کبھی نہیں کھلا۔

صرف ایک چھوٹا سا لڑکا رہ گیا جو سب کے پیچھے تھا اور لنگڑا ہونے کی وجہ سے اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ جب بچے کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے کو پہاڑ پر پہاڑ کی دوسری طرف پایا جہاں سے وہ کبھی نہیں آیا تھا اور غار کا جادو کا دروازہ بھی بند ہوچکا تھا اور بانسری کی آواز آنا بھی بند ہوگئی تھی۔

شہر کے حاکم کو پتہ چلا تو اس نے سارے میں بانسری والے کی تلاش کے لیے آدمی دوڑا دیے کہ اسے اس کی مانگی مقرر کی ہوئی اشرفیاں دے دیں اور بچوں کو واپس لے آئیں لیکن وہ بانسری والا جادوگر کہیں نہیں ملا نہ دوبارہ کہیں دکھائی دیا۔

سید مسعود الحسن

صحافی

ادھر اُدھر سے



بچوں کی پینٹنگ کا مقابلہ

۳۱ مارچ ۱۹۶۶ء کو دہلی کے ایک اسکول کے میدان میں بچوں کی پینٹنگ کا مقابلہ ہوا تھا۔ یہ مقابلہ "شنکر" کی طرف سے ہر سال دہلی میں ہوتا ہے۔ اس مقابلے میں ۵ سے ۱۶ سال کے بچے شریک ہوتے ہیں۔ اس سال ۳ سال تک کے بھی کچھ بچوں نے پینٹنگ کے اس مقابلے میں حصّہ لیا۔ مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو اس مقابلے میں خاص دلچسپی لیا کرتے تھے۔

اسکول کے میدان میں دریوں پر بیٹھ کر پینٹنگ کرتے ہوئے یہ بچے اپنی جگہ خود تصویر لگ رہے تھے۔ یہ سماں دیکھنے کے قابل تھا۔ یہ ننھے منے آرٹسٹ اپنی انوکھی سج دھج کے ساتھ تصویریں بنانے میں غرق تھے۔ سب کا انداز نرالا تھا۔ اس سال کوئی دس ہزار بچوں اور بچیوں نے اس مقابلے میں حصّہ لیا۔ زیادہ تر بچے دہلی اور آس پاس کے اسکولوں ہی کے تھے۔ مگر کچھ دور کے علاقوں سے بھی آئے تھے۔

کھلاڑیوں کی جان بچانے کا نیا آلہ

جو کھلاڑی موسم سرما کے کھیلوں میں حصّہ

تے ہیں ان کی جان سخت خطرے میں ہوتی ہے۔ ئی بار ایسے خطرناک طوفان آجاتے ہیں کہ یہ کھلاڑی ن کی زد میں آکر اس کے نیچے بھی دب جاتے ہیں۔ س وقت ان کی جان بچانے کا کام بہت ضروری تا ہے۔ برف میں دب جانے کے بعد انسان شکل سے کوئی دو گھنٹے تک زندہ رہ سکتا ہے۔ س لیے ان کی جان بچانے کے کام کو بہت پھرتی سے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ایسا ممکن ہو تو ان کو برف کے اندر سے زندہ نکال سکنا ن نہیں ہوتا۔ لیکن اس کام میں سب سے بڑی شکل یہ ہوتی ہے کہ آسانی سے یہ پتہ نہیں لگ تا کہ کھلاڑی برف کے نیچے کس جگہ دبا پڑا ہے۔ روس میں اب ایک نئی ایجاد کا اعلان کیا گیا ہے جو س مشکل کو حل کر سکتی ہے۔ اس ایجاد کے مکمل کرنے میں ٹھ سال کا عرصہ لگا ہے اور اب اسے لوگوں کے سامنے ش کیا گیا ہے۔ یہ ایک قسم کی مشین ہے جس کا وزن ۲ کیلوگرام ہے۔ یہ تین چار میٹر کی دوری سے بتا ستی ہے کہ فلاں جگہ پر کام کرو۔

اس میں کھلاڑیوں کو چھوٹے چھوٹے خاص ہے کے مقناطیس دیے جاتے ہیں جو وزن میں بہت ہلکے ہیں۔ ایک مقناطیس کا وزن صرف ۰، گرام ہے۔ وہ اپنی جیب میں رکھ سکتے ہیں۔ یا اس کو ان کے کپڑوں کے اندر بھی سیا جا سکتا ہے۔ مندرجہ بالا ایجاد اس مقناطیس کو فوراً پہچان لیتی ہے۔ اور برف کے اندر دبے کھلاڑیوں کا فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کس جگہ پر ہیں۔

درزی پرندہ

ماسکو: انسان بعض جانوروں اور پرندوں کے بارے میں واقف ہے کہ وہ کس فنکاری اور ہنرمندی کے ساتھ اپنی رہائش کی جگہیں یا ٹھکانے بناتے ہیں مثلاً کچھ پرندے اپنے گھونسلے جس طرح بناتے ہیں انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں چیونٹیوں کی "تعمیراتی" مہارت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حال ہی میں سوویت یونین میں ایک ایسا پرندہ دریافت ہوا ہے۔ جو "سلائی" کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس پرندے کی دم طویل ہوتی ہے۔ اس کا گھونسلا لمبی پتیوں والے درختوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ پرندہ بڑی خوبی کے ساتھ لمبی اور مضبوط پتیوں کے سرے باہم ملا کر سلائی کرتا ہے۔ سلائی کے لیے دھاگا استعمال ہوتا ہے۔ یہ دھاگا پرندہ کپاس سے خود ہی تیار کر لیتا ہے۔ سوئی کا کام وہ اپنی لمبی چونچ سے لیتا ہے۔



پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، دہلی میں آفسیٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

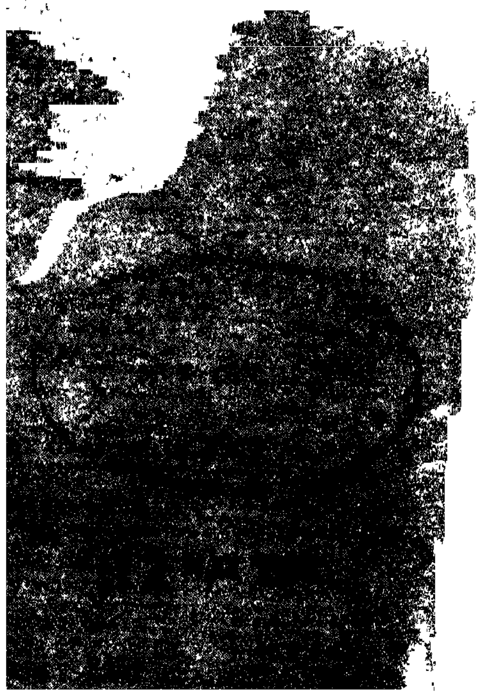
بچوں کے لئے

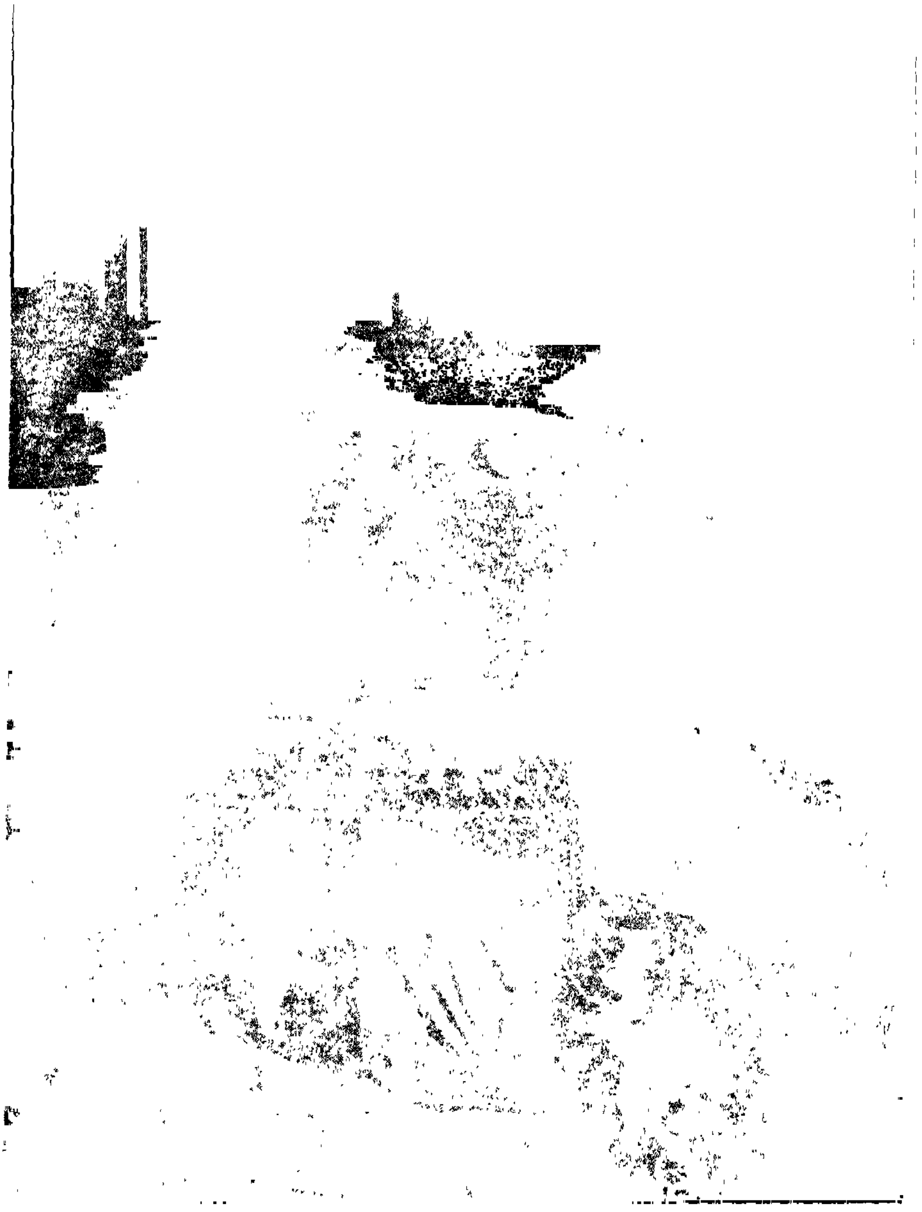
اسکول میں چھپی ہوئی رنگین تصویروں والی
خوبصورت کتابیں جو دلچسپ بھی ہیں اور سستی بھی

چوزہ	صفحات	۱۶	قیمت	۱۹	پیسے
دستانہ	〃	۲۰	〃	۲۵	〃
دو کہانیاں	〃	۲۰	〃	۳۱	〃
گیہوں کی بالی	〃	۱۶	〃	۳۱	〃
تصویروں میں چھوٹی کہانیاں	〃	۵۲	〃	۶۵	〃
مرغی اور دستشش	〃	۴۸	〃	۷۹	〃
تین بھالو	〃	۱۶	〃	۳۴	〃
نیلا پیالہ	〃	۴۴	〃	۱۲۵	〃
بیشکا	〃	۱۶	〃	۳۱	〃

ان میں سے چوزہ ½ ۱۰ × ۲۲ سنٹی میٹر اور باقی سب کتابیں
½۲۲ × ۲۹ سنٹی میٹر کے سائز پر ہیں۔

مکتبہ جامعہ ملیہ نئی دہلی

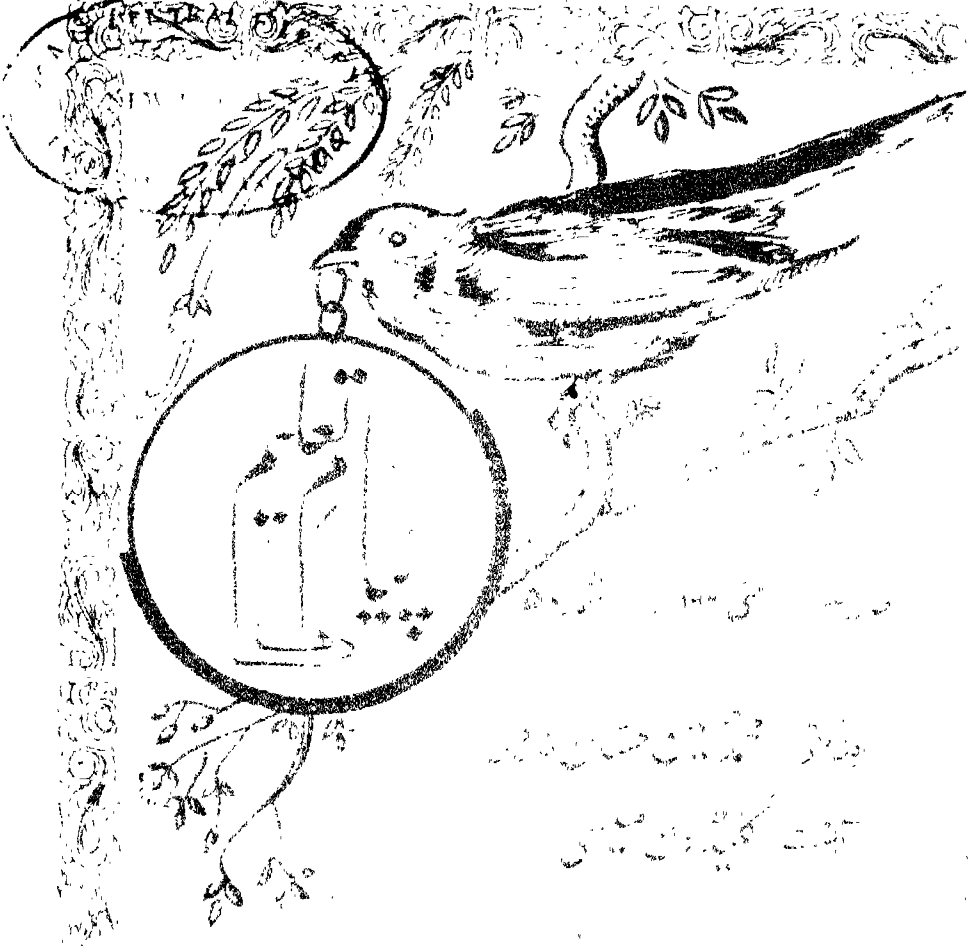




فوٹو: شاہد علی خاں

السلام علیکم

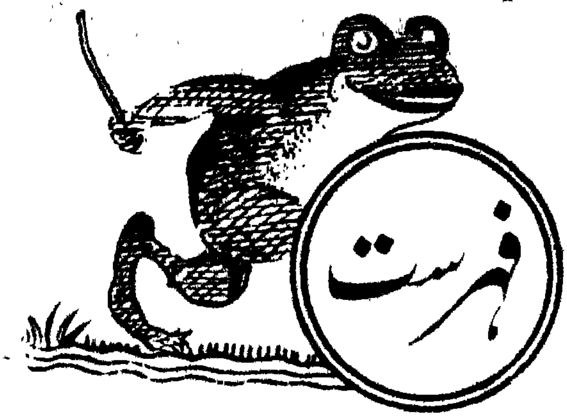
ریاست جموں و کشمیر میں تمام تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ



مکتبہ جامعہ ملیہ نئی دہلی

مکتبہ جامعہ ملیہ
پرنس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال بمبئی

تصویر سرورق: ہز ہولی نیس سیدنا محمد برہان الدین۔



فہرست



بچّوں سے باتیں

حافظ نبی احمد مرحوم کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ اچانک ایک اور حادثے کی خبر آئی۔ امتیاز حسین خاں صاحب بی، اے (جامعہ) بی کام (لندن) اللہ کو پیارے ہوئے۔ ساری جامعہ رنج و غم کی فضا میں ڈوب گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

امتیاز صاحب مرحوم، ڈاکٹر ذاکر حسین (نائب صدر جمہوریۂ ہند) کے بھتیجے تھے۔ ماں اور باپ دونوں بچپن ہی میں رخصت ہو گئے تھے۔ ذاکر صاحب نے انھیں، ان کے چھوٹے بھائی مسعود حسین خاں کو اولاد کی طرح پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ امتیاز صاحب نے جامعہ سے بی اے کیا۔ لندن جا کر بی کام کیا اور عثمانیہ یونی ورسٹی میں لیکچرر اور پھر ریڈر ہو گئے۔ ان دنوں محبوبیہ کالج سکندر آباد کے پرنسپل تھے۔

میرا جب جامعہ میں آنا ہوا تو محمد حسین صاحب حیدرآبادی (استاد مدرسہ ثانوی جامعہ) اور امتیاز صاحب سے واسطہ پڑا۔ تعلقات دن پر دن گہرے ہوتے گئے۔ پیام تعلیم کی ادارت میرے سپرد ہوئی تو مرحوم کو بھی اس سے دلچسپی بڑھی۔ لندن سے "دہلی سے انگلستان" تک کا سفر نامہ بڑے دلچسپ انداز میں لکھ کر بھیجا۔ پیام تعلیم کے کئی نمبروں میں لگاتار چھپتا رہا۔ اور جب لندن سے واپس آئے تو پیام تعلیم کے لیے ایک قیمتی تحفہ ساتھ لائے۔

کئی [redacted]ال ہوئے دل کا دورہ پڑا تھا علاج معالجے سے اچھے ہوگئے تھے۔ مگر اس مرتبہ یہ جان لیوا ثابت ہوا۔ سوگوار بیوہ کے علاوہ چار بچیاں یادگار ہیں۔

ہمیں اس حادثے میں مرحوم کی بچیوں، چھوٹے بھائی ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ذاکر صاحب، یوسف صاحب سے دلی ہمدردی ہے ہم سب ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

اس پرچے میں حافظ نبی احمد مرحوم پر ایک مضمون شائع ہو رہا ہے۔ طیب صاحب نے باوجود گوناگوں مشغولیتوں کے اپنا وعدہ بہت اچھی طرح نبھایا۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں طیب صاحب کبھی کبھی 'پیام تعلیم' کے لیے لکھتے رہتے تھے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی وہ اپنے رسالے کو نوازتے رہیں گے۔

اپریل کے 'پیام تعلیم' میں باوجود احتیاط کے غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ابن بطوطہ والے مضمون میں عمرو بن العاص کی جگہ عمر بن الخاص چھپ گیا اور پھر وفار احمد واثقی صاحب کے مضمون "یہ فاعلن کیا ہے" میں غلطیاں رہ گئیں۔ ص۴۳ کے پہلے کالم کی بیسویں سطر میں جاوید نے چار بار فعلن کہا ہے جبکہ تین ہی مرتبہ چھپا ہے۔ پیامی ان سب غلطیوں کو ٹھیک کر لیں۔

پچھلے مہینے مدرسہ ثانوی اور مدرسہ ابتدائی جامعہ میں ایک دن کا مدرسہ بہت شان و شوکت اور دھوم دھام سے منایا گیا۔ دونوں مدرسوں کے ہونہار بچوں نے اپنے اپنے مدرسوں کا بڑی خوش اسلوبی سے انتظام کیا، اپنے اپنے بورڈنگوں کو خوب خوب سجایا۔ مدرسہ ابتدائی کے کیمپ فائر میں بچوں نے پیام تعلیم کے دو مضمونوں "جانوروں کا مشاعرہ" اور "آپ ہی کی شیروانی ہے" کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا اور بہت اچھی طرح پیش کیا۔

سالنامے میں پیامیوں نے ایک نظم "پاگل خانہ" کے عنوان سے پڑھی ہوگی۔ ہمارے بعض پڑھنے والوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ بلکہ رنج کا اظہار کیا۔ ہمیں اس کا افسوس ہے مگر ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ کسی بری نیت کو دخل نہیں تھا۔

محترمہ ہاجرہ بیگم تو اصولاً نسلی امتیاز کی سخت دشمن ہیں۔ تاہم آئندہ مزید احتیاط کی جائے گی۔

اس پرچے میں ہم محترمہ نفرح امروہوی کی نظم شائع کر رہے ہیں۔ اس نظم میں جو کچھ لکھا ہے وہی ہمارا بھی مسلک ہے۔ امید ہے کہ نظم پسند آئے گی۔

پچھلے ہفتے ہمارے پاس کشن گنج (ضلع پورنیہ بہار) سے "تعلیمی برادری" کے نام سے ایک اخبار آیا ہے۔ ہمارے پرانے بہت ہی پرانے ساتھی سید حسن صاحب نے اس دور افتادہ علاقے میں تعلیمی مشن کے نام سے ایک تعلیمی تحریک شروع کی ہے اور کشن گنج ادارہ تعلیمی پوائنٹس کے نام سے ایک تجرباتی مرکز بھی قائم کیا ہے۔

سید حسن صاحب نے جامعہ سے بی اے کیا، بہت دنوں تک مدرسہ ابتدائی کے استاد رہے پھر اس کے نگران یا ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ چلے گئے۔ وہاں پڑھا بھی پڑھنے کے بعد پڑھایا بھی اور دونوں میں غیر معمولی امتیاز حاصل کیا۔

سید صاحب نے یہ کام بنا کسی سہارے کے بہت معمولی پیمانے پر شروع کیا ہے مگر ان کے خیالات بہت اونچے ہیں تجربہ بہت وسیع ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی ہمت، استقلال اور تعمیری ذہنیت کی بدولت یہ ننھا سا پودا ایک دن تناور درخت بن جائے گا اور پوری قوم اس سے فائدہ اٹھائے گی۔

"تہذیب کی بنیاد" کا تیسرا حصہ اس پرچے میں چھپ رہا ہے۔ یہ اس مضمون کی آخری قسط ہے۔ برکت صاحب نے یہ مضمون بڑی لگن سے لکھا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ اسے آپ پڑھیں اس سے اثر لیں، نہ صرف اثر لیں بلکہ کچھ کر کے بھی دکھائیں ہمارا دیس بہت پچھڑا ہوا دیس ہے۔ یہ آگے جبھی بڑھے گا جب ہم بوڑھے جوان اور بچے سب مل کر اسے آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔

مئی کا یہ مہینہ امتحانوں کا مہینہ ہے خدا آپ سب کو اپنے اپنے امتحانوں میں سرخرو کرے

(باقی صفحہ ۵۹ پر)



تحریر: نگہت اقبال صدیقی

اچھّے بچّوں کی دُعا

میرے مولا مری ہر ایک ہو حسرت پوری
کر سکے مجھ کو پریشاں نہ کوئی مجبوری

مجھ کو عزت ہو عطا وہ جو ترے گھر سے ملے
اصل میں ہے وہی دولت جو ترے دَر سے ملے

ظلمتیں دور رہوں دُنیا میں اُجالا ہو جائے
روشنی سے میری ہر شان دو بالا ہو جائے

صورتِ شمع کروں نور اندھیرے گھر میں
مہ و انجم کی طرح چمکوں زمانے بھر میں

دولتِ علم سے خالی نہ ہو میرا دامن
بزمِ عالم کو کروں علم سے اپنے روشن

اپنے الطاف و کرم سے مجھے عزت دے دے
میرے معبود مجھے علم کی دولت دیدے

علم کے ساتھ عمل بھی ہو زمانے میں مرا
ساتھ ہی اِس کے نہ چاہوں میں کسی کا بھی برا

ہر قدم میرا غریبوں کی حمایت میں اُٹھے
دردمندوں کی ضعیفوں کی محبت میں اُٹھے

ہر برائی سے ہمیشہ رہے نفرت مجھ کو
میرے معبود بھلائی سے ہو رغبت مجھ کو

خدمتِ خلق کروں دل سے ہمیشہ نگہتؔ
باغباں کرتے ہیں جس طرح چمن کی خدمت

جناب امانت علی برق

جشن تخت نشینی

پچھلے مارچ کے آخری اور اپریل کے شروع کے ہفتے میں سورت میں بڑی دھوم دھام رہی۔ ۲۸؍ مارچ سے ۶؍اپریل تک تقدس مآب ڈاکٹر ابو القائد محمد برہان الدین کا جشن بہت شان و شوکت سے منایا گیا۔ دیس کے بڑے بڑے لوگوں نے اس جشن میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔ باہر سے شریک ہونے والوں میں متحدہ عرب جمہوریہ کے نائب وزیر اعظم اور احمد حسن الباکوری ریکٹر جامعہ ازہر خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

سیدنا ڈاکٹر محمد برہان الدین کا نام ہمارے آپ کے لیے کوئی نیا نہیں ہے۔ دیس میں اور دیس کے باہر بھی لوگ انھیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ ہندوستان بلکہ دنیا کے ایک نامور بزرگ تقدس مآب سیدنا طاہر سیف الدین اعلی اللہ مقامہ کے لائق صاحبزادے اور اُن کے جانشین ہیں۔ اور اُن کی وفات کے بعد ۵۲ ویں داعیِ مطلق کی حیثیت سے گدّی پر بیٹھے ہیں۔

سیدنا حضرت طاہر سیف الدین بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ان کی روحانیت، علمی قابلیت، سوجھ بوجھ کا اپنے اور غیر سبھی لوہا مانتے تھے۔ حضرت جلالت مآب اعلی اللہ مقامہ داؤدی بوہروں کے مذہبی رہنما تھے۔ اس فرقے کی تعداد لگ بھگ دس لاکھ ہے۔ ہندوستان کے علاوہ اس فرقے کے لوگ افریقہ، عرب، ایران اور ایشیا کے پوربی ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور عزت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

حضرت سیدنا طاہر سیف الدین بڑے روشن خیال بزرگ تھے۔ اپنے فرقے کے علاوہ عام مسلمانوں کو بھی ان سے بہت فیض پہنچا ہے۔ مسلم یونی ورسٹی کے چانسلر تھے اور آخر وقت تک رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی آپ سے فیضیاب ہوتا رہا ہے۔

تقدس مآب سیدنا ڈاکٹر برہان الدین ۶؍مارچ ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ بزرگ باپ نے شروع سے ہی کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھا۔ عربی زبان اور ادب پڑھانے کے لیے اچھے سے اچھے استاد رکھے۔ خود بھی ہونہار بیٹے کی تعلیم و تربیت پر پوری پوری توجہ کی

اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ وغیرہ کی بذات خود تعلیم دی۔

۱۵ رسال (۱۹۳۰ء) کی عمر میں میثاق کی رسم ادا کی گئی اور برہان الدین کا لقب عطا کیا گیا۔ یہ بڑا اہم لقب ہے۔ خاص خاص شخصیتیں اس کی اہل سمجھی جاتی ہیں۔ اور داؤدی بوہروں میں یہ رسم بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس رسم کے بعد لڑکا زندگی کے نئے دروازے میں داخل ہوتا ہے اور "مومن بالغ" کہلاتا ہے۔

۱۹ رسال کی ہی عمر میں تقدس مآب برہان الدین نے ایک متبحر یا بہت بڑے عالم کی حیثیت حاصل کر لی تھی اسلامی شریعت، اسلامی تہذیب، اسلامی تاریخ، عربی زبان وادب غرض ہر چیز میں آپ نے پورا عبور یا مہارت حاصل کر لی۔ کلام پاک تو یوں کہیے کہ نوک بر زبان تھا۔

میثاق کے بعد ہی سیدنا ڈاکٹر برہان الدین نے اپنے محترم والد کے ساتھ مکہ مدینہ، نجف اور کربلا کی زیارت کی۔ ۱۹۳۹ء میں اپنے فرقے کے رسم و رواج کے مطابق بہت دھوم سے شادی ہوئی۔

تقدس مآب سیدنا ڈاکٹر برہان الدین نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا۔ اس سفر میں انھوں نے اپنے (داؤدی) فرقے کے لوگوں کو ملنے کی عزت بھی بخشی۔ اور کئی ملکوں کے بادشاہوں، وزیروں، لیڈروں اور بڑی شخصیتوں سے بھی [illegible] کی اور ہر ایک کے دل پر اپنی بزرگی، روحانیت اور [illegible] چھوڑا۔

خود اپنے دیس میں انھیں اپنے والد کے ساتھ ملک کے صدر، وزیر اعظم اور مختلف صوبوں کے وزیروں اور بڑے بڑے لیڈروں سے ملے، ان سے باتیں کرنے کا اور اس طرح ہر طرح کے ملکی اور غیر ملکی مسئلوں کے سمجھنے کا موقع ملا۔

تقدس مآب سیدنا برہان الدین کو جامعہ سیفیہ سے بھی گہری دلچسپی ہے یہ جامعہ جامعۂ ازہر کے نمونے پر قائم کی گئی ہے اور خوب ترقی کر رہی ہے۔

علم کے ساتھ وعظ و تقریر میں بھی خداداد مہارت ہے۔ جب وعظ فرماتے ہیں تو لوگوں پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

ابھی تھوڑے دنوں پہلے آپ نے حکومت مصر کی دعوت پر مصر کا دورہ کیا تھا۔ سیدنا طاہر سیف الدین اعلی اللہ مقامہ نے سونے چاندی کی ایک ضریح بنوائی تھی۔ یہ ضریح قاہرہ کے قریب اس مزار پر نصب کرنا تھی جس میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک دفن ہے۔ مصر کی حکومت نے اس کے افتتاح کے لیے سیدنا طاہر سیف الدین اعلی اللہ مقامہ کو دعوت دی تھی۔ ان کی وفات کی وجہ سے اس ذمہ داری کو آپ نے پورا کیا۔ اس موقع پر آپ ازہر یونیورسٹی بھی تشریف لے گئے۔ اس یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ غرض تقدس مآب سیدنا ڈاکٹر برہان الدین اپنے والد کے صحیح جانشین ہیں۔ یقین ہے کہ آپ کے معتقدوں اور عام [illegible] کو آپ سے بھی اتنا ہی فیض پہنچے گا جتنا آپ کے محترم والد کی ذات سے پہنچا تھا۔



جناب منیر الدین عزمؔ

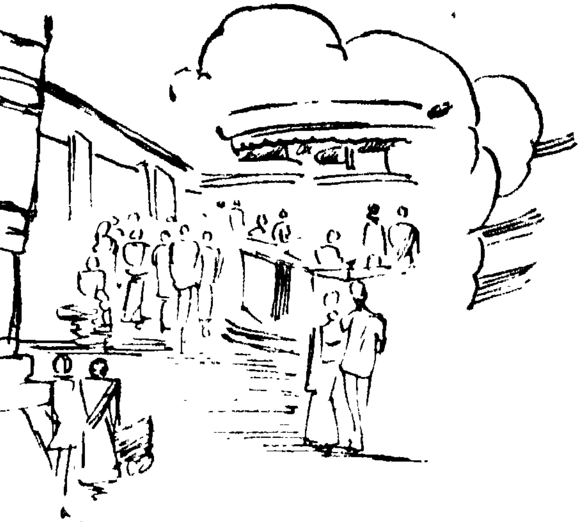
میری سالگرہ کی چھتری

ابا کی ہوں راج دلاری   سالگرہ ہے آج ہماری
تحفے سب من بھاتا لائے   ابا جان اک چھاتا لائے
تحفے سارے اک اک کرکے   میز کے اوپر چُن کر رکھے
چھاتا جب لٹکایا میں نے   گیت خوشی کا گایا میں نے
بادل اُمڈا میرے من میں   برسا جاکر بیچ آنگن میں
فوراً دوڑی چھتری لے کر   گد بد گد بد آئی در پر
چھتری ہے تو مینہ کا کیا ڈر   جیسے اندر ویسے باہر
چھم چھم چھم چھم مینھا برسے   لو جی کوئی یوں سیر کو ترسے
جھک کر چھتری کھول رہی تھی   اڑنے کو پر تول رہی تھی
دھوپ نے آکر کھنڈت ڈالی   چھتری رہ گئی کھولی کھالی

چھتری ہے بس نام کی چھتری
برسے تو ہے کام کی چھتری

جناب طاہر سعید

بگڑنے سے پہلے



سڑک پر بہت بھیڑ تھی ـــــ

میرے قدم آہستہ آہستہ گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بھیڑ کی وجہ سے فٹ پاتھ پر چلنا مشکل تھا۔ یہ بھیڑ ہمیشہ سے مجھے پسند ہے۔ اجاڑ اجاڑ ویران سڑک مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔ آج جی چاہتا ہے سڑک پر قبرستان کا سا سناٹا ہو اور میں اپنے قدموں کی آہٹ سے سناٹے کو چیرتا ہوا گھر پہنچ جاؤں۔ کسی کی آواز میرے کانوں میں نہ آئے۔ کسی کا شانہ میرے شانے سے نہ ٹکرائے۔ لیکن ظاہر ہے اس خواہش کا پورا ہونا ناممکن تھا ـــ پر میں سوچ یہی رہا تھا۔ ممی کو معلوم ہوگا تو وہ کھانا بند کر دیں گی ـــ ڈیڈی مارتے مارتے ہڈیاں توڑ دیں گے، بات نہیں کریں گے، میرا جیب خرچ بند ہو جائے گا۔ انٹرویل میں سب لڑکے مٹھائیاں کھائیں گے، ٹافیاں اڑائیں گے اور میں سب کا منہ تکوں گا، سب لڑکے میرا مذاق اڑائیں گے اور میں شر.....

'مر گیا' ـــــ میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور چیخ نکل گئی۔ سر پر کسی نے ایک زوردار چپت رسید کی تھی۔ اپنا سر سہلاتا ہوا پیچھے گھوم پڑا۔

"بس ـــ گھبرا گئے" مسعود نے مسکرا کر کہا۔ مجھے مسعود کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔

"مسعود بھائی ملاقات کرنے کا یہ طریقہ مجھے بالکل پسند نہیں آیا ——" میں نے غصّے سے کہا۔

"اچھا حضور معاف کریں —— غلطی ہوگئی ——" مسعود نے اتنی معصومیت سے کہا کہ مجھے ہنسی آگئی۔

"آج انٹرویل میں کہاں جارہے تھے؟" مسعود نے پوچھا۔

"ماسٹر صاحب نے ایک کام سے بازار بھیج دیا تھا۔"

"اوہ —— میں نے تمھارے لیے بانسوں میں کنوئیں ڈلوا دیے تھے۔"

"بانسوں میں کنوئیں ——؟"

"ارے معاف کرنا —— میرا مطلب تھا کنوؤں میں بانس ڈلوا دیے تھے —— یہ زبان گوشت کی ہے کبھی کبھی بہک جاتی ہے یوں چاہتا ہوں تھوڑی سی چھٹوا دوں لیکن خون نکلنے کا ڈر ہے کیا کروں خون مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔" مسعود نے کہا۔

"واہ —— کیسے بہادر ہو —— خون نہیں دیکھ سکتے ——؟"

"کیا بتاؤں —— اس معاملے میں تو میری بہادری ہار مان گئی ہے ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے میں بستر پر لیٹا تھا ایک موٹا تازہ کھٹمل سفید چادر پر ٹہلنے لگا۔ اتفاق سے چھوٹی بہن کی نظر پڑ گئی اُس نے وہیں چادر پر مسل دیا اور میں خون کا دھبہ دیکھ کر بے ہوش ہوگیا۔

"اور کئی دن تک بے ہوش رہے ——" میں بیچ میں بول پڑا۔

"کئی دن تو نہیں —— پھر بھی دو گھنٹے ضرور لگے —— شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹر جھک مار کر چلے گئے۔ آخر کار ممی نے مجھے ٹا....."

"جوتا سنگھایا ——" میں نے بات کاٹ کر کہا اور مسعود جھینپ گیا ——

"بھئی اس وقت تو مان گئے —— اچھا سناؤ کوئی تازہ خبر ——" مسعود نے مسکرا کر کہا۔

"مسعود بھائی آج میرا بستہ چوری ہوگیا میں بہت پریشان ہوں —— کیا کروں —— کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"بس! —— اتنی سی بات!! —— ارے آج تمھارا بستہ کسی نے چرالیا کل تم کسی کا پار کر دینا ——"

"نہیں نہیں —— میں چوری نہیں کروں گا" میں نے کہا۔

"تمھاری مرضی ــــ میں تو ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہوں۔ اگر میری کوئی ایک کتاب چراتا ہے تو میں پانچ کتابیں چرا کر بدلہ نکال لیتا ہوں ــــ" مسعود نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"یہ تو بہت بری بات ہے ــــ" میں نے کہا۔

"بری بات ہے تو جاؤ پریشان رہو ــــ گھر والوں کی مار کھاؤ ــــ برا سنو ــــ میں تو چلا۔ مجھے بازار سے کچھ سامان خریدنا ہے ــــ ٹاٹا" اور وہ بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

میں پھر گھر کی طرف روانہ ہو گیا ــــ مسعود کا مشورہ مجھے بالکل پسند نہ آیا۔ کئی مشہور ڈکیتوں کے قصے مجھے یاد آئے۔ بچپن میں انھیں چوری کرنے کی عادت پڑی اور پھر بڑھ کر وہ ڈکیت بن گئے۔ ان کے بھیانک انجام کا خیال کر کے میرا جسم کانپ اٹھا اور میں نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو چوری نہ کروں گا۔ مجھے تو بڑا ہو کر ایک ڈاکٹر بننا ہے ڈکیت نہیں ــــ

"آج تو بہت دیر کر دی ــــ" میرے ملازم فضلو نے مجھے چونکا دیا۔ مکان آ گیا تھا۔ میں اُسے کوئی جواب دیے بغیر اندر داخل ہو گیا ــــ

"ارے بستہ کہاں ہے ــــ؟" ممی نے مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر پوچھا۔ وہ باورچی خانے سے نکلی تھیں۔ ان کی آواز پر ڈیڈی نے بھی رسالے سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ وہ دالان میں کرسی پر بیٹھے تھے۔ ڈیڈی کو بے وقت گھر میں موجود پا کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ میں نے تو سوچا تھا چپکے سے ممی کو بتا کر اُن کی خوشامد کر لوں گا۔ وہ ڈیڈی کو بھی سمجھا دیں گی کہ میری کوئی غلطی نہیں ہے لیکن اب تو سارا راز کھل گیا۔

"مسعود ــــ میں کیا پوچھ رہی ہوں ــــ" ممی زور سے چلائیں۔

"مم.... مم.... ممی.... وہ.... وہ تو کسی نے چرا لیا...." ڈیڈی کے ڈر کی وجہ سے میری آواز کانپ گئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس وقت میں صحن میں بت بنا کھڑا تھا ــــ

اچانک ڈیڈی اپنی جگہ سے اٹھے ــــ انھوں نے رسالہ میز پر رکھ دیا ــــ میں نے سوچا اب وہ ہمیشہ کی طرح الماری سے اپنا بیت نکالیں گے اور پھر میرے ننھے سے جسم پر مارتے مارتے نیلیں اٹھا دیں گے لیکن آج وہ شاید بیت نکالنا بھول گئے۔ خالی ہاتھ میری طرف آ رہے تھے۔ اب مجھے اُن کے تماچوں اور تھپڑوں کی یاد آنے لگی۔ سارا

جسم کانپنے لگا۔

"ہر وقت کھیل میں بے ہوش رہتا ہے —— پورا بستہ چوری ہوگیا اور تجھے پتہ نہیں چلا۔" ممی کی غصّے سے بھری آواز آئی —— ڈیڈی میرے قریب آگئے تھے ان کی مار سے بچنے کے لیے میں تیزی سے ممی کی طرف بھاگا لیکن ڈیڈی نے پھرتی سے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا۔

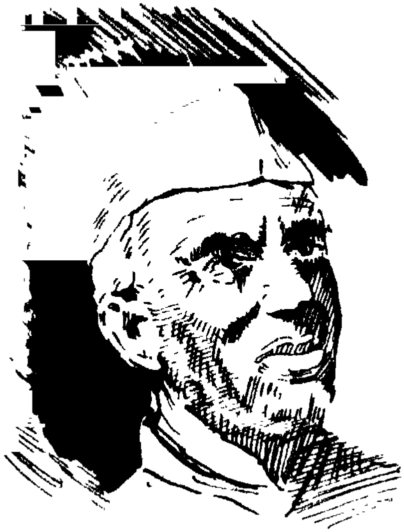
"ممی! مجھے بچائیے ——" بے اختیار میری چیخ نکل گئی اور ڈیڈی زور سے ہنس پڑے۔ انھوں نے مجھے گود میں اٹھا لیا ——

"پاگل —— بستہ کھو گیا —— کھو جانے دے —— میں تجھے اور لا دوں گا۔ آئندہ احتیاط رکھنا۔ میں تو اپنے بیٹے کی سچائی پر بہت خوش ہوں اور آج اس خوشی میں میں تجھے ٹافی کا ایک پیکٹ انعام میں دوں گا ——" ڈیڈی نے کہا۔

"میرے اچھے ڈیڈی ——" میں مسکرا کر ڈیڈی سے لپٹ گیا ——

دوسرے دن میں نئی کتابیں اور نئے بستے کے ساتھ اسکول میں داخل ہوا تو گھنٹہ ہو گیا۔ مسعود سے ملاقات نہ ہو سکی اِس سال میرا اور اس کا سیکشن بدل گیا تھا۔ انٹرویل میں میں اُس کے کلاس کی طرف گیا میں کل کی کہانی اسے سنانے کے لیے بے چین تھا۔ مسعود کلاس میں نہ تھا۔ کلاس کے ایک لڑکے سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ مسعود چور تھا۔ نہ جانے کس طرح ہیڈ ماسٹر صاحب پر اُس کی چوری کا بھید کھل گیا انھوں نے آج پہلے گھنٹے میں مسعود کی بری طرح مرمت کی، اس کا نام کاٹ دیا —— اور اسکول کی حد سے باہر نکال دیا —— اب وہ کبھی نہیں پڑھ سکے گا ——

میں یہ سن کر سکتے میں رہ گیا —— اگر میں مسعود کی رائے مان لیتا تو ایک دن میرا بھی یہی انجام ہوتا —— لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں گرنے سے پہلے سنبھل گیا —— یہ سوچتا ہوا میں اپنے کلاس میں لوٹ آیا۔



جناب ساحر بھوپالی

آہ نہرو

وطن کو خوف تھا جس کا گھڑی وہ آکے رہی — ہمارے ٹوٹے دلوں کو اجل دُکھا کے رہی
تمام آرزوئیں خاک میں ملا کے رہی — غموں میں جاگنے والے کو نیند آکے رہی

غریب قوم پہ غم کا پہاڑ ٹوٹا ہے
کہ جان سے بھی پیارے کا ساتھ چھوٹا ہے

ستم زدوں کا جہاں میں تو ہی سہارا تھا — کہ جن کے واسطے ہر غم تجھے گوارا تھا
وطن عزیز تجھے جان سے بھی پیارا تھا — تو اپنی قوم کی تقدیر کا ستارا تھا

یہ مرتبہ ہے وہ ہر اک جسے نہیں پاتا
کہ تیری موت کا دل کو یقیں نہیں آتا

جو کر گیا ہے تو وہ کوئی کر نہیں سکتا — زمانہ راہ سے تیری گزر نہیں سکتا
اب عشقِ قوم کا دم کوئی بھر نہیں سکتا — جو مٹ گیا ہو وطن پر وہ مر نہیں سکتا

کہاں سے لائے گا کوئی وہ ہمّتِ عالی
سدا رہے گی جہاں میں تری جگہ خالی

تو بزمِ عشق میں دانائے راز تھا نہرو زمانے بھر کا تو ہی اک ایاز تھا نہرو
خلوصِ عزم کا ترے یہ بھی راز تھا نہرو کہ تیرا بندہ بھی بندہ نواز تھا نہرو
ترے ہی واسطے بینائی اس نے کھوئی تھی
حرم و دیر میں صدیوں حیات روئی تھی

وقار تیرے ارادوں میں تھا ہمالہ کا تھا بحرِ زیست میں تیرے بہاؤ گنگا کا
بھرا تھا دل میں ترے درد ساری دنیا کا ۔ تو جانشین تھا گاندھی کا اور راّنا کا
تو اپنے ملک میں جمہوریت کا بانی تھا
کمالِ عشق میں تو بھی کرشن ثانی تھا

جہاں میں ہستی تری فخرِ آدمیت تھی زمانے بھر کی مصیبت تری مصیبت تھی
ہر ایک فرد کے دل پر تری حکومت تھی تمام لطف و عنایت تری سیاست تھی
ابوالکلام کی اُلفت کا انتخاب تھا تو
وہ آفتابِ محبت تھا، ماہتاب تھا تو

جوانی بیتی تری حوصلے بڑھانے میں بڑھاپا گزرا ترا قسمتیں بنانے میں
تمام عمر کٹی دُکھ پہ دُکھ اٹھانے میں ملا نہ چین تجھے مٹ کے بھی زمانے میں
تمام ہند میں بکھری ہوئی ہے خاک تری
مصیبتوں میں بھی طینت تھی کتنی پاک تری

کریں گے پوری ہم اک ایک آرزو تیری رکھیں گے مٹ کے زمانے میں آبرو تیری
ہماری بھی ہے وہی جو تھی جستجو تیری اب ہم کو بننا ہے تصویر ہو بہ ہو تیری
کریں گے ضبط جدائی کا غم بھی جھیلیں گے
مصیبتوں سے تو کھیلا تھا ہم بھی کھیلیں گے

جناب مولانا مقبول احمد سیوہاروی



ابن بطوطہ

(۲)

جمعہ کا دن

جمعہ کے دن خانقاہ کا خدمت گار سب درویشوں کے مصلّے جامع مسجد میں لے جاتا ہے اور سب مل کر خانقاہ کے بڑے شیخ کے ساتھ جامع مسجد جاتے ہیں۔ پھر ساتھ واپس آتے ہیں۔

اسی مصر کے محلہ قرافہ میں بڑی بڑی درگاہیں ہیں جہاں دن رات قرآن خوانی ہوتی رہتی ہے۔ ان درگاہوں میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے سرِ مبارک کی قبر بھی ہے۔ قبر کے دروازے کی زنجیریں چاندی کی ہیں اور دروازے کے کیواڑوں پر چاندی کے پتّر چڑھے ہوئے ہیں۔

سیدہ نفیسہ کی قبر

حضرت امام حسین علیہ السلام کی پوتی سیدہ نفیسہ کی قبر بھی یہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں: جو دعا اس قبر پر مانگی جاتی ہے قبول ہو جاتی ہے۔

مصر میں دریائے نیل بہتا ہے۔ نیل کا پانی میٹھا اور نہایت خوشگوار ہے، صاف ہے اور ہاضم ہے۔

دریا کے کنارے کنارے بہت سے گاؤں آباد ہیں اور نیل کے پانی سے خوب پیداوار ہوتی ہے۔ کسان مالا مال ہیں۔

اہرام مصر

مصر کی عمارتوں میں سب سے عجیب اور پرانی عمارت وہ ہے جسے اہرام کہتے ہیں۔ یہ عمارت کب تیار ہوئی؟ ٹھیک ٹھیک بتانا مشکل ہے پھر بھی بہت سے لوگوں نے اس کی تاریخیں لکھی ہیں اور بتایا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے پرانی عمارت ہے۔ جن پتھروں سے اسے بنایا گیا ہے وہ بے حد سخت اور مضبوط ہیں۔ اہرام کی شکل یہ ہے کہ بنیاد بہت چوڑی ہے نیچے سے اوپر تک گول[1] چلی گئی ہے اور اوپر جاکر اتنی پتلی ہو گئی ہے کہ نوک سی بن گئی ہے۔

ایک کتاب میں لکھا ہے کہ مصر کے بادشاہ نے جو ہزاروں برس پہلے حکومت کرتا تھا ایک ڈراونا خواب دیکھا اور اس نے دریائے نیل کے پچھمی سمت اہرام کی عمارت بنائی۔

بادشاہ نے نجومیوں سے پوچھا بتاؤ! اس عمارت کو کوئی توڑے گا تو نہیں۔

نجومیوں نے کہا: اس عمارت کو ایک بادشاہ اپنے زمانہ میں اُتر کی طرف سے توڑے گا جس میں اتنا روپیہ اسے خرچ کرنا پڑے گا۔

نجومیوں نے جتنا روپیہ بتایا اتنا ہی روپیہ مصر کے بادشاہ نے اُتر کی سمت میں رکھ دیا۔

ہزاروں برس گزرنے کے بعد جب عباسیوں کی حکومت ہوئی تو مامون الرشید عباسی کو (جس کی راجدھانی بغداد میں تھی) خیال ہوا کہ اہرام کی عمارت کھدوائی جائے۔

مصر کے بڑے بوڑھوں نے بادشاہ کے پاس عرضیاں بھیجیں کہ اسے نہ کھدوایا جائے۔ مگر مامون الرشید نہ مانا۔

بہت دنوں کی محنت کے بعد جب نہ جانے کتنا روپیہ خرچ ہو گیا تو ذرا سا سوراخ ہوا جس میں کچھ روپیہ نکلا۔ حساب لگایا تو جتنا روپیہ کھدائی میں خرچ ہوا تھا آنہ، پائی سے اتنا ہی روپیہ تھا۔ مامون الرشید نے جب یہ خبر سنی تو کھدائی بند کرادی۔

اہرام کی یہ عمارت ساٹھ برس میں تیار ہوئی

---

[1] گول نہیں مخروطی ہے۔ (ایڈیٹر)

ہے، جس بادشاہ نے اسے بنایا ہے لکھ کر لگا دیا ہے کہ یہ عمارت ساٹھ برس میں بنی ہے جو کوئی اسے کھودے گا یا گرائے گا چھ سو برس اس کے گرانے میں لگیں گے۔

جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں مصر کا بادشاہ ملک الناصر ابوالفتح محمد ابن ملک منصور سیف الدین قلاوون الصالحی تھا

یہ ملک الصالح کا غلام تھا اور ملک الصالح نے اسے ایک ہزار اشرفی میں خریدا تھا۔ اب یہ خود بادشاہ ہے اور بہت اچھا بادشاہ ہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی بڑی خدمت کرتا ہے اور مصر و عراق کے غریب لوگوں کو جنھیں حج کی آرزو ہوتی ہے روپیہ دے کر حج کراتا ہے۔ ان کے کھانے پینے کا سب خرچ خزانہ شاہی سے دیتا ہے۔ جو لوگ ہجرت کر کے جاتے ہیں ان کی بڑی مدد کرتا ہے۔

مصر کے سب سے بڑے قاضی کا نام —— شمس الدین حریری ہے، یہ بہت بڑے عالم ہیں اور بادشاہ ان کی بہت عزت کرتا ہے۔ بڑے بڑے امیر قاضی صاحب کا ادب کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں، خود بادشاہ نے ایک دفعہ مصاحبوں سے کہا کہ میں کسی سے نہیں ڈرتا مگر قاضی صاحب سے ڈرتا ہوں۔

قاضی شمس الدین حریری بڑے سے بڑے امیر کی پروا نہیں کرتے اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

بادشاہ کا دربار

بادشاہ پیر اور جمعرات کو عام دربار کرتا ہے۔ چاروں مذہب کے قاضی، شافعی، مالکی، حنبلی، حنفی بادشاہ کے بائیں طرف بیٹھتے ہیں۔ عرضیاں پیش ہوتی ہیں۔ جس پر ظلم ہوتا ہے وہ خود اپنی عرضی لے کر دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ بادشاہ خوب غور سے حال سنتا ہے اور انصاف کرتا ہے۔

محمل مصری

حکومت مصر کو یہ سعادت حاصل ہے کہ ہر سال خانہ کعبہ کا غلاف تیار ہو کر مصر سے جاتا ہے۔

رجب کا مہینہ آتے ہی جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے اور دلوں میں مکہ مدینہ جانے کی امنگیں اُبھر آتی ہیں۔

محمل شریف کا جلوس دیکھنے کی قابل ہوتا ہے۔

جلوس

سب سے آگے محمل ہوتا ہے، پھر عربی گیت گانے والے جنھیں حُدی خواں کہتے ہیں اونٹوں پر سوار گاتے ہوئے چلتے ہیں۔ اس کے بعد بڑے بڑے علماء، مشائخ، مفتی، قاضی، اور شہر کے لاکھوں آدمیوں کا ہجوم ہوتا ہے۔

میں بھی حج کو جارہا ہوں رات کو مسافرخانہ میں ٹھہرا۔ اس مسافرخانے میں تبرکات کی زیارت کرائی جاتی ہے۔

کٹورے کا ٹکڑا

جس کٹورے یا پیالے سے سرکارِ دو عالم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پانی پیتے تھے اس کا ایک ٹکڑا ہے۔

سرمہ کی سلائی

جس سلائی سے سرکار مدینہ سرمہ لگاتے تھے اور سوچا جس سے فخرِ دوجہاں اپنے جوتے درست فرماتے تھے یہاں موجود ہے۔

قرآن پاک

ایک قرآن پاک جسے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے رکھا جاتا ہے۔ ان تبرکات کو مسافرخانہ کے مالک نے ایک لاکھ روپیہ دے کر حاصل کیا ہے اور مسلمانوں کی زیارت کے لیے مسافرخانے میں رکھ دیا ہے۔ مصر میں گیہوں سے شہد نکالا جاتا ہے۔

بیت المقدس

بیت المقدس بڑا اچھا شہر ہے۔ یہاں کی مسجد اتنی مضبوط اور اعلیٰ ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے تمام دنیا کی مسجدوں سے بڑی ہے۔ مسجد کی لمبائی پانچ سو پینتالیس گز ۵۴۵ اور چوڑائی تین سو چودہ ۳۱۴ گز ہے کہتے ہیں کہ جنات حضرت سلیمان علیہ السلام کے فرماں بردار تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات کو حکم دیا اور انھوں نے ایسے بڑے بڑے پتھر لاکر عمارت میں لگادیے ہیں جنھیں دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

ایک ستون کا اتنا بڑا پتھر ہے کہ جدھر سے ناپو پچیس بالشت اترتا ہے۔

مسجد کے اندر ایک غار ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی قبریں ہیں۔

امام برہان الدین خطیب یہاں کے مشہور اماموں میں سے ہیں، بہت بوڑھے اور بزرگ ہیں۔ ان سے مل کر میں نے قبروں کی تصدیق کی تو انھوں نے فرمایا بیشک یہ قبریں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی ہیں اور ان سب کی بیبیوں کی قبریں بھی یہیں ہیں۔

مسجد میں حضرت یوسف علیہ السلام کا مزار بھی ہے اور حرم خلیل کی پوربی جانب ایک ٹیلے پر حضرت لوط علیہ السلام کی قبر ہے ٹیلے پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو شام کی سرحد نظر آتی ہے۔ اس کے قریب بحیرہ لوط (DEADSEA) ہے جس کا پانی بہت کھاری بلکہ بہت کڑوا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ حضرت لوط پیغمبر کی قوم یہاں آباد تھی جنھوں نے نافرمانی کی۔

حضرت لوط کی قبر کے پاس چھوٹی سی ایک مسجد ہے جسے مسجد یقین کہتے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے ایسی نورانی مسجد کہیں نہیں دیکھی تھی۔ مسجد کے پاس ایک گھر ہے جس میں مسجد کا مہتمم رہتا ہے مسجد کے دروازے پر پتھر کا تراشا ہوا محراب جیسا بنا ہے جس میں فقط ایک آدمی نماز پڑھ سکتا ہے۔

مشہور ہے کہ جب حضرت لوط کی گنہگار قوم تباہ ہوئی تو حضرت لوط نے خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے اسی جگہ سجدہ کیا تھا اور سجدہ کی یہ جگہ زمین کی جنبش سے نیچے بیٹھ گئی تھی۔

اسی مسجد کے نشیب میں سیدالشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحب زادی فاطمہ صغرا کا مزار ہے جس کے سرہانے سنگ مرمر کی تختی لگی ہوئی ہے۔ یہ تختی مصر کے ایک کاریگر نے لگائی ہے۔ جس کا نام محمد ابن سہیل نقاش ہے۔ تختی پر لکھا ہوا ہے:

یہ مزار مبارک ام سلمہ فاطمہ صغرا
حضرت امام حسینؑ کی صاحبزادی
کا ہے۔
یہ محمد ابن سہیل کا بنایا ہوا ہے
جس کی بود و باش مصر نہیں تھی۔

عبارت کے نیچے اشعار ہیں جن کا مطلب یہ ہے۔

ہائے آپ نے اپنا مسکن میرے
دل کی جگہ مٹی اور پتھر میں بنایا ہے۔
اے امام حسین کی بیٹی کے مزار
مقدس تجھ میں کیا نہیں ہے، دین
ہے، تقوے ہے، عفت ہے۔
نگہداشت ہے، حیا ہے۔ واحسرتا!
یہاں حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب
کے مزارات ہیں اسے شہر خلیل کہتے ہیں۔ یہاں
سے بیت المقدس جاتا ہے۔ راستے میں حضرت
یونس علیہ السلام کے مزار مبارک پر حاضری دی۔
مزار پر بہت بڑی عمارت اور مسجد ہے۔ پھر
حضرت عیسےٰ کے مقام پیدائش پر گئے جسے بیت اللحم
کہتے ہیں۔

یہاں کھجوروں کی شاخ کا نشان اب
تک موجود ہے۔

پیدائش کی جگہ بڑی شاندار عمارت
ہے جس کی عیسائی بے حد تعظیم کرتے ہیں اور جو
کوئی یہاں آتا ہے اس کی دعوت کرتے ہیں۔

اَلْاِدَارَۃُ الثَّقَافِیَّۃُ الْعِلْمِیَّۃُ (بمبئی) کی مطبوعات

تعلیم خواہ کسی معیار کی ہو، بڑی توجہ کی محتاج ہے۔ ابتدائی تعلیم تو اور بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اس منزل کے ہر مضمون کو سہولت و آسانی کے ساتھ حاصل کرنے کے بہترین وسائل مہیا کر دیے جائیں تو تعلیمی منزلیں بڑی آسانی سے طے ہوتی ہیں اور ذہنی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے —— اسی اصول کے پیشِ نظر سیدۂ محترمہ شہزادی صدیقہ بنت سیدنا طاہر سیف الدین قس نے ابتدائی دینی تالیفات کا سلسلہ شروع فرمایا ہے جسے روز بروز مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ جن ابتدائی و ثانوی اسکولوں میں دینیات کی تعلیم کا بھی انتظام ہے وہاں اگر شہزادی صاحبہ کی تالیفات کے ذریعے تعلیم دی جائے تو طلباء کو بہت فائدہ ہوگا۔ اس کی صورت یہ ہو کہ پہلے:

تَیْسِیْرُ الْقُرْآن : (قرآنی قاعدہ) : پڑھا جائے۔ اس میں صرف چودہ سبق ہیں۔ چھوٹے سائز کا یہ قاعدہ کافی جلی خط میں چھاپا گیا ہے۔ قیمت: ۵۰ پیسے

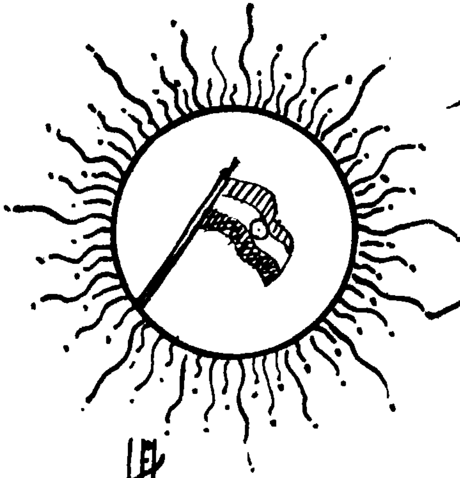
مِنْهَاجُ الْقُرْآن : یہ بھی قرآنی قاعدہ ہے اور تیسیر القرآن کے بعد پڑھانے سے بچوں کی قرآن خوانی کی صلاحیت کو بڑھاتا ہے۔ اس سے بڑی عمر کے لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں —— یہ دونوں قاعدے بچوں کو زیادہ سے زیادہ تین مہینوں میں ختم کرا دینے چاہییں۔ قیمت: ۷۵ پیسے

تَرْتِیْلُ الْقُرْآن : یہ کتاب قرآن کو صحیح پڑھنے کے لیے تجوید و وقف کے ضروری قواعد سے متعلق آسان زبان میں لکھی گئی ہے قیمت: ۵۰ پیسے

لِسَانُ الْقُرْآن : یہ کتاب چار جز پر مشتمل ہے۔ جو طلباء اسکولوں میں عربی زبان لیتے ہیں ان کے لیے یہ سلسلہ بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ پانچویں سے آٹھویں جماعت تک یہ سلسلہ ختم کر لینے کے بعد طلباء اور وہ لوگ بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو قرآن اور عربی کی کتابیں سمجھ کر پڑھنا چاہیں۔ فی جز ۷۵ پیسے

مذکورہ بالا تالیفات کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انھیں صاحب الفضائل والمناقب حضرت سیدنا طاہر سیف الدین قس کی پسندیدگی کا شرف حاصل ہے اور متعدد مکاتیب و مدارس میں یہ داخل نصاب ہیں۔

ملنے کا پتہ: **مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ جے جے اسپتال بمبئی ۳**



اچھے کام

جناب خورشید احمد جامی

دوسروں کو ملے خوشی جس سے — کچھ ہو تکلیف میں کمی جس سے
جو اندھیرے میں روشنی لائے — اور پیغامِ زندگی لائے
جوش پیارے وطن کی خدمت کا — حوصلہ پیار کا، محبّت کا
دُور کرتا ہو جو بُرائی کو — اور جگائے سدا بھلائی کو
آدمیت کا پاس ہو جس میں — شہد کی سی مٹھاس ہو جس میں
ہاتھ میں علم کا پھریرا ہو — زندگی ہو، نیا سویرا ہو
تازگی جس میں ہو بہاروں کی — روشنی جس میں ہو ستاروں کی
جس میں اخلاق جگمگاتے ہوں — چاند کی طرح مسکراتے ہوں

صبح اچھے ہیں شام اچھے ہیں
ایسے جتنے ہیں کام اچھے ہیں



یہ بھی گھر بناتے ہیں

ہم آپ سب گھروں میں رہتے ہیں۔ یہ گھر ہر ایک کی حیثیت اور رتبے کے مطابق ہوتے ہیں۔ کوئی مٹی کے گھروں میں رہتا ہے کوئی پکے گھروں میں رہتا ہے اور کسی نے اپنے رہنے کے لیے شاندار محل اور کوٹھیاں بنوالی ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے گھر میں آرام کی سب چیزیں ہوں۔

آپ تعجب نہ کیجیے ہماری آپ کی طرح بہت سے جاندار بھی گھر بنا کر رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہماری آپ کی طرح وہ بھی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے گھروں میں آرام کا سب سامان میسر ہو۔ دیمک، شہد کی مکھیاں، بھڑیں تو اپنے لیے گھر میں پورے پورے شہر آباد کرتی ہیں۔ بڑی بڑی بستیاں بناتی ہیں۔ آپ کو شوق ہو تو ان کے بارے میں آپ کو اردو میں بھی کتابیں مل جائیں گی۔



ایسے جانداروں میں سب سے پہلے ہم اُود بلاؤ

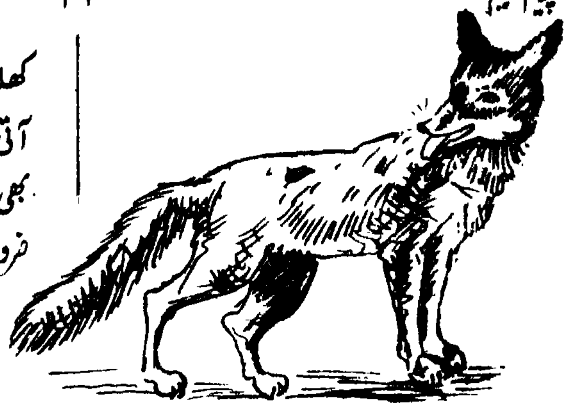
کو پیتے ہیں اور بلاؤ قدرت کا انجینیر کہلاتا ہے۔

اس کا گھر بنانے کا طریقہ بھی انوکھا ہے یہ اپنا گھر بنانے کے لیے پیڑوں کی ٹہنیوں کا ایک ڈھیر تالاب کے بیچ میں جمع کرتا ہے اور اسے کیچڑ سے لیپتا ہے۔ یہ ڈھیر کافی بڑا ہو جاتا ہے تو وہ اسے درمیان میں سے کترنا اور چبانا شروع کرتا ہے۔ اس طرح بیچ میں ایک چھوٹی سی سرنگ اور اس کے آگے ایک کمرہ بنالیتا ہے۔ گھر میں باقاعدہ روشندان بھی بنائے جاتے ہیں۔ گھر کی طرف جانے والی سرنگ کئی کئی گز لمبی ہوتی ہے۔ یہ پانی کے اندر سے گزرتی ہوئی جاتی ہے۔ اس کا گھر پانی کی سطح سے اونچا ہوتا ہے۔



چھچھوندر تو سب نے دیکھی ہوگی لیکن اس کے گھروں کے بارے میں شاید ہی کسی کو کچھ معلوم ہو۔ جہاں یہ رہتی ہے وہاں مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے سے بن جاتے ہیں لیکن یہ ان ڈھیروں میں نہیں رہتی۔ اس کا حقیقی گھر تو اس ٹیلے سے کچھ فاصلے پر کسی درخت یا جھاڑی میں چھپا رہتا ہے گھر کا دروازہ ایک سرنگ میں کھلتا ہے۔ یہ سرنگ کافی لمبی ہوتی ہے اور ایک بڑے ہال میں کھلتی ہے۔ لیکن یہ سیدھی ہال میں جاکر بھی نہیں کھلتی بلکہ ہال کے چاروں طرف دو گیلریاں ہوتی ہیں۔ ایک گیلری کی اونچائی ہال کی چھت کے برابر ہوتی ہے اور دوسری کی اس سے ذرا زیادہ۔ اوپر والی گیلری ہال میں کھلتی ہے۔ ہال کی چھت میں بھی تین دروازے ہوتے ہیں یہی نہیں بلکہ پانچ راستے اوپر کی گیلری سے نیچے کی گیلری تک جاتے ہیں۔ گھر سے کئی سرنگیں مختلف سمتوں کو جاتی ہیں۔ لیکن سب ہی پہلی گیلری میں کھلتی ہیں۔ چھچھوندر نچلی گیلری سے ہوتی ہوئی سیڑھیاں پار کرکے اوپر کی گیلری میں پہنچتی ہے اور پھر ہال میں داخل ہوتی ہے۔ یہاں پر بچوں کے لیے ایک الگ چھوٹا سا کمرہ ہوتا ہے اس میں چھوٹے چھوٹے گدے ہوتے ہیں اس کے نیچے سے ہو کر دو سرنگیں گزرتی ہیں۔ ہال میں صاف ہوا آسانی سے داخل ہوتی رہتی ہے اور چھچھوندر کو سانس لینے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

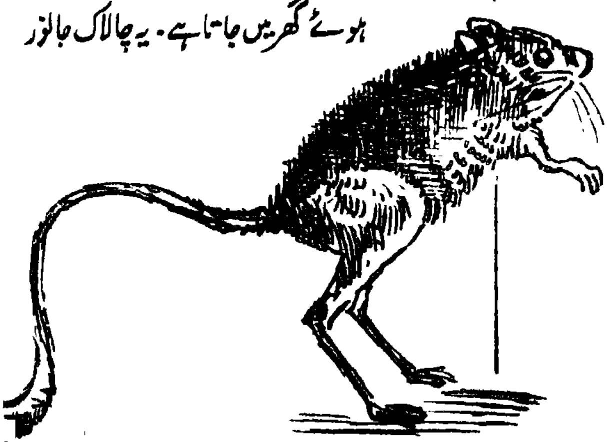
لومڑی بہت چالاک جانور ہے۔ یہ خود اپنا



گھر نہیں بناتی۔ بجّو کے گھر پر قبضہ کرلیتی ہے۔ بجّو بہت صفائی پسند جانور ہے اس کا گھر بہت صاف ستھرا ہوتا ہے۔ مگر لومڑی کو صفائی بالکل نہیں بھاتی۔ یہ وہاں اتنی گندگی پھیلاتی ہے کہ بیچارہ بجّو گھبرا کر بھاگ جاتا ہے اور لومڑی مزے سے اس کے گھر پر قبضہ کرلیتی ہے۔

گلہری اپنا گھر درختوں کے تنوں میں کافی اونچائی پر بناتی ہے۔ یہ ٹہنیوں کی مدد سے اپنے گھر کی دیواریں اور فرش اس طرح بناتی ہے کہ بارش کے موسم میں پانی داخل نہیں ہوسکتا۔ اس کے گھونسلے کے در و دیوار سوکھی کائی سے ڈھکے رہتے ہیں مگر ہوا کے لیے ایک چھوٹا سا دروازہ نیچے کی طرف کھلا رہتا ہے اسی دروازے سے یہ گھونسلے میں آتی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دروازہ اور بھی ہوتا ہے جو اوپر کی طرف کھلتا ہے یہ وقت ضرورت کام میں آتا ہے۔ آندھی اور طوفان کے وقت گلہری دونوں دروازوں کو کائی سے بند کرکے آرام سے گھونسلے میں بیٹھی رہتی ہے۔

ایک قسم کا چوہا "کنگارو چوہا" کہلاتا ہے۔ یہ اپنے گھر میں بھول بھلیاں بناتا ہے تاکہ اس کا گھر اس کے دشمنوں سے محفوظ رہے۔ گھر میں داخل ہونے کے لیے کئی دروازے ہوتے ہیں ہر دروازہ ایک ٹیڑھی میڑھی چکّر دار سُرنگ میں کھلتا ہے ہر سُرنگ اندر بنے ہوئے دروازوں میں کھلتی ہے۔ ان دروازوں سے ایک راستہ نکل کر اندر بنے ہوئے گھر میں جاتا ہے۔ یہ چالاک جانور



اپنے گھر سے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کر دیتا ہے۔ اس کے گھر میں ایک خاص کمرہ ہوتا ہے جو خوب سجا ہوا ہوتا ہے۔ فرش پر نرم نرم گھاس کے گدّے بچھے رہتے ہیں۔ کھانے پینے کا سامان بھی اس کے گھر کے اسٹور روم میں ہر وقت بھرا رہتا ہے۔

پیٹرول (Petrol) ایک سمندری چڑیا ہے یہ ٹواٹارا (Tuatara) ذات کی بڑی چھپکلی کے ساتھ گھونسلا بنا کر بڑے مزے سے رہتی ہے۔ یہ اپنا گھونسلا زمین میں گہرا بل بنا کر رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ رہنے والی چھپکلی خود دوسرے چھوٹے موٹے جانوروں کو کھا کر اپنا پیٹ بھرتی ہے۔ مگر پیٹرول کے بچّوں کی پوری دیکھ بھال کرتی ہے اور اپنے بچّوں کو اس کے بچّوں سے ملنے جلنے نہیں دیتی۔

بَیا اپنا گھونسلا درختوں کی شاخوں پر گھاس پھوس کے ذریعے بڑی ہی خوبصورتی اور مضبوطی سے بناتا ہے۔ جس میں کئی خانے ہوتے ہیں۔ آندھی کے جھکڑ اور طوفانی بارشیں بھی اس پر کچھ اثر نہیں کرتیں۔

'اوریول' نیلے نیلے رنگ کا ایک خوب صورت سا پرندہ ہے۔ یہ پہلے تو اپنے گھر کے لیے کسی درخت پر اچھی سی جگہ کا انتخاب کرتا ہے پھر گھر کی بنیاد رکھنے کے لیے درختوں کے لمبے لمبے ریشے ڈھونڈ کر لاتا ہے۔ وہ ریشوں کے ایک سرے کو درخت کی ٹہنی میں دو چار پھندے دے کر باندھ دیتا ہے۔ دوسرے سرے بھی اسی طرح باندھ دیتا ہے۔ لیکن ریشوں میں کافی ڈھیل چھوڑ دی جاتی ہے جس سے کر وہ ایک انڈے کی ٹوکری جیسا ڈھانچہ بن جاتا ہے۔ اس میں اس کا گھونسلا محفوظ رہتا ہے۔



محترمہ نغمہ فرح امروہوی

بڑھتی جائے بوئے گلشن

(محترمہ ہاجرہ بیگم کے "پاگل خانے" سے متاثر ہو کر:)

دُھنے، جولاہے، سقّے بھنگی
جالڈو، کوری، تیلی، دھوبی

خاں صاحب اور شیخ و برہمن
سید، مرزا، ویش اور شرون

نام ہیں یہ اُس دور کے بھائی
زیر کٹی جب محنت کی گردن

ذات پات کے سارے قصّے
بھولو ان کو یہ ہیں دُشمن

کون جولاہا، کون ہے سید!
نہیں کسی میں، کوئی بڑا پن

اپنے وطن کے سارے باسی
لالہ و نسریں، نرگس و سوسن

اونچا، نیچا، برتر، کم تر
خالی ہے تفریق کا دامن

جاگیری یہ دور نہیں ہے
سارے انساں جانِ گلشن

حسنِ وفا کے، صدق و صفا کے
پھولوں سے بھر دیں دیش کا دامن

کام کریں ہم مل کر ایسے
بڑھتی جائے بوئے گلشن

نغمہ ایسا مل کر گائیں،
غربت بھاگے، سب ہوں فروتن

جناب محمد طیب

حافظ نبی احمد مرحوم

مرنا اور جینا انسان کی زندگی میں کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ انوکھی یہ اس وقت ہو جاتی ہے جب کسی کا اس دنیا سے چلا جانا صرف اس کے گھر والوں اور ملنے والوں کے لیے ہی تکلیف دہ نہیں ہوتا ہے، ان کے لیے بھی ہوتا ہے جو اس سے براہ راست تو واقف نہیں ہوتے لیکن اس کے مفید کاموں سے محروم ہو کر اس کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔ آیئے آپ کو ایک ایسے ہی آدمی کا حال سنائیں۔

نبی احمد مرحوم ۱۹۱۴ء میں اپنے وطن پانی پت میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن ہی میں والدہ کی گود سے محروم ہو گئے۔ باپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بحیثیت استاد ملازم تھے اور نبی احمد پانی پت میں گھر پر پڑھتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں جامعہ قائم ہوئی تو والد مسلم یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑ کر جامعہ میں آ گئے اور جامعہ کے ہو رہے۔ ۱۹۲۶ء میں جامعہ علی گڑھ سے دہلی آئی تو نبی احمد بھی جامعہ آ گئے۔ اس وقت ان کی عمر بارہ برس کی تھی۔

اگست ۱۹۲۶ء میں جب میں جامعہ میں داخل ہونے آیا تھا تو سب سے پہلے ان ہی سے ملاقات ہوئی۔ گول مٹول، لکاڑھے کے صاف ستھرے کپڑے، عینک لگی ہوئی، سرخ جلد کی ایک کتاب (جس کی پشت پر سنہرے حروف چمک رہے تھے) ہاتھ میں۔ ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ گیٹ سے لگے کھڑے تھے۔ جس ہوسٹل میں ہمیں ٹھہرنا تھا اس کا پتہ پوچھا تو اس طرح سمجھانے لگے جیسے راستہ نظر آ رہا ہے اور یہ

ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اتنا یاد ہے کہ اس وضاحت نے میرے اوپر ایک خاص اثر کیا تھا۔ میرا داخلہ ابتدائی چہارم میں ہوا تھا۔ کلاس میں پہنچا تو یہ حضرت بھی وہیں بیٹھے ہوئے ملے اور میں یہ سوچنے لگا کہ یہ کسی آگے کے درجے میں کیوں نہیں ہیں۔

اتنی سی عمر میں جبکہ بچوں میں نہ ذمے داری کا احساس ہوتا ہے اور نہ ان کی معلومات اور سوجھ بوجھ میں کوئی خاص گہرائی ہوتی ہے انیس احمد ذمے دار بھی تھے اور نئی نئی معلومات حاصل کرنے کے شوقین بھی۔ ایک دن حساب کے سوال سمجھ میں نہیں آئے تو ماسٹر صاحب نے کہا "آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ گھڑی کب ایجاد ہوئی، کشش ثقل سب سے پہلے کس نے معلوم کی، آج کل کے دانشوروں کا کیا نام ہے لیکن حساب کے ان معمولی سوالوں کی طرف دھیان نہیں دیتے"۔

یہ حقیقت تھی کہ انھیں اس قسم کی معلومات بہت تھیں۔ اخبار کی خبریں، کہانیوں اور معلومات کی کتابوں کے نام مع مصنفوں کے ناموں کے بیان کرنا شروع کرتے تھے تو حیرت ہوتی تھی۔ بچپن میں پروگرام بنانا، ٹائم ٹیبل تیار کرنا اور گھڑی رکھ کر اس کے مطابق عمل کرنا بہت ہی غیر معمولی بات تھی۔

دہلی آنے کے چند ہی سال بعد انھیں دہلی کے چپے چپے سے واقفیت ہو گئی تھی۔ اور وہ ایک ایک عمارت اور قابل دید جگہوں کا حال مع اس کی تاریخ اور صحیح فاصلے کے بتاتے چلے جاتے تھے۔ وہ ساتھیوں کے ساتھ مذاق میں بھی ایسی بات نہیں کرتے تھے جس سے دل کو تکلیف پہنچے۔ اور اگر کوئی اس حد تک مذاق پر اتر آئے کہ آدمی ہنسنے کے بجائے رو دے تو وہ اس سے بہت رنجیدہ ہوتے تھے اور چاہتے تھے کہ مذاق کرنے والے کی یہ بُری عادت کسی طرح چھوٹ جائے۔

ایک دن ہم بہت سے ساتھی بورڈنگ کے ایک کمرے میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ کمرہ کا فرش جوٹ کی ٹپیوں کا تھا۔ ایک لڑکے نے ان کا کُرتا رسی سے پٹی میں باندھ دیا۔ ان حضرت کو یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ کسی نے کُرتے کا دامن باندھ دیا ہے لیکن بظاہر بے خبری کے عالم میں چل پڑے۔ یہ چلے جا رہے ہیں اور پٹی گھسٹتی ہوئی پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ دامن پھٹنا شروع

ہوا اور بغل تک بدن نے جھانکنا شروع کر دیا لیکن آپ ہیں کہ شانِ بے نیازی کے ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ اسی حال میں ماسٹر صاحب سے شکایت کی، ماسٹر صاحب بھی اس منظر کو دیکھ کر ہنسے بغیر نہ رہ سکے لیکن دامن باندھنے والے لڑکے کو ڈانٹا اور ان سے پوچھا کرتا پھٹنے لگا تو رُکے کیوں نہیں؟ کہنے لگے انھیں کیسے معلوم ہوتا کہ اس قسم کے مذاق سے اتنا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔

ایک بہت ہی غیر معمولی بات یہ تھی کہ اس عمر میں بھی وہ جو کچھ خرچ کرتے تھے اُسے لکھ لیتے تھے۔ اس عادت کے برقرار رہنے میں اس بات کو بھی دخل تھا کہ ان کے والد بہت پابندی سے انھیں ایک مقررہ رقم دیا کرتے تھے اور دوسری رقم اس وقت ملتی تھی جب وہ پچھلا حساب دکھا دیتے تھے۔

ان کی یہ خوبیاں ان کی عمر کے ساتھ ترقی کرتی گئیں۔ ان کی معلومات حاصل کرنے کی خواہش نے کتب خانے کے دامن میں پناہ لی اور وہ جامعہ کے کتب خانے کے لائبریرین مقرر ہو گئے۔ کتابوں کی معلومات کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ لوگ انھیں چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا کہنے لگے تھے۔

۱۹۴۶ء کے بعد سے ان کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی۔ بلڈ پریشر کے مریض ہو گئے تھے۔ گداز جسم لٹک گیا تھا، چال بہت سست ہو گئی تھی۔ سر گھٹا ہوا، داڑھی بہت بڑی اور لبیں بیشتر اتنی بڑھی ہوئیں کہ بال ہونٹوں کو ڈھک لیتے تھے، شیروانی کے چند بٹن لگے ہوئے اور وہ بھی بے ترتیب، ٹوپی کی باڑ یا تو اندر کی طرف مڑی ہوئی یا اتنی ٹیڑھی کہ سامنے کی نوک کان سے سرگوشی کرتی نظر آتی تھی۔ بھلا اس حلیہ کا کیا تو رعب پڑ سکتا ہے اور کیا کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے! لیکن کتب خانے کے علم کے ماہران سے مشورہ کر کے خوش ہوتے تھے اور طالب علموں کا ان سے مل کر یہ حال ہوتا تھا جیسے پیاسے کو کنواں مل جائے یا اندھے کو دو آنکھیں۔

گھر سے ایک مقررہ وقت پر کتب خانے کے لیے روانہ ہوتے تھے، ایک ہاتھ میں چھتری دوسرے میں تھیلا۔ اس معمول میں فرق نہ آتا تھا۔ کتب خانے میں داخل ہو کر ایسے منہمک ہوتے تھے کہ نہ اپنی خبر رہتی اور نہ گھر کی۔ گھر پر کوئی بیمار ہے، بہت تاکید سے کہہ دیا گیا ہے کہ دوا ضرور بھیج دیجیے گا لیکن یہ بات اس وقت یاد آتی ہے جب گھر کو لوٹنے لگتے ہیں اور سوچتے جاتے ہیں

کیا جواب دیا جائے گا۔ موجودہ انتظام کے
ماتحت ان کی حیثیت لائبریرین کی نہیں تھی لیکن
ہر جاننے والا شاہد ہے کہ اس تبدیلی سے ان کے
لگاؤ میں فرق نہیں آیا اور وہ ویسے ہی اپنے
کاموں میں منہمک رہے جیسے اس ذمے دار عہدہ
کے وقت۔

روز کا کام روز کر ڈالنا بھی ان کے
معمول میں داخل تھا۔ لائبریرین کی حیثیت سے
کتب خانے کا حساب ان ہی کے پاس رہتا تھا۔
وہ اسے روز لکھا کرتے تھے اور جب تک یہ
اطمینان نہ ہو جائے کہ خرچ کے بعد جو رقم بچنی چاہیے
وہی بچی بھی ہے، انھیں اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ ان
کی ان ہی باقاعدگیوں کی وجہ سے انھیں ایسے
کام بھی سونپ دیے جاتے تھے جن کا تعلق کتب خانہ
سے براہ راست کچھ نہیں ہوتا تھا۔ تعلیمی میلہ
کے موقع پر ڈراموں کے ٹکٹوں کی فروخت
اور اس کا حساب کتاب ان کے سپرد ہوا کرتا
تھا۔ گذشتہ نومبر میں جامعہ میں جو میلہ ہوا ہے
اس میں بھی یہ کام ان ہی کے سپرد تھا۔ میلہ کے
اگلے دن انھیں فالج کا دورہ ہوا جو جان لے
کر ہی ٹلا لیکن دورہ سے ایک دن پہلے وہ ٹکٹوں

کا پورا حساب مکمل کر چکے تھے۔ بیماری کے زمانے میں
ایک دن جب ذرا حواس بجا ہوئے تو سب سے
پہلے ڈرامے کے اسی حساب کا خیال آیا اور لڑکھڑاتی
ہوئی زبان سے پورا حساب سمجھا کر ایسا اطمینان
کا سانس لیا جیسے کوئی بہت بڑی دولت مل
گئی ہو۔

وقت اور کام کا اتنا صحیح اندازہ بہت
کم لوگ لگا سکتے ہیں۔ ایک دفعہ لائبریری کے
سلسلے میں ایک امریکن ٹیم آئی ہوئی تھی۔ مجھ سے
کہا کہ جلسے کے انتظام میں میری مدد کر دو۔ انتظامات
کے سلسلے میں میں نے مختلف سوالات شروع
کیے اور یہ ذکر آیا کہ کرسیاں فلاں وقت اور
فلاں جگہ سے آئیں گی۔ میں نے اپنی حساب دانی کا
رعب جمانے کے لیے کہا کہ یہ فاصلہ اتنا ہے کہ وقت
مقررہ تک یہ کرسیاں ڈھل ہی نہ سکیں گی۔ کہنے
لگے کہ یہ فاصلہ ایک آدمی اتنے منٹ میں طے کرتا ہے
اور اتنے پھیروں میں فلاں وقت تک یہ کام
ہو جائے گا۔ آپ نے دیکھا کہ انھوں نے اس قسم
کی باتوں پر پہلے ہی غور کر لیا تھا۔

کسی قسم کی کوئی تقریب ہو، وہ بلائے گئے
ہیں تو وقت مقررہ پر ضرور موجود ہوں گے۔ کبھی

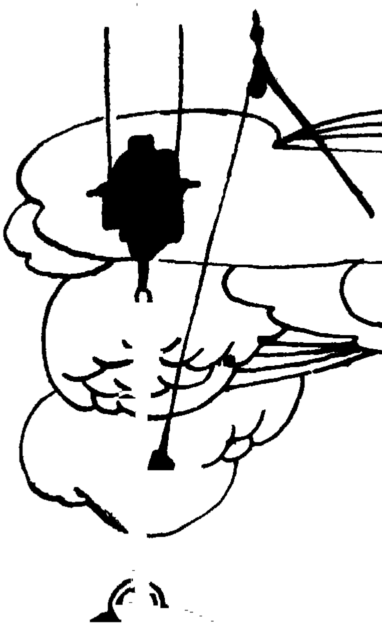
ان سے کہا بھی کہ آج کل صحت اچھی نہیں ہے اور تعلقات بھی اتنے گہرے نہیں ہیں کہ ضرور ہی شرکت کی جائے، تو جواب دیتے کہ بلانے والے نے کسی تعلق کی بنا پر ہی یاد کیا ہے، اس محبت کو کیسے نظر انداز کردوں۔

کئی سال ہوئے لائبریری کے فن کے کچھ گنے چُنے ماہر ایک وفد کی صورت میں امریکہ گئے تھے۔ وفد کے ایک ممبر ہمارے نبی احمد مرحوم بھی تھے۔ مقصد یہ تھا کہ امریکہ کی لائبریریوں کی سیر کی جائے۔ ان کے انتظام وغیرہ کے سلسلے میں معلومات حاصل کی جائیں اور ان معلومات کی روشنی میں اپنے یہاں کی لائبریریوں کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ نبی احمد مرحوم نے اپنی عادت کے مطابق بڑے شوق بہت انہماک کے ساتھ، بہت گہری نظر سے "نئی دنیا" کی ان لائبریریوں کو دیکھا بھالا اور معلومات کا خزانہ اپنے ساتھ لائے۔

امریکہ سے واپس آتے ہی وہ اپنے کام میں لگ گئے، سستانے اور آرام کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ شاید زیادہ انہماک اور مشغولیت کی وجہ سے امریکہ میں بلڈ پریشر کی شکایت ہو گئی تھی۔ بعد میں بھی کبھی کبھی دورے پڑ جاتے مگر یہ جو نہی چلنے پھرنے کے قابل ہوتے پھر کام میں جٹ جاتے۔ بس یہی چیز جان لیوا ثابت ہوئی۔ آخر پچھلے نومبر (۱۹۶۵ء) میں پہلے کے بعد فالج کا حملہ ہو گیا تھا۔ اولاد نے علاج و معالجے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ انھیں پنتھ اسپتال میں لے گئے۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے پوری ہمدردی اور توجہ سے علاج کیا۔

پر اب وقت پورا ہو چکا تھا اور ۲۶ فروری ۱۹۶۶ء کو سورج نکلنے سے پہلے وہ ہم سب سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور ہمیں بھی ان کی خوبیوں پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین!


آپ کی نگاہوں سے یہ راز پوشیدہ نہیں!
جی ہاں! وہ خوب جانتی ہیں کہ آپ کے چہرے کی دل فریبی اور خوش نمائی کا ضامن
خوب صورتی میں چار چاند لگانے والا افغان سنو آپ کی نگاہوں نے دیکھا ہے۔
جانی پہچانی چیز ہے اور یہ جانیے کہ افغان سنو کے انتخاب پر وہ آپ کے گن گاتی ہیں۔
افغان سنو
آپ کے رنگ و روپ کو نکھارتا ہے۔ اس کی بدولت
آپ کے چہرے میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔
بشرطیکہ جیسے افغان سنو کو لگاتار لگاتے رہیے۔ چہرے
کے داغ دھبوں، مہاسوں اور جلد کی جھریوں کا نام و نشان
باقی نہ رہے گا۔ افغان سنو سے
چہرے کی تازگی اور خوشنمائی تمام دن برقرار
رہتی ہے۔
آپ کا پسندیدہ انتخاب
افغان سنو
E. S. PATANWALA, BOMBAY-77



جناب محمد امین

چاند پر اُترنا

(۲)

لونا ۹ چاند پر اتر گیا' ناممکن، ممکن ہو گیا

اب چندا ماموں ایسے ماموں نہیں جو کہیں دور رہتے ہوں۔ وہ ہمارے دوست بن گئے ہیں جن کے یہاں ہمارا آنا جانا شروع ہو گیا ہے۔

زمانۂ قدیم' بہت قدیم اور بے شمار صدیوں سے چاند انسان کی پہنچ سے دور تھا، ہاتھ نہیں آسکتا تھا اور اب وہ یکایک گرفت میں آگیا ہے۔

ابھی چند سال پہلے روسی سائنسدانوں نے چاند کو رقعہ بھیجا تھا اور آج لونا ۹ چاند پر اتار کر انھوں نے یونان کے آرشمیدس، ہندوستانی ریاضی داں آریہ بھٹ، عرب کے منجم البیرونی، پولینڈ کے عقلیت پسند کوپرنکس، اٹلی کے گلیلیو اور روس کے تسیال کووسکی ــــ ان سب کے دیرینہ اور دلیرانہ خواب کو یکایک شرمندۂ تعبیر یعنی بالکل حقیقت بنا دیا۔ ہمارے دوست یوری گگارن نے ۱۲/ اپریل ۱۹۶۱ء کو ستاروں کی جس راہ پر پہلا قدم رکھا تھا اسے لونا ۹ نے ایک شاہراہ بنا دیا ہے۔ انسان کی پرواز خلاؤں میں؟ ناممکن البتہ

لونا ۹ نے چاند پر اتر کر ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔

۴ر فروری ۱۹۶۶ء کو ہمارے صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن، نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین اور وزیر اعظم اندرا گاندھی نے روس کی حکومت اور اس کے سائنسدانوں کو مبارک باد کا پیغام بھیجتے ہوئے کہا کہ لونا ۹ کا چاند پر ہلکے ہلکے اور بلا کسی ضرر یا ٹکر کے اتر جانا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے روس کے صدر پد گورنی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اپنی حکومت، اپنے عوام اور خود اپنی طرف سے دلی مبارک باد بھیجتا ہوں۔ آپ کے سائنسدانوں نے ایک بار پھر زبردست کامیابی حاصل کی ہے اور خلا کو فتح کرنے کے سلسلے میں انسان کا ایک بڑا قدم ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے پراودا اور تاس (اخبار اور نیوز ایجنسی) کو پیغام دیتے ہوئے فرمایا کہ جن سائنسدانوں نے یہ غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے وہ واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں اور ساری انسانیت کو بجا طور سے ان پر ناز ہے۔ انھوں نے ایسا جرأت مندانہ قدم اٹھا کر چاند کا سفر انسان کے لیے ممکن بنا دیا ہے۔

وزیر اعظم اندرا گاندھی نے روس کے سائنس والوں کو پیغام بھیجتے ہوئے کہا: "آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے چاند تک پہنچنا تو کیا، اس کا خواب بھی دیکھنا محال سمجھا جاتا رہا ہے۔ چاند محض دیکھنے، مشاہدہ کرنے اور لطف لینے کے لیے ایک نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ اسے دیکھ کر شاعر اور ادیب خوش ہوتے تھے۔ اور تشبیہوں، اشاروں اور کنایوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لونا ۹ کا خاموشی اور اطمینان سے اتر جانا اس بات کی علامت ہے کہ انسان کو اپنے اوپر کتنا اعتماد ہوتا جا رہا ہے اور اب اسے کامل یقین ہے کہ وہ ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔"

فرانس کے صدر ڈی گال نے پیرس میں فرمایا کہ چاند پر لونا ۹ کا اترنے کا مطلب یہ ہے کہ سیاحت، معلومات اور خلا کی تاریخ میں روس نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

امریکہ کے صدر جانسن نے فرمایا کہ خلائی تحقیقات میں یہ ایک غیر معمولی کارنامہ ہے اور امید ہے کہ اس سے ساری دنیا اور نسل انسانی کو فائدہ پہنچے گا۔

روس نے لونا ۹ ۳۱ جنوری ۱۹۶۶ء کو چاند کی طرف اڑایا۔ وہ ایک مصنوعی چاند میں رکھ دیا گیا تھا اور اس طرح بنا تھا کہ بعد میں خود ہی تیزی سے اڑ کر چاند پر پہنچ جائے۔ اس کی دوسری منزل وہ تھی جبکہ وہ چاند کے مدار پر پہنچ گیا۔ یعنی چاند کے چاروں طرف گردش کرنے لگا۔ تیسری منزل وہ تھی جب کہ لونا ۹ کو بھٹکنے سے بچانا تھا اور یہ دیکھنا تھا کہ وہ پہلے سے طے شدہ جگہ پر اترے۔ چوتھی منزل اس کی وہ تھی جب کہ وہ رُک رُک کر اترنا شروع ہوا یعنی اس میں بریک لگنے لگے اور پھر وہ آہستگی سے چاند پر اتر گیا۔

جب اسے اڑایا گیا تو ایک خاص بلندی پر پہنچنے کے بعد اسے زمین سے حکم دیا گیا کہ وہ ٹھیک راستے پر چلتا رہے۔ آخرکار وہ چاند کے قریب پہنچنے لگا اور جب اس کی سطح سے صرف ۶۰۰۰ میل اوپر رہ گیا تو اس کی رفتار ۲,۶۰۰ میٹر فی سیکنڈ سے گھٹنے لگی۔ وہ جب ۵۰۰۰ میل اوپر رہ گیا تو لونا ۹ کو چاند پر سیدھا اترنے کے لیے کہا گیا۔ ایک گھنٹے تک وہ ایک خاص رفتار سے نیچے اترتا رہا پھر اس میں بریک لگنا شروع ہو گئے اترنے سے ۴۸ سیکنڈ پہلے اس میں بریک مکمل طور سے لگا دیا گیا اور اس وقت اس خودکار اسٹیشن کا چاند کی سطح سے فاصلہ صرف ۴۵ میل رہ گیا تھا۔ بریک نے کام کرنا شروع کر دیا اور اس دوران میں دھکے کو برداشت کرنے کے آلوں کو تیار رہنے کا حکم نافذ کر دیا گیا۔ لونا کی رفتار کم ہوتی گئی اور گھٹ کر بمشکل ۲ر۱۷ر (71.2) میٹر فی سیکنڈ رہ گئی۔ اس طرح ماسکو کے وقت کے مطابق ۹ بج کر ۴۵ منٹ پر رات میں چاند پر اتر گیا۔ ۴ منٹ ۱۰ سیکنڈ کے بعد پنجے پھیل گئے۔ ۳½ دن میں یہ چاند پر پہنچ گیا۔ اس نے ۲,۸۵,۰۰۰ کلومیٹر (۱,۷۴,۰۰۰ میل) کی مسافت طے کی۔

چاند پر اتر جانے کے بعد بھی اس کا تعلق ریڈیو کے ذریعے زمین سے برابر قائم رہا۔ اترنے کے بعد سات گھنٹے تک وہ خاموش رہا اور ۷ گھنٹے ۵ منٹ کے بعد یعنی ۴ فروری کو صبح ۴ بج کر ۵ منٹ (ماسکو کے وقت کے مطابق) پر اسے حکم دیا گیا کہ وہ تصویریں کھینچ کر ان کو زمین تک ٹیلی ویژن سے بھیجے۔ حکم ملتے ہی اس نے چاند کی سطح کا جائزہ لینا شروع کر دیا اور پھر مسلسل ۳ گھنٹے ۲۰ منٹ تک وہ تصویریں کھینچ کر زمین تک

بھیجتا رہا۔ جیسے ہی اس کی تصویریں آنا شروع ہوئیں انگلستان کی سب سے بڑی دوربین نے (جو جاڈرل بینک میں فٹ ہے) تصویریں لینی شروع کردیں اور پھر، ۱۲ گھنٹے کے عرصے میں اس کے سائنس دانوں نے یہ تصویریں ساری دنیا کے اخباروں میں بھیج دیں۔ جونہی یہ چھپیں ساری دنیا میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ تہلکہ مچ گیا۔ روسی سائنس دانوں کی اور انسان کی عظمت کی تعریفیں ہونے لگیں۔ اب تک چاند انسان کے خوابوں، اس کی آرزوؤں، اس کی کوششوں کی ایک علامت ہوتا تھا لیکن آج وہ انسان کے اٹل ارادے کی علامت بن گیا ہے اور اب وہ کائنات، اس کے کہکشاں، کہکشاں کے تاروں، تاروں کے سیاروں اور سیاروں کے چاندوں کو بھی اپنی عقل، اپنے علم سے تسخیر کرسکتا ہے۔

روسی سائنس داں احتیاط برت رہے تھے اور ٹیلی ویژن سے جو تصویریں آتی تھیں ان کا مطالعہ کرکے اطمینان سے وہ پھر ان کو چھپنے کے لیے اخباروں میں بھیجنا چاہتے تھے۔ ان کو کوئی جلدی نہیں تھی لیکن جاڈرل بینک کی دوربین کے ڈائرکٹر برنارڈ لوول سب سے پہلے دنیا کو یہ خبر بتانے کا سہرا انگلستان کے سر رکھنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے اس کی بھی فکر نہیں کہ روسی سائنس دانوں سے کچھ صلاح مشورہ کرلیتے اور یہ دیکھ لیتے کہ آیا تصویریں صحیح ہیں یا نہیں۔ انھوں نے کوئی پروا نہ کی اور جس قسم کی تصویریں لونا ۹ نے بھیجی تھیں ان کو جوں کا توں چھپوا دیا۔ ۸۴ گھنٹے کے بعد جب روس نے بھی چاند کی تصویریں چھاپیں تو اندازہ ہوا کہ انگلستان کے سائنس دانوں نے جو تصویریں دی تھیں وہ ڈھائی گنا بڑی اور مبالغہ آمیز تھیں۔ روس کی تصویریں صاف اور بہت عمدہ تھیں اور ان کو دیکھنے سے چاند کی سطح کے راز اور اس کی تفصیلات ظاہر ہوتی تھیں۔

ماسکو میں بھی وہاں کے ٹیلی ویژن پر یہ تصویریں دکھائی گئی تھیں۔ ان سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ چاند کی سطح پر چٹانیں کس طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ اور کیسی صاف طور سے نمایاں ہیں۔ چٹانوں کے علاوہ کنکر، پتھر یعنی ایک انچ کی سائز کے نام و نشان بھی ظاہر ہوتے تھے۔ گڑھے یا آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے، دراڑیں، ہموار زمین اور خود لونا ۹ اور اس کا سایہ بھی نظر آتا تھا۔

لونا ۹ میں کیمرا ۲ فٹ اور ۱۰ فٹ کی بلندی پر فٹ تھا۔ تصویریں ۳ گھنٹے ۲۰ منٹ تک ۴-۶ منٹ کے وقفے سے برابر آتی رہیں۔ کیلی فورنیا میں امریکہ کے سائنس داں ڈاکٹر یوجین شومیکر نے کہا کہ جو تصویریں لونا ۹ نے بھیجی ہیں وہ بڑی عجیب اور حیرت انگیز ہیں۔ یہ تصویریں امریکی رینجر کی بھیجی ہوئی تصویروں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کے فوٹو سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاند پر چٹانیں، پتھر، کنکر بہت ہیں حالانکہ رینجر کی بھیجی ہوئی تصویریں اتنی پتھریلی اور چٹانی سطح ظاہر نہیں کرتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ لونا ۹ ایک غیر معمولی جگہ پر اترا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک کریٹر (آتش فشاں پہاڑ کے دہانے) پر اترا ہو —

الغرض لونا ۹ نے صاف صاف یہ بتا دیا کہ چاند کی سطح بہت اونچی نیچی ہے اور اس میں بہت سے گڑھے اور ان گنت پہاڑیاں یا ٹیلے ہیں۔ کنکر، پتھر اور روڑیاں بھی بہت ہیں۔

جہاں لونا ۹ اترا ہے وہاں کی زمین سخت ہے اس لیے کہ وہ اترتے ہی مضبوطی سے ٹک گیا۔ نیچے نہیں دھنسا جیسا کہ بعض سائنس داں کہتے تھے کہ چاند کی اوپری پرت ریت اور راکھ کی بنی ہوئی ہے اور اس پر اترتے ہی راکٹ اندر گھس جائے گا جیسے تیراکی نہ جاننے والا آدمی پانی میں غڑاپ سے نیچے چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ نظریہ بالکل غلط ثابت ہو گیا کہ چاند پر گرد کی موٹی تہہ بیٹھی ہوئی ہے۔ تصویروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ گرد و غبار کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ چٹانیں اسپنج کی قسم کی ہیں لیکن مضبوط اور سخت ہیں اور وہ لونا ۹ سے بھاری اور زیادہ وزنی خلائی جہاز کے بوجھ کو بھی برداشت کر سکتی ہیں۔ چٹانیں آتش فشانی یا آتشی ہیں۔ وہ لاوا کے مانند کھوکھلی اور اسپنج نما ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جلدی سے ٹھنڈی ہو گئی ہیں۔

جاپان کے دو ماہرین کا بھی یہی خیال ہے کہ چاند آتش فشانی مادوں سے بنا ہے اور تصویریں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دہانوں سے پگھلی ہوئی حالت یعنی لاوا کی شکل میں نکلی ہیں اور تہہ بہ تہہ بیٹھتی چلی گئی ہیں۔ گڑھے زیادہ تر آتش فشاں پہاڑ کے دہانے ہیں۔ اس لیے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ چاند کے گڑھے شہاب ثاقب یا میٹیا رائٹ کی ٹکر اور رگڑ سے بنے

ہیں بلکہ آتشی ہیں۔

روس کے ایک سائنس داں نے بتایا کہ خودکار اسٹیشن کی بھیجی ہوئی تصویروں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ چاند کی سطح کم از کم "سمندروں" کے علاقے میں خشک دلدل پر نہیں بلکہ لیبالٹ لاوے پر مشتمل ہے جس کی بناوٹ عام طور سے زیادہ سخت ہے۔

روس کے دوسرے سائنس داں نے کہا کہ چاند کی سطح ٹھوس ہے اور وہ اس قابل ہے کہ خلائی جہاز کا بوجھ برداشت کرلے چاہے اس کا وزن سیکڑوں کلو گرام ہی کیوں نہ ہو، انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اب "چاند پر ایک دیر پا تجربہ گاہ کے قیام کا امکان بھی بہت روشن ہوگیا ہے۔"

برطانیہ میں چاند کے سب سے بڑے ماہر پروفیسر زوڈنیک کوپا کا خیال ہے کہ چاند کی سطح پر جو بہت سے دھبے اور دانے دار نشان ہیں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ شہاب ثاقب کی بمباری یعنی چاند پر ان کی ٹکر سے بنے ہیں۔ بہرحال مجموعی طور سے سمندر یعنی خشک سمندر، گڈھے اور دہانے وغیرہ کل ۵ء۳ فی صدی ہیں اور لونا ۹ کی معلومات سے اندازہ ہوا ہے کہ گڈھے اور نشیبی علاقے توقع سے زیادہ ہیں اگرچہ ان کی وجہ سے انسان کے اترنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

کیمبرج یونیورسٹی کے لکچرر ڈاکٹر لٹلٹن نے کہا ہے کہ انسان ۱۹۶۹ء تک چاند پر قدم رکھ سکتا ہے۔ پہلے اس کا تصور کرنا مشکل تھا لیکن لونا ۹ کی نئی معلومات سے روس اور امریکہ کو بہت آسانی ہوگئی ہے۔ وہ نئے راکٹ میں آلے زیادہ فٹ کرسکتے ہیں۔ راکٹ کا وزن بڑھا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ طے ہے کہ راکٹ دھنس نہیں سکتا کیونکہ چاند پر گرد و غبار کا قصہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ امریکا خود تجربہ کرکے چاند کی جو تفصیلات معلوم کر[illegible] ۔ ۔ یت

لونا ۹ سے حاصل

[illegible] ہو دو ماہ بیت گئے جمیل برابر

سرمایہ اور فنی [illegible]

جلدی الذ[illegible] ، وغیرہ سب چیزیں اس کے پاس

[illegible] ایک جوڑا کپڑا بھی بنالیا تھا اور کبھی

خلائی [illegible]

کو [illegible] خرچ کے لیے بھی کچھ نہ کچھ دے بھاگتا

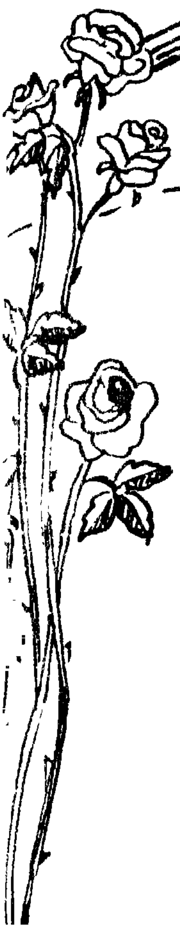
[illegible] ب خوش تھے لیکن باپ کو اپنے بیٹے کی طرف

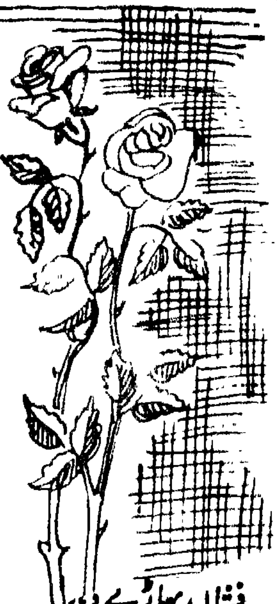
چھ تنک سا پیدا ہونے لگا۔ جمیل رات کو آٹھ

بجے کتاب لے کر جاتا اور رات کو بارہ ایک بجے

جناب مہر دردلوی

امر چاچا نہرو





جن سپوتوں نے کیا ہے نام بھارت کا بلند
ان سپوتوں میں ہیں چاچا نہرو سب سے ارجمند
پیار سے لیتا ہے ہر اک نام جس کا آج بھی
ساری دنیا کی ہے وہ آنکھوں کا تارا آج بھی
علم و دانش کا وہ پتلا صاحب جہد و عمل
فشاں پہاڑ ہے وہ۔ جس کے اخلاص و محبت بن گئے ضرب المثل
الغرض لونا ۹ ہے
کہ چاند کی سطح بہت اونچی نیچی دھن کا پکا، قول کا سچا تھا، ہمت کا بلند
بہت سے گڑھے اور ان گنت ہیں خوب صورت، خوب سیرت اور قسمت کا بلند
ہیں۔ کنکر، پتھر اور روڑیاں بھی بہت
جہاں لونا ۹ اترا ہے وہاں کی زمیں قدم پر ان بزرگوں کے چلے
ہے اس لیے کہ وہ اترتے ہی مضبوطی سے ٹ
گیا۔ نیچے نہیں دھنسا جیسا کہ بعض سائنس داں کی طرح وہ بھی امر ہو کر رہے
کہتے تھے کہ چاند کی اوپری پرت ریت اور راکھ



جناب حمید اللہ خاں سلام افغانی

اور اس نے اپنی پڑھائی جاری رکھی

جمیل باوجود والدین کے صاف جواب دینے کے اپنی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ آج سے دو ماہ پہلے جب وہ آٹھویں میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا تو جمیل کے والد انور نے کہا تھا:

"بیٹا تم جانتے ہو میں ایک غریب آدمی ہوں۔ تم غریب کھانے بھر کو مشکل سے کماپاتا ہوں۔ اس لیے اب تمھاری پڑھائی کا جاری رہنا مشکل ہے۔ آٹھویں تک تو خیر بغیر فیس کے پڑھائی ہوتی تھی پر اب فیس بھی لگے گی۔ کتابیں اور کاپیاں بھی مہنگی مہنگی آئیں گی، اب میرا خیال ہے تم ملازمت کر لو۔"

جمیل یہ باتیں سن کر سناٹے میں آگیا۔ وہ ہونہار تھا، ذہین تھا، اس کو اپنی تعلیم کے اس طرح رک جانے کا بڑا غم تھا اس لیے وہ دن رات اپنی تعلیم کے بارے میں سوچتا رہتا آخر کار ایک روز اس کو امید کی کرن نظر آئی اور اس نے اپنے والد سے کہا: "ابو میں اپنی پڑھائی جاری رکھوں گا۔"

باپ نے پوچھا "کس طرح"

جمیل نے صرف اتنا جواب دیا "آپ دیکھتے جائیے۔"

اس واقعے کو دو ماہ بیت گئے جمیل برابر پڑھ رہا تھا کتابیں وغیرہ سب چیزیں اس کے پاس تھیں، اس نے ایک جوڑا کپڑا بھی بنا لیا تھا اور کبھی کبھی گھر کے خرچ کے لیے بھی کچھ نہ کچھ دے بھاگتا تھا۔ سب خوش تھے لیکن باپ کو اپنے بیٹے کی طرف سے کچھ شک سا پیدا ہونے لگا۔ جمیل رات کو آٹھ نو بجے کتاب لے کر جاتا اور رات کو بارہ ایک بجے

لوٹتا۔ وہ اکثر سوچا کرتے جمیل کہیں جوا تو نہیں کھیلتا۔ چوری تو نہیں کرتا۔ ان کو جمیل کے چال چلن پر اعتماد تھا۔ لیکن غریب تھے اور عزت آبرو غریب کی سب سے بڑی دولت ہے۔

ایک دن رات کو آٹھ بجے تھے جمیل نے کتاب اٹھائی اور گھر سے نکلنے لگا اتنے میں اس کے کانوں میں انور میاں کی آواز ٹکرائی " بیٹا تم یہ رات رات کہاں غائب رہتے ہو؟"

"کچھ بھی تو نہیں ابو.... آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے۔ اچھا اس وقت میں جلدی میں ہوں، صبح بات کروں گا!" جمیل یہ کہہ کر گھر سے نکل گیا۔ اس کے ابو کچھ فکرمند ہو گئے اور وہ اس کے پیچھے پیچھے گھر سے نکل گئے۔

جمیل اپنی دُھن میں چوک بازار کی بھیڑ میں چلا جا رہا تھا۔ یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ چلنے میں وہ اپنا سبق بھی یاد کر رہا تھا۔ اب وہ نئے پورے کی گلی پر پہنچ گیا تھا۔ ایک مکان کی دیوار کے پاس گیس کی لالٹینیں رکھی تھیں۔ ایک ادھیڑ شخص انھیں برنر سے جلا رہا تھا۔ جمیل اس شخص کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر جمیل کو دیکھا اور بولا: " ارے تم آ گئے جمیل"

"جی ہاں چاچا میں آ گیا کتنی دیر ہے؟"

"بس تیار ہے، آج تمھارا وزن ہلکا ہی ہے وہ دیکھو صرف ایک گیس بتی اور بڑھائی کیسی چل رہی ہے!"

"سب ٹھیک ہے آپ کی دعا ہے اللہ کا فضل ہے" جمیل نے جواب دیا۔

"اچھا اب چلو" چچا بولے اور پھر چلانے لگے۔

"کلوا ارے کلوا چل تو یہ اٹھا، رام پیاری چل جلدی اٹھا چلو جلدی کرو اے اوستار جلدی چل برات تیار ہے۔ جمیل بیٹا تو یہ اٹھا!"

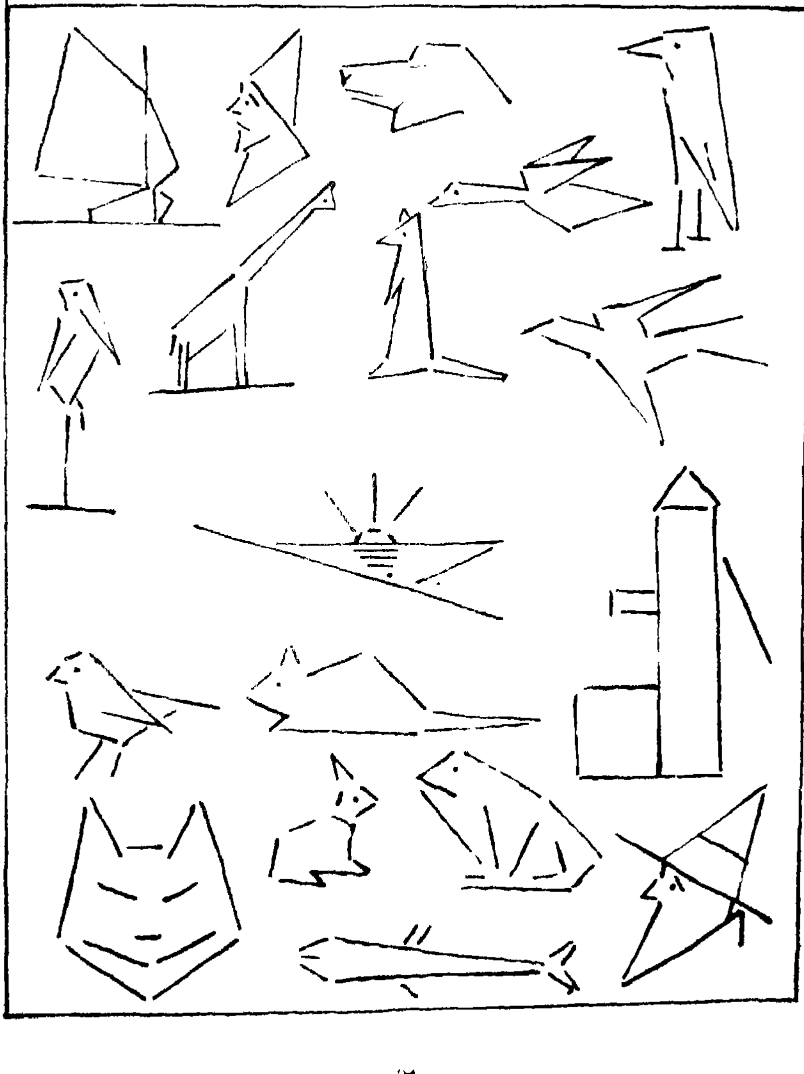
اور اس طرح امیروں کی برات کو زینت بخشنے والے یہ جھاڑ اور فانوس غریبوں کے سر کا بوجھ بن گئے۔

تھوڑی دیر بعد برات روانہ ہوئی۔ جمیل کے ابو یہ سب دیکھ رہے تھے۔ جمیل مزدوروں کے ساتھ گیس بتی اٹھائے چل رہا تھا۔ برات والوں کے قدم بڑھ رہے تھے۔ اور ان کے ساتھ ہی جمیل کے بھی۔ تین گھنٹے بعد جمیل واپس اپنے گھر کی جانب جا رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں تین چونیاں تھیں۔ وہ خوش تھا، بہت خوش۔

دوسرے دن صبح کو جمیل اپنے والد کے پاس بیٹھا تھا تھوڑی دیر بعد بولا" ابو آپ کل رات مجھ سے کچھ پوچھ رہے تھے۔"

"ہاں بیٹا" جمیل کے ابو بولے۔ رات کو میں ضرور کچھ کہنا چاہتا تھا پر اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے امید سے زیادہ یقین ہے کہ تم مستقبل میں ضرور بڑے آدمی بنو گے۔ دنیا میں ہمت سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور میں دیکھ چکا ہوں تمھاری ہمت، تمھارا جذبہ، تمھاری لگن اور یہی ہمت، یہی جذبہ، یہی لگن تم کو مستقبل کا بہت بڑا، بہت بڑا آدمی بنا دے گی۔

۱۲ سیدھی لکیروں اور ایک نقطے سے شکلیں بنائیے !



جناب خلیق انجم اشرفی



میں نے کاٹا ہے

بہت دنوں کا ذکر ہے کہ امریکہ کے کسی شہر میں ایک چھوٹا سا لڑکا رہتا تھا۔ اس کا نام تھا جارج واشنگٹن۔ اس کی چھٹی سالگرہ پر اس کے باپ نے اسے ایک چھوٹی اور خوب صورت کلہاڑی دی۔ جارج اپنے باپ سے یہ انوکھا تحفہ پا کر بہت خوش ہوا۔ اس دن جب وہ اسکول گیا تو وہاں بھی اس کے دماغ میں وہی خوب صورت کلہاڑی ناچتی رہی۔

چھٹّی کی گھنٹی بجتے ہی وہ بھاگتا ہوا گھر پہنچا اور دوپہر کا کھانا کھانے کے بجائے اپنے کمرے میں گھس گیا اور کلہاڑی اٹھا کر اپنے آپ سے کہنے لگا "واہ! کتنی خوب صورت اور چمک دار ہے یہ اور واہ بھئی اس کی دھار کتنی تیز ہے۔ دیکھو! میں اس سے کوئی چیز کاٹ کر دیکھتا ہوں"۔ یہ سوچ کر وہ اپنے باغ میں آیا ایک چھوٹے سے درخت کو کلہاڑی کی دھار آزمانے کے لیے چنا اور کلہاڑی لے کر اس پر پل پڑا۔ اس نے پیڑ کی ایک ایک شاخ اور ایک ایک پتّی الگ کر دی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس نے اس خوب صورت پیڑ کو مار ڈالا ہے۔ چھوٹا سا بچّہ ہی تو تھا! پیڑ کو کاٹ کر وہ واپس آیا اور دوپہر کا کھانا کھا کر کمرے میں چلا گیا۔

شام کو باپ باہر سے آئے تو پہلے باغ میں گئے۔ ان کو پودوں اور پھولوں سے بڑی محبت تھی۔ وہاں انھوں نے اس ننھّے سے خوب صورت پیڑ کو اس طرح کٹا پایا تو انھیں ایک دم غصّہ آگیا۔ چیخ

کر انھوں نے جارج کو پکارا "جارج یہ کس نے کاٹا ہے؟"

ظاہر ہے یہ جارج کا کارنامہ تھا پر بھی اس نے کوئی بہانہ نہیں بنایا۔ سچ سچ کہہ دیا "پاپا! میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ پیڑ میں نے کاٹا ہے"!

کیسا اچھا لڑکا تھا وہ! سچ بولنے کی سزا جانتے ہوئے بھی وہ سچ بولا۔

یہ جواب سنتے ہی انھوں نے اپنے پیارے بچے کو گود میں اٹھالیا اس کی پیشانی کو چوما اور بولے "میرے بچے! میں تم سے بہت خوش ہوں کہ تم نے سچ بولا۔ میں اس باغ کے تمام پیڑوں اور پودوں کو کٹا دیکھنا زیادہ پسند کروں گا بہ نسبت اس کے کہ میرا بچہ جھوٹ بولے"۔

اور کیا آپ جانتے ہیں کہ بڑا ہو کر یہ لڑکا کیا بنا؟ یہی بچہ دنیا کے مشہور ترین انسانوں میں سے ایک ہوا۔ بڑا ہونے پر وہ امریکہ کا پہلا صدر چنا گیا۔ وہی جارج واشنگٹن جس کے نام پر امریکہ کے مشہور شہر "واشنگٹن" کا نام ہے۔

جارج واشنگٹن کو بچپن ہی سے سادگی پسند تھی۔ امریکہ کا صدر بن جانے کے بعد بھی ان میں گھمنڈ نہ آیا۔ ایک بار وہ سادہ اور معمولی کپڑے پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے شہر سے باہر جا رہے تھے۔ شہر کے باہر پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ سڑک سے کچھ ہٹ کر تین چار سپاہی لکڑی کے ایک بڑے لٹھے کو اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پاس ہی ایک گھوڑا گاڑی کھڑی تھی جس پر شاید اس لٹھے کو چڑھانا تھا۔ ان سپاہیوں کے پاس ہی ایک کارپورل (چند سپاہیوں کا افسر) ہاتھ میں ایک پتلی چھڑی لیے انھیں چیخ چیخ کر حکم دے رہا تھا "کھینچو! ذرا اور طاقت لگاؤ ہاں ہاں۔ اور زور لگاؤ"۔ بے چارے سپاہی پسینے میں تر بتر تھے اور پوری طاقت سے لٹھے کو اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن لٹھے کو اٹھانے کے لیے ابھی ایک اور آدمی کی ضرورت تھی جارج واشنگٹن فوراً گھوڑے سے اتر کر کارپورل کے پاس آئے اور بولے "کیوں جناب! آپ ان سپاہیوں کی مدد کیوں نہیں کرتے۔ کارپورل چونک کر مڑا اور اس طرح بولا جیسے کہ وہی فوج کا جنرل ہو "آپ جانتے ہیں، میں کون ہوں؟ میں ایک کارپورل ہوں ان سپاہیوں کا افسر"!

واشنگٹن بولے "اوہ جناب میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ اتنے بڑے

آدمی ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے فوراً اپنا کوٹ، جوتے اور ہیٹ اتارے اور سپاہیوں کے ساتھ مل کر اپنی پوری طاقت سے زور لگانے لگے۔ ان کی اس مدد سے سپاہیوں نے جلد ہی لٹھے کو گاڑی کے اندر پہنچا دیا۔ کارپورل چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔

واشنگٹن اپنے گھوڑے کے پاس آئے۔ کوٹ، جوتے اور ہیٹ پہنا اور گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کارپورل سے بولے "مسٹر کارپورل! اگر کبھی دوبارہ آپ کو کوئی سخت کام کرنا ہو اور آپ کے پاس اس کام کے لیے کافی آدمی نہ ہوں تو مجھے بلا بھیجیے گا۔ مجھے لوگ جارج واشنگٹن کہتے ہیں۔"

کارپورل کو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ مارے شرمندگی کے اس کا جی اس وقت یہی چاہ رہا تھا کہ کاش زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں سما جاتا۔ وہ شرمندگی سے سر جھکائے چپ چاپ کھڑا رہا اور سپاہی تعجب سے اس طرف دیکھ رہے تھے جدھر امریکہ کا یہ عظیم فرزند جا رہا تھا۔

تہذیب کی بنیاد

(۳)

جناب برکت علی فراق

"جی ہاں، ماسٹر صاحب، ہمارے ابا جی بھی یہی کہہ رہے تھے"، عارف میاں اب خوش تھے۔

"ماسٹر صاحب! اُس دن آپ نے فرمایا تھا کہ طالب علم بھی بالغوں کی تعلیم کا کام کر سکتے ہیں، میری سمجھ میں یہ بات اچھی طرح نہیں آئی"، میمونہ دیر سے سوچ رہی تھی کہ آخر جلسہ کب شروع ہوگا۔

تاریخ کے استاد اس کی بات بھانپ کر بولے "ارے ہاں بھئی، اتنی دیر ہوگئی اور ابھی باقاعدہ جلسہ ہی شروع نہیں ہوا۔ آپ لوگوں کی یہ نوک جھونک اتنی دلچسپ تھی کہ میں بھی اُسی میں کھو گیا۔ خیر اب جلسہ شروع ہوتا ہے۔ اس دن ہم نے یہ بحث یہاں چھوڑی تھی کہ طالب علم بھی یہ کام کر سکتے ہیں، اور زیادہ کر سکتے ہیں اس لیے کہ ان کی تعداد زیادہ ہے۔ اور آج میں کہتا ہوں کہ ان کے کام سے اُن پڑھوں کا بھلا تو ہوگا ہی، طالب علموں کا اپنا بھی اس میں فائدہ ہے۔"

"جی اتنی بات تو سمجھ میں آتی ہے جناب صدر، کہ پڑھانے والوں کی تعداد زیادہ ہوگی تو پڑھنے والے بھی زیادہ ہوں گے لیکن ....."

میمونہ اپنے حساب کے زور سے سمجھی ہوئی بات ابھی پوری بھی نہ کرنے پائی تھی کہ ماسٹر صاحب بول اٹھے:

"پڑھنے والوں کی تعداد پر ایک بات یاد آ گئی، بہت دلچسپ ہے، تم بھی خوش ہو گے ...."

"جی ہاں جناب صدر، وہ بات ضرور بتلائیے" ایک ساتھ بہت سے طلباء بول اٹھے۔ کہانی کچھ ننھے ننھے بچوں ہی کی من بھاتی چیز نہیں ہے، نویں دسویں کے طلباء بھی کہانی کی تاک جھانک میں رہتے ہیں۔

"امریکہ کے ایک بوڑھے استاد ہیں،" تاریخ کے استاد نے کہانی شروع کی "یہی کوئی اسّی نوّے سال کے۔ فرینک لاباخ ان کا نام ہے۔ جوانی کے زمانے میں وہ 'ایک جزیرہ ہے فلپائن ....'"

"بحرالکاہل میں چین کے پورب اور جاپان سے کچھ جنوب میں، وہی نا جناب صدر" عالم نواز خاں نے جو جغرافیے کے طالب علم تھے، استاد کی بات کاٹ [illegible] کسی زمانے میں اس کے اوپر امریکہ کی حکومت [illegible]، جیسے ہندوستان پر انگلینڈ کی۔"

"[illegible]وں میمونہ بیٹی، ٹھیک کہہ رہے ہیں عالم نواز [illegible]!" استاد نے پوچھا۔

[illegible]نہ خاموش بیٹھی رہی۔

"[illegible] کہ معلوم نہیں ہے کیوں، ہے نا؟" استاد کو پڑھے [illegible] لے بالغوں کو تعلیم دینے کی ضرورت سمجھانے کا ایک موقع ہاتھ آیا۔" اُس دن آپ لوگوں نے اس بات پر تعجب کیا تھا کہ پڑھے لکھے لوگوں کو تعلیم دینے کا کیا مطلب۔ اب یہیں سمجھ لیجیے۔ کتنے ہیں آپ لوگوں میں جو جزیرہ فلپائن کی صحیح جگہ جانتے ہیں۔ پڑھے لکھے تو آپ سب لوگ ہیں۔ بات یہ ہے کہ علم اب اتنا پھیل گیا ہے کہ لوگ اب تمام علوم میں پوری پوری واقفیت حاصل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جوں جوں طالب علم اونچی جماعتوں میں چڑھتا جاتا ہے، اس کے مضمونوں کی تعداد گھٹتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آتا ہے جب اس کے پاس صرف ایک مضمون رہ جاتا ہے، اسی میں وہ پوری پوری واقفیت حاصل کرتا ہے۔ اس کو "مہارتِ خصوصی" کہتے ہیں۔ یہ زمانہ 'مہارتِ خصوصی' کا زمانہ ہے۔ اس لیے بھی ضروری ہے کہ انسان جس مضمون کو نہیں جانتا اُس کی اُسے تھوڑی بہت معلومات تعلیم بالغان کے ذریعے کرادی جائے۔ اور اپنے پڑوسی ملکوں اور وہاں کے لوگوں کے حالات جاننا تو بہت ضروری ہے۔ دوسرے ملکوں میں تو لوگ دور دور کے ملکوں کے حالات معلوم کرنے کے خواہشمند رہتے ہیں، جو اُن کے پڑوسی بھی نہیں ہوتے۔

اب یہی میمونہ ہے، حساب، کمسٹری اور فزکس میں تو کیسی تیزی دکھاتی ہے، لیکن اتنا نہیں معلوم کہ جزیرہ فلپائن ہندوستان سے کس طرف کو ہے۔ اور صرف میمونہ ہی پر کیا موقوف ہے، میں نے اُس سے سوال کیا تو آپ سبھی تو خاموش ہو گئے تھے!"

"ہاں تو لاباخ صاحب" استاد نے کہانی کا سلسلہ شروع کیا "جزیرہ فلپائن میں عیسائی مذہب کے پادری کی حیثیت سے گئے تھے کہ وہاں کے باشندوں میں عیسائی مذہب پھیلائیں گے۔ مگر وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگ تو سب کے سب ان پڑھ ہیں۔ ان میں مذہب کیسے پھیلایا جائے گا۔ یہ دیکھ کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے انھیں پڑھنا لکھنا سکھایا جائے۔ پڑھانے کا فن تو وہ جانتے ہی تھے، چار پانچ سال کی محنت سے فلپائن کے لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیا۔

کچھ عرصے کے بعد لاباخ صاحب کو اپنے گھر کی ضرورت سے امریکہ واپس جانا پڑا۔ امریکہ جاتے ہوئے راستے میں ہندوستان پڑتا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ یہاں کے لوگ بھی بہت زیادہ تعداد میں ان پڑھ ہیں، کچھ کام یہاں بھی کر لیں اور پڑھے لکھے لوگوں کو بتا دیں کہ اِس اِس طرح کام کرنے سے یہاں کے بھی سب لوگ پڑھ لکھ جائیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے انھوں نے کچھ عرصے دو تین جگہ ان پڑھوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کا تجربہ کیا اور کامیاب رہے۔ چلنے کا وقت آیا تو لاباخ صاحب گاندھی جی سے ملے۔ گاندھی جی کو انھوں نے سمجھایا کہ 'دیکھیے اس وقت ہندوستان میں ۱۶ فیصدی لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ اگر ہر پڑھا لکھا آدمی ایک سال میں ایک ان پڑھ کو پڑھا دے تو دوسرے سال پڑھے لکھوں کی تعداد ۳۲ فیصدی ہو جائے گی۔ اب دوسرے سال ۳۲ لوگ ایک ایک ان پڑھ کو پڑھنا لکھنا سکھائیں گے تو تیسرے سال یہ تعداد ۶۴ فیصدی ہو جائے گی۔ تیسرے سال ۶۴ فیصدی آدمی یہی کریں گے تو چوتھے سال پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ۱۲۸ فیصدی ہو جائے گی۔ یہ ۲۸ جو ۱۰۰ سے زیادہ ہیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ [illegible] ال میں ۲۸ فیصدی آبادی بڑھ چکی ہوگی [illegible] طرح چار سال کے زمانے میں سو فیصدی [illegible] لکھے ہو جائیں گے۔ یعنی ملک میں کو[illegible] نہیں رہے گا۔

"گاندھی جی نے لاباخ صاحب [illegible]

بڑے غور اور دلچسپی سے سنی اور اس پر اور زیادہ سوچ بچار کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ بات اس وقت کی ہے جب ہندوستان کے صوبوں میں آزاد حکومتیں بننے والی تھیں۔ جب یہ حکومتیں بن گئیں تو گاندھی جی نے ان کو لا باخ صاحب کے اصول پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ اُن کے مشورے سے ملک میں بڑا جوش پھیل گیا تھا، اور کئی جگہ اس طریقے پر کام بھی شروع ہو گیا تھا۔ اسکولوں کے طلبا اس کام میں آگے آگے تھے۔ لیکن ڈیڑھ ہی دو سال کے بعد دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی اور آزاد حکومتوں نے استعفے دے دیئے اور یہ کام رک گیا۔"

"لا باخ صاحب کا یہ حساب تو بالکل ٹھیک ہے، جناب صدر،" حساب کی طالبہ میمونہ بولی "مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ طالب علم یہ کام کریں کیسے؟"

"معمولی سمجھ کی بات ہے بیٹی" استاد نے کہا "ویسے تو تمہارے آس پاس بہت سی لڑکیاں اور عورتیں اَن پڑھ ہوں گی، اپنے فاضل وقت میں ان میں سے ایک دو کو بلا لیا کرو، یا اُن ہی کے گھر چلی جایا کرو اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ روزانہ پڑھا دیا کرو۔ اب دیکھو، عارف میاں نے تو کام شروع ہی کر دیا ہے۔ ان سے پوچھو، کیسے کرتے ہیں۔ اور اگر یہ نہیں تو تم لوگوں کو سال میں ایک بار دو مہینے کی چھٹی تو ہوتی ہی ہے۔ فرصت ہی فرصت رہتی ہے۔ چوبیس گھنٹے میں گھنٹے دو گھنٹے تو اس کام کے لیے نکال ہی سکتی ہو۔ اگر ہر طالب علم اپنی چھٹیوں کے زمانے میں دو ان پڑھوں کو پڑھا دیا کرے، تو فرض کرو، پورے ہندوستان میں پڑھانے کی قابلیت رکھنے والے دو لاکھ بھی طالب علم ہوں تو ہر سال چار لاکھ ان پڑھ بالغ پڑھ لکھ جائیں گے۔۔۔۔۔"

"دو ہی لاکھ جناب صدر، میں کہتا ہوں بیس پچیس لاکھ سے کم نہ ہوں گے" ہندوستان کی عظمت کے پجاری عارف میاں جوش میں بھر کر بولے "اور دو ہی کیوں پڑھائیں، میں تو پورے پانچ آدمیوں کو پڑھاتا ہوں۔"

"تو گویا ایک سال میں بیس پچیس سو لاکھ یعنی ایک کروڑ آدمی پڑھنا لکھنا سیکھ جائیں گے، کیوں میمونہ؟" مسعود نے میمونہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں تو اور کیا، مجھ سے کیوں پوچھتے ہو، کیا تم کو پانچ سے بیس کو ضرب دینا بھی نہیں

آتا ؟" میمونہ نے جل کر جواب دیا۔

"پھر آپ نے بے تکی بات شروع کر دی مسعود صاحب، اس میں مذاق کی کیا بات ہے۔ پہلے آپ نے عارف کو رلایا تھا، اب میمونہ کا منہ چڑھا رہے ہیں۔ اگر لاباخ صاحب فلپائن میں یہ کام کر سکتے ہیں تو ہم ہندوستان میں کیوں نہیں کر سکتے۔" استاد نے مسعود کو تنبیہہ کی۔ میمونہ اور عارف میاں کے چہرے دمکنے لگے۔

خاموشی۔

"مگر جناب صدر، لاباخ صاحب کے حساب سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ نیا نیا پڑھنا لکھنا سیکھیں گے، وہ بھی پڑھنے کے بعد پڑھائیں۔" موہن لال نے سوال کیا۔

"ہاں، لاباخ صاحب نے فلپائن میں یہی کیا تھا۔ مگر آپ لوگ اُن کے حساب پر کیوں جائیں، اپنے ہی حساب پر رہیے۔ ایک سال میں ایک کروڑ۔ اس وقت ہندوستان میں بیس کروڑ کے قریب لوگ ان پڑھ ہیں۔ اگر اس بڑی تعداد کو پڑھنا لکھنا سکھانے میں بیس سال لگ جائیں تب بھی یہ بہت کم مدت ہے اور یہ سہرا طالب علموں کے سر ہو سکتا ہے۔"

"آپ نے شروع میں فرمایا تھا جناب صدر، کہ اس کام میں طالب علموں کا اپنا بھی فائدہ ہے۔"

"ہاں بھئی، یہ بات تو رہ ہی گئی" استاد نے شمیم کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کا منشا سمجھ لیا۔ "آپ نے وہ مثل سنی ہوگی کہ کام خود کام سکھا دیتا ہے۔ اس مثل کا منشا بھی سمجھے! جب آپ ان پڑھ بالغوں کو پڑھانا شروع کریں گے تو سب سے پہلے آپ پڑھانے کا طریقہ سمجھنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔ پھر بچوں اور بالغوں کو پڑھانے کے طریقے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ بچّہ اور طالب علم کا تو کام ہی پڑھنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اُس کو پڑھنے کے لیے گھر پر ماں باپ اور اسکول میں استاد مجبور کرتے ہیں۔ مگر بالغ کو اس طرح کی کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ اگر وہ نہ پڑھنا چاہے تو اسے بچوں کی طرح سزا نہیں دی جا سکتی۔ وہ تو جب اس کی مرضی ہوگی جبھی پڑھے گا۔ اور پھر اُسے کام بھی دوسرے بہت سے ہوتے ہیں، اُن سے چھٹی پائے گا اور کام کی تھکن اتر چکی ہوگی، اُسی وقت اس کا جی پڑھنے کو چاہے گا۔ جب آپ بالغ کو پڑھانا شروع کریں گے تو یہ سب دشواریاں سامنے آئیں گی۔ اب اگر آپ کو

اس کام کی ہمّت اور لگن ہوگی تو جو لوگ اس کام کو جانتے ہیں، ان سے آپ رائے لیں گے مشورہ کریں گے۔ پڑھانے کا طریقہ سیکھیں گے، بالغوں کو پڑھنا لکھنا سیکھنے کے لیے تیار کرنے کا گر سیکھیں گے۔ دسیوں بیسیوں نئے آدمیوں سے آپ کو واسطہ پڑے گا، تو اس سے آپ کا تجربہ بڑھے گا۔ ہمّت اور حوصلہ بڑھے گا، کام کرنے کا شوق پیدا ہوگا۔ یہی فائدہ کیا کم ہے۔ پھر جس سے یہ باتیں سیکھیں گے وہ کچھ تو زبانی بتائے گا اور کچھ کتابیں پڑھنے کا مشورہ دے گا۔ کتابیں پڑھنا اور اس طرح پڑھنا کر پڑھی ہوئی بات پر عمل کرنا ہے، یوں ہی مفید ہوتا ہے۔ آپ کو کتاب سمجھ کر پڑھنے کی عادت پڑے گی۔ کوئی ایک دو فائدے ہوں تو گنائے بھی جائیں۔ عملی کام میں تو فائدے ہی فائدے ہیں۔"

"مگر جناب صدر، پڑھائیں کس طرح؟" عارف میاں نے سوال کیا "میں اُنھیں ہزار الف ب ت یاد کرانے کی کوشش کرتا ہوں، انھیں یاد ہی نہیں ہوتا۔"

"بھئی یہ بڑا لمبا سوال ہے، تمھارے ابّا تو یہی کام کرتے ہیں، اُن سے کیوں نہیں پوچھتے۔ اس کا مجھے بھی کچھ خاص تجربہ نہیں ہے۔ مجھے تو اسکول میں لڑکوں کو پڑھانے کی مشق ہے۔" استاد نے صاف صاف معذوری ظاہر کردی۔

"ابّا میاں تو جناب صدر، اکثر اس وقت گھر آتے ہیں جب میں سو جاتا ہوں، کب پوچھوں ان سے۔ یہ تو وہ چھٹی کے دن کبھی کبھی بتا دیتے ہیں اور اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ چھٹی کے دن بھی اُنھیں فرصت نہیں ہوتی۔" عارف نے اپنی بے بسی ظاہر کی۔

"اچھا تو اگر آپ لوگ کہیں گے اور یہ کام شوق سے سیکھنا چاہیں گے تو کسی دن ہم عارف کے ابّا میاں کو بُلائیں گے۔ وہ بتائیں گے کہ بالغوں کو پڑھانے کے کیا طریقے ہوتے ہیں۔"

"ہم تیار ہیں جناب صدر، اس سال کی گرمی کی چھٹیوں میں ..... " بہت سے طلباء ایک ساتھ بولے۔

"میں تو باہر نہیں جا سکوں گی ماسٹر صاحب! مگر ہاں ایک تو میرے گھر ہی پر ایک بُوا اور ان کی لڑکی ہے، محلّے سے بھی دو تین اور ماماؤں کو بلا لیا کروں گی، اور اُنھیں پڑھاؤں گی۔" میمونہ نے بھی اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے اپنا ارادہ بیان کیا۔

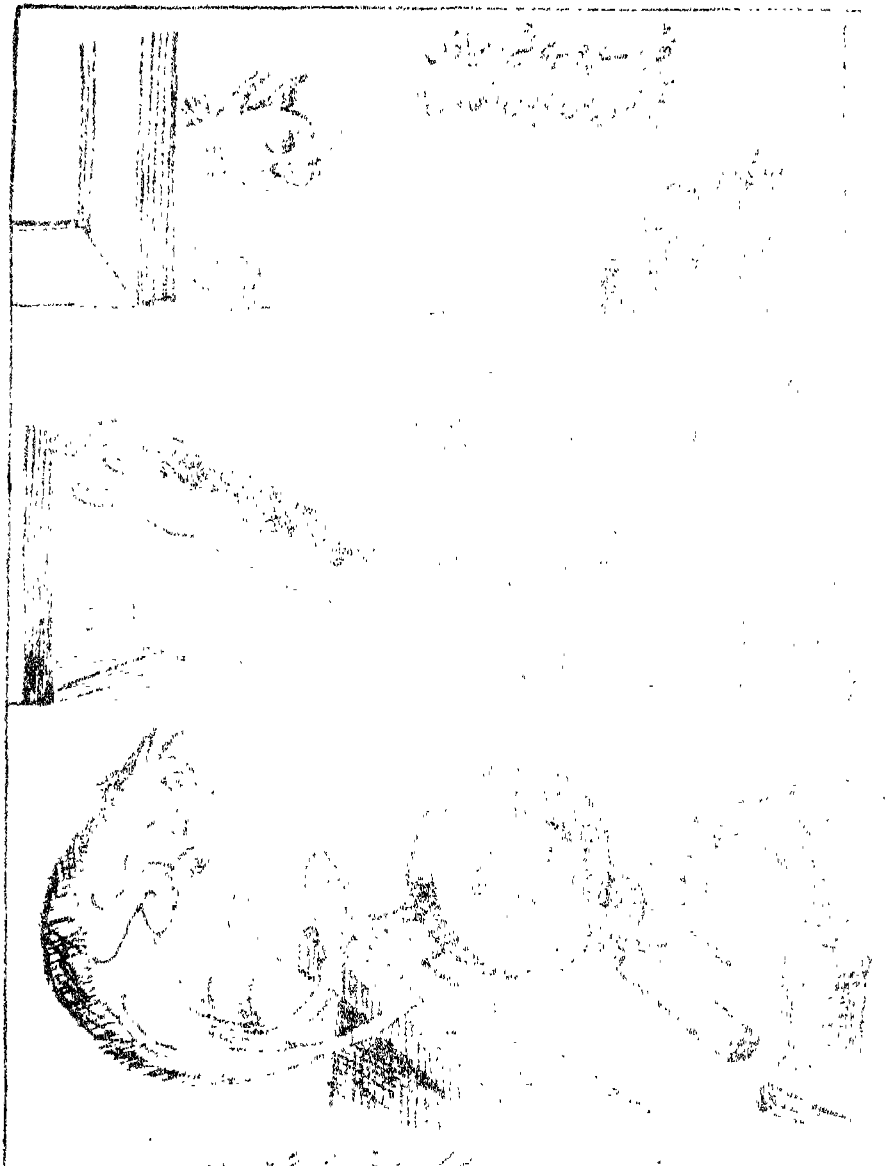
وقت ختم ہو رہا تھا۔ استاد نے طلباء کے عزم و ارادے پر انھیں مبارک باد دی اور ان کے لیے خدا سے کامیابی کی دعا کرکے جلسہ برخاست کردیا۔

ششم کی الوداعی دعوت

سال کے آخر میں ابتدائی پنجم کے طلبا ششم کے طلباء کو الوداع کہتے ہیں۔ دونوں جماعتوں کے طلبا اور مدرسہ کے اساتذہ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ اس موقع کے لیے ابتدائی ششم کے چند طلبا نے مل کر ایک نظم لکھی اور ایک لڑکی نے اسے سنایا۔

سید احمد علی آزاد

لیجیے ہم ششم سے جاتے ہیں	دعوتیں الوداعی کھاتے ہیں	ریاض احمد	عمر ۱۲ سال
چھ برس خوب پڑھ لیا ہم نے	آخری سال اب ہے جاتے ہیں	عشرت جہاں	" ۱۱ "
آپ پنجم سے آئیں گے اس میں	اور ہم اب ششم سے جاتے ہیں	نسیم حلیم	" ۱۲ "
چھوٹتے ہیں پرانے سب استاد	اس قدر غم بھی لے کے جاتے ہیں	"	" " "
لیجیے ہم ششم سے جاتے ہیں	کام کچھ نئے کیے جاتے ہیں	"	" " "
اچھے استاد ابتدائی کے	ثانوی جا کے یاد آتے ہیں	ناظم الدین	" " "
کام اچھے کیے ہیں کچھ ہم نے	واسطے سب کے چھوڑے جاتے ہیں	ابرار احمد	" " "
ان کے کاموں کو یاد رکھیے گا	سبق محنت کا دے کے جاتے ہیں	محمد یحییٰ	" ۱۱ "
ایک پروجیکٹ جو چلایا تھا	ہم یہاں اس کو چھوڑے جاتے ہیں	نسیم علیم	" ۱۲ "
یاد تین زنگ کی ہم کو آتی ہے	کس قدر حوصلہ دلاتے ہیں	رعنا امین	" ۱۱ "
دیدیے سارے امتحاں ہم نے	اب تو اپنے گھروں کو جاتے ہیں	ابرار احمد	" ۱۲ "
ساتویں میں ضرور جائیں گے	دل نہ محنت سے ہم چراتے ہیں	ناظم الدین	" " "
منزل ثانوی پہنچ کر ہم	پچھلی باتوں پہ مسکراتے ہیں	محمد عارف	" ۱۱ "
ایسا حلوہ یہ پوریاں خواجہ	خوب ڈٹ کر یہاں یہ کھاتے ہیں	خواجہ	" " "
فیل ہم میں سے ہو گیا کوئی	شرم سے آنکھ بھی چراتے ہیں	جمیل احمد	" ۱۳ "



[illegible] گندا سا!

جناب اعجاز اختر

چند پُرانے سائنس داں



اریسسٹریٹس

سائنس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ ان میں ایک اہم شاخ علم الابدان بھی ہے۔ یعنی انسان کے جسم کی بناوٹ کا علم۔ اسے انگریزی میں Physiology کہتے ہیں اس میں بدن کے تمام حصّوں یا اعضا، اس کے نظام تنفس کی رفتار، دورانِ خون، دل کی دھڑکن اور بیماریوں کی جانچ وغیرہ شامل ہے۔

حضرت عیسیٰ سے بھی ۳ سو برس پہلے اریسسٹریٹس (Erasistratus) نام کے ایک مشہور عالم گذرے ہیں۔ یہ اُس وقت علم الابدان (Physiology) کے ماہر تھے۔ اریسسٹریٹس "اسکندریہ" نامی مقام پر

رہتے تھے اور وہیں انھوں نے تعلیم حاصل کی ۔ ان دنوں "اسکندریہ" سائنس اور دوسرے علوم و فنون کا مرکز تھا ۔

ایسسٹریٹس ایک ڈاکٹر کے بیٹے تھے ۔ اور ان کی پیدائش "کاس" نامی جزیرہ میں ہوئی ۔ اس مشہور جزیرے میں کوئی سو سال پہلے ہیپو کریٹس نامی سائنسداں بھی پیدا ہوئے تھے ۔ ان کے بارے میں ابھی زیادہ تحقیق نہیں کی گئی ۔ موجودہ مورخوں کا کہنا ہے کہ "کاس" ان دنوں میڈیکل اور طبی مرکز تھا ۔ وہاں کے رہنے والے زیادہ تر ڈاکٹر اور سرجن تھے ۔

ایسسٹریٹس نے انسانی جسم کی بناوٹ کا بہت گہرا مطالعہ کیا ۔ اسی لیے انھیں علم الابدان کا ماہر کہا جاتا ہے ۔

انھوں نے انسانوں اور جانوروں کی لاشوں پر بہت سے تجربے کیے ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ شہر کے قیدخانے سے قیدیوں کو لے آتے اور ان کے جیتے جی ان پر تجربات کرتے ۔

ان کے بہت سے اصول غلط تھے ۔ مثلاً ان کا عقیدہ تھا کہ سانس کی نلی ہوا سے بھری رہتی ہے ۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ نبض چھوٹی اور پتلی نالیاں ہوتی ہیں جن سے ایک عجیب سا رقیق مادہ بھرا ہوتا ہے ۔

بچوں سے باتیں

(بقایا ص ۵)

امتحان کے بعد دو مہینے کی چھٹیاں ہوں گی ۔ ان چھٹیوں میں آپ کیا کریں گے ؟ کیا اچھا ہو کہ آپ برکت صاحب کی خواہش کے مطابق کچھ کام کر ڈالیں ۔

سالنامے کے بعد آپ کا 'پیام تعلیم' بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے ۔ خریدار بھی بڑھ رہے ہیں ۔ اس کی ظاہری شان و شوکت میں بھی آپ نمایاں ترقی محسوس کرتے ہوں گے ۔ اب وقت ہے کہ کچھ آپ بھی ہماری مدد کریں اور اپنے عزیزوں اور ساتھیوں کو اس کی خریداری کی طرف مائل کریں ۔ ان چھٹیوں میں یہ کام آپ بڑے اطمینان سے کر سکتے ہیں ۔

بڑوں کی کوششیں

اردو زبان

"آیئے تشریف رکھیے" سننے میں کیسا بھلا اور پیارا لگتا ہے، سب سے پہلے یہ لفظ میں نے جناب پرنسپل صاحب کی مبارک زبان سے سُنا تھا جب میرا انٹرویو ہوا تھا۔ "شکریہ" کا لفظ میں نے اپنے اردو کے استاد معصولی صاحب سے مقابلے والے امتحان کے دن سنا تھا جب وہ اپنے ایک ساتھی سے کہہ رہے تھے۔ ان لفظوں کو سن کر اُسی دن سے میرے من میں اردو سیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ اور خدا سے دعا کی کہ مجھے یہاں جامعہ میں داخلہ مل جائے تاکہ میں اردو سیکھ جاؤں۔ پھر میں بھی ٹھاٹ سے اردو بولا کروں گی اور پتاجی کو خط بھی اردو میں ہی لکھوں گی اور ایسی کتابیں بھی پڑھنے کروں گی۔ اسی طرح کی اُمنگیں میرے دل میں اٹھنے لگیں۔

تیر خدا نے میری پکار سن لی اور میں آج ان کے استادوں کے مدرسے میں داخل ہوگئی اور اردو سیکھنے کی امید پوری ہوگئی۔

ہمارے اردو کے استاد جناب معصولی صاحب بڑے دلچسپ طریقے سے اردو پڑھانے لگے ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں بہت سے حرفوں کی پہچان ہوگئی۔ ان سے پھر لفظ اور فقرے بنانے لگے۔ ترقی کرتے کرتے ہم نے اب اردو کی دو کتابیں پڑھ لی ہیں۔ اب ہم چھوٹے چھوٹے خط، واقعات اور املا لکھ لیتے ہیں۔ شاید وہ دن دور نہیں جب ہم اردو کے اخبار، قصے کہانیاں اور بڑی بڑی

[illegible] بولیں گے "تشریف لائیے"، "آپ کے [illegible] کہتے ہیں"، "آداب عرض ہے"، "چائے نوش فرمائیے"، "باجی"، "ہمشیرہ صاحبہ" وغیرہ لفظوں میں تو مانو مصری گھلی ہوئی ہے۔ ان کو سن کر [illegible] خوشی ہوتی ہے۔ واقعی اس زبان میں مٹھاس [illegible] کا نام نہیں — اصل میں [illegible] اردو باتوں کو آپس میں [illegible] والی زبان ہے۔ ہندی جو عام بولتے ہیں [illegible] اردو کا ہی روپ جھلکتا ہے۔ سوچتی [illegible] ایسی خالص زبان بول سکوں گی [illegible] استادوں کو پورا ہوتا دیکھتی ہوں۔ خدا [illegible] پورا کرے۔

سندری کالرا جامعہ
بیک دوسرا سال

اچانک ملاقات

دسمبر کی چھٹی ہوئی اور ہم سب لڑکے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔ ہم چار ساتھی راجندر پال، کرشن چندر، محمد بشیر خان اور میں شام کے ١٢ بجے شاہدرہ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے مگر وہاں پتہ چلا کہ ریل صبح ۵ بجے جائے گی۔ خیر ہم چاروں ساتھی پلیٹ فارم پر بنچوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں پلیٹ فارم کے دوسری طرف جاکر گھومنے لگا۔ اتنے میں ایک سپاہی آیا اور اس نے مجھے پکڑ لیا۔ میں نے کہا کیا بات ہے بھائی صاحب؟ وہ کہنے لگا بات پوچھتے ہو میاں! آج ہی میرے ہاتھ لگے ہو۔ تم روزانہ یہاں سے کوئلہ اٹھا کر لے جاتے ہو۔ میں نے کہا بھائی صاحب ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو ویسے ہی گھوم رہا ہوں، ریل کافی دیر بعد آئے گی اور میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا جس کی وجہ سے میں ادھر گھومنے لگا۔ اس نے میری طرف لال پیلی آنکھیں نکالیں اور کڑکڑاتی آواز سے بولا جھوٹ بولتے ہو مجھے مت بہکاؤ کسی اور کو بہکا لینا۔ خیر میں نے اس کی سب باتیں سن لیں اور اسے بہت سمجھایا۔ پھر وہ بولا کہ اچھا تم ایمان داری سے بتلاؤ کہ تم کوئلہ اٹھانے کے لیے نہیں آتے تھے کیا؟ میں نے کہا بھائی صاحب مجھے کوئلے کا کیا کرنا ہے میں تو ویسے ہی گھوم رہا ہوں۔ خیر اس کی سمجھ میں میری بات آگئی اور وہ کہنے لگا کہ اچھا اگر تم کوئلہ جاکر سلگانا چاہتے ہو اور ہاتھ سینکنا چاہتے ہو تو کوئلہ لے جاؤ۔ میں تمھاری بول چال سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ تمھاری بات چیت سے میں نے

اندازہ لگایا ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے بھائی صاحب کو بلانے جاؤ اور اسے سلگا کر خوب ہاتھ سینکو۔ میں نے کہا آپ کا بہت بہت شکریہ مجھے کوئلے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کہنے لگا بھائی صاحب مجھے معاف کرنا میں یہی سمجھا تھا کہ شاید آپ کوئلا اٹھانے کے لیے آئے تھے۔ میں نے کہا نہیں بھائی صاحب اس میں معافی کی کیا بات ہے؟ یہ تو آپ کی ڈیوٹی ہے اور آپ نے میرے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے وہ ٹھیک ہے اور آپ کو اپنی ڈیوٹی پر اسی طرح کام کرنا چاہیے۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا بھائی صاحب آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ میں نے کہا میں ضلع میرٹھ کا رہنے والا ہوں۔ اس نے پوچھا کس گاؤں کے رہنے والے ہو؟ میں نے جواب دیا میں بڑوت کے پاس ایک چھوٹے سے گاؤں بجواڑہ کا رہنے والا ہوں۔ اس نے پوچھا آپ کا کیا نام ہے؟ میں نے کہا مجھے اقبال احمد کہتے ہیں۔ اقبال احمد۔ اقبال احمد... اتنا کہہ کر اس نے میری کولی بھرلی اور کہا بھائی صاحب میں رگھوبر سنگھ ہوں شاید آپ بھول گئے ہوں گے میں پاکھر کا رہنے والا ہوں۔ یہ سنتے ہی مجھے ایک دم وہ وقت یاد آگیا جب ہم دونوں بچپن میں دوسری جماعت میں ایک ہی ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ میں نے بھی اس کی کولی بھرلی۔ اس نے مجھ سے معافی مانگی اور کہنے لگا بھائی صاحب میرے ساتھ مکان پر چلیے وہیں آرام کیجیے۔ ادھر میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے تھے۔ خیر میں نے انھیں سمجھایا کہ بھائی صاحب مجھے بہت ضروری کام ہے جس کی وجہ سے مجھے آج ضرور جانا ہے اس لیے معاف فرمائیے۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ میں نے بتلایا کہ میں آج کل جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بیسک ٹریننگ کر رہا ہوں پھر جامعہ کے بارے میں بھی کافی بات چیت ہوئی۔ اس نے گھر چلنے کے لیے اصرار کیا مگر میں نے اسے سمجھایا کہ آپ کا بہت بہت شکریہ، کبھی پھر ملیں گے۔ اس نے مجھے اپنا پتہ دیا اور آخر میں ہم دونوں پھر ایک ساتھ کولی بھر کر گلے ملے اور بچپن کی دوستی کو یاد کرتے ہوئے ایک دوسرے سے وداع ہو گئے۔ یہ تھی وہ ایک اچانک ملاقات۔

اقبال احمد جامعہ
بیسک دوسرا سال

خدا جانے

حال ہی کی بات ہے میں ایک انٹرویو

دیئے گیا ہوا تھا۔ وہاں اور بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔ میرا نمبر ٣٠ واں تھا۔ جب میں انٹرویو دے کر باہر آیا تو چہرے پر کچھ کچھ گھبراہٹ تھی۔ جو لوگ اندر ہو آئے تھے باہر بیٹھے تھے۔ جب میں ان کے پاس گیا تو ایک نے پوچھا "کہو بھائی کیا ہوا؟" میں نے ٹالتے ہوئے کہا "ارے بھائی خدا جانے" بات آئی گئی ہوئی۔ پھر کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اچانک ایک آدمی نے پوچھا "ارے بھئی کیا تم مسلمان نہیں ہو؟ میں نے جواب دیا" نہیں آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ میں مسلمان ہوں"! ان نے کہا ابھی تم کہہ رہے تھے "خدا جانے" میں نے کہا "کیا اردو لفظ مسلمان ہی بول سکتے ہیں۔ میں تو اردو میں بھگوان کا نام لے رہا تھا۔ اردو میں اسے خدا کہتے ہیں، ہندی میں بھگوان کہتے ہیں انگریزی میں گوڈ کہتے ہیں۔ بات تو ایک ہے۔

بلبیر کرشن سیٹھی جامعہ
بیک دوسرا سال

میں نے ایک دن کا مدرسہ دیکھا

چھوٹے چھوٹے بچے اِدھر اُدھر ربن کے پھول لگائے گھوم رہے تھے۔ وہ ایک دم ہماری طرف بھاگے بھاگے آئے کہنے لگے "آپ مدرسہ دیکھیں گے کیا؟" ننھے ننھے وہ پھول ہمارے چاروں طرف گھر گئے جن سے پیار کی خوشبو آ رہی تھی۔ ہم ایک دم بول اٹھے "ہاں ہاں ضرور! ہم یہی تو دیکھنے آئے ہیں" "تو چلیے" بچے بولے، جیسے اُن کی تمنا پوری ہو گئی ہو۔ ہم اُن کے ساتھ چل پڑے۔ ہم نے سامنے نوٹس بورڈ پر دیکھا وہاں ایک شعر لکھا تھا۔

تعلیم دے رہے ہیں تعلیم پانے والے
پکنک منا رہے ہیں ہم کو پڑھانے والے

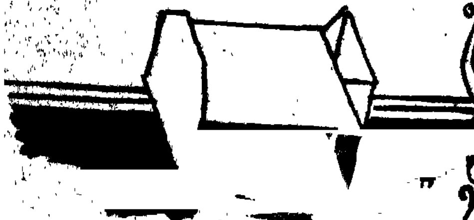
شعر بچوں کا ہی لکھا ہوا تھا۔ وہ ہم کو کلاسوں میں لے گئے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اپنے برابر کے بچوں کو پڑھا رہے تھے اور اتنے پیار سے جتنا شاید ان کے استاد بھی نہ پڑھاتے ہوں گے۔ دل چاہتا ہم بھی اُس کلاس میں بیٹھ جائیں۔ پر ابھی ہم کو اور بھی چیزیں دیکھنی تھیں۔ بس ہمارے باہر نکلتے ہی وہ ہمیں لے چلے بورڈنگ کی طرف۔ تینوں بورڈنگ بہت سجے ہوئے تھے۔ صاف بچوں کی طرح صاف اور اُجلے کمرے۔ ننھے ننھے ہاتھوں سے بنائے ہوئے پھول پتیوں سے سجے ہوئے تھے۔

بچوں کی دوکان، بینک دیکھ کر ایسا لگتا
جیسے یہ سچ مچ دکاندار اور آفیسر ہوں۔ اس
چھوٹے سے مدرسے کو دیکھ کر ایسا لگتا جیسے پوری
دنیا چھوٹی ہو کر آگئی ہو۔ [illegible]
بات تھی۔ پھر ہم ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس گئے
یہ ہیڈ ماسٹر [illegible]
کلاس کے لڑکے۔ ایک دن کے [illegible]
نے ان سے ایک دن [illegible]
کچھ سوال پوچھے [illegible]
جواب دیے جیسے ایک بڑا آدمی دیتا ہے۔
انھوں نے بتایا کہ ہمارے بچوں کی ایک حکومت
ہوتی ہے وہ سال میں ایک دن کے لیے اسکول
کا پورا کام اپنے ذمے لیتی ہے۔ ہم اس دن کو
اتنی ہی خوشی سے مناتے ہیں جتنا [illegible]
ہم اسے "ایک دن کی حکومت" یا "ایک دن کا
مدرسہ" کہتے ہیں۔

یہ ایک دن کا مدرسہ مدرسہ ابتدائی
جامعہ میں ہوا تھا۔

اوشا کنیال جامعہ
بیسک دوسرا سال

جناب اقبال مہدی



گڑیا کی مسہری

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ مسہری کسے کہتے ہیں۔

یہ ایک لمبا چوڑا، اونچا سا پلنگ ہوتا ہے جس کے سرہانے کی طرف، اور کبھی سرہانے اور پائنتی دونوں طرف، لکڑی کے خوب صورت تختے لگے ہوتے ہیں جن کو "تکیہ" کہتے ہیں۔

کچھ مسہریوں میں چھپر کھٹ یا مچھر دانی کے ڈنڈے لگانے کے لیے چاروں پاؤں کے اوپر لوہے یا کسی اور دھات کے نلکے بھی جڑے ہوتے ہیں۔

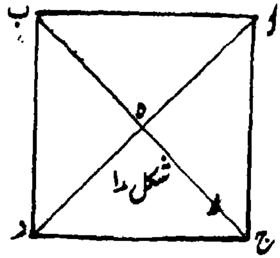
مسہریوں پر سونے کا رواج بہت پرانا ہے۔ یہ عام طور پر نفیس اور مضبوط قسم کی لکڑی سے بنائی جاتی ہیں۔ اب لوہے کی بھی بننے لگی ہیں۔ مجھے صرف کاغذ کی مسہری بنانی آتی ہے۔

"کاغذ کی مسہری" صرف دیکھنے بھر کی ہوتی ہے۔ اس پر کوئی سو نہیں سکتا، نہ لیٹ سکتا ہے، نہ بیٹھ سکتا ہے۔ ہاں! چھوٹی سی، نازک سی، ہلکی پھلکی کوئی گڑیا ہو، جو نہ کچھ کھائے نہ پیے، صرف گڑیا والی کی محبت پر جیے۔ جس کا وزن پھولوں کی مہک اور چاند کی پھوار سے زیادہ نہ ہو، تو یہ مسہری اس کے کام آسکتی ہے۔

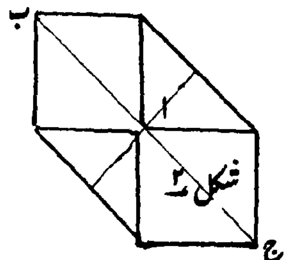
اگر آپ کے پاس ایسی گڑیا ہے تو اس کے لیے یہ مسہری ضرور بنایئے۔

اگر آپ کے پاس ایسی گڑیا نہیں ہے تو "خیالی گڑیا" کے لیے "کاغذی مسہری" بنانے میں بھی حرج کیا ہے؟ آپ تھک جائیں، یا اکتا جائیں، تو آپ کی ایک پھونک میں دونوں اڑ جائیں گے۔ باقی رہ جائے گا وہ ہنر جو آپ نے سیکھ لیا ہے۔ یعنی کاغذ کے کسی بھی ٹکڑے کو تہہ کرکے "گڑیا کی مسہری" بنانا۔

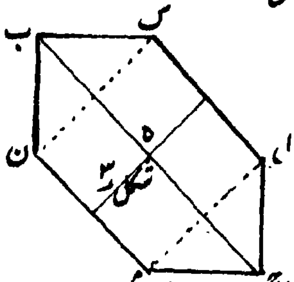
یہ مسہری بنانے کے لیے۔



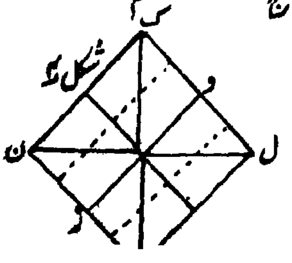
عمل نمبر۱۔ ایک مربع کاغذ لیجیے۔ اس کے دونوں وتروں پر شکن ڈالیے۔ (شکل ۱)



عمل نمبر۲۔ شکل ۱ کے کونہ ا اور کونہ د کو نقطہ ہ پر ملایئے۔ (شکل ۲) موڑ کو دبا کر بٹھا دیجیے۔



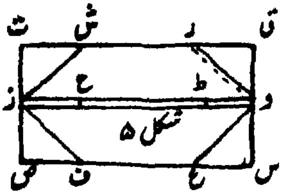
عمل نمبر۳۔ کاغذ کو پلٹ کر نیچے کی سطح اوپر لے آیئے (شکل ۳) شکل ۳ کے کونہ ب اور کونہ ج کو بھی نقطہ ہ پر ملایئے اور موڑ ک ن اور موڑ ل م کو دبا کر بٹھا دیجیے۔ کاغذ شکل ۴ کی طرح تہہ ہو جائے گا۔



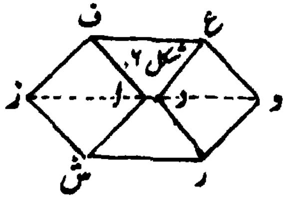
عمل نمبر۴۔ شکل ۴ کے کنارے ک ن کو مرکزی خط و ز سے ملا کر نقطہ دار خط پر موڑیے۔ موڑ کو دبا دیجیے۔

اسی طرح کنارہ ل م کو بھی مرکزی خط و ز سے ملا کر نقطہ دار خط پر موڑیے۔ موڑ کو دبا دیجیے۔

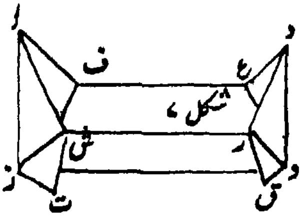
اب کاغذ شکل نمبر ۵ کی طرح تہہ کیا ہوا آپ کے سامنے ہوگا۔



عمل نمبر ۵۔ شکل ۵ کے کونے ق کو نقطہ دار خط دو پر موڑ کر نقطہ ط سے ملا دیجیے۔
کونہ س کو بھی خط دع پر موڑ کر نقطہ ط سے ملا دیجیے۔
اسی طرح کونہ ت اور کونہ ص کو بھی خط ش ز اور خط زف پر موڑ کر نقطہ ح سے ملا دیجیے۔



عمل نمبر ۶۔ کاغذ کو پلٹ کر نیچے کی سطح اوپر لے آئیے۔ اب کاغذ شکل ۶ کی طرح تہہ کیا ہوا آپ کے سامنے ہوگا۔ اس کاغذ کے اوپر کے کنارے ع ف کو مرکزی نقطہ دار خط دز پر موڑ کر نچلے کنارے رش سے ملا دیجیے۔ موڑ دز کو اچھی طرح دبا کر شکن ڈالیے اور کاغذ کو پھر شکل ۶ کی طرح ہی کھول کر رکھ دیجیے۔

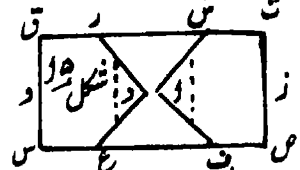


عمل نمبر ۷۔ اب شکل ۶ کی پرت دا اور پرت اکو اس طرح اوپر اٹھائیے کہ کنارہ ع ف کنارہ رش کے قریب آئے۔ اور کاغذ شکل ۷ کی طرح کھل جائے۔ یہ گڑیا کی مسہری ہے۔
شکل ۵ کے کونے ق، ت، س اور ص، عمل نمبر ۵ اور نمبر ۶ کی وجہ سے نیچے کو مڑ کر مسہری کے پائے بن گئے ہیں۔

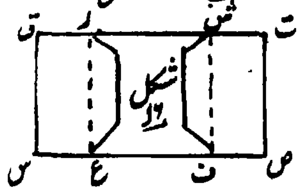
یہ مسہری خوب صورت اور نئی وضع کی ہے۔ اس میں لیٹی ہوئی گڑیا بہت اچھی دکھائی دے گی۔ اگر آپ کی گڑیا کی اس شاندار مسہری کو دیکھ کر کوئی جل جائے اور اس میں عیب نکالے کہ یہ "مسہری" تو ڈھیلی ہے۔ اس جھولا مسہری میں تو گڑیا کو نیند بھی نہ آسکے گی۔ تو آپ دل تھوڑا نہ کیجیے۔ کس کی گڑیا

واقعی سوتی یا جاگتی ہے؛

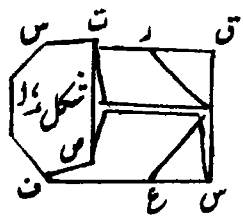
اگر آپ "کسی ہوئی" مسہری ہی بنانا چاہتے ہیں تو دوسرا کاغذ لے کر عمل نمبر ۱ تا ۴ دُہرا کر اسے شکل ۵ کی طرح تہہ کر لیجیے اور اس کو پلٹ کر نیچے کی سطح اوپر لے آیئے۔ اب کاغذ شکل ۵/۱ کی طرح آپ کے سامنے ہوگا۔



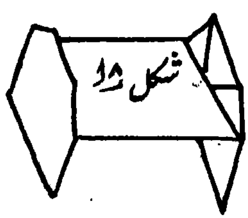
عمل نمبر ۵/۱: شکل ۵/۱ کی پرت ا اور د کو نقطہ دار پر اندر کی طرف اِس طرح موڑیے کہ کونہ ا اور کونہ د شکل ۶/۱ کے نقطہ دار خط ش ف اور ر ع سے آگے بڑھ جائیں۔



عمل نمبر ۶/۱: شکل ۶/۱ میں کنارہ ت ص کو نقطہ دار خط ش ف پر پیچھے کی طرف اِس طرح موڑیے کہ پرت ا کا باقی ماندہ حصّہ اُس کے ساتھ نہ مڑے۔



شکل ۷/۱ میں اِس موڑ کو سمجھایا گیا ہے۔ اسی طرح شکل ۶/۱ میں پرت د کے باقی ماندہ حصّہ کو سیدھا رکھتے ہوئے، کنارہ ق س کو نقطہ دار خط ر ع پر پیچھے کی طرف موڑیے۔



اب کاغذ شکل ۸/۱ کی طرح ہو جائے گا۔

یہ گڑیا کی "کسی ہوئی" مسہری ہے۔ جتنی لمبی ہے اتنی ہی چوڑی ہے۔ تاکہ گڑیا خوب مزے سے لوٹ لگا سکے۔

صحافی

ادھر اُدھر سے



سمندر پر سین کی فتح

اچھا بتائیے آپ کو تیرنا بھی آتا ہے۔ یقین کیجیے بڑا دلچسپ مشغلہ ہے۔ بہت مفید ورزش ہے۔ سمندروں اور دریاؤں کے کنارے رہنے والے تو قریب قریب سبھی لوگ تیرنا جانتے ہیں۔ ہمارا بنگال کا صوبہ تو دریاؤں، ندیوں اور تالابوں کا دیس ہے۔ یوں سمجھیے کہ یہاں کے دیہاتوں کا بچّہ بچّہ تیراک ہوتا ہے۔

ہمارے بیرسٹر مہر سین اسی بنگال کے رہنے والے ہیں۔ دنیا کے مشہور تیراکوں میں ان کا شمار ہے۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے انگلش چینل کو پار کیا تھا اور چوتھے نمبر پر آئے تھے۔

پچھلے مہینے (اپریل ۶۶ء) مہر سین نے ایک اور کارنامہ انجام دیا۔ ہندوستان اور لنکا کے درمیان سمندر کا جو حصّہ ہے اسے آبنائے پاک کہتے ہیں۔ اس کی کم سے کم چوڑائی ۲۰ میل ہے۔ سمندر کا یہ حصّہ بڑا خطرناک ہے، اس میں مگرمچھوں، زہریلے سانپوں، آدمی پر حملہ کرنے والے شارکوں کی کثرت ہے۔ پر مہر سین نے ان خطروں کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ ۶ اپریل ۶۶ء کی صبح کو اس سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ ۲۵ گھنٹے لگاتار تیرتے رہے اور آخر ہندوستان

کے کنارے پر آکر دم لیا۔ ان کے اس کارنامے پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

لونا ۱۰

لونا ۹ کی کامیابی کے چرچے ابھی جاری تھے کہ روسی سائنس والوں نے ایک اور بہت بڑا کارنامہ انجام دے دیا۔ ساری دنیا میں اس کارنامے کی دھوم مچی ہوئی ہے۔

اتوار (۳ اپریل) کی رات کے ۹ بج کر چوالیس منٹ (ماسکو ٹائم) پر لونا ۱۰ چاند کا ذیلی سیارہ بن گیا۔ یعنی چاند کا چاند بن گیا۔ اور اب یہ چاند کے چاروں طرف چکر پہ چکر لگا رہا ہے۔ چاند سے اس کا کم سے کم فاصلہ ۳۵۰ کلومیٹر زیادہ سے زیادہ فاصلہ ... اکلومیٹر ہے۔

اس اسپوتنک یا سیارہ ۱۰ میں ایسے سائنسی آلے لگائے گئے ہیں جن کے ذریعے وہ چاند کے آس پاس کی فضا یا خلا کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا اور یہ معلومات ٹیلی میٹرک نظام کے ذریعے زمین پر بھیجے گا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات سنیے۔

سوویت کمیونسٹ پارٹی کا ماسکو میں اجلاس ہو رہا تھا۔ تمام ڈیلی گیٹ احترام کے طور پر اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ لونا ۱۰ سے ریکارڈ کیا ہوا انٹرنیشنل ترانہ نشر ہو رہا تھا اور اسے اجلاس کے ہال میں ریلے کیا جا رہا تھا۔

نو سو مسافروں والا ہوائی جہاز

پچھمی برلن کے ایک انجینیر ہانس ٹوئے لس ریپلن قسم کا ایک ایسا ہوائی جہاز تیار کرنے کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں جس کی شکل سگار جیسی ہوگی۔ اس میں نو سو مسافروں اور ۱۳۰ ٹن سامان کی گنجائش ہوگی۔ یہ ہوائی جہاز ۳۰اکلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑان کرے گا۔ جرمنی سے تین دن چھ گھنٹے میں یہ نیویارک پہنچ جائے گا۔ اس میں مسافروں کے ہر طرح کے آرام کا پورا پورا لحاظ کیا جائے گا۔ جہاز کی لمبائی ۵۱۰ میٹر۔ چوڑائی ۸۵ میٹر اور اونچائی ۱۱۳ میٹر ہوگی۔ اس کی لاگت کا اندازہ بیس کروڑ جرمن مارک لگایا گیا ہے۔

نئی نئی ترکیبیں

آج کل امتحان کا موسم ہے۔ محنت سے جی چرانے والے بھائیوں کو اپنی کامیابی کے لیے

امتحان ہال میں کیا کیا ترکیبیں کرنی پڑتی ہیں، بہت سے پیاپی جانتے ہوں گے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ خبر سُنیئے۔

فرانس میں کسی جگہ امتحان ہو رہا تھا۔ ایک صاحبزادے بار بار اپنے پِل اوور پر منہ رکھ کر کچھ بڑبڑاتے تھے۔ امتحان کے نگراں کی ان پر نظر پڑ گئی۔ امتحان ہال سے کچھ دور ایک صاحب ایک بکس میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ تحقیق سے پتہ لگا کہ صاحبزادے ایک آلہ لگائے ہوئے تھے اور اس کے ذریعے اپنے والد صاحب سے بات چیت کا سلسلہ جاری تھا۔ صاحبزادے سوال بتاتے تھے اور ابا جان جواب لکھوا دیتے تھے۔ آخر دونوں گرفتار کر لیے گئے۔

ذاکر، اندرا کا مقابلہ

پچھلے مہینے (۹ر اپریل) دہلی میں کرکٹ کا ایک شاندار میچ ہوا۔ دونوں ٹیموں میں پارلیمنٹ کے ممبر تھے ایک ٹیم کے کیپٹن ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریۂ ہند دوسری کی وزیر اعظم اندرا گاندھی تھیں۔

یہ مقابلہ دہلی کے نیشنل اسٹیڈیم میں ہوا۔

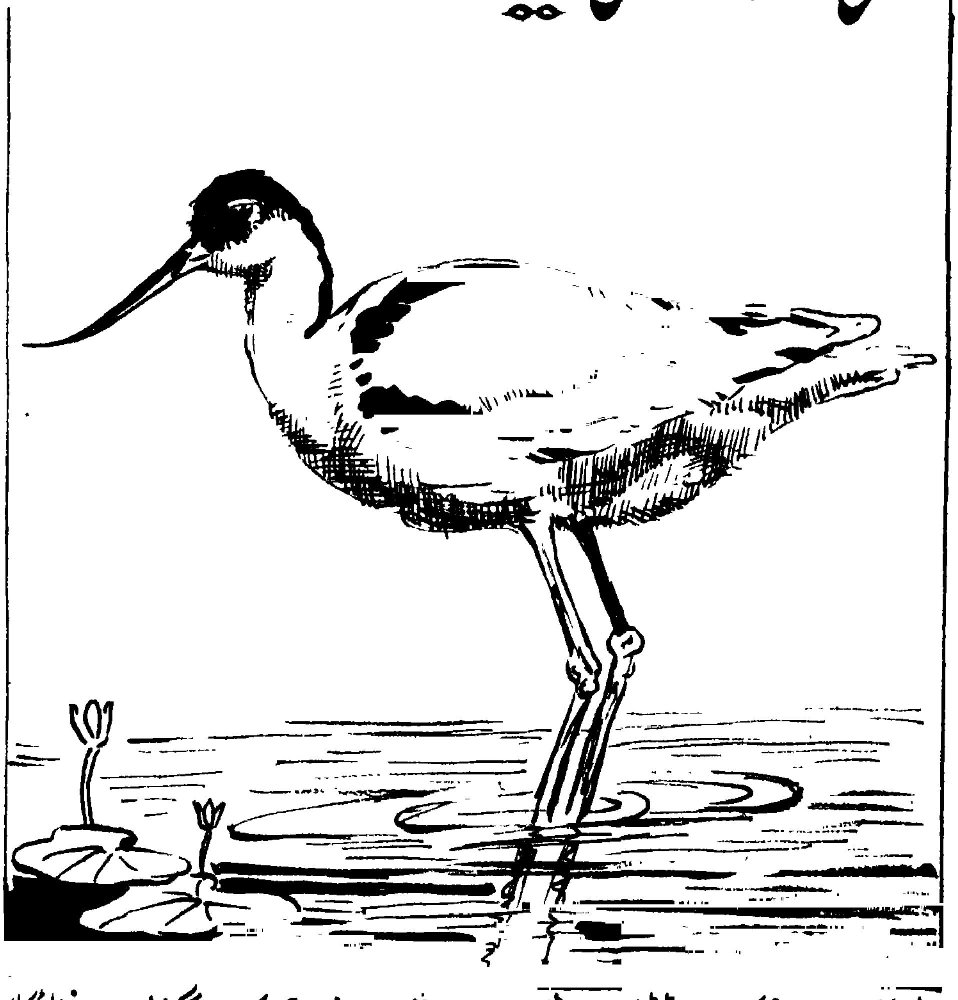
مزے کی بات یہ کہ وزیر اعظم کی ٹیم میں بارہ اور نائب صدر کی ٹیم میں گیارہ آدمی تھے۔ دلچسپ مقابلہ تھا اور یہ دلچسپی آخر تک قائم رہی۔ اسٹیڈیم میں ہزاروں تماشائی تھے اور خوب تالیاں بج رہی تھیں۔ نائب صدر کی ٹیم ہار گئی۔ اندرا گاندھی کی جیت گئی۔

پر اس کا ایک نتیجہ اور بھی نکلا۔ بہت خوشگوار ٹکٹوں کی آمدنی سے اور چندوں سے لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ روپیے جمع ہو گئے۔ جواہر لال نہرو انسٹی ٹیوٹ کے نام سے معذور اور اپاہج بچوں کا ایک ادارہ ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے لیے کوئی مستقل عمارت نہیں تھی۔ بچوں کو بہت تکلیف تھی۔ یہ کھیل اسی انسٹی ٹیوٹ کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے کھیلا گیا تھا۔

کھیل کے بعد وہ دونوں بیٹ بھی نیلام ہو گئے جن پر اندرا گاندھی اور نائب صدر کے دستخط تھے اور وہ قلم بھی جن سے یہ دستخط کیے گئے تھے۔

★

رنگ بھریے



(پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا)

بچوّں کے لئے دلچسپ معلوماتی کتابیں

● **بڑدادا کی کہانی** اِس کتاب میں چار دلچسپ معلوماتی کہانیاں ہیں جن میں ہندوستان کی برسہابرس پُرانی کہانی "بڑ" کے ایک بوڑھے درخت سے کہلوائی گئی ہے۔ قیمت: ۵۶ پیسے

● **سونے کی چڑیا** اِس معلوماتی کتاب میں مغلیہ عہد کے ہندوستانی تمدن کی ایک رنگین جھلک نظر آئے گی جس کو بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں کا ہاتھ رہا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ

● **سمندر کے کنارے** اِس کتاب میں سمندر کے کنارے رہنے والی مخلوق اور طرح طرح کے عجیب جانوروں کی کہانیاں ہیں۔ خوب صورت ٹائیٹل۔ رنگ برنگی تصاویر۔ قیمت: ایک روپیہ ۱۲ پیسے

● **آدمی کی کہانی** اب سے ہزاروں برس پہلے آج جیسی نہ آدمی کی صورت تھی اور نہ آج جیسا رہن سہن یہ سب درجہ بدرجہ کس طرح ہوا اِس کی کہانی اِس کتاب میں پڑھیے۔ قیمت۔ ایک روپیہ ۲۵ پیسے

● **انوکھا عجائب خانہ** اس کتاب میں چھوٹی موٹی روزمرہ کی چیزوں کے بارے میں سوال قائم کرکے ان کے جواب دئے گئے ہیں۔ سوال وجواب کا انداز بے حد مزیدار اور دلچسپ ہے۔ قیمت:—

حصہ اوّل	دوم	سوم	چہارم
۵ پیسے	۳۰ پیسے	۴۰ پیسے	۵۰ پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی

May, 1966. Regd. No. D. 1457.

Payam-i-Taleem
New Delhi-25.





رخشندہ مومن عمر ۲½ سال

فوٹو: شاہد علی خاں

ریاست جموں و کشمیر میں تمام تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ



پیام تعلیم
دہلی

جلد ۳ — جون ۱۹۶۶ء — شمارہ ۶

ایڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی

آرٹسٹ گلیڈون میس

سالانہ چندہ: — پانچ روپے

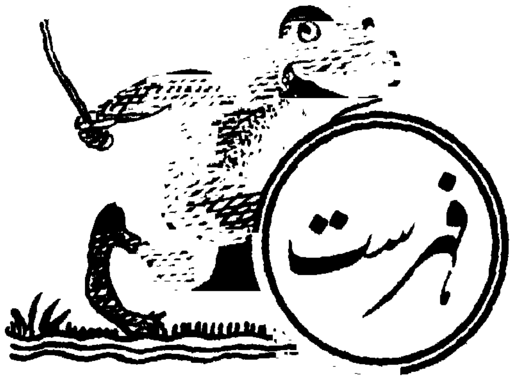
فی پرچہ: — پچاس پیسے

بمبئی آفس:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، جے جے ہسپتال بمبئی

مرکزی دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

سرورق: فرخ عرفانی

فوٹو: شاہد علی خاں





بچوں سے باتیں

لیجیے صاحب دیکھتے دیکھتے پورا سال گزر گیا۔ امتحان ختم ہوگئے۔ نتیجہ بھی سنا دیا گیا۔ جن بچوں نے سال بھر جی لگا کر پڑھا تھا، کھیل کے وقت کھیلے تھے، پڑھائی کے وقت پوری توجہ سے محنت کی تھی وہ سب پاس ہو گئے۔ یہ سب خوب خوشیاں منا رہے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہنس کھیل رہے ہیں۔ چہلیں کر رہے ہیں۔ ہم بھی ان کی خوشی میں شریک ہیں۔ انھیں دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ خدا کرے انھیں آئندہ بھی ایسی ہی کامیابیاں نصیب ہوں۔

اس خوشی میں ہم آپ کی خدمت میں ایک نظم پیش کرتے ہیں۔ یہ ہمارے پرانے ساتھی نیّر صاحب کی نظم ہے۔ کیسی پیاری نظم ہے! ایسا لگتا ہے جیسے نیّر صاحب کو اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آگیا ہے اور انھوں نے اپنے اوپر وہی کیفیت طاری کر لی ہے۔

ہماری جامعہ میں تو ۱۵ مئی سے چھٹیاں ہوگئیں۔ آپ بھی چھٹیاں منا رہے ہوں گے۔ جن پیامیوں کو خدا نے توفیق دی ہے شوق بھی دیا ہے انھوں نے پہاڑوں کی اور ان دیکھی جگہوں کی سیر کا پروگرام بنایا ہوگا۔ کچھ پیامی دوسرے شہروں میں رہنے والے عزیزوں اور رشتہ داروں سے ملاقات کا لطف اٹھا رہے ہوں گے۔

پر بہت سے ایسے بھی تو ہوں گے جو اپنی چھٹیاں گھر پر گزاریں گے۔ آخر وہ یہ دو مہینے کیسے

گزاریں گے۔ تو کبھی بہت سے دوست اور ساتھی ایک ساتھ مل کر تفریحی پروگرام بنایئے اور نیر صاحب کے ارشاد کے مطابق یہ چھٹیاں ہنسی خوشی گزاریے۔

آپ نے برکت صاحب کا مضمون تو پڑھا ہے خوب دھیان سے پڑھا ہے۔ ان چھٹیوں میں آپ ان کے مشورے کے مطابق کچھ تجربہ کر ڈالیں تو کیا اچھا ہو۔ اپنے تفریحی پروگرام میں تھوڑا سا وقت اس کے لیے بھی نکالیے۔ اس زمانے میں اگر آپ اپنے محلے کا یا کم سے کم اپنی گلی کا سروے کر ڈالیں یعنی یہ معلوم کریں کہ محلے میں کتنے ان پڑھ لوگ ہیں۔ ان پڑھ لوگوں میں کتنوں کو پڑھنے کی خواہش ہے۔ کتنوں کو رغبت دلانا ہوگی۔ اور رغبت دلانے کی کیا صورتیں ہوں گی۔ ان چھٹیوں میں آپ اتنا ہی کام کرلیں تو بڑی بات ہے۔ یہ بہت اچھا کام ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کے بڑے بھی اس کام میں ہاتھ بٹائیں گے۔ آپ کی ہمت بڑھائیں گے۔

اور ہاں صاحب ایک کام اور ہے۔ جو آپ سمجھیں تو یہ بھی بہت بڑا کام ہے۔ یہ تو آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا پیام تعلیم ترقی کر رہا ہے تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہمارے جنرل منیجر محترم تاباں صاحب، ہمارے ساتھی شاہد علی خاں صاحب، سید احمد ولی صاحب، مجیب احمد خاں صاحب، ہمارے عزیز دوست میں خالد عرفان صاحب، وقار خلیل صاحب اور تقریباً سبھی مضمون نگار پرچے کو آگے بڑھانے میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں۔ اور اب ضرورت ہے کہ آپ بھی ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ اپنے پرچے کو ساتھیوں میں مقبول بنائیں۔ اس کے خریدار بنائیں۔ اگر آپ کے شہر یا قصبے میں پیام تعلیم کی ایجنسی نہیں ہے تو ایجنسی قائم کروا دیجیے۔ یاد رکھیے اگر آپ نے ایک ایک دو دو خریدار بنا دیے تو آپ کے رسالے کی بڑی مدد ہو جائے گی۔ اور اس امداد میں حصہ لینے والوں کے نام ہم بڑی خوشی سے پیام تعلیم میں شائع کریں گے۔

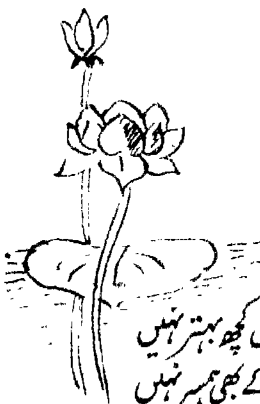
پیامیوں نے اپنے رسالے کو مقبول بنانے کے لیے بہت سی تجویزیں ہمارے پاس بھیجی ہیں۔ قریب قریب سبھی بہت اچھی ہیں۔ ان میں دو قلمی دوستی اور آدھی ملاقات پر تو ہم اگلے پرچے سے عمل کرنا چاہتے ہیں۔ قلمی دوستی کے

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

جناب برق بہاری



علم کی شان



راہِ حق میں علم سا رہبر نہیں ۔۔۔ علم سے دُنیا میں کچھ بہتر نہیں
علم سے ہم اشرف المخلوق ہیں ۔۔۔ ورنہ حیوانوں کے بھی ہمسر نہیں
نیک و بد کے جانچنے کے واسطے ۔۔۔ اس کسوٹی سے کوئی بڑھ کر نہیں
گنجِ قاروں اس کے آگے ہیچ ہے ۔۔۔ خوب تر اس کیمیا سے زر نہیں
خرچ سے بڑھتا ہے یہ وہ مال ہے ۔۔۔ دُزد لے جائیں اسے یہ ڈر نہیں
چاہیے کوشش حصولِ علم میں ۔۔۔ گو ہمیں ہونا کہیں نوکر نہیں
علم کی حاجت ہے ہر اک کام میں ۔۔۔ نوکری کرتے ہیں سب پڑھ کر نہیں

علم سے ہی آدمی ہے آدمی
جانور ہے جس میں یہ جوہر نہیں

؎ چور



قربان میاں کے کارنامے

تایا جان یوسف ناظم

اپریل کے پیام تعلیم میں روتری کلب کے عنوان سے ایک بہت ہی دلچسپ مضمون چھپا تھا۔ آپ نے اسے بہت دلچسپی سے پڑھا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس روتری کلب کے ہیرو یہی قربان میاں تھے۔ آپ کے تایا یوسف ناظم صاحب نے ان کے کچھ اور کارنامے لکھ کر بھیجے ہیں۔ یہ مضمون مئی میں چھپنا چاہیے تھا پر یہ اس وقت ملا جب مئی کا پرچہ پریس میں جا چکا تھا۔ اگلے پرچے میں قربان میاں کا ایک اور کارنامہ پڑھیے گا بہت ہی دلچسپ۔

۔ایڈیٹر

قربان میاں کو آتا جاتا تو کچھ ہے نہیں لیکن شوق ہر کام کرنے کا ہے۔ ادھر جس کام میں قربان میاں کا ہاتھ لگ جائے یوں سمجھو کہ اس کی بس خیریت ہی خیریت۔ گھر میں ہر شخص بس یہی دعا مانگتا ہے کہ خدا کرے قربان میاں کہیں کوئی کام کرنے تیار نہ ہو جائیں۔

گھر کی صفائی ہو رہی ہو اور قربان میاں اس کام میں ہاتھ بٹانے لگیں تو گھر صاف ستھرا

ہوتا تو دور کی بات محلّہ کا کوڑا کرکٹ بھی گھر کے اندر آجائے تو کوئی عجب نہیں۔ پکنک کا پروگرام بنے اور قربان میاں اپنے ذمّہ کوئی چھوٹا موٹا کام لے لیں تو بس ہوگئی پک نک! نہ جانے ان کے ہاتھوں میں کیا خوبی ہے کہ بنتا کام بگڑ جاتا ہے۔

امی کئی دن سے کہہ رہی تھیں سارے گھر میں بوتلیں اور شیشیاں اور ڈبّے بکھرے پڑے ہیں کسی کو فکر نہیں کہ انھیں بیچ آئے۔ ہر کوئی سنتا ہے اور ٹال جاتا ہے۔ چچا میاں کو اپنی فوٹوگرافی سے فرصت نہیں۔ دن بھر ایک سیاہ پردے کے پیچھے چھپے ہوئے خدا معلوم کیا کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کھینچی ہوئی تصویریں نہ تو کسی اخبار میں چھپیں نہ کسی رسالے میں۔ دعویٰ ان کو یہ تھا کہ ان کے جیسا فوٹوگرافر پورے شہر میں دوسرا نہیں ـــــ رہے بڑے بھیا تو وہ ایسے حقیر کام کو بھلا کیسے ہاتھ لگاتے اور اس وقت تو وہ قانون کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ ان سے کوئی کچھ کہتا بھی تو قانونی بحث چھڑ جاتی۔

شاہد بھائی، کرکٹ کی مشق میں مصروف تھے۔ اور ہر چھٹی کے دن صبح ہی سے اپنے جوتوں پر سفیدی چڑھانے، پتلون پر استری کرنے اور کرکٹ کے بیٹ کا سنگھار کرنے میں جٹ جاتے۔

اختر بھائی، ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ جناب والا ہفتہ بھر اچھے خاصے رہتے۔ لیکن اتوار کے دن اور چھٹی کے دن ان کی طبیعت ہمیشہ بگڑ جاتی۔ ۱۰ بجے تک سوتے، اور جب اٹھتے تو ایسا ظاہر کرتے جیسے بڑی تکلیف میں ہیں۔ ہاتھ منہ دھوتے خوب جی لگا کر ناشتہ کرتے اور پھر فوراً بیمار ہو جاتے۔ اخبار، ناول یا کامک لے کر بستر پر دراز ہو جاتے۔ ہر چھٹی کے دن ان کی یہی مصروفیت رہتی۔ لے دے کے بس قربان میاں رہ گئے پر امی ان سے تو کام لینے سے رہیں۔

جس دن کا یہ قصہ ہے اس دن اتوار تھا اور صبح ہی سے امی کا پارا چڑھا ہوا تھا۔ وہ بس یہی کہہ رہی تھیں کہ گھر کباڑ خانہ بھی بن جائے تو کسی کو نظر نہ آئے گا۔ ہر شخص کو بس اپنی فکر ہے۔ یہی حال رہا تو سارے گھر میں ڈبّے شیشیاں، بوتلیں رہیں گی اور گھر والوں کو کہیں اور جا کر رہنا ہوگا۔ میں تو کہتی ہوں گھر کا چھوٹا موٹا کام کرنے کے لیے بھی اب مزدور اور حمّال بلوانے ہوں گے۔

چچا میاں نے یہ رنگ دیکھا تو بجائے ڈارک روم میں جانے کے انھوں نے اپنا کیمرہ

سنبھالا اور بغیر چائے پیے ہی رفوچکر ہو گئے۔ بڑے بھیا کو تو معلوم ہی تھا کہ ان سے کوئی کام نہیں لیا جا سکتا۔ شاہد بھائی نے فوراً اپنا سامان تیار کیا اور کرکٹ میچ کھیلنے نکل گئے۔ اختر بھائی نے کامک، تکیے کے نیچے چھپا دیا اور سوتے بن گئے۔

قربان میاں کو لیکن بہت جوش آگیا اور انھوں نے اعلان فرمایا "ارے امّی آپ کیوں بدمزہ ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ڈبے شیشیاں اور بوتلیں نہیں بیچ سکتا تو لائیے میں یہ کام کیے دیتا ہوں"۔۔۔ یہ سن کر امّی کو تقریباً غش سا آگیا بولیں "نہیں۔ نہیں تم رہنے دو۔ تم سے یہ کام نہ ہوگا۔ میں خود ہی، گلی میں کوئی آدمی بیچنے والا آئے گا تو نکال دوں گی۔"

پر اب قربان میاں طے کر چکے تھے کہ وہ یہ کام کر کے ہی دم لیں گے اور قربان میاں کسی کام کا ارادہ کر لیں تو ان کو روکنا، گھر میں ہنگامہ برپا کروانا ہے۔ امّی نے بھی سوچا چلو یوں ہی سہی شیشیاں اور ڈبے ہی تو ہیں دو چار آنے کم بھی آگئے تو کوئی حرج نہیں۔ امّی انجان ہو گئیں اور قربان میاں نے شیشیوں، بوتلوں اور ڈبوں پر حملہ بول دیا۔ گھر کے ہر کونے سے انھوں نے شیشیاں اور ڈبے جمع کیے۔ محلے کے ایک لڑکے کو پکڑا اور اس کی مدد سے سارے شیشیاں اور ڈبے دوپہر تک بیچ بھی آئے۔

کھانے کے وقت سے پہلے ہی قربان میاں نے امی کے ہاتھ میں تین روپیہ بیس پیسے لا کر رکھ دیے کہ "لیجیے آپ کے بے کار سامان کی قیمت"۔ امّی بھی اتنے پیسے دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ وہ تو سمجھتی تھیں کہ مشکل دو روپے کا سامان ہوگا۔ امّی نے قربان میاں کو خوب خوب شاباشی دی اور کہا "واہ بیٹے! تم تو بڑے ہوشیار ہو گئے"۔

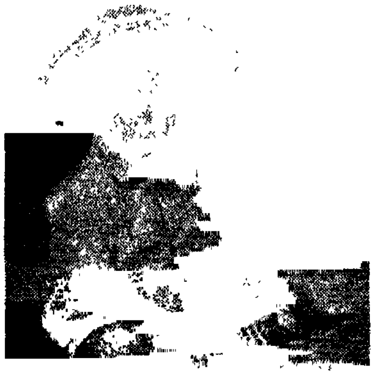
دوپہر کو دسترخوان پر سب لوگ جمع ہوئے تو امّی نے ابا سے کہا "آج قربان میاں نے کمال کر دیا۔ دو روپے کی شیشیاں اور ڈبے تین روپے بیس پیسے میں بیچے اور پھر کسی کی مدد کے بغیر۔ میں کہتی ہوں اس سے آگے چل کر یہ کام کروانا۔ اچھا بزنس مین بنے گا۔" ابا۔ بھیا اور باجی کو بھی حیرت ہوئی کہ قربان میاں اور

اتنے میں ابا میاں نے کہا ۔۔ بیٹا منّو۔ ذرا میرا گلقند کا ڈبّا تو لے آؤ ۔۔۔ منّو ابّا کے کمرے میں دوڑ کر گئی۔ لیکن خالی ہاتھ لوٹی ۔۔۔ ابّا وہاں

ننھے پیامی



ہد عمر ۴ سال



قیصر حسین زیدی عمر ۲ سال



طاعت بانو عمر ۵ سال



ریتا عمر ۷ سال



نوید وحید عمر ۳ سال



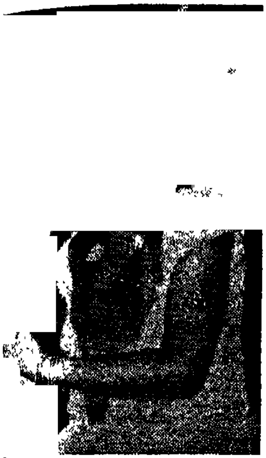
وسیمہ عمر ۶ سال



صہبا عمر ۶ سال



محمد راشد خاں عمر ۲½ سال



بے بی عمر ۶ سال



آصف زیدی عمر ۶ سال



عظمیٰ خلیل عمر ۳ سال

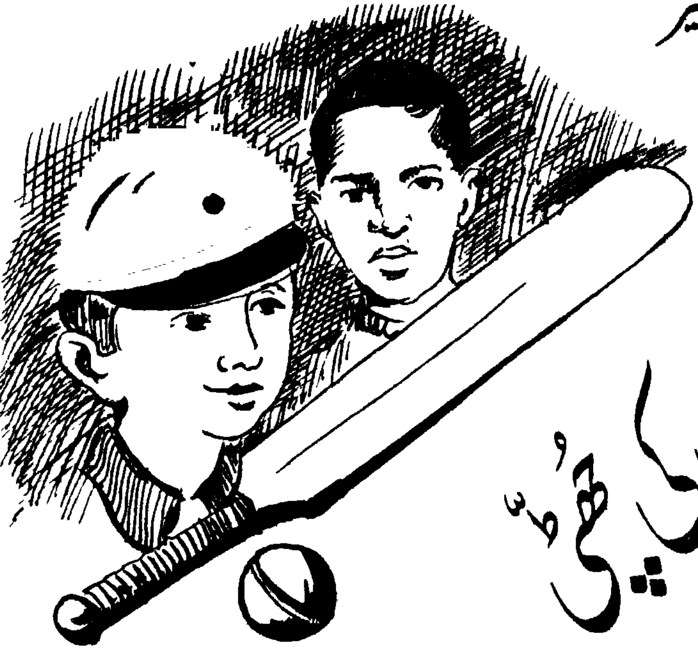
بے بی پروین۔ کلکتہ

تو ڈبا نہیں ملتا"۔۔۔ قربان میاں بولے "وہ نیلا ڈبا نا، وہ تو میں بیچ آیا"۔۔۔ اتنا سننا تھا کہ بڑے بھیا، چچا میاں، باجی، اختر بھائی سب اپنے اپنے کمروں کی طرف بھاگے۔ اور تھوڑی دیر بعد گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ تھا۔ بڑے بھیا کی بی وٹامن کی شیشی غائب تھی۔ چچا میاں کے فوٹوگرافی کے سامان میں سے دو ڈبے کم تھے۔ باجی کی ربنوں کا ڈبا اور پونڈز کریم کی بڑی شیشی نہیں ملتی تھی۔ اختر بھائی نے اپنے کمرے میں پٹرول کا ڈبا رکھ چھوڑا تھا اور اپنی اسکوٹر کے لیے وہ فاضل پٹرول اسی ڈبے میں رکھا کرتے تھے۔ اتفاق سے وہ ڈبا خالی تھا اور اب کہیں نظر نہ آتا تھا۔ باورچی خانے سے میٹھے تیل کی خالی شیشی بھی غائب تھی۔ قربان میاں گھر کے سارے ڈبے اور ساری شیشیاں تین روپے بیس پیسے میں بیچ آئے تھے۔

چندہ ہمیشہ منی آرڈر سے بھیجا کیجیے۔

منیجر

جناب محمد شفیع الدّین نیّر



چھٹیوں کی چھٹی

آہا ہا، چھٹی آئی چھٹی آئی چھٹی
او ہو ہو ہو، ہم نے پائی ہم نے پائی چھٹی

ختم ہوا اب کورس ہمارا، ہوئے مزے سے پاس
محنت سے کام اپنا کرنا، آیا ہم کو راس

چھٹی ہے بھئی چھٹی، آؤ لکھنا پڑھنا چھوڑیں
اسکول آنے جانے کی زنجیریں یارو! توڑیں

کیسی اردو، کیسی ہندی، کیسا علم ریاضی
آؤ آؤ جم جائے شطرنج کی بس اب بازی

سائنس اور ڈرائنگ سے بھی اب چھٹکارا پائیں
میٹھے میٹھے گیت سہانے آؤ مل کر گائیں

آؤ الجبرے کی دم میں نمدا باندھیں بھائی
تاریخ اور جغرافیہ چھوڑیں، کھائیں دودھ ملائی

دودھ ملائی سنتے ہی منہ میں پانی بھر آیا
چھٹی کے تو نام ہی نے ہم سب کا خون بڑھایا

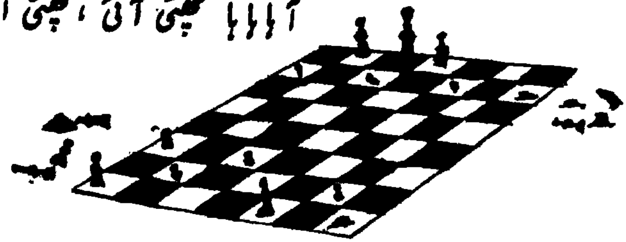
اب روزانہ کھیلیں گے ہم کرکٹ اور فٹ بال
کھا پی کر کُپّا کریں گے اپنے اپنے گال

سیر کریں گے آگرے جاکر دیکھیں گے ہم تاج
خوب مزے آئیں گے اب تو ہو گا کام نہ کاج

کھیلنے اور کھانے ہی سے بس ہو گا ہم کو کام
کھیل کود میں ہو جائے گا روشن اپنا نام

ٹھیک کہا بدھو بھیا نے ہے تعلیم خراب
کھیلو کودو لطف اٹھاؤ بن جاؤ نواب

چھٹی میں پڑھنے کو کہے جو اُس سے اپنی کُٹی
آ ہا ہا ہا چھٹی آئی، چھٹی آئی، چھٹی



جناب مولانا مقبول احمد سیوہاروی

ابن بطوطہ

(۲)

بیت المقدس کے مکان عمدہ پتھر کے ہیں۔

یہ شہر حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے فتح کیا تھا۔ پھر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے فتح کیا۔

بیت المقدس کی سب سے مقدس اور متبرک عمارت قبۃ الصخرہ ہے۔ اس میں وہ پتھر ہے جس پر سے گزر کر سرکار دو جہاں محمدؐ رسول اللہ آسمانوں کی سیر کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اور خدا سے ہم کلام ہوئے تھے۔ اسی آسمانوں کی سیر کو معراج کہتے ہیں۔

قبہ کے اندر کا تمام فرش سنگ مرمر کا ہے۔ اور نہایت خوب صورت ہے۔ قبہ کے اندر اور باہر کا نقشہ اتنا خوش نما ہے کہ زبان و قلم اس کا حسن بیان کرنے سے عاجز ہیں۔

جس پتھر سے سرکار دو عالمؐ گزر کر تشریف لے گئے اس کی اونچائی آدمی کے قد کے برابر ہے۔ نیچے غار ہے جیسے چھوٹا حجرہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک ڈھال لٹکی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ڈھال سیدنا حمزہؓ بن عبدالمطلب کی ہے۔

شہر سے پورب کی طرف ایک جگہ ہے۔ مشہور ہے کہ اسی جگہ سے حضرت عیسیٰؑ آسمان پر اٹھائے گئے تھے۔

حضرت مریم کی قبر بھی یہیں ہے۔ ایک گرجا ہے جس کی عیسائی بہت تعظیم کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے گہوارے کی جگہ بھی یہیں ہے۔

بیت المقدس کے مشہور عالموں میں، علامہ شمس الدین محمد، صالح عماد الدین، نابلسی، شہاب الدین محدث طبری ہیں۔

صوفیوں میں ابو علی حسن مجوبؒ بہت مشہور ہیں۔
بیت المقدس سے عسقلان پہنچا۔ سارا شہر ویران ہے، کھنڈر اور ٹیکریوں کے نشانات ہیں۔ ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی یہ شہر کتنا شاندار اور آراستہ تھا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک اس عسقلان میں مدفون تھا جسے اب قاہرہ میں لے جاکر دفن کر دیا گیا ہے۔

مسجد حضرت عمرؓ

مسجد حضرت عمرؓ بھی اسی جگہ ہے۔ مسجد ٹوٹ گئی ہے۔ دیواریں اور ستون باقی ہیں۔ ستون سنگ مرمر کے نہایت صاف ترشے ہوئے ہیں۔

عسقلان میں ایک ستون عجیب ہے۔ مشہور ہے کہ یہ ستون عیسائی لے گئے تھے مگر خود بہ خود یہاں آگیا۔ یہ سرخ پتھر کا ستون ہے۔ مسجد حضرت عمرؓ کے پاس ایک کنواں بھی ہے۔ جسے ابراہیم والا کنواں کہتے ہیں۔

یہ ایک باولی ہے، جس میں اترنے کے لیے چوڑی چوڑی سیڑھیاں ہیں۔ باولی کے چاروں طرف مکانات ہیں۔ جن میں ہر طرف چشمے بہتے ہیں۔ چشموں کا پانی صاف اور شفاف ہے۔

عسقلان کے ویرانوں میں سیکڑوں شہیدوں اور بزرگوں کی قبریں ہیں۔ جنھیں ایک مجاور بتا دیتا ہے۔

عسقلان کے باہر ایک جگہ ہے، جسے وادیٔ نمل (چیونٹیوں کا ٹھکانا) کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔

آگے چلے تو شہر رَملہ آگیا جس میں مسجد کے قریب تین سو رسولوں کی قبریں بتائی جاتی ہیں۔ رملہ کا دوسرا نام فلسطین ہے۔

یہاں سے ہم نابلس گئے۔ نابلس بڑا بارونق دار شہر ہے۔ جدھر دیکھو ہریالی اور پھولوں پھلوں کے درخت نظر آتے ہیں۔ پانی کی نہریں رواں ہیں۔ زیتون کی خوب پیداوار ہے۔ دمشق اور شام کے شہروں میں زیتون یہیں سے جاتا ہے۔

نابلس میں ایک گھاس ہوتی ہے، جسے نچوڑ کر حلوا بنایا جاتا ہے۔ گھاس کا نام خروب ہے۔ پہلے اسے پکاتے ہیں پھر نچوڑ لیتے ہیں اور اس کے نچوڑے ہوئے شیرہ سے حلوا پکاتے ہیں۔

یہ شیرہ شام اور مصر میں بھی جاتا ہے۔ نابلس کا خربوزہ بھی نہایت لذیذ ہوتا ہے۔

نابلس کی جامع مسجد نہایت خوب صورت ہے۔ جس کے بیچ میں پانی کا حوض ہے۔

آگے چلے تو حضرت ابو عبیدہؓ کی قبر پر حاضر ہوئی۔ دو ٹیکریوں کے درمیان ایک میدان ہے۔ جسے وادی غور کہتے ہیں۔ یہاں خانقاہ بنی ہوئی ہے۔ جس میں مسافروں کے ٹھہرنے کا انتظام ہے اور کھانا بھی ملتا ہے۔

حضرت ابو عبیدہؓ

حضرت ابو عبیدہؓ کا پورا نام ابو عبیدہ ابن عامر الجراح ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انھیں امین الامتہ کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

اور جن دس بزرگوں کو رسول اللہؐ نے قطعی طور پر جنت میں داخل ہونے کی بشارت دی ہے ان میں حضرت ابو عبیدہؓ کا نام بھی ہے۔ دوسرے نو بزرگوں کے نام یہ ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت سعدؓ، حضرت سعیدؓ۔ حضرت طلحہؓ۔ حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہا۔

یہ تمام بزرگ رسول اللہؐ کے مشہور صحابی ہیں۔

ملک شام کی لڑائیوں میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں، مسلمان فوجوں کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہؓ رہے ہیں۔

معاذ بن جبلؓ

یہاں سے چل کر قصیر آتا ہے۔ جہاں حضرت معاذ بن جبلؓ کی قبر مبارک ہے۔ یہ بھی رسول اللہ کے صحابی ہیں اور شام کی لڑائیوں میں بڑی بہادری سے لڑے تھے۔

آگے چلے تو شہر عکہ ملا، جہاں حضرت صالح پیغمبر کی قبر ہے۔ قرآن پاک میں ان کا ذکر ہے۔

اس کے بعد سورا (T Y R E) کے کھنڈر تھے جس کے قلعوں کی مضبوطی ساری دنیا میں مشہور تھی۔ پھر طبریہ آیا۔ کسی زمانے میں بڑا بھاری شہر تھا۔ یہاں کے حمام دیکھنے کے لائق ہیں۔ ہر ایک حمام کے دو درجے ہیں ایک عورتوں کے لیے ایک مردوں کے لیے، پانی خوب گرم ملتا ہے۔

ایک مسجد ہے جسے ابنیاء مسجد کہتے ہیں۔ یہاں حضرت شعیبؑ اور ان کی دختر کی قبر ہے جن سے حضرت موسیٰ پیغمبر کی شادی ہوئی تھی۔ جب حضرت موسیٰؑ مصر سے چھپ کر آئے تھے

کنویں کے پاس کھڑی تھیں۔ کنویں پر بھیڑ بھی اور یہ عورت ذات اتنی ہمت نہ رکھتی تھیں کہ پانی بھریں۔ حضرت موسیٰؑ نے انھیں پانی بھر کر دیا۔ پھر جب یہ اپنے باپ حضرت شعیبؑ کے پاس گئیں تو حضرت موسیٰؑ کا ذکر کیا، اور حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ کو بلاکر انھیں تسلی دی اور اپنی لڑکی سے ان کی شادی کر دی۔

حضرت سلیمانؑ کی قبر بھی یہیں بتائی جاتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں یہودا اور راحیل کی قبریں بھی یہیں ہیں۔ شہر کے باہر وہ کنواں ہے جس میں حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے ڈال دیا تھا۔ اور پھر حضرت یوسفؑ مصر کے بادشاہ بنا دیئے گئے تھے۔ یہ پورا قصہ قرآن پاک میں ہے۔

یہ کنواں ایک چھوٹی سی مسجد کے صحن میں ہے۔ مسافروں کے ٹھہرنے کی خانقاہ بھی ہے کنویں میں برسات کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔ مجاور نے بتایا کہ کنویں میں سوت بھی جاری ہیں۔ جن سے پانی آتا رہتا ہے۔

یہاں سے بیروت گئے۔ بیروت کے تجارتی سامان میں میوے اور لوہا ہے۔

بیروت کی مسجد اور میوے کا بازار بہت خوش نما ہے اور بیروت کا میوہ مصر بھی جاتا ہے۔ آگے کرک یعقوب میں ابو یعقوبؒ کا مزار بھی دیکھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ابو یعقوبؒ یوسف مغرب کے ملک کے شاہی خاندان میں تھے۔ جہاں ان کا مقبرہ ہے۔ وہ لوزح کی سڑک کے نام سے مشہور ہے۔

ابو یعقوب یوسفؒ کی دلچسپ کہانی۔

کہتے ہیں کہ ابو یعقوب یوسف مصر آئے تو بیمار ہو گئے۔ بے چارے بازاروں میں پڑے رہتے تھے۔ اچھے ہوئے تو ملک نورالدین کے کسی باغ کے رکھوالے بنا دیئے گئے۔ چھ مہینے بعد میوے کا موسم آیا تو سلطان نورالدین اس باغ میں آیا۔ باغ کے داروغہ نے ابو یعقوبؒ سے کہا کہ سلطان کی خدمت میں نہایت عمدہ قسم کا انار پیش کرو۔ انار آیا تو کھٹا تھا۔ داروغہ نے جتنے انار منگائے کھٹے نکلے۔ اس پر داروغہ نے خفا ہو کر کہا "حیرت ہے تم چھ مہینے سے باغ کی رکھوالی کرتے ہو۔ مگر کھٹے میٹھے کی پہچان نہ ہوئی"۔ ابو یعقوبؒ نے نرمی سے جواب دیا۔ "مجھے باغ کی رکھوالی کے لیے مقرر کیا ہے نہ انار چکھنے کے لیے!! میں کیا جانوں میٹھا کون سا ہے اور کھٹا کون سا ہے؟"

داروغہ نے سلطان کے حضور میں اس واقعہ کا ذکر کیا تو سلطان نے ابو یعقوبؒ کو بلایا. خدا کی شان کہ بادشاہ نے خواب میں ابو یعقوبؒ کو دیکھا تھا، اور خواب میں کسی نے بادشاہ سے یہ بھی کہا تھا کہ ان سے تمھیں بہت فائدہ پہنچے گا. صورت دیکھتے ہی پہچان گیا، کھڑا ہوا بغل گیر ہوا اور اپنے ساتھ لے گیا اور ابو یعقوبؒ کی دعوت بادشاہ نے اپنی محنت کی کمائی سے کی، شاہی خزانے کا پیسہ خرچ نہ کیا.

ابو یعقوبؒ کچھ دن بادشاہ کے پاس رہے اور پھر چلے گئے اور دمشق کے ایک گاؤں میں کسی غریب کے ہاں ٹھہر گئے. غریب کی ایک لڑکی تھی جس کی شادی ہونے والی تھی. ابو یعقوبؒ نے لڑکی کے باپ سے کہا، تیرے پاس جس قدر تانبے کے برتن ہوں میرے پاس لے آ، اور پاس پڑوس سے جتنے برتن مل سکیں منگا لے. برتن آ گئے تو ابو یعقوبؒ نے انھیں آگ پر تپایا اور اپنے پاس سے اکسیر کی چٹکیاں ڈال دیں جس سے سب برتن خالص سونے کے بن گئے. پھر ان برتنوں کو کوٹھری میں بند کر کے تالا ڈال دیا اور سلطان نورالدین کو خط لکھا کہ اس سونے سے غریبوں کے لیے شفا خانہ بنا دیا جائے اور شفاخانے کے خرچ کے لیے وقف کیا جائے اور جن لوگوں سے برتن لیے گئے ہیں انھیں اتنی قیمت دیدی جائے جس سے یہ لوگ خوش ہو جائیں.

خط بھیج کر ابو یعقوبؒ گاؤں سے چلے گئے سلطان نورالدین خود گاؤں آیا ابو یعقوبؒ کو تلاش کرایا وہ نہ ملے تو تمام سونا لدوا کر مصر لے گیا. برتنوں کے مالکوں کو اتنی قیمت دیدی کہ وہ خوش ہو گئے.

مصر پہنچ کر ایک نہایت شاندار شفاخانہ بنایا جس کا نام شفا خانہ ابو یعقوبؒ ہے. اور دنیا میں اس جیسا شفا خانہ کوئی نہیں ہے.

بچوں سے باتیں (بقایا صکا)

سلسلے میں آپ اپنا نام اور عمر. خاص مشغلہ اور پورا پتہ لکھ بھیجیے. ہم پیام تعلیم میں شایع کر دیں گے.

اور ہاں دیکھیے اپنی پیدائش یا سالگرہ کی تاریخ تو ہمیں یہ رسالہ دیکھتے ہی فوراً لکھ بھیجیے یہ سلسلہ آپ کو سن کر خوشی ہوگی کہ بڑی کامیابی سے چل رہا ہے.

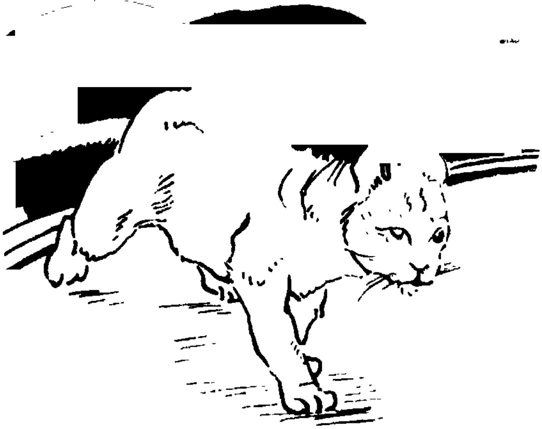
صبح کے نظارے

جناب سعادت نظیر

جاگا ہے بوٹا بوٹا۔ چٹکا ہے غنچہ غنچہ
چمکا ہے ذرّہ ذرّہ روشن ہے چپّہ چپّہ
سبزہ لہک رہا ہے، کلیاں مہک رہی ہیں
باغوں میں ڈالیوں پر چڑیاں چہک رہی ہیں
شبنم کا ہر چمن کو وہ آرسی دکھانا
پتّوں کا پھر خوشی سے وہ تالیاں بجانا
پھولوں میں مدھ بھری ہے کانٹوں میں تازگی ہے
ہر دل میں اک خوشی ہے، ہر سمت روشنی ہے
وادی، پہاڑ، جنگل، ہر ایک جگمگایا
دریا کو جوش آیا ساحل بھی گنگنایا
فطرت بہار پر ہے، دنیا نکھار پر ہے
ہر شے حسیں حسیں ہے رنگین ہر نظر ہے
سچ پوچھیے تو منظر کیسے ہیں پیارے پیارے
دیتے ہیں لطف کیا کیا یہ صبح کے نظارے

جناب اظہر افسر

منّو بلائی



یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ منّو بلائی کسے کہتے ہیں۔ جی ہاں پُسی، پسی پسی، مانو اور منّو بلائی پیار سے بلی بلّی کو کہا جاتا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں بلّی کو تقریباً سبھی بچوں نے پالا پوسا ہوگا۔ ہمارے دیس میں اکثر گھروں میں بلی کو پالا جاتا ہے، اور پھر نہ بھی پالا جائے تو وقت بے وقت یہ کہیں نہ کہیں سے ضرور آدھمکتی ہے۔ جس طرح ہم آپ اسے پیار کرتے ہیں، چاہتے ہیں، یہ بھی آدمیوں سے بہت محبت کرتی ہے۔ سدا پاس گھس کر بیٹھنا چاہتی ہے اور خرخر کرتی رہتی ہے، بعض وقت ہل جاتی ہے تو اسے اپنی جگہ سے اتنا پیار ہو جاتا ہے کہ یہ وہاں سے جانے کا نام نہیں لیتی۔ طرح طرح کے چکر دے کر اسے کہیں لے جا کر چھوڑ آیئے کچھ ہی دیر بعد وہ پھر سے آموجود ہوتی ہے۔

لوگ بیزار ہو کر تھیلوں میں بند کر کے اسے گھر سے کوسوں دور چھوڑ آتے ہیں مگر ابھی ڈیڑھ دو دن بھی گزرنے نہیں پاتے کہ جس میاؤں میاؤں کی آواز سے وہ بے فکر ہو چکے تھے پھر سے بڑے شکایتی لہجے میں سنائی دینے لگتی ہے اور گھر والے پھر نئے سرے سے اس میاؤں میاؤں سے چھٹکارا پانے کی ترکیبیں سوچنے لگتے ہیں۔ حالانکہ بے چاری بلّی جب بھی گھر کے اندر آتی ہے پہلے سب سے پوچھ لیتی ہے میں آؤں، میں آؤں، تب کہیں گھر کے اندر قدم رکھتی ہے۔

بلّی کی دو چیزیں بڑی خاص ہوتی ہیں۔ ایک آنکھیں اور دوسری اس کی مونچھیں، بلی کی آنکھیں

ہماری تمھاری طرح گول نہیں چوڑی ہوتی ہیں اور بلی جب چاہے اپنی آنکھوں کو پھیلا اور سکیڑ سکتی ہے، سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یہ اندھیرے میں بھی اپنی من بھاتی غذا چوہوں کا بڑی آسانی سے شکار کرتی ہے اور لوگ چوہوں کے کارنامے سے بچنے کی خاطر اسے بڑے شوق سے پالتے ہیں۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کی منّو کی مونچھیں، منّو کے لیے بڑا کام دیتی ہیں، ... منّو اپنی ان مونچھوں ہی سے اپنے راستے کا اندازہ کرتی ہے۔ اگر منّو کا سر اور مونچھیں کسی سوراخ یا جگہ سے گزر جاتی ہیں تو یہ سمجھ جاتی ہے کہ وہ خود بھی صحیح سالم اس راستے سے گزر جائے گی ورنہ نہیں۔

بلّی کی سب سے اچھی عادت یہ ہے کہ وہ سدا صاف ستھرا رہنا پسند کرتی ہے۔ ذرا ذرا سی دیر بعد وہ اپنا منہ صاف کرتی رہتی ہے، تھوڑا سا پانی بھی اس پر پھینک دو تو وہ اپنے لمبے لمبے بالوں والی کھال جھٹک کر خود کو خشک کر لیتی ہے۔ یہی ملایم بال اسے سردی سے محفوظ رکھتے ہیں، بدیشی ملکوں میں ان بالدار کھالوں سے بنی ہوئی پوستینیں اور خوب صورت ٹوپیاں کثرت سے استعمال کی جاتی ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا بلیاں کئی رنگ کی ہوتی ہیں، کالی، چھپتلی جس پر لال سفید دھبے ہوں چتکبری ـــ کالے سفید دھبوں والی، مگر سب سے خوب صورت سفید ہوتی ہے، بعض لوگ کالی بلّی سے بہت ڈرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں بلیّوں کے سروں پر بھوت ہوتے ہیں یا بڑیلیں اور جادوگرنیاں ہوتی ہیں جو بھیس بدل کر انسانوں سے قریب ہونا چاہتی ہیں، یہ سب غلط ہے آج کی دنیا میں بھوت پریت جادو ٹونا کوئی چیز نہیں۔

ہمارے ہاں بھی ایک منّو بیگم ہیں یہ کالی ہیں نہ لال، نہایت گوری چٹّی بالکل سفید ہیں، بہت خوب صورت، ہمیشہ ان کی گردن میں لال ربن بندھا رہتا ہے اور بڑی بنی سنوری رہتی ہیں، مگر ان میں ایک خرابی ہے، دودھ، ملائی روٹی اور چوہے تو پسند ہیں ہی بھولی بھالی چڑیوں کی بھی بڑی شوقین ہیں۔ گھنٹوں صبح، دوپہر، شام یہ درختوں کے نیچے بیٹھی، ٹہنیوں اور ڈالیوں پر چہچہانے والی چڑیوں کو حسرت

سے تکا کرتی ہیں۔

صحن میں ایک ٹب رکھا رہتا ہے جس میں ہمیشہ پانی بھرا رہتا ہے۔ بے چاری چڑیاں اس ٹب پہ آآکر بیٹھتی ہیں، پانی پیتی ہیں، نہاتی ہیں، آپس میں چہلیں کرتی ہیں اور اڑ جاتی ہیں اور سب کو تو ان چڑیوں کا چہچہا کر ڈبکیاں لگانا بھلا لگتا ہے مگر ان منّو بیگم کو چڑیوں کی یہ آزادی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

ایک دن یہ روز کی طرح ایک اونچی سیڑھی پر بیٹھی پانی کے ٹب میں نہانے والی چڑیوں کو تکے جا رہی تھیں، ان کے دل میں جانے کیا آئی کہ یکایک اپنی جگہ پر سے اچھلیں اور ٹب کے اس حصے کی طرف چھلانگ لگا دی جہاں بہت سی چڑیاں بیٹھی چہچہا رہی تھیں اور خوشی میں اپنی چونچیں ٹب کے سخت کنارے پر مار رہی تھیں۔ انھوں نے سوچا تھا کہ دس بارہ چڑیوں میں سے ایک آدھ تو ان کے ہاتھ آ ہی جائے گی ــــ مگر افسوس چڑیاں تو ساری پھر سے اڑ گئیں اور منّو بیگم ٹب کے سخت کنارے سے ٹکرا کر غڑاپ سے پانی میں!

لوگ دوڑے کہ ہائے ہائے منّو بیگم پانی میں گر پڑیں، کسی نے ہاتھ بڑھا کر انھیں ٹب سے نکال دیا، ٹب سے باہر آئیں تو منّو بھیگ کر شرابور ہو چکی تھیں، تین چار زوردار چھینکیں لیں، اپنی کھال جھٹکی اور ایک کونے میں جا کر لیٹ گئیں۔ شاید سردی سے یا شرمندگی سے انھیں اس رات بڑے زور کا بخار رہا ــــ

دوسرے دن منّو بیگم نے سوچا ان چڑیوں سے ضرور بدلا لینا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ اپنے گدے دار ہی دیر بعد وہ پھر ــــ آہستہ آہستہ بنگلے کی دیوار سے ہوتی ہوئی منڈیر پر پہنچیں جس کے نیچے گلاب کی جھاڑیاں تھیں اور جہاں بے شمار چڑیاں دن بھر دھما چوکڑی مچایا کرتی تھیں۔

منّو بیگم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ منڈیر کی دیوار سے گلاب کی جھاڑیوں پر کود گئیں اور خیال ہی خیال میں تین چار چڑیوں کو اپنے نکیلے پنجوں میں دبوچ لیا۔ مگر دوسری ہی سانس میں پتہ چلا کہ چڑیاں تو ہمیشہ کی طرح پھر سے غائب ہو چکی ہیں اور گلاب کے سخت کانٹے ان کے بدن میں چبھے جا رہے ہیں۔ منّو بیگم کے سنبھلتے سنبھلتے بھی تیز نوکیلے کانٹوں نے ان کو بری طرح زخمی کر دیا اور وہ بلبلاتی ہوئی نیچے کود پڑیں۔

منّو کو زخمی حالت میں دیکھ کر لوگ سمجھے کہ یہ کسی دوسری بلّی یا بلاؤ سے لڑ کر آئی ہیں۔ لیکن یہ خود ان کا دل جانتا ہے کہ ان کا سارا بدن کس طرح زخمی ہوا تھا۔ کئی دن تک منّو بیگم نے کچھ کھایا پیا نہیں بس ایک کونے میں کراہتی ہوئی پڑی رہیں اور جب اچھی ہوئیں تو سدا کے لیے توبہ کر لی کہ اب میں کبھی ان آزادی سے چہچہانے والی بھولی بھالی چڑیوں کو اپنے نکیلے پنجوں میں دبوچ لینے کا لالچ نہیں کروں گی، کبھی نہیں۔ جو کچھ دودھ روٹی میرے حصّے کی مجھے مل جاتی ہے میرے لیے وہی بہت ہے۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ میرے دانت اور ناخن تیز ہیں تو چڑیوں کی حفاظت کرنے والے درخت بھی اپنے ناخن ہمیشہ تیز رکھتے ہیں۔

ہاں ایک بات ضرور ہے اب بھی کبھی منّو بیگم درختوں کے نیچے سے گزرتی ہیں تو ترچھی نگاہوں سے ایک بار ان چہچہاتی چڑیوں کو ضرور دیکھ لیتی ہیں ——— وہ تو آپ نے سنا ہوگا، چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے تھوڑا ہی جاتا ہے ———،

جناب ظفر گورکھپوری

نئی لوری

جاگ اے میرے لختِ جگر جاگ تو
جاگ اے میرے نورِ نظر جاگ تو

آج کی رات تیرہ[1] ہے ہر رات سے
آج کی رات سونا مناسب نہیں
آج کی رات وہ خونچکاں رات ہے
بے خبر جس سے ہونا مناسب نہیں

تیرے ہاتھوں میں ہے صبح کی آبرو
جاگ اے میرے لختِ جگر جاگ تو

کل تلک تیرا جھولا جھلاتے ہوئے
میں نے جو گیت گائے انھیں بھول جا
میں نے پچھلے پہر تک سرہانے ترے
جو فسانے سنائے انھیں بھول جا
شوخ چڑیوں پرندوں کے وہ تذکرے

دیو، بھوتوں کی وہ داستاں اب نہیں
جس نے پریوں کے قصے سنائے تجھے
میرے منہ میں وہ میٹھی زباں اب نہیں
چندا ماموں کے احوال مت پوچھ اب
دودھ کی پیالیوں کی حکایت گئی
لومڑی مر گئی، بھیڑیا مر گیا
شیر اور بکریوں کی روایت گئی

زندگی کو حقیقت کی ہے جستجو
جاگ اے میرے لختِ جگر جاگ تو

دیکھ مہتاب کتنا فسردہ سا ہے
دیکھ تاروں کا منہ کس قدر زرد ہے
دیکھ آفاق کے روئے پُرنور پر
آج کتنا دھواں، کس قدر گرد ہے
دیکھ ٹھنڈی ہوا میں ہے کتنی جلن

[1] اندھیری

دیکھ کتنی شرر بار ہر لہر ہے
آسماں ہے کہ شعلوں کی کھیتی کوئی
کہکشاں یا کوئی خون کی نہر ہے
چاندنی ہے کہ دھرتی کے تن کا کفن
ہیں شعاعیں کہ مکڑی کے جالے ہیں یہ
ڈالیاں ہیں کہ مفلس کی ٹوٹی کمر
پھول ہیں یا کلیجوں کے چھالے ہیں یہ

نکہتیں ہیں کہ بارود کی تیز بو
جاگ اے میرے لختِ جگر جاگ تو

نیند کی جل پری تیری ساقی سہی
آج کی رات تو اس کی حسرت نہ کر
خواب کی نازنیں لاکھ پنکھا جھلے
آج کی رات اس سے محبت نہ کر
آئے تجھ کو سُلانے جو بادِ صبا
اس کو پلکوں کی گلیوں میں آنے نہ دے
لیکے دو چار لمحات آرام کے
اپنی بیداریوں کے زمانے نہ دے

نیند کیا، نیند آئی ہے پھر آئے گی
آسکے گی نہ پھر آبروئے وطن *
آج ہر چین اپنا وطن کے لیے
آج ہر آرزو آرزوئے وطن

یہ زمیں آج پھر مانگتی ہے لہو
جاگ اے میرے لختِ جگر جاگ تو

جاگ جب تک وطن تجھ کو آواز دے
جاگ جب تک یہ دھرتی بلائے تجھے
جاگ جب تک جلے مشعلِ قلب وجاں
جاگ یہ رات جب تک جگائے تجھے
بجھ نہ جائے ستاروں کی رخشندگی
جگمگاتا ہوا چاند کالا نہ ہو
جاگ جب تک اندھیرے کریں سازشیں
جاگ جب تک وطن میں اُجالا نہ ہو

جاگ جب تک نہ ہو زندگی سرخرو
جاگ اے میرے لختِ جگر جاگ تو



بہنوں کی لڑائی

محترمہ عائشہ یوسف ناظم

دو بہنیں ہیں۔ دونوں تقریباً برابر کی ہیں۔ ان کی عمروں میں تھوڑا سا فرق ہوگا۔ ساتھ بیٹھتی ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کبوتروں کا جوڑا بیٹھا ہے۔ ساتھ چلتی ہیں تو ایسی نظر آتی ہیں جیسے دو خرگوش چلے آرہے ہیں۔ گھر میں کوئی مہمان آجائے تو بھولی بن کر سامنے آجاتی ہیں۔ مہمانوں کو دیکھتی ہیں اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی ہیں۔ اس طرح مسکراتی ہیں کہ مہمان دیکھ نہ پائیں۔ معلوم نہیں مہمانوں میں انھیں کیا انوکھی بات نظر آتی ہے۔ مہمانوں کے جانے کے بعد فوراً دونوں ان کی نقلیں اتارتی ہیں جیسے نقلوں کا بھی کوئی امتحان ہونے والا ہو۔

لیکن یہ سب سے اچھی اس وقت نظر آتی ہیں جب ایک دوسرے سے لڑتی ہیں۔ لڑنے کے لیے انھیں کسی بہانے کی ضرورت نہیں۔ دسترخوان پر بیٹھیں گی تو پلیٹ کے لیے لڑیں گی۔ پھولوں والی پلیٹ مجھے چاہیے۔ دوسری کہے گی نہیں نہیں یہ پلیٹ ہماری ہے ہم لیں گے۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ یہ کھانا کھائیں گی یا پلیٹ کے پھول۔

دسترخوان اوندھا ہو جائے، سالن الٹ جائے، پانی بہہ جائے، انھیں پرواہ نہیں۔ دسترخوان پر امی اور ابا کے آنے سے پہلے

دسترخوان کا نقشہ بگڑ جاتا ہے۔

ہم دور سے دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ بہنیں لڑتی ہوئی نظر آتی ہیں تو بڑی خوب صورت معلوم ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ہوا میں دو غبارے اڑ رہے ہیں۔ ایک کی چوٹی اس کے ہاتھ میں، دوسری کے بال اس کے ہاتھ میں۔ اور پھر یہی نہیں جو چیز جس کے ہاتھ آجائے اس کی مرمت ہو جائے۔

بھائیوں کی لڑائیاں بھی ہم نے دیکھی ہیں لیکن اس لڑائی میں وہ مزہ کہاں جو بہنوں کی لڑائی میں آتا ہے۔ بھائیوں کی لڑائی میں ہمیشہ تیسرے کو صلح کرانی پڑتی ہے اور بعض وقت تو معاملہ بگڑ جاتا ہے۔

لیکن بہنوں کی لڑائی میں بڑا پیار رہتا ہے۔ لڑتی بھی ہیں تو بڑی محبت سے۔ ماریں گی بھی تو ایسے کہ زیادہ چوٹ نہ آئے۔ نوچیں گی تو احتیاط سے کہ زخم نہ ہو جائے۔ دھکا دے کر گرائیں گی بھی تو یہ دیکھ کر کہ پیچھے کچھ ہے تو نہیں۔

بھائیوں کی لڑائی میں ایسا نہیں ہوتا وہ جب لڑتے ہیں تو اس بے دردی سے لڑتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مار کر ہی دم لیں گے۔ نکسیر پھوٹ جائے یا سر پھٹ جائے، دوسرے کو پرواہ نہیں ہوتی ایک دیوار سے ٹکرا جائے یا اوندھے منہ گر پڑے پہلا نہیں سوچتا۔

اور پھر دو بھائی لڑتے ہیں تو وہ شور ہوتا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ بہنیں تو بڑی خاموشی سے لڑتی ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لڑائی کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ کمرے کے ایک کونے میں جا کر لڑیں گی اور جب لڑنے سے جی بھر جائے گا تو چپ چاپ آکر بیٹھ جائیں گی۔ تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو غصہ بھری نظروں سے گھوریں گی لیکن بس تھوڑی دیر تک۔ زیادہ دیر تک دونوں سے صبر نہیں ہو سکتا۔ بڑی بہن چھوٹی سے پنسل مانگے گی۔ چھوٹی پہلے تو منہ بنائے گی۔ پھر خاموشی سے اپنے بستے میں سے پنسل نکال کر بڑی کو دے دے گی۔ اب بڑی بہن انتظار کرے گی کہ چھوٹی کچھ کہے۔ چھوٹی بھی چند منٹ تک کچھ سوچے گی اور پھر بڑی سے کہے گی کہ ذرا مجھے نیڈل ورک سکھا دو۔ بڑی گھورے گی اور پھر نیڈل ورک لے کر بیٹھ جائے گی۔ دونوں اس کے بعد ہنسنا بولنا شروع کر دیں گی اتنے میں ہنستے ہنستے چھوٹی کے سوئی چبھ جائے گی اور پھر جھگڑا شروع! نیڈل ورک الگ رکھ دیا جائے گا

- - - - - - - -

- - - - - اور دونوں اس بات کا تصفیہ کرنے کی کوشش کریں گی کہ سوئی چبھونے میں کس کا قصور تھا۔ بڑی نے جان بوجھ کر سوئی چبھوئی یا چھوٹی نے خود اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ پہلے باتیں ہوں گی پھر بحث ہوگی پھر تھوڑا سا رونا ہوگا۔ اور پھر ہاتھا پائی ہوگی۔

اتنے میں کوئی مہمان گھر میں آجائے گا۔ دونوں اپنے کپڑے درست کرلیں گی۔ بال سنوار لیں گی اور پھر فوراً بھولی بن کر مہمان کے سامنے آکر بیٹھ جائیں گی۔ مہمانوں میں اگر کوئی بڑی بوڑھی خالہ آ جائیں تو فوراً کہیں گی واہ کیا تمیزدار اور سمجھدار لڑکیاں ہیں۔ دیکھو کیسی چپ چاپ بیٹھی ہیں۔ بے چاری کیا جانیں کہ یہ دو بہنیں دن بھر گھر میں کیسا اُدھم مچاتی ہیں۔

خیر مہمان تو رخصت ہوئے کہ چھوٹی کو یاد آیا کہ ابھی تو اسے ہوم ورک کرنا ہے۔ رات کے دس بج رہے ہیں نیند سے آنکھیں بند ہوئی جارہی ہیں، ادھر ہوم ورک کی فکر جان آدھی کیے جارہی ہے ٹائم ٹیبل دیکھا پتہ چلا کہ ٹیچر نے تو یکدم دن سے فائیو ہنیڈرڈ تک لکھ کر لانے کی ہدایت کی ہے۔ خیر بڑی مشکل سے پچاس تک لکھ پائے گی اور فوراً بڑی کو آرڈر دے گی دیکھو آپا اب ہم کو نیند بہت آرہی ہے اور ابھی پانچ سو تک لکھنا ہے ہم تو سوتے ہیں تم ہماری ہینڈ رائٹنگ میں یہ ہوم ورک پورا کردو۔ دیکھو آپا ہینڈ رائٹنگ بدلنا مت ورنہ ٹیچر ہم کو ماریں گی۔

بے چاری بڑی آپا، محبت کی ماری مہربان آپا چھوٹی بہن کا حکم مان کر خاموشی سے اس کا ہوم ورک ختم کرنے بیٹھ جاتی ہے اور چھوٹی بڑی معصومیت کے ساتھ اپنے بستر پر خواب خرگوش کے مزے لینے لگتی ہے ـــــ ارے کہیں تم بھی ایسی دو بہنیں تو نہیں ــ؟



دیہات کی صبح

جناب پروفیسر امانت



یہ میرا وطن ہے، یہ میرا وطن

اُفق پر جونہی پھوٹی پہلی کرن — چمکنے دمکنے لگا سب گگن
گئی ہار بازی اُجالے کے ساتھ — کیے رات نے یوں تو لاکھوں جتن
ستاروں کی شمعیں بھی سب بجھ گئیں — پیامِ اجل لائی پہلی کرن
خراماں خراماں چلی پھر نسیم — لگا لینے انگڑائیاں پھر چمن
بسیروں سے پنچھی اڑے دُور دُور — چہکتے ہوئے گیت گاتے، مگن
گگریاں چلیں لے کے پنہاریں — بلاتی ہے پنگھٹ کی ان کو لگن
سنائی دیے گیت چکی کے پھر — سہانا ہے گاؤں کا ہر اک چلن
کساں اپنے کھیتوں پہ جانے لگے — ہے محنت کی اُن کے دلوں میں لگن
وطن کی فضائیں ہیں کتنی حسیں! — امانت نہ کھو جائے کیوں اپنا من

ہے دیہات کی صبح کیا خوشگوار
ہو سو جان سے کیوں نہ صدقے بہار

جناب م۔ ی۔ کھتری

شبلی کا شوقِ مطالعہ



شبلی بچپن ہی سے کتب بینی کے شوقین تھے۔ جب وہ اعظم گڑھ میں ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے۔ اس وقت ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ روزانہ ایک کتب فروش کی دوکان پر جاکر فارسی کتابوں کی ورق گردانی کرتے تھے۔ یہ ان کا روزانہ دستور سا ہو گیا تھا۔ ایک روز ان کے والد صاحب نے انھیں اسی دوکان پر کتاب پڑھتے دیکھ لیا تو ان کو منع کیا۔ یہ بات شبلی کو ٹھیک نہ لگی۔ لیکن انھوں نے اپنے باپ کے حکم کو ٹالا نہیں اور اب وہ دوکان کی بجائے گھر پر کتابیں لے آتے اور انھیں پڑھ کے لوٹا دیتے۔ مزے کی بات یہ کہ بہت سی کتابوں کی عبارت شبلی بس آدھی پونی ہی سمجھ پاتے تھے۔ شبلی خود فرماتے ہیں "صفحے کے صفحے پڑھ جاتا تھا لیکن صرف ایک آدھ لفظ اور ایک آدھ سطر سمجھ میں آتی تھی۔ اور اسی کو غنیمت سمجھتا تھا۔"

۱۸۷۶ء میں شبلی حج کے لیے گئے۔ بعد حج کے جب وہ مدینہ منورہ زیارت کے لیے حاضر ہوئے تو وہاں کے کتب خانوں کی سیر کی اور کئی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ وہاں کے کتب خانوں کے بارے میں فرماتے ہیں "احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ ان ہی کتب خانوں میں نظر آیا۔"

جب شبلی علی گڑھ تشریف لے گئے تو مطالعہ کے شوق کو پورا کرنے کا پورا سادھن انھوں نے یہاں

پایا۔ سرسید کا کتب خانہ بہترین کتابوں کا خزانہ تھا۔ سرسید نے بخوشی شبلی کو مطالعہ کی اجازت دے دی۔ شبلی نے اس سنہری موقع سے دل کھول کر فائدہ اٹھایا اور فیضیاب ہوئے۔ اس سلسلے میں نہایت ہی مسرت کے ساتھ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔" سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔ سید صاحب کے پاس تاریخ، جغرافیہ اور عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو حقیقت میں بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے۔ گر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں۔ مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں۔ گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپئے کے صرف سے کرایا ہے میرے مطالعے میں ہے۔"

علی گڑھ میں شبلی کے ایک اور دوست تھے۔ انھیں بھی کتابوں کے مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ وہ فخریہ شبلی کی خدمت میں کتابیں پیش کرتے تھے اور شبلی ان کتابوں کا نہایت شوق سے مطالعہ کرتے تھے۔ اس بارے میں ایک عزیز کو بخوشی اس کی اطلاع دیتے ہیں۔ "یہاں ایک شخص عبدالحمید نامی اہلمد محکمہ کلکٹری ہیں۔ یہ صاحب دیوان ہیں اور کتابوں کے بڑے شائق۔ بہت سا حصہ ان کی تنخواہ کا کتابوں میں صرف ہوتا ہے۔ ان کو دعویٰ ہے کہ کوئی ذخیرہ فارسی کا ایسا نہیں جو چھپا ہو اور میرے پاس نہ ہو۔ میں نے ان کو بہت سی کتابیں لکھوادی ہیں اور وہ بہت جلد ان کو منگوانا چاہتے ہیں۔ یہ خوب آدمی ہیں، ان کے ذریعے سے کتابیں دیکھنے کو خوب ملتی ہیں۔ یہ بے چارے فخریہ کتابیں بھیج دیا کرتے ہیں... ممکن ہے مسلمان ساوجی و طالب آملی دیکھنے کو مل جائے۔"

المامون اور سیرۃ النعمان کی تصنیف تک تو ہندوستان کے علمی سرمایہ نے شبلی کا ساتھ دیا لیکن جب ان کی خواہش الفاروق کی تصنیف کرنے کی ہوئی تو انھیں یہ سرمایہ کم دکھائی دیا۔ اور مزید سرمایہ اگر مل سکتا تھا تو مصر اور قسطنطنیہ کی وادیٔ علم میں۔ اور شبلی نے یہ سرمایہ حاصل کرنے کے لیے وادیٔ علم جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اور اس طویل مسافت پر روانہ ہوگئے۔ ہندوستان کی علمی تاریخ میں یہ پہلا سفر ہے جو محض ذوقِ علم کے لیے ممالک اسلامیہ میں کیا گیا۔ جب شبلی قسطنطنیہ پہنچے تو کتب خانوں کی تلاش شروع کر دی۔ وہاں کے

تمام کتب خانوں کا چکر لگایا۔ قسطنطنیہ میں کتب خانے بہت دور دور واقع تھے۔ لیکن شبلی کا ذوق دیکھیے ایک کتب خانے سے دوسرے کتب خانے تک پیدل جاتے۔ اس طرح دن بھر پیادہ سفر کرتے اور علم حاصل کرتے۔ ان کتب خانوں کا ذکر اپنے والد صاحب کو قسطنطنیہ سے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں "کتابیں نہایت عجائب و غرائب ہیں۔ لیکن حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ نہ نقل ہو سکتی ہے نہ حافظہ ان کے لیے کافی ہے۔ میں ہر روز دو تین میل پیادہ سفر کرتا ہوں کیونکہ کتب خانے دور دور واقع ہیں۔"

ایک اور خط قسطنطنیہ سے تحریر کیا تھا جو سر سید کے نام تھا۔ اس میں تحریر فرماتے ہیں "سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ دو تین سو یا اس سے زیادہ روپیہ بھیج دیں کہ جو کتاب جس وقت ہاتھ آئے لے لی جائے یا نقل و کتابت کا انتظام کیا جائے۔ کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں۔ لیکن کہاں تک لکھوائی جا سکتی ہیں۔ امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں اور بو علی سینا کی تو شاید کل تصنیفات مل سکتی ہیں۔ امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں۔ اس وقت بلکہ زمانۂ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی۔ ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دور دور واقع ہیں۔"

ہندوستان کا شاید ہی کوئی کتب خانہ ایسا ہوگا جس کو شبلی نے بار بار نہ دیکھا ہو۔ رام پور کا سرکاری کتب خانہ، لکھنؤ میں مولوی حامد حسن کا کتب خانہ، خدا بخش خاں لائبریری بانکی پور، ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد وغیرہ کے علاوہ دوستوں کے ذاتی کتب خانوں میں جاتے اور کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ شبلی کسی شہر میں جاتے اور معلوم ہوتا کہ کسی کے ہاں کتابوں کا ذخیرہ ہے اور کسی کے ہاں کتابوں کا ذخیرہ پاتے تو اس کے پاس جا کر اسے دیکھنا اپنا فرض سمجھتے۔

شبلی کے مطالعہ کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی کتاب اوّل تا آخر نہ پڑھتے۔ بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر ورق الٹتے رہتے۔ اور ساتھ ہی ان کی روانی بھی بہت تیز تھی۔ لیکن جیسے ہی ان کی نگاہ کسی اہم معلومات پر پڑ جاتی تو وہ ان معلومات پر اس قدر حاوی ہو جاتے کہ کتاب کا مطالعہ دوبارہ شروع کر دیتے۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ کتاب پر ریویو (Review) کرنے کے لیے بھی تیار رہتے۔

صحت و علالت، سفر و حضر اور جلوت و خلوت غرض ہر حال میں کتابوں نے ان کا ساتھ دیا۔ کشمیر سے جب شبلی لوٹے۔ اس وقت وہ علیل ہوگئے۔ لیکن اس علالت میں بھی مطالعہ سے باز نہ آئے۔

ایک دفعہ اعظم گڑھ میں طاعون کی وبا پھیلی۔ قریب پورے شہر میں طاعون کا زور تھا۔ شبلی کے فرزند محمد حامد بھی اس کی زد میں آگئے۔ اس وبا سے بچنے کیلیے لوگوں نے شہر چھوڑ کر باہر چھپروں میں پناہ لی۔ شبلی اور ان کے فرزند نے بھی وہاں قیام کیا۔ اور شبلی منزل چھوڑ دی۔ ایسی حالت میں بھی شبلی مطالعہ سے پرہیز نہ کرسکے۔ ایک روز محقق طوسی کی شرحِ اشارات زیر مطالعہ تھی۔ محقق طوسی نے امام رازی پر ایک اعتراض کیا تھا۔ اور یہ اعتراض شبلی کو غلط معلوم ہوا۔ اور اس کی تصدیق کے لیے محاکمات کا مطالعہ ضروری تھا۔ لیکن یہ کتاب یہاں موجود نہ تھی بلکہ گھر پر تھی۔ شبلی فوراً اٹھے اور شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ حالانکہ شہر میں طاعون کا زور تھا اور بنگلہ بند تھا۔ اس وبا کے باوجود بنگلے پر پہنچ کر محاکمات نکالی اور اس کا مطالعہ کیا۔ دیکھا تو واقعی محقق طوسی کا اعتراض غلط تھا۔

مصر، بیروت، شام اور یورپ میں جو بہترین کتابیں شائع ہوتی تھیں شبلی ان کو شوق سے منگواتے۔ اور اپنی جان سے زیادہ ان کی حفاظت کرتے۔ قدیم قلمی کتابوں کی جستجو میں ہمیشہ وہ مصروف رہے۔ جب کوئی عمدہ کتاب ہاتھ آجاتی تو فراخ دلی سے اسے خریدتے جس کے لیے وہ مجبور تھے۔ اگر کہیں بہترین کتابیں نظر سے گزر جاتیں اور وہ انھیں حاصل نہ کرپاتے تو انھیں اپنی مفلسی پر افسوس ہوتا۔ ایک بار مولوی سید علی بلگرامی کے کتب خانے میں یورپ کی شائع کردہ بہترین کتابیں انھوں نے دیکھیں۔ لیکن مفلسی نے انھیں یہ اجازت نہ دی کہ وہ ان کتابوں کو خریدیں۔ شبلی نے ان نادر کتابوں اور اپنی مفلسی کا ذکر مولانا شیروانی کے نام ایک خط میں لکھا ہے" مولوی سید علی صاحب کے کتب خانے میں عربی مطبوعات یورپ دیکھ کر سخت حیرت زدہ ہوگیا ہوں علمی زمین نے اپنے خزانے اگل دیئے ہیں۔ کیا کہوں، اپنے علماء کی بدقسمتی اور اپنی مفلسی پر افسوس آتا ہے"

جناب بزمی بھارتی

مرثیہ

اس ہونے والی بات کا خطرہ نہ جب ٹل ہی سکا
آلِ نبیؐ کا قافلہ کرب و بلا میں رُک گیا
مدِ مقابل آ گیا سیلاب ظلم و جبر کا
لیکن نہ پیچھے ہٹ سکا اس سے کوئی اہلِ وفا

ثیرب نوا اسی کوئی بھی بزمیؔ نہ تھا چیں بر جبیں
شاہد ہے جس کی آج بھی کرب و بلا کی سرزمین

ابنِ علیؑ کا لاڈلا، وہ ہم شبیہہِ مصطفےٰؐ
قصرِ صداقت کا دیا، وہ اکبرِ ذی حوصلا
اس شان سے رن میں گیا دشتِ وغا تھرا اٹھا
گو تھا اجل کا سامنا آگے مگر بڑھتا رہا

اپنے ارادوں کے دھنی پیچھے کبھی ہٹتے نہیں
شاہد ہے جس کی آج بھی کرب و بلا کی سرزمیں

پسپائیوں کا ذکر کیا، سرتن پہ اس کے بار تھا
ملنے پہ پل پھر بھی نہ تھا پیاسا تھا گو چھ وقت کا
اللہ رے زعمِ وفا منزل کو بڑھ کر لے لیا
زخموں سے جب بے بس ہوا جامِ مئے وحدت پیا

طوفان سے ٹکرا گیا بزمِ حرم کا نازنین
شاہد ہے جس کی آج بھی کرب و بلا کی سرزمیں

ہمدردِ آلِ مرتضیٰؑ، عباسؑ عالی مرتبا
پروانۂ شمعِ وفا، دیوانۂ صبر و رضا
رن کی زمیں کو روندتا وہ مردِ میدانِ وغا
شوقِ شہادت میں چلا اک شیر جھنجھلایا ہوا

فوجِ عدو کی جرأتیں سر در گریباں ہو گئیں
شاہد ہے جس کی آج بھی کرب و بلا کی سرزمیں

کیف خودی میں جھومتا تلوار کا منہ چومتا — دریا پہ پہنچا باوفا مشکیزہ پانی کا بھرا
جو سورما آگے بڑھا اس کو وہیں ٹھنڈا کیا — شرمندہ ہو کر رہ گیا ہر فتنہ گر کا حوصلا
اور سوئے خیمہ گاہ پھر گھوڑے کی باگیں موڑ دیں
شاہد ہے جس کی آج بھی کرب و بلا کی سرزمیں

اک فتنۂ مکر و دغا چھپ کر اسے دے ہی گیا — جب بازوئے ساقی کٹا مشکیزہ دانتوں میں لیا
وعدہ نہ پورا کر سکا پیاسی سکینہ کا چچا — گھوڑے سے آخر گر گیا اور خلد کا رستہ لیا
خودداریوں کی کلغیاں اس نے مگر جھکنے نہ دیں
شاہد ہے جس کی آج بھی کرب و بلا کی سرزمیں

اف! اصغرِ معصوم کا پیاسا گلا چھیدا گیا — اور قاسم نوشاہ کا سہرا نہ سالم رہ سکا
نذرِ جفائے ناروا ہو کر رہا سب قافلہ — لیکن رضائے کبریا شبیرؑ کا مسلک رہا
ہوتی نہیں خم شیر کی روباہ کے آگے جبیں
شاہد ہے جس کی آج بھی کرب و بلا کی سرزمیں

فانوسِ فردوسِ رضا وہ پیکرِ مہر و وفا — خود بھی اٹھا پڑھتا ہوا جبر و ستم کا مرثیا
اور قبلہ رو پیشِ خدا سجدے میں سر کٹوا دیا — اک درسِ عبرت بن گیا پیارے نبی کا دھیوتا
قندیل استقلال کی چمکی سرِ عرشِ بریں
شاہد ہے جس کی آج بھی کرب و بلا کی سرزمیں

پتھر کی اک چٹان تھا یہ قافلے کا قافلہ — عزم و عمل کا دیوتا ہر فرد تھا سرتا بہ پا
سر تن سے ہو جائے جدا جھکنا مگر آتا نہ تھا — تختہ الٹ کر رکھ دیا دنیائے استبداد کا
قصرِ صداقت کی جڑیں اس طرح مستحکم ہوئیں
شاہد ہے جس کی آج بھی کرب و بلا کی سرزمیں

بجناب وقار خلیل



گولکنڈہ

حیدرآباد کا آہنی قلعہ

آندھرا پردیش کے صدر مقام شہر حیدرآباد کے پچھم کی طرف چھ میل دور واقع قلعہ گولکنڈہ اپنے ترقی اور عروج کے زمانے میں ہیروں کی زبردست منڈی کے طور پر مشہور تھا۔ یہ اپنے پُرشکوہ کھنڈروں کے سبب دو سو سال کی تاریخ رکھتا ہے۔ دکن کی اور ہمسر سلطنتوں کے ساتھ پندرہویں صدی کے آخری دس سالوں میں اس کی داغ بیل پڑی تھی اور سترھویں صدی کے آخر میں اس کا خاتمہ ہوا۔ اطالوی سیاح لوتی نے گولکنڈہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ ہے وہ گولکنڈہ جو دو تین صدیوں تک ہندوستان کا عجوبہ بنا ہوا تھا۔"

اسی طرح انگریزی زبان کے مشہور شاعر ملٹن نے بھی فراوانیٔ دولت کے لیے گولکنڈہ کے لفظ کو ضرب المثل کے طور پر استعمال کیا ہے۔

تاریخیں کہتی ہیں کہ قلعۂ گولکنڈہ پرانے زمانے میں ہندو راجاؤں کے ماتحت ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ پہلے بس یہ مٹی سے بنایا گیا تھا بعد میں وہ ورنگل کے راجاؤں کے قبضے میں آگیا پھر ورنگل کے راجا نے ۱۳۶۴ء میں اسے تمام مضافات کے ساتھ بہمنی بادشاہ کے حوالے کردیا۔ ۱۵۱۲ء تک یہ بہمنی سلطنت میں رہا۔ اس کے بعد قطب شاہی بادشاہوں کے قبضے میں آگیا۔ بہرحال یہ قلعہ دو ہزار برس

کے لگ بھگ کی عمر رکھتا ہے۔

قلعۂ گولکنڈہ، جسے قلعۂ محمد نگر بھی کہتے ہیں ایک جدا ٹیلے نما خطّے پر بنایا گیا ہے۔ یہ سطح زمین سے چار سو فٹ بلند ہے۔ اور یہاں سے دور اور نزدیک کی تمام بستیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ اس قلعہ کی تمام کی تمام دیواریں پتھر کی ہیں۔ پہلی نظر میں قلعہ ویرانہ سا دکھائی دیتا ہے، مگر قریب سے دیکھیے تو اس کی شوکت اور عظمت دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں دکن میں طوائف الملوکی اور خانہ جنگیوں کا دور دورہ تھا اس وقت خانِ اعظم محمد مصطفےٰ خاں نے بادشاہ کو توجہ دلائی کہ قلعہ معمولی ہے اور اطراف و جوانب کی یورشوں سے اس کی تباہی کا اندیشہ ہے اس لیے اس کو مضبوط اور مستحکم کرنا چاہیے۔

بادشاہ نے اس رائے سے اتفاق کیا اور ایک پکی فصیل چونے اور پتھر سے بنوائی۔ اس کی مجموعی لمبائی چھ میل ہے۔ قلعہ کی فصیلوں کے زاویوں پر اٹھاسی برج ہیں جہاں اب تک قطب شاہی توپوں کے نمونے ملتے ہیں۔ ان میں بہتوں کے شگاف اڑے ہوئے ہیں اور بہتوں میں میخیں ٹھنسی ہوئی ہیں۔ یہ میخیں اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۶۸۷ء میں قلعہ کو فتح کرتے وقت ٹھونکی تھیں۔ اس قلعے کے دروازے پہلے آٹھ تھے لیکن اب صرف چار محفوظ ہیں۔ یعنی مکہ دروازہ، جمالی دروازہ، بنجارہ دروازہ اور فتح دروازہ۔ اورنگ زیب کا لڑکا شہزادہ محمد معظم اسی دروازے سے اپنی فوجوں کے ساتھ قلعہ فتح کرنے کے لیے داخل ہوا تھا۔ اسی لیے اس کا نام فتح دروازہ رکھا گیا۔ تمام کے تمام دروازے ساگوانی لکڑی کے بنے ہوئے ہیں اور ان میں تیز نوکیلی میخیں جڑی ہوئی ہیں تاکہ جنگی ہاتھی انھیں نقصان نہ پہنچا سکیں۔

گولکنڈے میں داخلے کے بعد جو چیز سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، وہ ہے آسمان سے باتیں کرتا ہوا بالاحصار، یہ اپنی جگہ خود ایک قلعہ ہے۔ یہ جنوب مغربی حصّے میں واقع ہے اور اس پر زیادہ تر سپہ سالار اور فوجی عہدہ داروں کا عمل دخل تھا۔ اس حصّے کو اونچی اونچی دیواروں سے اس طرح علیحدہ کیا گیا ہے کہ محلوں اور شاہی عمارتوں پر اوپر سے نظر نہیں پڑتی۔ قطب شاہی سلطنت کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس کی بلندی اور مضبوطی سے متاثر ہو کر اسے اپنا پایۂ تخت قرار دیا تھا۔

لیکن آبادی میں اضافے کے سبب اس کے چاروں طرف نیا شہر بسانا پڑا اور اصل قلعہ کو صرف شاہی محلات کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ اندرونی قلعہ کے حصار کا باب الداخلہ فتح دروازے سے آنے والی سڑک کے مقابل واقع ہے جس کے سامنے ایک محافظ دیوار ہلال کی شکل میں بنائی گئی ہے جس پر توپیں چڑھی ہوئی تھیں اور اس طرح اصل دروازہ دشمن کے حملے سے بالکل محفوظ تھا۔ یہ دروازہ ایک کمان کے اندر ہے جس کے بیرونی چہرے پر قطب شاہی سلطنت کے نشان شیر اور مور پتھر پر کھدے ہوئے ہیں اور کچھ نقش و نگار پیچ یا گچ میں ابھرے ہوئے ہیں۔

اسی بالا حصار میں کئی محل اور شاہی دفتر واقع ہیں، ان میں سے چند عمارتیں صدیوں کے بعد بھی گئی گزری حالت میں بھی قابل توجہ ہیں۔ سب سے پہلے اس کوہسار کی بلند ترین چوٹی پر واقع وہ مشہور دو منزلہ عمارت ہے جو اب بھی "نانا صاحب کی گدی" کے نام سے مشہور ہے اور میلوں سے صاف نظر آتی ہے۔ گولکنڈے کے محاصرے کے وقت تانا شاہ نے اسی حصے کو اپنی قیام گاہ بنایا تھا اور اسی جگہ اس نے آخری عصرانہ بھی کھایا تھا۔ تانا شاہ کی اس گدی سے جو عمارتیں، گنبد، مینار اور پہاڑیاں شہر حیدرآباد اور قلعہ محمد نگر کے بسنے والوں کو نہایت بلند دکھائی دیتی ہیں، بالا حصار سے ان کو دیکھیے تو ساری بلندیاں پستیوں میں مبدّل ہوتی نظر آئیں گی۔

دوسری چیز جو بالا حصار کے ہر سیاح کو متاثر کرتی ہے وہ چوٹی تک جانے والے زینہ دار راستے پر باولیوں، مسجدوں اور مندروں کا سلسلہ ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ قطب شاہوں کو اپنی ہر مذہب ملت کی رعایا اور ملازمین کے آرام و آسائش اور پاسداری کا کتنا احساس تھا۔ محلوں اور شاہی نشست گاہوں کے قریب مندروں کا پایا جانا مذہبی رواداری کا بہترین ثبوت ہے۔

تیسری چیز "نگینہ باغ" ہے یہ بالا حصار کے دروازے میں داخل ہوتے ہی سیدھی طرف ملتا ہے اور جس کا ذکر وفاشعاری اور دیانت کے سبب تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ اسی باغ میں مشہور آفاق اور وفاکیش سپہ سالار عبدالرزاق لاری زخموں سے چور پایا گیا تھا اور اسی میں بالا حصار کا وہ خفیہ دروازہ بھی ہے جو ضرورت کے وقت قلعے میں محفوظ لوگوں کے کام آتا ہے۔

چوتھی قابلِ قدر چیز بالا حصار کی یہ تھی کہ بلند سے بلند پانچ پانچ چھ چھ منزلہ عمارتوں اور پہاڑوں کی اونچی سے اونچی چوٹی بھی پانی کے انتظام سے محروم نہ تھی۔ شاہی محلات کی ہر منزل میں پانی پہنچایا گیا تھا اور سب سے اوپر کی چاندنی پر حوض بنائے گئے تھے جن کے آثار اس وقت تک موجود ہیں۔

"نگینہ باغ" کے عین سامنے یعنی بالا حصار کے دروازے کے بائیں جانب شاہی محلات کے آثار نظر آتے ہیں۔ تسخیر گولکنڈے کے وقت مغلوں کا پہلا گولا انہی محلات میں گرا تھا کیونکہ حملہ آوروں کا خیال تھا کہ محلات پر گولہ باری کی جائے گی تو نازنینانِ حرم بادشاہ کو مجبور کرکے قلعہ کا دروازہ کھلوا دیں گی۔ بالا حصار کی بیرونی فصیل سے ملحق شاہی محلات کے جھروکے کے نیچے جلو خانۂ عالی کا وسیع عریض میدان نظر آتا ہے جس میں شاہی سلامتی کے لیے قطب شاہی فوجیں جمع ہوتیں۔ اسی جلو خانہ سے جنوب کی طرف قلعہ کی جو فصیل دکھائی دیتی ہے اسی میں وہ مشہورِ زمانہ کاغذی برج ہے جس کو منہدم کرنے کے لیے محاصرین کو جان جوکھم میں ڈالنی پڑتی تھی اور فتح گولکنڈہ سے ایک روز قبل جب انھوں نے اس کو بہت کچھ مسمار کر دیا تو قطب شاہی نقاشوں اور صنعت گروں نے راتوں رات اس کو کاغذ اور کپڑے سے تیار کر دیا تھا۔ کاغذی بُرج سے کچھ فاصلے پر موسیٰ بُرج بھی ملتا ہے جس کے کتبہ کو گولکنڈہ کی تاریخ میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔

موسیٰ بُرج اور فتح دروازے کے درمیان کئی عالی شان عمارتوں کے کھنڈرات ملتے ہیں جن میں "دیوان کا محل" بہت کچھ محفوظ حالت میں ہے۔ گولکنڈے کا مشہور احسان فراموش وزیر اعظم محمد سعید میر جملہ ابتداً اسی میں رہتا تھا اور پھر تانا شاہ کے عہد میں مشہور دیوان اکنا مادنا بھی اسی میں قیام پذیر رہے۔ حسن اتفاق کہ اس محل میں دو مختلف فطرت کے وزیروں نے زندگی کے دن گزارے۔ میر جملہ نے اپنے فائدے کے لیے ملک و مالک کو نقصان پہنچانے کے منصوبے باندھے تھے اور اسی محل میں گولکنڈہ کے آخری وزرا اکنا اور مادنا نے ملک اور مالک کی راہ میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔

"مسجد صفا" گولکنڈہ کی وہ مشہور ترین اور قدیم جامع مسجد ہے جو قطب شاہی سلطنت کے بانی مبانی سلطان قلی کی وفاشعاری اور آقا پرستی

کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ اسی مسجد کے محراب کے قریب گولکنڈہ کا پہلا بادشاہ نتانوے سال کا بوڑھا سلطان قلی محمد شاہ عین حالتِ سجدہ میں شہید کیا گیا تھا۔

مسجد صفا کے پیچھے کے حصے میں وہ زبردست برج ہے جس پر "فتح رہبر توپ" رکھی ہوئی ہے۔ اس رفیع الشان برج کے علاوہ نئے قلعہ میں جس کی بنیاد سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ڈالی گئی تھی ایک بارہ دری ہے جس میں متعدد عالی شان حوض بنائے گئے ہیں۔ نئے قلعے کے اطراف ایک پختہ اور نامکمل حصار کے نشانات بھی ملتے ہیں جو پانچ لاکھ روپیوں کے صرفے سے تیار کی گئی تھی۔ اس قلعہ میں پہاڑ نما پیڑ "ہتھیان کا درخت" بھی مشہور ہے۔ یہ ایک سو سولہ فٹ چوڑا ہے اور اگر اس کے ایک طرف کھڑے ہو کر اونچی آواز سے گفتگو کی جائے تو دوسری طرف یہ بات چیت سنائی نہیں دیتی۔ اس کے چھال پر ہاتھی کے کھال کی طرح جھرّیاں پڑی ہوئی ہیں اور جہاں جہاں سے شاخیں نکلی ہوئی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی سونڈ اٹھائے کھڑے ہیں اس پیڑ کے اندر پچاس فٹ مربع رقبہ کا کھوکھلا حصہ ہے جو بالکل گنبد کی طرح بن گیا ہے۔

قلعۂ گولکنڈہ سچ مچ حیدرآباد کا آہنی قلعہ ہے۔ یوں تو کئی واقعات اس کی پختگی کے شاہد ہیں۔ اس موقعہ پر صرف ایک واقعہ تحریر کرتے ہیں جس سے اس کی اہمیت اور مضبوطی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ سنہ ۱۶۸۶ء میں ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں جب مغل فوجوں نے بیجاپور کی تسخیر کے بعد گولکنڈہ کا رخ کیا تو قلعہ میں گھمسان کا رن پڑا۔ محاصرہ سخت کر دیا گیا اور قلعہ کے چاروں طرف مورچے باندھ کر توپوں کے ذریعے یورش کی جانے لگی اور فصیل میں کئی مرتبہ نقب لگا کر اسے بارود سے اڑا دینے کی مغل فوجوں نے بہتیری کوششیں کیں لیکن اہل قلعہ کی باخبری اور جیالے سپہ سالار عبدالرزاق لاری کی رہنمائی سے مغلوں کو سخت پسپائی ہوئی۔ چنانچہ ۲۲ رجون کو سرنگیں اڑانے کا اہتمام کیا گیا تو اس کا یہ حشر ہوا کہ جن فصیلوں پر نقب لگا کر بارود بھری گئی تھی قلعہ والوں نے اُن کی بہت سی بارود خارج کر دی اور کچھ بارود کا رخ مغلوں کی طرف پھر گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب سرنگیں اڑیں تو قلعہ کی فصیل کو تو کوئی دھکا نہیں لگا بلکہ بارود کے دھماکے اور

پتھروں کے اڑنے سے اسّی مغلوں کے کوئی گیارہ سو آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس سراسیمگی کے عالم میں جب مغلوں نے دوسری مرتبہ سرنگ اڑائی تو اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے ہوا تھا۔ آخر کار تھک ہار کر مغلوں کو محاصرے سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ لیکن اہل قلعہ کی بے وفائی کے سبب مدافعت کی تمام تدبیریں لاحاصل ثابت ہوئیں اور مغل فوجوں نے آخر کار قلعہ کو تسخیر کر لیا۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد)



واہ — کیا مزہ ہے!

جناب ابوالکلام



دہلی سے نیویارک

لیجیے صاحب آج آپ کو ایک نئے مضمون نگار سے ملائیں۔ اپنے محترم ساتھی ابوالکلام صاحب سے یہ نئے آپ کے لیے ہیں ہمارے لیے تو پرانے ہیں، بہت ہی پرانے۔

پیام تعلیم جب قرول باغ سے نکلتا تھا بہت دنوں تک ——— ان کی کوئی نہ کوئی چیز چھپتی رہی۔ رنگ بھرنے کے انعامی مقابلے میں تو ضرور حصہ لیتے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ابوالکلام صاحب ودیا بھون اودے پور میں پڑھتے تھے۔ یہاں سے پڑھ لکھ کر فارغ ہوئے تو شانتی نکیتن چلے گئے۔ شانتی نکیتن سے بھی ہمارے لیے مضمون بھیجتے رہے ان کا ایک مضمون خود شانتی نکیتن پر ہم نے اُسی زمانے کے سالنامے میں چھاپا۔ یہ باتصویر تھا اور بہت پسند کیا گیا تھا۔

شانتی نکیتن کی تعلیم سے فارغ ہوکر ابوالکلام صاحب سیدھے جامعہ تشریف لائے۔ یہ نہ جانے پیام تعلیم کی کشش تھی یا جامعہ کے ماحول کی کشش تھی۔ اس وقت کی جامعہ کا انداز ہی نرالا تھا۔ اُس وقت لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والے زیادہ تھے۔ روکھی سوکھی کھاتے تھے اور جامعہ کے کاموں میں دل و جان سے لگے رہتے تھے۔ ابوالکلام صاحب بھی انہی میں شامل ہوگئے۔

پھر ۱۹۴۸ء میں ایسی صورتیں پیدا ہوئیں کہ انھیں امریکہ جانے کا موقع مل گیا۔ وہاں انھوں نے آرٹ

یا مصوری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اور واپس آکر پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ ٹریننگ کالج میں پڑھانے لگے۔ پر اب کے انھوں نے ٹریننگ کالج میں پڑھانے پر بس نہیں کی۔ آرٹ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک نئے ادارے کی بنیاد ڈالی۔ یہ ادارہ ان کے شوق، بے غرض خدمت اور مسلسل جدوجہد کی بدولت خوب پھل پھول رہا ہے۔

نیچے کا مضمون "دلی سے نیویارک" اسی سفر کا دلچسپ حال ہے۔ اس سفرنامے کو لکھے ہوئے انیس بیس سال کی مدت گزر چکی ہے پھر بھی اس میں بڑی تازگی ہے۔ بہت جان ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ جوں جوں آگے بڑھتے جایئے سفرنامے کی دلچسپی بڑھتی جائے گی۔

ابوالکلام صاحب اپنے سفر کے یہ حالات اپنے چھوٹے بھائی کو بھیجتے تھے۔ اس لیے یہ خطوں کی شکل میں ہیں۔ بالکل سادہ زبان اور گھریلو انداز میں اسی وجہ سے سفرنامے کی دلچسپی اور بھی بڑھ گئی ہے۔

۔ ایڈیٹر۔

برادرِ من!

یہ تمھیں معلوم ہے کہ گو وِن برادرس[1] نے سب سے پہلی بکنگ کولمبو سے کی تھی۔ 'بالی' نامی ایک ڈچ جہاز ۱۱ر مئی کو کولمبو سے نیویارک کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ مجھے اس جہاز سے سفر پسند نہیں تھا۔ لیکن جلد ہی کسی دوسرے جہاز کی روانگی کی امید نہیں تھی۔ اس لیے مجھے منظور کرنا پڑا۔ اور روانگی کے سلسلے میں تمام سامان مکمل کر لیا۔

مگر ابھی میں نے اطمینان کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ گو ون برادرس کا ایک خط ملا کہ جو جہاز ۱۲ر مئی کو کولمبو سے روانہ ہونے والا تھا۔ اُس کا جانا ملتوی ہو گیا ہے۔

یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ آجکل جہاز کا ملنا کتنا دشوار ہو گیا ہے۔ سواریوں کے جہاز بالکل بند ہیں۔ سواری کا آخری جہاز ۳۱ر دسمبر کو امریکہ کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اس کے بعد اب تک

---

[1] نئی دہلی کی ایک مشہور فرم۔ یہ دوسرے ملکوں کے مسافروں کے لیے تمام ممکن سہولتوں کا انتظام کرتی تھی۔

کوئی جہاز نہیں گیا۔ تم سوچتے ہوگے ایسی حالت میں مجھے کتنا افسوس ہوا ہوگا پر مجھے تو بہت خوشی ہوئی۔

بات یہ ہے کہ راستہ بہت لمبا تھا۔ کولمبو تک پہنچنے کے لیے جگہ جگہ گاڑی بدلنا پڑتی پھر کولمبو میں دوست احباب بھی نہیں جن کے یہاں کچھ دنوں ٹھہرنے کا انتظام ہوتا اور جو جہاز پر بٹھانے میں کچھ مدد کرسکتے۔

لیکن میرے دوستوں کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چاہتے تھے جتنی جلدی ہوسکے میں ہندوستان سے روانہ ہو جاؤں۔ انھیں ڈر تھا کہ اس لیت و لعل میں کہیں تعلیم کی ٹرم ہی ختم نہ ہو جائے۔ یہ ڈر مجھے بھی تھا۔ دوستوں کے احساس دلانے سے پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔ گوون برادرس نے اپنے پچھلے خط میں یقین دلایا تھا کہ کسی دوسرے جہاز کے لیے وہ پوری کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن میں خط ملنے کے دوسرے ہی دن گوون برادرس کے ہاں جا دھمکا۔

وہ بے چارے بہت شرمندہ تھے۔ مگر مجبور تھے انھوں نے مجھے بتایا کہ بمبئی اور کلکتہ وغیرہ کئی جگہ تار دے رکھے ہیں۔ امید ہے کہ جلد ہی کہیں سے جواب آجائے گا۔

یہ تو تمھیں معلوم ہے کہ جس جہاز سے میں کولمبو سے روانہ ہو رہا تھا وہ ملا جلا جہاز تھا۔ یعنی سواریوں کا بھی، سامان کا بھی۔ اصل میں تو مال گاڑی کی طرح وہ سامان لادنے والا جہاز تھا۔ لیکن چند سواریاں بھی لے لیتا تھا۔

اس طرح کے مال لادنے والے جہاز میں کئی طرح کے عیب ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا عیب تو یہ ہے کہ جوں کی چال چلتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیزی دکھائے تو ایک گھنٹے میں ۱۵ میل چل سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں سواری کا جہاز ۲۰ سے ۲۵ میل فی گھنٹہ چلتا ہے۔ سواریاں کم ہونے کی وجہ سے کچھ مزہ نہیں آتا۔

یہ سواریوں کا جہاز نہیں ہے اس لیے اس میں نہ تو کتب خانہ ہوتا ہے نہ تیرنے کا تالاب نہ کھیل اور تفریح کا دوسرا سامان مگر ساتھ ہی اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں۔ سواری کے جہاز میں تو پہلا درجہ ہوتا ہے، دوسرا درجہ ہوتا ہے، تیسرا درجہ ہوتا ہے۔ ڈک یا عرشہ ہوتا ہے۔ مگر اس جہاز میں بس ایک ہی درجہ ہوتا ہے۔ کلاس ایک ہی ہوتا ہے تو کھانا بھی ایک ہی قسم کا ہوتا ہے۔ اور

اچھا ہوتا ہے۔

ہاں میں تمھیں یہ بتا رہا تھا کہ گوون برادرس نے اپنی پوری پوری کوشش کا یقین دلایا تو مجھے اطمینان ہو گیا۔ یہ ۱۲ رمئی ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔

۱۳ مئی کو مجھے ٹیلی فون پر اطلاع ملی کہ ایک کارگو (یالدّو) جہاز ۲۳ رمئی کو کلکتہ سے امریکہ کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔ اگر یہ پسند ہو تو بکنگ کر دی جائے۔ تو بھئی یہاں پسند یا ناپسند کا سوال ہی کیا تھا۔ مجھے تو کسی طرح وقت پر امریکہ پہنچنا تھا بس میں نے فوراً منظور کر لیا۔

کولمبو کے مقابلے میں کلکتہ مجھے بہت غنیمت معلوم ہوا مگر دلی خواہش یہ تھی کہ کوئی جہاز بمبئی سے جانے والا مل جاتا۔ تم شاید پوچھو کہ کیوں تو یہ بھی سن لو۔ پہلی بات تو یہ کہ بمبئی میں میرے کافی دوست ہیں میں نے انھیں بہت دنوں سے لکھ رکھا تھا کہ میں مزید تعلیم کے لیے امریکہ جا رہا ہوں اور امکان اس بات کا ہے کہ بمبئی سے جاؤں اس لیے بڑی مدت سے وہ میرا انتظار کر رہے تھے، بہت بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ پر اللہ میاں کو یہ منظور نہیں تھا۔

کلکتے سے جانے کی بات پکّی ہو گئی تو میں نے اپنے ایک دوست کو تار سے اطلاع دیدی کہ فلاں تاریخ کو کلکتہ پہنچ رہا ہوں۔ مہربانی فرما کر مجھے ہاوڑہ اسٹیشن سے لے لیں۔

گوون برادرس نے میرے لیے دہلی میل سے ۱۷ رمئی کی سیٹ رزرو کروادی تھی۔ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ بھی دیا تھا۔

بہت سے ساتھیوں اور دوستوں نے جب یہ سنا کہ میں کولمبو سے نہیں جا رہا ہوں تو انھوں نے دعوتیں ملتوی کر دیں مگر سفر کا انتظام اتنی جلد ہو گیا کہ پھر انھیں دعوت کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اب اتنا وقت ہی کہاں رہ گیا تھا۔

پھر بھی کچھ عزیز ساتھیوں کے اصرار کو ٹالنا بہت مشکل تھا۔ ایک قریبی دوست نے پوچھا تم امریکہ تو جا رہے ہو پر کبھی انگریزی کھانا بھی کھایا ہے؟ میں نے عرض کیا "کھانا تو دور کی بات ہے حضور میں نے تو دیکھا بھی نہیں ہے۔"

وہ فوراً بول اٹھے "تو میری دعوت انگریزی قسم کی ہوگی۔ میز کرسی ہوگی، چھری کانٹے ہوں گے۔ کھانے بھی انگریزی ہوں گے۔"

مجھے تو یہ بات مشکل ہی معلوم ہو رہی تھی مگر

انھوں نے جو کچھ کہا تھا سچ کر دکھایا۔ اچھی خاصی انگریزی قسم کی دعوت تھی اور اکثر لوگوں نے پسند کی۔

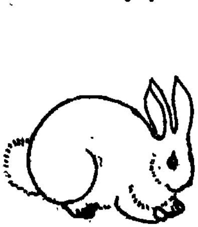
تو بھئی اس طرح دعوتوں کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔ اس کا اندازہ تم اس طرح لگا سکتے ہو کہ مجھے ۱۰ مئی کو ½۷ بجے جامعہ نگر سے اسٹیشن کے لیے روانہ ہو جانا تھا لیکن ½۶ بجے ایک چائے کی دعوت میں شرکت کرنا تھی انکار کیسے کرتا۔ اپنے عزیز ساتھی کی محبت کو ٹھکرانا میرے بس کی بات نہ تھی۔

لیجیے، ۱۰ مئی کو ٹھیک ساڑھے سات بجے جامعہ کی کار آ کر کھڑی ہو گئی۔ بہت سے استاد اور دوست احباب جمع ہو گئے۔ کوئی ہاتھ ملا رہا تھا کوئی گلے مل رہا تھا۔ بہت سے ساتھی اسٹیشن جانا چاہتے تھے۔ اُن میں سے چند تو کار میں بیٹھ گئے باقی بس میں بیٹھ کر اسٹیشن پہنچے۔

ہم لوگ ٹھیک آٹھ بجے اسٹیشن پہنچے۔ سامان کچھ زیادہ تھا تُلوایا گیا اور بُک کروا کر ساتھ لے لیا گیا۔ اب چلے اپنے رزرو ڈبّے کی تلاش میں۔ تمھیں شاید معلوم ہو کہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ سیکنڈ کلاس میں جن کی سیٹ پہلے سے رزرو ہوتی ہے اُن کا نام لکھ کر ڈبّے پر لگا دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی سیٹ کا نمبر بھی ہوتا ہے۔

میرے ساتھی ایک سرے سے ڈبّوں پر لکھے ہوئے نام پڑھتے جاتے تھے اور میرا نام نہ پا کر جز بز ہوتے تھے۔ اور بے چینی کے ساتھ آگے بڑھ جاتے تھے۔ کچھ ساتھیوں کو تو شک ہونے لگا کہ ریلوے والے شاید نام لکھنا بھول گئے۔ اتنے میں ایک ساتھی کو جو سب سے آگے تھے۔ ایک ڈبّے پر میرا نام مل گیا۔ مارے خوشی کے چیخ اٹھے۔ جناب یہ ہے آپ کا ڈبّہ۔ میں نے اور دو ایک اور ساتھیوں نے قلیوں کے سر سے سامان اُتروایا اور سیٹ کے ساتھ ترتیب کے ساتھ لگوا دیا۔ بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ اوپر کی سیٹ (برتھ) ملی تھی۔

(اگلا دلچسپ حال جولائی کے پرچے میں پڑھیے)



جناب محمود سرؔدش

والدین کی خدمت

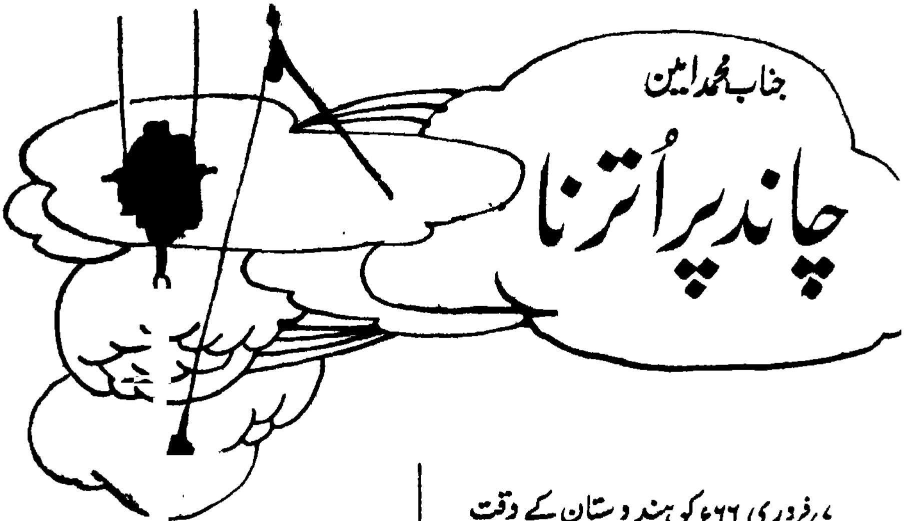
یہ سچ ہے ہم ہیں قدرت کی عطا اور وہ کھلونے ہیں
کہ جن کی زندگی سے آپ کھُل کر کھیل سکتے ہیں
یہ سچ ہے ہم بہت مجبور ہیں اور آپ کے تیور
بلک کر، چیخ کر، فریاد کر کے جھیل سکتے ہیں

مگر یہ بھی تو سچ ہے قوتِ احساس ہے ہم میں
مگر یہ بھی تو سچ ہے ہم بھی دل اور جان رکھتے ہیں
ہمیں تو آپ کا کردار وہ معیار ہے جس سے
زمانے کی برائی اور بھلائی کو پرکھتے ہیں

اسے تو آپ بھی تسلیم کرلیں گے کہ ہم وہ ہیں
جو ہر بات آپ کی بے رد و کدؔ تسلیم کرتے ہیں
سمجھ کر اس کو اپنا دین کرتے ہیں عمل اس پر
یہاں تک آپ کے ارشاد کی تعظیم کرتے ہیں

جھلک ملتی ہے جس میں آپ کے خلق و شرافت کی
زمانے والے ہم کو ایسا آئینہ سمجھتے ہیں
حقیقت پوچھیے تو آپ کے ہم ہیں نمائندے
غلط کرتے ہیں ہم کو آپ جو بچّہ سمجھتے ہیں

لہ بغیر عذر



چاند پر اُترنا

جناب محمد امین



۷؍فروری ۶۶ء کو ہندوستان کے وقت کے مطابق ۳ بج کر ۱۵ منٹ پر صبح برطانیہ کے سائنس داں برنارڈ لوول نے اعلان کیا کہ لونا ۹ پھر حرکت کر رہا ہے۔ ممکن ہے یہ حرکت کرتے ہوئے آگے بڑھے اور چاند کی اور تصویریں بھیجنا شروع کردے۔ یہ بھی خیال تھا کہ شاید ۱۴ روز تک مسلسل تصویریں آتی رہیں۔ اس کے بعد ممکن ہے کہ لونا ۹ تاریکی کے حصے میں چلا جائے (چاند پر دن اور رات دونوں چودہ چودہ دن کے ہوتے ہیں) اور رات میں چٹانوں کی جو کیفیت ہوتی ہے شاید اس کی تصویریں بھیجے۔ ایک تصویر وقت ختم ہونے کے بعد جو آئی تو اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ابھی حرکت کر رہا ہے۔ پھر کچھ محسوس ہوا کہ شاید وہ اوپر اٹھ رہا ہے اور پروفیسر برنارڈ لوول نے دنیا کو اچنبھے میں ڈالنے کے لیے ایک نئی بات یہ کہی کہ روسی سائنس داں اسے واپس لانے کی کوشش

کر رہے ہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ وہ اس میں کامیاب بھی ہو جائیں۔ لیکن یہ محض قیاس آرائی تھی اور ماسکو نے خود اعلان کر دیا تھا کہ ۵ / فروری ۶۶ء کو لونا ۹ تحقیق کا کام ختم کر دے گا۔

۵ / فروری کی شام تک ہمارے وقت کے حساب سے ۱۰ بج کر ۵۴ منٹ تک ۴ تصویریں آئیں۔ ۱۱ بج کر ۱ منٹ پر آخری تصویر آئی۔ اس کی بیٹری ختم ہو رہی تھی اس لیے تصویریں مدھم اور ہلکی ہونے لگیں۔ پھر یہ خبر گرم ہو گئی کہ لونا ۹ خاموش ہونے والا ہے۔ ۶ / فروری تک جو سگنل اور تصویریں آئیں وہ دھندلی اور ہلکی ہوتی چلی گئیں۔ ان کا سلسلہ رات کو ۱۲ بج کر ۳۰ منٹ اور پھر صبح ۲ بج کر ۱۱ منٹ تک باقی رہا۔ پھر روس کے خلائی اڈے بائکنور (یہ قزاکستان کے گھاس کے میدان میں واقع ہے) کے سنٹرل کنٹرول روم سے اعلان کیا گیا کہ لونا ۹ نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے اور اب وہ بالکل خاموش ہو گیا ہے۔ لیکن اس نے تصویریں بھیجنے کے ساتھ ساتھ ایک دلچسپ کام یہ بھی کیا ہے کہ روس کا جھنڈا اور قومی نشان بھی چاند پر اتار دیا ہے۔

لونا ۹ صحیح معنی میں طوفانی سمندر میں اترا تھا۔ یہ ایسی جگہ ہے جو ۷ / ڈگری ۸ منٹ شمالی عرض البلد اور ۶۴ ڈگری اور ۲۲ منٹ مغربی طول البلد پر واقع ہے۔ یوں سمجھیے کہ اگر ہم اپنی زمین کے نقشے کی طرح چاند کا نقشہ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ جگہ کیولیریس (cavalerious) کے بڑے دہانے یا کریٹر سے ۱۰۰ کلومیٹر (۶۲ میل) مشرق میں ہے۔

لونا ۹ کا وزن ۱،۵۸۳ کلوگرام تھا۔ اس میں خلائی اسٹیشن، انجن اور الگ الگ کمپارٹمنٹ تھے جن میں ایسے آلے فٹ تھے جو اسے اوپر لے گئے تھے۔ اس میں کوئی چیز پنجے نما بھی تھی جو چاند کی سطح کو چھوتے ہی خود بخود کھل گئی تھی تاکہ اترتے وقت اس کو دھکا نہ لگے۔ ٹیلی ویژن کے سسٹم کو محفوظ کرنے کے لیے پردے کا بھی اہتمام تھا۔

تجربہ کامیاب ہونے کے بعد ستاروں کے علم کے ماہر روسی سائنس داں ویسیلی فیزن کاف نے کہا کہ اب ہم میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔ ہم چاند پر مستقل طور سے آبزرویٹری قائم کر سکتے ہیں اور وہاں پر آلے جمع کر کے لونا ۹ کی قسم کے اور اسٹیشن دوسرے سیارے

خصوصاً مریخ تک بھیج سکتے ہیں۔

آہستگی سے اترنے کی اہمیت کا جائزہ لیتے ہوئے مسٹر فیز نکاف نے کہا کہ ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ چاند کی سطح کی کیا بناوٹ ہے۔ اس سے پہلے لاکھوں کروڑوں سال سے خلا سے ریڈ ایشن (شعاع افشانی) ہوتا رہا ہے۔ سورج کے طوفان شہاب ثاقب کی کھلم کھلا اور بے لاگ بمباری سے چاند کی سطح عجیب و غریب خصوصیات کی حامل بن گئی ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ اس کے ذروں میں بجلی بھی بھری ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ چاند کے مادّوں کو آزمایا جائے اور دیکھا جائے کہ ان میں کتنی طاقت ہے اور ان میں سے ہو کر بجلی کی لہریں کتنی تیز دوڑتی ہیں۔ کیا چاند پر گڑھا کھود کر کچھ گہرائی میں ان کے اثر سے بچا جا سکتا ہے؟ تاکہ لیباریٹری قائم کرنے کا پروگرام بنایا جائے۔

مسٹر فیز نکاف نے بتایا کہ یہ بھی ضروری ہے کہ یقینی طور سے یہ معلوم کر لیا جائے کہ چاند پر کرۂ ہوائی ہے یا نہیں؟ — ہو سکتا ہے کہ آتش فشاں کے مادّے جو کچھ بھاری بھی ہوں ان کو چاند نے اپنی کشش کے عمل سے روک رکھا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ چاند کے ماحول میں اندرونی گیسیں جیسے کرپٹان، ذے نان ہوں۔ لونا ۹ سے معلوم ہوگا کہ یہ گیسیں وہاں ہیں یا نہیں!

چاند کے رازوں کو اگر ہم معلوم کر لیں تو ہم کو یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ خلا میں بایوجنٹک (Biogenetic) کی قسم کے پیچیدہ آرگنک کمپاؤنڈ کو کیسے بنایا جا سکتا ہے اور اگر اس کا بھید معلوم ہو جائے تو ہم زمین پر زندگی کو ایسی شکل دے سکتے ہیں کہ وہ کبھی ختم نہ ہو یعنی لافانی بن جائے۔

روسی سائنسداں ابھی ۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ اس بات کا اندازہ کر رہے ہیں کہ ابھی چاند پر انسان کو اتارنے میں کتنے دن اور لگیں گے لیکن ایک جرمن سائنسداں نے جرأت سے کام لیتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ روس نے چاند پر لونا ۹ اتار دیا ہے لیکن یہ امریکہ سے بازی لے جانے کا سوال نہیں ہے۔ امریکہ نے خلائی پرواز میں جس طرح اپنی ٹیکنالوجی کو مکمل کر لیا ہے وہ بے مثل ہے اور روس اب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ محض ڈینگ ہے۔ روس مسلسل اور ایک خاص پروگرام کے

تحت اپنی اڑانیں کرتا آیا ہے۔ رکارڈ سے ظاہر ہے کہ اب تک ہر معاملے میں پہل اور جیت اسی کی ہے۔ پہلا اسپوتنک اس نے اڑایا۔ اس کے بعد پہلا خلائی انسان، پہلی خلاباز خاتون، پھر خلا میں دیر تک چکر لگانے کا پہلا اور نیا رکارڈ، خلا میں تیرنے کا پہلا کارنامہ اور آخر میں ۳؍فروری ۶۶ء کو چاند پر پہلا تصویریں بھیجنے والا خلائی راکٹ اتارنے کا سہرا بھی روس کے سر ہے۔

اس کے علاوہ دنیا کے ماہرین کا خیال یہ ہے کہ امریکہ چاند کی تحقیق کے سلسلے میں روس سے تین سال تک پیچھے ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ امریکہ خاموش بیٹھ جائے۔ وہاں کی بوئنگ کمپنی خلائی پرواز کے لیے ۸ مصنوعی چاند یا خلائی جہاز بنا رہی ہے ان میں سے تین زمین پر تجربے کرنے کے لیے استعمال کئے جائیں گے اور ۵ چاند کی اڑان کے سلسلے میں استعمال کئے جائیں گے۔ یہ اپولو نام کے راکٹ میں رکھ کر بھیجے جائیں گے اور چاند کے اوپر ۲۸؍میل کی بلندی سے یہ پرواز کریں گے اور مخصوص علاقوں کی تصویریں کھینچ کر بھیجیں گے۔ تصویروں کی تعداد ۱۹۴ ہوگی اور ۳۰ دن تک متواتر تصویریں آتی رہیں گی۔ دوسرے اعداد و شمار بھی موصول ہوتے رہیں گے۔ اس طرح ماہرین یہ معلوم کرلیں گے کہ چاند پر سب سے محفوظ جگہ کہاں ہے تاکہ وہیں خلا باز اتارے جائیں۔

دراصل خلاباز کے اترنے کی جگہ ایسی ہونی چاہیے جو ہموار ہو، وہاں کوئی دہانہ (آتش فشاں پہاڑ کا منہ یا کریٹر) نہ ہو۔ چٹانیں اندر سے کھوکھلی یا ڈھیلی ڈھالی نہ ہوں بلکہ ٹھوس اور مضبوط ہوں اور ان کا رقبہ کم سے کم ۲۵ مربع فٹ ہو۔

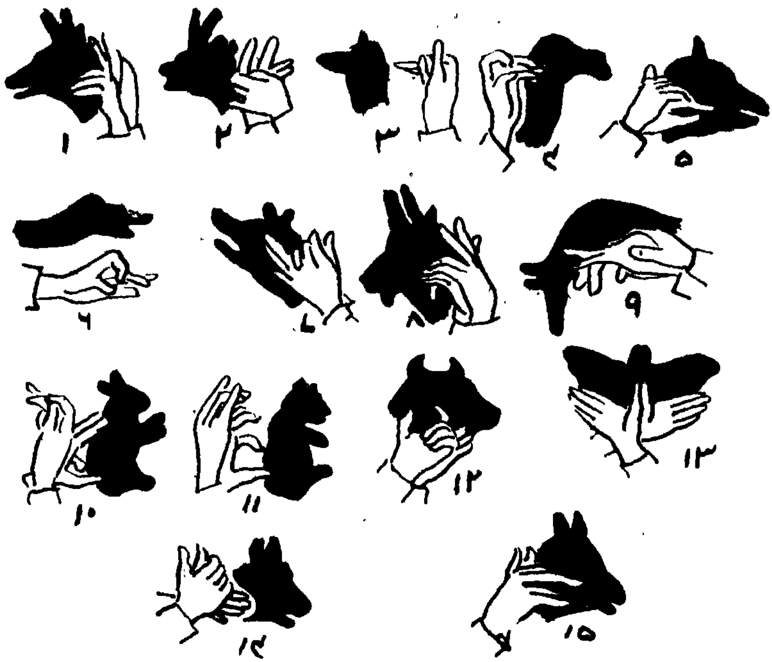
علم نجوم کے انگریز ماہر سر برنارڈ لوول نے ۷؍فروری ۱۹۶۶ء کو پیشین گوئی کرتے ہوئے کہا کہ لونا ۹ کی کامیاب اڑان اور آہستگی سے اترنے کی وجہ سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ روس چاند پر انسان یعنی پہلا انسان اتارنے کے منصوبے پر تیزی سے عمل کر رہا ہے۔ انھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ممکن ہے کہ چند مہینوں کے اندر اندر روس چاند کے دوسرے حصوں میں بھی خلائی جہاز یا راکٹ آہستگی سے اتار دے۔ اس کے بعد وہ راکٹ کو واپس لانے کی کوشش بھی کرے گا۔

پھر خلا میں چاند کے چاروں طرف اڑنے اور چکر لگانے کے لیے ایک خلا باز بھیجا جائے گا۔ اس سال یعنی ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۷ء میں ابھی شاید چاند پر آدمی نہیں اترے گا۔

روس نے لونا ۹ چاند پر اتار کر یہ شبہہ قطعی طور سے دور کر دیا ہے کہ وہ امریکہ کے ساتھ مل کر چاند پر پہنچنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ دراصل وہ تن تنہا چاند پر پہنچنے کا ارادہ پکا کر چکا ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ چاند کو چھو لینے کا ارمان اب مکمل ہونے ہی والا ہے۔ انسان نا ممکن کو ممکن بناتا جا رہا ہے۔ ہم خلائی پرواز شروع کرنے ہی والے ہیں۔ مبارک ہوں ہمارے سائنسداں کو ان کی کوششیں اور ہمارے جانباز خلائی پروازوں کو ان کی ہمتیں کہ انھوں نے خلا کی فتح کو اب قریب قریب ممکن بنا دیا ہے۔

ہاتھ کی پرچھائیں سے تصویریں بنائیں



[illegible]

[illegible]

[illegible]





جناب خالد عرفان

طنبورے کا اعجاز

اگر کوئی آپ سے پوچھے "آپ کس ملک کے باشندے ہیں؟" آپ بڑے فخر سے کہہ دیں گے "ہم ہندوستان کے شہری ہیں، ہمارا سر اونچا ہے' ہمیں آزادی جیسی نعمت میسر ہے جو زندہ قوموں کی جان ہے۔"

لیکن آزاد ہونے سے پہلے ہماری حالت کیا تھی؟ ہم پر انگریز حکومت کیا کرتے تھے۔ حکومت کیا کرتے تھے ہمیں لوٹ رہے تھے۔ ہماری ساری دولت انگلستان پہنچا رہے تھے۔ کیوں نہ پہنچاتے! وہ ہندوستان کو "سونے کی چڑیا" کہتے تھے اور اس چڑیا کے سارے سنہرے پر کھینچ لینا چاہتے تھے۔

اس خطرے کو ہمارے لیڈروں نے محسوس کیا، اور مہاتما گاندھی اور دوسرے نیتاؤں کی رہنمائی میں اپنے حق کو حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی۔ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے، اور تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی، تعجب ہوگا کہ اس خطرے کو اب سے کوئی دو سو سال پہلے ہی محسوس کر لیا گیا تھا، اس وقت جب کہ پہلے پہل انگریز یہاں تجارت کے بہانے آئے تھے اور

ہمارے ملک کے انتظامی معاملات میں دخل دینے لگے تھے۔

اس خطرے کو محسوس کرنے کے بعد بعض جانباز اور جان نثار بہادروں نے اپنی زندگی کی بازی لگا کر ملک سے انگریزوں کو نکالنے کی تگ و دو شروع کر دی تھی۔ ایسے جانباز حق پرستوں میں جہاں آپ بنگال کے نواب سراج الدولہ اور مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا نام لے سکتے ہیں، وہیں آپ میسور کے حاکم ٹیپو سلطان کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔

ٹیپو سلطان نے نہ تو محمود غزنوی کی طرح سومنات کو توڑا، نہ علاء الدین خلجی کی طرح اپنی حکومت کو شمال سے جنوب تک پھیلایا، نہ اکبر کی طرح نئی نئی اصلاحات اور قوانین رائج کیے۔ نہ شاہ جہاں کی طرح کوئی تاج محل تعمیر کرایا — نہ اورنگ زیب کی طرح وسیع سلطنت پر حکومت کی، لیکن آج بھی تاریخ میں ان کا نام سنہرے حرفوں میں جگمگا رہا ہے، اس لیے کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی جنگ کے میدان میں دشمنوں سے لڑ کر گزاری، انگریزوں کے ناپاک وجود سے ملک کو پاک کرنے کے لیے اپنی جان قربان کر دی، انھوں نے گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے افضل شیر کی ایک دن کی زندگی کو جانا، اور میدان جنگ میں لڑتے ہوئے اپنی جان نچھاور کر دی ——

کیوں نہ کرتے؟ وہ ایسے بہادر، دور اندیش، ذہین اور بارعب باپ کے بیٹے تھے جس نے جنگ کی چھاونیوں میں انتقال کیا تھا۔ اور جس نے مرہٹوں اور انگریزوں کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ اب سنئے ان ہی نواب حیدر علی خاں کی سپاہ گری، عقلمندی اور تدبر کا ایک واقعہ!

ٹیپو سلطان کو اپنے باپ سے میسور کی سلطنت ہی نہیں، تھکا دینے والی اور بربادی پھیلا دینے والی جنگ بھی ملی تھی۔ یہ جنگ انگریزوں سے ہی نہیں لڑی جا رہی تھی، مرہٹوں کے حملوں کو بھی روکنا تھا، پڑوسی بادشاہوں کے ناپاک ارادوں کو بھی کچلنا تھا۔

حیدر علی ریاست میسور کے حاکم راجہ کشن راج وڈیر کی فوج میں ایک معمولی سپاہی تھے، لیکن ریاست کے حالات کچھ اس طرح پلٹے کہ ان کی سپاہیانہ صلاحیت کے بل بوتے باج گزار ریاست میسور ایک خود مختار اور مضبوط حکومت میں بدل گئی۔

اس تبدیلی میں حیدر علی خاں نے نمایاں خدمات انجام دیں جس کی وجہ سے جلد ہی حکومت کی باگ ڈور

ان کے ہاتھوں میں آگئی۔

مرہٹوں کے حملوں سے شمال میں شاہان مغلیہ تنگ تھے اور دکن کے راجے مہاراجے اور حاکم الگ پریشان تھے۔ ریاست میسور پر مرہٹوں نے پہلا حملہ تو راجہ کے دوران حکومت میں ہی (۱۷۵۳ء) کیا تھا۔ اس جنگ میں انھیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی اور راجہ نے دب کر ایک کروڑ روپے دے کر صلح کرلی تھی۔ لیکن دوسرے ہی سال سپہ سالار حیدر علی خاں بہادر نے بڑی بامردی اور حکمت سے کام لے کر انھیں بعض علاقوں سے مار بھگایا۔ اب مرہٹہ سردار کسی نہ کسی خط پر چڑھائی کرکے آگے بڑھنے کے خواب دیکھنے لگے۔ بالآخر بارہ سال بعد (۱۷۶۶ء) مادھوراؤ نے اہم قلعوں پر حملہ کر دیا۔

نواب حیدر علی خاں کو اس حملے کی اطلاع ملی، انھوں نے اپنی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا۔ چتر درگ کے پالیگار نے آپ کا ساتھ دیا۔ مرہٹوں نے سازش کرکے ساونور کے حاکم کو اپنی طرف ملا لیا۔ اُس زمانے میں آج کی طرح طیاروں کے ذریعے بمباری نہیں کی جاتی تھی، نہ ٹینک تھے نہ طیارہ مار توپ۔ بس میدان میں دونوں طرف کی فوجوں کے درمیان دو بدو مقابلہ ہوتا، تلوار چلائی جاتی، تیر پھینکے جاتے، بہت ہوا تو بندوق اور توپ استعمال کرلی جاتی۔ آمنے سامنے کی لڑائی میں تو نواب کی فوجوں کا پلہ بھاری رہا لیکن مرہٹوں نے اپنی "دور مار توپ" کو ایک محفوظ پہاڑی پر نصب کرکے نواب کے لشکر پر خوب گولہ باری شروع کر دی جس سے کافی نقصان پہنچا، نواب نے توپ خانے پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا، پانچ ہزار نشانہ باز بندوقچیوں، پندرہ سو سواروں اور چار توپوں کو لے کر توپ خانے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ لیکن جنگل میں راستہ بناتے بناتے توپ خانے کے قریب پہنچتے تک ہی دن نکل آیا اور دشمن کو پتہ چل گیا۔ اس نے حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے نواب نے گھبرانے کی بجائے فوج کو ترتیب دیا اور توپوں کو سر کرنے کا حکم دیا۔ لیکن بارود اتنی ٹھنڈی ہو چکی تھی کہ چل نہ سکی۔ خود حیدر علی نے کوشش کی لیکن اس کو نہ بھڑکنا تھا نہ بھڑکی۔ اسی اثنا میں دشمن نے زوردار ہلّا بول دیا۔ حیدر علی کی فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ کئی بہادر مارے گئے اور جو بچے وہ تتر بتر ہو گئے۔ خود حیدر علی کی جان کے لالے پڑ گئے۔ بڑی حکمت عملی سے جان بچا کر بھاگے اور گھنے جنگل میں ایک درخت کے نیچے پناہ لی۔ ابھی وہ سستا رہے تھے کہ اتفاقاً وہاں ایک طنبورہ بجانے والا آگیا،

...... نواب کو فوراً دور کی سوجھی، وہ دشمن کو نیچا دکھانے کی سوچ رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ طنبورہ پوری قوت سے بجایا جائے، طنبورہ والے نے حکم کی تعمیل کی، طنبورہ بجانے لگا، جنگل گونج اٹھا، زمین آسمان کانپتے معلوم ہوئے، اس ہیبت ناک آواز کو سن کر مرہٹوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ انھیں ایسا لگا کہ نواب کی مدد کے لیے بھاری فوج آگئی ہے۔ اور ان کی طرف بڑھی چلی آرہی ہے، کہاں تو وہ فتح کی خوشی میں مست ہوئے جا رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے، کہاں وہ خوف کے مارے لوٹ مار سب کچھ چھوڑ چھاڑ اپنی چھاونی کی طرف بھاگنے لگے، نواب کی دلی مراد بر آئی۔ ان کا تیر نشانہ پر بیٹھا تھا۔ وہ خوش خوش میدان کی طرف لوٹے، اپنے منتشر سپاہیوں کو اکٹھا کیا اور میدان میں جا ڈٹے، اسی اثنا میں فوج کے بقیہ سپاہی جو پڑاؤ پر رہ گئے تھے چلے آئے، حیدرعلی سجدۂ شکر بجالائے اور تازہ دم سپاہیوں کو لے کر بھاگتے سپاہیوں کا تعاقب کیا، مقابلے پر اکسایا اور ایسی گولہ باری کی کہ مرہٹوں کو بھاگتے ہی بن پڑی۔ وہ زخمیوں اور لاشوں کو چھوڑ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور میدان حیدری لشکر کے ہاتھ رہا۔ ایک معمولی سے طنبورہ نے لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا۔ ہار کو جیت میں بدل دیا——

نواب حیدرعلی جتنے بہادر تھے اتنے ہی رحم دل، دور اندیش اور فراخ دل تھے۔ انھوں نے اپنے دشمن کی لاشوں کو دفنانے کا مناسب انتظام کیا اور زخمیوں کے علاج کے لیے معقول رقم عنایت فرمائی۔ ایک اچھے انسان کی یہی نشانی ہے کہ وہ اپنے جانی دشمن سے بھی اچھا سلوک کرتا ہے۔

ایک طالب علم کی

کہانی

ایک غریب طالب علم نے کس طرح محنت مزدوری کر کے ایک مدرسے میں تعلیم پائی پھر اسی مدرسے کا ہیڈ ماسٹر ہو گیا۔ عبدالغفار صاحب مدھولی نے یہ سچی کہانی بڑے دلکش انداز میں لکھی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کتاب پر حکومت ہند نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔ قیمت: ۲ روپیہ

بچوّں کی کوششیں



منگل مندر

اداکار

نارائن : ایک مالدار گھرانے کا لڑکا عمر دس سال

تارا : نارائن کی بہن

رمئی : ایک بھکاری لڑکا

اور نارائن کے ماں باپ اور نارائن کے کچھ ساتھی۔

[پہلا منظر]

نارائن :۔ (ایک روپیہ ہتھیلی پر لے کر) آہا ہا!
روپیہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ آج تو خوب
موج اڑاؤں گا! موج ہی موج اور کچھ
کام نہیں۔

(نارائن کی بہن تارا آتی ہے)

تارا : نارائن او نارائن!

نارائن : کیا ہے! تارا؟

تارا : یہاں اکیلے کیوں کھڑے ہو؟

نارائن: کچھ سوچ رہا ہوں!

تارا : کیا سوچ رہے ہو! (روپیہ دیکھ کر) یہ

روپیہ تمھیں کہاں ملا۔

نارائن: ماں نے دیا ہے آج میری سالگرہ ہے۔

تارا: ماں تو ایسے دینے والی نہیں۔

نارائن: یہی تو سوچ رہا ہوں پچھلے سال بڑی مشکل سے پچیس ۲۵ پیسے دیئے تھے۔ اس سال بنا مانگے ایک روپیہ!

تارا: اس روپیہ سے کیا کروگے۔

نارائن: (آنکھیں مٹکاکر) کھاؤں گا، پیوں گا، گھوموں گا، تماشہ دیکھوں گا جو جی میں آئے گا کروں گا۔

تارا: (منہ بچکاکر) تو، اپنے چٹ پٹے کھائیں ماں سے اور پیسے لیتی ہوں (تارا چلی جاتی ہے۔ پیچھے سے کنچن آکر نارائن کی آنکھیں بند کر لیتا ہے)

نارائن: چھوڑو۔ چھوڑو۔ ارے بھئی کون ہو، چھوڑو نا۔

کنچن: (آواز بدل کر) نام بولو تب چھوڑیں گے۔

نارائن: ارے پہچان لیا مادھو۔

کنچن: جھوٹ۔

نارائن: تب پھر کشور۔

کنچن: بالکل جھوٹ

نارائن: تب کون؟ موہن۔

کنچن: اور جھوٹ۔

نارائن: ارے نٹ کھٹ نٹو۔

کنچن: آگے بڑھو۔

نارائن: اچھا بھئی ہم ہارے اب تمھیں بتاؤ۔

کنچن: (ہاتھ چھوڑ کر) پہچانو میں کون ہوں۔

نارائن: ارے کنچن تمھیں تو میں نے دیکھا ہی نہیں چور کی طرح کیسے آ گئے۔

کنچن: آج تو بڑے خوش نظر آرہے ہو۔

نارائن: (خوش ہوکر) آج میری سالگرہ ہے، ماں نے مجھے ایک روپیہ دیا ہے، آج دن بھر موج اڑائیں گے چٹ پٹے والے کو کہہ آؤ کہ شام کو بڑھیا چٹ پٹے بنا کر لائے اور جیرے کا جل (زیرے کا پانی) بھی لائے۔

کنچن: کس کس کو دعوت دوگے۔

نارائن: ایک تم ہو، بہاری ہے، نٹو ہے، مادھو ہے، للیتا ہے، بسنت کو بھی دعوت دے آؤ۔ چار بجے باغ میں چٹ پٹے کا کھانا۔ پانچ بجے شربت کی دکان پر چل کر مزیدار

شربت پئیں گے اور چھے بجے سینما۔
کنچن: تو بھائی اتنے ساتھیوں کو بلانے کے لیے اتنی لمبی دوڑ تو مجھ سے نہ ہوگی۔ میں تو تمھاری دعوت سے باز آیا۔
بہاری: (آتے ہوئے) پر میں تو کھاؤں گا جل جیرا اور چٹ پٹی چیزیں مجھے بہت بھاتی ہیں بتاؤ اور کس کس کو بلاؤ گے میں بلا لاؤں گا۔
نارائن: ننو، مادھو، للیتا۔ بسنت کو بلانا ہے۔ ڈاکخانے کے پاس رحمان رہتا ہے اسے بھی بلانا ہے۔ شام کو چار بجے۔
بہاری: ننو، للیتا، رحمان کو میں بلا لاتا ہوں اور بسنت کو تم کنچن۔
کنچن: ہاں اب مجھے منظور ہے۔
نارائن: تو تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ چار بجے پہنچو گے نا؟
بہاری اور کنچن: ہاں ضرور۔
(دونوں چلے جاتے ہیں)
(نارائن پھر سوچنے لگتا ہے اتنے میں کسی کے گانے کی آواز سنائی دیتی ہے)
منگل مندر کھولو دیا میں
منگل مندر کھولو

(یہ گاتے ہوئے ایک بھکاری لڑکا سامنے آتا ہے)
نارائن: تم کون ہو؟
لڑکا: میں بھکاری ہوں۔
نارائن: کیا تمھارے ماں باپ نہیں ہیں؟
لڑکا: ماں نہیں ہیں وہ تو مجھے بچپن ہی میں چھوڑ کر چلی گئیں۔
نارائن: اور باپ؟
لڑکا: وہ کئی دن سے بیمار ہیں
نارائن: کیا کام کرتے ہیں؟
لڑکا: مزدوری کرتے ہیں۔
نارائن: تمھارے کوئی بھائی بہن؟
لڑکا: ایک بھائی تھا وہ پہلے ہی مر گیا۔
نارائن: ایسی کڑاکے کی دھوپ میں کہیں تم بیمار پڑ گئے تو...؟
لڑکا: بھگوان جیسا کرے گا ویسا ہوگا۔
نارائن: تم پڑھتے نہیں؟
لڑکا: دوسرے درجے میں پڑھتا ہوں۔
نارائن: یہ گانا تم نے کہاں سے سیکھا۔
لڑکا: میرے پتا روز کھانی کر بھجن گانے لگتے ہیں ان سے سن سن کر میں نے سیکھ لیا۔

نارائن : تمہارا نام کیا ہے ؟
لڑکا : رمئی ۔
نارائن : تمہارے پتانے کچھ بچا کر کیوں نہیں رکھا ؟
لڑکا : اُنھیں روز بیس ہی پیسے ملتے تھے ۔
نارائن : (دل میں کچھ سوچتے ہوئے) بڑا اُدکھی لڑکا ہے ۔
(جیب میں سے ایک روپیہ نکال کر دیتے ہوئے)
اب جاؤ بھیک نہ مانگا کرو بیس پیسے کے
حساب سے یہ روپیہ پانچ دن چلے گا اتنے دن
تم اپنے پتا کی خدمت کرنا ۔
(لڑکا دعائیں دیتا ہوا چلا جاتا ہے ۔)
نارائن : (سوچتے ہوئے) اب میں اپنے دوستوں کو
کیا منہ دکھاؤں گا ۔ یہ میرا مذاق اڑائیں گے
(اتنے میں نارائن کے پتا آتے ہیں)
نارائن کے پتا : تو اداس کیوں کھڑا ہے ۔
(نارائن سب حال کہہ سناتا ہے)
نارائن کے پتا : (خوش ہو کر) تو نے بہت اچھا
کام کیا ۔ دعوت کی فکر نہ کر آج شام تیرے
اسکول کے تمام لڑکوں کی دعوت میری طرف سے
ہوگی (نوکر سے) جاؤ اسکول کے بچوں
کو شام کی دعوت کے لیے کہہ آؤ ۔
(پردہ گرتا ہے ۔)

عبدالغفار بمبئی

ایمی جانسن

ایمی جانسن دنیا کی پہلی ہوا باز خاتون تھیں ۔ جنھوں نے تنہا انگلینڈ سے آسٹریلیا کا سفر ہوائی جہاز کے ذریعے طے کیا ۔

ایمی جانسن ۱۹۰۳ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوئیں ۔ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے ہوائی پرواز کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی ۔ یہ تعلیم انھوں نے دو سال میں پوری کی ۔ وہ ایک بہترین ہواباز اور ہوائی جہاز کی ماہر انجینیر بن گئیں ۔

۱۹۳۰ء میں ایمی جانسن نے ایک چھوٹے ہوائی جہاز پر ایروڈن بیوری (انگلینڈ) سے برسین (آسٹریلیا) تک تنہا اڑان کی ۔ ان کی اس ہمت اور اس قدر طویل پرواز کی وجہ سے حکومت نے انھیں C.B.E کا اعزاز عطا کیا ۔

۱۹۳۱ء میں ایمی جانسن نے انگلینڈ سے ٹوکیو (جاپان) تک ہوائی پرواز کی اور پھر ہوائی جہاز پر ہی انگلینڈ واپس آگئیں ۔ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے انگلینڈ سے جنوبی افریقہ تک ہوائی اڑان کی ۔ ان دونوں اڑانوں میں انھوں نے پچھلے عالمی ریکارڈ توڑ دیے ۔

۱۹۳۲ء میں انھوں نے جے۔ اے۔ مولسن سے شادی کی۔ یہ بھی مشہور ہوا باز تھے۔ ۱۹۳۳ء میں ایمی جانسن نے اپنے شوہر کے ساتھ اٹلانٹک کو ہوائی جہاز کے ذریعے پار کیا۔ انھوں نے شمال سے جنوب کی طرف پرواز کی۔ ایمی جانسن اور اُن کے شوہر نے اٹلانٹک کو ۳۹ گھنٹوں میں پار کیا۔

۱۹۳۶ء میں ایمی جانسن نے تنہا لندن سے کیپ ٹاؤن تک پرواز کی اور پھر اسی جہاز پر لندن واپس آگئیں۔

ایمی جانسن کے ہوائی کارناموں کی وجہ سے حکومت انگلینڈ کی جانب سے کئی خطابات اور ٹرافیاں دی گئیں۔ رایل ایرو کلب کی جانب سے انھیں گولڈ میڈل بھی دیا گیا۔

ایمی، دوسری جنگِ عالمگیر کے دوران میں رسد لے جانے والی ہوائی فوج میں شامل ہو گئیں۔

۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو اس عظیم اور مہم پرست خاتون کو پرواز کے دوران ہی قتل کردیا گیا۔ ایمی جانسن ایک دلیر، نڈر اور بہادر خاتون تھیں جنھوں نے بڑی بڑی ہوائی پروازیں ہی نہیں کیں بلکہ ہوائی جہاز کی مقبولیت میں بھی بہت اہم رول انجام دیا۔

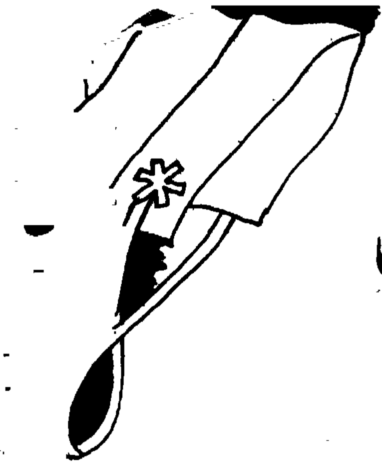
سید محمد جمال الدین
میسور

حمد

یارب تونے سب کو بنایا
توہی رازق توہی داتا
تیرے ہی گن گاتے ہیں ہم
تجھ کو اپنا بناتے ہیں ہم
ہرے بھرے ہیں پیڑ اور پودے
تیری عنایت تیرے کرم سے
شان کہیں کیا مولا تیری
تو سب کا، سب دنیا تیری
ہر تنکے میں تیری قدرت
ہر ذرہ میں تیری حکمت
توہی حکیم اور توہی علیم
تو رحمان اور توہی رحیم
آرزو اپنی یہ ہے مولا
ہم کو دکھا دے سیدھا رستہ

مشہود انوار سہیل جامعہ

جناب اقبال مہدی



ننھی کا ٹوپ

بعض لوگ "ٹوپا" کہتے ہیں۔ اس سے بچوں کے سر ڈھکے جاتے ہیں۔

عام طور پر رنگین اور بڑھیا قسم کے لیکن پہنے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ گوٹہ کناری اوپر سے لگا دیتے ہیں۔

ایسا ٹوپ خوش نما تو ضرور ہوتا ہے لیکن بہت دن چلتا ہے۔ پہنتے پہنتے طبیعت اکتا جاتی ہے، اسی لیے، ننھی ہو یا ننھا۔ بڑا ہوتے ہی سر سے اُتار دیتا ہے اور پھر کبھی نہیں پہنتا۔

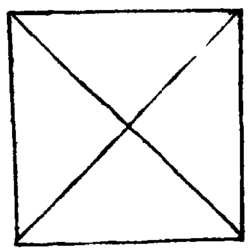
ایسے ٹوپ کے بجائے رنگین کاغذ کا ٹوپ بہت اچھا رہتا ہے، جلد پھٹ جاتا ہے اور آسانی سے بن جاتا ہے۔

ننھی کا نام تو ایسے ہی لکھ دیا ہے۔ اسے ننھے کو بھی پہنا سکتے ہیں۔ آپا بھی پہن سکتی ہیں اور بھائی جان بھی۔ جس کا جی چاہے وہی پہن سکتا ہے۔ سر ڈھکنے اور سر سجانے کے لیے کام کی چیز ہے

صحیح ناپ کا بنانا چاہیں تو سر کی لمبائی ناپ لیجیے۔ اور ٹوپ کے لیے مربع کاغذ اتنا بڑا لیجیے کہ اس کا ایک کنارہ سر کی لمبائی کے دوگنے سے ایک ڈیڑھ انچ بڑا ہو۔ امید ہے سر پر ٹوپ ٹھیک آئے گا۔ اگر ٹھیک نہ آئے اور تنگ ہے تو سر کو دبا کر چھوٹا کر لیجیے۔ ڈھیلا ہے تو سر کو پھیلا کر بڑا کر دیجیے۔ اگر کسی وجہ سے ایسا نہ کر سکیں تو دوسرا کاغذ ضرورت کے مطابق

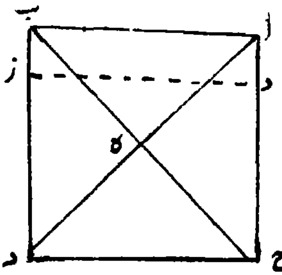
چھوٹا یا بڑا کر کے دوسرا ٹوپ تیار کر لیں۔ یہ بھی نہ کرنا چاہیں تو جیسا بن گیا ہے اسی کو استعمال کریں۔ دیکھنے والے ہنسیں گے ہی روئیں گے نہیں۔

اگر یہ ٹوپ گڑیا کو پہنائیں تو وہ اور بھی پیاری معلوم ہوگی۔ ٹوپ بنانے کا طریقہ یہ ہے۔



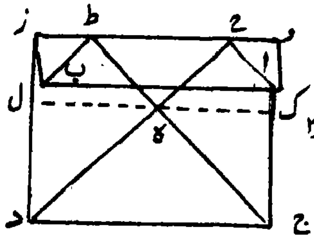
شکل ۱

عمل نمبر ۱۔ ایک مربع کاغذ لیجیے۔ آمنے سامنے کے کونوں کو ملا کر دونوں وتر پر شکن ڈالیے۔ (شکل ۱) کاغذ کو پلٹ کر نیچے کی سطح اوپر لے آئیے۔ دونوں وتر کی شکنیں اس طرف ابھری ہوئی ہوں گی۔



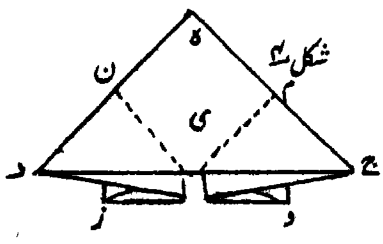
شکل ۲

عمل نمبر ۲۔ شکل ۲ کے کنارے اب کو نقطہ دار خط وز پر موڑیے (دیکھیے شکل ۲) اد کا فاصلہ اج کے فاصلے کے ایک چوتھائی سے کچھ کم ہونا چاہیے۔



شکل ۳

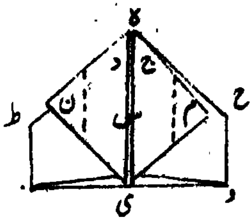
عمل نمبر ۳۔ مستطیل اب وز کے پلٹ جانے سے وتر کی شکنیں ح ا اور ط ب دبی ہوئی اوپر آئیں گی شکل ۳ کے کاغذ کو ج ط اور د ح پر پیچھے کی طرف موڑ کر ان شکنوں کے ابھار کو اور نمایاں کر لیجیے۔



شکل ۴

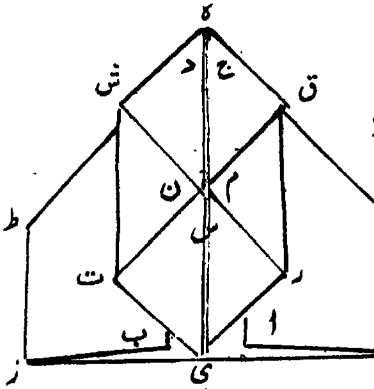
عمل نمبر ۴۔ اب شکل ۳ کے کنارے وز کو کنارہ ج د کی طرف تے ہوئے، مرکزی نقطہ دار خط ک ل پر موڑیے موڑ پر شکن لیے۔ کاغذ کو پھر کھول کر شکل ۳ کی طرح رکھ دیجیے نئی شکن بنی ہوئی آ سے دگی۔

عمل نمبر۵۔ شکل ۴ کے نقطہ ہ کو اوپر ابھارتے ہوئے کاغذ کو ابھری ہوئی اور دبی ہوئی شکنوں پر تہہ کیجیے۔ کاغذ شکل ۵ کی طرح تہہ ہو جائے گا۔



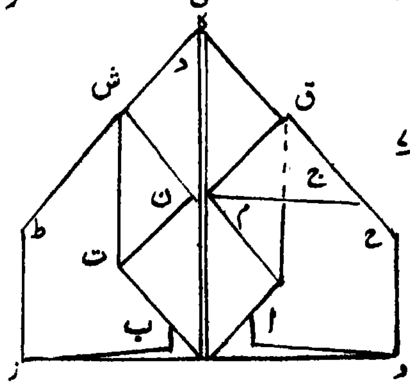
شکل ۵

عمل نمبر۶۔ شکل ۵ کے کونہ ج کو کونہ ہ پر رکھ کر کاغذ کو نقطہ دار خط م ی پر موڑیے۔ اسی طرح کونہ د کو بھی کونہ ہ پر رکھ کر کاغذ کو نقطہ دار خط ن ی پر موڑیے۔ (شکل ۶)



شکل ۶

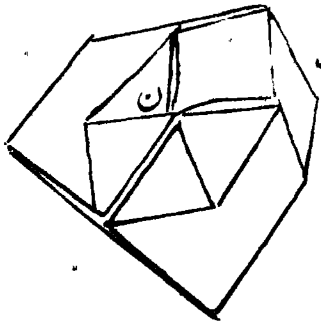
عمل نمبر۷۔ شکل ۶ کے کونہ م کو نقطہ س پر رکھ کر نقطہ دار خط پر موڑیے۔ اسی طرح کونہ ن کو نقطہ س پر رکھ کر نقطہ دار خط پر موڑیے۔



شکل ۷

عمل نمبر۸۔ شکل ۷ کے پرت ق م اور پرت ش ن جیب دار ہوں گی۔ کونہ ہ سے پرت ج کو اٹھا کر جیب ق م کے اندر رکھنا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے پہلے شکل ۷ کی پرت ج کو نقطہ دار خط ق م پر موڑیے۔

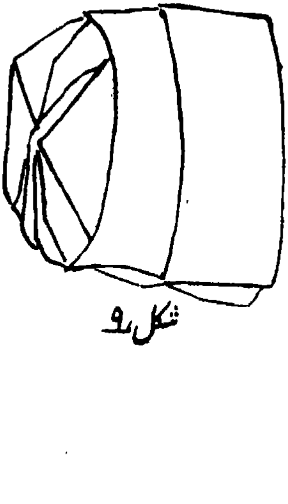
عمل نمبر ۹ شکل ۸ کے کونہ ج کو اٹھا کر نقطہ دار
خط پر پھر موڑیے۔ اس طرح جو مثلث تہہ ہو گیا ہے
اس کو اٹھا کر جیب ق م کے اندر رکھ دیجیے۔ موڑ کو
اچھی طرح دبا دیجیے۔



شکل ۸

عمل نمبر ۱۰۔ اب شکل ۸ کے پرت د کو عمل نمبر ۸ اور نمبر ۹
کی طرح تہہ کر کے جیب ش ن کے اندر رکھ دیجیے۔

عمل نمبر ۱۱۔ اس تہہ کیے ہوئے کاغذ کو اٹھائیے۔
اس کی پشت پر ایک جیب سی بنی ہو گی (شکل ۸)
کونہ م اور کونہ ن کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں
سے تھام کر دائیں ہاتھ سے پشت کی جیب کو باہر کھینچیے۔
پھر انگلیوں کی مدد سے شکل ۹ کی طرح کھول لیجیے۔
یہ "ننھی کا ٹوپ" ہے۔ مضمون کے شروع میں
بنی ہوئی تصویر کی طرح اس ٹوپ کے کھلے ہوئے دونوں
کناروں پر رنگین کریپ کاغذ کی ایک پٹی کاٹ کر
لگا لیجیے۔ اس کے جوڑ چھپانے کے لیے ایک اور پٹی سے
پھول بنا کر چپکا دیجیے۔


شکل ۹

کریپ کاغذ کے بجائے ریشمی کپڑے کا فیتہ مضبوط رہے گا۔
ٹوپ فیتے اور پھولوں کے لیے اگر رنگ برنگے کاغذ اور ربن استعمال کیے جائیں۔ تو تیار ہو کر
ٹوپ خوب صورت دکھائی دے گا۔

بچّوں کی معلوماتی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
آدمی کی کہانی	مشتاق احمد اعظمی	۱/۲۵
انوکھا عجائب خانہ، اوّل	محمد حسین حسّان	-/۵۰
″	″	-/۴۰
″	″	-/۴۰
″	″	-/۵۰
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	-/۵۰
بجلی اور مقناطیس کے کھیل		-/۷۵
دادا کی کہانی	پروفیسر عبدالغفور	-/۵۶
تاریخ ہند کی کہانیاں، اوّل	خجستہ سلطانہ	-/۸۰
″ دوم	ضیاء الرّحمٰن	-/۸۰
″ سوم	مشتاق احمد اعظمی	-/۸۰
″ چہارم	″	-/۸۷
چٹانوں کی کہانی	محمد امین ایم۔اے	۱/۷۵
دادا نہرو	مُنوّر لکھنوی	۱/۵۰
دُنیا کے بسنے والے	بشیر حسین زیدی	-/۷۵
دُنیا کے بچے	محمد حسین حسّان	-/۶۵

کتاب	مصنف	قیمت
قدرت کے کرشمے		-/۶۲
سونے کی چڑیا	محمد عبدالغفور	۱/=
سمندر کے کنارے	سُلطانہ آصف فیضی	۱/۱۲
سماجی زندگی اوّل	احمد الدین پٹیل و غلام ابرار	-/۵۶
″ دوم	″ ″	-/۸۰
″ سوم	″ ″	-/۸۱
″ چہارم	″ ″	-/۸۱
گاندھی بابا کی کہانی	بیگم قُدسیہ زیدی	۲/=
مُفید معلومات اوّل		-/۵۰
″ دوم		-/۷۵
″ سوم		۱/۲۵
″ چہارم		۱/۵۰
معلومات کی پانچویں		۱/۵۰
مقناطیس کی کہانی		-/۴۴
میر تقی میرؔ	محمد حسین حسّان	۱/=
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۵۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

صحافی

ادھر اُدھر سے



بلی جیسی آنکھیں

روس میں ایک صاحب حیوانات کے ماہر ہیں۔ بھلا سا نام ہے وسوولودیو ٹوپولوسکی۔ یہ اب تک کچھ نہیں کچھ نہیں تو تیس ہزار سانپ پکڑ چکے ہیں۔ ان میں سے کوئی پانچ ہزار تو افعی ہیں۔ یعنی بہت ہی زہریلے سانپ لگ بھگ پانچ ہزار ناگ ہیں۔ ایک سانپ بہت خوب صورت ہوتا ہے۔ اس کی جلد کی رنگت ایسی جیسے شام کو ڈوبنے والا سورج ریگستان میں اپنا سُرخ رنگ بکھیر رہا ہو۔ یہ سانپ بھی کوئی دس ہزار کی تعداد میں پکڑے ہیں۔ ایک سانپ ایسا بھی ہوتا ہے جس کی آنکھیں بلیوں جیسی ہوتی ہیں ان کے علاوہ اور بہت سے عجیب و غریب قسم کے سانپ پکڑے ہیں۔

ان صاحب نے عمر بھر میں بس ایک سانپ مارا ہے وہ بھی ایک خاص ضرورت سے۔ وہ کہتے ہیں کہ سانپ فصل کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں کو ہلاک کرتا ہے۔ ان سانپوں کو ہلاک کیا گیا تو یہ کیڑے فصلوں کو تباہ کر دیں گے۔

١٦١ ویں سالگرہ

اس سے پہلے انہی صفحوں پر شیرعلی مسلموف کا ذکر آچکا ہے۔ یہ دنیا کے معمر ترین انسان تھا

مئی ۱۹۶۶ء میں وہ خیر سے ۱۶۱ سال کے ہوگئے، اور ایک سو باسٹھویں سال میں قدم رکھا۔ شیر علی مسیلموف صاحب ماشاء اللہ خوب تندرست ہیں چاق و چوبند ہیں، خوش و خرم ہیں۔ ان کی یہ ۱۶۱ دیں سال گرہ خوب دھوم دھام سے منائی گئی۔ خدا نظر بد سے بچائے، ماشا اللہ بھرا پرا کنبا ہے۔ پوتے پوتیاں پڑ پوتے پڑ پوتیاں سب ملا کر تعداد ۱۴۰ تک پہنچ جاتی ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں سے اور خود سوویت یونین سے ان کے پاس روزانہ ان گنت خط آتے رہتے ہیں ان خطوں میں انھیں مبارکباد دی جاتی ہے اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ہم سب کی بھی یہی دعا ہے کہ خدا ان کی عمر اور دراز کرے

بچھڑا یا بارہ سنگھا

قزاق (سوویت یونین) کے پاس کیروف اجتماعی فارم ہے یہاں ایک گائے کے بچھڑا پیدا ہوا ہے۔ یہ بچھڑا بالکل بارہ سنگھے جیسے لگتا ہے اس کے بڑھنے کی رفتار بھی حیرت انگیز ہے۔ سائنسدانوں کی نظر میں بھی یہ جانور دوغلا یا دو نسلا ہے۔ بات یہ ہے کہ بارہ سنگھے اس علاقے میں آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ پالتو مویشیوں میں مل کر چرائی میں بھی شریک ہو جاتے ہیں۔

مدرسہ ثانوی کا سالانہ جلسہ

مئی کے پہلے ہفتے میں مدرسہ ثانوی جامعہ (ہائر سکنڈری اسکول) کے بچوں کی انجمن اسٹوڈنٹس کونسل کا سالانہ جلسہ حسب معمول بہت دھوم دھام سے منایا گیا۔ مہمان خصوصی مسز چیسٹر باؤلز (امریکی سفیر کی بیگم صاحبہ) تھیں۔ انعامات انہی کے ہاتھوں سے تقسیم کرائے گئے، مسز چیسٹر باولز کی خدمت میں صدر جانسن کا بسٹ بھی پیش کیا گیا۔ بسٹ تیاگی صاحب کی فنکاری کا اچھا نمونہ تھا۔ یہ تیاگی صاحب ٹیچرس ٹریننگ کالج میں آرٹ کے استاد ہیں۔ امریکن رپورٹر میں یہ بات غلط چھپ گئی ہے کہ تیاگی صاحب مدرسہ ثانوی کے استاد ہیں۔

مدرسہ ابتدائی کا سالانہ جلسہ

۱۳ رمئی کو مدرسہ ابتدائی جامعہ میں بھی سالانہ جلسہ ہوا اور انعامیان کی جگہ سرٹیفکٹ وغیرہ بچوں کو تقسیم کیے گئے۔ مدرسہ کے منتظمین

نے پیام تعلیم کے نمائندے کو شرکت کا اعزاز نہیں بخشا نہ جلسے کی رپورٹ بھیجی۔ اس لیے زیادہ تفصیل نہ معلوم ہو سکی۔

ہندوستان کا سب سے گہرا کنواں

بیکانیر (راجستھان) کے ضلع میں ایک گاؤں میں ایک کنواں سات سو فٹ گہرا ہے۔ کہتے ہیں پورے دیس میں اس سے زیادہ گہرا کنواں نہیں ہے۔ اتنا گہرا ہونے پر بھی پانی اس میں چار فٹ سے زیادہ نہیں رہتا اور گرمیوں میں بالکل خشک ہو جاتا ہے۔

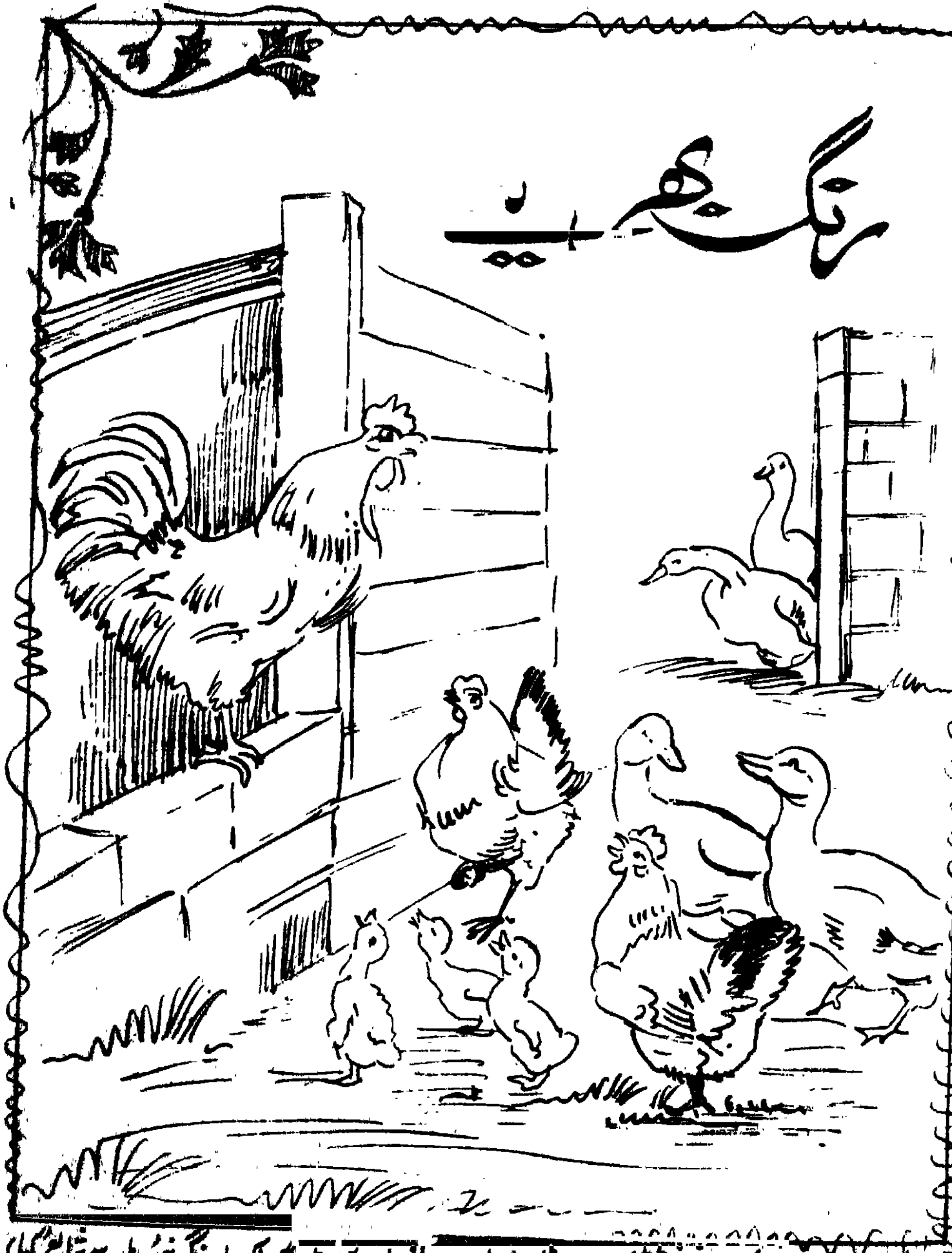
ہماری زمین کے کئی چاند

جوں جوں چاند کے بارے میں سائنسدانوں کی تحقیق کا سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔ نئی نئی باتیں سامنے آ رہی ہیں۔ پہلے چاند کی سطح کے بارے میں اختلاف تھا کوئی اسے بھربھرا کہتا تھا۔ کوئی اسے ٹھوس بتاتا تھا۔ پرلونا ۹ کے سلامتی کے ساتھ چاند پر اتر جانے سے یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ چاند کی سطح بھربھری نہیں ٹھوس ہے۔

کچھ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ چندا ماموں ہماری زمین کا حصہ نہیں ہیں۔ یعنی یہ زمین کے تیزی سے گھومتے وقت اس سے ٹوٹ کر نہیں بنے ہیں اور یہ جو کہتے ہیں کہ اس کے الگ ہونے سے زمین میں جو گڑھا ہو گیا ہے۔ اس میں پانی چڑھ دوڑا اور بحر الکاہل سمندر بن گیا سو یہ خیالی بات ہے۔ ان کے خیال میں چاند ایک ستارہ تھا۔ یہ بے چارہ آفت کا مارا راستہ بھٹک گیا۔ زمین کی کشش کے چکر میں پھنس گیا اور ایک غلام کی طرح زمین کے گرد چکر کاٹ رہا ہے۔

پر آپ تو ذرا صبر سے کام لیجیے۔ تھوڑے دنوں بعد انسان کے قدم چاند پر پہنچ جائیں تو اس کی اصلیت کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔

اور ہاں بہت سے سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ چاند جیسے اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے سیارے ہماری زمین کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔

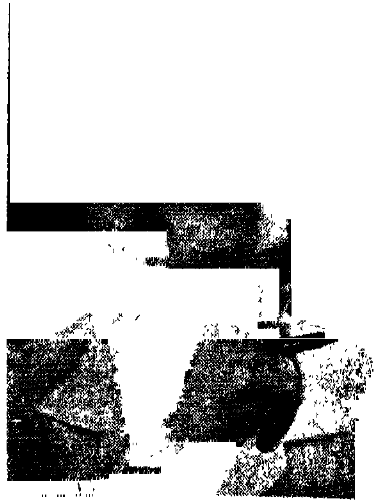


(ایڈیٹر پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا)

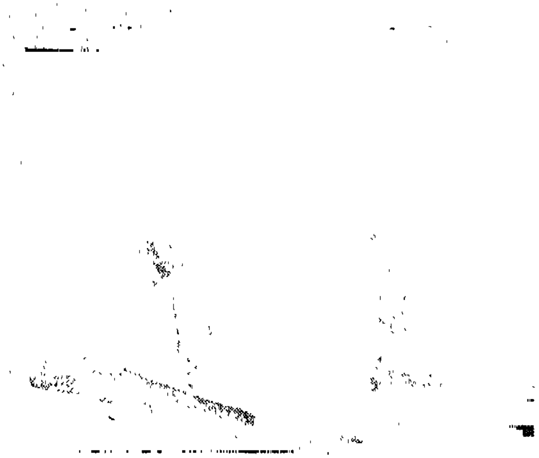
بچّوں کی دل چسپ اور سبق آموز کتابیں

ایک پکوڑی تیل میں راجا جی جیل میں ۴۰/-	اُس نے کیا کرنہ جانا ۳۷/-	بچّوں کی کہانیاں ۳۷/-	بڑے دادا کی کہانی ۵۶/-
پرندوں کا ایکا ۲۰/-	تانبیل خاں ۳۰/-	تُرکوں کی کہانیاں ۵۵/-	جنگو کی بلّی ۲۵/-
چنبیلی ۵۰/-	چمپاوت کا آدم خور شیر ۳۵/-	چوہوں کی کانفرنس ۴۵/-	خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا ۳۰/-
سونے کی چڑیا ۱/=	شہزادہ اور ٹھگ ۴۵/-	شہزادی گلفام ۵۰/-	شہزادی گلنار ۴۰/-
شیدلا ۵۰/-	کیمپ فائر کی نقلیں اوّل ۷۵/-	کیمپ فائر کی نقلیں دوم ۷۵/-	لال مُرغی ۵۰/-
مزہ چکھائیں گے ۳۵/-	مُرغی اجمیر چلی ۲۵/-	ننّھا ٹٹّو ۳۰/-	ہمّت کے پھل ۳۵/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵



ظفر گورکھپوری



اظہر افسر



یوسف ناظم

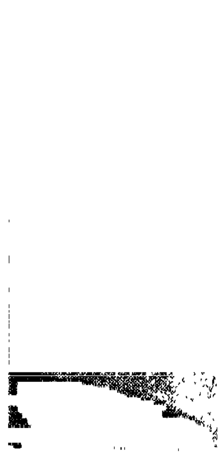


بزمی بھارتی

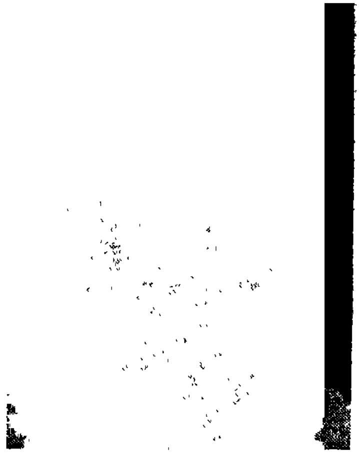
1966 Reg D.1

Payam-i-Taleem
New Delhi-25.

سید عبدالستار دلوی عمر ۱۲ سال (ممبئی) فوٹو: شاہد علی خاں



قاسم میاں عمر ۱ سال



شائستہ مجیب عمر ۲ سال



حامد وحید عمر ۵ سال



محمد آصف خان عمر ۴ سال

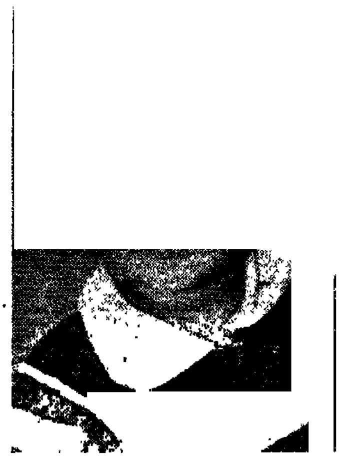


فرح عرفانی عمر ۲½ سال

گولو عمر ۶ ماہ



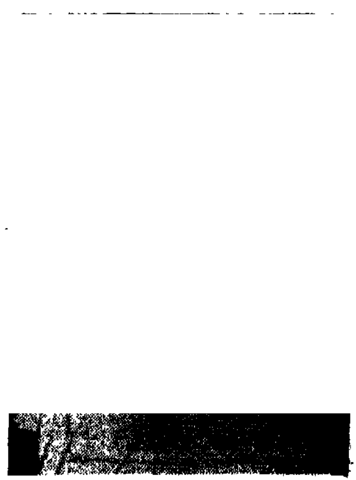
عمو میاں رامپور عمر ۵ سال



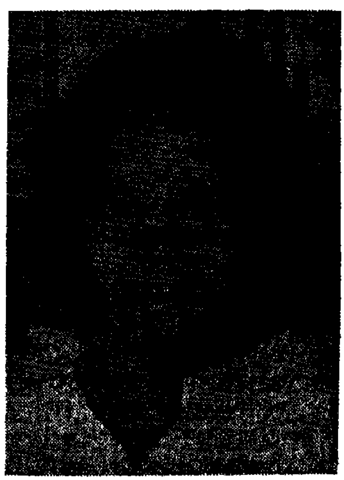
حمیدہ بیگم عمر ۲ سال



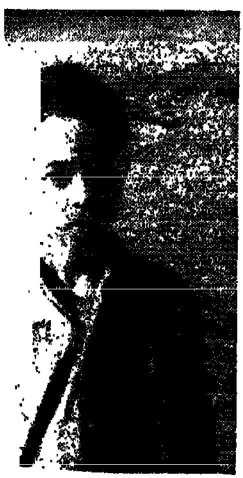
محمد مصطفیٰ عمر ۴ سا



متین میاں عمر ۱۲ سال



شیریں مجیب عمر ۶ سال



سیف الرحمٰن عمر ۶ سال

ریاست جموں وکشمیر میں تمام تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ



پیام تعلیم
دہلی

جلد ۳ — جولائی ۱۹۶۶ء — شمارہ ۷

ایڈیٹر: محمد حسین حسّان ندوی

آرٹسٹ: گلیڈون میسی

سالانہ چندہ: — پانچ روپے

فی پرچہ: — پچاس پیسے

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

بمبئی آفس:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنس بلڈنگ، جے جے ہسپتال، بمبئی ۸



سرورق ــــــــ غزالہ عمر ۲½ سال
کے ــــــــ فوٹو: شاہد علی خاں

فہرست



بچّوں سے باتیں

جون کے دوسرے تیسرے ہفتے میں قریب قریب سبھی ریاستوں میں ہائی اسکولوں ، ہائر سکنڈری اسکولوں، انٹرمیجیٹ کالجوں کے آخری امتحانوں کے نتیجے نکل گئے۔ ان امتحانوں میں ہمارے بہت سے پیامی بھی شریک تھے۔ اور بہت سے پیامی اس امتحان میں کامیاب ہوگئے۔ یہ ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہم ان سب کو دِلی مبارک باد دیتے ہیں۔

اکثر صوبوں میں کسی خاص مضمون میں اوّل آنے والوں کو انعام بھی دیے جاتے ہیں۔ بمبئی میں اُردو، فارسی اور عربی میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے بھی انعام کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ اس مرتبہ اُردو کا پہلا انعام عزیزہ پیش امام افروزہ بیگم ابراہیم کو ملا۔ یہ رئیس ہائی اسکول بمبئی کی طالب علم ہیں۔ انھیں کئی اور مضمونوں میں بھی انعام ملے ہیں۔ اردو کا دوسرا انعام بھی ایک لڑکی عزیزہ امرچنٹ خدیجہ احمد کو ملا ہے۔ یہ سلیمان گرلز ہائی اسکول بمبئی کی طالبہ ہیں۔

فارسی کا پہلا انعام عزیزہ میرائی حسین سید آغا نے حاصل کیا ہے۔ یہ سینٹ جوزف ہائی اسکول عمرکھاڑی کی طالبہ ہیں۔ عربی کا پہلا انعام دامانی محبوب حسین کو ملا ہے۔ یہ سیفیہ ہائی اسکول

پاسے دھونی کے طالب علم ہیں۔ اس غیر معمولی اور نمایاں کامیابی پر یہ سب ہماری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔

مئی کے پرچے میں ہم نے ایک نظم "پاگل" کے سلسلے میں معذرت کی تھی۔ محترمہ ہاجرہ بیگم کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ یہ نظم ان کی نہیں ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں محترمہ ہاجرہ بیگم شروع سے پیامِ تعلیم کی سرپرستی فرماتی ہیں۔ اور ہر طرح اس کی مدد فرماتی رہتی ہیں۔ ایک بار انھوں نے ہمیں کئی مضمون بھیجے، اپنے بھی دوسروں کے بھی۔ اور سب میں تو لکھنے والوں کے نام تھے۔ ان نظموں پر نہیں تھا۔ مجھے اور محترم ساتھی سید احمد ولی صاحب کو غلط فہمی ہوئی کہ اس طرح کی نظمیں جو چھوٹے بچوں کے دل بہلاوے کا سامان ہیں انھیں کی لکھی ہوئی ہیں۔ بہرحال ہمیں اس کا بہت افسوس ہے اور شرمندگی ہے کہ خواہ مخواہ انھیں ملامت کا نشانہ بننا پڑا۔

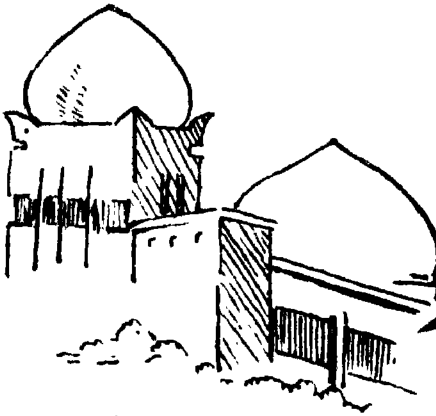
جون کا پرچہ پیامیوں کو بہت پسند آیا۔ تصویریں بھی، مضمون بھی، کہانیاں بھی، ڈرامے بھی۔ اس طرح کے چند خط ہم "آدھی ملاقات" کے عنوان سے شائع کر رہے ہیں۔

ہمیں بڑی خوشی ہے کہ آپ اپنے پیامِ تعلیم کی ترقی کے سلسلے میں ہمیں برابر مشورے دیتے رہتے ہیں۔ آپ کی خواہش کے مطابق ہم نے تصویروں کے صفحے بڑھا دیئے ہیں۔

آپ پرچے میں سوال و جواب کا سلسلہ بھی شروع کرانا چاہتے ہیں۔ یہ ہم اس پرچے سے شروع کر رہے ہیں۔ مگر اس کا انداز بالکل الگ ہوگا۔ سوال و جواب سائنسی معلومات کے سلسلے میں ہوں گے۔ اور سوال بھی آپ ہی کریں گے جواب بھی آپ ہی دیں گے۔ کوئی دقت پیش آئے گی تو ہمارے محترم ساتھی اکرام صاحب لکچرر ٹریننگ کالج جامعہ آپ کی پوری مدد کریں گے۔ اکرام صاحب نے اس کا عنوان ہی "سائنس کی دنیا" رکھا ہے۔ نمونے کے طور پر کچھ سوال بھی دیئے ہیں۔

آدھی ملاقات کے عنوان سے ہم آپ کے منتخب خط بھی شائع کریں گے۔ اس کا سلسلہ بھی اس پرچے سے شروع کیا جا رہا ہے۔

جناب محمد شفیع الدین نیّر



گلشن میں بہار

جامعہ کے ادارے ۱۶؍ جولائی کو کھلیں گے۔ پھر ہر طرف رونق اور چہل پہل ہوگی۔ کیا ہوگا۔ نیّر صاحب نے اُس کا خاکہ کچھ اس طرح کھینچا ہے۔

پھر آئی ہے اِس علم کے گلشن میں بہار
پھر غنچے ہوئے ہیں کھل کھلا کر گُلنار
اِس سال یہ اُمید ہے مجھ کو نیّر
ہر شعبۂ تعلیم پہ آئے گا نکھار

پھر دوست بچھڑے ہوگئے ہیں یک جا
پھر مہر کے سورج کی چمکتی ہے ضیا
پھر دُور ہوئی فراق کی تاریکی
ہے روشنی یہ بہت مسرت افزا

آئے ہیں سبھی نئی اُمیدیں لے کر
خواہش ہے یہی کہ سال ہو یہ بہتر
صحت ہو فراغت ہو میسّر سب کو
اللہ کی رحمت پہ رہے سب کی نظر



تایا جان یوسف ناظم

قربان میاں کے کارنامے

یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ قربان میاں کس ٹائپ کے صاحبزادے ہیں۔ کبھی وہ بالکل بدھو معلوم دیتے ہیں اور کبھی اتنے ہوشیار کہ عقلمند سے عقلمند آدمی بھی ان کے آگے لاجواب ہوکر رہ جائے۔ گھر میں ابا، امی، چچا جان، کشور باجی، بڑے بھیا اور اختر بھائی ان کے سوالوں سے گھبراتے ہیں اور ان کے سوالوں کا جواب دینے کی بجائے ان سے گذارش کرتے ہیں، جاؤ قربان میاں جاؤ ذرا لڈن کے ساتھ پارک تو ہو آؤ یا دیکھو قربان میاں اب وقت بہت ہو گیا ہے سو جاؤ۔ لیکن قربان میاں سب سمجھتے ہیں اور جان بوجھ کر سب کو زچ کرتے ہیں۔ خاص طور پر کشور باجی کو تنگ کرنے میں انھیں بہت مزا آتا ہے۔ اب تم ہی دیکھو یہ تنگ کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

قربان میاں: باجی کیا آپ برلا کو نہیں جانتیں۔

کشور باجی: کیوں نہیں جانتی! ہندوستان میں اس کے جگہ جگہ کارخانے ہیں۔

قربان میاں: تو وہ بہت مالدار ہوگا۔

کشور باجی: ہاں ہاں کیوں نہیں۔ کروڑوں نہیں تو لاکھوں کا آدمی تو ہوگا ہی۔

قربان میاں: پھر آپ کو اس کی کیا چیز ناپسند ہے۔

کشور باجی: یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے کیوں ناپسند ہونے

لگا وہ بیچارہ۔

قربان میاں: باجی آپ ہی کو نہیں وہ تو ہر شخص کو ناپسند ہے۔

کشور باجی: (اب ان کا پارہ چڑھنا شروع ہو گیا) تم بک کیا رہے ہو۔ برلا کو خواہ مخواہ ناپسند کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

قربان میاں: دیکھئے دیکھئے اس کے ذکر سے آپ کا پارہ چڑھ گیا۔ کسی اور کے نام پر آپ کو غصہ نہیں آتا۔

کشور باجی: مجھے برلا پر غصہ نہیں آ رہا ہے تمہارے بیوقوفی کے سوالات پر جی چاہتا ہے تمہارے کان کھینچ دوں۔

قربان میاں: باجی۔ اچھا جانے دیجئے اگر وہ لوگوں کو ناپسند نہیں تو کم سے کم لوگوں کو وہ پسند بھی تو نہیں ہے۔

کشور باجی: اچھا جاؤ۔ میں مان لیتی ہوں کہ وہ لوگوں کو پسند نہیں۔

قربان میاں: باجی یوں کام نہیں چلے گا۔ آپ کو بتانا پڑے گا کہ ٹاٹا کے مقابلے میں برلا کیوں جم نہیں سکا۔

کشور باجی: یہ تم ٹاٹا اور برلا کا مقابلہ کہاں سے لے بیٹھے

قربان میاں: آپ پھر بگڑ رہی ہیں۔ سیدھے سیدھے سمجھا کیوں نہیں دیتیں۔

کشور باجی: سمجھاؤں کا کیا خاک۔ کوئی ٹھک کی بات پوچھو تو سمجھاؤں۔

قربان میاں: دیکھئے باجی۔ آپ، امّی، ابا، آپکی ساری سہیلیاں، بھیا کے سارے دوست جب دیکھو ٹاٹا کو یاد کرتے ہیں۔ آپ اسکول جاتی ہیں تو امّی سے "ٹاٹا" کہتی ہیں۔ ابا دفتر جاتے ہیں تو امی کو ٹاٹا کی یاد دلا کر جاتے ہیں۔ بھیا باہر نکلتے ہیں تو کھڑکی سے شور کرتے نکلتے ہیں ٹاٹا ٹاٹا۔ جیسے ٹاٹا کا نام نہ لیں گے تو امتحان میں فیل ہو جائیں گے۔ ٹرین پر ٹاٹا، بس میں ٹاٹا، اسکول میں ٹاٹا جدھر دیکھو ٹاٹا۔ ٹاٹا نہ ہوا کھانا پینا ہو گیا۔ کوئی بھی برلا کو یاد نہیں کرتا۔

کشور باجی: (آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی ہیں) اچھا تو یہ بات تھی۔

قربان میاں: (بغیر رکے ہوئے) جی ہاں باجی آپ ہی دیکھئے نا۔ اس بیچارے کا قصور کیا ہے۔ میں نے تو کہیں پڑھا تھا کہ آر جے ٹاٹا سے جی۔ ڈی۔ برلا کسی طرح کم نہیں۔ میں تو اپنے دوستوں سے رخصت ہوتے ٹاٹا کی بجائے "ابرلا" ہی

کیا کرتا ہوں۔

کشور باجی: اچھا۔ اب زیادہ بکو مت۔ اور یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔

قربان میاں: اچھا باجی مجھے بھی اسکول بھاگنا ہے (ہاتھ ہلا کر) باجی برلا۔ باجی برلا۔

کشور باجی: چلو بھاگو یہاں سے۔ برل کے چیلے

قربان میاں اسکول پہنچتے ہیں تو وہاں بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ کسی استاد سے ان کی بنتی نہیں۔ تم ہی بتاؤ اس میں بیچارے ڈرائنگ ماسٹر صاحب کی کیا غلطی تھی جو قربان میاں نے اتنی بات بڑھا دی۔ ڈرائنگ کلاس شروع ہوئی نہیں کہ قربان میاں نے ذہن کی چالاکی دکھانی شروع کر دی۔ ماسٹر صاحب نے کہا لڑکو پہلے سورج مکھی کا پھول اتارو۔ پھر کوٹ پتلون اتارو۔ سب لڑکے تصویر اتارنے میں مصروف ہو گئے۔ قربان میاں نے ڈرائنگ کرنا شروع کر دیا اور پندرہ منٹ کے اندر ہی اندر اپنا کام ختم کر لیا۔ اور کھڑے ہو گئے۔

قربان میاں: سر میں نے تصویر اتار لی ہے۔

ڈرائنگ ماسٹر: لاؤ ادھر لاؤ۔ دیکھوں ذرا —— (کاپی دیکھ کر) ارے یہ سورج مکھی کا پھول تو تم نے بہت اچھا اتارا ہے لیکن کوٹ پتلون کہاں ہیں۔

قربان میاں: میں نے اپنا کوٹ اتار کر وہاں لگا دیا ہے لیکن سر میں پتلون بالکل نہیں اتاروں گا (کلاس ہنستی ہے)

ڈرائنگ ماسٹر: قربان میاں۔ سیدھی طرح جا کر کوٹ پتلون اتار دو ورنہ میں تمہیں سخت سزا دوں گا۔

قربان میاں: سر میں نے کہہ دیا کہ کوٹ میں نے اتار دیا ہے لیکن پتلون اتارنے کے لئے میں تیار نہیں ہوں۔

جناب برق بہاری

ابرِ رحمت



لو گھٹا چھا گئی پہاڑوں پر ۔۔۔ لو بہار آ گئی پہاڑوں پر

لو دھواں دھار ہو گیا عالم ۔۔۔ تیرہ و تار ہو گیا عالم

ایسی ظلمت پہ نور قرباں ہو ۔۔۔ جس میں پوشیدہ آبِ حیواں ہو

پھول کمھلا گیا تھا گرمی سے ۔۔۔ سرو چکرا گیا تھا گرمی سے

سبزہ زرد آ گیا تھا گرمی سے ۔۔۔ آدمی گھبرا گیا تھا گرمی سے

ابر آتے ہی دم میں دم آیا

مژدۂ رحمت و کرم لایا



جناب مقبول احمد سیوہاروی

ابنِ بطوطہ

(۴)

طرابلس

شام کے شہروں میں طرابلس نہایت پُرفضا شہر ہے۔ آبادی کے بیچ میں نہریں بہتی ہیں اور پورا شہر پھولوں پھلوں سے پُربہار ہے۔ بازار بھی بارونق ہیں۔ شہر سے دو میل پر دریا لہریں لیتا ہے۔

مَلِک ظاہر نے یہ شہر عیسائیوں سے حاصل کیا ہے اور مسلمانوں نے اسے نئے سِرے سے آباد کیا ہے۔ یہاں چالیس تُرک امیر رہتے ہیں۔ حکمراں کا لقب امیر الامرا ہے۔ پیر اور جمعرات کو امیر الامرا کا جلوس نکلتا ہے۔ تمام امیر اور فوج کے سپاہی جلوس کے ساتھ چلتے ہیں۔ یہ جلوس شہر کے باہر تک جاتا ہے اور جب پلٹ کر امیر الامرا کے محل پر آتا ہے تو جتنے امیر جلوس کے ساتھ ہوتے ہیں گھوڑوں سے اُتر پڑتے ہیں اور پیادہ پا امیر الامرا کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ پھر امیر الامرا محل میں چلا جاتا ہے اور امیر اپنی اپنی حویلیوں میں چلے جاتے ہیں۔

نوبت

سورج چھُپتے ہی ہر امیر کے دروازے پر نوبت بجتی ہے اور روشنی کی جاتی ہے۔ امیروں میں سب سے زیادہ سخی بہاء الدّین اور ان کے بھائی حُسام الدّین ہیں۔

یہاں کے قاضی القضاۃ شمس الدّین النقیب

بڑے عالم ہیں، ملک شام کے رہنے والے ہیں طرابلس سے سندمور حسن الاکرم ہوتے ہوئے حمص پہنچے، حمص بھی دل آویز شہر ہے۔ ہرے بھرے درخت لہلہاتے ہیں اور شفاف نہریں بہتی ہیں۔ جن سے فضا میں عجیب فرحت پیدا ہوگئی ہے۔

اسی حمص میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی قبر ہے۔ خالد بن ولیدؓ بڑے دلیر اور نڈر صحابی تھے۔ ہزاروں میں اکیلے لڑتے تھے۔ رسول اللہؐ نے انھیں سیف اللہ کا خطاب دیا تھا سیف تلوار کو کہتے ہیں۔ سیف اللہ، اللہ کی تلوار۔ حضرت خالدؓ کی قبر پر سیاہ چادر پڑی رہتی ہے۔

حمص کا قاضی صورت اور سیرت میں بہت اچھا ہے۔ جمال الدین شربشی نام ہے۔

معرّہ

یہ شہر بھی اچھا ہے۔ انجیر اور پستے کی پیداوار ہوتی ہے۔ معرّہ تک تین شہروں سے گزر کر ہمیں جانا پڑا۔ شہر حماۃ، سرائے منصوریہ۔ منصوریہ میں میوے کثرت سے ہوتے ہیں۔ شمش لوزی (خوبانی) بہت ہوتی ہے۔ اس کی مینگ بھی میٹھی ہوتی ہے۔ معرّہ کا میوہ مصر میں جاکر بکتا ہے۔ پہلے اس شہر کا نام ذات التصور تھا۔ نعمان ابن بشیر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صحابی نے یہاں وفات پائی تو اس کا نام معرۃ النعمان ہوگیا۔ اسی شہر میں ایک بہت بڑے شاعر رہتے تھے جن کا نام ابوالعلاء معرّی تھا۔

شہر سے ایک کوس پر حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی قبر ہے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز خاندان بنو اُمیّہ کے نامور اور نہایت نیک حکمراں گزرے ہیں۔ اور انھوں نے تمام عمر اچھے اچھے کام کیے تھے۔ یہاں سے چل کر ایک شہر ملا جس کا نام سر ہے۔ یہاں ہاتھ منہ دھونے کا نہایت خوشبودار صابن بنتا ہے اور مصر و شام کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ سوتی کپڑے بھی تیار ہوتے ہیں۔ اس کے آگے حلب کا شہر ہے۔ حلب کا قلعہ اتنا مضبوط ہے کہ اسے کوئی فتح نہیں کرسکتا، مضبوط بھی ہے اور خوب صورت بھی ہے، قلعہ کا نام شہناء ہے۔

قلعے کے اندر ایک جنگل ہے۔ جہاں ہمیشہ پانی کے چشمے جاری رہتے ہیں اور پانی کی کمی کا خطرہ کبھی نہیں ہوتا۔ آب و ہوا ایسی عمدہ

ہے کہ کئی کئی دن کھانا خراب نہیں ہوتا۔ یہاں وہ جگہ بھی ہے جہاں سیّدنا ابراہیم خلیل علیہ السلام نے عبادت کی تھی، اب بھی دُور دُور سے لوگ آتے ہیں اور یہاں عبادت کرتے ہیں۔

یہاں ایک صندوق ہے۔ مشہور ہے کہ اس صندوق میں حضرت یحییٰ علیہ السّلام کے سرِ مبارک کا ایک ٹکڑا بند ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی مہمان نوازی کا یہ حال تھا کہ راہ چلتوں کو پکڑ لاتے تھے اور بکریوں کا دودھ پلاتے تھے، اس کی شہرت اتنی پھیلی کہ قافلے آتے تو پوچھتے کہ حلب ابراہیمؑ کہاں تقسیم ہوتا ہے۔ حلب دودھ دوہنے کو کہتے ہیں۔ شاید اس شہر کا نام جب ہی سے حلب ہوگیا

حلب کا بازار نہایت عمدہ ہے۔ چوک کے بیچ میں ایک مسجد ہے۔ ہر طرف کی سڑکیں مسجد تک پہنچ جاتی ہیں۔

شہر کی جامع مسجد بہت شاندار اور خوب صورت ہے۔ ممبر کی کاری گری قابلِ دید ہے۔ ہاتھی دانت اور آبنوس کا جڑاؤ کام ہے اور ایسا خوب صورت ہے کہ دیکھنے سے جی نہیں بھرتا۔

حلب سے قنسرین ہوتے ہوئے انطاکیہ پہنچے جہاں حضرت حبیب النجارؒ کا مزار مبارک ہے۔ مزار کے پاس مسافروں کے ٹھہرنے کی خانقاہ ہے۔ خانقاہ کے شیخ بہت اچھے آدمی ہیں۔ ایک سو برس کی عمر ہے۔ قوّت کا یہ حال ہے کہ ایک دن میں نے دیکھا لکڑیوں کا گٹھا اُٹھائے لیے چلے آرہے ہیں۔

ان کا بیٹا جس کی عمر اسّی برس کی ہے اتنا کمزور ہے کہ بیٹھ کر اُٹھا نہیں جاتا۔ کمر بھی جھک گئی ہے۔ جو کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے۔ بیٹے کو باپ سمجھتا ہے اور باپ کو بیٹا۔ اس خانقاہ میں مسافروں کو کھانا بھی ملتا ہے۔

اب ذرا اس شہر کا حال سنو جہاں ابراہیم ادہمؒ کی قبر ہے۔ اس شہر کا نام جبلہ ہے۔ جبلہ کے راستے میں جو شہر ملے ان کے نام یہ ہیں:-

تیزین، قنسرین، انطاکیہ، حصن بغراس، حصن القصیر، حصن الشغر، بکاس، صہیون، حصین القوموس حصین المنیف، حصین الحلیفہ، المصاف، الکھف۔

یہ سب کے سب قلعے ہیں اور ان میں فدائی رہتے ہیں۔ جبلہ جاتے ہوئے یہ سب قلعے ہمارے راستے میں آئے۔

جناب سعادت نظیر

پیغام

اُٹھو، قدم قدم سے ملاتے چلے چلو — سب مِل کے ایک راہ بناتے چلے چلو
منزل کی دُھن میں جھومتے گاتے چلے چلو — ہر مرحلے کو سہل بناتے چلے چلو
بن کر گھٹا فضاؤں پہ چھاتے چلے چلو — ہر ہر قدم پہ دھوم مچاتے چلے چلو
نیچ اونچ کو دِلوں سے مٹاتے چلے چلو — انسانیت کی شان دکھاتے چلے چلو
آگے بڑھو، رُکو نہ کسی رہ گزار پر — ہر دَم سفر کا لُطف اُٹھاتے چلے چلو
مایوسیوں میں چھیڑ دو نغمے امید کے — تاریکیوں میں جوت جگاتے چلے چلو
ٹوٹے ہوئے دِلوں کو محبت سے جوڑ دو — جَوہر عمل کے اپنے دکھاتے چلے چلو
دھرتی بھی جگمگا اُٹھے آکاش کی طرح — راتوں میں وہ چراغ جلاتے چلے چلو
چمکو گگن کے تاروں کی صورت زمین پر — تم آسماں زمیں کو بناتے چلے چلو
پَت جھڑ کی رُت میں پھول کھلانا کمال ہے — پَت جھڑ کی رت میں پھول کھلاتے چلے چلو

بدلے خزاں، نظیر، چمن میں بہار سے
وہ گیت زندگی کے سُناتے چلے چلو

مولانا محی الدین احمد

علم کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے شاگردوں میں امام ابو یوسفؒ بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ امام ابو یوسفؒ کا نام یعقوب بن ابراہیم تھا یہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ غریب ماں چرخہ چلا کر جیسے تیسے اپنا اور یتیم بچے کا پیٹ پالتی تھیں۔ ابو یوسف کی عمر چھ سال کی ہوئی تو ماں نے ان کو ایک دھوبی کے ہاں نوکر رکھا تاکہ یہ کپڑے دھونا سیکھ جائیں اور گذر بسر کا سہارا ہو جائے۔

امام ابو یوسفؒ دھوبی کے ساتھ گھاٹ پہ جانے لگے۔ ایک دن دھوبی کے پاس جاتے ہوئے امام ابو حنیفہؒ کا مدرسہ راستے میں پڑا۔ امام صاحب اپنے شاگردوں کو پڑھا رہے تھے۔ پڑھاتے وقت امام صاحب نے علم کی فضیلت پر ایک مختصر سی تقریر کی۔ اسے سن کر امام ابو یوسف کو علم حاصل کرنے کا ایسا شوق ہوا کہ دھوبی کے گھر جانے کا خیال دل سے نکل گیا۔ اور امام ابو حنیفہ کے مدرسے میں پہنچ گئے۔ یہ ان کی تعلیم کا پہلا دن تھا۔ اب یہ مسلسل مدرسے میں حاضر ہونے لگے۔ اور باقاعدہ تعلیم شروع ہو گئی۔

کئی دن کے بعد دھوبی نے ان کی ماں کے پاس جا کر شکایت کی کہ آپ کا لڑکا کام پر نہیں آ رہا ہے۔ یہ سن کر ان کی ماں نے انھیں سخت سست کہا۔ اور

ان کو مدرسے سے اٹھا کر دھوبی کے پاس چھوڑ آئیں لیکن امام صاحب دھوبی کے پاس سے بھاگ آئے اور مدرسے پہنچ گئے۔ تین دن کے بعد ان کی ماں یہ معلوم کر کے کہ وہ پھر دھوبی کے پاس سے غائب ہیں خود حضرت امام ابوحنیفہؒ کے پاس آئیں۔ ماں کی صورت دیکھتے ہی امام ابو یوسفؒ سہم گئے اور گھبرا کر امام صاحب کی صورت دیکھنے لگے۔ اس منظر سے حضرت امام ابوحنیفہؒ بھی بہت متاثر ہوئے۔ ماں نے امام صاحب سے کہا کہ آپ نے مجھ دکھیا کے بچے کو اس بات سے روک رکھا ہے کہ دنیا میں کچھ کام سیکھ سکے اور محنت مزدوری کر کے اپنا اور میرا پیٹ پال سکے۔ آپ نے اس کو پڑھنے لکھنے کا شوق دلا دیا ہے جو ہم غریبوں کے کام آنے والی چیز نہیں ہے۔

یہ سن کر امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ بوی جاؤ۔ اپنا کام کرو تمہارے لڑکے کے بشرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت خوش نصیب ہوگا اب تو یہ فاقہ کر کے علم حاصل کر رہا ہے مگر ایک وقت آئے گا کہ روغن پستہ میں تیار کیا ہوا فالودہ کھائے گا۔

یہ سن کر ان کی ماں کو بہت غصہ آیا اور وہ حضرت امام کی شان میں گستاخی کرنے لگی "بڑے میاں معلوم ہوتا ہے کہ تم سٹھیا گئے ہو" یہ کہا اور بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

اب ابو یوسف روزانہ مدرسے آنے لگے۔ اب یہ لکھنا بھی سیکھ گئے تھے۔ لیکن استاد کے سبق کو لکھ لکھنا ان کے لئے بہت مشکل تھا۔ ان بیچارے کو روٹی ہی میسر نہ تھی کاغذ قلم روشنائی کہاں سے لاتے۔ لیکن علم کے شوق نے ان کو ہر مشکل پر قابو پانے کا طریقہ بتا دیا تھا۔

فرصت کے وقت وہ قصابوں کی دوکانوں کی طرف جانکلتے۔ وہاں سے اونٹ گائے وغیرہ کے شانے کی چوڑی چوڑی ہڈیاں چن کر لاتے۔ انھیں دھو کر صاف کرتے اور ان پر کوئلے سے استاد کی تقریر کو لکھ لیتے یہ وہی نوٹ ہیں جو آگے چل کر کتاب امالی النوادر کے نام سے مشہور ہوئے۔

جب امام صاحب کی عمر ۱۲ سال کی ہو گئی تو ان کی ماں نے سوچا ان کی شادی کر دی جائے شادی کے بعد یا تو یہ ذمہ داری محسوس کر کے کچھ کمانے لگیں گے یا پھر ساس اور بہو دونوں کی محنت سے کچھ آمدنی بڑھے گی۔ لیکن شادی کے بعد بھی امام صاحب پڑھنے لکھنے سے باز نہیں آئے اور امام ابوحنیفہ کا دامن نہ چھوڑا۔

ساس بہو کی مشترکہ محنت اور کتائی سے آمدنی بڑھی ضرور لیکن اسی مناسبت سے خرچ بھی بڑھا دو کی بجائے اب تین آدمیوں کی گذر بسر کرنا تھی۔ غرض

گھر کی پریشانی جوں کی توں رہی۔

ایک دن امام ابو یوسف نے گھر آکر اپنی بیوی سے کہا۔ کچھ کھانے کو ہو تو لاؤ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ بے چاروں کو دو دن کا فاقہ تھا۔ ان کی بیوی خود بھی کئی دن کے فاقے سے تھیں۔ یہ سن کر کمرے میں گئیں اور وہ سب ہڈیاں جن پر یہ سبق لکھے تھے اٹھا لائیں اور سامنے رکھ کر کہا کہ ان کے سوا گھر میں کچھ نہیں ہے۔ امام صاحب مجبوراً تعلیم چھوڑ کر روزی کی تلاش میں لگ گئے۔

جب یہ مسلسل تین دن مدرسے میں حاضر نہ ہوئے تو امام ابو حنیفہ نے اپنے شاگردوں کو ان کے گھر بھیجا۔ ان شاگردوں نے ابو حنیفہ کو سارا حال بتایا۔ امام صاحب نے انھیں بلا بھیجا اور اپنے ایک مالدار معتقد سے کہہ کر ان کا معقول وظیفہ مقرر کرا دیا۔ اب امام ابو یوسف کو قدرے اطمینان ہوا اور وہ پورے انہماک سے علم حاصل کرنے لگے۔ حضرت امام ابو یوسف کو علم حاصل کرنے کا اس قدر شوق تھا کہ انھوں نے علاوہ حضرت امام ابو حنیفہ کے دوسرے بزرگوں سے بھی علم حاصل کیا۔ دمیری شافعی ان کے حالات میں لکھتے ہیں۔ انھوں نے بغداد میں رہ کر علم حاصل نہیں کیا بلکہ تاریخ اسلام اور مغازی کے حاصل کرنے کے لئے اسلامی ملکوں کا سفر بھی کیا۔

اس قدر محنت سے علم حاصل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بہت جلد فارغ التحصیل ہو گئے اور امام ابو حنیفہؒ کی زندگی ہی میں صاحب فتویٰ یا فتویٰ دینے والے کے اہل قرار دے دیے گئے۔ اور پھر امام ابو حنیفہؒ کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ مسند درس و افتا پر انھیں کا انتخاب ہوا۔ اور اب اس جگہ جہاں کبھی خود پڑھا کرتے تھے پڑھانے لگے۔ لیکن غربت و افلاس نے اب بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔

غریبی مفلسی کا یہ عالم تھا کہ ان کے پڑوس میں ایک مالدار یہودی رہتا تھا اس نے اپنی حویلی بنانے کے لئے اس قدر زمین گھیری کہ نہ صرف امام ابو یوسف بلکہ دوسرے پڑوسیوں کے لئے آمد و رفت کا راستہ تنگ ہو گیا۔

ایک دن امام صاحب اس کے پاس گئے۔ اور نہایت عاجزی سے اس سے کہا کہ تمہارے اس عمل سے سارے اہل محلہ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ ہمارا راستہ تنگ نہ کرو۔ اس پر اس نے بڑے طنز سے کہا۔ حضرت جانے ابھی تو آپ پیدل مارے مارے پھرتے ہیں۔ ہاں جب آپ پالکی نشین ہو جائیں اور آپ لوگ ہٹو بچو کہتے ہوئے آپ کی سواری لائیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس وقت یہ عمارت مسمار کر کے آپ کے لئے راستہ بنا دوں گا۔

خدا کی شان دیکھئے اس گفتگو کے ایک ماہ بعد ہی امام یوسفؒ بارگاہِ خلافت میں باریاب ہوئے اور پہلی ملاقات میں خلیفہ ان کے علم و ذہانت سے اس قدر متاثر ہوا کہ ان کا تقرر قاضی القضاۃ کے عہدہ جلیلہ پر کر دیا۔ اور جب یہ واپس ہوئے تو سرکاری پالکی میں لائے گئے۔ پالکی کے ساتھ حکومت کے چوب دار اور فوج اور پولیس کے جوان تھے اور حسب وعدہ اس یہودی کا مکان مسمار کر کے ان کی پالکی ان کے مکان تک لائی گئی۔

امام ابو یوسفؒ کے علم و فضل سے خلیفہ اس قدر متاثر تھا کہ ان کو اکثر اپنے ساتھ رکھتا۔ ایک دن اس نے حضرت امام سے فرمایا کہ قاضی صاحب آج آپ کھانا ہمارے ساتھ کھائیے۔ آپ کو ایک ایسی چیز کھلائی جائیگی جو بوجہ تکلیف کے میرے باورچی خانہ میں بھی کبھی کبھی تیار کی جاتی ہے اس پر امام صاحب نے پوچھا۔ امیرالمومنین ایسی کیا چیز ہے۔ خلیفہ نے جواب دیا۔ وہ فالودہ جو روغن پستہ میں تیار کیا جاتا ہے۔ یہ سنتے ہی امام صاحب کو اپنے بچپن کی بات یاد آگئی۔ بے اختیار ہنسی آگئی خلیفہ نے ہنسنے کا سبب دریافت کیا تو حضرت امام صاحب نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا وہ واقعہ بیان کردیا جو اوپر لکھا گیا ہے۔ اس دن خلیفہ کو ان کے حالات کا علم ہوا۔ حیرت سے امام ابو یوسفؒ کی صورت دیکھنے لگا اور کہا کہ حضرت ابوحنیفہ کی دل کی آنکھیں کس قدر روشن تھیں اور یہ کہ علم بھی کیا دولت ہے آدمی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔

جناب خضر برنی شاستری



شان بڑھائیں

مل کر دیش کی شان بڑھائیں بھارت کے نر، ناری
بل کو اپنے کام میں لائیں مہکے گی پھلواری

قدم قدم منزل کے نظارے، نگر نگر تصویر
گہرے ساگر، اونچا ہمالہ، جنت ہے کشمیر
سب سے اچھا دیش ہمارا سب سے ریت[1] نیاری
مل کر دیس کی شان بڑھائیں بھارت کے نر، ناری

بونڈ خریدیں سونے کے کچھ اور بڑھے سمان[2]
خرچ گھٹا کر دیش کو اپنے کرنا ہے بلوان[3]
آشاؤں کی چھایا میں اب کرنی ہے تیاری
مل کر دیش کی شان بڑھائیں بھارت کے نر، ناری

بھارت ماں کے کارن سب کو کرنا ہے بلیدان[4]
اپنے یوگ[5] بنیں ہم خود ہی سمے پہ رکھیں دھیان
گنگا جمنا سے جل لے کر بھر دیں کیاری کیاری
مل کر دیش کی شان بڑھائیں بھارت کے نر، ناری

---

۱ رواج ۲ عزت ۳ طاقتور ۴ قربانی ۵ لائق



جناب قاضی سلیم

کہانی چینی بِھکشو کی

گوتم بدھ کے زمانے میں چین اور جاپان سے بہت سے لوگ علم حاصل کرنے ہندوستان آتے رہتے ان میں سے ایک کا نام تریپی تاکا عرف چیو چانگ تھا۔ یہ چینی بھکشو بدھ کی شاگردی میں کئی سال رہا، کائنات کے سب بھید اس پر کھل گئے، جب وہ علم حاصل کر چکا اور چین لوٹنے لگا، تو اس نے گوتم بدھ سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی "اے مہاتما میں جب چین واپس لوٹوں گا لوگ مجھ پر کیسے بھروسا کریں گے کہ یہ سارا علم میں نے تجھ سے حاصل کیا ہے، اس لیے مجھے اپنی لکھی ہوئی کتابیں مرحمت فرمادیں تاکہ میں لوگوں کو بتلا سکوں۔"

مہاتما بدھ کہ دل ان کا رحم سے بھرا تھا شاگرد کی یہ بات سن کر بہت اداس ہوئے، انھوں نے کہا: "میں نے ناحق تم کو پڑھانے لکھانے پر وقت برباد کیا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اتنے دن کی تعلیم سے تمھارا دل روشن ہو گیا ہوگا، تم لوگوں کی رہبری خود کروگے، مگر تم تحریر مانگتے ہو۔"

شاگرد یہ سن کر زار و قطار رونے لگا، گوتم بدھ سے یہ رونا دیکھا نہ گیا، انھوں نے سات کاغذ اِس دُنیا کے اور سات دوسری دُنیا کے بارے میں لکھے اور کپڑے میں لپیٹ کر شاگرد رشید کے حوالے کیے۔ تریپی ناگا عرف چیو چانگ ملک چین کی طرف روانہ ہوا۔

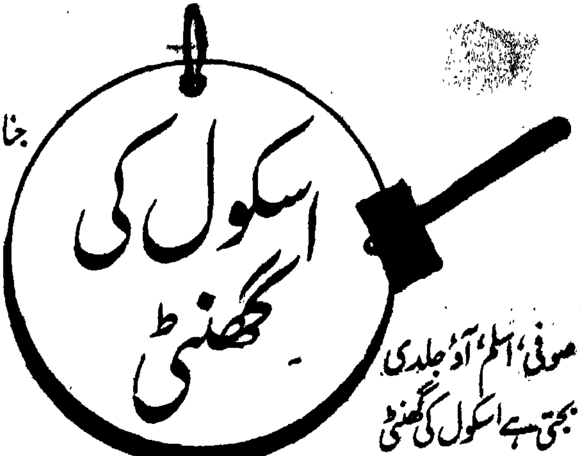
وہ نیک بندہ جب بیچ ہمالہ کے پہنچا تو طوفان، ہوا اور پانی نے اسے گھیر لیا۔ اتنے اولے پڑے کہ اس کا ڈیرا اکھڑ گیا، وہ پریشانیوں میں جکڑ گیا، برف باری سے اکڑ گیا، ساتھیوں نے لخلخہ سنگھایا تو اسے ہوش آیا، خیال ان کاغذات کا آتے ہی اس نے بستہ کھول کر دیکھا، سارے کاغذ پانی سے بھیگ چکے تھے۔ ان کا ایک ایک حرف دھل گیا تھا۔ چیو چانگ ایک ایک کاغذ کھولتا جاتا اور روتا جاتا۔ روتے روتے جب تھک گیا، تو اس کے ساتھیوں نے کہا "اے استاد رونے سے کیا حاصل، چلو پھر گوتم بدھ کے دربار میں لوٹ چلیں شاید انھیں رحم آئے۔"

ساتھیوں کا یہ مشورہ مان کر الٹے پاؤں لوٹا۔ آخر گوتم بدھ کی خدمت میں حاضر ہوا — گوتم بدھ نے اپنے شاگرد کو اس حال میں دیکھا ہنسنے لگے، برڑ کے پتے تالیاں بجانے لگے، چڑیاں بے اختیار برڑ کی داڑھی میں لٹک لٹک چہکنے لگیں۔ گوتم نے کہا: "اے سادہ لوح برخوردار یہی خالی کاغذ جس پر سب لفظ دھل گئے ہیں اصل دستاویزیں ہیں یہی سب سے بڑی سچائی ہے۔ اس لیے کہ تمھارا نیک دل اور روشن دماغ ہر وقت حالات کے لحاظ سے ان پر اچھی باتیں پڑھ سکتا ہے۔ جو علم تمھارے بھیجے میں میں نے بھر دیا ہے وہی کافی ہے۔ کاغذ کی تحریروں میں کیا رکھا ہے وہ حالات بدلتے ہی بے کار ہو جاتی ہیں، جب انسان خود سمجھنے کے قابل بن گیا تو کورا کاغذ ہی وسعتیں سات زمینوں اور سات آسمانوں کی اپنے اندر رکھتا ہے۔"

چینی بھکشو نے چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھولیں، مہاتما کی بات سن کر اسے اطمینان ہوا۔ مگر چیٹی چیٹی ناکوں کے خوف سے پھر بند کر لیں، اس نے تصور میں دیکھا گدڑے گدڑے لوگوں کا ایک ہجوم اس کی طرف بڑھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے "تم جھوٹے ہو، تم مہاتما سے ملے ہی نہیں۔ کیا ثبوت ہے تمھارے پاس کہ انھوں نے پیغام دے کر ہماری طرف بھیجا ہے۔"

گوتم بدھ جو بڑے راز جان لینے والے تھے شاگرد رشید کے دل کے خوف کو پہچان گئے۔ انھیں اس پر بہت ترس آیا، دلاسا دیا۔ "تم ایسی باتوں پر ایمان نہیں لاؤ گے، آؤ تم بے وقوفوں کے لیے میں دوسری تحریریں دیتا ہوں۔ جاؤ قیامت تک لفظوں کی غلامی کرو، تمھارے مقدر میں علم ہے ہی نہیں۔"

اسکول کی گھنٹی



جناب خالد رحیم

صوفی، اسلم، آؤ جلدی
بجتی ہے اسکول کی گھنٹی

کندھوں میں بستہ لٹکائے
دیکھو بچے دوڑ رہے ہیں
منو، چنو، راجو، اوشا
سب کے سب اسکول چلے ہیں

صوفی، اسلم، آؤ جلدی
بجتی ہے اسکول کی گھنٹی

سوشل جاتا ہے سائیکل پر
گیتا پیچھے دوڑ رہی ہے
احمد یکے پر آیا ہے
سلمہ موٹر سے اتری ہے

صوفی، اسلم، آؤ جلدی
بجتی ہے اسکول کی گھنٹی

پڑھنے میں تاخیر نہ کرنا
علم و ادب ہے اپنی منزل
علم سے ہی تہذیب و تمدن
اس سے نہ ہونا ہرگز غافل

صوفی، اسلم، آؤ جلدی
بجتی ہے اسکول کی گھنٹی

جناب ابوالکلام

دہلی سے نیویارک

(قسط نمبر ۲)

ریل کے ڈبے میں سامان سلیقے سے لگا دیا گیا تو سب باہر نکل آئے اور ڈبے کے سامنے جمع ہوگئے۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔ بعض دوستوں کے چہرے کچھ اُداس اُداس تھے۔ کچھ خوب ہشاش بشاش تھے۔ میرے دل پر بھی دوست احباب سے جُدائی کا بہت گہرا اثر تھا پھر بھی اپنے آپ کو خوش و خرم رکھنے کی کوشش کی اگر میں ذرا بھی کمزوری دکھاتا تو ساری فضا اداس ہوجاتی اس لیے ساتھیوں سے برابر ہنستا بولتا رہا۔

ہم لوگ پلیٹ فارم پر گپیں لگا رہے تھے کہ روانگی کا وقت آگیا۔ گارڈ نے سیٹی دی۔ میں گاڑی میں چڑھ گیا۔ پھولوں کے ہار دوستوں نے چھپا رکھے تھے۔ یہ ہار وہ جلدی جلدی میرے گلے میں ڈالنے لگے۔ یہ تو تم جانتے ہو مجھے ہار پہننا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن اس وقت اپنے عزیز ساتھیوں کا یہ تحفہ مجھے قبول کرنا پڑا۔ یہ بھی ان کے دلی جذبات کی ایک نشانی تھی۔

گاڑی دھیرے دھیرے کھسکنے لگی۔ ہمارے دوست گاڑی کے ساتھ ہولئے اس وقت تک ساتھ ساتھ چلتے رہے جب تک گاڑی نے تیزی نہ پکڑ لی۔ اور پھر ہاتھ ہلاتے رہے، رومال ہلتے رہے۔ کچھ عجیب نظارہ تھا۔ گاڑی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ دیکھتے دیکھتے

اسٹیشن نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں گم سُم اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ دل پر کچھ عجیب کیفیت گزر رہی تھی۔ دِلّی وطن نہ سہی۔ برسوں رہتے رہتے اس سے وطن جیسی محبّت ہوگئی تھی اور جامعہ کے کارکن اور ساتھی عزیزوں سے زیادہ عزیز لگ رہے تھے۔ ان کی جدائی شاق تھی۔

گاڑی دہلی اسٹیشن سے دُور نکل گئی۔ دوست احباب نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ تو میں نے ڈبّے کے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی معلوم ہوا کہ سب ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں اور بنگالی ہیں۔ میں نے بنگالی زبان میں بات چیت شروع کردی ان سے پوچھا کہ کہاں تک کا سفر ہے۔ مجھے اپنی زبان میں باتیں کرتے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے ہاوڑہ جارہے ہیں۔ ان کے سوال کے جواب میں میں نے کہا میں بھی ہاوڑہ جارہا ہوں۔ یہ سُن کر انھیں اور بھی زیادہ خوشی ہوئی۔ ہمارے بنگالی بھائی اپنی زبان کو اپنے صوبے کو اپنی ہر چیز کو بہتر سمجھتے ہیں افضل سمجھتے ہیں۔ اسی لیے میں جب کبھی بنگالیوں سے ملتا ہوں بنگالی میں بات چیت شروع کردیتا ہوں۔ اس طرح وہ غیریت اور اجنبیت محسوس نہیں کرتے۔

غرض ہاوڑہ تک ان کا ساتھ رہا مگر بات چیت زیادہ نہیں ہوئی نہ انھوں نے کوئی خواہش ظاہر کی نہ میں نے۔ دن کے وقت میں ان کی نیچے کی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ رات میں اپنی برتھ پر جالیٹا۔ سیکنڈ کلاس کا سفر بہت آرام کا ہوتا ہے۔ ساری رات خوب مزے سے سوتا رہا۔ کھانے کا وقت آیا تو ڈائننگ کار سے کھانا منگوالیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اطمینان سے کھایا۔

دوسرے دن کوئی پونے بارہ بجے ہماری گاڑی ہاوڑہ پہنچی۔ قلیوں سے سامان پلیٹ فارم پر اُتروایا اور اپنے دوست کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے دہلی سے روانگی سے پہلے اکسپرس تار بھیج دیا تھا۔ راستے میں مجھے ایک آدھ بار یہ خیال آیا کہ یہ دوست اسٹیشن پر نہ آسکے تو کیا ہوگا۔ اسی لیے میں نے ہاوڑہ سے پہلے ہی ایک ہم سفر سے کلکتہ کے ہوٹلوں کے بارے میں کافی معلومات حاصل کرلی تھیں۔ ہوٹل کے انتخاب میں میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ پورٹ یا بندرگاہ کے قریب ہو

تاکہ جہاز تک پہنچنے میں آسانی ہو۔
دوسرے سب مسافر اپنا سامان قلیوں کے سر پر رکھوائے اسٹیشن سے باہر جارہے تھے اور میں تھا کہ کھڑا کھڑا اِدھر اُدھر تک رہا تھا۔ قلیوں نے بھی تعجب سے پوچھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے اور جب میں نے انھیں بتایا کہ میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں تو بے چارے خاموش ہو گئے۔
ہوتے ہوتے سارا پلیٹ فارم خالی ہوگیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ مجھے لینے کوئی نہیں آئے گا تو جھوراً قلیوں سے سامان اٹھانے کو کہا اور گیٹ کی طرف چل پڑا۔ مگر مجھے پریشانی زیادہ نہ تھی۔ کلکتہ میرے لیے کوئی اجنبی جگہ نہ تھی۔ کئی بار میں یہاں گھوما پھرا تھا۔ یقین تھا کہ یہاں کوئی خاص پریشانی نہ ہوگی۔
پر جوں ہی میں گیٹ کے قریب پہنچا میرے دوست کے چھوٹے بھائی میرا انتظار کر رہے تھے۔ پھر تو خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔ انھوں نے سامان اپنی کار میں رکھوایا اور ہم لوگ فوراً ان کے گھر کی طرف چل پڑے۔ ہاوڑہ اسٹیشن سے تقریباً بارہ میل دور مشرق کی طرف ٹالی گنج میں ان کا ذاتی مکان ہے۔ تھوڑی دیر میں ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔
ہاں میں ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ اس سے پہلے ۱۹۴۱ء میں میں کلکتے گیا تھا۔ اس وقت دریائے ہگلی پر نیا پُل بن رہا تھا۔ یہ پُل اب تیار ہوگیا تھا ہماری کار اسی پر سے ہو کر گزری۔ پرانا پُل کشتیوں پر بنا ہوا تھا۔ جب کسی جہاز کو گزرنا ہوتا تو یہ پُل ٹوٹ جاتا اور جہاز بیچ میں سے ہو کر گزر جاتا۔ ظاہر ہے اس وقت تمام آمد و رفت بند ہو جاتی۔
یہ نیا پُل دوسری طرح کا ہے۔ ایک تو یہ اتنا اونچا ہے کہ جہاز اس کے نیچے سے آسانی سے گزر جاتے ہیں۔ اسے توڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسرے اب اس پر سے ریل اور ٹرام بھی گزر سکتی ہے۔ پرانے پُل میں یہ سہولت نہ تھی تیسری خاص بات یہ کہ اس پُل کے نیچے کوئی کھمبا نہیں ہے۔
جونہی ہماری کار دوست کے مکان پر پہنچی گھر کے تمام لوگ باہر نکل آئے۔ ان استقبال کرنے والوں میں ایک ننھے میاں بھی تھے۔ کوئی تین سال کے ہوں گے۔ پر یہ تو مجھے دیکھتے

پہنچ کر بھاگے۔ یہ میرے دوست کے بڑے بھائی کا بچہ تھا۔ مگر بہت جلد ہمارے تعلقات خوش گوار ہوگئے۔ اور ننھے میاں ہمارے بہت اچھے دوست بن گئے۔

میرے دوست گجراتی ہیں۔ جوہری کا پیشہ کرتے ہیں۔ کافی پیسے والے ہیں۔ تین چار موٹریں ہیں، اپنا مکان ہے۔ میرے دوست باہر گئے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے بھائی، بہنوں، ماں باپ سب سے میری ملاقات ہے۔ سب بڑی محبت اور خلوص سے ملتے ہیں۔

گھر پہنچتے ہی میں نہایا دھویا کپڑے بدلے۔ کھانا تیار تھا۔ کھانا کھایا۔ گجراتی کھانا تو تم نے کبھی کھایا نہ ہوگا بس اتنا جان لو کہ وہ اپنی طرز کا الگ ہوتا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر میں نے آرام کیا اور پھر اپنے دوست سے کہا کہ مجھے امریکن اکسپرس کمپنی پہنچادیں۔ ٹکٹ کے بارے میں اور دوسری باتوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھی۔

یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ آج اٹھارہ مئی ہے۔ گوون برادرس نے مجھے اطلاع دی تھی کہ سٹی آف لی ۲۰ رمئی کو کلکتے سے روانہ ہوگا۔ گوون برادرس نے امریکن اکسپرس کمپنی کی معرفت میرے سفر کا انتظام کیا تھا۔ یہ امریکہ کی بہت بڑی کمپنی ہے —— ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں اس کی شاخیں ہیں۔ کلکتے والی شاخ پولک اسٹریٹ پر تھی۔ میں اس اسٹریٹ سے واقف نہ تھا۔ یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ یہ جگہ میرے دوست کی دکان کے پاس ہی ہے۔ یہ اپنی دکان پر جانے والے تھے بس پھر کیا تھا میں بھی انھی کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا اور انھوں نے مجھے امریکن اکسپرس پہنچادیا۔ یہاں معلوم ہوا کہ یہ جہاز اس کمپنی کا نہیں گلیڈ اسٹون کمپنی کا ہے۔ اور جہاز ۲۰ رکی جگہ ۲۱ رمئی کو روانہ ہوگا۔ یہ بھی بتایا کہ گلیڈ اسٹون کمپنی کے دفتر میں ۱۰½ بجے حاضر ہونا ہے۔ کمپنی والے کاغذات دیکھیں گے ڈاکٹری معائنہ بھی ہوگا۔ جہاز کا ٹکٹ بھی دیں گے۔

میں نے کہا ڈاکٹری معائنہ تو امریکن سفارت خانے میں ہوگیا ہے اب کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگے یہ معائنہ تو ہوگا۔ جہاز کی کمپنی کا ڈاکٹر کرے گا۔ سولہ روپے فیس بھی دینی ہوگی۔

یہ سنتے ہی جیسے دم نکل گیا۔ دہلی میں اسی معائنے کی فیس ۲۲ روپے دے کر آیا ہوں۔ اب سولہ روپے کا ڈنڈ اور بھرنا ہے۔ پر کیا کیا جاتا امریکہ تو بہر حال جانا تھا۔ میرے کاغذات میں کچھ کمی رہ گئی تھی اس دفتر سے چھٹکارا پاکر دوسرے دفتر میں گیا۔ جیسے تیسے اس کمی یا خامی کو پورا کیا اور گھر آگیا۔

۱۹ مئی کو مجھے کوئی خاص کام نہ تھا میں نے سوچا اُن پرانے دوستوں سے مل لوں جو اس وقت کلکتے میں موجود ہیں۔ اور ایک عرصے سے ملنے کا موقع نہیں نکل سکا ہے۔ اس لیے آج بھی میرے دوست دکان جانے لگے تو ان کے ساتھ ہو لیا۔ جن دوست سے میں ملنا چاہتا تھا انھیں یہ بھی جانتے تھے۔ انھوں نے اپنی دکان سے ہی انھیں فون کر دیا۔ وہ بے چارے خود دکان پر آگئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ بہت دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ باتوں باتوں میں میں نے ان سے کہا: "میں چند منتخب ریکارڈ امریکہ لے جانا چاہتا ہوں تاکہ امریکہ کے لوگوں سے اپنی ہندوستانی موسیقی کا تعارف کرا سکوں۔ میرے دوست کو یہ خیال بہت پسند آیا اور کوئی تین بجے ہم دونوں بازار کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ بہت سی دکانیں دیکھ ڈالیں بڑی مشکل سے اپنے مطلب کے پانچ ریکارڈ ملے۔ دلی میں تلاش کرتا تو جو ریکارڈ میں لے جانا چاہتا تھا غالباً سب مل جاتے۔

دوسرے دن بیس تاریخ تھی۔ ۱۰½ بجے گلیڈ اسٹون جانا تھا۔ صبح اٹھتے ہی تیاری میں لگ گیا اور جیسے ہی میرے دوست دکان پر جانے لگے میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا اور گلیڈ اسٹون کے دفتر میں ٹھیک ۱۰½ بجے مسٹر گابرین کے کمرے پہنچا۔ مجھے انھی سے ملنا تھا۔ یہ پی بی ڈیپارٹمنٹ کے انچارج تھے۔ بڑے تپاک سے پیش آئے۔ میں نے اپنے کاغذات دکھائے اور اکسپریس کمپنی کا واؤچر ان کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے کاغذات دیکھنے کے بعد لوٹا دیے۔ واؤچر ایک شخص کو بلا کر دے دیا اور میرا ٹکٹ تیار کرنے کا حکم دیا۔

میں نے گھر ہی پر بہت سے سوالوں کی فہرست تیار کر رکھی تھی۔ جیسے:

فارغ ہوئے میں نے سوالوں کی بوچھار کردی۔ مگر پہلے ہی سوال کا جواب اتنا نامعقول تھا کہ طبیعت پر اداس سی پڑ گئی۔ میرا سب سے پہلا سوال جہاز کی روانگی کے بارے میں تھا جواب ملا شاید ۲۲ر کو روانہ ہوگا۔ پر ابھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

دہلی میں معلوم ہوا تھا کہ ۲۰ر مئی کو جائے گا۔ اکسپرس کمپنی نے بتایا ۲۱ر کو جائے گا اور مسٹر گلیرس فرماتے ہیں ۲۲ر کو شاید جائے۔ بڑی پریشانی ہوئی۔ انتظار کی گھڑیاں بہت شاق گزرنے لگیں۔ مگر وہی مثل ہے: "مرتا کیا نہ کرتا۔ میں اب کر بھی کیا سکتا ہوں"۔ اس خیال سے دل کو ذرا تسلی ہوئی تو اور دوسرے سوال کیے۔ یہ سوال و جواب ہو رہے تھے کہ جہاز کے ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے اور مجھے ایک کمرے میں لے گئے جو شاید فائلوں کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ خیر صاحب انھوں نے معائنہ فرمایا۔ معائنہ کیا کرنا تھا سولہ روپے وصول کرنا تھے وہ انھوں نے کر لیے ہمیں بھی چھٹی ملی۔

(باقی اگلے پرچے میں)

جناب عادل جعفری

خواب میں سوچا نہ تھا

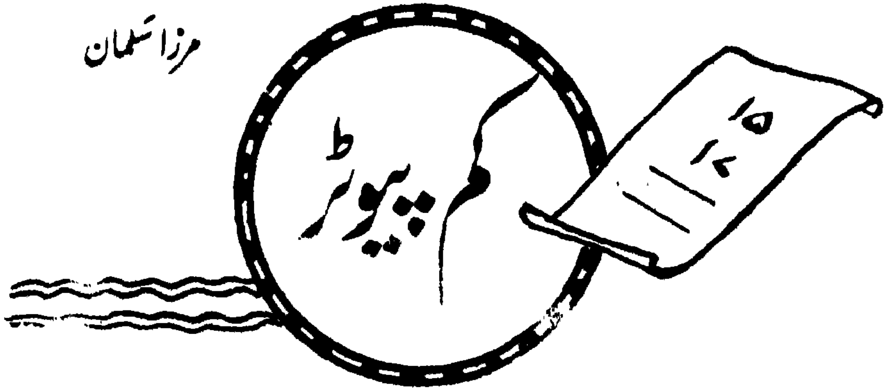
آج میں جیسے ہی سو کر صبح بستر سے اُٹھا
اِک لفافہ دے کے امّی نے یہ ابّا سے کہا
دیکھیے تو کیا ہے یہ، بے کار ہے یا کام کا
آپ کے کمرے میں الماری کے پیچھے تھا پڑا
ہاتھ سے امّی کے ابّا نے لیا کھولا اسے
اِک نظر کاغذ پہ ڈالی، مُنہ بنایا، رکھ دیا
دیکھ کر میری طرف غصّے میں بولے زور سے
"لیجیے حضرت! نتیجہ آگیا یہ آپ کا
دیکھیے کس شان سے ہیں فیل اُٹھیے دیکھیے
اتنا پاکیزہ نتیجہ آج تک دیکھا نہ تھا
چار[4] ہیں تاریخ میں، جغرافیہ میں صرف دو[2]
دائرے کی شکل اقلیدس میں ہے، اے واہ وا
دیکھیے انگریزی میں ہیں صرف چھ[6] نمبر ملے
نو[9] سے زیادہ آپ کو سائنس میں ملتا بھی کیا

ہونے کو اردو میں ہیں چالیس لیکن سب فضول
جب ریاضی میں یہاں ہے ایک ہی نمبر دھرا
یاد ہے اب بھی مجھے اپنا زمانہ یاد ہے
جب مشن اسکول میں میں ساتویں درجے میں تھا
سب سے زیادہ مارکس ملتے تھے مجھے سائنس میں
صرف درجے ہی میں کیا اسکول بھر میں تیز تھا
میری اردو ہی نہیں تھی فارسی بھی بہترین
سو میں سو نمبر ریاضی میں تو لانا کھیل تھا"
اتنے میں ماموں میاں میرے کہیں سے آگئے،
پوچھا ابا سے "کہو دولھا میاں کیا ہو گیا؟"
بولے ابا "یہ تمھارے بھانجے کا ہے رزلٹ
پوچھتے کیا ہو اسے تم خود ہی لو دیکھو ذرا"
ہاتھ میں ماموں میاں نے لے کے کاغذ شوق سے
پڑھ لیا ہر لفظ کو از ابتدا تا انتہا
مسکرا کر طنزیہ ابا سے پھر کہنے لگے
ہوشمندی کا نمونہ ہے یہ لڑکا آپ کا!!
یہ تو پہلی جون سن تیس کی ہے مارکس شیٹ
نام ہے یہ دیکھیے خود آپ کا لکھا ہوا

آپ اتنے [illegible] تھے پڑھنے میں، سچ؟ کیا واقعی؟
خواب میں بھی ہم نے یہ دولھا میاں سوچا نہ تھا"

مرزا سلمان

کمپیوٹر



دِلّی سے بمبئی کوئی ۸۵۷ میل ہے۔
ایک ریل گاڑی دو سو میل ۲۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اور بقیہ فاصلہ ۴۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے طے کرتی ہے۔ بتائیے اس گاڑی سے بمبئی پہنچنے میں کتنی دیر لگے گی؟

آپ تو سوچ میں پڑ گئے۔ کاغذ پنسل لے کر بیٹھنے کی فکر میں ہیں۔ بھلا آج کل کے زمانے میں اس کی مہلت کہاں۔ اور ذرا سوچیے اگر یہ چاند تک کا ہزار ہا میل کا سفر کرنے کا خواب دیکھنے والے بھی آپ ہی کی طرح بیٹھ کر ضرب تقسیم کرنے لگے تو کیوں کر کام بنے گا۔ اور یہ تو ہم نے ایک مثال دی۔ ایسے ہی نہ جانے کتنے کام انسان کرتا ہے اور کرنے کی سوچتا ہے۔ ان کاموں میں اتنے لمبے چوڑے اعداد و شمار ہوتے ہیں کہ اگر سائنس داں آپ کی طرح نفی، جمع، ضرب اور تقسیم کے چکر میں پڑیں تو ایک ذرا سی چیز کا حساب لگانے میں ہی نہ جانے ان کی کتنی پیڑھیاں ختم ہو جائیں پھر بھی نہ جانے جواب صحیح آئے یا نہ آئے۔

حساب تو آپ جانیں ہوتی ہی ایسی چیز ہے کہ ایک ذرا صفر اِدھر اُدھر ہوا نہیں کہ سارا معاملہ چوپٹ۔ اپنے حساب سے تو آپ کا راکٹ چاند پر جا رہا ہوگا اور ذرا سی حسابی غلطی سے پہنچ جائیں گے مریخ میں، اور اس کا بھی کیا پتہ کہ کہیں پہنچ بھی پائیں گے یا زمین کے گرد کولھو کے بیل کی طرح چکر ہی کاٹتے رہ جائیں گے۔

کہیے ہے نا معاملہ گمبھیر؟

اچھا خیر! آئیے آپ کو ایسی چیز دکھائیں جس سے مشکل سے مشکل سوال بس یوں چٹکی

بجاتے ہیں حل ہو جائے۔ یہ چیز ہے "کم پیوٹر" (Computon) یا اردو میں اسے آپ "مشینی دماغ" سمجھ لیجیے۔ اسے بناتا تو انسان ہی ہے۔ مگر اس کے بعد یہ ایسے ایسے کارنامے دکھاتا ہے کہ خود انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آپ کو اپنا سوال بتاتے دیر لگے گی، "کم پیوٹر" کو جواب دیتے دیر نہیں لگے گی۔

بڑے بڑے ہوٹلوں میں بل بنا کر پیش کر دینا، بڑی بڑی دکانوں میں خرید و فروخت کا لمبے سے لمبا حساب لگا کر دے دینا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس کے اصل کمالات سے تو کچھ انجینیر اور سائنس داں ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بہت بڑا پل بنانا ہے، حساب لگانے بیٹھیں تو بھیجا پگھل جائے کم پیوٹر سے درخواست کی، لیجیے مشکل دور ہو گئی۔ بڑی پیچیدہ سی کوئی مشین بنانا ہے، یوں حساب لگانے میں عمریں بیت جائیں، کم پیوٹر کی مدد لی جاتی ہے۔ پلک جھپکتے میں جواب حاضر۔ کم پیوٹر نہ ہوا کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہو گیا۔ جہاں کوئی چلاتا ہوا چرنوں میں آ کے گرا "دہائی ہے بڑی بپتا آن پڑی ہے۔" انھوں نے "حق اللہ" کا نعرہ مارا، آنکھیں کھولیں، سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا "جا اللہ بھلا کرے گا بیٹا۔" لیجیے ساری مصیبت ختم۔ ان کی کرامت ہوئی اور بے چارے مصیبت زدہ کا کام بن گیا۔ تو بھئی یہ کم پیوٹر ہے تو سائنس ہی کی کرامت۔ چاند اور راکٹ ہی کا معاملہ لیجیے۔ ہزاروں میل کا سفر، سینکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار۔ ذرا سی حساب میں غلطی سے ساری محنت پر پانی پھر جائے۔ پر یہ مشینی دماغ نہ صرف یہ کہ حساب لگاتا ہے بلکہ کس قدر صحت کے ساتھ اس کا زندہ ثبوت روس اور امریکہ کے کارنامے ہیں۔

اچھا صاحب، یہ تو ہوئے "کم پیوٹر صاحب" کے کارنامے جسے انگریزی میں Digital Computon کہتے ہیں۔ ایک "کم پیوٹر صاحب" بھی ہیں ان کو انگریزی میں Analog Computon کہتے ہیں۔ دونوں کے کام میں سمجھیے ایسا ہی فرق ہے جیسا مردوں اور عورتوں کے کام میں۔ دفتر، تجارت، بڑے بڑے حساب کتاب زیادہ تر مرد کرتے ہیں۔ گھر میں کسی چیز کی ضرورت ہے، کیا چیز فالتو ہے؛ شادی بیاہ کا حساب لگانا یہ کام عموماً عورتیں ہی

کرتی ہیں۔ تو بس یہ دوسرے قسم کا کام "کم پیوٹر صاحب" کیا کرتی ہیں۔

آپ مذاق سمجھ رہے ہوں گے پر ہم سچ کہتے ہیں یہ تو شادیاں تک لگوا دیتی ہیں۔ امریکہ میں تو آج کل اس کا بڑا چرچا ہے۔ بہت سے نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنی پسند ناپسند، عادات و اطوار اور دوسرے حالات جاکر فوراً فوراً ان کم پیوٹر صاحب کو بتا دیتے ہیں۔ اور یہ کم پیوٹر صاحب مزاج اور حالات کی مناسبت سے فیصلہ کر دیتی ہیں کہ فلاں لڑکی کو فلاں لڑکے سے اور فلاں لڑکے کو فلاں لڑکی سے شادی کرنا چاہیے۔ دیکھا آپ نے، نہ بڑی بوڑھیوں کو لڑکی دیکھنے جانے کی ضرورت، نہ کسی کو بر دکھوا کے لیے جانا ہوتا ہے، نہ لڑکی والے بر ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ سب اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ نئی کم پیوٹر شادی طے کر دیتی ہیں۔

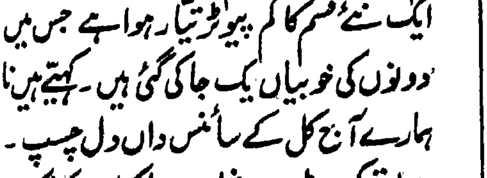
اور یہ بھی نہیں کہ یہ مشینی دماغ کوئی کاٹھ کے اُلّو ہوں۔ اجی حضرت یہ مذاق بھی خوب کرتے ہیں۔ بعض بعض تو ایسے حاضر جواب نکلتے ہیں کہ اچھے اچھوں کے دانت کھٹے ہو جاتے ہیں۔ حساب کتاب کرنے والے تو عموماً بڑے خشک مزاج ہوتے ہیں۔ مگر ایک ایسے کم پیوٹر کی حاضر جوابی تو ذرا سنیے: ایک معزز مگر ذرا سائنس اور ریاضی سے نابلد صاحب ایک کم پیوٹر دیکھنے گئے۔ سیاسی یعنی نیتا قسم کے آدمی تھے پوچھنے لگے: "یہ بتائیے امریکہ کا صدر کون ہے؟" تڑاک سے جواب ملا: "جناب کیوں مجھے پریشان کرتے ہیں۔ کسی اخبار کا پہلا صفحہ اُٹھا کر دیکھ لیجیے ایسی اہم شخصیت کا نام آپ کو ضرور مل جائے گا۔" انھوں نے دوسرا سوال کیا: "اچھا یہ بتائیے امریکہ کی خاتونِ اوّل کون ہیں؟" چھوٹتے ہی جواب ملا "ماشاء اللہ آپ کو عورتوں سے بہت دل چسپی ہے۔" بے چارے نیتا جی سمجھتے تھے کہ پُرانا کم پیوٹر ہے پُرانی خبر دے گا۔ مگر کم پیوٹر نے خود ان ہی کو لاجواب کر دیا۔

پر بھئی مشین تو پھر مشین ہوتی ہے انسان کی بنائی ہوئی۔ اسے جتنا سکھایا جاتا ہے اتنا ہی بتاتی ہے۔ نہ آتا ہو تو بہت صفائی سے "معاف کیجیے گا" کہہ دیتی ہے۔ اور آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ یہ سب بات چیت، حساب کتاب ایسے ہوتے ہیں جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے ہوں۔ نہیں بھئی۔ مشین سے اس کو استعمال

کرنے کے لیے اس کا طریقہ سیکھنا پڑتا ہے۔

بات چیت زبانی نہیں بلکہ ٹائپ رائٹر کے ذریعے ہوتی ہے۔ خاص قسم کے کارڈ پر آپ اپنا سوال ٹائپ کرتے ہیں۔ یہ کارڈ کمپیوٹر میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ وہ ان کا مطالعہ کرتا ہے۔ اگر سوال صحیح طریقے سے لکھا ہو تو چند لمحوں بعد اس کا ٹائپ رائٹر اپنے آپ چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور "بہت خوب" لکھ کر سامنے آجاتا ہے۔ اگر ان کارڈوں پر لکھنے میں کوئی غلطی ہوتی ہے یا کوئی ایسا سوال کیا گیا جو کمپیوٹر کی سمجھ سے باہر ہو تو اس کے مطابق لکھ کر آجاتا ہے کہ "سوال لکھنے میں آپ نے فلاں غلطی کی ہے" یا "معاف کیجیے گا میں یہ جواب دینے سے معذور ہوں" غرض پہلے آپ کو سوال کی منظوری کی اطلاع دی جاتی ہے اور پھر مزید چند لمحوں کے بعد کارڈوں پر جواب چھپ کر نکلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کمپیوٹر اور اس کا کام ہلکا پھلکا ہو تو اسی اعتبار سے استعمال بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اور بھئی یہ کمپیوٹر نازک مزاج بھی بہت ہوتے ہیں۔ ایرکنڈیشنڈ جگہوں میں ان کو رکھنا ہوتا ہے۔ ذرا درجۂ حرارت مقررہ مقدار سے کم زیادہ ہوا کہ نخرے شروع ہو جاتے ہیں۔ جواب میں کمپیوٹر آئیں بائیں شائیں بکنا شروع کر دیتا ہے۔

ہمارے ملک میں تو کمپیوٹر بہت گنی چنی تعداد میں ہیں۔ سب سے اچھا ٹاٹا کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ہے۔ ترقی یافتہ ممالک جیسے امریکہ وغیرہ میں تو ذرا ذرا سے کاموں کے لیے ان کا استعمال ہوتا ہے۔ سائنس داں اس میں مزید بہتری کے لیے رات دن کوشاں رہتے ہیں ابھی کچھ دن پہلے خبر نظر پڑی "کمپیوٹروں کی شادی کر دی گئی" پہلے تو ہم چکر میں پڑ گئے کہ بھلا مشینوں کی شادی! پڑھنے پر معلوم ہوا کہ کمپیوٹر صاحب اور کمپیوٹر صاحبہ دونوں کو ملا کر ایک نئے قسم کا کمپیوٹر تیار ہوا ہے جس میں دونوں کی خوبیاں یک جا کی گئی ہیں۔ کہتے ہیں نا ہمارے آج کل کے سائنس داں دلچسپ۔ پہلے تو کمپیوٹر سے شادی طے کرانے کا کام لیتے تھے اور اب خود ان کی شادی کر دی۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔



جناب کوثر انصاری (بمبئی)

علم کی برکتیں



علم ہوتا ہے جن کو جی سے پسند
اُن کے رُتبے ہیں دیکھو کتنے بلند
علم سے نیکیاں زمانے کی
علم کی غفلتوں پہ ڈالو کمند
علم ہے ضو فشاں زمانے میں — کیا کمی علم کے خزانے میں

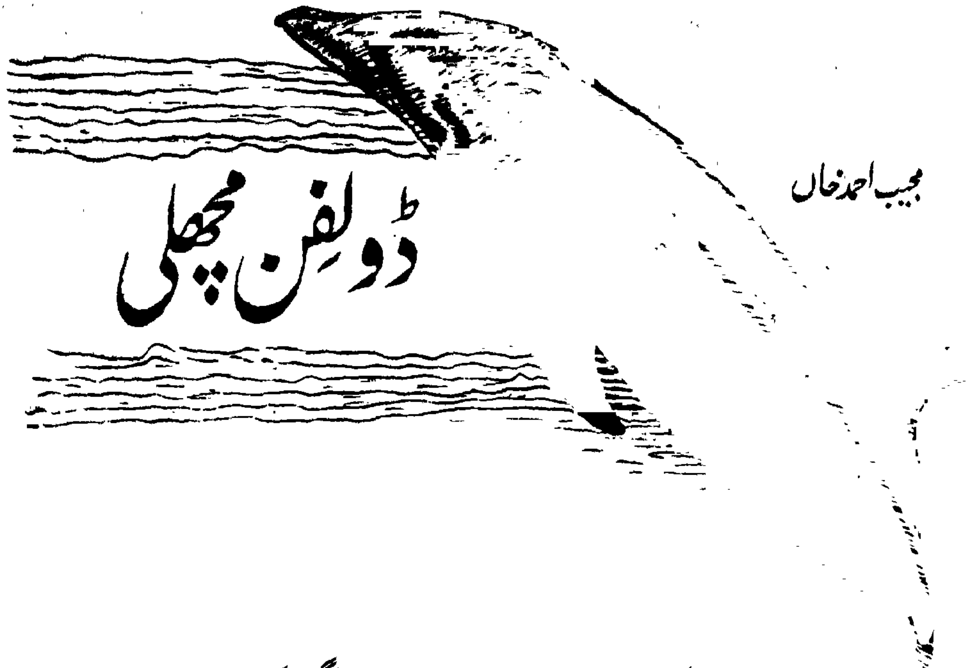
علم ہی ہے خدا کا اک فرمان
علم کے بس میں ہیں یہ دونوں جہان
علم ہی زندگی کا محور ہے
علم سے ہے جہاں میں امن و امان
علم ہے ضو فشاں زمانے میں — کیا کمی علم کے خزانے میں

علم ہی زندگی کا ساحل ہے
علم ہی دوستی کی منزل ہے
زندگی کی روش منور ہے
علم کوثر وہ ماہِ کامل ہے
علم ہے ضو فشاں زمانے میں — کیا کمی علم کے خزانے میں

بچوں کی دلچسپ اور سبق آموز کتابیں

ایک پھوہڑی تیل میں راجا جی چلیں ۴۰/-	اس نے کیا کر نہ جانا ۲۷/-	بچوں کی کہانیاں ۲۷/-	بڑے دادا کی کہانی ۵۶/-
پرندوں کا ایکا ۲۰/-	تانبیل خاں ۳۰/-	ترکوں کی کہانیاں ۵۵/-	جنگو کی بلی ۲۵/-
چنبیلی ۵۰/-	چمپاوت کا آدم خور شیر ۳۵/-	چوہوں کی کانفرنس ۴۵/-	خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا ۳۰/-
سونے کی چڑیا ۱/=	شہزادہ اور ٹھگ ۴۵/-	شہزادی گلفام ۵۰/-	شہزادی گلناز ۴۰/-
شیدلا ۵۰/-	کیمپ فائر کی نقلیں اوّل ۷۵/-	کیمپ فائر کی نقلیں دوم ۷۵/-	لال مرغی ۵۰/-
مزہ چکھائیں گے ۳۵/-	مرغی اجمیر چلی ۲۵/-	ننھا ٹٹو ۳۰/-	ہمت کے پھل ۳۵/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵



ڈولفن مچھلی

مجیب احمد خاں

جانوروں میں بندر، کُتّے، ہاتھی اور گھوڑے کو آپ سب سے زیادہ سمجھ دار جانور مانتے ہیں۔ پر یہ سُن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ ان سے بھی زیادہ سمجھ بوجھ رکھنے والا ایک جاندار اور بھی ہے اور وہ ہے سمندری مچھلی 'ڈولفن'۔

ڈولفن گہرے سمندر میں رہنے والی مچھلی ہے۔ تقریباً دس فٹ لمبی اور کافی وزنی۔ یہ بہت تیز تیرتی ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی رفتار ۶۰ کلو میٹر فی گھنٹہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اتنا تیز تیرنے پر بھی پانی میں کوئی ہل چل پیدا نہیں کرتی۔ اور جناب ایک اور انوکھی بات یہ کہ ڈولفن انڈے نہیں، بچے دیتی ہے۔ ایک بار میں صرف ایک ہی بچہ دیتی ہے اور اُسے اپنا دودھ پلاتی ہے۔

علم حیوانات کے ماہرین کا خیال ہے کہ دودھ پلانے والی مخلوق میں آدمی کے بعد سب سے زیادہ سمجھ رکھنے والا جاندار یہی مچھلی ہے۔ اسے سدھایا جائے تو بڑی آسانی سے

سدھ جاتی ہے۔ کہنا خوب مانتی ہے۔ اس کے گلے میں آواز پیدا کرنے والے عضلات نہیں ہوتے۔ پر وہ اپنے منہ سے ہوا نکال کر پانی میں مختلف قسم کی آوازیں پیدا کرتی ہے اور یہ آوازیں اس کے مختلف جذبات کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے جسم کی مختلف حرکتوں سے وہ خوشی، رنج، غصے اور نفرت کا بھی صاف صاف اظہار کر سکتی ہے۔ اس کی سننے کی طاقت بھی بہت تیز ہوتی ہے سمت کا اندازہ لگانے میں ماہر ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر سمندر میں دور لے جائیے اور پھر کنارے پر کھڑے ہو کر آواز دیجیے۔ آواز سنتے ہی سیدھی آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔

ہمارے سائنس داں ڈولفن کی اس سوجھ بوجھ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مثلاً امریکی سائنس دانوں نے ایک ڈولفن کو سمندر کے اندر کیے جانے والی تحقیقاتی کاموں کے لیے سدھایا ہے۔ اس ڈولفن کا نام انھوں نے "ٹفی" رکھا ہے۔ ٹفی سمندر کے اندر تحقیقات کرنے والے جہاز "سی لیب دوم" میں ملازم ہے۔ اور سطح سمندر پر کھڑے ہوئے جہاز اور سمندر کی تہہ میں کام کرنے والے سائنس دانوں کے درمیان پوسٹ مین کا کام انجام دیتی ہے، پیغامات لے جاتی ہے اور چھوٹا موٹا سامان بھی پہنچا دیتی ہے۔ وہ اپنے مالک کے ہر اشارے کو اور آواز کے ہر اتار چڑھاؤ کو خوب سمجھتی ہے اور ہمیشہ وہی کرتی ہے جو اس کا مالک چاہتا ہے۔

ایک بار ٹفی کے جہاز پر کام کرنے والا ایک شخص سمندر میں گر گیا۔ لہریں کچھ اس طرح چل رہی تھیں کہ باوجود کوشش کے وہ شخص جہاز سے دور ہوتا چلا گیا۔ ٹفی کے مالک نے ٹفی کو آواز دی۔ ٹفی فوراً سطح پر آ گئی۔ مالک نے ایک لمبی رسی کا سرا اس کے منہ میں دے کر اس آدمی کی طرف صرف اشارہ کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اس آدمی کے پاس تھی۔ ٹفی نے رسی کا سرا اس آدمی کے ہاتھ میں تھما دیا اور اس طرح اس کی جان بچالی۔

ایک امید سے بھی زیادہ دل چسپ خبر پچھلے مہینے کے اخباروں میں چھپی ہے۔ ایک آدمی نہ جانے کیسے سمندر میں شارک مچھلیوں کے

زغے میں آگیا۔ قریب تھا کہ وہ اس کا تِکّا بوٹی کر ڈالیں پر اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ بہت سی ڈولفِن مچھلیاں وہاں پہنچ گئیں آدمی کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ ایک ڈولفِن مچھلی نے آدمی کو اپنی پیٹھ پر لِٹا لیا۔ دوسری مچھلیاں شارک مچھلیوں سے لڑتی لڑاتی آدمی کو ان دشمنوں کے زغے سے نکال لائیں اور اسے ایک محفوظ جگہ پہنچا دیا۔

حفیظ اللہ نیولپوری

ہم سفر



برسوں پُرانی بات ہے ایک پارسی اور ایک یہودی ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ یہودی ایک غریب آدمی تھا۔ اس کے پاس نہ سفر کے لیے خرچ تھا نہ سواری۔ پیدل ہی راستہ طے کر رہا تھا۔ پارسی کافی دولت مند تھا اور ایک تیز رفتار خچر پر سوار تھا۔ سفر کے تمام سامان اور طرح طرح کے کھانے ساتھ تھے۔ پارسی نے یہودی سے دریافت کیا کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟ یہودی نے کہا: "میرا مذہب اور عقیدہ یہ ہے کہ میرا ایک خالق ہے اور میں اسے پوجتا ہوں اور اسی کی درگاہ میں پناہ لیتا ہوں۔ اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے اس کی بارگاہ سے نیکی طلب کرتا ہوں۔ جو میرے مذہب کی مخالفت کرتا ہے اس کا خون اور مال اپنے لیے حلال سمجھتا ہوں اور اس کی مدد کرنا اپنے اوپر حرام ....."

جب یہودی نے یہ باتیں کہہ ڈالیں تو پارسی سے دریافت کیا۔

"آپ بھی اپنا مذہب اور عقیدہ ظاہر کیجیے!"

پارسی نے کہا: "میرا عقیدہ یہ ہے کہ میں اپنے لیے اور تمام لوگوں کے لیے بھلائی چاہتا ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ کسی مخلوق کا بُرا ہو میں حتی المقدور دوست اور دشمن ہر ایک سے اچھا سلوک کرتا ہوں۔ کوئی شخص مجھ سے بُرا سلوک کرتا ہے تو اس سے بدلہ لینے کی کوشش نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ سارے جہان

ایک خالق ہے۔ اور مخلوق کی کوئی بات اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ وہ نیک لوگوں کو نیکی کے عوض ثواب دیتا ہے اور بُرے کو بدی کے بدلے عذاب۔"

یہودی نے کہا: "آپ نے تو ٹھیک فرمایا آپ کا مذہب بھی ٹھیک ہے۔ لیکن معاف کیجیے گا! آپ اپنے مذہب پر قائم نہیں ہیں۔"

پارسی نے تعجب سے پوچھا "واللہ! یہ کیسے؟"

یہودی نے کہا "غور فرمائیے! میں آپ کا ہم سفر ہوتے ہوئے بھی پیدل سفر کر رہا ہوں اور آپ خچر پر سوار ہیں۔ آپ کے ساتھ کافی مقدار میں کھانا ہے۔ میں ان تمام چیزوں سے محروم دو وقت کا بھوکا ہوں لیکن نہ آپ نے مجھے اپنے کھانے میں شریک کیا نہ گھڑی بھر کو خچر پر بٹھایا ـــــ"

"آپ نے بجا فرمایا" یہ کہہ کر پارسی خچر سے اُتر پڑا۔ ایک سایہ دار درخت کے نیچے دسترخوان بچھایا اور کھانا چُنا۔ دونوں بیٹھ کر کھانے لگے۔ یہودی خوب سیر ہو چکا تو پارسی نے کہا "آپ بہت تھکے ہوئے ہیں کچھ دیر خچر پر سوار ہو جائیے تکان دور ہو جائے گی۔ یہودی خچر پر سوار ہو گیا اور پارسی خچر کے پیچھے پیچھے پیدل چلنے لگا۔ دونوں آپس میں باتیں کرتے جاتے تھے۔ یہودی نے پارسی کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ اس پر تکان کا اثر طاری ہے، فوراً خچر کو ایڑ لگا کر آگے نکل گیا۔ پارسی جنگل میں تنہا رہ گیا۔ بے چارہ بڑی عاجزی سے فریاد کرتا رہا اور یہودی کو پکارتا رہا کہ "اے بھائی نیکی کا بدلہ بدی سے مت دو۔ یہ جنگل کا خوفناک راستہ ہے کہیں کوئی درندہ مجھے مار نہ ڈالے یا پانی نہ ملنے کی وجہ سے ہلاک نہ ہو جاؤں!"

یہودی نے پیچھے مُڑے بغیر جواب دیا "میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ جو میرے دین کی مخالفت کرے گا اس کا خون اور مال مجھ پر حلال ہے۔" اور پارسی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بے چارہ پارسی اس کی گرد کو بھی نہ پا سکا۔ آخرکار اس خوفناک جنگل میں پارسی کو اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا اور وہ آسمان کی جانب سر اُٹھا کر اللہ سے دُعا کرنے لگا۔

"اے میرے پروردگار! میں نے جو کیا تیری ہدایت کے مطابق کیا۔ میں جانتا تھا کہ تو نیکی کا بدلہ ثواب ہے اور بدی کا بدلہ عذاب دینے والا ہے۔ اے میرے معبود! اگر مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہے تو تُو اپنے فضل و کرم سے معاف فرما۔ اس ظالم نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ انصاف تیرے ہاتھ ہے۔

پارسی گریہ وزاری کرتا ہوا اپنی راہ پر ہولیا۔ میل بھر چلنے کے بعد کیا دیکھتا ہے کہ اس کا خچر یہودی کو اپنی پشت سے گرا کر ایک طرف کھڑا ہے اور گرنے کی وجہ سے یہودی زخمی ہوگیا ہے اور تڑپ رہا ہے۔

پارسی نے اپنے خچر کو دیکھ کر سجدۂ شکر ادا کیا اور اس پر سوار ہو کر اپنی منزل کی جانب چل پڑا۔

یہودی کراہتے ہوئے پکارنے لگا۔ "اے بھائی! میں نے تجھے دھوکا دینا چاہا۔ اس کا پھل مجھ کو ملا۔ تیرے حسنِ اعتقاد کا بدلہ تجھ کو ملا۔ اب مجھے اس بیابان میں اکیلا نہ چھوڑ۔" یہ کہہ کر یہودی اس قدر رویا کہ پارسی کو اس پر رحم آگیا۔ اس نے دغاباز یہودی کو خچر پر بٹھا کر شہر پہنچا دیا۔

(فارسی سے)

پیام تعلیم اور کتابیں

۱۲ر فروری ۶۶ء کو رئیس ہائی اسکول اولڈ بوائز ٹرائی کے تحت آل مہاراشٹر انٹر اسکول اردو تقریری مقابلہ ہوا تھا۔ معین الدین صاحب حارث جلسے کے صدر تھے۔ اس موقع پر بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے شاہد علی خاں صاحب (منیجر شاخ مکتبہ بمبئی) نے مس تحسین مسعود فرید کو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بمبئی کی طرف سے ۲۵ روپے کی کتابیں دینے کا اعلان کیا۔

اور محترمہ نورالنساء بیگم جناب یوسف ناظم اور جناب اصغر مہدی، مس رضیہ، محمد ذکریا حکیم (مالی گاؤں) اور تحسین فرید کے نام اور جناب شفیق چودھری نے مس رفیعہ محمد حسن (رئیس ہائی اسکول) اور مس جمیلہ قادری چودھری کے نام ایک ایک سال کے لیے ماہنامہ "پیامِ تعلیم" جاری کرانے کا اعلان کیا۔

(شمعِ ادب، بھیونڈی)

"میرا بھی کوئی خط ہے"

"آپ کا نام کیا ہے"

"میرا نام لفافے پر ہوگا"



اظہر افسر



ننّھا جاسوس

کام کرنے والے: نجّو
موتی
انسپکٹر
ساتھی
آشا اور دو تین اور آدمی

منظر پہلا

ڈاک خانے کے سامنے موتی اور نجّو کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔

موتی: نجّو۔ چاچی کے ہاں سے کوئی خط آیا۔

نجّو: میں سمجھتا ہوں کہ وہ خود مجھ سے ملنے ہاسٹل آئیں گے، تم سناؤ چاچا جی کا کیا حال ہے۔

موتی: وہی سوچ رہا ہوں، انھوں نے بھی کوئی خط نہیں لکھا فیس کے لیے روپے چاہئیں نئی کتابوں کی ضرورت ہے، آؤ ڈاک خانہ کھلا ہے ایک خط ڈال دیں۔

نجّو: دو پوسٹ کارڈ دیجیے۔

ایک آدمی: دس پیسے والے تین ٹکٹ چاہئیں ٹکٹ دیجئے۔
آشا: مجھے ایک منی آرڈر فارم چاہیئے۔ ارے ارے میرا پرس۔ میرا پرس۔
ایک آدمی: کیا بات ہے دیوی جی۔
آشا: ابھی ابھی جو آدمی بھاگا ہے اس نے میرے ہاتھ سے پرس چھین لیا ہے، پرس میں تین سو روپے کے نوٹ ہیں۔ اب میں کیا کروں۔
نجو: کالے کوٹ والے آدمی کو تو نہیں کہہ رہی ہیں آپ تو میرے پاس کھڑا تھا؟
موتی: ہاں مجھے بھی یاد ہے اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔
آشا: ہاں وہی ہے، ہائے اب میں کیا کروں۔
ساتھی: ٹھہرئیے میں دیکھتا ہوں بچ کر کہاں جا سکتا ہے۔
(ساتھی کچھ دور بھاگ کر جاتا ہے پھر ہانپتا ہوا لوٹ آتا ہے)
موتی: کیا ہوا ملا وہ آدمی آپ کو۔
ساتھی: جی نہیں بڑی دیر ہوئی۔ میرے دیکھتے دیکھتے نہ جانے وہ سڑک پر کہاں غائب ہو گیا۔
آشا: اب کیا ہوگا؟
نجو: چلئے پولس میں رپورٹ کریں۔
ساتھی: ہاں ہاں چلئے پولس میں ضرور رپورٹ کرنی چاہیئے! آئیے۔
آشا: بچو۔ تم بھی میرے ساتھ چلوگے؟
موتی: ہاں ہاں چلئے، ہم دونوں آپ کے ساتھ ہیں۔
نجو: وہ میرے ہی پاس کھڑا کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا میں نے اسے اچھی طرح دیکھا ہے۔ آئیے!

[منظر ۲]

(تھانے میں ایک بڑی سی میز پر دو تین رجسٹر رکھے ہوئے ہیں۔ آس پاس کچھ کرسیاں ہیں۔ درمیان میں انسپکٹر بیٹھا ہے۔ داہنی جانب سے موتی۔ بچو۔ اور آشا اور ساتھی داخل ہوتے ہیں)
ساتھی: انسپکٹر صاحب آداب۔ (بچے بھی سلام کرتے ہیں)
انسپکٹر: آداب۔ آداب۔ فرمائیے؟
ساتھی: آپ کا پرس چوری ہو گیا ہے۔
آشا: اس میں تین سو روپے تھے انسپکٹر صاحب، مجھے اسکول کا کچھ سامان خریدنا تھا۔
انسپکٹر: آپ کا شبھ نام؟ بیٹھئے نا۔
آشا: جی میرا نام آشا ہے۔ میں جامعہ ملی گرلس اسکول کی استانی ہوں۔ (بیٹھ جاتی ہے)
انسپکٹر: لیکن یہ چوری ہوئی کیسے؟
آشا: میں ڈاک خانے میں پوسٹ ماسٹر سے منی آرڈر

فارم مانگ رہی تھی، دو چار آدمی میرے پاس کھڑے تھے ان میں سے ایک نے میرے ہاتھ سے پرس چھین لیا۔ اور فوراً ڈاک خانے سے چلتا بنا۔

ساتھی: میں اس بدمعاش کے پیچھے لپکا بھی مگر وہ ایسا غائب ہوا جیسے چھلاوہ۔

انسپکٹر: یہ لڑکے کون ہیں؟

نجو: ہم دونوں سامنے والے ہاسٹل میں رہتے ہیں۔ ہم نے اس آدمی کو اچھی طرح دیکھا ہے۔

انسپکٹر: کیسا آدمی تھا وہ۔

موتی: ایک لمبے قد کا آدمی، اس کی خوب بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔

ساتھی: جی نہیں وہ آدمی جو پرس لے کر بھاگا ہے وہ تو کچھ ایسا لمبا نہیں تھا، اور نہ اس کے مونچھیں ہی تھیں۔ میرا خیال ہے ان لڑکوں نے کسی اور کو دیکھا ہے۔

انسپکٹر: (آشا سے) آپ نے اسے دیکھا ہے؟

آشا: میں صرف اتنا دیکھ سکی کہ کسی نے میرے ہاتھ سے پرس چھین لیا اور ڈاک خانے سے باہر بھاگا شاید اس کا قد لمبا ہی ہے۔ مونچھیں بھی ہوں۔

موتی: وہ کالے رنگ کا لمبا سا کوٹ پہنے تھا انسپکٹر صاحب، ہم اسے پھر کبھی دیکھ لیں تو ضرور پہچان جائیں گے۔

آشا: ہاں اس کے جسم پر کالے ہی رنگ کا کوٹ تھا۔

ساتھی: آپ لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے اس کا قد نہ تو کچھ ایسا لمبا تھا نہ وہ کالے رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اس سے اس کے کوٹ کے کپڑے کے دام بھی پوچھے تھے وہ نیلے رنگ کا کوٹ پہنے تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ کچھ ہی دیر بعد وہ کسی کا بٹوہ لے اڑے گا۔ . . . خیر صاحب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میں تو چلتا ہوں۔

آشا: آپ تو بالکل خفا ہو گئے بعض وقت نیلے رنگ پر بھی تو کالے رنگ کا دھوکا ہو سکتا ہے۔

ساتھی: جی نہیں معاف فرمائیے اب آپ ان بچوں ہی سے مدد لیجئے مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ چلتے چلتے اتنا اور بتا دوں وہ ڈاک خانے کے سامنے والا پنواڑی کی گلی میں کہیں غائب ہوا ہے۔

(چلا جاتا ہے)

انسپکٹر: آپ نے ایک اچھے خاصے آدمی کی مدد سے انکار کر دیا۔

آشا: اوہ۔ اب کیا ہو گا۔

انسپکٹر: میں نے آپ کی اور اس آدمی کی باتیں نوٹ کر لی ہیں۔ تلاش شروع کر دی جائے گی۔

اپنا پتہ لکھوا دیجئے تاکہ کوئی فوری ضرورت پر آپکو اطلاع دی جاسکے۔

آشا: میں مام پلی گرلس اسکول کی استانی ہوں۔ میرا نام آشا ہے۔ اسکول میں یا پھر سامنے ہی اسکول کے ہاسٹل میں میں ہر وقت مل سکتی ہوں۔

انسپکٹر: بہت اچھا۔ اب آپ جاسکتی ہیں۔

[منظر ۳]

(وہی منظر ہے جو ایک میں ہے)

نجو: موتی! کیا سچ مچ اس آدمی کی مونچھیں نہیں تھیں انسپکٹر کو حلیہ بتانے میں مجھ سے کہیں بھول تو نہیں ہوئی؟

موتی: بھول کیسی، میں نے خود اس آدمی کو اتنے قریب سے دیکھا ہے جتنے اب تم ہو۔ اس کی مونچھیں ہیں اور کافی بڑی بڑی نوکدار۔ اور وہ کالے رنگ کا کوٹ پہنے تھا۔

نجو: نہیں۔ آدمی جو ہمارے ساتھ تھانے آیا تھا۔

موتی: وہ تو یہ بھی کہتا تھا کہ پرس لے کر بھاگنے والا آدمی لمبا تڑنگا نہیں تھا۔ اس کی مونچھیں تھیں نہ کالا کوٹ تھا۔

نجو: اس آدمی کے دیکھنے میں ضرور غلطی ہوئی ہے۔ اور پھر ضدی ایسا ہے کہ تھانے میں بھی اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ لیکن ایک بات ہے موتی۔ اس نے تھانے میں چل کر رپورٹ لکھوانے میں مدد ضرور کی۔ میرا خیال ہے اس نے پرس لے کر بھاگنے والے آدمی کو اچھی طرح دیکھا نہیں۔ بھولا بیچارہ۔

موتی: وہ اتنا بھولا نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ ٹھہرو تو ـــ

نجو: کیا ہوا، رک کیوں گئے۔

موتی: نجو۔ تم ہاسٹل جاؤ اپنے۔ میں آتا ہوں مگر دیکھو ہاسٹل ہی میں رہنا۔ میں کہیں نہ کہیں سے تمہیں فون کروں گا۔ اچھا۔ (چل دیتا ہے)

نجو: سنو۔ سنو موتی۔ چلا گیا۔

[منظر ۴]

(موتی اور نجو کا ہاسٹل۔ میز پر ٹیلیفون رکھا ہے نجو ٹہل رہا ہے)

نجو: یہ موتی بھی عجیب ہے۔ جانے کیا سوجھی، باتیں کرتے کرتے چل دیا۔ کہتا تھا فون کروں گا کہیں سے۔ چار بج رہے ہیں اب تک بھائی کا پتہ نہیں ہے۔

(اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

نجو: (ریسیور اٹھاتا ہے) ہلو۔ کون موتی! ہاں میں

نجو بول رہا ہوں یعنی کیا کرتا تمہارے ٹیلیفون کا انتظار کرتے کرتے کمرے سے ٹیلیفون کی میز کے پاس ہی چکر لگاتا رہا ہوں۔ کیا کہا؟ آشا دیوی کو پیام پہنچ گیا تو اسکول سے یا ہاسٹل سے؟ اچھا اچھا لیتا آتا ہوں۔ بہت اچھا۔ اسٹیشن پر ملوگے؟

اچھا۔ آ رہا ہوں۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔

(ریسیور رکھ دیتا ہے)

[منظر ۵]

(ایک کمرہ کی کھڑکی نظر آ رہی ہے جس کے اس طرف ریلوے پلیٹ فارم ہے۔ بائیں جانب سے آشا اور نجو داخل ہوتے ہیں۔ موتی پہلے ہی سے کھڑکی سے لگا کھڑا ہے)

موتی: آشا دیوی بہت اچھا کیا آپ نے جو جلدی چلی آئیں۔ ذرا اس کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھیے اندر دو آدمی ہیں کیا آپ انھیں پہچانتی ہیں۔

(آشا کھڑکی سے اندر جھانکتی ہے)

آشا: ارے یہ تو وہی دو آدمی ہیں۔ ایک بڑی مونچھوں والا ہے، دوسرا وہ ہے جو ہمارے ساتھ کھانے گیا تھا۔

نجو: ان دونوں کا ساتھ کیسے ہو گیا؟

موتی: یہ سب کچھ میں بعد میں بتاؤں گا۔ بس اتنا کرو یہیں ٹھہرے رہو، اگر یہ کسی طرف جائیں تو انکا پیچھا کرنا اچھا۔ میں انسپکٹر کو لے کر ابھی آتا ہوں دیسے یہ لوگ کس گاڑی سے روانہ ہونے والے ہیں یہاں سے ہلیں گے نہیں۔ میں ابھی آیا۔

[منظر ۶]

(کمرہ کا اندرونی حصہ ویٹنگ روم دو آدمی ایک کونے میں بنچ پر بیٹھے ہیں، نیچے ٹرنک رکھا ہے اچانک انسپکٹر، موتی، نجو، اور آشا داخل ہوتے ہیں)

ساتھی: (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) اوہ انسپکٹر صاحب۔

انسپکٹر: (دوسرے آدمی کو دیکھ کر) تو اب آپ مونچھوں والے ہو گئے ہیں۔ آپ سے تو میں اچھی طرح واقف ہوں۔ خبردار بھاگنے کی کوشش کی تو پستول چلا دوں گا۔ (پکارتا ہے) رحمن خاں (ایک کانسٹبل داخل ہوتا ہے) پکڑ لو اسے، ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ صندوق کی تلاشی تو لو۔ (انسپکٹر صندوق کھولتا ہے) قمیص پتلون یہ کالا کوٹ یہ رہا آپ کا پرس۔

آشا: جی۔ جی ہاں۔ (پرس لے لیتی ہے)

انسپکٹر: روپے دیکھیے۔ پورے ہیں؟

آشا: جی ہاں پورے تین سو ہیں۔

انسپکٹر: رحمان خاں ان دونوں کو تھانے لے چلو۔

آشا: انسپکٹر صاحب میں آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ آپ نے میرے کھوئے ہوئے روپے واپس دلوا دیے۔

انسپکٹر: آشا دیوی جو کچھ میں نے کیا ہے وہ تو میرا فرض ہے شکریہ کے حق دار تو یہ بچے ہیں موتی اور نجو۔ ساتویں درجے میں پڑھتے ہیں مگر وہ عقل پائی ہے کہ بڑے بڑے جاسوس پیچھے رہ جائیں اس لمبی مونچھوں والے چور کا تو موتی ہی نے کھوج نکالا ہے۔ میں تو صرف اطلاع ملنے پر چلا آیا تھا۔ موتی۔

موتی: جی انسپکٹر صاحب۔

انسپکٹر: سچ مچ تم بڑے بہادر اور ہوشیار لڑکے ہو، میں تمہیں سرکار کی طرف سے کچھ نہ کچھ انعام دلوانے کی کوشش کروں گا۔ اس آدمی کی تو پولس کو عرصے سے تلاش تھی۔

آشا: (نوٹ دیتے ہوئے) انسپکٹر صاحب یہ تیس ۳۰ روپے ہیں آپ موتی کو دے دیجیے میں اس لڑکے سے بہت خوش ہوئی ہوں۔

انسپکٹر: میں کیا دوں آشا دیوی موتی آپ کے سامنے ہے، آپ ہی دے دیجیے، یہ لو موتی، میں تمہاری آج کی ساری کارروائی سن کر بے دھڑک کہہ سکتا ہوں کہ تم آگے چل کر ملک کے ایک بڑے اچھے جاسوس بنو گے۔ لو روپے یہ تمہاری محنت اور ہوشیاری کا بڑا اچھا انعام ہے۔

[منظر ۵]

(وہی ہاسٹل کا ایک حصہ ہے جو منظر ۴ میں ہے)

نجو: بھئی موتی آج تو تم نے کمال کر دیا۔ اب تو تم پورے جاسوس بن گئے پر بھئی تمہیں یہ کیسے پتہ چل گیا کہ وہ دونوں آدمی اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں بیٹھے ہیں۔

موتی: (ہنستا ہے) تمہیں یاد ہوگا میں تم سے باتیں کرتے کرتے یکایک تمہیں چھوڑ کر بھاگا تھا۔

نجو: ہاں میں نے تمہیں روکنا بھی چاہا تھا مگر تم دوڑے چلے گئے۔

موتی: وقت ہی نہیں تھا نجو۔ میں نے تم سے باتیں کرتے کرتے دیکھا کہ وہ آدمی جو ہمارے ساتھ پولس اسٹیشن آیا تھا آگے پان والے کی دوکان سے پان خرید رہا ہے تو میں بھاگا اور

پاس گلی میں چھپ کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھوں وہ کہاں جاتا ہے۔

نجو: کیوں؟

موتی: جب اس آدمی نے تھانے میں ہمیں جھٹلایا تو مجھے اسی وقت یقین ہو گیا کہ یہ آدمی اس لمبی مونچھوں والے آدمی سے ملا ہوا ہے جبھی اس کے بچانے کو ایسی الٹی سیدھی باتیں بنا رہا تھا اور بہکانے کو ہمارے ساتھ پولس اسٹیشن آیا ہے۔

نجو: بھئی واہ سچ مچ میں اب سمجھا کہ وہ کیوں ہمیں جھوٹا بنا رہا تھا۔

موتی: جب وہ پان کی دوکان سے آگے بڑھا تو میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا، میں جانتا تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں اس مونچھوں والے آدمی سے ضرور ملیگا۔ الحمد ایسا ہی ہوا وہ مختلف راستوں سے چکر کاٹتا ہوا "رندابن ہوٹل" میں گھس گیا۔ میں باہر کھڑا اسکی راہ دیکھنے لگا۔ میں نے سوچا کبھی تو باہر نکلیں گے۔

نجو: پھر؟

موتی: کچھ ہی دیر بعد وہ باہر نکلا اور اس کے ساتھ ٹرنک لئے ہوئے ایک اور آدمی تھا جانتے ہو وہ کون تھا؟

نجو: (بے تابی سے) کون تھا؟

موتی: وہی بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی جو ڈاک خانے سے آشا دیوی کا پرس لے اڑا تھا، دونوں کچھ دیر آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے اور پھر اسٹیشن والی سڑک پر چلنے لگے، دونوں نے اسٹیشن پہنچ کر ٹکٹ خریدا اور ویٹنگ روم میں ٹرین کا انتظار کرنے لگے، میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں فوراً میں نے ٹکٹ بابو سے پوچھا کہ گاڑی کے آنے میں کتنی دیر ہے اس نے کہا پون گھنٹہ باقی ہے جبھی میں نے تمہیں فون کیا کہ جتنی جلدی ہو سکے تم ملی گرلز اسکول کی استانی جی آشا دیوی کو لے کر اسٹیشن پہنچ جاؤ۔

موتی: ہاں بس اس کے بعد کا حال تو تم جانتے ہو۔

نجو: واہ میرے ننھے جاسوس واہ۔ سچ مچ مجھے تم پر اور تمہاری دوستی پر ناز ہے۔

موتی: اب یہ بے کار باتیں چھوڑیئے نجی اللہ صاحب۔ آئیے اپنی کتابیں خریدیں۔

نجو: کتابیں؟ مگر دام کہاں ہیں؟

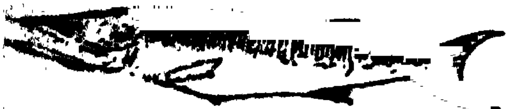
موتی: دام اور یہ روپے کس کام آئیں گے۔ آؤ آؤ ذرا جلدی کرو۔

(دونوں قہقہہ لگاتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

جناب گلیڈون میسی

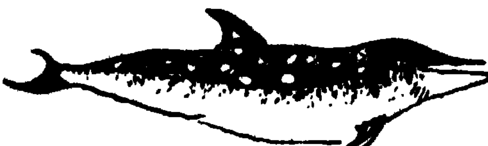
سمندر کی دنیا



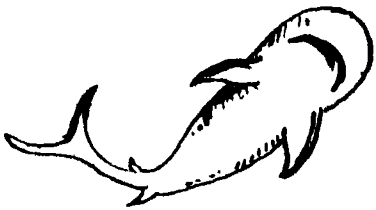
بڑا کاؤڈا مچھلی ۶۶ پونڈ ۵½ فٹ



وِھپ رے مچھلی ۴۱۰ پونڈ ۱۶ فٹ



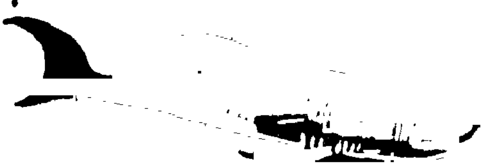
پورپوائز مچھلی ۲۰۰ پونڈ



شاول شارک مچھلی ۱۴۶۰ پونڈ ۱۵ فٹ



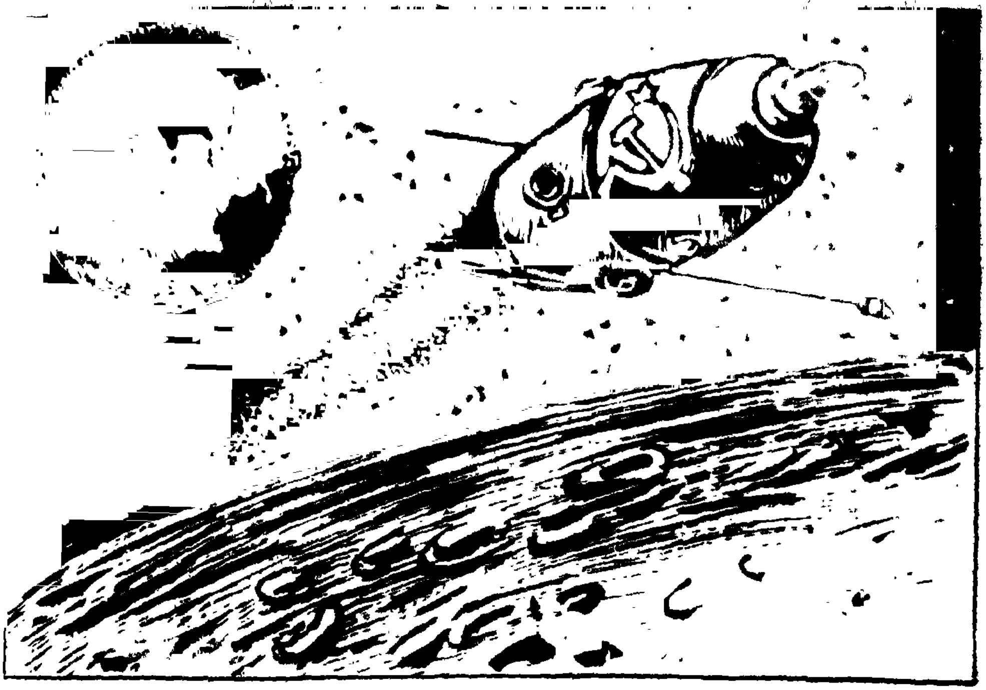
ہتھوڑا مچھلی ۱۳۵۰ پونڈ ۱۷½ فٹ



شیر شارک مچھلی ۱۷۶۰ پونڈ ۲۱ فٹ



آرا مچھلی ۵۷۰۰ پونڈ ۲۱ فٹ



جناب محمد امین

چاند پر اُترنا (قسط نمبر ۵) لونا ۱۰

۴ اپریل ۱۹۶۶ء کو روس نے سوویت اور دنیا کی کمیونسٹ پارٹی کی ۲۳ ویں بین الاقوامی کانفرنس کے موقع پر ڈیلی گیٹوں کے سامنے ایک اہم اعلان کیا۔ "لونا ۱۰ چاند کے ارگرد چکر کاٹ رہا ہے"۔ روس کے نمائندے شرف رشیدوف نے اسی وقت یہ بھی اعلان کیا کہ لونا ۱۰ کو ۲۳ ویں کانگریس کے نام وقف کر دیا گیا ہے ... ۶۰۰۰ ڈیلی گیٹوں نے کمیونزم کا بین الاقوامی ترانہ بھی سنا یہ لونا ۱۰ سے نشر کیا جا رہا تھا۔

اس طرح روس نے پہلی بار چاند کے ارد گرد چکر لگانے والا پہلا مصنوعی سیارہ اڑا کر خلا اور چاند

کی تحقیق کے سلسلے میں ایک نیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ یوں کہئے کہ اس معاملے میں بھی پہل روس نے کی۔

پہلی اپریل کو روس نے اسے اڑایا تھا اور ۳ اپریل کو ماسکو کے وقت کے مطابق رات میں ۹ بج کر ۴۴ منٹ پر چاند کے اردگرد اس کے مدار پر وہ چکر لگانے لگا تھا آج تک بھگ پونے تین مہینے ہو چکے ہیں اور وہ ہے کہ چاند کے مدار پر برابر چکر لگا رہا ہے چاند کی سطح سے اس کا کم سے کم فاصلہ ۳۵۰ کلومیٹر اور زیادہ سے زیادہ فاصلہ ۱۰۰۰ کلومیٹر ہے۔ چاند کے چاروں طرف ایک چکر یہ تقریباً ۳ گھنٹے میں پورا کرتا ہے۔ انسان کا بنایا ہوا یہ پہلا مصنوعی چاند ہے جو چاند کے اردگرد چکر کاٹ رہا ہے اور شاید مہینوں بلکہ برسوں کاٹتا رہے گا۔

راکٹوں اور خودکار اسٹیشنوں کے ذریعے روس نے چاند کے سلسلے میں تحقیق کا جو کام کیا ہے اسے چار مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) لونا۲ ستمبر ۵۹ میں اڑایا گیا تھا۔ یہ چاند کی سطح تک پہنچ گیا تھا اور وہاں اس نے روس کا قومی نشان پہنچایا تھا (۲) لونا ۳ نے جو اسی سال اکتوبر میں بھیجا گیا تھا چاند کے اس حصے کی تصویر کھینچی تھی جو ہمیں کبھی دکھائی نہیں دیتا۔ (۳) لونا ۹ جو جنوری ۱۹۶۶ء میں بھیجا گیا تھا آہستگی کے ساتھ چاند کی سطح پر اترا تھا (اس کا مفصل حال آپ مئی کے پیام تعلیم میں پڑھ چکے ہیں) اور وہاں سے اس نے چاند کی تصویریں زمین پر بھیجی تھیں۔ (۴) اور اب لونا ۱۰ چاند کا مصنوعی تابع سیارہ بن کر سائنسی معلومات بھیج رہا ہے۔

اس سلسلے میں انگلستان کی جاڈرل بینک آبزرویٹری مانچسٹر سے سر برنارڈ لوول نے جلدی جلدی جس طرح لونا ۱۰ کی خبروں کا اعلان کیا تھا وہ بہت ہی عجیب تھا۔ وہ چاہتے تو یہ تھے کہ خلائی پرواز اور چاند کی تحقیق میں ہم حصہ نہیں لے رہے ہیں نہ سہی۔ کم سے کم اس کے بارے میں سب سے پہلے نت نئی خبریں ہی دے کر اپنی بڑائی اور برتری جتا دیں۔

لیکن افسوس کہ جیسے لونا ۹ کے متعلق انھوں نے غلط اور مبالغہ آمیز خبریں دی تھیں اب کی بار بھی وہ کچھ کم غلط اور بے بنیاد نہیں تھیں۔

مثلاً ۲ اپریل ۱۹۶۶ء کو انھوں نے اعلان کیا کہ شاید لونا ۱۰ چاند پر اتر گیا ہے۔ انھوں نے مزید یہ فرمایا کہ اس سے جو سگنل شروع میں آ رہے تھے ان سے پتہ چلا کہ لونا ۱۰ چاند کے گرد چکر کاٹنے لگا ہے لیکن وہ اپنی رائے پر قائم نہیں رہے بلکہ رائے بدلتے ہوئے انھوں نے کہا کہ رات میں ۲ بج کر ۴۲ منٹ (ہندستانی وقت) پر

یہ شاید چاند پر اتر گیا ہے۔ ان کی رائے کے مطابق اس کے سگنل کچھ کمزور ہو گئے تھے۔ اس کے بعد رات میں ۲ بج کر ۱۷ منٹ پر (ہندستانی وقت) یک بیک تیز ہو گئے اور یہ تیز ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ چاند پر اتر گیا ہے۔

اس سے پہلے ماسکو کی خبروں کے مطابق وہاں کے سائنس داں انتظار کر رہے تھے کہ جب زمین سے اشارہ ہوگا تو ایک نیا راکٹ لونا ۱۰ کو اٹھا کر چاند کے ارد گرد اس کے مدار پر چکر لگانے کے لئے مجبور کر دے گا اور ہمارے (ہندستانی) وقت کے مطابق وہ صبح ۲ بجے چاند کے چاروں طرف چکر لگانے لگے گا۔

سر برنارڈ لوول کو یقین نہیں آیا اور انھوں نے سمجھا کہ روسی سائنس داں خواہ مخواہ کی گپ ہانک رہے ہیں حالانکہ بیسیوں بار یہ آزمایا جا چکا ہے کہ روسی سائنس داں جھوٹ نہیں بولتے اور وہ جس بات کا دعویٰ کرتے ہیں اسے صحیح ثابت کر کے دکھا دیتے ہیں۔ اس لئے اب کی بار بھی وہ جو کچھ کہہ رہے تھے اسے ٹھیک سمجھنا چاہتے تھے۔

لیکن اپنی اہمیت جتانے کے لئے خواہ مخواہ انھوں نے شبہ کا اظہار کیا اور کہا کہ ابھی ٹھیک سے معلوم نہیں کہ لونا ۱۰ کیا کارنامے انجام دے رہا ہے ان کے خیال کے مطابق رات میں ۱۱ بج کر ۱۰ منٹ (ہندستانی ٹائم) پر سگنل کی آواز کم ہونے لگی تھی اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ راکٹ کشش کی وجہ سے شاید چاند کی طرف کھنچ رہا ہے اس وقت چاند سے اس کا فاصلہ ۵۰۰۰ کلومیٹر (۳۱۰۶ میل) تھا۔ پھر رات میں ۱۱ بجکر ۱۹ منٹ پر سگنل کی آواز بالکل مدھم پڑ گئی اور لوول نے یہ سمجھا کہ وہ چاند کی سطح پر اتر گیا ہے حالانکہ ٹھیک اسی وقت ایک نیا راکٹ اسی بلندی سے داغا گیا تھا اور اس نے لونا ۱۰ کو چاند کے قریب پہنچا کر رات میں ۱۱ بج کر ۵۰ منٹ (ہندستانی وقت) پر اسے چاند کے ارد گرد چکر لگانے کے لئے آگے بڑھا دیا تھا۔

اسپتنک جس سے لونا ۱۰ اڑایا گیا تھا اس کی رفتار ایک سکنڈ میں ۱۱ کلومیٹر تھی لیکن جیسے ہی لونا ۱۰ راکٹ سے باہر نکلا اس کی رفتار گھٹا دی گئی اور آخر میں وہ صرف ۲۵ر۱ کلومیٹر فی سکنڈ رہ گئی تھی۔

لونا ۱۰ نے جو تصویریں اور معلومات بھیجی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ چاند کے چاروں طرف شہاب ثاقب یا میٹیارک کے اجزا زیادہ ہیں اتنے زیادہ کہ خلائی سفر کے دوران اتنے اور کہیں نہیں ملتے۔

سائنسی آلات جو اس میں فٹ ہیں ان کے مطالعے سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہاں قوت کشش زیادہ

ہے یعنی اتنی کہ خلائی پرواز کے دوران اتنی کشش اور کہیں نہیں محسوس کی جاتی اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ یہ قوتِ کشش چاند کی قوتِ کشش کی وجہ سے ہو۔

الکٹرانک میں اتار چڑھاؤ بھی بہت ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ الکٹرانک کے اتار چڑھاؤ زمین کی مقناطیسی قوت کی وجہ سے ہوں۔

۱۴ اپریل ۱۹۶۶ء کو ماسکو کی خبر کے مطابق پروفیسر کوالائی پشکوف نے تاس کے نمائندہ سے ملاقات کے دوران یہ امید ظاہر کی کہ لونا ۱۰ چاند کی مقناطیسی طاقت کے متعلق تفصیل سے معلومات بہم پہنچائے گا۔ پروفیسر پشکوف نے روس کے لونا ۲ کو جو کہ ستمبر ۱۹۵۹ء میں چاند پر اترا تھا یاد کرتے ہوئے کہا کہ اس لونا ۲ راکٹ کی مدد سے ہم کو معلوم ہو گیا تھا کہ چاند کی قوتِ کشش زمین کے مقابلے میں ایک ہزار سے بھی کم ہے۔ لیکن اب لونا ۱۰ جو اڑایا گیا ہے تو اس کے آلے ۱۵ گنا زیادہ حساس ہیں اس لئے ان سے اور بھی صحیح معلومات حاصل ہونگی ممکن ہے چاند میں قوتِ کشش بالکل نہ ہو جیسا کہ بہت سے تحقیق کرنے والے سائنسداں کہتے ہیں لیکن اس کے باوجود لونا ۱۰ کے آلوں سے مفید باتیں معلوم ہوں گی۔ ان سے زمین کی قوتِ کشش کا بھی پتہ لگ سکے گا۔

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ زمین کی قوتِ کشش کا اثر خلا میں دور دور تک محسوس ہوتا ہے اور ۱۵ ارب کلو میٹر یعنی پلوٹو کے مدار سے بھی آگے تک اس کی کشش کچھ نہ کچھ باقی رہتی ہے۔ لونا ۱۰ سے زمین کی قوتِ کشش کی شدت کا اندازہ ہو سکے گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ چاند، زمین اور سورج کے درمیان آپس میں قوتِ کشش کا کیا تعلق ہے۔ اور چاند اور زمین میں براہِ راست قوتِ کشش کا کیا تناسب ہے۔

۱۵ اپریل ۱۹۶۶ء کو نیویارک کی ایک خبر کے مطابق لونا ۱۰ نے چاند کی سطح پر گاما کی کرن کے اسپکٹرم کا پتہ لگایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاند کی سطح ٹھوس اور سخت ہے اور یہ سخت چٹان یا تہہ زمین کی چٹان سے ملتی جلتی ہے۔ اس کے متعلق سائنس دانوں میں ابھی تک اختلاف ہے لیکن امریکن سائنس داں سمجھتے ہیں کہ لونا ۱۰ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ چاند کی سطح زمین کی سطح سے ملتی جلتی ہے اور یہ بڑی اہم بات ہے تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔

۱۲ اپریل ۱۹۶۶ء کو امریکہ کی خبر کے مطابق، ہوسٹن امریکن خلائی میڈیکل ایسوسی ایشن کی سالانہ نشست کے موقع پر روسی خلائی دواؤں کے ماہر آرمن سائی سوزیان نے بتایا کہ روس نے ایک پروگرام بنایا ہے کہ اس پروگرام کے مطابق وہ یکے بعد دیگرے خلائی پرواز میں قدم آگے

بڑھائے گا۔ اب وہ ایک ایسا راکٹ اڑائے گا جس میں انسان بیٹھا ہوگا اور وہ چاند کے چاروں طرف گردش کرے گا۔ پھر ایک پلیٹ فارم سے خلا میں مزید راکٹ اڑائے جائیں گے۔ اور بے وزنی کی کیفیت کے مسئلہ کو بھی حل کیا جائے گا۔

سوویت اکیڈمی آف سائنس کے صدر پروفیسر کیلاش نے ماسکو میں کہا ہے کہ خلا میں بھاری جہاز کو اکٹھا کرنے کی تکنیک پر کام شروع ہو گیا ہے لیکن ابھی چاند پر کسی انسان کو بھیجنے سے پہلے جانوروں پر تجربے کئے جائیں گے۔

اس سلسلے میں یہ خبر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ سوویت مصنوعی سیارہ کوسموس ۱۱۰ نے اپنی خلائی پرواز مکمل کرلی ہے جس میں دو کتے بریزی اور بلیے کی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس خلائی جہاز نے ۳۲۲ چکر لگائے اور کامیابی کے ساتھ زمین پر اتر آیا ہے۔ یہ جہاز ۲۲ مارچ ۶۶ء کو مدار میں بھیجا گیا تھا اور متواتر ۲۲ دنوں تک زمین کے ارد گرد چکر لگاتا رہا۔ ۱۶ اپریل ۱۹۶۶ء کو یہ نیچے اتر آیا۔

امید ہے کہ اس کی مدد سے دو بنیادی مسائل حل کئے جائیں گے (۱) کیا انسان بے وزنی کی حالت کا عادی ہو سکتا ہے؟ (۲) اگر ہو سکتا ہے تو زمین کی کشش میں واپس آنے کے بعد کیا وہ اپنے پرانے ماحول کو جھیل سکتا ہے؟



۱۷ مئی ۶۶ء کی ماسکو کی خبر کے مطابق بریزی اور بلیے کی نام کے جو دو کتے ۲۲ دن تک مسلسل زمین کے چاروں طرف ایک خاص بلندی پر چکر کاٹتے رہے ان کے اعضاء سکڑتے رہے تھے، اُن کے جسم سے کلشیم غائب ہو گیا تھا اور جسم کی رگ رگ کھنچ رہی تھی زمین پر اترنے کے بعد انھیں چلنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ پیر لڑکھڑاتے تھے اور قدم ٹھیک سے زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ آٹھ سے دس دن تک متواتر انھیں مشق کرائی گئی، غذا دی گئی تب جا کر وہ پھر نارمل حالت میں آئے۔

لونا ۱۰ جو چاند کے ارد گرد چکر لگا رہا ہے وہ بہت کامیاب ہے۔ اس کے بعد خلائی جہاز جس میں کتے یا دوسرے جانور بیٹھے ہوں گے اڑائے جائیں گے



مجھے کن باتوں پر غصہ آتا ہے؟

(نوٹ) اس عنوان پر ابتدائی ششم جامعہ کے بچوں نے مضمون لکھے تھے۔ اُن سے دل چسپ اقتباسات نیچے دیے جاتے ہیں۔

غصہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس جذبے کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب کوئی بات مزاج یا طبیعت کے خلاف ہو جائے۔ لیکن بچوں کا غصہ پتھر کی لکیر نہیں ہوتا "جلد آجاتا ہے غصہ جلد من جاتا ہوں میں" کے مصداق ہوتا ہے۔

سید احمد علی

غصہ ہر انسان کو آتا ہے۔ لیکن اس کے آنے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ جب کوئی بات مرضی کے خلاف ہوتی ہے تو پھر آ ہی جاتا ہے۔ چہرہ لال ہو جاتا ہے۔ بدن تھر تھر کانپنے لگتا ہے اور غصہ اُتارنے میں کوئی رُکاوٹ ہوتی ہے تو بے کسی میں آنسو بھی نکل آتے ہیں۔ بہر حال غصہ انسان کی تمام خوبیوں کو برباد اور تباہ کر دیتا ہے۔ بار بار غصہ آنا انسان کو جسمانی حیثیت سے کمزو

آئندہ دو سالوں میں روس کا پروگرام حسب ذیل ہوگا۔ کئی خلائی جہاز جوڑ کر ساتھ ساتھ خلا میں اڑائے جائیں گے پھر ایسے خلائی جہاز اڑائے جائیں گے جو چاند کے مدار پر چکر لگانے کے بعد زمین پر واپس لائے جائیں گے پروفیسر کیلاش نے کہا ہے کہ لونا ۱۰ کو واپس لانے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ پھر جانوروں کو جہاز میں بٹھا کر چاند کے چاروں طرف ان کو اڑایا جائے گا اور ان کو پھر زمین پر واپس لایا جائے گا۔

۱۲ اپریل ۱۹۶۶ کو یوری گگارن کی پہلی خلائی پرواز کی پانچویں سالگرہ منائی گئی۔ اس موقع پر روس میں خصوصاً ماسکو میں بہت چرچا تھا کہ اب وہ دن دور نہیں جب انسان چاند پر اتر جائے گا۔

سوویت کاسموناٹ بار بار اس بات کی طرف اشارہ کرتے رہے ہیں کہ ان کی حکومت توقع سے بہت پہلے چاند پر انسان کو اتار دینے کی کوشش کریگی۔

آپ کو یاد ہوگا اکسی لیونوف نے ۱۹ مارچ ۶۵ء کو پہلی بار خلا میں تیراکی کی تھی ان کا کہنا ہے کہ روس موجودہ روسی پنج سالہ پلان کے دوران یقیناً انسان کو چاند پر اتارنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

گگارن نے کہا ہے کہ سوویت خلائی تحقیقات نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ انکو یقین ہے کہ ۱۹۶۸ء تک ایک روسی یقیناً چاند پر کامیابی سے اتر جائے گا۔

گیرمن تیتوف یعنی دوسرے روسی کاسموناٹ نے پیشن گوئی کی ہے کہ چاند جلد ہی خلا کی پرواز کے سلسلے میں ایک زبردست مرکز بن جائے گا اور پھر وہاں خلائی جہاز اکٹھا کئے جائیں گے اور نئے خلائی جہاز کائنات کی وسعت اور گہرائی کی چھان بین کرنے کے لئے اڑائے جائیں گے۔

ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ روسی سائنسدانوں کو اپنے اوپر کتنا اعتماد ہے اور وہ کتنے بڑے پیمانے پر اور کتنی تیزی کے ساتھ چاند پر پہلے پہنچ کر اس دوڑ میں بازی لے جانا چاہتے ہیں۔

امریکہ بھی خلا میں راکٹ اکٹھا کر کے آپس میں انکو جوڑنے اور ملا دینے کا پروگرام مکمل کر چکا ہے۔ روس بھی خلا میں راکٹ اکٹھا کرنے کا تجربہ کر رہا ہے لیکن چاند پر اتارنے کے سلسلے میں ان کو بہت بھاری وزن کا جہاز چاند پر اتارنا پڑے گا اور پھر اس کو واپس بھی لانا پڑے گا۔ وزن زیادہ ہونے کی وجہ سے واپس لانے اور زمین کے مدار پر کھینچنے کے لئے روس کو امریکہ کے مقابلے میں زیادہ جتن کرنا پڑیگا اس لئے کہ امریکہ کے جہاز اتنے وزنی نہیں ہیں۔

بہر حال پچھلے ۱۲ مہینوں میں چاند پر اترنے کے سلسلے میں روس نے جتنی کوششیں کی ہیں وہ قابل تعریف ہیں امریکہ اس معاملے میں ابھی پیچھے ہے۔ (باقی آئندہ)



مجھے کن باتوں پر غصہ آتا ہے؟

(نوٹ) اس عنوان پر ابتدائی ششم
جامعہ کے بچوں نے مضمون لکھے تھے۔ اُن سے
دل چسپ اقتباسات نیچے دیے جاتے ہیں۔

غصہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس جذبے کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب کوئی بات مزاج یا طبیعت
کے خلاف ہوجائے۔ لیکن بچوں کا غصہ پتھر کی لکیر نہیں ہوتا" جلد آجاتا ہے غصہ جلد من جاتا ہوں ہیں"
سید احمد علی
کے مصداق ہوتا ہے۔

غصہ ہر انسان کو آتا ہے۔ لیکن اس کے آنے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ جب کوئی بات مرضی کے خلاف ہوتی ہے تو پھر آہی جاتا ہے۔ چہرہ لال ہوجاتا ہے۔ بدن تھر تھر کانپنے لگتا ہے اور غصہ

اُتارنے میں کوئی رکاوٹ ہوتی ہے تو بے کسی میں آنسو بھی نکل آتے ہیں۔ بہر حال غصہ انسان کی تمام خوبیوں کو برباد اور تباہ کر دیتا ہے۔ بار بار غصہ آنا انسان کو جسمانی حیثیت سے کمز

آئندہ دو سالوں میں روس کا پروگرام حسب ذیل ہوگا۔ کئی خلائی جہاز جوڑ کر ساتھ ساتھ خلا میں اڑائے جائیں گے پھر ایسے خلائی جہاز اڑائے جائیں گے جو چاند کے مدار پر چکر لگانے کے بعد زمین پر واپس لائے جائیں گے پروفیسر کیلاش نے کہا ہے کہ لونا ۱۰ کو واپس لانے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ پھر جانوروں کو جہاز میں بٹھا کر چاند کے چاروں طرف ان کو اڑایا جائے گا اور ان کو پھر زمین پر واپس لایا جائے گا۔

۱۲ اپریل ۱۹۶۶ء کو یوری گگارن کی پہلی خلائی پرواز کی پانچویں سالگرہ منائی گئی۔ اس موقع پر روس میں خصوصاً ماسکو میں بہت چرچا تھا کہ اب وہ دن دور نہیں جب انسان چاند پر اتر جائے گا۔

سوویت کاسموناٹ بار بار اس بات کی طرف اشارہ کرتے رہے ہیں کہ ان کی حکومت توقع سے بہت پہلے چاند پر انسان کو اتار دینے کی کوشش کریگی۔

آپ کو یاد ہوگا الکسی لیونانف نے ۱۹ مارچ ۱۹۶۵ء کو پہلی بار خلا میں تیراکی کی تھی ان کا کہنا ہے کہ روس موجودہ روسی پنج سالہ پلان کے دوران یقیناً انسان کو چاند پر اتارنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

گگارن نے کہا ہے کہ سوویت خلائی تحقیقات نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ انکو یقین ہے کہ ۱۹۶۸ء تک ایک روسی یقیناً چاند پر کامیابی سے اتر جائے گا۔

گیرمن تیتوف یعنی دوسرے روسی کاسموناٹ نے پیشن گوئی کی ہے کہ چاند جلد ہی خلا کی پرواز کے سلسلے میں ایک زبردست مرکز بن جائے گا اور پھر وہاں خلائی جہاز اکٹھا کئے جائیں گے اور نئے خلائی جہاز کائنات کی وسعت اور گہرائی کی چھان بین کرنے کے لئے اڑائے جائیں گے۔

ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ روسی سائنسدانوں کو اپنے اوپر کتنا اعتماد ہے اور وہ کتنے بڑے پیمانے پر اور کتنی تیزی کے ساتھ چاند پر پہلے پہنچ کر اس دوڑ میں بازی لے جانا چاہتے ہیں۔

امریکہ بھی خلا میں راکٹ اکٹھا کرکے آپس میں انکو جوڑنے اور ملا دینے کا پروگرام مکمل کر چکا ہے۔ روس بھی خلا میں راکٹ اکٹھا کرنے کا تجربہ کر رہا ہے لیکن چاند پر اتارنے کے سلسلے میں ان کو بہت بھاری وزن کا جہاز چاند پر اتارنا پڑے گا اور پھر اس کو واپس بھی لانا پڑے گا۔ وزن زیادہ ہونے کی وجہ سے واپس لانے اور زمین کے مدار پر کھینچنے کے لئے روس کو امریکہ کے مقابلے میں زیادہ جتن کرنا پڑیگا اس لئے کہ امریکہ کے جہاز اتنے وزنی نہیں ہیں۔

بہرحال پچھلے ۱۲ مہینوں میں چاند پر اترنے کے سلسلے میں روس نے جتنی کوششیں کی ہیں وہ قابل تعریف ہیں امریکہ اس معاملے میں ابھی پیچھے ہے۔ (باقی آئندہ)

جناب محمد اکرام ایم اے۔ ایم۔ ایس سی

سائنس کی دنیا

آپ کی دل چسپی کے لیے آج ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے —— آج کی دنیا سائنس کی ہے۔ آپ کے چاروں طرف۔ گھر میں، اسکول میں، بازار میں، غرض ہر جگہ ایسا سامان ہے جس میں سائنس کی معلومات ہیں۔ سڑک پر، باغ میں تو وہاں بھی سائنس کے سلسلے کی کوئی نہ کوئی بات موجود ہے۔ آج سائنس سے چھٹکارا کسی طرح ممکن نہیں۔ ہر کتاب، رسالے میں اور اخبار میں سائنس کی باتیں ضرور ہوتی ہیں۔

جب میں چھوٹا تھا تو سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی جتنی ترقی آج کی ہے۔ نہ گھروں میں آج کا جیسا ماڈرن یا نئے طرز کا سامان تھا۔ بازار میں بھی بس گنی چنی بجلی کی چیزیں تھیں۔ اخبار میں بھی کبھی کبھی کوئی سائنس کی خبر آتی تھی ورنہ لڑائی، جھگڑے، چوری ڈکیتی کی خبریں عام ہوا کرتی تھیں۔ اُس وقت بھی کبھی کبھی ذہن میں ایسا سوال آتا تھا جس کا تعلق سائنس سے ہوتا تھا۔ گھر میں بتانے والا کوئی نہیں تھا، کتابیں تلاش کرنا اور اُن کا سمجھنا مشکل کام تھا، اسکول میں اُستاد سے معلوم کرنے کی ہمت کبھی ہوتی تھی کبھی نہیں۔ دوستوں کا حال اپنے سے بہتر نہیں تھا۔ زیادہ تر سوال دل کے دل ہی میں رہ جاتے تھے۔

جانتا ہوں آپ کا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں۔ بلکہ حالات اتنے بدلے ہوئے ہیں کہ اب تو روز ایک نہ ایک نیا سوال دل میں اُٹھتا ہے۔ اردو میں ایسی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جن میں ان سوالوں کے جواب مل سکیں۔

اس لیے یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔

آپ اپنے سوال ہمیں بھیجیے۔ ہم آپ کا سوال اور نام چھاپیں گے۔ پیامیوں کو اُن کا جواب

ترقی کرے گا۔

اور وہ اب سچ مچ محنت مزدوری کرنے لگا۔ کبھی قلی کا کام کرتا کبھی اینٹ گارے کا کام کرتا۔ اس طرح جو مزدوری ملتی اس سے اپنا پیٹ بھرتا۔ ایسے کاموں کی عادت نہیں تھی۔ بہت تکلیف ہوتی، پر اس نے ہمت نہ ہاری۔

غرض اس طرح کچھ پریشانی دور ہوئی۔ اور کچھ پیسے جمع ہو گئے تو اُسے ایک بات اور سوجھی۔ شہر کی کچہری کے احاطے میں قلم دوات لے کر بیٹھ جاتا۔ یہاں اَن پڑھ لوگوں کے خط لکھ دیتا۔ ان کی درخواستیں لکھ دیتا۔ منی آرڈر فارم بھر دیتا۔ اس طرح خاصی آمدنی ہونے لگی۔

ایک دن اتّفاق سے شہر کے ایک سوداگر کا اِدھر گزر ہوا۔ ایک نو عمر لڑکے کو اس طرح کام کرتے دیکھا تو ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس لڑکے کے کام کرنے کے طریقے کو دیکھا۔ کام کرانے والوں سے اس کے برتاؤ کو دیکھا۔ اس کی خوش اخلاقی اور سوجھ بوجھ کا اس پر بہت اثر ہوا۔

اشوک کو کام سے ذرا فرصت ملی تو قریب آ کر اس کا نام پوچھا۔ پھر اس کا حال پوچھا۔ سب کچھ معلوم ہو گیا تو بولا: "مجھے اپنی دُکان میں ایک کلرک کی ضرورت ہے۔ تنخواہ اچھی ملے گی۔ کام اچھا رہا تو ترقی بھی جلد جلد ہو گی۔ بونس بھی ملے گا۔"

اشوک راضی ہو گیا۔ اب وہ پابندی سے دُکان پر بیٹھنے لگا۔ اس نے اپنی محنت، ایمان داری اور خوش اخلاقی سے دُکاندار کا اور گاہکوں کا دل موہ لیا۔ ہوتے ہوتے وہ دُکان کا منیجر ہو گیا۔ عزّت اور آرام سے گزرنے لگی۔ پر اشوک اپنے پچھلے دنوں کو نہ بھولا۔ وہ اکثر دل ہی دل میں کہا کرتا آدمی ہمّت، مستقل مزاجی اور سوجھ بوجھ سے کام لے تو برا وقت کبھی نہ کبھی ضرور اس کی سُنتے ہیں۔

شبیر اقبال مادھوپوری

ایک صاحب بہت ڈینگیں مارتے تھے میں شیر کا شکار خوب کھیلتا ہوں۔ ایک دن لوگ جنگل میں لے گئے اور پیڑ پر مچان بنا کر بٹھا دیا۔ پاس ہی ایک پیڑ سے بھینسا بھی باندھ دیا۔ شیر آیا اور بھینسے کو کھا کر چلا گیا۔ پوچھا گیا۔ کیوں صاحب آپ نے بندوق کیوں نہیں چلائی۔ شکاری صاحب اپنے حواس درست کر کے بولے۔ کارتوس تو گھر پر ہی رہ گئے تھے۔

محمد اسمٰعیل نگری جامعہ نگر

محمد اکرام ایم اے ۔ ایم ۔ ایس سی

سائنس کی دنیا

آپ کی دل چسپی کے لیے آج ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے —— آج کی دنیا سائنس کی ہے ۔ آپ کے چاروں طرف ۔ گھر میں، اسکول میں، بازار میں، غرض ہر جگہ ایسا سامان ہے جس میں سائنس کی معلومات ہیں ۔ سڑک پر، باغ میں تو وہاں بھی سائنس کے سلسلے کی کوئی نہ کوئی بات موجود ہے ۔ آج سائنس سے چھٹکارا کسی طرح ممکن نہیں ۔ ہر کتاب، رسالے میں اور اخبار میں سائنس کی باتیں ضرور ہوتی ہیں ۔

جب میں چھوٹا تھا تو سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی جتنی ترقی آج کی ہے ۔ نہ گھروں میں آج کا جیسا ماڈرن یا نئے طرز کا سامان تھا ۔ بازار میں بھی بس گنی چنی بجلی کی چیزیں تھیں ۔ اخبار میں بھی کبھی کبھی کوئی سائنس کی خبر آتی تھی ورنہ لڑائی جھگڑے، چوری ڈکیتی کی خبریں عام ہوا کرتی تھیں ۔ اس وقت بھی کبھی کبھی ذہن میں ایسا سوال آتا تھا جس کا تعلق سائنس سے ہوتا تھا ۔ گھر میں بتانے والا کوئی نہیں تھا، کتابیں تلاش کرنا اور ان کا سمجھنا مشکل کام تھا، اسکول میں استاد سے معلوم کرنے کی ہمت کبھی ہوتی تھی کبھی نہیں ۔ دوستوں کا حال اپنے سے بہتر نہیں تھا ۔ زیادہ تر سوال دل کے دل ہی میں رہ جاتے تھے ۔

جانتا ہوں آپ کا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں ۔ بلکہ حالات اتنے بدلے ہوئے ہیں کہ اب تو روز ایک نہ ایک نیا سوال دل میں اٹھتا ہے ۔ اردو میں ایسی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ جن میں ان سوالوں کے جواب مل سکیں ۔ اس لیے یہ سلسلہ شروع کیا جارہا ہے ۔

آپ اپنے سوال ہمیں بھیجیے ۔ ہم آپ کا سوال اور نام چھاپیں گے ۔ پیامیوں کو ان کا جواب

ترقی کرے گا۔

اور وہ اب سچ مچ محنت مزدوری کرنے لگا۔ کبھی قلی کا کام کرتا کبھی اینٹ گارے کا کام کرتا۔ اس طرح جو مزدوری ملتی اس سے اپنا پیٹ بھرتا۔ ایسے کاموں کی عادت نہیں تھی۔ بہت تکلیف ہوتی، پر اس نے ہمت نہ ہاری۔

غرض اس طرح کچھ پریشانی دور ہوئی۔ اور کچھ پیسے جمع ہو گئے تو اُسے ایک بات اور سوجھی۔ شہر کی کچہری کے احاطے میں قلم دوات لے کر بیٹھ جاتا۔ یہاں اَن پڑھ لوگوں کے خط لکھ دیتا۔ ان کی درخواستیں لکھ دیتا۔ منی آرڈر فارم بھر دیتا۔ اس طرح خاصی آمدنی ہونے لگی۔

ایک دن اتفاق سے شہر کے ایک سوداگر کا اِدھر گزر ہوا۔ ایک نو عمر لڑکے کو اس طرح کام کرتے دیکھا تو ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس لڑکے کے کام کرنے کے طریقے کو دیکھا۔ کام کرانے والوں سے اس کے برتاؤ کو دیکھا۔ اس کی خوش اخلاقی اور سوجھ بوجھ کا اس پر بہت اثر ہوا۔

اشوک کو کام سے ذرا فرصت ملی تو قریب آ کر اس کا نام پوچھا۔ پھر اس کا حال پوچھا۔ سب کچھ معلوم ہو گیا تو بولا: "مجھے اپنی دُکان میں ایک کلرک کی ضرورت ہے۔ تنخواہ اچھی ملے گی۔ کام اچھا رہا تو ترقی بھی جلد جلد ہو گی۔ بونس بھی ملے گا۔"

اشوک راضی ہو گیا۔ اب وہ پابندی سے دُکان پر بیٹھنے لگا۔ اس نے اپنی محنت، ایمان داری اور خوش اخلاقی سے دُکاندار کا اور گاہکوں کا دل موہ لیا۔ ہوتے ہوتے وہ دُکان کا منیجر ہو گیا۔ عزت اور آرام سے گزرنے لگی۔ پر اشوک اپنے پچھلے دنوں کو نہ بھولا۔ وہ اکثر دل ہی دل میں کہا کرتا آدمی ہمت، مستقل مزاجی اور سوجھ بوجھ سے کام لے تو پرماتما کبھی نہ کبھی ضرور اس کی سُنتے ہیں۔

شبیر اقبال مادھوپوری

ایک صاحب بہت ڈینگیں مارتے تھے میں شیر کا شکار خوب کھیلتا ہوں۔ ایک دن لوگ جنگل میں لے گئے اور پیڑ پر مچان بنا کر بٹھا دیا۔ پاس ہی ایک پیڑ سے بھینسا بھی باندھ دیا۔ شیر آیا اور بھینسے کو کھا کر چلا گیا۔ پوچھا گیا کیوں آپ نے بندوق کیوں نہیں چلائی؟ شکاری صاحب حواس درست کر کے بولے۔ کارتوس تو گھر پر ہی رہ گئے تھے۔

محمد اسمٰعیل لکری جامعہ نگر

اِدھر اُدھر سے

امریکہ کا سرویئر بھی چاند پر!

لیجیے جناب روس کے بعد امریکہ نے بھی پالا مار لیا۔ اس کا سرویئر نامی راکٹ پچھلے مہینے یعنی ۲ر جون ۶۶ء کو ۱۱۔ بج کر ۱۷ منٹ پر بڑے آرام و اطمینان سے چاند پر اُتر گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ آدھے گھنٹے کے اندر ہی اندر اس نے ٹیلی ویژن پر تصویریں بھی بھیجنی شروع کر دیں کھٹا کھٹ ۱۴۴ فوٹو بھیج دیے۔ پھر امریکی سائنس دانوں نے اسے خاموشی کا حکم دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ پھر بھی بارہ روز تک تھوڑے تھوڑے وقفے سے کچھ اور فوٹو بھیجے۔

یہ سرویئر چاند کے جس حصے پر اُترا ہے وہاں اُس وقت دن تھا۔ پر بارہ دن یعنی ۱۴ دن کے بعد وہاں رات شروع ہو گئی ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ چاند پر دن ہمارے چودہ دن کے برابر اور رات بھی اتنی ہی لمبی ہوتی ہے۔

سرویئر کی بھیجی ہوئی تصویریں لونا ۹ کی تصویروں سے ملتی جلتی ہیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ چاند کی سطح ریت کی نہیں بلکہ سخت اور ٹھوس چٹان کی بنی ہے۔ وہاں ہماری راکٹ بھی آسانی سے اُتر کر ٹک سکتا ہے۔

تازہ خبر یہ ہے کہ سرویئر اب تک ۱۰۳۳۸

(دس ہزار تین سو اڑتیس) تصویریں بھیج چکا ہے۔

جیمنی ۹ کی خلائی پرواز

پہلی جون ۶۶ء کو جیمنی ۹ نام کا ایک راکٹ امریکہ نے خلا میں اُڑایا۔ اس میں دو امریکی خلا باز (۱) ٹامس اسٹفورڈ اور یوجن سرنن بیٹھے تھے۔ شروع میں دونوں خلا باز ایک مصنوعی چاند کا پیچھا کرتے رہے۔ امریکہ نے یہ چاند پہلے سے اُڑایا تھا۔

اس مصنوعی چاند سے جیمنی ۹ کا فاصلہ شروع میں ۶۴۰ میل تھا۔ لیکن ہوتے ہوتے صرف ۳۰ میل یا ۴۸ کلو میٹر رہ گیا۔ یہ بھی ایک حیرت انگیز کارنامہ تھا۔

۵ جون کو خلا باز یوجن سرنن جیمنی ۹ سے باہر نکلے اور ۲ گھنٹے تک ہوا میں تیرتے رہے۔ بڑے آرام سے بہت اطمینان سے۔ البتہ جیمنی ۹ اور ان کے درمیان ۱۲۵ فٹ لمبی نائلون کی ایک رسّی تھی۔ یوجن سرنن اس رسّی سے بندھے ہوئے تھے۔ خلا میں تیرتے وقت انھوں نے نیچے نظر کی۔ زمین صاف دکھائی دے رہی تھی اور مناظر بہت خوب صورت تھے۔

اپنا کام مکمل کرکے یہ دونوں خلا باز رات کے وقت ۱۰ بج کر ۴۰ منٹ پر بحر اکاہل میں نیچے اُتر آئے۔ امریکی سائنس والوں کا یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ یوجن سرنن نے دو گھنٹے خلا میں تیر کر ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔

(تفصیل اگلے پرچے میں پڑھیے گا)

نہرو بال بھون کا جال

سارے ہندوستان میں

ہمارے چاچا نہرو کو آپ نونہالوں سے کتنی محبّت تھی، کتنا لگاؤ تھا اِس کا اندازہ بہت سے بچّوں کو ہوگا۔ بچے چاہے کسی دیس کے ہوں انھیں پیارے تھے۔ وہ دیس دیس کا سفر کرتے تھے، ہر دیس کے بچّوں سے ملتے جلتے تھے۔ ان کے مشغلوں اور تفریحی سنٹروں کو گہری نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ سنٹر انھیں بہت اچھے لگتے تھے۔ ان کے دل میں بے اختیار امنگ پیدا ہوتی تھی کہ کیوں نہ اپنے دیس میں ایسے سنٹر کھولے جائیں۔

آخر ان کی خواہش کے مطابق نمونے کا

ایک تفریحی سنٹر دلّی میں بال بھون کے نام سے قائم کیا گیا۔ اور شریمتی اندرا گاندھی نے اُسے نمونے کا بال بھون بنانے کی پوری کوشش کی۔ اور دس سال کی مُدّت میں اس بھون نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ دلّی آنے والے عام طور پر اسے ضرور دیکھتے ہیں۔

اس بال بھون میں تفریحی اور تعلیمی دلچسپیوں کا بہت سا سامان ہے۔ بچّوں کا ایک بہت اچھا میوزیم ہے۔ ایک کتب خانہ ہے۔ سائنس کے مشغلوں کا خاص طور پر انتظام ہے۔ پھر ناچ گانے اور ڈرامے کی تربیت دی جاتی ہے۔ کھیل کود کی چیزوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ طرح طرح کے کھیلوں کا انتظام ہے۔

اور ہاں بھئی ایک ننھی مُنّی سی ریل گاڑی بھی ہے۔ خود بچّے اسے چلاتے ہیں۔ وہی ڈرائیور وہی گارڈ وہی ٹکٹ چیکر۔

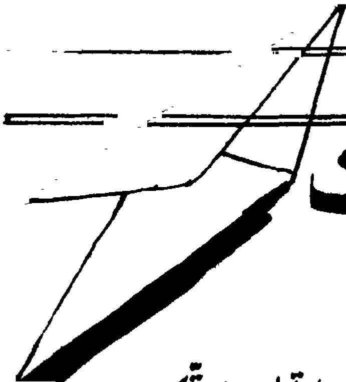
اِس بال بھون کی سرگرمیوں نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے۔ اسی لیے طے کیا گیا ہے کہ اس نمونے کے بال بھون پورے دیس میں جگہ جگہ کھولے جائیں۔ اس سلسلے میں بال بھون چلانے والوں نے ایک اسکیم تیار کی ہے۔

پچھلے مہینے ۸ر جون سے ۱۱ر جون ۱۹۶۶ء تک اسی اسکیم کے بارے میں مشورہ اور تبادلۂ خیال کرنے کے لیے ایک سمینار ہوا تھا۔ اس سمینار میں بارہ ریاستوں کے اور بچّوں کے مختلف تعلیمی اداروں کے نمائندوں نے آپس کے مشورے سے ایک بہت اچھی اسکیم تیار کی ہے اس اسکیم کے ماتحت بہت جلد دیس کے بڑے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں بال بھون کھلیں گے۔ اگر آپ کے شہر میں کھلیں تو کیا کہنا۔ ضرور اس کے ممبر بن جائیے گا۔ اور کبھی دہلی آنے کا موقع ملے تو یہاں کا بال بھون ضرور دیکھیے گا۔

(محمد اسمٰعیل خاں)

ہر سال گرمیوں میں ہمالیہ کی چوٹیاں سر کرنے کا جیسے موسم آجاتا ہے۔ اس سال مرد تو مرد عورتوں نے بھی ایک چوٹی سر کر لی۔ پر ایک اس سے بھی زیادہ دلچسپ خبر! اسکول کے نونہالوں نے گڑھوال کے علاقے میں ۲۱۷۶۹ فٹ کی ایک چوٹی سر کر لی۔ کہیے، ہے نا اہم خبر! اس مہم میں دہرہ دون کے اسکول کے دو لڑکے، ایک استاد، ایک فوجی افسر تھے۔ یہ واقعہ ۶ر اور ۷ر جون ۱۹۶۶ء کا ہے۔

آدھی مُلاقات



محترم ایڈیٹر صاحب، پیامِ تعلیم

جون کا پیامِ تعلیم ملا۔ پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ پہلے کی بہ نسبت پیامِ تعلیم اب بہت خوب صورت نکل رہا ہے۔ یہی حال رہا تو وہ دن دُور نہیں جب پیامِ تعلیم ہندوستان کا بہترین رسالہ کہلائے گا۔ واقعی آپ لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں جو اتنی محنت اور لگن سے پرچے کو خوب صورت سے خوب صورت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

واحد علی خاں، بمبئی ۵۴

محترمی، سلام و نیاز

پیامِ تعلیم کا جون کا شمارہ دیکھا۔ کافی پسند آیا۔ سرورق کی تصویر دیکھ کر طبیعت پھڑک اُٹھی۔ نیّر صاحب کی نظم "چھٹی کے دن" بہت پسند آئی۔..

خدا کرے پیامِ تعلیم اور ترقی کرے۔

عبد الصمد، کلکتہ ۱۳

مکرمی، تسلیمات

کل اپنے ایک ساتھی کے ہاں پیامِ تعلیم دیکھا اور اس کا معیار دیکھ کر بے ساختہ منھ سے سبحان اللہ نکل گیا۔ واقعی پرچہ بہت خوب صورت ہے۔

نیاز آگیں

احسان الحق صوفی، سہسرام

محترم ایڈیٹر صاحب، آداب

گزشتہ دنوں آپ کا اور میرا محبوب رسالہ نظر سے گزرا۔ جسے دیکھ کر ہی تعلیم کا جذبہ اُبھرتا

ہے اور تعلیم کی اُمنگیں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔
پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ امید ہے کہ خداوند عالم
اس محبوب رسالے کو اور بھی سرفراز کرے۔

عبدالکریم محمود　　بمبئی

جناب ایڈیٹر صاحب، سلام عرض کرتا ہوں
اپریل کا رسالہ ملا۔ ٹائیٹل دیکھ کر یقین نہیں
آیا کہ یہ ہمارا رسالہ پیامِ تعلیم ہے۔ اور جب رسالہ
کھول کر دیکھا تو مُنہ سے خود بخود تعریفی کلمات
نکل گئے۔ رسالے کو جس ترتیب سے مزیّن
کیا گیا ہے وہ آپ کی خوش سلیقگی کا نتیجہ ہے۔
واقعی آپ تعریف و تحسین کے مستحق ہیں۔

جہانگیر احمد شاہین۔ بریلی

محترم المقام ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم
سال گرہ کا تحفہ موصول ہوا شکریہ۔ تحفہ
بے حد پسند آیا۔ سر آنکھوں سے لگایا۔ میری
سہیلیوں نے بھی خوب پسند کرنے کے ساتھ آپ کا
شکریہ ادا کیا۔

کلثوم بانو بساوی ڈنگی ہار
(مغربی دیناج پور)

جناب عالی، تسلیم
پیامِ تعلیم کا جون کا شمارہ پڑھ کر لوگوں نے
اس کی بہت تعریف کی۔ خصوصاً بچوّں نے تو اسے
بہت پڑھا۔ بار بار پڑھا اور بہت دل چسپی سے
اس کا مطالعہ کیا۔ میں چوں کہ بچوّں کی نفسیات
سے واقف نہ تھا۔ بچوّں کی اس دل چسپی کو سمجھ نہ سکا۔
بہر حال بچوّں کی، بڑوں کی سب کی دل چسپی کا
سامان اس کے اندر موجود ہے اور ہر لحاظ سے
بچوّں کا بلند ترین معیاری رسالہ کہلانے کا
مستحق ہے۔

انچارج نسیمی لائبریری، دہلی ۶

محترمی ایڈیٹر صاحب
ارے واہ جناب آپ نے بھی
کمال کر دیا۔ ایک دم سے اس قیمتی رسالے میں
اس قدر تبدیلی دیکھ کر تو ہوش ہی نہ رہے۔ پھر
جون کے رسالے کے ٹائٹل پر تو جیسے ہی نظر پڑی
آنکھیں چوندھیا گئیں۔ اندر کے مضامین کو دیکھ کر
بے اختیار میرے مُنہ سے نکل پڑا "ماشاءاللہ"
لکھائی چھپائی کا تو جواب ہی نہیں۔

شاہد افسر سہسرامی، کلکتہ ۱

کل اپنے ایک دوست کے توسط سے
پیامِ تعلیم کا تازہ پرچہ نظر نواز ہوا۔ شروع سے
آخر تک مطالعہ کیا۔ یوں تو سبھوں کی چیزیں اچھی
ہیں۔ لیکن خصوصی طور سے صوبۂ بہار کے مشہور
فن کار حضرت برقؔ بہاری کی نظم "علم کی شان"
مولانا مقبول احمد صاحب سیوہاروی کا مضمون
"ابنِ بطوطہ" وقار خلیل صاحب کی تخلیق "گول گندہ"
جناب نیّر صاحب کی نظم "چھٹی کے دن" پسند آئی۔

ایم صادق گیاوی

مکرمی، آداب و تسلیم
پرسوں بعد انتظار پیامِ تعلیم کا تازہ شمارہ
نظر نواز ہوا۔ ہر ایک مضمون اور نظم کا بغور مطالعہ
کیا۔ یہ شمارہ پچھلے تمام شماروں سے زیادہ پسند
آیا۔ "علم کی شان" "قربان میاں" "صبح کے
نظارے" "مِٹّو بلائی" "شبلی کا شوقِ مطالعہ"
وغیرہ بہت ہی اعلیٰ تخلیقات آپ نے پیش
کی ہیں......

محمد شوکت علی، بنارس



پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

بچّوں کی معلوماتی کتابیں

آدمی کی کہانی	مشتاق احمد اعظمی	1/25
انوکھا عجائب خانہ، اوّل	محمد حسین حسّان	-/50
"	"	-/40
"	"	-/40
"	"	-/50
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	-/50
بجلی اور مقناطیس کے کھیل		-/75
بڑدادا کی کہانی	پروفیسر عبدالغفور	-/56
تاریخ ہند کی کہانیاں، اوّل	خجستہ سلطانہ	-/80
" دوم	ضیاء الرحمٰن	-/80
" سوم	مشتاق احمد اعظمی	-/80
" چہارم	"	-/87
چٹانوں کی کہانی	محمد امین ایم۔ اے	1/75
دادا نہرو	منوّر لکھنوی	1/50
دُنیا کے بسنے والے	بشیر حسین زیدی	-/75
دُنیا کے بچّے	محمد حسین حسّان	-/65

قدرت کے کرشمے		-/62
سونے کی چڑیا	محمد عبدالغفور	1/=
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	1/12
سماجی زندگی اوّل	احمد الیاس پٹیل و غلام ابرار	-/56
" دوم	" "	-/80
" سوم	" "	-/81
" چہارم	" "	-/81
گاندھی بابا کی کہانی	بیگم قدسیہ زیدی	3/=
مُفید معلومات اوّل		-/50
" دوم		-/75
" سوم		1/25
" چہارم		1/50
معلومات کی پانچویں		1/50
مقناطیس کی کہانی		-/44
میر تقی میر	محمد حسین حسّان	1/=
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	1/50

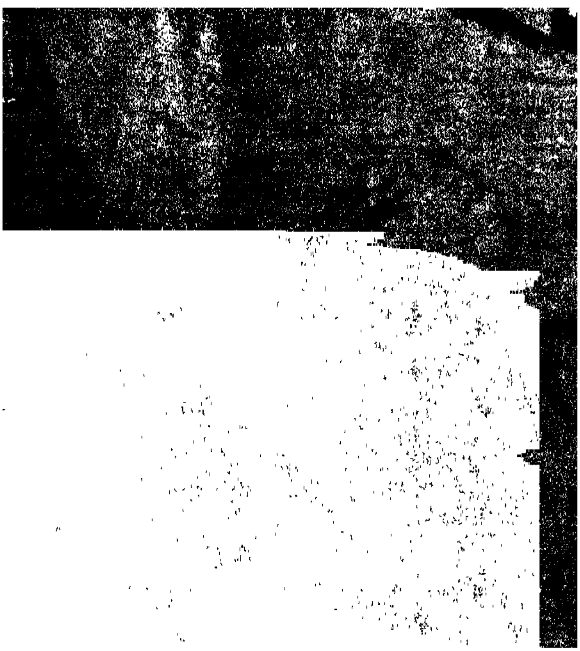
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

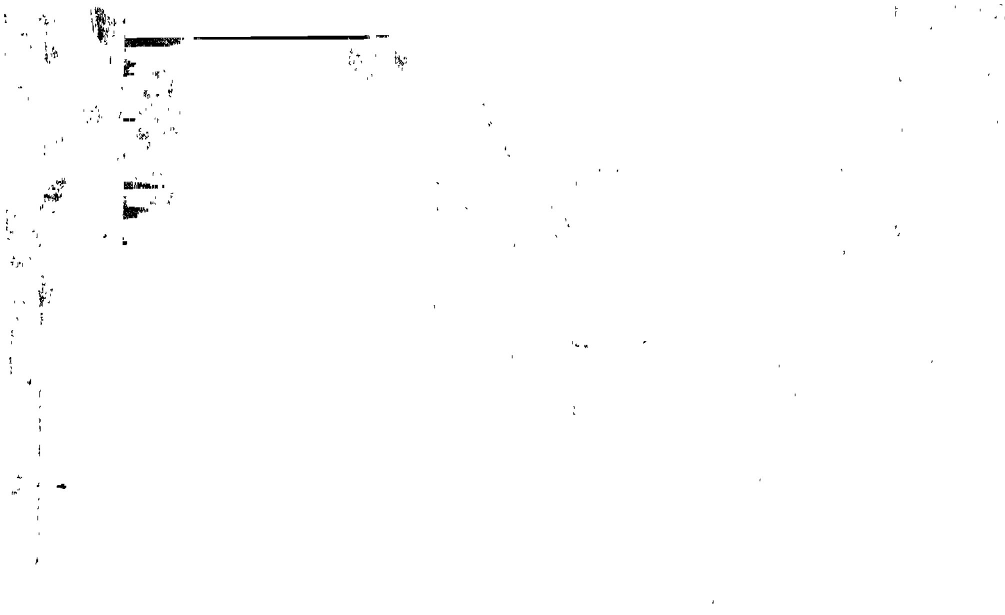
شکیل الرّحمٰن عمر ۲½ سال   فوٹو: فضل الرّحمٰن

July, 1966. Regd. No. I

Payam -i- Taleem

New Delhi-25.

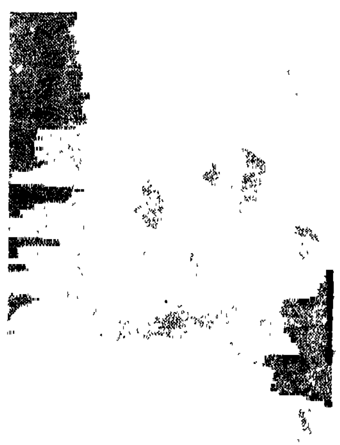




دو بہنیں — مہ جبیں عمر ۳ سال اور ارجمند بانو عمر ۲ سال
فوٹو: ایچ ایچ خان



سیّد زاہد علی عمر ۱۰ سال (بمبئی)

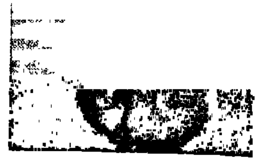


سُجاتا اگمکاری عمر ۳ سال (جامعہ نگر)

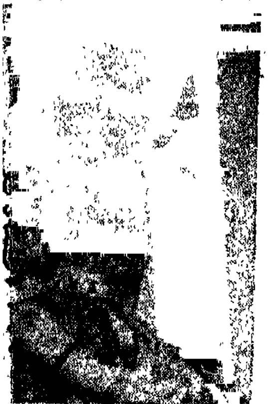


ریاض عثمان عمر ۵ سال (علی گ

ننھے پیامی



فاطمہ عمر ۴ سال (بمبئی)



میر زہرہ بانو عمر ۲ سال (بمبئی)



رونق عمر ۴ سال ۔ روزی عمر ۲ سال

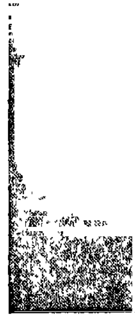


معزہ عمر ۴ سال (بمبئی)



فوزیہ عمر ۴ سال (بمبئی)

ننھے پیامی

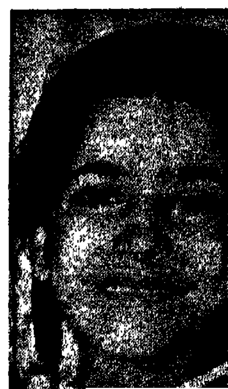


اندرا عمر ۴ سال (بمبئی)

ارشد الہدیٰ عمر ۷ سال (کشن گنج)



کول رخسانہ امین (جرمنی)



عذرا عمر ۵ سال (بمبئی)

تفضل جلیل عمر ۱½ سال (دھولیہ)

ریاست جموں و کشمیر میں تمام تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

پیام تعلیم
دہلی



جلد ۳ — اگست ۱۹۶۶ء — شمارہ ۸

ایڈیٹر: محمد حسین حسّان ندوی

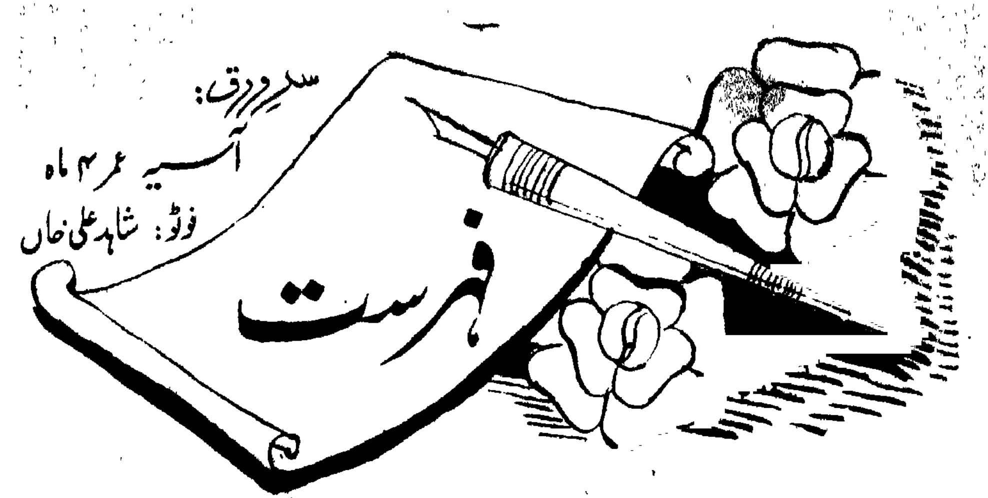
آرٹسٹ: گلیڈون میسی

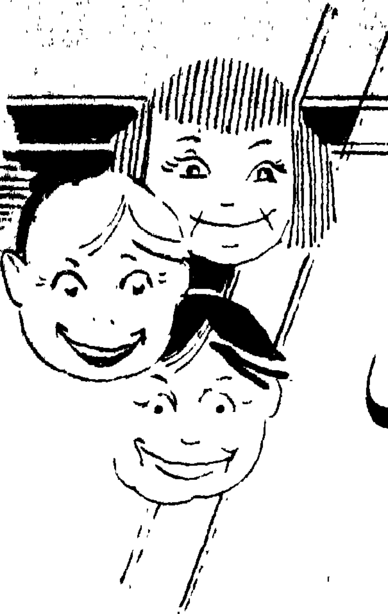
سالانہ چندہ: — پانچ روپے

فی پرچہ: — پچاس پیسے

صدر دفتر:-
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

بمبئی آفس:-
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، جے جے ہسپتال بمبئی


فہرست
سرورق:
آسیہ عمر ۴ ماہ
فوٹو: شاہد علی خاں



بچوں سے باتیں

پیامِ تعلیم کے کسی پرچے میں ہم نے اپنے پیامیوں سے، ان کے بزرگوں سے اور دوسرے قدردانوں سے پیامِ تعلیم کی اشاعت بڑھانے کی درخواست کی تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ ہماری یہ آواز بے اثر نہ رہی۔ بہت سے پیامیوں نے اور بزرگوں نے ہمیں ہمت بڑھانے والے خط لکھے ہیں۔ بہت سے بزرگوں نے خریدار فراہم کیے ہیں۔

ہم اپنے محترم ساتھی جناب محمد یوسف صاحب ایم ایس سی اُستاد مدرسہ ثانوی جامعہ۔ جناب مشہود مفتی صاحب استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ، کے خاص طور پر ممنون ہیں۔ انھوں نے کئی خریدار دیے ہیں۔ یوسف صاحب نے تو آئندہ بھی کوششیں جاری رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

ہمارے پُرانے ساتھی محمد حسین صاحب حیدرآبادی تو شروع سے ایک دو خریدار برابر فراہم کرتے رہتے ہیں، اور ہاں بہت ہی پُرانے جامعی مرزا عزیز اللہ بیگ صاحب، ایڈوکیٹ وردھا بھی پیامِ تعلیم کی شروع سے سرپرستی فرما رہے ہیں۔ ابھی دو تین مہینے ہوئے بہت ہی دردناک حادثہ پیش آیا۔ ان کی حقیقی چچی، بہن اور گھر کے کچھ اور لوگ اچانک آگ کی نذر ہو گئے۔ ہمیں اس حادثے میں اپنے عزیز ساتھی سے دلی ہمدردی ہے۔

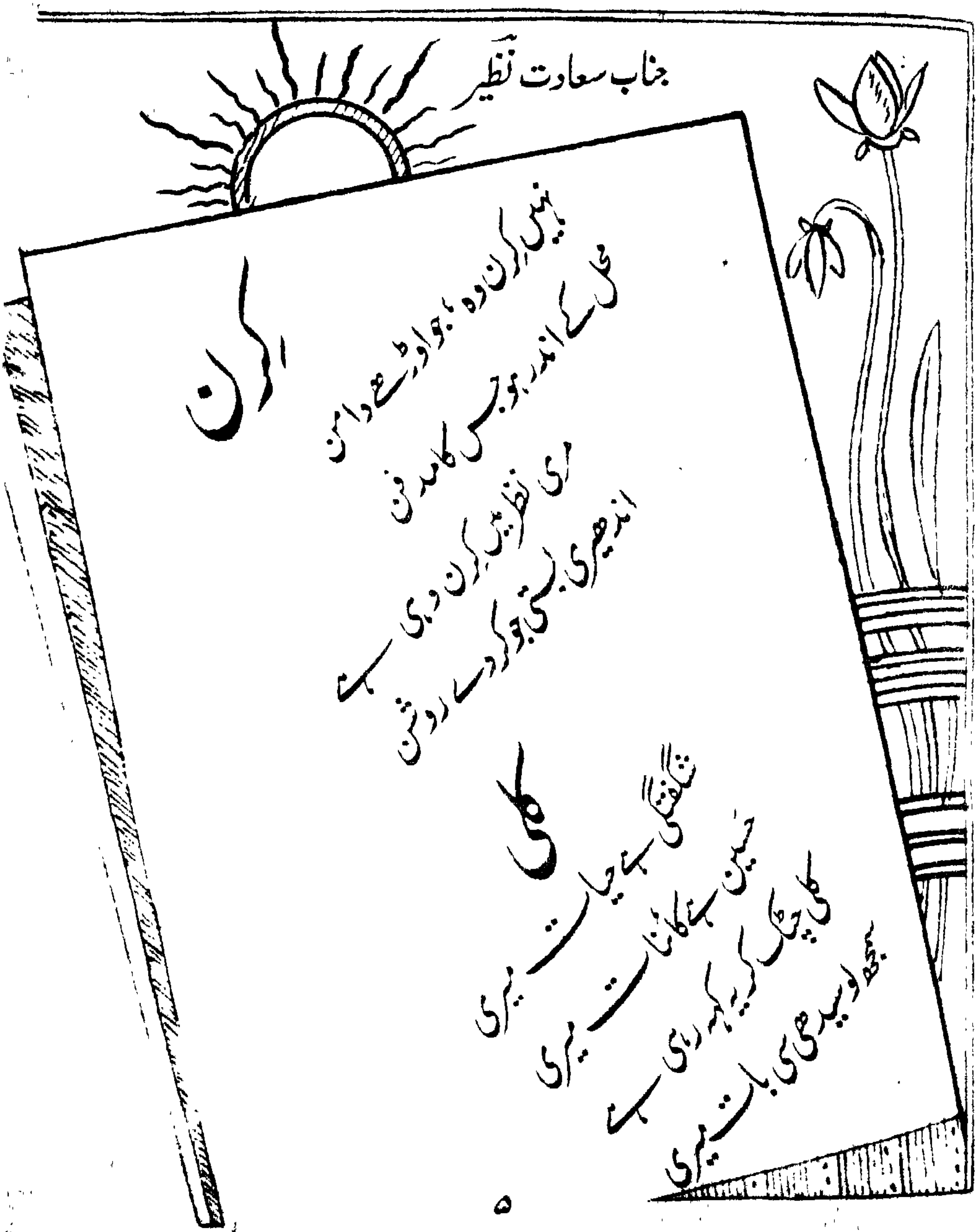
اس مرتبہ جناب عبدالحق خاں صاحب پرنسپل مدرسہ ثانوی جامعہ، اور جناب آزاد رسول صاحب نگران مدرسہ ابتدائی جامعہ نے اس طرف خاص طور پر توجہ فرمائی ہے۔ ان کی اس عنایت اور توجہ سے ہمیں یقین ہے کہ پیامِ تعلیم بہت سے نئے پیامیوں کے ہاتھوں میں پہنچ سکے گا۔ جناب آفتاب احمد صاحب اُستاد اور جناب حبیب احمد صاحب کارکن مدرسہ ابتدائی جامعہ، اس سلسلے میں بڑی دل چسپی سے کام کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ دوسرے پیامی بھی اس طرف خاص توجہ فرمائیں گے۔

پچھلے مہینے کا پرچہ بھی آپ کو پسند آیا۔ دُعا کیجیے کہ ہم اسے بہتر سے بہتر صورت میں آپ کی خدمت میں پیش کرتے رہیں۔ موقع ملے تو آپ اس کی بہتری کے سلسلے میں ہمیں مشورے بھی دیتے رہیں۔

اور ہاں صاحب سال کے آخر میں آپ کے پیامِ تعلیم کا سالنامہ بھی تو نکالنا ہے۔ اس کے لیے ابھی سے تیاری کرنی ہے۔ ہمارے محترم مضمون نگار حضرات اس کے لیے اچھی اچھی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ بہت دل چسپ معلوماتی مضمون لکھ رہے ہیں، ڈرامے لکھ رہے ہیں۔ ہمارے شاعر حضرات اچھی اچھی نظمیں لکھ رہے ہیں۔ ہم نے انھیں مشورہ دیا ہے کہ اِدھر سال ڈیڑھ سال سے جس انداز کی قومی نظمیں چھپ رہی تھیں، اب وہ وقت کی چیزیں نہیں ہیں۔ بچوں کی دل چسپی کے اور بہت سے موضوع ہیں۔ انھی کی طرف توجہ فرمائیں۔

اس پرچے میں آپ ایک اور دل چسپ مضمون پڑھیے "لندن کا آنکھوں دیکھا حال" اس کا اگلا حصہ اور بھی دل چسپ ہے۔ یہ اگلے پرچے میں چھپے گا۔ مولانا مقبول احمد صاحب ابکے ابن بطوطہ والا مضمون نہ بھیج سکے اس کی جگہ ان کا ایک اور مضمون چھپ رہا ہے۔ یہ بھی بہت دل چسپ ہے۔

ابکے پیامیوں کو پرچہ کچھ دیر سے ملا۔ غالباً داخلوں وغیرہ کی مصروفیت سے سائنس کی دنیا والے مضمون کے سوالوں کے جواب نہ بھیج سکے۔ اب آپ کو اطمینان ہو گیا ہوگا۔ اس لیے ان سوالوں کے جواب جلد بھیج دیجیے۔ تاکہ ہم انھیں اگلے پرچے میں چھاپ سکیں۔ آپ کا اگلا پرچہ بھی بہت دل چسپ ہوگا۔


جناب سعادت نظیر
کرن
نہیں کرن وہ جو اوڑھے دامن
محل کے اندر ہو جس کا مدفن
مری نظر میں کرن وہی ہے
اندھیری بستی جو کردے روشن
کلی
شگفتگی ہے حیات میری
حسین ہے کائنات میری
کلی چٹک کر یہ کہہ رہی ہے
سمجھ لو سیدھی سی بات میری



جناب تایا جان یوسف ناظم

قربان میاں کے کارنامے

۳

قربان میاں کو اپنی بھلائی کی فکر ہمیشہ رہتی ہے۔ چاہتے ہیں کہ گھر کا فرد بشر بس انھیں کے بارے میں سوچتا رہے۔ ان کی ترقی وغیرہ کے پروگرام بناتا رہے۔

ایک دن وہ چچا میاں کے پیچھے پڑ گئے کہ چچا میاں مجھے اُلٹا لٹکنا سکھا دیجیے۔ چچا میاں تو حیران سے ہو گئے کہ یہ لڑکا چاہتا کیا ہے۔ اور اِسے اُلٹا لٹکنے کی سوجھی کیوں کر۔

چچا میاں: قربان میاں تم گھاس تو نہیں کھا گئے ہو۔ یہ اُلٹا لٹکنا کوئی کھیل ہے۔

قُربان میاں: دیکھیے چچا جان۔ خفا ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے کبھی آپ سے کوئی کام نہیں لیا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو اپنی فوٹوگرافی کے علاوہ کسی اور بات کی فکر نہیں۔

چچا میاں: (غصّے سے) اپنی حد میں رہو قربان میاں۔ میری فوٹوگرافی نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔ جاؤ، باہر جاکر اُلٹے لٹکو۔

قُربان میاں: اِسی لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ اختر بھائی کہہ رہے تھے کہ چچا میاں یہ کام بہت اچھا کر سکتے ہیں۔

چچا میاں: اچھا تو یہ اختر میاں کی شرارت ہے۔ اب ان کی بھی شامت آئی ہے۔

قُربان میاں: اس میں اختر بھائی کا کیا قصور ہے

اور اختر بھائی تو کہہ رہے تھے کہ بڑے بھیا بھی پہلے آپ ہی سے اُلٹا لٹکنا سیکھتے تھے۔ یہ بڑے بھیا نے اختر بھائی کو بتایا تھا۔

چچا میاں : نالائق جمع ہو گئے ہیں سب اِس گھر میں ـــــ قربان میاں چلو دفع ہو یہاں سے، ورنہ میں مار بیٹھوں گا۔

قُربان میاں : عجیب بات ہے۔ میں تو ایک بات سیکھنا چاہ رہا ہوں اور آپ ان دونوں پر بگڑ کر میرا کام خراب کیے دے رہے ہیں۔

چچا میاں : لیکن تمھارے دماغ میں یہ بات گھُسی کیسے ؟

قربان میاں : آج ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے خوب ڈانٹا اور کہا کہ اب اگر میں نے اسکول میں کچھ کیا تو وہ مجھے اُلٹا لٹکا دیں گے۔ میں نے سوچا اسکول میں اُلٹا لٹکنے سے پہلے گھر میں اس کی مشق کر لوں تو ٹھیک رہے گا۔

چچا میاں : تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے تمھیں صرف دھمکی دی ہے۔

قُربان میاں : جی ہاں، چچا جان لیکن وہ سچ مچ ایسا کر بیٹھیں گے۔

چچا میاں : ارے میں تو کہتا ہوں، ان کو روز ہی ایسا کرنا چاہیے۔ اُن سے میں پوچھوں گا کہ اب تک تمھیں اسکول میں اُلٹا کیوں نہیں لٹکایا گیا۔

قُربان میاں : آپ تو ایسا کہہ رہے ہیں جیسے اس میں بھی میرا قصور ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے نہیں لٹکایا تو آپ لٹکا دیجیے۔

چچا میاں : میں ضرور یہ کام کروں گا تمھیں اُلٹا لٹکاؤں گا اور پھر دیکھوں گا کہ کون تمھیں اُتارتا ہے۔

قُربان میاں : آپ اُتاریں گے اور کون اُتارے گا۔ میں دن بھر تھوڑے ہی لٹکنا چاہتا ہوں۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب بھی شاید۔

چچا میاں : لیکن تمھارے ہیڈ ماسٹر صاحب نے تم سے ایسا کہا کیوں۔

قُربان میاں : ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب تو یہ چاہتے ہیں کہ اسکول کے سبھی لڑکے اُلٹے لٹکتے رہیں۔ یہ کل کی بات ہے۔ ہمارے اسکول میں نمائش کی تیاری ہو رہی ہے۔

ہر لڑکا کوئی نہ کوئی کام کر رہا ہے۔ ہماری
کلاس میں کاغذ کے پھول لگائے جا رہے
تھے۔ کچھ پھول کم پڑ گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب
بھی اس کام کی نگرانی کر رہے تھے۔ انھوں
نے مجھ سے کہا ——— قربان میاں۔
تم ذرا بازار چلے جاؤ اور ایک روپے کے
پھول اور لے آؤ۔ میں نے کہا۔ سر میں
ابھی جاتا ہوں اور ابھی واپس آتا ہوں۔
ہیڈ ماسٹر صاحب بولے دیکھو دیر نہ کرنا۔
تین ۳ بجے تک یہ کام پورا ہو جانا چاہیے۔
تم میری سائیکل لے جاؤ اور فوراً آؤ۔
میں نے کہا جی اچھا۔ لیکن جب میں چار بجے
اسکول پہنچا تو ہیڈ ماسٹر صاحب بس
تلملا رہے تھے۔ پوری کلاس کے سامنے
انھوں نے مجھے خوب ڈانٹا۔

ہیڈ ماسٹر: قربان میاں۔ مجھے معلوم تھا کہ تم سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ تم دو ۲ بجے گئے تھے اور اب چار بجے واپس آئے ہو۔

قربان میاں: سر! بازار بہت دور ہے۔ میں تو بہت تیز تیز آیا۔

ہیڈ ماسٹر: بازار دور ہے تو کیا ہوا میں نے تو کہا تھا سائیکل لے کر جانا۔

قربان میاں: میں سائیکل لے کر ہی گیا تھا۔

ہیڈ ماسٹر: سائیکل لے کر گئے تھے تو پھر اتنی دیر کیسے ہوئی۔

قربان میاں: سر مجھے سائیکل چلانا نہیں آتی۔

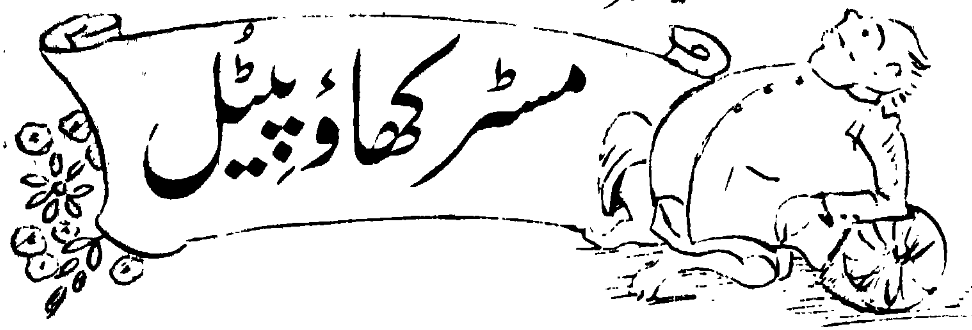
ہیڈ ماسٹر: بے وقوف! پھر سائیکل لے کر کیوں گئے تھے۔

قربان میاں: آپ نے جو حکم دیا تھا۔

ہیڈ ماسٹر: بکومت۔ آئندہ تم نے کوئی بیوقوفی کی تو اُلٹا لٹکا دوں گا تمھیں۔

جناب محمد شفیع الدین نیّر

مسٹر کھاؤ پیٹل



ہے کہانی یہ کھاؤ پیٹل کی — کھانے پینے کا جس کو تھا ہوکا
رات دن، صبح و شام، آٹھ پہر — ہر گھڑی کچھ نہ کچھ وہ کھاتا تھا
دال، روٹی، اچار اور چٹنی — کوفتہ، قیمہ، قورمہ، قلیا
فیرنی و پلاؤ اور زردہ — رائتا، دلیا، بھجیا اور بھرتا
پوریاں اور کچوریاں خستہ — ہو سموسا وہ یا کہ ہو کلچا
لڈو، پیڑا، جلیبی اور برفی — یا قلاقند، نکتیاں، حلوا
کیک اور بسکٹ اور پیسٹری — جام، جیلی، پڈنگ یا انڈا
ناشپاتی، انار، سیب، امرود — آم، جامن ہو یا ہو خربوزہ
سامنے اُس کے چیز جو آتی — آن کی آن میں وہ چٹ کرتا
اتنا کھا کر بھی وہ نہ خوش ہوتا — اتنا کھانے پہ بھی نہ بس کرتا

یہی کہتا، سدا یہی کہتا
ہائے رے، ہائے رے میں بھوکا

جناب مسعود علی جوہر

علاّمہ اقبالؔ کی سادگی

دو فوجی اپنے وطن لوٹ رہے تھے۔

انھوں نے سوچا چلتے چلتے علاّمہ اقبالؔ سے بھی ملاقات کرلیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ موت آجائے اور علاّمہ سے ملاقات کی حسرت دل میں رہ جائے۔ اور پھر وہ دونوں علاّمہ کے مکان کی طرف چل پڑے۔ دونوں راستے بھر یہی سوچتے رہے کہ علاّمہ اقبالؔ بہت بڑے آدمی ہیں۔ بڑے ٹھاٹھ سے رہتے ہوں گے۔ ان کی کوٹھی دُلہن کی طرح سجی ہوئی ہوگی۔ ملک کے بڑے بڑے لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہوگا۔ ان سے گفتگو بھی نپی تلی کرنی ہوگی۔ بھلا ایک بیرسٹر سے کوئی معمولی آدمی گفتگو کرسکتا ہے۔ لوگوں کو بات چیت کرتے وقت دانتوں پسینہ آجاتا ہوگا۔ یہی سب باتیں سوچتے وہ علاّمہ کے گھر پہنچے۔ اور متحیر رہ گئے۔ کیوں کہ وہاں نہ کوئی ٹھاٹھ تھا نہ آن و بان۔ کچھ لوگ سائبان میں بیٹھے گفتگو میں مشغول تھے۔ یہ دونوں فوجی بھی ایک طرف بیٹھ گئے اور علاّمہ کا انتظار کرنے لگے۔

لوگ ایک آدمی سے مخاطب تھے۔ جو لُنگی اور بنیائن پہنے ایک چارپائی پر بیٹھا ہر ایک کا جواب دے رہا تھا۔ اس کے سر پر گول ترکی ٹوپی تھی۔ تھوڑی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر وہ آدمی اُٹھ کر اندر گھر میں چلا گیا۔ اور دوسرے لوگ خاموش بیٹھ گئے۔

دونوں فوجی انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔

اور پھر انھوں نے مجبوراً ایک آدمی سے پوچھ لیا۔

"حضرت! علامہ کہاں گئے۔ ہمیں ان سے مُلاقات کرنی تھی۔ ہم بہت دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔"

وہ آدمی بے ساختہ ہنس دیا۔ دوسرے بھی ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہی لُنگی والا آدمی باہر آیا۔ اور حال دریافت کرنے پر خود بھی ہنسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی نے ہنستے ہوئے لنگی والے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیجیے صاحب! علامہ اقبال آ گئے۔ مل لیجیے۔"

دونوں فوجی اس سادگی کے پُتلے کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

کسی زمیندار نے علامہ اقبال کو اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے اپنے شہر میں بلایا تاکہ آپ اسی کے گھر رہ کر پوری جانچ کرکے مقدمے کی پیروی کر سکیں۔ علامہ مانے ہوئے بیرسٹر تھے۔ اس لیے ان کے شایانِ شان گھر کا انتظام ضروری تھا۔ زمیندار نے اپنے گھر کو محل کی طرح سجایا۔ جس کمرے میں آپ کا قیام تھا، وہاں فرش پر عمدہ قالین تھا۔ قیمتی صوفے اور قیمتی سنگار میز تھی۔

علامہ اقبال وہاں تین روز رہے زمیندار کسی کام میں مصروف ہو گیا۔ ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ویسے اُسے گھر کے ملازموں سے ہر بات کی واقفیت ہو جاتی۔ ملازم اُسے روز بتاتے کہ علامہ کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ زمیندار کو بڑی حیرت ہوتی۔

ایک روز وہ ڈرتے ڈرتے علامہ کے کمرے میں داخل ہوا۔

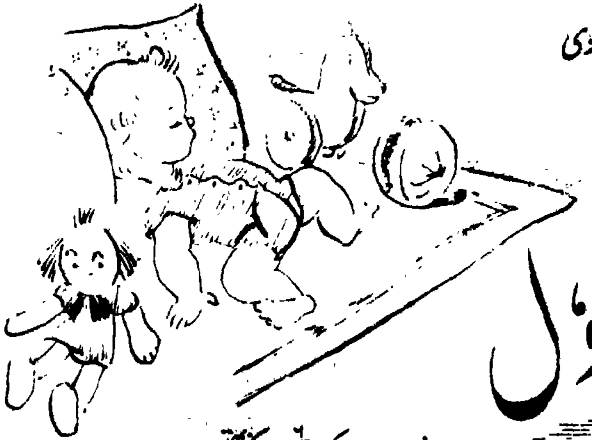
اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے انھیں کمرے کے ایک کونے میں چٹائی پر بیٹھا ہوا دیکھا۔ یہی نہیں، بلکہ علامہ کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ وہ شاید رو رہے تھے۔

زمیندار ہاتھ جوڑ کر بولا۔

حضرت مجھ سے ایسی کون سی غلطی ہو گئی۔ جو آپ نے ان چیزوں کو استعمال نہ کیا۔ میں نے تو آپ کو ہر ممکن آرام پہنچانے کی کوشش کی۔ اگر کچھ غلطی ہوئی ہو تو معاف فرمائیں۔

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

جناب سید ریاض علی پرواز اکبرآبادی



نسرین کا پھول

(نسرین شاعر کی چھ ماہ کی بھتیجی ہے)

(۱)
سنو پھول سی ایک لڑکی کا حال
ہے صورت سے روشن قمر کا جمال

(۲)
زیادہ ابھی عمر اس کی نہیں
وہ گھٹنوں سرکتی ہے چلتی نہیں

(۳)
ہر اک چاہتا ہے کھلانا اسے
اٹھانا، بٹھانا، چلانا اسے

(۴)
ادائیں ہیں اس کی بہت دل نواز
چچا جان اس کے اٹھاتے ہیں ناز

(۵)
پھدکتی ہیں چڑیاں عجب طور سے
انھیں دیکھتی ہے بڑے غور سے

(۶)
دہن میں کھلونے کو ہے ٹھونستی
انگوٹھا تو اکثر ہے وہ چوستی

(۷)
ہے رنگین کپڑوں سے الفت اسے
کھلونوں سے بے حد ہے رغبت اسے

(۸)
ہو منظور تم کو سلانا اسے
تو دے دو کوئی نرم کپڑا اسے

(۹) لپٹ کر وہ کپڑے سے سو جائے گی
وہ بچپن کے خوابوں میں کھو جائے گی

(۱۰) کبھی نیند میں مسکرائے گی وہ
کبھی ہونٹ اپنے چلائے گی وہ

(۱۱) سحر کو وہ اُٹھتی ہے ہنستی ہوئی
نگاہوں سے شوخی برستی ہوئی

(۱۲) وہ ہونٹوں کے طائر چہکتے ہوئے
وہ آنکھوں کے غنچے چٹکتے ہوئے

(۱۳) وہ گلنار سی ناک، شبنم سے گال
وہ بے ربط باتوں کا ہونٹوں پہ جال

(۱۴) تعلق ہے اس کا خیابان سے
وہ آئی ہے شاید پرستان سے

(۱۵) سحر کی صباحت، ستاروں کا دل
وہ پھولوں کی رانی، بہاروں کا دل

(۱۶) حقیقت میں چینی کی گُڑیا ہے وہ
شرارت کی شوخی کی پُڑیا ہے وہ

(۱۰) ازل کے مصوّر کی تصویر ہے
وہ خوابِ جوانی کی تعبیر ہے

(۱۸) سب آنکھوں کا تارا ہے نسرین کا پھول
چمن کا اُجالا ہے نسرین کا پھول



جناب مقبول احمد سیوہاروی



خطرے میں زندگی

ملاح کا بیٹا کشتی چلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چپّو تھے۔ جن سے پانی چیرتا تھا اور کشتی تیر کی طرح جا رہی تھی۔ رَواں، دَواں، پانی کے چھینٹے اُڑتے تو دیکھنے والے واہ واہ کرتے تھے۔

کنارے پر ایک امیر کھڑا تھا۔ چھڑی گھماتا اور سیٹی بجاتا جاتا تھا۔ اسے کشتی میں سیر کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے زور سے سیٹی بجائی۔

ملاح کے لڑکے نے کشتی کنارے کی طرف موڑ دی۔

امیر نے پوچھا کیا تم ہمیں کشتی میں دریا کی سَیر کراؤ گے، لڑکے نے سر کے اشارے سے اقرار کیا، اور امیر کشتی میں سوار ہو گیا۔

لڑکا اپنی دُھن میں کشتی چلا رہا تھا۔ اس کے فولادی ہاتھ چپّو پر تھے جس سے پانی کا زور ٹوٹتا جاتا تھا۔ اور کشتی ہَوا کی طرح اُڑی جا رہی تھی۔

امیر کچھ دیر چُپ بیٹھا رہا، پھر لڑکے سے پوچھا۔ لڑکے!! تم یہ کام کب سے کرتے ہو؟

لڑکے نے کہا سینکڑوں برس سے، یہی ہمارا پیشہ ہے۔

میرے باپ دادا، نگڑ دادا، سکڑ دادا، سب کے سب کشتی چلاتے رہے اور کشتی چلاتے چلاتے مر گئے۔

امیر نے کہا، مگر یہ تو بڑا خطرناک پیشہ ہے۔ ہوا کے زور سے کشتی اُلٹ جائے تو کشتی اور ملّاح دونوں پانی کی تہہ میں پہنچ جاتے ہیں۔

لڑکے نے کہا، جی!! خطرہ تو ہے، دیکھیے! میرے باپ کشتی چلاتے چلاتے مرے۔ ایک دن پانی کی موج نے انھیں کشتی سے اُٹھا کر پھینک دیا۔ بوڑھا جسم تھا، پانی میں سانس قائم نہ رہ سکا اور مر گئے۔

دادا کشتی اُڑائے جا رہے تھے، سامنے سے جہاز آ گیا اور کشتی اس کی خوف ناک ٹکّر سے چور چور ہو گئی اور بے چارے دادا کے پُرزے اُڑ گئے۔

نگڑ دادا ایک دن جب کہ طوفان کا زور تھا، پانی کی موجیں آسمان سے ٹکرا رہی تھیں، ان کی کشتی اُلٹ گئی۔ اور کسی طرح نہ بچ سکے۔

امیر نے کہا بھئی لڑکے اس میں تو ہر لحظہ جان کا ڈر ہے، اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ دُنیا میں تو بہت سے کام ہیں۔ لڑکا ہنسا اور بولا مگر سرکار!! آپ کیا کام کرتے ہیں۔ امیر نے کہا ہمارے کارخانے ہیں، دُکانیں ہیں، گھی کی فیکٹری ہے، شکر کی مل ہے، جس میں لاکھ من شکر بنتی ہے، ہم موٹروں میں سوار ہوتے ہیں، رات ہوتی ہے تو گدّوں والی مسہری پر سوتے ہیں۔

لڑکا بولا تو کیا آپ کے باپ، دادا، نگڑ دادا سب زندہ ہیں۔ امیر نے کہا نہیں!! مگر ہم لوگ بیمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا علاج کراتے ہیں اور پھر کسی نہ کسی دن مر کر رہ جاتے ہیں۔

لڑکے نے کہا تو سرکار خطرے میں تو آپ بھی رہتے ہیں۔ مرنے سے تو آپ کو بھی چھٹکارا نہیں، پھر آپ مسہری کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے جس پر آپ کے باپ، دادا، نگڑ دادا، سویا کیے اور آخر کار مر گئے۔

آپ کا پیشہ روپیہ جوڑنا ہے جب چاہتے ہیں گھی مہنگا کر دیتے ہیں اور لوگ گھی ڈھونڈتے ہیں، چینی مہنگی کر دیتے ہیں اور مخلوق میٹھے سے ترس جاتی ہے۔ مگر میں سپاہی ہوں، اور جس طرح سپاہی مسہری کے گدّے نہیں ڈھونڈتا اور ملک کی عزّت بڑھانے، بچّوں، بوڑھوں، عورتوں، مسجدوں، مندروں، گھی کی فیکٹریوں اور شکر کی ملوں کو بچانے کے لیے خطرے میں کود پڑتا ہے میں بھی پانی میں کود پڑتا ہوں اور ڈوبتے ہوؤں کو بچاتا ہوں۔

گدّے اور ....یاں پسندیدہ ہیں مگر انجن چلانے والے جن کے کپڑے تیل اور سیاہی میں تھڑے رہتے ہیں۔ یہ ہوائی جہازوں کے ڈرائیور یہ ٹینک پر سوار ہونے والا سپاہی جو گولیوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑا رہتا ہے۔ جو برچھیوں اور تلواروں سے ٹکرا جاتا ہے، میرا محبوب ہے اور پھر وہ علم سکھانے والے انسان جو زندگی کے اندھیرے کو اُجالے سے بدل دیتے ہیں میرے محبوب ہیں۔

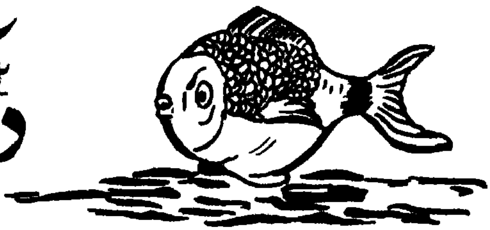
سرکار زندگی تو نام ہی اس کا ہے کہ انسان خطرے میں رہ کر اپنی زندگی گزارے۔

بقیہ "علامہ اقبال کی سادگی"

علامہ نے سر اٹھایا اور روتے ہوئے بولے:

"نہیں میاں! تم سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔ تم نے تو کسی راجہ، مہاراجہ کے ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا۔ مگر میں ان چیزوں کو کیوں کر استعمال کر سکتا ہوں۔ جب کہ میرے حضور، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک چٹائی پر سوتے رہے ہیں۔

دو کہانیاں



مچھلی نے کیا سبق دیا

دن بہت خوشگوار تھا۔ قطب جنوبی میں پنگین کے دو بچے ایک بڑے برف کے تودے پر بیٹھے مچھلی کا شکار کر رہے تھے۔ ان کا تیسرا بھائی اِدھر اُدھر بے کار پھر رہا تھا۔ پھر اس نے برف کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُٹھایا اور گزرتی ہوئی ایک سمندری چیل کی طرف پھینک دیا۔ پھر اس نے ایک چھوٹا سا تودہ بہا دیا۔ اس کے بعد وہ بھاگتا ہوا چچی چکے کے پاس پہنچا وہ کھانا پکا رہی تھی۔ چچی چکے کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اس نے اپنے بڑے پنکھ پھڑ پھڑائے اور اسے بھگا دیا۔

تھوڑی دیر بعد پن نے ایک لکڑی اُٹھائی، اس کا گھوڑا بنا کر پھر سمندر کے کنارے پر آ گیا۔ "میں نے ایک مچھلی پکڑ لی ہے۔" اس کے ایک بھائی نے خوش ہو کر کہا۔ مچھلی تڑپ رہی تھی، اچھل رہی تھی اور بھاگنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ لیکن دونوں بھائیوں نے پوری طاقت سے اسے دبوچ لیا۔

پھر وہ اسے باہر لائے۔ کنارے پر ڈال کر دونوں پھر شکار کرنے چل دیے۔ آواز سن کر پن قریب پہنچ گیا۔ دبے دبے قدموں مچھلی کے پاس پہنچا۔ پھر اسے اُٹھا کر رفو چکر ہو گیا۔

وہ مچھلی لیے چچی چکے کے پاس پہنچا اور چلایا، "چچی دیکھو میں نے کتنی بڑی مچھلی پکڑی ہے۔ ہمارے گاؤں میں کبھی کسی نے بھی اتنی بڑی مچھلی نہیں پکڑی ہو گی۔ ہے نا چچی

چکّے چکّے ؟"

"شاباش بیٹے" چچی نے تعریف کی۔

پھر وہ مچھلی صاف کرنے لگیں۔ انھوں نے اسے آٹے میں لپیٹا اور گھر کی سب سے بڑی کڑھائی میں تلنے کے لیے ڈال دیا۔ مچھلی اتنی بڑی تھی کہ اس کی دُم کڑھائی سے باہر نکلی رہی جب دونوں بھائی خالی ہاتھ گھر پہنچے تو چچی چکّے چکّے بولیں "دیکھو! پن نے کتنی بڑی مچھلی پکڑی ہے"

اس کے بھائی خاموش رہے۔ انھوں نے پن کی شکایت نہ کی۔ پر انھیں یہ بات پسند نہ آئی۔

آخر کھانے کا وقت آگیا۔ سب ننھے پنگین کھانے کی میز کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ پن بھی ان کے ساتھ بیٹھا۔ وہ فخر سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ مچھلی میں نے پکڑی ہے۔ آخر سبزی میں لپٹی ہوئی مچھلی چکّے چکّے نے چینی کے برتن میں رکھی۔

مچھلی تلی ہوئی تھی۔ پھر بھی وہ ہنس دی۔ مگر اس نے پن کی طرف نظر بھی نہ کی۔ "یہ میری مچھلی ہے" پن نے برتن اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ اس نے برتن میں سے نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا کہ ..... مچھلی اُچھلی اور اپنی تلی ہوئی دُم سے پن کے چہرے پر ایک طمانچہ مارا۔ پن ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ مچھلی نے غصّے میں پن سے کچھ کہا۔ آواز اتنی تیز تھی کہ اس کے بھائی کچھ سمجھ نہ سکے۔ البتّہ پن نے مچھلی کا برتن اپنے آپ سے اور بھی دُور کر دیا۔

"کیوں کیا ہوا ؟" پن کے بھائیوں نے پوچھا۔ "مجھے یہ مچھلی پسند نہیں" پن نے جواب دیا۔ البتّہ اس کے بھائی سمجھ گئے کہ مچھلی نے پن سے کیا بات کہی ہے۔ انھوں نے مچھلی کے دو ٹکڑے کیے اور اپنے برتنوں میں نکال لیے۔ پن کو کچھ نہ ملا۔ وہ خاموش میز پر بیٹھا رہا — آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ مچھلی کھانے کا اسے کتنا شوق تھا۔ آخر اس کے بھائیوں کو اس پر ترس آیا۔ انھوں نے تھوڑی سی مچھلی اسے بھی دے دی۔ پن کو بڑی خوشی ہوئی۔ وہ مچھلی کو صفا چٹ کر کے اس کے کانٹے تک چوس گیا۔ "شکریہ چچی چکّے چکّے۔ مچھلی بڑے مزے کی تھی" اس کے بھائیوں نے کہا اور مچھلی پکڑنے چل دیے۔ اب کی بار پن بھی ان کے ساتھ تھا۔

بوٹوں کی کہانی

از: صوفیہ پروکوفیئوا

بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ بوٹوں کا ایک جوڑا تھا۔ اس کے فیتے بہت لمبے لمبے تھے۔ وہ ایک کونے میں سست کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔

"ہمیں کوئی ایسا شخص تلاش کرنا چاہیے جو ہمیں پہننے کے لیے تیار ہو جائے۔" داہنے بوٹ نے تجویز پیش کی۔ "تم بتا سکتے ہو ایسا کون ہو سکتا ہے؟"

"ہمیں چل کر دیکھنا چاہیے۔" بائیں بوٹ نے کہا:

اور وہ اپنے کونے سے نکل کر آگے بڑھے۔ انھوں نے دیکھا کہ کمرے کے وسط میں چار ٹانگوں کی ایک میز کھڑی ہوئی ہے۔

انھوں نے ایک ساتھ کہا "آپ کا مزاج کیسا ہے؟ ہمیں پہننے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ہم سب ایک ساتھ ٹہلنے کے لیے جا سکیں گے اور اس طرح وقت خوشگوار گزرے گا!"

"نہیں، شکریہ۔ میں چل نہیں سکتی۔ میں صرف کمرے کے بیچوں بیچ خاموشی سے کھڑی رہ سکتی ہوں۔" میز نے غمگین لہجے میں کہا۔

یہ سن کر وہ پچھلے حصے سے باہر پہنچے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک بڑی بلی سے ہوئی۔

بلی بڑبڑائی، "کیا یہ فیتے خوب صورت اور لمبے نہیں ہیں؟ اور کیا یہ چھوٹے چوہے کی لمبی لمبی دُم جیسے نہیں ہیں؟"

نرم پنجے سے بہت ہی بھیانک اور تیز ناخن باہر نکل آئے۔ بوٹ خوف زدہ ہو گئے۔ دایاں بوٹ دائیں طرف بھاگا، بایاں بائیں طرف۔ بلی جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ان میں سے کس کا پیچھا کیا جائے۔

بوٹ دوبارہ ایک دوسرے کے قریب ہو گئے اور ایک ہرے بھرے سبزہ زار کی طرف چل دیے۔

ایک گائے وہاں اکیلی گھاس چر رہی تھی۔ انھوں نے بڑے نرم لہجے میں کہا،

"پیاری گائے، تمھارا مزاج کیسا ہے؟ اپنے کھروں کی حفاظت کے لیے ہمیں پہننے کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ ہم ٹہلنے جائیں گے اور اچھا وقت گزرے گا!"

"میرے چار کھر ہیں، اس لیے میرے لیے چار بوٹ چاہئیں، آپ تو صرف دو ہی ہیں۔" گائے نے کہا۔

اتنے میں سرکنڈوں کے جھنڈ سے ایک مرغابی باہر آگئی۔

"اے بہن آداب، مزاج شریف۔ آپ کی صرف دو ٹانگیں ہیں۔ کیا آپ ہمیں پہنیں گی؟ ہم ٹہلنے جائیں گے اور......"

"میں چلنا نہیں، بلکہ تیرنا پسند کرتی ہوں۔ میں تمھیں پہن لوں تو پانی میں تمھاری وجہ سے صرف تکلیف ہی ہوگی۔" مرغابی نے جواب دیا۔

بھورے رنگ کی ایک چمک دار چڑیا سڑک پر پھدکتی ہوئی نکلی۔

"پیاری چڑیا، آپ کے مزاج کیسے ہیں؟ آپ کے بھی دو پاؤں ہیں۔ مہربانی فرماکر ہمیں پہن لیجیے، ہم خوب پھدکنا اور کھیلنا چاہتے ہیں!" بوٹوں نے کہا۔

چڑیا جواب میں چہچہائی، "میں اڑنا پسند کرتی ہوں۔ میں تمھیں پہن لوں تو پھر بہت بھاری ہو جاؤں گی۔"

بوٹ زور زور سے رونے لگے۔

"ہمیں کوئی نہیں چاہتا! ہم کیا کریں؟"

اسی لمحے انھوں نے دو ننگے پیر دیکھے۔ وہ چل یا پھدک نہیں رہے تھے۔ وہ انتہائی دکھی تھے، کیوں کہ وہ تیز سنگ ریزے..... سے زخمی ہو گئے تھے۔

"اوہ، بے چارے ننگے پاؤں، مہربانی کرکے ہمیں پہن لو۔ ہم تمھیں دنیا کے دوسرے پیروں سے زیادہ چاہتے ہیں۔" بوٹوں نے التجا کی۔

پاؤں بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے بوٹ پہن لیے اور تیزی سے دوڑنے لگے۔ وہ خوشی سے اچھل رہے تھے اور کود رہے تھے۔

وہ پاؤں کس کے تھے؟

تمھارے!



جناب مفتوںؔ کوٹوی

۱۵ر اگست

یومِ آزادی

مست ہے باغ میں ہر سرو و سمن آج کے دن
رنگ کیا لایا ہے گلزارِ وطن آج کے دن

اس کے ہر ذرّے سے خوشبوئے وفا آتی ہے
ہے ہمیں خاکِ وطن، مشکِ ختن آج کے دن

تھا غلامی کا اندھیرا ہی اندھیرا ہر سُو
دل میں پھوٹی تھی امیدوں کی کرن آج کے دن

ہم بھلائیں نہ فدایانِ وطن کی یادیں
رہیں نظروں میں وہی دار و رسن آج کے دن

جاں نثاروں ہی کے صدقے میں ملی آزادی
ان کے صدقے ہی میں ہیں اتنے مگن آج کے دن

عہدِ تعمیرِ وطن، وعدۂ تزئینِ وطن
ہر جگہ ہو یہی موضوعِ سخن آج کے دن

دیکھیں اور دیکھ کے سب شیر و شکر ہو جائیں
اختلاطِ بہم گنگ ـــ و جمن آج کے دن

قحط ہو، یا ہو گرانی کہ ہو جنگی ماحول
لاؤ ہمّت ـــ جو ہو طوفان شکن آج کے دن

جس اخوّت سے ہوئی کوششِ آزادیٔ ملک
اس اخوّت کا ہو پھر تازہ چلن آج کے دن

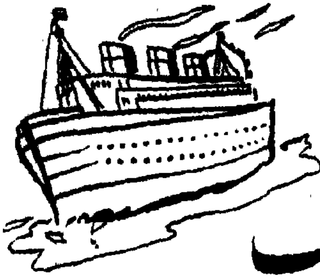
جس لگن نے ہمیں بخشا ہے یہ انعامِ بہار
پھر وہی زندہ کریں دل میں لگن آج کے دن

کارخانوں کی یہ بہتات، کلوں کی کثرت
فخر کر سکتے ہیں اربابِ وطن آج کے دن

اور بھی ہم کو ترقی کی طرف لے جائے
ارتقائے چمن و دشت و دمن آج کے دن

ادب و شعر ہو مفتوںؔ کوئی موسیقی و فن
ہو ہر اک بات بہ عنوانِ وطن آج کے دن

جناب ابوالکلام، وائس پرنسپل ٹیچرس ٹریننگ کالج، جامعہ



دہلی سے نیویارک

۳

میں نے مسٹر گلیرس سے اور بہت سے سوالوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی پوچھا کہ اس جہاز میں کُل مسافر کتنے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا آپ سمیت کُل چھے مسافر ہیں۔ ان میں دو خان بھائی ہیں یہ دونوں یونیورسٹی کی تعلیم ختم کر کے مزید تعلیم کے لیے امریکہ جا رہے ہیں۔ باقی تین انگریز ہیں۔ یہ آسام سے آنے والے تھے۔ ان کی سیٹیں بُک ہو چکی ہیں مگر یہ نہ تو خود آئے نہ خط ہی بھیجا۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ خان بھائی بھی وہیں پہنچ گئے۔ یہ دونوں ہیں تو پٹھان مگر ایک مُدّت سے ہندوستان میں رہتے ہیں۔ اسی لیے ب و لہجے میں بہت نرمی ہے۔ بات چیت کا انداز بڑا شائستہ ہے۔ بڑے بھائی امان اللہ خاں چھوٹے بھائی امین اللہ خاں —— اِن دونوں سے مل کر بڑی مسرّت بڑا اطمینان ہوا۔ یہ مجھ سے بھی پہلے سے کلکتے آئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس جہاز کی زیارت بھی کر لی ہے جس پر ہم کو سفر کرنا تھا۔

مسٹر گلیرس نے رخصت ہوتے وقت مجھے ایک پاس بھی دیا۔ اس پاس کے ذریعے میرے چار دوست مجھے رخصت کرنے کے لیے جہاز تک آ سکیں گے۔ خان بھائیوں سے۔ جہاز کے

بارے میں معلومات حاصل کر کے بہت تسلی ہوئی اور اطمینان کا سانس لیا۔

کوئی ساڑھے گیارہ بجے ہم لوگ یہاں سے فارغ ہو گئے۔ چلتے وقت ہم نے اپنے لیے کلکتے کے پتے دفتر کو دے دیے کہ جہاز کی روانگی کی اطلاع ہمیں فوراً دے دی جائے۔

جیسے ہی ہم اس دفتر سے باہر آئے امین صاحب نے پوچھا: "آپ کا پاسپورٹ کہاں کہاں کا ہے؟" میں نے کہا: "صرف امریکہ کا ہے۔" کہنے لگے: "تو پھر دوسرے ملکوں میں جانے کا اجازت نامہ بھی لے لیجیے یعنی انڈورس (ENDORSE) کرا لیجیے۔ ہم نے مصر وغیرہ کے لیے کرا لیا ہے۔ یہ جہاز مختلف ملکوں کی بندرگاہوں پر رُکے گا۔ ہم اس وقت جہاز پر بیٹھ کر کیا مکھیاں ماریں گے؟" انھوں نے انڈورس منٹ کرانے کا پورا طریقہ بھی تفصیل سے بتا دیا۔

خان بھائیوں سے رخصت ہو کر میں سیدھا پاسپورٹ آفس گیا۔ انڈورس منٹ کا فارم بھر کر دفتر کے حوالے کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ آج ہی ساڑھے تین بجے دفتر آ کر کاغذات لے جاؤں۔ میں اتنا وقت گزارنے کے لیے اپنے ایک آرٹسٹ دوست کے ہاں جا دھمکا۔ گپیں ہانکتا رہا۔ ٹھیک تین بجے انھیں ساتھ لے کر اور انھیں کی کار میں بیٹھ کر سیدھا پاسپورٹ آفس پہنچا۔ معلوم ہوا کہ کاغذات ابھی مکمل نہیں ہوئے۔ بڑی ردّ و کد کے بعد کلرک صاحب نے پاسپورٹ اور انڈورس منٹ فارم میرے حوالے کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کلرک صاحب کی نیت خراب تھی اور مجھ سے کچھ وصول کرتے بن نہ پڑا تو مایوس ہو گئے۔ یہاں سے میں قہوہ خانے پہنچا۔ کچھ کھایا پیا اور گھر کی راہ لی۔ یہ ۲۰ مئی کی بات ہے۔

میرے میزبان کبھی کبھی جہاز کی روانگی کے بارے میں سب پوچھ لیا کرتے تھے اور میں کوئی تسلی بخش جواب نہ دے پاتا تھا۔ یہی کہہ دیتا تھا کہ ابھی کچھ پتہ نہیں چلا۔ ۲۱ مئی کی صبح میں نے جلدی جلدی نہا دھو کر ناشتہ کیا۔ میرے میزبان دوست اس کا مطلب سمجھ گئے۔ کہنے لگے "معلوم ہوتا ہے آپ میرے ساتھ چلیں گے۔" میں نے کہا "جی ہاں، یہی ارادہ ہے۔" اصل میں میں نے سوچا مجھے خود گلیڈ اسٹون کے دفتر جا کر جہاز کی روانگی کی صحیح تاریخ معلوم کرنی چاہیے۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ جہاز ۲۲ مئی کو

آٹھ بجے رات کو روانہ ہوگا۔ ہم لوگوں کو ٹھیک ڈیڑھ بجے ڈیک پر پہنچ جانا چاہیے۔ وہاں کسٹم والے جانچ کریں گے۔ پولیس والے کاغذات دیکھیں گے۔ جہاز کے ڈاکٹر صاحب بھی یہ کاغذات ایک بار اور دیکھیں گے۔

تم یہ سوچتے ہوگے کہ یہ سب معلوم کرکے مجھے خوشی ہوئی ہوگی۔ جی نہیں۔ مجھے اس وقت بھی اطمینان نہ تھا کہ جہاز کل روانہ ہو سکے گا۔ پر جب انھوں نے یہ بات مجھے لکھ کر دے دی تو بے شک کچھ اطمینان ہوا۔ اس دفتر سے روانہ ہوتے وقت میں نے یہ بھی معلوم کیا تھا کہ آیا خان بھائیوں کو بھی اطلاع دے دی گئی ہے۔ جواب ملا کہ دے دی گئی ہے۔

اس کے بعد میں نے فوراً امریکن ایکسپریس کا رُخ کیا۔ بھلا کیوں؟ میں دہلی سے صرف ساٹھ روپے لے کر چلا تھا۔ خیال تھا کہ جہاز ۲۰ مئی کو جائے گا۔ دو دن کے خرچ کے لیے یہ رقم کافی تھی۔ پر جب میں نے یہاں رکارڈس وغیرہ خریدے اور ڈاکٹر کی فیس (سولہ روپے) بھرنا پڑی تو روپے ختم ہوگئے۔ ہوٹل میں ٹھہرتا تو دو ہی دن میں حساب کتاب برابر ہو جاتا۔ مجھے اطمینان اس لیے تھا کہ جب کبھی روپیہ ختم ہوگا تو ڈالر بھناؤں گا۔ امریکن ایکسپریس میں اسی لیے گیا تھا۔ میں نے وہاں دس ڈالر بھنائے، اس کے مجھے بتّیس روپے چودہ آنے ملے۔ ایک ڈالر تین روپے چھے آنے کا ہوتا ہے[1]۔

مجھے یہ ڈالر گورن برادرس نے ٹریولرس چیک کی شکل میں دیے تھے۔ تم شاید سوچو کہ یہ ٹریولرس چیک کیا بلا ہے؟ تو بھئی یہ اچھے خاصے نوٹ ہوتے ہیں۔ پر نوٹ تو نقدی ہے کاغذ کی شکل میں، مگر یہ چیک بجائے خود کرنسی یا نقدی نہیں ہیں۔ ہاں ان کے ذریعے سے نقدی مل سکتی ہے۔ یہ ایک ڈالر سے لے کر سو ڈالر تک مختلف رقم کے ہو سکتے ہیں۔

یہ چیک جب دیے جاتے ہیں تو لینے والے کو کلرک کے سامنے اس پر اپنے دستخط کرنے پڑتے ہیں۔ اور جب انھیں بھنانا ہو تو رقم دینے والے

---

[1] یہ اب سے بیس برس پہلے (۱۹۴۶ء) کی بات ہے۔ اب جو ہماری حکومت نے سرکاری طور پر اپنے روپے کی قیمت کم کر دی ہے تو ڈالر کے دام بھی کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں۔ اب ایک ڈالر ساڑھے سات روپے کا ہوتا ہے۔

کلرک کے سامنے رقم لینے والے کو دوبارہ دستخط کرنے پڑتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ چیک میرے نام کا ہوا تو کوئی دوسرا انھیں نہیں بُھنا سکتا۔ یہ کھو بھی جائیں تو کوئی دوسرا ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اور ہاں یہ اسی جگہ بُھنائے بھی جا سکتے ہیں جہاں چیک دینے والی کمپنی کا دفتر ہوگا۔ مثلاً مجھے یہ چیک امریکن اکسپریس نے دیے ہیں تو اب دُنیا میں جہاں بھی اس کمپنی کا دفتر ہوگا یہ چیک آسانی سے بُھن جائیں گے۔ غالباً اب نوٹ اور چیک کا فرق تمھاری سمجھ میں آگیا ہوگا۔ غرض روپے لے کر میں گھر چلا اور ۲۲ر کا انتظار کرنے لگا۔

بھیجے صاحب، آج ۲۲ر مئی ہے، ہمارے جہاز کے روانہ ہونے کی تاریخ۔ میں آج تڑکے ہی اُٹھ بیٹھا۔ اور نہا دھو کر سامان ٹھیک کرنے میں لگ گیا۔ سفر میں کام آنے والی چند ضروری چیزیں سوٹ کیس میں رکھ لیں۔ باقی دوسری چیزوں کو بڑے ٹرنک میں بند کر دیا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا دو سوٹ کیسوں کو چھوڑ کر باقی تمام سامان جہاز کے اسٹور روم میں رکھا جائے گا۔ یہ سوٹ کیس مسافر اپنے ساتھ کہیں بھی رکھ سکتا ہے۔ سامان ترتیب دیتے وقت میں نے پاسپورٹ اور ویزا کو خاص طور سے احتیاط سے رکھا۔ یہ دونوں کہیں کھو جائیں تو اب تک کی ساری دوڑ دھوپ خاک میں مل جائے۔ انھیں میں نے اپنے سوٹ کیس میں رکھ دیا۔ غرض ناشتے سے پہلے پہلے اپنا سامان قرینے سے لگا چکا تھا۔

میرے میزبان دوست کو جہاز کی روانگی کی اطلاع ہو چکی تھی۔ اس لیے انھوں نے پہلے ہی کار کا انتظام کر دیا تھا، اور مجھے بتا دیا تھا کہ ٹھیک ۱۲½ بجے ڈرائیور کار لے کر آجائے گا اور مجھے ڈک پر چھوڑ آئے گا۔ میرے دوست حسبِ معمول اپنی دُکان پر جانے لگے تو میں ان سے آخری بار رخصت ہوا اور ان کی مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

وہ دوپہر کو عموماً ۱½ ڈیڑھ بجے گھر آتے ہیں اور مجھے ۱۲½ بجے یہاں سے روانہ ہو جانا تھا، اس لیے یہ آخری ملاقات تھی۔

گھر میں ویسے ۱½ بجے کھانا کھایا جاتا تھا لیکن مجھے جلدی جانا تھا۔ اس لیے میرے لیے کھانا جلدی تیار کر دیا گیا۔ اور جب کھانا تیار ہو گیا

تو گھر کے اور لوگ بھی میرے ساتھ بیٹھ گئے۔

ہم ابھی کھانا کھا ہی چکے تھے کہ ڈرائیور صاحب کار لے کر آدھمکے اور جلدی کرنے لگے۔ گھر کے ملازموں نے سامان کار میں رکھا یں تو کسا کسایا پہلے سے تیار تھا۔ گھر والوں سے آخری سلام کیا ان کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور کار میں آبیٹھا۔ کدر پورڈک یہاں سے چھ میل کے فاصلے پر تھا، کار بات کہتے ہیں وہاں تک پہنچ گئی۔ میں کار سے اُترا۔ سامنے گیٹ پر پولیس والا کھڑا تھا' اس سے دریافت کیا کہ آیا کدر پورڈک یہی ہے ؟ اس نے بتایا کہ ہاں یہ کدر پور ہی ہے اور جس جہاز کی ہمیں تلاش ہے۔ یہ سامنے کھڑا ہے اور اس کا نام (LILLES) یعنی للے یا لیلی جہاز۔

یہاں ہماری کار کے رُکتے ہی بہت سے قلی دوڑ پڑے۔ کوئی تین چار ایک ساتھ سامان اُتارنے لگے۔ میں نے انھیں روکنا چاہا ــــ جہاز والوں نے بتایا تھا کہ سامان سب سے پہلے کسٹم کے دفتر میں جائے گا۔ وہاں سامان کی جانچ ہوگی پھر جہاز میں رکھا جائے گا۔ قلیوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ اس جگہ کو جانتے ہیں۔ روزانہ یہی کام کرتے ہیں۔ ڈرائیور نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی' تو میں نے ان کی بات مان لی۔ سامان اتر چکا تو میں نے ڈرائیور کی کچھ "خدمت" کی۔ وہ کچھ خوش خوش نظر آئے' سلام کیا' گاڑی اسٹارٹ کی' رخصت ہوئے۔ اور میں اس طرف چلا جہاں کسٹم والے سامان کی جانچ کرتے ہیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے ہم سفر خان بھائی بھی وہیں اپنا سامان لیے کھڑے ہیں۔ اس وقت میری خوشی کا کیا پوچھنا! معلوم ہوا کہ وہ بھی ابھی ابھی آئے ہیں۔

ہم تینوں باتیں کر رہے تھے کہ مسٹر گلیرس آگئے۔ کہنے لگے کہ ہمیں اپنے تمام کاغذات اور روپے لے کر کسٹم کے دفتر میں جانا ہے۔ ہم نے یہ تمام ضروری چیزیں سوٹ کیس سے نکالیں اور مسٹر گلیرس کے ساتھ ہو لیے۔

اس درمیان میں ہم نے اپنا لیلی جہاز بھی دیکھ لیا۔ اچھا خاصا جہاز تھا۔ کوئی چھ ہزار ٹن وزن کا ہوگا۔ یہ آدھا سُرمئی تھا آدھا سفید۔ سُرمئی حصّہ نیچے اور سفید حصّہ اوپر....

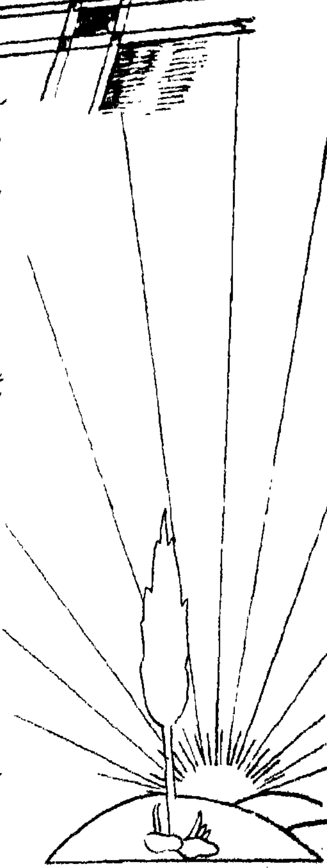
(باقی اگلے پرچے میں)

تقدیس بالا

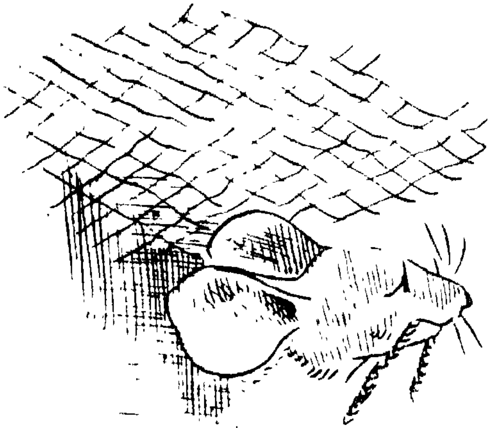


سُندر سپنا

میں اِک ایسی بچّی ہوں
بھارت ماں کے گلشن میں
جس کو آگے بڑھنا ہے
سیواؤں کی خوشبو سے
دھرتی ماں کے آنچل کو
پگ پگ پر مہکانا ہے
تاروں کو شرمانا ہے
جیون کو چمکانا ہے
پیار کا نغمہ گانا ہے
میرا ہر اک سُندر سپنا
گلشن گلشن مہکے گا
سورج بن کر چمکے گا
میں اِک ایسی بچّی ہوں
جس کو آگے بڑھنا ہے



جناب مصطفیٰ رشید میوہاروی



کوّا اور چوہا

ایک رات کوّے کی ماں نے اپنے بیٹے کوّے سے کہا۔ دیکھو بیٹا جب کوئی آدمی نیچے جھکے تو فوراً اُڑ جانا۔ آدمی جھک کر اینٹ یا پتھر جو بھی مل جائے اُٹھا کر کوّے پر نشانہ لگا دیتا ہے۔ آدمی بڑے نشانے باز ہوتے ہیں۔ پتھروں، کنکروں سے کوّے، چڑیاں مارا کرتے ہیں۔

کوّے نے ماں کو جواب دیا "امّاں جی! اگر آدمی پہلے سے اینٹ یا پتھر لیے بیٹھا ہو اور مجھے دیکھتے ہی نشانہ لگا دے تو کیا کروں؟" یہ سُن کر کوّے کی ماں خوب ہنسی۔ قیں، قیں، قیں۔ پھر کوّے کے باپ سے بولی، سُنتے ہو چھوٹے کاگا کی بات۔

کوّا بولا کیوں نہ ہو، میرا بیٹا ہے سب چیزیں چُرا کر کھائے گا اور کسی کی مار نہ کھائے گا۔ شاباش بیٹے شاباش۔

کوّے کی ماں لوری گانے لگی:

ہلدی لائے لہسن لائے
مرچیں لائے بیسن لائے
کچّی لائے پکّی لائے
اور لائے پھل پھلاری
لائے اُبلا انڈا
اور نہ کھائے ڈنڈا
میرا بیٹا کالا کالا
کھائے تر نوالا

میرا بیٹا بڑا سیانا
کھائے اچھا کھانا

کاگا جی سو گئے۔ تڑکے تڑکے اُٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شکاری کندھے پر جال ڈالے گھومتا پھرتا ہے، کوّا پیڑ کے پتّوں میں چھپ گیا۔ اور دیکھنے لگا کہ شکاری کیا کرتا ہے۔

شکاری نے جھولے میں سے چاول نکالے اور زمین پر بکھیر دیے پھر دُور جاکر بیٹھ گیا۔

اتنے میں کبوتروں کا غول دُور سے آتا دکھائی دیا۔ یہ کبوتر کہیں دُور سے اُڑتے چلے آرہے تھے۔ ان میں ایک کبوتر بڑا شان دار تھا اور سب سے اونچا اُڑتا آرہا تھا۔ اور یہی کبوتروں کا سردار تھا۔

سب کبوتروں نے کہا غٹرغوں، ہم تھک گئے ہیں، ذرا کی ذرا سستالیں۔ سردار نے سر کے اشارے سے منظوری دے دی۔ اور کبوتروں کا غول میدان میں اُتر پڑا۔

میدان میں اُتر کر جب کبوتروں نے چاولوں کے دانے بکھرے دیکھے تو ناچنے لگے۔ اور غٹرغوں، غٹرغوں کرتے ہوئے بولے، آؤ انھیں چُگ لیں۔ سردار نے کہا خبردار چاولوں کا لالچ نہ کرنا، جنگل میں چاول کہاں۔ کہیں شکاری چھپا نہ بیٹھا ہو۔

ایک کبوتر جوانی میں بھرپور تھا سینہ اُبھار کر بولا غٹرغوں، جہاں ڈر وہاں ہمارا گھر۔ بہادر کہیں ڈرتے ہیں۔ ڈریں گے تو کھائیں گے کیا؟ یہ کہہ کر دانہ چُگنے لگا اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے کبوتر بھی چُگنے لگے۔

سردار دیکھتا رہا، پھر سوچا، دانہ چُگتا ہوں تو پکڑا جاتا ہوں اور نہیں چُگتا تو ساتھیوں سے الگ رہتا ہوں۔ پھر سب کے ساتھ چونچیں مارنے لگا۔ شکاری نے جب یہ دیکھا کہ سب کے سب جال میں آگئے ہیں تو جال کھینچ لیا اور سب کبوتر پھنس کر رہ گئے۔ نوجوان کبوتر جس نے شیخی ماری تھی سب کبوتر اُسے بُرا کہنے لگے۔

سردار نے کہا کون ہے جس سے بھول نہیں ہوتی۔ انسان جو خدا کی سب سے اچھی مخلوق ہے، دن رات خطائیں کرتا ہے۔

غل نہ مچاؤ اور عقل سے کام لو۔ مرد وہ ہے کہ مصیبت میں ہوش و حواس نہ کھو بیٹھے۔ میرا کہا مانو، ایک دَم زور کرو اور جال سمیت اُڑ چلو۔ یہ سُنتے ہی کبوتروں نے زور کیا اور جال سمیت

اُڑ گئے۔

یہ دیکھ کر شکاری بڑا سٹ پٹایا اور آسمان کی طرف دیکھتا ہوا بھاگا۔ مگر کہاں تک؟

کاگا جی نے یہ تماشا کہاں دیکھا تھا۔ کبوتر جال لے کر اُڑے تو یہ بھی قیں قیں کرتے ان کے ساتھ ہو لیے۔

کبوتروں نے سردار سے پوچھا اب کیا ہوگا؟ سردار نے کہا میرا ایک دوست ہے ہم سب اسی کے پاس جا رہے ہیں۔ دیکھنے کو پتلی دم چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں کا چوہا ہے مگر ہے بڑے کام کا۔ اُڑتے اُڑتے سب چوہے کے بل کے پاس پہنچے۔

چوہے نے دُور سے کبوتروں کا غول دیکھا تو بل میں گھس گیا۔ مگر جوں ہی سردار نے پکارا باہر نکل آیا۔ اور بولا تم جیسا دانا جال میں کیسے پھنسا۔ سردار نے کہا بڑوں کا کہنا نہ ماننے سے مصیبت آ ہی جاتی ہے۔ چوہے نے کہا میرے دوست غم نہ کرو۔ میرے دانت تیز ہیں اور پنجے مضبوط ہیں۔ یہ کہہ کر اپنے دوست کا پھندا کاٹنے دوڑا۔ سردار نے کہا اوّل میرے ساتھیوں کے پھندے کاٹو پھر مجھے بچاؤ۔ چوہے نے اپنے دوست کی بات سن کر کہا شاباش مَردوں کا یہی کام ہے۔ پھر سب کے پھندے کاٹ دیے۔

جب کبوتر رخصت ہو گئے تو کاگا جی کائیں کائیں کرتے چوہے کے پاس پہنچے اور بولے۔

میں نے بڑے بڑے گھروں
سے پھل اور توس مکھن چرایا ہے،
مگر تجھ جیسا وفادار میں نے نہیں
دیکھا، کیا ہی اچھا ہو کہ میں اور تُو
دوست بن جائیں۔

چوہے نے بل میں سے جواب دیا:

میں چوہا، تُو کاگا، اور چوہا
تیرا کھاجا، مجھ میں اور تجھ میں دوستی
کیسی، جا! کسی دوسرے پنچھی سے
یارانا گانٹھ اور ایسی چکنی چپڑی
باتیں گلہری سے کر۔

کوّے نے ہر چند کائیں کائیں کی اور کہا تُو باہر تو نکل کر آ، ہر ایک کوّا مکار نہیں ہوتا مگر چوہے نے جواب بھی نہ دیا اور آخر کاگا جی یہ کہتے ہوئے اُڑ گئے کہ یہ چوہا تو مجھ سے بھی سیانا ہے۔



جناب واحد پریمی

بچوں کا ترانہ

الٰہی دے وہ دولتِ علم و فن
جسے لوٹ سکتا نہیں راہ زن

ہم آپس میں ہو کر رہیں ایک دِل
محبّت کی ہو سب کے دل میں لگن

وہ دھرتی جہاں جنم ہم نے لیا
اسے ہم بنا دیں شگفتہ چمن

وطن کا اندھیرا کریں دُور ہم
بنیں صُبح کی مُسکراتی کرن

کہے مادرِ ہند ہم کو سپوت
کرے ناز ہم پر ہمارا وطن

جناب احسان الحق (جامعی)

لندن کا آنکھوں دیکھا حال



(۱)

انگلینڈ کا دنیا میں بڑا نام ہے۔ بڑی شان ہے۔ اس کی راج دھانی لندن تو کسی زمانے میں دُنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ کہتے ہیں اب اس کی جگہ جاپان کی راج دھانی ٹوکیو نے لے لی ہے۔ پھر بھی یہ دوسرے نمبر پر تو ہے ہی۔

ایک بات بڑی دل چسپ ہے۔ انگلینڈ کا نام اتنا بڑا ہے۔ پر اپنے دیس کے کئی صوبے مثلاً راجستھان، اُتر پردیش، مہاراشٹر وغیرہ اس سے بڑے ہیں۔ اور ہاں ہمارے اُتر پردیش کی آبادی سات کروڑ، ۲ لاکھ ہے اور انگلینڈ کی کل پانچ کروڑ ستائیس لاکھ۔ اسی موقع پر تو کہتے ہیں، نام بڑے درشن چھوٹے!

ہاں تو بھئی میں بھی اپنی تعلیم کے سلسلے میں انگلینڈ پہنچا۔ آزادی سے پہلے دیس کے زیادہ لوگ اونچی تعلیم حاصل کرنے زیادہ تر انگلینڈ ہی جاتے تھے۔ اب بھی یہ علم کا بہت بڑا مرکز ہے۔ اس کی دو یونیورسٹیاں آکسفورڈ اور کیمبرج اب بھی ساری دُنیا میں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

میں لندن میں ایک دو نہیں پورے سات سال رہا۔ اور اب آپ کو وہاں کا آنکھوں دیکھا حال سُناتا ہوں۔ دیکھیے کتنا دل چسپ کتنا مزے دار ہے۔

میں لندن کا پہلا دن کبھی نہیں بھول سکتا۔

سارے شہر پر برف کا ایک سفید غلاف چڑھا تھا۔ ہلکے پھلکے برف کے گالے آسمان سے گر رہے تھے ایک بات عجیب ہے برف گرتے وقت سردی بالکل نہیں ہوتی۔ شاید اسی لیے بچوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں سڑکوں پر نکل آتی ہیں۔ پر یہ برف جمنا شروع ہوتی ہے تو سردی کی لہر اٹھتی ہے۔ یہ ایسی غضب کی ہوتی ہے کہ آپ کی ہڈیوں کے گودے تک پہنچ جاتی ہے۔ دانت کڑکڑ بجنے لگتے ہیں۔ ناک کی چونچ سرخ ہو جاتی ہے۔ کانوں کو چھو کر دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک اپنی جگہ ہیں یا کہیں گر گئے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ریلوں کو بنانے کی پہل انگلینڈ والوں نے کی تھی۔ ۱۸۲۵ء میں جارج اسٹیفنسن کے انجن کی پہلی ٹرین اسٹاکٹن (Stockton) سے بھک بھک کرتی ہوئی چلی تھی۔ لندن میں ریل گاڑی زمین کے نیچے چلتی ہے۔ اسے ٹیوب یعنی نل کہتے ہیں۔ ٹیوب اس لیے کہتے ہیں کہ بڑے بڑے بہت ہی بڑے لوہے کے نل زمین کے اندر ڈال دیے گئے ہیں اور ان نلوں میں بجلی کی ریلیں بھاگتی ہیں۔ سارے شہر کے نیچے ان ریلوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا ہوتا ہے کہ آپ نیچے ریل کے ڈبے میں بیٹھے گپ لڑا رہے ہیں اور آپ کو معلوم بھی نہیں کہ آپ کی ریل گاڑی کے اوپر دریائے ٹیمز بہہ رہا ہے۔

گرمیاں تو انگلینڈ میں آتی ہی نہیں۔ ہاں بہار کا موسم ضرور آتا ہے۔ اس موسم میں بھی بس اتنی سردی ہوتی ہے کہ آپ ایک ہلکا سا سوئٹر پہن کر باہر گھومنے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس موسم میں دن بہت بڑا ہو جاتا ہے۔ جون میں ایک دن ایسا بھی آتا ہے جب رات کے گیارہ بجے تک دن کی روشنی پھیلی رہتی ہے۔

اگر آپ لندن آنے والے کسی نئے آدمی سے کہیے کہ بھائی اب سو جاؤ رات کے گیارہ بج رہے ہیں تو وہ ہنسنے لگے گا۔ یعنی ابھی تو سورج ڈوبا نہیں اور میں سو جاؤں۔ لیکن جس کو صبح سویرے اٹھ کر دفتر جانا ہو اسے تو اپنے گھر کے سارے پردے کھینچ کر کمرے میں اندھیرا کرنا ہوتا ہے۔ اور پھر بستر پر لیٹ کر آنکھیں بھی بند کرنا پڑتی ہیں۔

اس دیس میں اخبار بہت نکلتے ہیں۔

یہاں پر ہر سو آدمیوں میں سے پچاس آدمی اپنا اخبار خریدتے ہیں۔ ایک اخبار تو پچاس لاکھ روزانہ چھپتا ہے۔ اور ہاتھوں ہاتھ بک بھی جاتا ہے۔ اخبار کی بات پر مجھے لندن کے "بچے" یاد آرہے ہیں۔ بتائیے کیوں؟

وہاں کے لوگ کسی کام کو بُرا نہیں سمجھتے چنانچہ "بچے" بھی صبح تڑکے اُٹھ کر لوگوں کے گھروں پر اخبار پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔ جن دنوں برف گرتی ہے، یہی "بچے" اسکول سے آنے کے بعد دوسروں کے گھر جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں جناب آپ کو اپنے گھر کے سامنے سے برف تو نہیں ہٹوانا ہے۔ کسی کو برف ہٹوانا ہو تو یہ "بچے" پھاوڑے لے کر کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ جمی ہوئی برف توڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ "چھٹی" کے دن ایک تھیلے میں برش اور اسپنج لے کر دوسروں کی موٹریں صاف کرتے ہیں۔

سڑکوں پر اخبار بیچنے کا کام بُڈھوں کے سپرد ہے۔ اور آپ جانتے ہیں وہ اخبار کیسے بیچتے ہیں؟ ایک کونے میں اخباروں کا ڈھیر سلیقے سے رکھ کر اس کے پاس ایک خالی ٹین کا ڈبا رکھ دیتے ہیں اور پھر کسی چائے کی دُکان میں جا کر آرام کرتے ہیں۔ لوگ آتے ہیں، اخبار اُٹھاتے ہیں اور اس کی قیمت ڈبے میں ڈال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

کبھی صبح سویرے اُٹھ کر آپ باہر نکلیں تو آپ دیکھیں گے کہ تمام دروازوں کے سامنے دودھ کی بھری ہوئی بوتلوں اور اخباروں کا ڈھیر ہے۔ کیا مجال جو کبھی چوری ہو جائے۔ لوگ سو کر اُٹھتے ہیں تو اپنی اپنی بوتل اور اپنا اپنا اخبار اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔

انگلینڈ کے لوگوں میں تہذیب اور شائستگی بہت ہے۔ بسوں اور ریلوں میں زور سے نہیں بولتے نہ سڑکوں پر تھوکتے ہیں، نہ دیوار پر لکھتے ہیں، نہ یہ کہ پھلوں کے چھلکے جہاں جی چاہے پھینک دیے۔ تھینک یُو یعنی شکریہ کا لفظ کہنا ان لوگوں کی جیسے عادت بن گئی ہے۔ بس میں سفر کرتے وقت کنڈکٹر کو پیسے دیتے ہیں تو کنڈکٹر پیسے لے کر شکریہ ادا کرتا ہے اور جب وہ ٹکٹ مسافر کو دیتا ہے تو مسافر کے مُنہ سے آپ ہی آپ تھینک یُو نکل جاتا ہے۔ اور کبھی اگر کوئی تھینک یو نہ کہے تو اسے تمیز دار آدمی نہیں

سمجھا جاتا۔

انگلینڈ کے اسکولوں میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ صفائی پر بہت زور دیا جاتا ہے اور ہر بچّے کو یہ یاد کرا دیا جاتا ہے کہ انگلینڈ صاف ستھرا اور درست رکھو۔ مجھے یاد ہے میں ایک دفعہ اپنے ایک دوست کے ساتھ جا رہا تھا۔ اُن کا کوئی آٹھ برس کا لڑکا ہم لوگوں کے ساتھ تھا۔ ایک جگہ میں نے چاکلیٹ کا ایک پیکٹ خرید کر اُسے دیا، وہ بہت خوش ہوا اور تھینک یُو کہہ کر اس نے چاکلیٹ کھانا شروع کر دیے۔ میں برابر اس لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ میں دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ بچّہ چاکلیٹ کا کاغذ کہاں پھینکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں اس لڑکے نے کاغذ کہاں پھینکا؟ اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا تاکہ جہاں کہیں اسے ردّی کی ٹوکری نظر آئے وہ اس میں کاغذ کو ڈال دے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی بے اختیار جی چاہا کہ اُسے انعام دوں۔

بچّوں کے کھیلنے کے لیے سرکار نے بڑے خوب صورت پارک بنا رکھے ہیں۔ ان پارکوں میں سال بھر میلا لگا رہتا ہے۔ لندن کا شاید ہی کوئی بچّہ ایسا ہوگا جو وہاں کے بیٹرسی پارک میں نہ گیا ہو۔ دُنیا بھر کے کھیل تماشے وہاں ہیں۔

سرکار نے وہاں اونچی اونچی آسمان سے باتیں کرنے والی پہاڑیاں بنا رکھی ہیں۔ ان پر چھوٹی چھوٹی بجلی سے چلنے والی ریل گاڑیاں چلتی ہیں۔ ان کی اونچائی اتنی سیدھی ہے کہ اوپر چڑھتے ہوئے سانس رُکنے لگتی ہے۔ اور نیچے دیکھتے وقت تو مارے ڈر کے آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔

اوپر پہنچ کر جب گاڑی دوسری طرف نیچے ڈھال پر اُترنا شروع کرتی ہے تو بچّوں کو نیچے پانی کی ایک جھیل نظر آتی ہے۔ بس ایسا لگتا ہے کہ ٹرین اِس جھیل میں اب گری کہ اب گری۔ پر یہ ٹرین اِس زنّاٹے سے پلک جھپکتے میں پانی سے ہوتی ہوئی نکل جاتی ہے کہ بچّوں کی چیخیں نکل جاتی ہیں اور پانی کی چھینٹیں پاس والی شیشے کی دیوار پر بیس تیس فٹ تک پہنچ جاتی ہیں۔

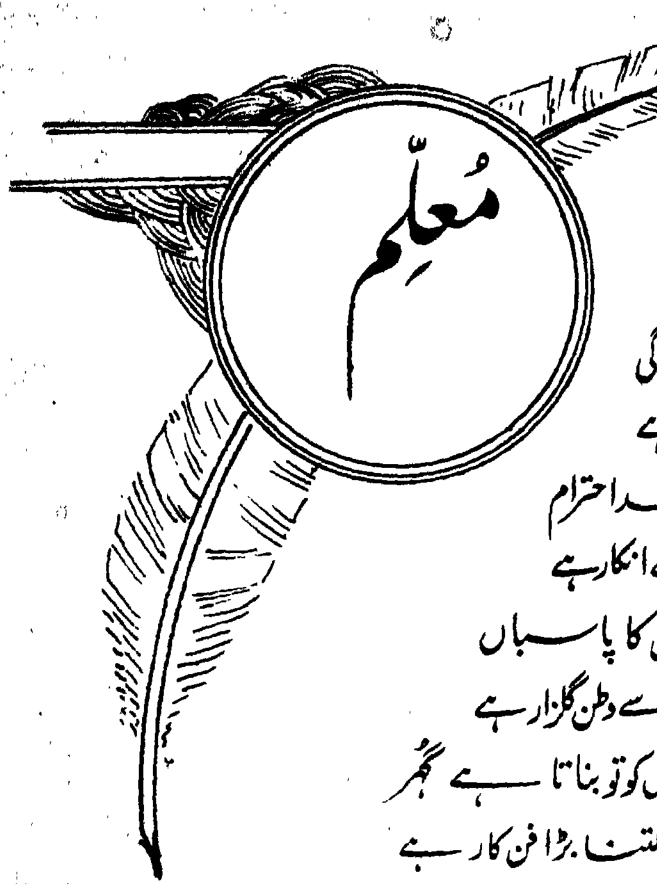
پھر ایک اور ٹرین ہے جو زمین کے اندر غاروں میں سے گزرتی ہے۔ سارے راستوں میں اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ کہیں کہیں ہلکی سی

روشنی جلتی ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ ایک پتھر کی دیوار بالکل قریب آگئی ہے جس سے گاڑی ٹکرا کر ٹکڑے ہو جائے گی۔ آپ کے مُنہ سے چیخ نکلنے بھی نہیں پاتی کہ گاڑی دیوار سے ٹکرا جاتی ہے۔ لیکن دیوار جیسے ربڑ کی ہو ایک جھٹکے میں کھل جاتی ہے۔ آپ کی جان میں جان آتی ہے۔

ریل گاڑی اب ایک اور گپھا میں پہنچ چکی ہے۔ ہلکی ہلکی روشنی میں آپ دیکھتے ہیں کہ ٹھیک آپ کے سر کے اوپر بڑے بڑے مکڑے بلبلا رہے ہیں۔ آپ کے راستے میں مُردوں کے ڈھانچے کھڑے ہیں۔ یہ مکڑے آپ پر حملہ کرتے ہیں۔ آپ چیخ اُٹھتے ہیں۔ پھر یہی چیخ کھسیانی ہنسی میں بدل جاتی ہے۔ وہ تو سب کچھ پلاسٹک کے ڈھکوسلے تھے۔

(باقی اگلے پرچے میں پڑھیے بہت ہی دل چسپ اور مزے دار ہے)

جنابِ شیخ حسن مہابلیشوری



مُعلّم

تیرے دَم سے ہے بہارِ زندگی
زندگی سے تجھ کو کتنا پیار ہے
ذات تیری قابلِ صد احترام
کس کو تیرے کام سے انکار ہے
نونہالانِ وطن کا پاسباں
تیرے ہی دَم سے وطن گلزار ہے
پتھروں کو تو بناتا ہے گُہر
واقعی کتنا بڑا فن کار ہے
علم کیا ہے؟ روشنی ہی روشنی
اور مُعلّم اُس کا اِک مینار ہے
یہ تری خدمات کا ہے ماحصل
کوئی لیڈر ہے کوئی سردار ہے
کوئی مانے یا نہ مانے اے حسن
ہر مُعلّم قافلہ سالار ہے



ایک لوک کہانی

جناب قاضی کلیم جودھپوری

گاؤں کے یہ گنوار لوگ

بات زیادہ پُرانی نہیں ہے۔ راجستھان کے ایک گاؤں میں ایک نیا حوالدار پہنچا۔ اس کا لباس تو بڑا صاف سُتھرا تھا مگر دل صاف نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ گاؤں کے لوگ بالکل ناسمجھ اور گنوار ہوتے ہیں۔ اُن کو دونوں ہاتھوں سے لوٹوں گا۔ اناج کی جگہ اناج، گھی کی جگہ گھی۔ چارہ اور ایندھن تو کسی شمار میں نہیں، سار بانوں یا اونٹ والوں سے اونٹ کی جٹ (اون) کے کمبل اور جولاہوں سے کپڑے۔ بس مزا آجائے گا۔

غرض مونچھیں چڑھائے اور ہاتھ میں چاندی کی موگری والی چھڑی لیے وہ گاؤں کی چوپال کے نزدیک اپنے اونٹ سے نیچے اُترا بڑی شان سے اُترا۔ پر بستی کے لوگوں نے یہ محسوس کر لیا کہ حولدار کے لچھن کچھ اچھے نہیں ہیں۔ شروع میں انکساری اور عاجزی سے کام لیا تو حولدار جی ایک ایک کو چوس کر کھا جائیں گے۔

چوپال میں اپنا ڈیرا جما کر حولدار نے اپنے سر اور گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ بال کچھ کچھ بڑھے ہوئے تھے۔ اس کو حجامت بنوانے کا خیال آیا۔ یوں تو وہ عمر رسیدہ تھا۔ کالے بالوں میں سے سپیدی جھانکنے لگی تھی۔ پر وہ روزانہ حجامت بنوا کر گاؤں والوں پر اپنا رعب جمانا چاہتا تھا۔ اپنی چھڑی کو گھماتے ہوئے اس نے ایک دیہاتی سے کہا "فوراً ایک حجام کو بلا لاؤ

گاؤں کے چودھری نے سوچا "یہ موقع اچھا ہے اسے ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے" اس نے ایک حجّام کو اچھی طرح سمجھا بُجھا کر حوَلدار جی کے پاس بھیج دیا۔

حولدار صاحب حجامت بنوانے بیٹھ گئے۔ بہت اکڑے ہوئے تھے۔ حجّام نے اپنی پیٹی سے اُسترا اور سان کے ساتھ میدے سے بھری ایک کٹوری نکالی تو حوَلدار جی نے پوچھا "اِس کٹوری میں کیا ہے؟" حجّام نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ "حضور! یہ میدہ ہے، اس کو میں نے بڑی احتیاط سے باریک ململ سے چھانا ہے۔"

حولدار نے بڑے تعجب سے کہا "حجامت بنانے میں میدے کا کیا کام ہے؟" حجّام نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "حضور! یہ میدہ تو گاؤں میں سب سے عمدہ چیز ہے۔ یہاں شہر جیسے نہ تو بڑھیا اوزار ہیں نہ ہوشیار کاریگر، کُند اُسترے اور اناڑی حجاموں کی لاج یہ میدہ ہی رکھتا ہے۔ حجامت بناتے وقت جگہ جگہ خراشیں آئیں گی تو یہ میدہ ان میں بھرنا پڑے گا۔ آپ کو زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں، چار پانچ روز میں خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہاں کے سب لوگ اس کے عادی ہیں۔ آپ کو پہلے پہل کچھ تکلیف ضرور ہوگی لیکن کچھ دنوں کے بعد آپ بھی اس کے عادی ہو جائیں گے۔"

حوَلدار نے غصّے میں آ کر کہا "دُور پھینک اپنے اس میدے کو، مجھے اس کا عادی نہیں ہونا ہے۔ چل دُور ہو۔ کسی دوسرے ہوشیار حجّام کو بھیج۔ ہے کوئی؟"

اپنی پیٹی بند کرتے ہوئے حجّام نے کہا۔ "ہے کیوں نہیں حضور! اس گاؤں میں حجاموں کے تین گھر ہیں۔ ہوشیار تو میں بھی ہوں لیکن آپ کا حکم سر آنکھوں پر، ابھی دوسرا حجّام حاضر کرتا ہوں لیکن اَن داتا! کبھی کبھی مجھے بھی حاضری کا موقع دیجیے گا۔" حوَلدار نے اپنے رُخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا — "میرے جسم میں فالتو خون نہیں ہے۔ اِس گاؤں کا دُودھ، گھی کھانے سے خون زیادہ بڑھے گا، تو تجھے یاد کروں گا۔"

دوسرا حجّام مسکراتا ہوا حاضر ہوا اور ادب سے بیٹھ گیا۔ اپنے اُسترے کی دھار تیز کرنے کے بعد، اس نے اپنی پیٹی سے سُوئی اور دھاگا نکالا۔ حولدار فوراً بول پڑا — "کیا تو درزی کا کام بھی جانتا ہے؟" حجّام نے عاجزی سے

جواب دیا ــــ "ان داتا! پیٹ بڑا پاپی ہے، سو کام سیکھنے پڑتے ہیں۔ میں سوئی اُسترے سے زیادہ بہتر چلا سکتا ہوں۔ حولدار نے خوش ہو کر کہا ــــ "پھر تو تو ہی روزانہ یہاں حاضری دے جایا کر، ہمیں بہت سے کپڑے بھی سلوانے ہیں۔"

حجام بولا ــــ "حضور! میں کپڑے سینے کا کام نہیں کرتا، میرے ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ اُسترے سے چمڑی چھل جائے تو میں اسی وقت سوئی سے سی ڈالتا ہوں۔ اس کام میں میرے جیسا ماہر آس پاس کے کسی گاؤں میں نہیں ہے۔ پہلی بار تکلیف ضرور ہو گی حضور، لیکن بعد میں آپ برداشت کر لیں گے۔ گاؤں والوں کے تو بڑے بڑے ٹانکے لگا لیتا ہوں لیکن آپ جیسے امیروں کے ویسے ٹانکے نہیں چلیں گے۔ اِس بات سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ ایک دفعہ آپ میرے ہاتھ کی کاری گری تو دیکھیے۔"

حولدار نے غصّے میں آکر کہا ــــ "اپنی یہ کاری گری یہاں کے دیہاتی جانوروں ہی کو دکھا۔ بھاگ یہاں سے اور کسی ہوشیار حجام کو بھیج۔"

تیسرا حجام حولدار کو کچھ ہوشیار کاری گر دکھائی دیا۔ نہ تو اس کی پیٹی میں میدہ تھا نہ سوئی دھاگا۔ وہ امیر کی ٹھوڑی کے نیچے گردن پر پانی لگا کر مسلنے لگا۔ کافی دیر تک مسلتا رہا تو چمڑی میں جلن ہونے لگی۔ حولدار چلا اُٹھا ــــ "ارے کم بخت! ایک ہی جگہ پر اتنی دیر سے کیا رگڑ رہا ہے۔ میری تو ساری چمڑی چھل گئی!"

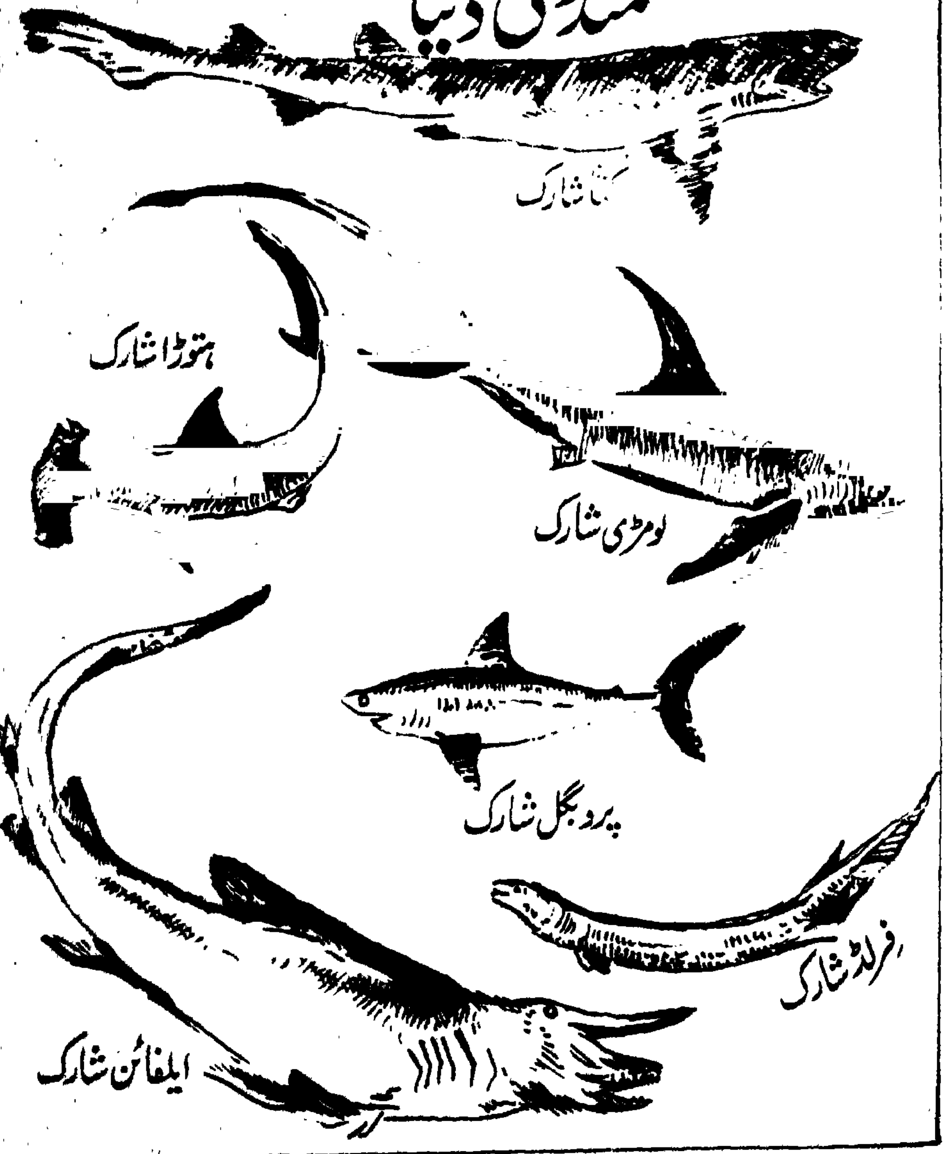
حجام ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا ــــ "ان داتا! میں پہلے ٹھوڑی کے نیچے ہی سے حجامت شروع کرتا ہوں۔ اگر یہاں ٹھیک ڈھنگ سے حجامت بن جائے تو پھر آگے بڑھتا ہوں۔ ایک دفعہ ایک آدمی کا سر مونڈنے کے بعد جب داڑھی بنا رہا تھا تو اس کا گلا ہی کٹ گیا۔ سر مونڈا ہوا بے کار گیا۔ مجھے مرگی کا مرض ہے حضور، گلے اور گالوں سے فارغ ہو کر سر مونڈتا ہوں۔ سر مونڈنے کے بعد گلا کٹ جائے تو میری ساری محنت تو بے کار ہی جاتی ہے۔"

حجام کی یہ بات سن کر حولدار کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ گاؤں ہے کہ مصیبت۔ بھلا کوئی بھلا آدمی یہاں رہ سکتا ہے۔

حولدار اُسی دن شام کو جس راستے سے آیا تھا، اُسی راستے سے روانہ ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد اونٹ کے نشانات بھی مٹ گئے۔

جناب گلیڈون میسی

سمندر کی دُنیا



اظہر افسر



حسن گنگوہمنی

منظر

دس بارہ سال کی عمر کے دو بچے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، ایک کا نام سعید ہے دوسرے کا شنکر — شنکر سعید کا ہاتھ دیکھ رہا ہے۔

شنکر: ہوں۔ ہوں۔

سعید: اب ہوں ہوں ہی کروگے یا کچھ بتاؤ گے بھی۔

شنکر: بتاتا ہوں یار ٹھہرو۔ ہوں۔ سچ مچ بڑا اچھا ہاتھ ہے، بہت صاف لکیریں ہیں، عمر بھی کافی لمبی ہے، اوہ کہاں تک چلی گئی ہے یہ لکیر

سعید: کچھ پڑھائی کے بارے میں بتاؤ یار عمر کو چھوڑو۔

شنکر: تعلیمی حالت تو تمہاری بہت اچھی ہے۔ اب بھی عمدہ ہے آئندہ بھی بڑی جلدی جلدی ترقی کروگے۔ محنتی بھی ہو اور دیانت دار بھی۔ اور

سعید: اور کیا۔

شنکر: تمہاری ہتھیلی کی داہنی طرف ایک لکیر بڑی عجیب سی آگئی ہے، یہ لکیر بتاتی

ہے کہ تم پڑھائی کے بعد ایک بہت
بڑے آدمی بنوگے ۔ بہت بڑے ۔
ہاتھ کی لکیریں کبھی غلط نہیں کہتیں ۔

سعید: نہیں یار، سب کہنے کی باتیں ہیں ۔

شنکر: میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں ۔ چاچا جی
کے پاس ان ہاتھ کی لکیروں پر بڑی
موٹی موٹی کتابیں ہیں ۔

سعید: تو تم نے یہ سب انہی سے سیکھا ہے ۔

شنکر: ہاں، اور ساری باتیں کم سے کم میں نے
تو سچ پائیں ۔

سعید: میں اور بڑا آدمی (ہنستا ہے)

شنکر: کیوں نہیں، تم ایک نہ ایک دن ضرور
بڑے آدمی بنوگے ۔

سعید: تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے گنگو جوتشی
نے حسن سے کہا تھا ۔

شنکر: حسن سے، کون حسن؟ وہ جو پچھلے سال
فیل ہوگیا ۔

سعید: (قہقہہ لگاتا ہے) نہیں بھائی وہ نہیں
میں تو حسن گنگو بہمنی کی بات کر رہا ہوں

شنکر: حسن گنگو بہمنی؟ کون تھا وہ؟

سعید: آج سے کوئی چھ سو سال پہلے کی

ہے کہ دلّی پر سلطان محمد تغلق کی حکومت
تھی، اور محمد تغلق کے دربار میں گنگو مہاراج
نامی ایک بڑا ماہر جوتشی تھا ۔ اسی جوتشی
کے ہاں حسن نامی ایک نوجوان نوکر تھا ۔

شنکر: میرا خیال ہے، حسن گنگو بہمنی تو بادشاہ
گزرا ہے کوئی ۔

سعید: جی ہاں، جی ہاں ۔ اُسی بادشاہ کا حال
تو میں آپ کو سُنا رہا ہوں حضور ۔ حسن کو
گنگو جوتشی ہی نے بتایا تھا ہاتھ دیکھ کر
کہ تم ایک دن ضرور بادشاہ بنوگے ۔
آپ تاریخ پڑھتے ہیں اور سب کچھ
بھول جاتے ہیں ۔

گنگو: (تھال ہٹاتے ہوئے) سچ، یہ تو اشرفیوں
سے لبالب بھرا ہے، کہاں سے اٹھا لائے؟

حسن: یہ دیگ آپ ہی کی ہے مہاراج ۔ آج
ہل چلاتے وقت میرے ہل کا پھل مٹی میں
ایک جگہ بار بار رُک جاتا تھا میرا خیال
تھا شاید کوئی پتھر ہوگا ۔ کدال سے میں نے
جوں ہی زمین کو کھودا ــــ تو ــــ تو یہ
دیگ نکل آئی ۔

گنگو: حسن جانتے ہو یہ کتنے روپے ہیں ۔

حسن: جتنے بھی ہوں مہاراج ــــ آپ کے ہیں ۔

سارا کام یہی حسن سنبھالتا تھا۔ ایک دن حسن کے ہاتھ کی لکیروں کی طرف گنگو جوتشی نے بڑے غور سے دیکھا اور اسے پاس بلایا۔

منظر ۲

قدیم طرز کا ایک چھوٹا سا مکان
گھر کے تخت پر گنگو جوتشی بیٹھا ہے۔
حسن پسینے میں تر بتر ہاتھ منہ
دھو رہا ہے۔

گنگو: حسن، ذرا یہاں تو آؤ۔

[illegible]
دیکھ رہا ہے۔

شنکر: ہوں۔ ہوں۔

سعید: اب ہوں ہوں ہی کروگے یا کچھ بتاؤ گے بھی۔

شنکر: بتاتا ہوں یار ٹھہرو۔ ہوں۔ بیچ بیچ بڑا اچھا ہاتھ ہے، بہت صاف لکیریں ہیں، عمر بھی کافی لمبی ہے، اُف وہ کہاں تک چلی گئی ہے یہ لکیر۔

سعید: کچھ پڑھائی کے بارے میں بتاؤ یار

حسن: کیا سوچ رہے ہیں مہاراج آپ۔

گنگو: حسن تمھارا ہاتھ ایک بادشاہ کا ہاتھ ہے۔

حسن: مہاراج۔

گنگو: تمھارے ہاتھ کی لکیریں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ تم ـــــ ایک دن ـــــ کہ تم ایک دن بادشاہ بنوگے۔

حسن: بادشاہ ـــــ ارے نہیں مہاراج۔

گنگو: ہاں ـــــ حسن ہاں۔ تم بادشاہ بنوگے۔ میرا جوتش کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ بس یہ بتاؤ تم بادشاہ بن گئے تو مجھے کیا دوگے۔

حسن: میں ـــــ میں۔

گنگو: ہاں ہاں، بتاؤ اگر تم کسی دن بادشاہ بن گئے، تو مجھے کیا دوگے۔

حسن: تو میرے دربار کے آپ ہی وزیر ہوائے مہاراج ـــــ مگر ـــــ مگر مجھے آپ فرمائیں مجھ سے بھول ہو گئی ـــــ میں

گنگو: نہیں نہیں، اس میں بھول کی کیا بات ہے، ہاتھ کی لکیریں کبھی دھوکا نہیں دے سکتیں۔ خیر ـــــ دیکھا جائے گا۔

یہ بتاؤ، ہماری زمینوں کا کیا حال ہے۔
حسن۔

حسن: (چونک کر) ہاں مہاراج۔

گنگو: (مسکراتے ہوئے) ہماری زمینوں کا کیا حال ہے حسن۔

حسن: جی، پورب والے حصّے کی ساری زمین پر میں نے ہل چلا دیا ہے۔ کل باقی ٹکڑے پر بھی اچھی طرح ہل چلا کر زمین کو بوائی کے لائق بنا دوں گا۔

گنگو: باقی بچی ہوئی زمین تو بڑی سخت اور پتھریلی ہے۔

حسن: کوئی حرج نہیں مہاراج، کل کام ختم ہو جائے گا۔ اس میں ہم تل اور ارنڈ بو دیں گے۔

گنگو: اُوہ، باتوں باتوں میں شاہی محل میں حاضر ہونے کا وقت بھی آ پہنچا۔ اچھا جاؤ تم بھی آج بہت تھک گئے ہو۔

منظر ۳

گنگو مہاراج کے گھر کا وہی حصّہ ہے جو منظر ۲ میں تھا۔ حسن تانبے کی ایک بہت بڑی دیگ سر پر لیے ہانپتا ہوا داخل ہوتا ہے۔
گنگو، حسن کو دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ــــ

گنگو: حسن یہ کیا چیز ہے تمھارے سر پر۔ ٹھہرو ٹھہرو اسے نہ اُتارو، میں سہارا دیتا ہوں۔
(گنگو اور حسن دیگ نیچے رکھتے ہیں)

گنگو: کیسی دیگ ہے؟

حسن: اس میں اشرفیاں بھری ہیں مہاراج ــــ تھال ہٹا کر دیکھیے۔

گنگو: (تھال ہٹاتے ہوئے) ہیں یہ تو اشرفیوں سے لبالب بھرا ہے، کہاں سے اٹھا لائے؟

حسن: یہ دیگ آپ ہی کی ہے مہاراج۔ آج ہل چلاتے وقت میرے ہل کا پھل مٹّی میں ایک جگہ بار بار رُک جاتا تھا میرا خیال تھا شاید کوئی پتھر ہوگا۔ کدال سے میں نے جوں ہی زمین کو کھودا ــــ تو ــــ تو یہ دیگ نکل آئی۔

گنگو: حسن جانتے ہو یہ کتنے روپے ہیں۔

حسن: جتنے بھی ہوں مہاراج ــــ آپ کے ہیں۔

گنگو: حسن! تم نے دیانت اور ایمان داری کی ایک ایسی مثال میرے سامنے رکھی ہے کہ میرا دل اس وقت دولت سے زیادہ تمھاری سچائی پر خوشی سے جھوم رہا ہے۔ تم اگر چاہتے تو سات روپے ماہوار کی نوکری چھوڑ کر اشرفیوں سے بھری ہوئی یہ دیگ کہیں بھی لے جا سکتے تھے۔ ساری عمر عیش و آرام سے بسر کر سکتے تھے۔ حسن، مجھے تم پر ناز ہے۔ سچ مچ تم ایک بہت بڑے آدمی ہو۔ تم ضرور بادشاہ ہوگے۔ میرا جوتش غلط نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔

منظر ۴

سلطان محمد تغلق کا شاہی محل۔
سلطان محمد تغلق کے آگے گنگو اور حسن ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔

تغلق: گنگو مہاراج۔

گنگو: عالم پناہ۔

تغلق: ہم تمھارے اس دیانت دار ملازم حسن کا حال سن کر بہت متاثر ہوئے۔ سچ مچ حسن نے اپنی ایمان داری کا بے مثال ثبوت دیا ہے۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ بے حد خوش ہوئے۔ ہمارے دربار میں ایسے ہی محنتی اور دیانت دار آدمیوں کی ضرورت ہے۔ گنگو مہاراج ہم تم سے کچھ چاہیں تو ہمیں ملے گا۔

گنگو: حکم ہو عالم پناہ۔ داس اور داس کی ہر چیز عالم پناہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

تغلق: ہمیں حسن چاہیے۔

گنگو: حسن کورنش بجا لاؤ۔

حسن: عالم پناہ (حسن کورنش بجا لاتا ہے)

تغلق: آج سے تم شاہی ملازم ہو، سات سو سواروں کے فوجی افسر ہو۔ اور گنگو مہاراج تمھیں سات گاؤں دیے گئے۔

گنگو: (سر جھکا کر) عالم پناہ کا اقبال بلند ہو۔

حسن: (سر جھکاتے ہوئے) عالم پناہ کا اقبال بلند ہو۔

منظر ۵

پہلے منظر کی طرح شنکر اور سعید بیٹھے ہیں۔

سعید: اس طرح سات روپے ماہوار پانے والا غریب حسن سات سو سواروں کا فوجی افسر ہو گیا۔ اور جب دکن میں شورش ہوئی، کچھ باغی سرداروں نے حکومت کے خلاف سر اٹھایا تو سلطان محمد تغلق نے حسن کو ایک بڑی بھاری فوج کے ساتھ دکن کی طرف روانہ کیا۔

شنکر: دکن کی طرف روانہ کیا حسن کو؟

سعید: ہاں دکن پہنچنے پر دکن کے باغی سرداروں نے حسن کی بڑی آؤ بھگت کی اور سب نے ایک ساتھ فیصلہ کیا کہ دکن پر حکومت حسن ہی کی ہونی چاہیے ——— ۱۳۴۷ء میں حسن نے اپنے پرانے مالک کی یاد میں حسن گنگو بہمنی کے نام سے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور دکن میں بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

شنکر: بھئی واہ ——— کیا خوب۔

سعید: سلطان محمد تغلق نے دکن میں اپنا پایۂ تخت دولت آباد قرار دیا تھا۔ لیکن حسن گنگو بہمنی نے دولت آباد کی بجائے گلبرگہ کو دکن کا پایۂ تخت بنایا۔ اور اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد قاصدوں کو دلی روانہ کیا کہ وہ گنگو مہاراج کو نہایت عزت اور شان کے ساتھ دکن کی راج دھانی گلبرگہ لے آئیں کیوں کہ وہی اب دکن کی بہمنی سلطنت کے وزیر ہیں۔

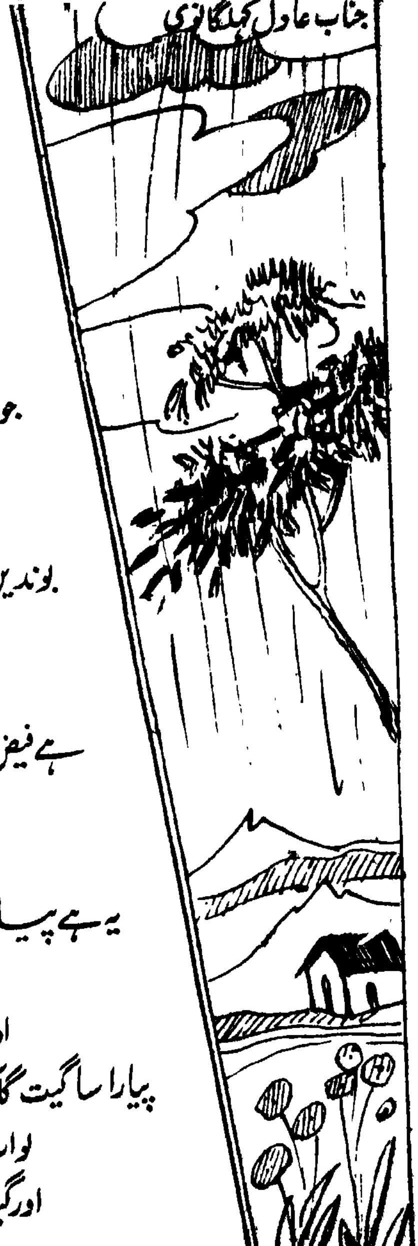
شنکر: اسی لیے تو کہتا ہوں میرے بھائی کہ تمہارے ہاتھ کی لکیریں صاف بتا رہی ہیں کہ ایک نہ ایک دن تم ہمارے دیس کے منسٹر بنو گے اور اپنے پیارے دوست شنکر جوتشی کو یاد کرو گے۔

سعید: ضرور ضرور۔ بھلا کوئی اپنے پیارے دوست کو بھول سکتا ہے۔ کبھی نہیں۔

(پردہ گرتا ہے)



جناب عادل کھلگانوی



برسات

میداں، پہاڑ، دریا   گُلشن ہو یا کہ صحرا
دل کش بنا رہی ہوں
اور گیت گا رہی ہوں

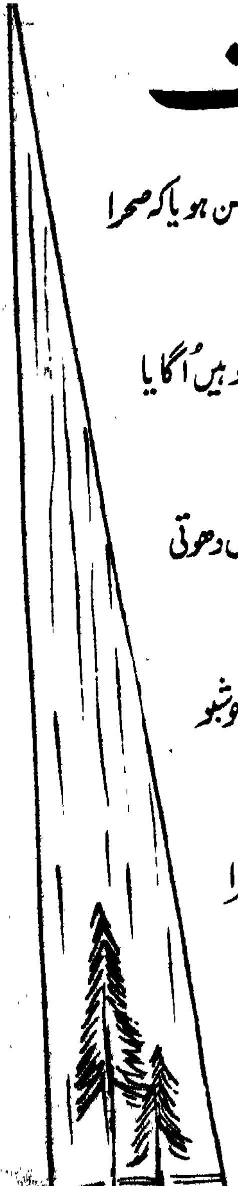
جو ریگ زار پایا   سبزہ وہیں اُگایا
رونق بڑھا رہی ہوں
اور گیت گا رہی ہوں

بوندیں ہیں جیسے موتی   ہر باغ کو ہیں دھوتی
اور حُسن لا رہی ہوں
اور گیت گا رہی ہوں

ہے فیض میرا ہر سُو   ہر جا ہے میری خوشبو
رحمت لُٹا رہی ہوں
اور گیت گا رہی ہوں

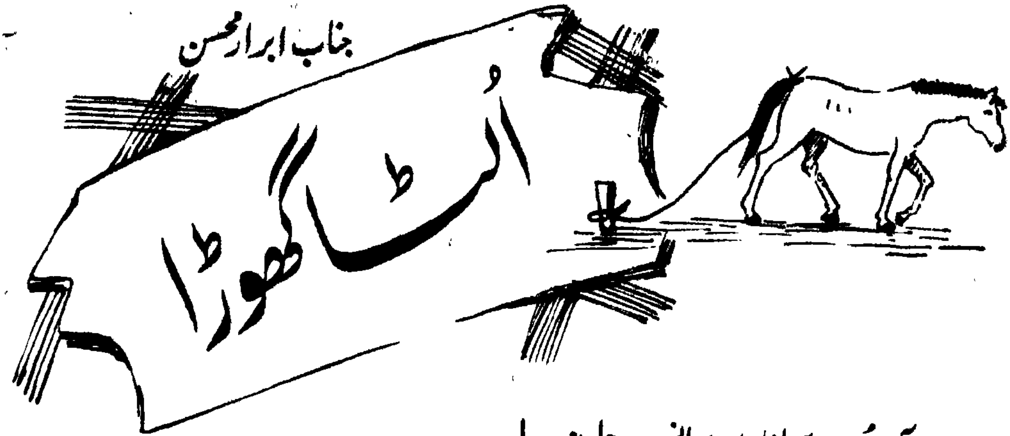
یہ ہے پیام میرا   ہے فیضِ عام میرا
سب کو سُنا رہی ہوں
اور گیت گا رہی ہوں

پیارا سا گیت گا کر   سب کو میں خوش بنا کر
لو اب میں جا رہی ہوں
اور گیت گا رہی ہوں



اُلٹا گھوڑا

جناب ابرار محسن



آج اُسے بیچ بازار میں پھانسی دی جانے والی تھی۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ لوگ بڑے اشتیاق سے اُچک اُچک کر اُسے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سارے ملک میں اس کا نام شیطان کی طرح مشہور تھا۔ بادشاہ کے سپاہیوں نے بڑی مشکل سے اُسے گرفتار کیا تھا۔ ورنہ وہ تو ایک چھلاوہ تھا۔ بے انتہا پھرتیلا اور بلا کا ہوشیار۔ مجال ہے جو کوئی اس کا ہاتھ بھی پکڑ سکتا۔ لیکن آج وہی شاطر پھانسی کے پھندے کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ پیروں میں لوہے کے وزنی کڑے پہنا دیے گئے تھے۔

نام تو اس کا کچھ اور تھا پر وہ مشہور تھا چار سو بیس کے نام سے۔ اس کی حرکتوں ہی کی وجہ سے لوگوں نے اُسے یہ نام دیا۔ اس نے عجیب عجیب طریقوں سے لوگوں کو دھوکا دیا تھا۔ اکثر لوگ اس کی ذہانت کی تعریف بھی کرتے تھے لیکن زیادہ تر لوگ اس سے نالاں تھے۔ اُس نے بڑے بڑے ہوشیار لوگوں کو وہ وہ چکمے دیئے تھے جو معمولی ذہانت کے لوگوں کے بس کی بات نہ تھی۔ آج سب لوگ اس کے چاروں طرف کھڑے دانت پیس رہے تھے۔

پھانسی کا وقت قریب آگیا تھا صرف بادشاہ کے آنے کی دیر تھی۔ اچانک مجمع میں شور ہوا "بادشاہ سلامت آگئے۔ ہوشیار۔ خبردار"

بادشاہ اپنی بارہ ۱۲ گھوڑوں والی گاڑی

سے اُتر کر چارسو بیس کے قریب پہنچا اور بلند آواز میں لوگوں سے کہا: "تم سب اسے اچھی طرح پہچانتے ہو۔ یہ وہی ہے جس نے طرح طرح سے لوگوں کو دھوکا دیا ہے اور انھیں اُلّو بنایا ہے یہی وہ چارسو بیس ہے جس کی تلاش میں ہمارے سپاہی برسوں مارے مارے پھرے ہیں۔ آخر کار ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس کی ساری چالاکی دھری رہ گئی اور آج وہ تمھارے سامنے موجود ہے۔ پھانسی کا پھندا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ بس چند ہی لمحوں میں اس کی لاش جھولتی ہوئی دکھائی دے گی اور ہماری رعایا کو اس کے ہتھکنڈوں سے نجات مل جائے گی۔"

یہ کہہ کر بادشاہ چارسو بیس سے مخاطب ہوا "ہمارے ملک میں ایک دستور ہے کہ پھانسی دینے سے پہلے مجرم کی آخری خواہش ضرور پوری کی جاتی ہے اگر وہ قابلِ قبول ہو۔ بولو، تمھاری کیا خواہش ہے؟"

چارسو بیس نے بادشاہ کی بات سن کر اپنا اُداس چہرہ اوپر اٹھایا اور صرف ایک ٹھنڈی سانس بھر کر گردن پھر جھکا لی۔

"ہم تمھاری آخری خواہش سننے کے منتظر ہیں۔" بادشاہ نے گرج کر کہا۔

"اے بادشاہ!" چارسو بیس نے دھیرے سے کہا "اب خواہش بتانے سے کیا فائدہ۔"

بادشاہ نے طیش میں آکر کہا "بدمعاش وقت کیوں برباد کر رہا ہے۔ جلدی سے اپنی آخری خواہش بتا۔"

"ہائے میرا اُلٹا گھوڑا بے چارہ اکیلا رہ جائے گا!" چارسو بیس بڑبڑایا۔

"کیا کہا" بادشاہ نے اس کے قریب آکر کہا "اُلٹا گھوڑا۔ کیا مطلب؟"

چارسو بیس نے سر جھکا کر کہا "حضور مجھے اپنی موت کا غم نہیں، نہ میری کوئی خواہش ہے۔ بس ایک یہی غم ہے کہ میرے بعد میرے اُلٹے گھوڑے کا کیا ہوگا۔"

"کیسی عجیب باتیں کرتا ہے!" بادشاہ نے جھنجھلا کر کہا "اُلٹے گھوڑے سے تیرا کیا مطلب ہے؟ اُلٹا گھوڑا کیسا ہوتا ہے؟"

"حضور، میں کیسے بتاؤں، میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔" چارسو بیس نے رُوہانسا ہو کر کہا۔

بادشاہ کے حکم سے اس کے ہاتھ کھول دیے گئے

"ہاں اب بتاؤ۔" بادشاہ بولا۔

"حضور یہاں سب کے سامنے۔" چارسو بیس نے بادشاہ کے کان میں کہا۔

بادشاہ اُلٹے گھوڑے کے متعلق جاننے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے زور سے لوگوں سے کہا "پھانسی آج نہیں دی جائے گی۔"

اور وہ چارسو بیس کو اپنی بارہ گھوڑوں والی گاڑی میں بٹھا کر محل کی طرف لے چلا۔ سب لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ آخر ایک دم بادشاہ کو کیا ہوگیا۔ پھانسی کیوں روک دی؟ اس بدمعاش کو اپنے ساتھ کیوں لے گیا؟ غرض کہ لوگ بادشاہ کو بُرا بھلا کہتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

بادشاہ چارسو بیس کو محل میں اپنے خاص کمرے میں لے گیا۔

"ہاں اب بتاؤ یہ اُلٹا گھوڑا کیسا ہے؟" اُس نے سوال کیا۔

چارسو بیس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "حضور! گستاخی معاف۔ یہ گھوڑا میں آپ ہی کے لیے جان کو ہتھیلی پر رکھ کر لایا تھا۔ مگر وہ بہت کمزور تھا۔ سوچا کچھ دنوں اپنے پاس رکھ کر اسے کھلاؤں پلاؤں اور جب اُس میں کچھ دَم آجائے تو آپ کے حوالے کردوں۔ لیکن اسی عرصے میں حضور کے سپاہیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ ہائے بے چارہ اُلٹا گھوڑا بھوکا پیاسا مرجائے گا۔"

چارسو بیس سسکیاں لے کر رو رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو لگاتار بہہ رہے تھے۔

بادشاہ نے اُسے دلاسا دیا "گھبراؤ نہیں۔ اُلٹا گھوڑا بھوکا پیاسا نہیں مرے گا۔ لیکن تم یہ تو بتاؤ کہ وہ اُلٹا کس طرح ہے؟"

چارسو بیس نے بادشاہ کے کان کے پاس مُنہ لے جاکر کہا "بادشاہ سلامت اُس گھوڑے کی گردن دُم کی جگہ ہے اور دُم گردن کی جگہ۔ یہ اُلٹا نہیں تو اور کیا ہے؟"

"کمال ہے" بادشاہ حیرت سے چلّایا۔ "خدا کی قسم اگر واقعی یہ بات ہے تو تم وہ عجیب گھوڑا ہمیں دے دو۔ ہم تمھاری سزا معاف کردیں گے۔ چلو ابھی ہمیں دکھاؤ۔"

"نہیں سرکار" اس نے کہا "پہلے مجھے جانے دیں۔ ایک گھنٹے بعد آپ میرے گھر تشریف لے آئیں۔"

بادشاہ "اگر دھوکا دینے کی کوشش کی تو

چار سو بیس "آپ سپاہیوں کو حکم دیں کہ وہ میرے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیں تاکہ میں بھاگ نہ سکوں۔

بادشاہ نے کچھ دیر سوچ کر چار سو بیس کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

ایک گھنٹے کے بعد بادشاہ بھی چار سو بیس کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا "ایسا عجیب و غریب گھوڑا پا کر مجھے کس قدر خوشی ہوگی۔ ایسا گھوڑا تو کسی نے آج تک سنا بھی نہ ہوگا"

بادشاہ چار سو بیس کے گھر پہنچ گیا۔ اس گھر کو سپاہیوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ بادشاہ کے پہنچتے ہی چار سو بیس گھر سے باہر نکل آیا اور جھک کر سلام کیا۔

"کیوں بھئی چار سو بیس" بادشاہ نے اُس سے پوچھا "دکھاؤ وہ گھوڑا کہاں ہے؟"

"آیئے سرکار" چار سو بیس نے جواب دیا "اندر آیئے"

چار سو بیس بادشاہ کو گھر کے اندر لے گیا۔ ایک کمرے کے اندر ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ جس کی گردن کے بجائے دُم میں لگام بندھی ہوئی تھی اور گردن دوسری طرف تھی۔ در اصل چار سو بیس نے گھوڑے کی گردن کے بجائے دُم میں لگام باندھ دی تھی اور اس طرح گھوڑے کو اُلٹا کھڑا کر دیا تھا۔

بادشاہ آگ بگولا ہو گیا۔ چار سو بیس نے اُسے بھی دھوکا دیا تھا۔ اُس نے میان سے تلوار نکالی کہ اسی وقت چار سو بیس کا خاتمہ کر دے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے کچھ سوچ کر تلوار کو میان میں رکھتے ہوئے کہا۔

"چار سو بیس تمھاری عقل مندی کو ہم مانتے ہیں۔ تم جیسا عقل مند آدمی ہمارے لیے بڑا کارآمد ہوگا۔ آج سے تم ہمارے وزیر ہو"

چار سو بیس وزیر بن گیا اور آئندہ لوگوں کو دھوکا نہ دینے کی قسم کھائی۔

(صرف خیال جرمن کہانی سے لیا گیا)



جناب سعادت صدیقی نئی دہلی

بی مکھّی نے رام کہانی کہی

ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک کونے سے بھنبھناہٹ کی آواز آنے لگی۔ پڑھنا دُشوار ہوگیا۔ ادھر جو نظر اٹھائی تو بی مکھّی بیٹھی نظر آئیں۔ انھی کے پاس مچھّر صاحب بھی براجمان تھے۔ دونوں میں کچھ کھُسر پُھسر ہورہی تھی۔ میں نے اپنے کان لگادیے۔ غور سے ان کی باتیں سُننے لگا۔

مچھّر: اہاہ! بی مکھّی کہیے مزاج تو اچھے ہیں بہت دنوں بعد نیاز حاصل ہوا۔ کیسے بھول پڑیں......؟

مکھّی: کیا کہوں بھائی؟ زمانہ ایسا آگیا ہے کہ انسان تو انسان ہم جانداروں کو بھی کھانا میسّر نہیں۔ آج کئی دن سے اسی تلاش میں گھوم رہی تھی کہ کہیں کچھ مل جائے تو پیٹ بھروں۔ خدا خدا کرکے ابھی تھوڑا سا کھانے کو مل گیا تو پیٹ کی آگ بُجھی۔ ورنہ خدا جانے آج کیا حشر ہوتا؟

مچھّر: میں تو سمجھتا تھا کہ میں ہی فاقہ مست اور مصیبت زدہ ہوں مگر آپ بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ خیر یہ رونا تو روز ہی کا ہے۔ اس وقت ہم کو اور آپ کو اطمینان ہے۔ کوئی کہانی کہیے۔ آپ کی میٹھی زبان مجھے بہت بھاتی ہے۔

مکھّی: "کہانی وہانی کیا کہوں ۔؟ زمانے کی گردش نے سب کچھ بُھلادیا ۔ اب تو اپنی ہی کہانی یاد رہ گئی ہے ۔ کہو تو سنادوں ؟"

مچھّر: "واہ بی مکھّی واہ ۔ اس سے بڑھ کر اور کون اچھّی کہانی ہوگی ۔ جو مزہ 'رام کہانی' میں ہے وہ دوسرے کی کہانی میں کہاں ؟ ضرور سنایئے ۔

مکھّی: "میری کہانی ہی کیا ؟ چند دن زندگی اور اس زندگی کے واقعات ہیں ۔ تم نہیں مانتے تو سنو ۔

کوئی زمانہ تھا جب دُنیا میں مجھ سے زیادہ خوش نصیب کوئی بھی جانور نہ تھا ۔ ہر مُلک میں میری کثرت تھی ۔ ہر جگہ میرے کھانے کے لیے جتنی افراط اور آسانیاں تھیں اتنی کسی بھی جانور کو نہ تھی ۔ آپ جانیے دنیا کی ساری گندی چیزیں مرغوب ہیں ـــــ گھوڑے کی لید تو میری من بھاتی غذا ہے ۔ لیکن جب سے ان موئے ڈاکٹروں اور حکیموں کی زیادتی ہوئی ہے اور سائنس کی تعلیم عام ہوئی ہے میری مرن ہوگئی ہے ۔ کیوں کہ صحت کے لیے صفائی بہت ضروری ہے ۔ اس لیے پڑھے لکھے لوگ اب صفائی کا بہت خیال رکھنے لگے ہیں ۔ اور بھلا جہاں صفائی ہو ۔ وہاں میرا گذر کہاں ! یہی وجہ ہے کہ اب صرف غریبوں کے محلّوں، دیہاتوں اور گندی جگہوں پر ہماری بُہتات ہوتی ہے ۔ شہروں اور صاف ستھری جگہوں پر ہمارا نام و نشان نظر نہیں آتا ۔"

مچھّر: بی مکھّی اب تک آپ نے جتنی کہانی سنائی ہے وہ غذا، اور جائے رہائش سے متعلّق ہے ۔ یہ تو بتائیے کہ مکھّی کی پیدائش اور پھر پرورش کیسے ہوتی ہے ؟

مکھّی: "ذرا صبر کرو، ابھی بتاتی ہوں ۔ تم نے اکثر غور کیا ہوگا کہ برسات کے دنوں میں مکھیوں کی بہت زیادتی ہوجاتی ہے ۔ اور یہ اس لیے کہ برسات میں گندگی بہت بڑھ جاتی ہے ۔ گندگی اور کوڑے کرکٹ والے مقامات پر مادہ مکھیاں بہت زیادہ تعداد میں انڈے دے دیتی ہیں ـــــ سائنس دانوں کے کہنے کے مطابق مادہ مکھّی ایک بار میں ۱۰۰ سے ۱۵۰ تک انڈے

دیتی ہے۔ یہ انڈے تقریباً ایک ملی میٹر لمبے ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں سفید اور چمکدار معلوم ہوتے ہیں۔ ۸ سے ۲۴ گھنٹے کے وقفے کے بعد ہر انڈے سے ایک چھوٹا سا کیڑا نکل آتا ہے جسے لاروا (LARVA) کہتے ہیں۔ یہ کیڑا بیلن کی شکل کا ہوتا ہے دونوں سرے نکیلے ہوتے ہیں۔ اس کے ۱۳ حصے ہوتے ہیں اور ٹانگیں نہیں ہوتیں پھر بھی یہ اِدھر اُدھر رینگ سکتا ہے۔ اس کے اگلے سرے پر ایک چھوٹا سا مُنھ ہوتا ہے جس کے پاس ایک کالا سا کانٹا ہوتا ہے جو کھانے کے لیے کام میں آتا ہے۔ ایک ہفتے میں لاروا اپنی شکل تبدیل کر کے بھورے رنگ کے ڈھول کی طرح ہو جاتا ہے اسے پیوپا (PUPA) کہتے ہیں۔ یہ چل پھر نہیں سکتا نہ کھاتا پیتا ہے۔ کوڑے کے نیچے چپ چاپ پڑا رہتا ہے۔ یہ حالت دو تین دن تک رہتی ہے۔ اس عرصے میں پوری مکھی بن جاتی ہے اور اوپری خول پھاڑ کر باہر نکل آتی ہے۔ یہ ہلکے بھورے رنگ کی ہوتی ہے۔

اس کی چھ ٹانگیں ہوتی ہیں۔ ٹانگوں کے آخری سرے پر دو نکیلے کانٹے اور کانٹوں کے بیچ میں گدّی ہوتی ہے اس کے پَر ہوتے ہیں۔ اور دو بڑی بڑی لال رنگ کی آنکھیں ہوتی ہیں، سر پر دو نوکیں ہوتی ہیں جن سے یہ چھونے کا کام لیتی ہے۔ کچھ دنوں میں مکھی کے تمام اعضا مضبوط ہو جاتے ہیں اور وہ مکھی بھی ہماری طرح کام میں لگ جاتی ہے۔"

مچھر: "واہ بھئی واہ ـــــ بی مکھی آپ کی کہانی سُن کر لطف آگیا ـــــ اب ذرا یہ بتائیے کہ آپ انسانوں کو اپنا شکار کس طرح بناتی ہیں؟"

مکھی: یہ تو تم جانتے ہی ہو، مکھیاں سبھی جگہ پر بیٹھتی ہیں۔ جب یہ کسی گندے مقام پر یا مریض کے تھوک و بلغم وغیرہ پر بیٹھتی ہیں تو جراثیم مکھیوں کے بال دار پروں میں چپک جاتے ہیں۔ . . . یہ مکھیاں کھانے پینے کی چیزوں پر جا بیٹھتی ہیں۔ اس طرح یہ جراثیم کھانے پینے کی چیزوں کے

ساتھ ساتھ انسانوں کے جسم کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔ اور وہ بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان جراثیم سے میعادی بُخار، ہیضہ، پیچش اور تپ دِق وغیرہ بیماریاں پھیلتی ہیں اور انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہیں۔"

مچھر: "بی مکھی۔ آپ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔ آپ کی کہانی سن کر مزہ بھی آیا اور معلومات بھی بڑھی۔ اب اجازت دیجیے۔ باتوں باتوں میں کافی وقت گزر گیا۔ پھر ملاقات ہو گی۔"



نائی کی دُکان



بچوّں کی کوششیں

نھّی بی نے شادی رچائی

نھّی بی اپنے گھر بھر میں، بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی ہیں۔ انھیں گڑیوں کا بڑا شوق ہے۔ نھّی بی کے پاس ایک دو نہیں درجنوں گڑیاں ہیں۔

نھّی بی کو پڑھائی لکھائی سے زیادہ رغبت نہیں ہے۔ بس وہ تو ہر وقت گڑیا کھیلا کرتی ہیں سب سے چھوٹی ہیں اس لیے کوئی کہتا بھی نہیں۔ نھّی بی ہفتے میں دوچار گڑیاں ضرور بنوا لیتی ہیں۔ وہ اپنی گڑیوں کو بہت پیار کرتی ہیں۔ خواب میں اپنی گڑیوں کو ہی دیکھتی ہیں۔

ان کو گڑیوں کی شادی رچانے کا بھی بڑا شوق ہے۔ آج اگر نیلو گڑیا کی شادی ہے تو کل راجو گڈّے کی دُلہن آرہی ہے۔ اس طرح وہ ہر ہفتے کسی نہ کسی گڈّے گڑیا کی شادی ضرور رچا لیتی ہیں گھر کے لوگ اس روز روز کے شادی بیاہ سے اُکتا گئے تھے۔

پر ایک دفعہ جب وہ اپنی ایک گڑیا کی شادی کر چکیں تو انھیں اپنی پمیلا گڑیا کی شادی کی سوجھی۔ وہ دوڑی دوڑی اپنی سہیلی روحی کے پاس

گئیں گڈے بادبلد سے پمیلہ کی شادی طے کرائیں۔
ننھّی بی بہت خوش تھیں اور بارات ۴ بجے دن کو آنے والی تھی۔ گڈے یا کو لال پردہ باندھ کر گھر کے ایک کونے میں بابوں بٹھا دیا گیا اور خود دو چار سہیلیوں کو لے کر گانے بیٹھ گئیں۔
اللہ اللہ کر کے اتوار کا دن آیا لیکن ننھّی بی کے چہرے پر آج خوشی نظر نہ آرہی تھی۔ گھر بھر بہت تعجب میں تھا۔ آخر ان کی بڑی بہن نے پوچھ ہی لیا۔
"ننھّی بی آج پمیلا کی شادی ہے اور تم کچھ خوش نظر نہیں آرہی ہو"۔
اس بات کا سننا تھا کہ ننھّی بی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ روحی نے کل شام جتلا دیا تھا کہ "گڈے یا کو آنے دو میں پھر کبھی لوٹ کر نہ جانے دوں گی اور سارے گھر کا کام اسی سے کراؤں"۔ ننھّی بی کو اپنی پمیلا سب سے پیاری تھی۔ اسی لیے انھوں نے اس کی شادی ابھی تک نہ کی تھی۔
ان سے پہلے تو روحی نے کہا تھا کہ "میں تمھاری گڈیا کو بہت اچھی طرح رکھوں گی اور تمھارے کہنے پر فوراً بھیج دیا کروں گی"۔ مگر اب روحی نے دھوکا دیا۔ اب ہو بھی کیا سکتا ہے۔ آج ہی بارات آرہی تھی۔ اس لیے ننھّی بی اداس تھیں۔ انھوں نے کہا "میں بارات واپس کردوں گی"۔ لیکن امی کے سمجھانے پر مان گئیں۔ لیکن اس دن سے ننھّی بی نے قسم کھائی کہ اب میں اپنی گڑیوں کی شادی کبھی نہ کروں گی۔ اور پمیلا کے گلے لگ کر بہت روئیں۔

سرتاج بانو (عمر ۹ سال)
سیتاپور۔

مجھے غصّہ کیوں آتا ہے؟

رات کو جب جھینگر زور زور سے بولتے ہیں تو مجھے بہت غصّہ آتا ہے اور یہ اتنی شدّت اختیار کر لیتا ہے کہ میں جھینگروں کو مارنے کے لیے دوڑتی ہوں، پر وہ دکھائی نہیں دیتے۔ جب میں اپنا کمرہ سجاتی ہوں اور پھر دوسرے کام میں لگ جاتی ہوں۔ اس عرصے میں کوئی میرا کمرہ خراب کر دیتا ہے تو مجھے بہت غصّہ آتا ہے۔ یہ اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ میں خراب کرنے والے کو مارنے لگتی ہوں۔

طلعت فاطمہ (عمر ۱۱ سال)

ایک دن جامعہ میں رات کو کوئی پروگرام ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا اجازت تو مل ہی جائے گی۔ مگر جب اجازت لینے گئے تو آبا نے صاف انکار کر دیا۔ غصّے کے مارے میری آنکھیں لال ہو گئیں اور منھ میں جھاگ آنے لگے تھے۔ مگر ایک شیر کے سامنے ہرن بیچارہ کیا کر سکتا تھا۔

سہیل احمد (عمر ۱۲ سال)

مجھے بعض باتوں پر اتنا غصّہ آتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ یا تو اُس کو مار دوں یا خود مر جاؤں۔ ہم کو تو بڑے زور کی بھوک لگی ہوتی ہے لیکن ڈرائنگ ہال کا مانیٹر مجھے ڈرائنگ ہال سے نکال دیتا ہے کیوں؟ مانیٹر صاحب کے خیال میں میرے بال ٹھیک سے نہیں بنے تھے۔ پھر میں سوچتا ہوں کہ اگر میں کبھی کھانا مانیٹر بن گیا تو اس کو بھی ایسی سزا دوں گا کہ یاد کرے گا۔ پھر اگر کوئی بڑا لڑکا مجھ پر دھونس جماتا ہے تو مجھے بہت غصّہ آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کو کسی بڑے لڑکے سے خوب پٹواؤں۔ کبھی کبھی میں بغیر لوٹے کے پیخانے میں بیٹھ جاتا ہوں اس لیے کہ دوستوں پر اعتبار کر لیتا ہوں اور ساتھ کے پیخانے میں بیٹھے ہوئے لڑکے سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ لوٹا مجھے دے دے گا۔ لیکن وہ بغیر لوٹا دیے چلا جاتا ہے اور میں کافی دیر تک انتظار میں پیخانے میں بیٹھا رہتا ہوں اور اُس لڑکے پر غصّہ کرتا رہتا ہوں۔

محمد عثمان خاں (عمر ۱۳ سال)

مجھے کئی باتوں پر غصّہ آتا ہے۔ اگر گھر پر میری کوئی بات پوری نہ ہو تو مجھے غصّہ آتا رہتا ہے اور اگر اس کے نہ پورا کرنے کی بہن یا بھائی بھی حمایت کر دیں تو پھر غصّہ اور بڑھ جاتا ہے پھر اس میں جنون کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر مجھ سے کوئی کام خراب ہو جاتا ہے تب بھی مجھے بہت غصّہ آتا ہے لیکن غصّے کی وجہ سے وہ اور خراب ہو جاتا ہے۔

عادل منصور (عمر ۱۳ سال)

گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر پر اُستاد مقرر ہو جاتے ہیں اور کئی اور لڑکے بھی پڑھنے آنے لگتے ہیں۔ جب چھٹی کا وقت قریب ہوتا ہے اور میں کوئی شرارت کر بیٹھتا ہوں تو سب کی چھٹی تو ہو جاتی ہے مگر میری چھٹی نہیں ہوتی۔ اس پر مجھے بہت غصّہ آتا ہے۔

سیّد حسین حیدر (عمر ۱۳ سال)

مہا کالی

یہ اس زمانے کی بات ہے جب آدمیوں، جنوں اور دیووں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے تھے۔

ان دنوں ایک بہت ہی خوف ناک دیو رہتا تھا۔ اس کا نام مہا کالی تھا۔ اس کی ایک شخص کریم بخش سے گہری دوستی تھی۔ کریم بخش نے ایک دفعہ مہا کالی کی دعوت کی۔ مہا کالی کا پیٹ بہت بڑا تھا خوراک بھی بہت زیادہ تھی۔ پہلے تو اس نے طنز سے ایک قہقہہ لگایا مگر جب دیکھا کہ کریم بخش کچھ افسردہ ہو رہا ہے تو دعوت منظور کر لی۔ اور بولا "مگر بھائی کریم تمھیں میری خوراک تو معلوم ہے۔ ذرا اس کا خیال رکھنا، اور ہاں میرا پیٹ نہ بھرے تو تاؤ آجاتا ہے۔"

کریم بخش دن بھر طرح طرح کے کھانے تیار کرتا رہا۔ شیرمال، قورما، زردہ، بریانی وغیرہ۔ سب کچھ تیار ہو گیا تو مہا کالی آدھمکا۔ کریم بخش نے سب کھانے دسترخوان پر چن دیے۔ پر وہ تو سارا کھانا دیکھتے دیکھتے چٹ کر گیا۔ دسترخوان خالی ہو گیا۔ پیٹ پھر بھی نہ بھرا۔ کہنے لگا "کریم بخش کھانا اور لاؤ"

کریم بخش ڈرتے ڈرتے بولا "پر بھائی صاحب کھانا تو ختم ہو گیا۔"

دیو نے قہر آلود نگاہوں سے کریم بخش کو دیکھا اور بولا "میں کیا جانوں مجھے کھانا پیٹ بھر ملنا چاہیے۔ نہیں تو میں تمھیں کھا جاؤں گا۔"

اور اس نے بھاڑ سا منہ کھولا تو میاں کریم بخش تنکے کی طرح اڑتے ہوئے اس کے منہ میں چلے گئے۔

اب وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ایک شیر ملا۔ مہا کالی نے اسے ہٹنے کو کہا۔ شیر بھی اپنے زعم میں تھا نہیں ہٹا۔ مہا کالی اسے بھی ہڑپ کر گیا۔ آگے جا کر ایک ہاتھی ملا، اس نے بھی اکڑ دکھائی۔ مہا کالی نے منہ کھولا اور وہ بھی اس کے پیٹ میں پہنچ گیا۔

اور آگے بڑھا تو ایک دیہاتی کندھے پر کلہاڑی رکھے چلا آرہا تھا، اس سے بھی تکرار ہوئی، مہا کالی نے اسے بھی اپنے پیٹ میں رکھ لیا۔

اب ان سب نے باہر نکلنے کی کوشش کی اور اچھلنا کودنا شروع کیا تو مہا کالی کا درد سے برا حال ہو گیا۔ دیہاتی برابر کلہاڑی چلاتا رہا، آخر مہا کالی کا پیٹ پھٹ گیا اور وہ چاروں باہر آگئے۔ "جان بچی لاکھوں پائے۔"

مظفر علی شاد کوٹوی

آدھی ملاقات

میرے محترم!

آداب۔ ابھی ابھی آپ کا محبت نامہ میری سالگرہ کے موقع پر موصول ہوا۔ آپ کی محبت اور خلوص کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ اور بہت بہت شکریے کے ساتھ اپنی محبت اور تعاون ہمیشہ کے لیے، آپ کے اور اپنے عزیز پیام تعلیم کے لیے وقف کرتا ہوں۔ قبول فرمائیے۔ اور ہاں پیام تعلیم کی ترقی کے لیے بھی کئی دوستوں کو راضی کیا ہے۔ آپ یقین رکھیں انشاء اللہ پیام تعلیم اور کتاب نما کے لیے تو ہمیشہ کوشش کرتا رہوں گا۔

شمس رحمانی، مرادآباد

آپ سے ایک گزارش ہے۔ آپ نے جہاں قلمی دوستی کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ خطوں کے جواب اور سوال و جواب کا سلسلہ بھی شروع کر دیں۔ رنگ بھریے اور کارٹون وغیرہ کا سلسلہ بند ہی کر دیں تو بہتر ہے۔ ویسے آپ کی مرضی۔

واجد علی خاں، بمبئی ۴۰

مکرمی بھائی جان۔ تسلیم و نیاز

ابھی ابھی آپ کا ہمت نامہ موصول ہوا۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہوا۔ پرسوں ہی پرچہ پیام تعلیم خریدا اور پڑھے بغیر نہ چھوڑا۔ کیوں نہ چھوڑا؟ آپ کے پرچے میں وہ چاشنی اور دل کشی رہتی ہے کہ پڑھے بغیر چین نصیب نہیں ہوتا۔ تہذیب کی

بنیاد والا مضمون پڑھ کر میرے دل میں ایک جذبۂ ولولہ اور جوش و خروش پیدا ہوا ہے۔ میں ڈو مل مزدور بالغوں کو پہلے سے پڑھا رہا ہوں۔ انھیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ یہ اب اخباروں کی سرخیاں آسانی سے پڑھ لیتے ہیں۔ اس سے دل کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔

جلیل تنویر گلبرگہ

جناب من، السلام علیکم

آج میری نظر سے پیام تعلیم گزرا۔ مجھے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ تمام پرانی باتوں کا نقشہ میرے سامنے آگیا۔ خدا آپ کو خوش و خرم رکھے۔ آپ کو وقت ملے تو ضرور تشریف لائیے۔ پیام تعلیم کے خریدار بھی آپ کے آنے سے ہو جائیں گے۔ ایک سال کے لیے پیام تعلیم جاری کر دیجیے، میں یہاں پر دی۔ پی چھڑا لوں گا۔

عمر بن حسین بسمت نگر

محترم، سلام و خلوص

پیام تعلیم برابر مل رہا ہے شکریہ۔ ہر بار جب یہ ملتا ہے تو شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس بار شرمندگی کے جال سے خود کو نکال رہا ہوں۔ ایک کہانی حاضر ہے۔ پیامی پسند کریں گے اس کا یقین ہے۔

سالنامے کے سلسلے میں خط لکھنے والا تھا۔ خط تو نہ لکھ سکا لیکن مقامی روزنامہ "ندیم" میں اس پر تبصرہ ضرور کیا تھا۔ اُسے بھی پوسٹ نہ کر سکا۔ آج اس کا بھی تراشا بھیج رہا ہوں۔

اتنا اچھا سالنامہ نکالنے پر میری مبارکباد قبول کیجیے۔ اگرچہ یہ مبارکباد بہت دیر سے ہے۔ مگر دیر کی وجہ سے اچھے کام بُرے تو نہیں ہو جاتے اچھے ہی رہتے ہیں۔ آپ کا

آفاق احمد ایم۔ اے

لیکچرر حمیدیہ کالج، بھوپال

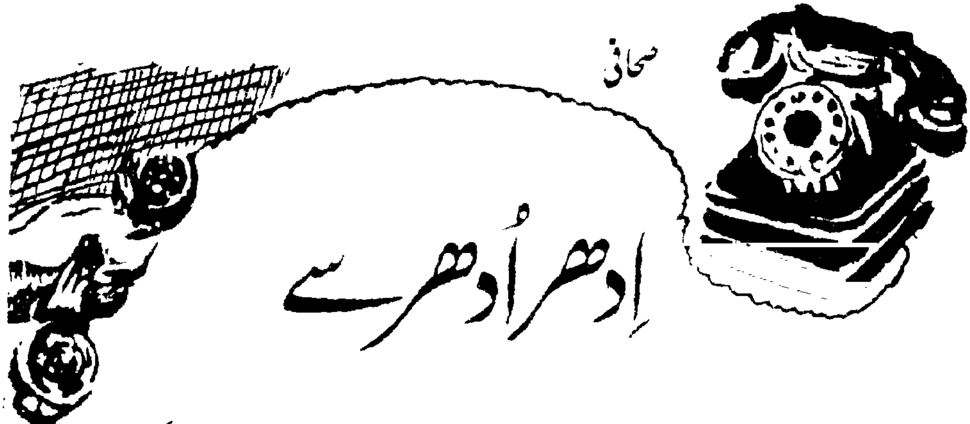
محترمی حسان صاحب، سلام مسنون

پیام تعلیم برابر مل رہا ہے۔ پرچہ بے حد ترقی کر رہا ہے۔ آج کل تو آپ نہ صرف اندرونی صفحات رنگین چھاپ رہے ہیں بلکہ ٹائیٹل پیج پر بھی وارنش ہوتی ہے۔ ترتیب اور دلکشی دونوں لحاظ سے پرچہ بے حد عمدہ ہے۔

مخلص اظہر افسر

حیدرآباد

صحافی



اِدھر اُدھر سے

دھوکا دیا ہے

ڈولفن مچھلی کے بارے میں آپ جولائی کے پرچے میں ایک دل چسپ مضمون پڑھ چکے ہیں۔ اب اس کے بارے میں (اخباروں کی اصطلاح میں) ایک "سنسنی خیز" واقعہ سنیے۔ یہ واقعہ ایک امریکی سائنس داں کے ساتھ پیش آیا۔ ان کا بیان ہے کہ جس ڈولفن پر وہ تجربہ کر رہے تھے وہ باتیں کرنے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ بے بس جاندار یہ محسوس کر رہا ہے کہ وہ سائنسی تجربوں کا شکار ہو رہا ہے۔ سائنس کی خاطر مصیبتیں برداشت کرنے والی اس ڈولفن نے مرنے سے ایک دن پہلے دوسری ڈولفن سے کہا۔ "انھوں نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔" ٹیپ ریکارڈ کیا ہوا یہ جملہ بار بار سنا گیا اور ہر بار امریکی سائنس داں پریشان ہو کر رہ گیا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔

سائنس داں سالہا سال سے اس مخلوق کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں جو نشو و نما کے لحاظ سے انسان سے قریب ترین مشابہت رکھتی ہے۔ ایک روسی سائنس داں کا کہنا ہے کہ ڈولفن میں انسانوں کے ساتھ دوستی کے حیرت انگیز جذبے کا ایک سے زیادہ مرتبہ انھیں ثبوت ملا ہے۔

(پریس ریلیز روسی سفارت خانہ، دہلی)

مسٹر ویلنٹائن

ایک صاحب ہیں مسٹر ویلنٹائن۔ یہ ساٹھ (۶۰) سال سے مسلسل جاگ رہے ہیں۔ آٹھ سال کی عمر میں

ان کی نیند اچانک غائب ہوگئی۔ جب سے وہ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں سوئے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کی تن دُرستی پر ذرا بھی خراب اثر نہیں پڑا۔ بلکہ عام انسانوں کے مقابلے میں تین گنا کام کرتے ہیں۔ اور خوب چاق چوبند رہتے ہیں۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں نے ان کا طبی معائنہ کیا مگر بے خوابی کا کوئی سبب معلوم نہ کر سکے۔ انھیں خواب آور یا نیند لانے والی دوائیں بھی دی گئیں۔ انجکشن بھی لگائے گئے مگر نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔

(سنڈے اسٹینڈرڈ)

پنجروں کا عجائب خانہ

ہابی یا مشغلوں کی بیسیوں قسمیں ہیں۔ جرمنی میں ایک صاحب کو پنجرے جمع کرنے کا شوق ہے۔ یہ حضرت خود پنجرے بناتے ہیں۔ ایک بار انھیں ایک دُکان پر سولھویں صدی کا پنجرا نظر آگیا۔ یہ جھٹ انھوں نے خرید لیا اور جب سے انھیں کچھ ایسا شوق ہوا کہ اب تک اپنے گھر میں ۷۰ پنجرے جمع کر چکے ہیں۔ یہ پنجرے تینوں برِّ اعظموں سے جمع کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک پنجرا رنگین شیشے کا ہے۔ اِس پنجرے پر ۱۹۵۱ء کے بین الاقوامی مقابلے میں انعام بھی مل چکا ہے۔ لکڑی اور تار کے بنے ہوئے پنجرے تین سو سال پُرانے ہیں۔ دو پنجرے چاندی کے ہیں۔ یہ بلجیم اور ایشیا سے آئے ہیں۔ ان کے پاس ۱۷۱۱ء کی لکھی ہوئی ایک کتاب بھی ہے۔ اس میں پرندوں کو گھر میں پالنے کے بارے میں اور اُن کے پنجروں کے بارے میں پوری معلومات دی گئی ہیں۔

(یونی ورسل پریس سروس برن سفارت خانہ)

دلّی کے چڑیا گھر میں لکڑی کا دیدبان

دلّی کے چڑیا گھر میں ایک خوب صورت جھیل ہے اس جھیل کے کنارے لکڑی کا ایک مینار یا دیدبان بنایا جارہا ہے۔ اس میں نیچے ایک کمرہ ہوگا اس میں پرندوں سے متعلق کتابوں کی لائبریری ہوگی۔ اس کی چھت پر پرندوں کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے جگہ ہوگی اور اس چھت پر چھتری نما سائبان ہوگا۔ ظاہر ہے اِدھر اُدھر سے طرح طرح کے پرندے اس جھیل کی طرف آئیں گے۔ جو چھتری پر آکر بیٹھیں گے یا جھیل میں اُتریں گے۔ پرندوں کا مشاہدہ با

مطالعہ کرنے والوں کو انھیں قریب سے دیکھنے کا بہت اچھا موقع ملے گا۔

(سنڈے اسٹینڈرڈ)

ریل کے ٹکٹ مشین سے خریدیے

مغربی جرمنی کے فرانکفرٹ شہر کے ریلوے اسٹیشن پر ایک مشین لگائی گئی ہے۔ یہ مشین ریل کے ٹکٹ بیچے گی۔ اس مشین سے ۱۲ بڑے اسٹیشنوں کے اور ۲۳۲ چھوٹے اسٹیشنوں کے ٹکٹ مل سکیں گے۔ یہ تجربہ کامیاب رہا تو ایسی مشینیں دوسرے اسٹیشنوں پر لگائی جائیں گی۔

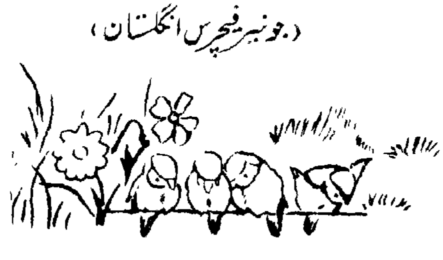
(یونی ورسل پریس سروس)

سائنس کے میلے

انگلستان کے اسکولوں میں ایک نئی اسکیم چل رہی ہے۔ اس اسکیم کا منشا یہ ہے کہ سائنس کے طالب علموں کو سائنس کی بہت سی شاخوں میں کس شاخ سے زیادہ دل چسپی ہے اس میں اپنی اُپج سے وہ کیا کام کرتے ہیں اور کیسا کرتے ہیں انگلستان کے مختلف اسکولوں کی طرف سے جگہ جگہ سائنس کے میلوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس میلے کی حیثیت ایک نمائش کی ہوتی ہے۔ ۱۲ سے ۱۸ سال تک کے بچے اپنے ہی بنائے ہوئے منصوبے یا پروجیکٹ کے مطابق جو سامان تیار کرتے ہیں اسی سامان کی ان سائنس میلوں میں نمائش کی جاتی ہے۔

اس وقت تک برطانیہ میں چھے میلے ہو چکے ہیں۔ یہ سائنس میلے ترقی کی مہم اور اخبار سنڈے ٹائمز کی سرپرستی میں ہوئے ہیں۔ نمائش میں جس اسکول کا کام سب سے اچھا ہوتا ہے اسے سال بھر کے لیے ٹرافی دی جاتی ہے۔ یہ ٹرافی بھی سنڈے ٹائمز کی طرف سے ہے۔ کاش ایسے میلوں کا انتظام ہمارے دیس میں بھی ہونے لگے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ سائنس کے طالب علموں میں دل چسپی بڑھ جائے گی۔ اور انھیں اپنی اپج سے کام کرنے کا شوق ہوگا۔

(جونیئر فیچرس انگلستان)



فٹ بال کے کھلاڑی یادگاری ٹکٹوں پر

ٹکٹ جمع کرنے والے شوقینوں کے لیے یہ خبر بہت دل چسپ ہوگی کہ انگلستان کی تاریخ میں پہلی بار کھلاڑیوں والے یادگاری ٹکٹ جاری کیے جا رہے ہیں۔ اس مرتبہ فٹ بال کے کھیل کا عالمی یا بین الاقوامی مقابلہ انگلستان میں ہو رہا ہے یہ ٹکٹ اسی موقع کے ہیں۔ ان میں کھلاڑیوں کو کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ عام ٹکٹ سے ڈگنے سائز کے ہیں اور چار رنگوں میں ہیں۔

مصنوعی زبان سے بول سکتے ہیں

جرمنی کے ڈاکٹروں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے بناوٹی یا مصنوعی زبان تیار کی ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ کسی خطرناک بیماری کی وجہ سے زبان کو کاٹ دینے پر بھی زبان کے نیچے کے پٹھے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ کچھ پٹھے تو اتنے طاقت ور ہوتے ہیں کہ انھیں بناوٹی یا مصنوعی زبان کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ زبان اصل زبان کی طرح کام شروع کر سکتی ہے اور اس سے بولنے اور خوراک نگلنے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔

(یونی ورسل پریس سروس جرمن سفارت خانہ)

جسم کے اندرونی حصے ٹیلی ویژن پر

جرمنی کے دو ڈاکٹروں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جن کی مدد سے اپنے جسم کے اندرونی حصے کا حال آپ ٹیلی ویژن پر دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً آپ معدے کے اندر غذا کو ہضم ہوتے دیکھ سکتے ہیں۔ اس آلے کی بدولت بدن کے اندرونی حصوں کی خطرناک بیماری کی تشخیص آسانی سے ہو سکتی ہے۔

(یونی ورسل پریس سروس جرمن سفارت خانہ)

جناب گلیڈ دن میسی

رنگ بھریے

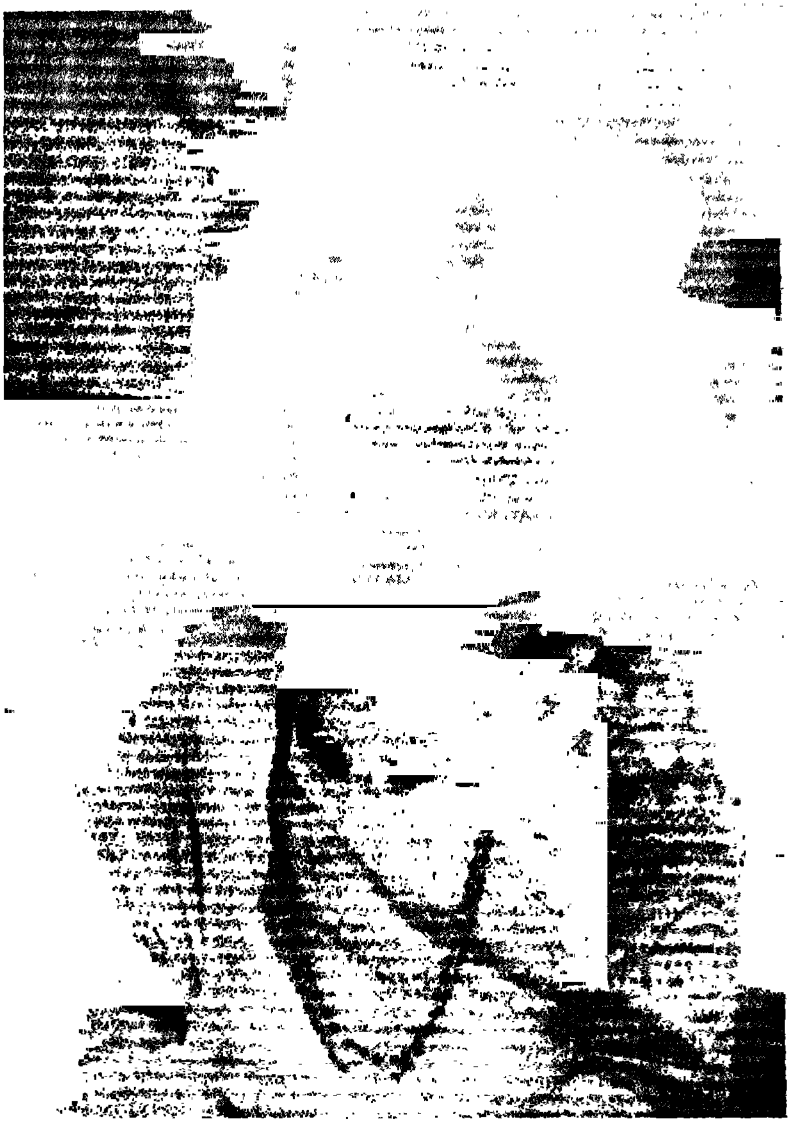


بچّوں کی دل چسپ اور سبق آموز کتابیں

ایک کچوری تیل میں اماجی جلیں -/۳۰	اُس نے کیا کرنا جانا -/۳۷	بچّوں کی کہانیاں -/۲۷	بڑے دادا کی کہانی -/۵۶
پرندوں کا ایکا -/۲۰	تانبیل خاں -/۳۰	تُرکوں کی کہانیاں -/۵۵	جنگو کی بلی -/۲۵
چنبیلی -/۵۰	چمپاوت کا آدم خور شیر -/۲۵	چوہوں کی کانفرنس -/۴۵	خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا -/۳۰
سونے کی چڑیا /=۱	شہزادہ اور ٹھگ -/۴۵	شہزادی گلفام -/۵۰	شہزادی گلنار -/۴۰
شیدلا -/۵۰	کیمپ فائر کی نقلیں اوّل -/۷۵	کیمپ فائر کی نقلیں دوم -/۷۵	لال مُرغی -/۵۰
مزہ چکھائیں گے -/۳۵	مُرغی اجمیر چلی -/۲۵	ننھا ٹٹو -/۳۰	ہمّت کے پھل -/۳۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

پرنٹر و پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا



بے بی ناہید   فوٹو: جوزر، ڈی، واراوالا

August, 1966. Regd. No. D. 1457.

Payam -i- Taleem

New Delhi-25.

بچّوں کے لئے

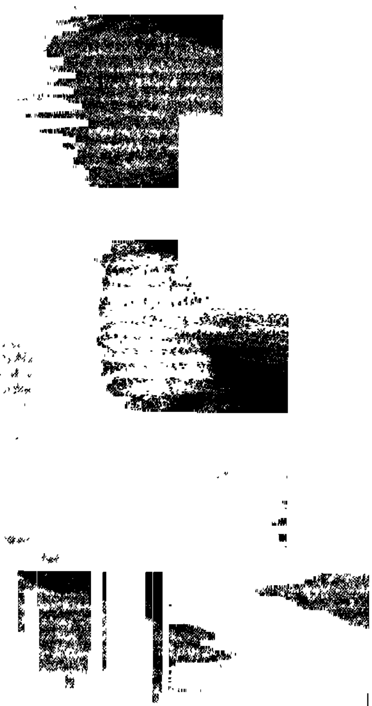
ماسکو میں چھپی ہوئی رنگین تصویروں والی
خوبصورت کتابیں جو دلچسپ بھی ہیں اور سستی بھی

●	چوزہ	صفحات	۱۶	قیمت	۲۰	پیسے
●	دستانہ	″	۲۰	″	۳۰	″
●	دو کہانیاں	″	۲۰	″	۳۰	″
●	گیہوں کی بالی	″	۱۶	″	۳۰	″
●	تصویروں میں چٹ پٹی کہانیاں	″	۵۲	″	۵۰	″
●	دوستی اور دشمنی	″	۶۸	″	۷۰	″
●	تین بھالو	″	۱۶	″	[illegible]	″
●	نیلا پیالہ	″	۶۴	″	۱۲۵	″
●	میشکا	″	۱۶	″	۳۰	″

ان میں سے چوزہ ۱۰ × ۲۲ سنٹی میٹر اور باقی سب کتابیں
۲۲ × ۲۹ سنٹی میٹر کے سائز پر ہیں۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

پیام تعلیم



50 P.



تصویر نہیں کھینچوائیں گے
(نجیب جتان)

فوٹو احمد کمال جامعہ



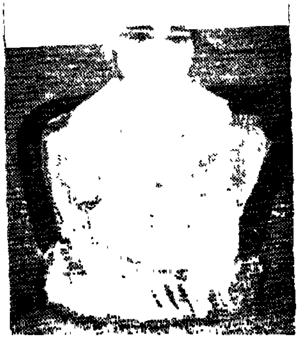
بانو (بمبئی) عمر چار سال



زینت انجم عمر ۹ سال (بمبئی)



زہرہ نفیس عمر ۶ سال (بمبئی)



ارشد عامر عمر ۳ سال (جامنگر)



تحسین مسعود فرید عمر ۴ سال (بمبئی)



سہیل قیصر عمر ۳ سال (رام پور)



زینت نور عمر ۷ سال (بمبئی)



ایاز محمود عمر ۸ سال (بمبئی)



شکیل احمد عمر ایک سال (برہان پور)



میر ساجدہ بانو عمر ۶ سال (بمبئی)

ریاست جموں و کشمیر میں تمام تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ



جلد ۳ — ستمبر ۱۹۶۶ء — شمارہ ۷

ایڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی

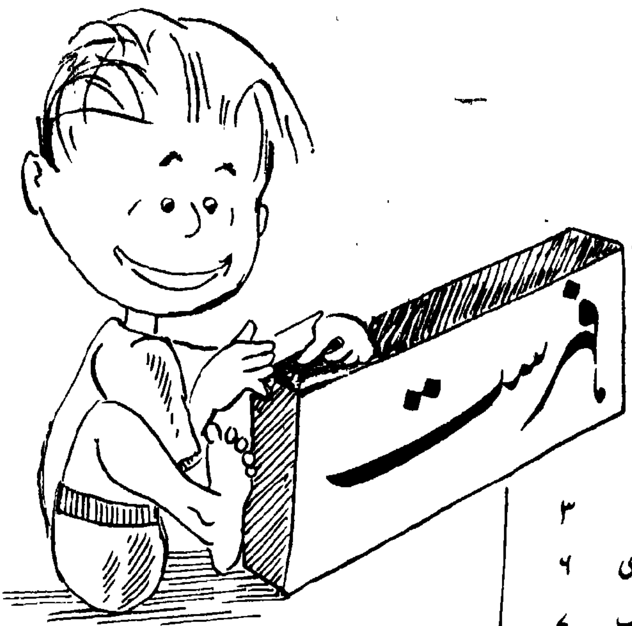
آرٹسٹ: گلیڈون میسی

سالانہ چندہ: — پانچ روپے

فی پرچہ: — پچاس پیسے

صدر دفتر:-
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

بمبئی آفس:-
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنس بلڈنگ، جے جے ہسپتال بمبئی ۳



تصویر سرِورق:
معصوم مُسکراہٹ۔ ناہیدہ زیدی
(عمر ۴ سال)
فوٹو: ایم، ایس، خاں

بچّوں سے باتیں

غالباً بہت سے پیامیوں کو یاد ہوگا پیامِ تعلیم کے نئے دَور کا پہلا پرچہ اگست ۶۴ء میں نکلا۔ اِس حساب سے پچھلی جولائی ۶۶ء کو دُو برس پورے ہوگئے۔ پچھلے اگست سے اس نے تیسرے سال میں قدم رکھا ہے۔

شروع شروع میں یہ لیتھو میں نکلتا تھا۔ بلاک کی تصویریں بھی بس دو ایک ہی ہوتی تھیں۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے قدم آگے بڑھایا۔ نہرو نمبر نکالا۔ حالی نمبر نکالا۔ یہ دونوں خاص نمبر آپ نے بہت پسند کیے۔ دفتر میں یہ دونوں دیکھتے دیکھتے ختم ہوگئے۔ حالی نمبر تو ایسا عنقا ہوا کہ اپنے بہت سے پیامیوں کی فرمائشیں بھی ہم پوری نہ کرسکے شرمندگی اُٹھانا پڑی۔

پھر محترم تاباں صاحب کی کوششوں سے مکتبے کا اپنا آفسٹ پریس قائم ہوگیا اور پیامِ تعلیم آفسٹ پریس میں چھپنے لگا۔ اس کی ظاہری آب و تاب میں نمایاں فرق آیا۔ ساتھ ہی ساتھ بلاک کی تصویروں کی طرف بھی توجّہ کی گئی۔ ٹائیٹل کے دُو صفحوں کے علاوہ دُو صفحے اور بڑھائے گئے۔ ٹائیٹل پر ہر مہینے ایک نئی تصویر چھپنے لگی۔

رہی مضمونوں کی بات تو اس میں بھی کافی ترقّی ہوئی۔ کہانیوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ پیامیوں کی دل چسپی کی دوسری چیزیں بھی شامل کی گئیں۔ سائنسی مضمونوں پر خاص طور پر دھیان دیا گیا۔ تایا جان جناب یوسف ناظم اور دوسرے بزرگوں کی نوازشوں کی بدولت مزاحیہ مضمون اور ڈرامے بھی چھپنے لگے۔ اپنے ننّھے پیامیوں کے لیے بھی

تھوڑا بہت مواد فراہم کیا گیا۔

غرض آپ کا پیامِ تعلیم دھیرے دھیرے چولا بدل رہا ہے۔ ترقی کی طرف برابر قدم بڑھا رہا ہے۔ ہمیں خوشی اس بات کی ہے کہ ان سب چیزوں کو آپ بھی محسوس کر رہے ہیں۔ اور اپنے پیامِ تعلیم سے آپ کی دل چسپی دن پر دن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

اس سلسلے میں ہم اپنے ساتھیوں کے، اپنے مضمون نگاروں کے خاص طور پر احسان مند ہیں۔ انھیں کی بدولت ہمیں یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

اس تمام عرصے میں پیامِ تعلیم کے قدردانوں کی تعداد بھی برابر بڑھتی رہی ہے۔ ہماری خواہش تو یہ ہے کہ پیامِ تعلیم زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچے۔ اس سے ایک فائدہ اور ہوگا۔ بہت بڑا فائدہ! جس قدر اس کی مالی حالت بہتر ہوگی اسی قدر ہم اطمینان و سکون کے ساتھ اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کر سکیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے پیامی اس طرف بھی زیادہ سے زیادہ توجہ کریں گے۔

اِس سے پہلے انھی صفحوں میں ہم اگلے سالنامے کا ذکر کر چکے ہیں۔ پچھلا سالنامہ ضخامت زیادہ ہونے کی وجہ سے آفسٹ میں نہیں چھپ سکا تھا۔ تابانؔ صاحب کی دلی خواہش ہے کہ اگلا سالنامہ پورا کا پورا آفسٹ پر چھپے۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ ہم ابھی سے تیاری شروع کر دیں۔ ہمارے مضمون نگار اور بچّوں کے شاعر ابھی سے اس طرف توجّہ فرمائیں تو ہمیں بڑی آسانی ہو جائے۔

ہاں اِس سلسلے میں ایک بات عرض کرنا ہے۔ کچھ پیامی دبے دبے لفظوں میں ہماری بعض نظموں کے بارے میں شکایت کرنے لگے ہیں۔ ننھّے پیامی خاص طور پر۔ مثلاً بعض نظموں کے مضمون ان کی دل چسپی کے نہیں ہوتے۔ یا ایسے مشکل الفاظ میں، ایسی مشکل زبان میں ہوتے ہیں کہ وہ انھیں سمجھ نہیں پاتے، ان سے لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ قومی نظموں سے تو سبھی پیامی جیسے اُکتا گئے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے شاعر حضرات اِدھر خاص طور پر دھیان دیں گے۔ نظم لکھتے وقت بچّوں کی نفسیات، ان کی سمجھ، ان کی استعداد کو سامنے رکھا جائے تو شاید ہمارے بزرگ شاعر زیادہ آسان، زیادہ دل چسپ نظمیں لکھ سکیں۔

پیامِ تعلیم میں لطیفے بہت کم شائع ہوتے ہیں۔ ایسے لطیفے جن میں کچھ اچھوتا پن ہو، کوئی نئی بات ہو، ڈھونڈھے سے نہیں ملتے۔ اِس بات کو ہمارے پیامی بھی محسوس کرتے تھے، ہمارے سرپرست بھی۔ ہمارے پُرانے سرپرست اور جامعہ کے بہت پُرانے ہمدرد جناب محمد منال صاحب (بمبئی) کو یہ کمی خاص طور پر کھٹکی۔ ان کا خیال ہے کہ پیامِ تعلیم میں لطیفے ضرور ضرور شائع ہوں۔ اِتنا ہی نہیں انھوں نے اپنی طرف سے اس کے لیے ایک انعام بھی رکھا ہے۔ جس بچے کا لطیفہ سب سے اچھا ہوگا، نیا ہوگا، منال صاحب اس کے لیے پیامِ تعلیم مفت جاری کرا دیں گے۔ یہ بچہ اگر پیامِ تعلیم کا پہلے سے خریدار ہے تو وہ جس بچے کا نام لکھے گا پیامِ تعلیم اس کے نام پورے سال کے لیے جاری کر دیا جائے گا۔ یہ سلسلہ مسلسل اور مستقل رہے گا۔ اچھا تو آپ ابھی سے کوشش شروع کر دیجیے۔ کہ اگلے مہینے ہم آپ کا کوئی اچھے سے اچھا لطیفہ شائع کر سکیں۔

پیامِ تعلیم کے خریدار کبھی کبھی پیامِ تعلیم کا چندہ ایڈیٹر کے نام بھیج دیتے ہیں۔ دفتر والوں کو اس میں خاصی پریشانی ہوتی ہے۔ اس لیے روپے پیسے کی بات ہمیشہ منیجر صاحب سے کیجیے۔ ایڈیٹر کے پاس تو اپنے مضمون وغیرہ بھیجیے اور بس۔ اور ہاں منیجر صاحب کی درخواست ہے کہ انھیں خط لکھتے وقت نمبر خریداری ضرور لکھا کیجیے۔ پرچہ وقت پر نہ ملے تو آٹھ دس دن کے اندر اندر منیجر صاحب کو خط لکھ دیا کیجیے۔

اِس سلسلے میں ایک صاحب نے بہت ستم ظریفی سے کام لیا ہے۔ ٹھیک سات مہینے کے بعد (جنوری سے اب تک) پرچہ نہ پہنچنے کی شکایت کی ہے۔ اور منیجر صاحب کو وہاں بھیجنے کی دعا کی ہے جہاں جانے کے لیے وہ آمادہ نہیں ہیں۔ غالباً یہ سب پرچے اِدھر اُدھر سے اکٹھا کر کے انھیں بھیج دیے جائیں گے۔ لیکن وہ وقت پر دفتر کو شکایتی خط لکھ دیتے تو یہ نوبت کیوں آتی!۔

پرچہ پریس جا ہی رہا تھا کہ مکتبے کے ایک بہت ہی ہمدرد سرپرست جناب محمد حسین ہاشم پریم جی کے اچانک انتقال کی خبر سے پورے دفتر پر رنج و غم کے بادل چھا گئے۔ مرحوم ۱۹۵۰ء سے مکتبہ جامعہ کے ڈائرکٹر تھے اور ہمیشہ مکتبے کی ترقی و بہبود کو

(بقیہ دیکھیے صفحہ پر)



جناب برق بہاری

بچّے کی دُعا

تُو ہے مالک، تُو ہے داتا
خالق تُو ہے ارض و سَما کا

سُورج تارے تُو نے بنائے
باغوں میں کیا پھول کھلائے

سب کچھ ہے یہ تیرا جلوہ
کیا صحرا کیا خاک کا ذرّہ

جس کو چاہے پل میں گرادے
جس کی چاہے بگڑی بنادے

بخش تُو ہم کو علم کی دَولت
جس سے دُنیا میں ہو عزّت

جس سے تجھ کو جان سکیں ہم
نیک اور بد پہچان سکیں ہم

جو دُنیا میں پریم سکھادے
جو تیرا محبوب بنادے

جناب مرزا شکور بیگ

بھولے نواب

بھولے نواب کے ہاں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ مال، جائداد، اولا۔ خوب شان سے گزر رہی تھی۔ بڑوں نے ہزاروں جتن کرکے جو دولت جوڑی تھی، نواب اُسے اُڑا رہے تھے۔ دل کھول کر اُڑا رہے تھے۔ کبوتر بازی، بٹیر بازی، مُرغ بازی، پتنگ بازی اور ان سے اُکتا گئے، تو گپ بازی وقت گزارنے کے مشغلے تھے۔ کھانا، پینا اور مزے اُڑانا زندگی کا مقصد تھا۔ صبح سے شام تک خوشامدی جمع رہتے اور بھولے نواب کی تعریفوں کے پُل باندھتے۔ نواب اپنی تعریف بہت پسند کرتے تھے۔ لوگوں کو اس کمزوری کا علم تھا۔ وہ ہمیشہ ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے اور انعام پاتے تھے۔

اس تمام عیش و آرام کے ساتھ نواب کو ایک بات کا رنج بھی تھا۔ کبھی کبھی ان کے ہاں پہیلیوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ کوئی ایک پہیلی کہتا، دوسرا بوجھ لیتا۔ نواب حیران ہوتے کہ آخر یہ لوگ پہیلی بوجھ کیسے لیتے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ بھولے نواب کے پاس جتنی دولت کی زیادتی تھی عقل کی اتنی ہی کمی تھی۔ ایک آدھ دفعہ نواب نے پہیلی بوجھنے کی کوشش بھی کی مگر جواب ایسا بے ڈھنگا دیا کہ حاضرین ہنس پڑے۔ ہوا یہ کہ ایک شخص نے اس خیال سے کہ نواب آسانی سے بوجھ سکیں یہ پہیلی گھڑی کہ "رنگ برنگ کی ہوتی ہیں۔ دو دو پر رکھتی ہیں۔ پھول پتوں پر ٹکتی ہیں۔ پھر اُڑنے لگتی ہیں۔" بھولے نواب نے کچھ دیر غور کیا۔ پھر کہہ دیا: "پتنگیں۔" اس پر لوگ نہ ہنستے تو کیا کرتے! نواب کو ان مصاحبوں کا ہنسنا

ناگوار گزرا۔ ان لوگوں کو بھی احساس ہوا کہ ہم نے غلطی کی۔ اب نواب چُپ چُپ سے رہنے لگے صرف اپنے چہیتے کُتے سے کچھ دیر دل بہلا لیتے تھے اور خاموشی سے سب کی سُنتے رہتے تھے۔ موقع دیکھ کر ان کے ایک مُنہ چڑھے مصاحب نے اعلان کر دیا کہ جو کوئی ایسی پہیلی کہے جسے نواب صاحب بوجھ لیں تو اسے ایک سو روپے کا انعام دیا جائے گا۔ بھولے نواب نے بھی اس تحریک سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ لوگ آسان سے آسان پہیلیاں تیار کر کے لاتے مگر نواب صاحب کے دماغ میں ہمیشہ ان کے اُلٹے جواب آتے تھے۔ جب کوئی کوشش کامیاب ہوتی نظر نہ آئی تو لوگوں نے ایک ایسے شخص کو گانٹھا جو اپنی حاضر جوابی اور درباداری میں مشہور تھا۔ اس نے پوچھا نواب صاحب کو کس چیز سے زیادہ محبت ہے۔ بیوی سے، بچّوں سے، مرغوں سے، یا کبوتروں سے۔ بالآخر اتفاقِ رائے اسی پر ہوا کہ بھولے نواب کو زیادہ محبت اپنے کُتے سے ہے۔ یہ سُنتے ہی اس شخص نے کہا اب یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں ایسی پہیلی کہوں گا کہ نواب صاحب کو صحیح جواب دینا پڑے گا۔ پھر بھی تم لوگ ہر موقع پر میری تائید کرنا اور جب میں تعریف شروع کر دوں تو میرا ساتھ دینا۔ بہر حال ایک دن مقرر ہوا۔ بھولے نواب بھی اچھے موڈ میں تھے۔ پہیلی کہنے والا حاضر ہوا۔ اور ادب سے اجازت لے کر اپنی پہیلی پیش کی۔

"چار پاؤں رکھتا ہے۔ بھوں بھوں کرتا ہے۔ مالک کو دیکھ کر دُم ہلاتا ہے"۔ یہ سُن کر بھولے نواب اس کا جواب سوچنے لگے اور پھر پوچھا۔ کھانے پینے میں ہے یا دیکھنے میں ہے۔ ہنسی روکتے ہوئے اس شخص نے کہا حضور دیکھنے میں ہے۔ اب کچھ دیر بعد بھولے نواب بولے ذرا پھر سے اپنی پہیلی دُہرانا۔ اس نے پھر اسے دُہرا دیا۔ تھوڑی دیر بعد بھولے نواب نے بیساختہ کہا، ہم سمجھ گئے، ہم سمجھ گئے۔ اس نے کہا حضور کیا سمجھے۔ نواب نے کہا "اونٹ"۔ پہیلی کہنے والا بلا کا چالاک تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ بھی اُلٹی پڑی تو فوراً اس نے پینترا بدلا اور کہا "بالکل ٹھیک حضور بالکل ٹھیک"۔ مگر گستاخی معاف حضور یہ جواب آپ کو کسی نے بتایا ہے۔ جواب صحیح ہونے کی تصدیق سُن کر نواب بے حد خوش ہوئے، جوش میں کہنے لگے۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں کسی نے نہیں بتایا۔ اس شخص نے کہا یا کسی نے اشارہ کیا ہوگا۔ یہ بھی غلط ہے۔ میں نے خود اپنے دل سے پہچانا ہے۔ اور بھولے نواب خوشی کے مارے آپے سے باہر تھے۔ کیوں نہ ہو آج عمر میں پہلی دفعہ پہیلی بوجھی تھی!

جناب مقبول احمد سیوہاروی

ایک دل چسپ لڑائی

یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دین کی خاطر بڑی بڑی لڑائیاں لڑی ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چاروں خلیفہ اپنے دین کو بچانے کے لیے سرگرم رہے ہیں۔ ان کے زمانے کی لڑائیاں ایسی ہیں جنھیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تھوڑی سی مسلمان فوج نے عیسائیوں کے بڑے بڑے لشکروں کو کیسے ہرادیا، اور ایسی لڑائیاں بھی ہیں جنھیں پڑھ کر ہنسی آتی ہے کہ دشمن کو شکست دینے کے لیے کیسی کیسی چالاکیاں کی جاتی تھیں۔

اب تم اُس لڑائی کا حال سنو جس میں عیسائی فوج کے کمانڈر نے ایک نئی چال چلی تھی۔

شاید تم سوچو کہ حضرت عثمان کون تھے تو ہم تمھیں بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ؐ کے دوستوں میں جنھوں نے سب سے زیادہ رسول اللہ ؐ کا ساتھ دیا۔ جان اور مال سے شریک رہے، اپنی جان کو جان نہیں سمجھا، چار دوست بہت مشہور ہیں۔

(۱) حضرت ابو بکر صدیق رضؓ
(۲) حضرت عمر فاروق رضؓ
(۳) حضرت عثمان غنی رضؓ
(۴) حضرت علی شیر خدا

اس وقت ذکر حضرت عثمان کا ہے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں یوں تو بہت سے شہر فتح ہوئے۔ بغاوتوں کو کچلا گیا، سمندری جنگ ہوئی۔ مگر ایک لڑائی کا ذکر بہت دل چسپ

ہے۔ یہ لڑائی طرابلس کے میدانوں میں لڑی جارہی تھی۔

ایک طرف عربوں کی فوج تھی جس کے سردار عبداللہ ابن مرح تھے، دوسری طرف رومیوں کی فوج تھی جس کا سردار جرجیر تھا۔ جرجیر بہادر بھی تھا اور بڑا ہوشیار اور چالاک تھا۔

جرجیر کی اکلوتی بیٹی بہت خوب صورت تھی اور اس کی خوب صورتی طرابلس کے شہروں اور عیسائیوں میں مشہور تھی۔

جرجیر نے جب مسلمانوں کی جاں بازی دیکھی اور یہ دیکھا کہ یہ لوگ مرنے سے ذرا نہیں ڈرتے اور کتنی ہی فوج کیوں نہ ہو بے دھڑک گھس پڑتے ہیں تو ایک نئی چال چلا۔

اس نے منادی کرادی کہ سپاہی ہو یا افسر جو کوئی مسلمانوں کی فوج کے افسر کو زندہ گرفتار کروائے گا یا قتل کر دے گا۔

میں اپنی بیٹی سے اس کی شادی کر دوں گا اور جو شہر فتح ہوگا بطور جاگیر اس کے جہیز میں دے دوں گا۔

جرجیر کی بیٹی جیسی خوب صورت تھی لڑائی میں بھی ایسا ہی کمال رکھتی تھی۔ بڑے بڑے جنرل اور کرنل اس کی لڑائی دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔

جرجیر نے منادی کی تو عیسائی فوج کا ہر ایک سپاہی اس تاک میں رہنے لگا کہ مسلمانوں کے افسر کو کسی صورت سے پکڑے تاکہ جرجیر کی بیٹی سے اس کی شادی ہو جائے۔

حضرت عثمانؓ نے طرابلس کی فوجوں کی مدد کے لیے مدینے سے کچھ جوان بھیجے تھے جن میں ہر جوان کا دعویٰ تھا کہ وہ اکیلا سیکڑوں سے لڑ سکتا ہے۔ ان جوانوں میں حضرت عباسؓ اور حضرت زبیرؓ کے بیٹے بھی تھے۔ اور ان دونوں کا نام عبداللہ تھا۔ عبداللہ ابنِ عباسؓ، عبداللہ ابنِ زبیرؓ۔ حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ بھی تھے۔ جن کی بہادری کی تمام عرب میں شہرت تھی۔

حضرت زبیرؓ کے بیٹے عبداللہ نے بھی جرجیر کی لڑکی کی شہرت سنی تھی اور جب کبھی اس لڑکی کا ذکر آتا تو وہ ہنس کر کہتے کہ اگر ہم نے دشمن کو پکڑ لیا یا اللہ کی خوشنودی کی نیت سے قتل کر دیا تو مال بھی ملے گا اور اسی دنیا میں ایک حور بھی مل جائے گی۔ انھیں معلوم تھا کہ جرجیر نے عبداللہ ابن مرح کمانڈر فوج اسلام کے لیے یہ جال بچھایا ہے۔

یہ نوجوان جب مسلمانوں کے پڑاؤ پر پہنچے تو

فوج کے کمانڈر عبداللہ ابن مرح ایک اونچی ٹیکری پر خیمے میں تھے اور ان کے چاروں طرف فوجوں کا پہرا تھا۔ عبداللہ ابنِ زبیرؓ نے ان سے کہا آج ہی اپنی فوج میں منادی کر دیجیے کہ جو کوئی جرجیر کو زندہ گرفتار کرے گا یا اُسے قتل کر دے گا تو اس کی شادی جرجیر کی بیٹی سے کر دی جائے گی۔ اور ایسا ہی ایک اشتہار دشمن کی فوج میں بھی بھجوا دیجیے، پھر آپ میدان میں نکلیے اور دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے سالارِ فوج کی یہ منادی سپاہیوں نے سُنی تو ان میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا اور لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔

حضرت زبیرؓ کے بیٹے عبداللہ بڑے جانباز سپاہی تھے۔ بے حد دلیر اور بہت خوب صورت!

گھمسان کی لڑائی ہوئی تو یہ بھی بڑھ کر جرجیر کی طرف چلے اور آخر حضرت عبداللہ نے جرجیر کو قتل کر دیا اور لڑکی کو گرفتار کر لیا۔

اور جب عیسائی فوجوں کو شکست ہوئی اور مال و دولت کی لوٹ ہوئی تو لوٹ کے مال کے ساتھ جرجیر کی لڑکی بھی مدینہ بھیجی گئی۔ جرجیر کی لڑکی نے راستے بھر عبداللہ کے طور طریقے دیکھے۔ وہ لڑکی کو دیکھتے بھی نہ تھے اور راستے بھر اس کی عزت کرتے رہے تھے۔ لڑکی نے سوچا کہ وہ ایک لونڈی سے زیادہ نہیں ہے۔ جو چاہے گا اس کی قیمت دے گا اور اسے حاصل کر لے گا

مگر جب اس نے کہا کہ میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں تو اسے آزاد کر دیا گیا کہ وہ خود مختار ہے۔ اور جب اس کی منشا معلوم ہو گئی تو حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ سے اس کی شادی کر دی گئی جسے ایک شریف اور عزت دار بہو بنا کر عبداللہ اپنے گھر لے آئے۔



جناب پروفیسر امانت

پھول کی نصیحت

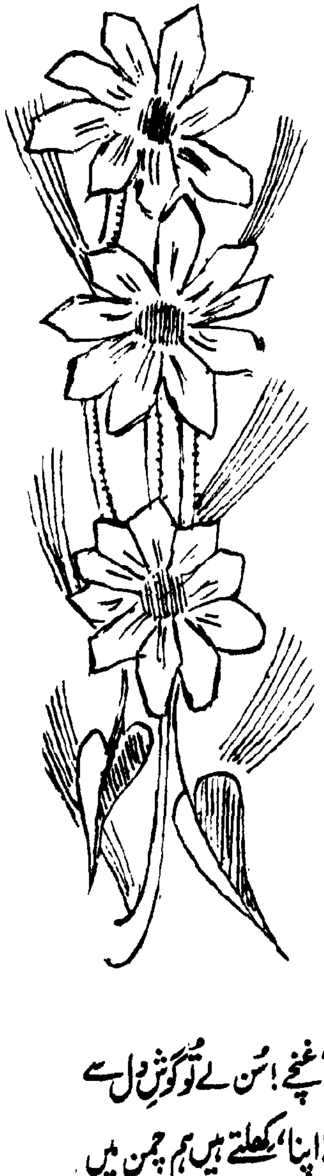
(بڑے پیامیوں کے لیے)

اے ننھے مُنے غنچے! سُن لے تو گوشِ دل سے
جلوہ دکھانے اپنا، کھلتے ہیں ہم چمن میں

ہم رشکِ مُشک و عنبر، ہم حسنِ ماہ و اختر
ہم جانِ گلستاں ہیں، ہم سے جہاں مُعطّر
بُلبل ہماری شیدا، تتلی نثار ہم پر
سب کچھ لُٹا رہی ہے، رنگیں بہار ہم پر



گلشن کے شاہزادے، کہتی ہے ہم کو دُنیا
قدموں میں لوٹتا ہے، ہر لُطفِ زندگانی
پھر بھی کہیں سے پیہم آواز آ رہی ہے
گُل کی حیات فانی، گُل کی حیات فانی



تازہ گلاب کتنے، مُرجھا گئے ہیں کھِل کر
آئے ہیں لَوٹ کر پھر، بچھڑے ہیں ایسے مل کر
زخموں کا اپنے مرہم، نایاب ہے یہاں پر
اپنا پھٹا گریباں، ملتا نہیں ہے سِل کر

کِھل کر چمن میں تُو بھی، لطفِ حیات پانا
کانٹوں سے پیار کرنا، کلیوں کو چوم لینا
رُخصت سے میری ہرگز، افسردہ تُو نہ ہونا
غم کو مرے بھُلا کر، ڈالی پہ جھوم لینا

خوشبو لُٹانا ہر سُو، فرضِ حسیں ہمارا
لیکن قیامِ دائم، ممکن نہیں ہمارا
یہ زندگی سفر ہے، غافل کبھی نہ ہونا
ہر لمحہ قیمتی ہے، بے کار اسے نہ کھونا

اے ننھے مُنے غنچے! سُن لے تُو گوشِ دل سے
جلوہ دکھائے اپنا، کھلتے ہیں ہم چمن میں

جناب حمید اللہ خاں سلام افغانی اندوری



دُھن ہو تو ایسی

نیوٹن پیامِ تعلیم میں عرصے سے سائنس اور سائنس دانوں کے بارے میں مضمون شائع ہو رہے ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ آج میں بھی کچھ لکھ رہا ہوں۔ ان سائنس دانوں کے بارے میں جو اپنے کام کی دُھن میں معمولی کاموں کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ ایسی بھول کر بیٹھتے تھے کہ سُن کر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔

ایسے سائنس دانوں میں ایک سر اسحاق نیوٹن بھی تھے۔ یہ وہی سائنس داں ہیں جنھوں نے زمین میں کشش کی بات بتائی۔ یہ ایک دن اپنے باغیچے میں بیٹھے تھے کہ ایک پھل پیڑ پر سے نیچے گرا۔ بس پھر کیا تھا سوچنا شروع کر دیا۔ یہ پھل نیچے کیوں گرا؟ اوپر کیوں نہیں اُڑ گیا؟ آخر سوچتے سوچتے ایک دن معلوم کر لیا کہ زمین میں کشش ہوتی ہے جس کی وجہ سے اوپر پھینکی ہوئی چیزیں زمین پر گر جاتی ہیں۔

اچھا اب ذرا سائنس دانوں کی بھول کا حال بھی پڑھیے۔ نیوٹن نے ایک بلّی پالی تھی۔ اس بلّی کے بچّہ ہوا۔ جب یہ بچّہ چلنے پھرنے لگا تو ایک روز وہ اپنی ماں کے ساتھ دروازے پر آکر رُک گیا اس لیے کہ دروازہ بند تھا۔ نیوٹن نے فوراً بڑھئی کو بلا کر کہا۔ اِس دروازے میں دو سوراخ کیے جائیں۔ جن میں سے ایک سوراخ سے بلّی اور دوسرے سے بچّے نکل جائیں۔ بڑھئی نے کہا جناب جس سوراخ سے بلّی نکلے گی اِسی سے بچّہ بھی نکل جائے گا۔ لیکن یہ سیدھی سادی بات لاکھ سمجھانے پر بھی

نیوٹن کے دماغ میں نہ آئی۔ بڑھئی نے کہا اچھا ٹھہریے میں بلی کے لیے سوراخ بنائے دیتا ہوں۔ بڑھئی نے بلی کے لیے سوراخ بنایا اور اس میں سے پہلے بلی اور پھر بچے کو نکال دیا۔ تب کہیں نیوٹن کی سمجھ میں اتنی سی بات آئی۔

اور سنیے، ایک بار نیوٹن کے جوتے خراب ہو گئے۔ اس نے اپنی ماما سے کہا میں تو بازار جاؤں گا نہیں، تم میرے لیے بازار سے جوتے مول لے آنا۔ ماما نے نیوٹن کے پیر کا ناپ لے لیا۔ تھوڑی دیر بعد کسی کام کے لیے نیوٹن کو بازار جانا پڑا۔ ماما نے کہا آپ بازار جا رہے ہیں جوتے لیتے آئیے گا۔ نیوٹن بازار گیا لیکن جوتے نہ لایا۔ نوکرانی نے پوچھا آپ جوتے کیوں نہیں لائے۔ نیوٹن نے کہا پیر کا ناپ تو تمھارے ہی پاس رہ گیا تھا۔

نیوٹن اپنے تجربات میں دن رات مشغول رہتا تھا۔ ایک بار ماما ٹھیک وقت پر کھانا لا کر میز پر رکھ گئی لیکن نیوٹن اس وقت کام میں لگا ہوا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا منہمک تھا کہ اس کو یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ اسی دوران ایک دوست نیوٹن سے ملنے کے لیے آئے۔ نیوٹن تو اپنے کام میں لگا تھا۔ دوست سے باتیں نہ کر سکا۔ اِدھر دوست کو بھوک لگی تھی، اس نے نیوٹن کا کھانا کھا کر برتن ویسے ہی جما دیے۔ اور چلا گیا۔ نیوٹن جب اپنے کام سے فارغ ہوا تو کھانے کی میز پر گیا۔ اس نے برتن اُٹھا کر دیکھے اور کہا: "میں بھی کیا انسان ہوں، یہ بھی یاد نہ رہا کہ کھانا کھا چکا ہوں" اور چپ چاپ واپس اپنے کام میں لگ گیا۔

ایڈیسن

آج شہروں میں بجلیاں اور پنکھے وغیرہ چلتے ہیں۔ ٹیلیفون پر روزانہ ہزاروں آدمی بات چیت کرتے ہیں، گراموفون پر گانے سنے جاتے ہیں اور سینما کے پردے پر چلتی پھرتی اور بولتی ہوئی تصویریں ہماری تفریح کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ ایکسرے کی مشین کے ذریعے جسم کی ایک ایک ہڈی کی تصویر لی جاتی ہے جس سے بیمار شخص کے جسم کے اندر کی ہڈیوں کی بیماری جلد ہی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اِن چیزوں کی ایجاد کرنے والا امریکہ کا رہنے والا ایڈیسن تھا۔ وہ دن رات اپنی تجربہ گاہ میں نئی نئی ایجادیں کرنے میں مشغول رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ چالیس برس کا ہوا تب بھی وہ کنوارا تھا۔

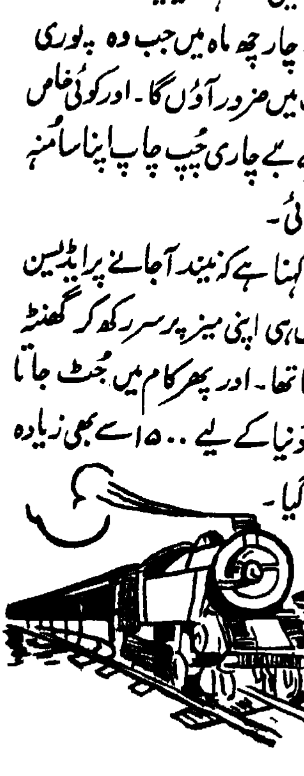
ایک دن ایڈیسن کے دوستوں نے زور دیا کہ اب تمھیں شادی کر لینا چاہیے۔ دوستوں کی بات مان کر اس نے ہاں کر دی۔ دوستوں نے اس کے بیاہ کا اشتہار نکالا۔ تھوڑے ہی دن میں ایڈیسن سے شادی کی خواہش رکھنے والی لڑکیوں کے فوٹو اکھٹے ہو گئے جس سے کئی الماریاں بھر گئیں۔ اب ان کے دوستوں نے کہا کہ ان میں سے کسی لڑکی کو اپنے لیے پسند کر لو۔ لیکن ایڈیسن تو ان فوٹوؤں کی تعداد دیکھ کر ہی ڈر گیا۔ اس نے بغیر جانچ پڑتال کیے ایک فوٹو الماری سے نکال کر دوستوں کو دے دیا۔ اس فوٹو والی لڑکی کو اطلاع دی گئی۔ وہ پھولی نہ سمائی اور دونوں کا بیاہ ہو گیا۔

ایڈیسن نے جیب سے اپنے گھر کی چابی نکالی اور اپنی بیوی کو دیتے ہوئے کہا سب سامان گھر میں ہے، نوکر سے کام لیجیے اور مزے سے رہیے۔ بیوی گھر آئی۔ اتنے بڑے آدمی کے گھر میں سب کچھ تھا لیکن ایک چیز نہ تھی، کون؟ خود ایڈیسن! جب ہفتوں پر ہفتے، مہینوں پر مہینے بیت گئے اور بیوی کو ایڈیسن کے درشن نہ ہوئے تب اس نے تجربہ گاہ میں جا کر ایڈیسن کو اطلاع دی۔ ایڈیسن اس کی طرف دم بخود ہو کر دیکھنے لگا۔ بیوی نے کہا: "آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔" ایڈیسن نے بڑے دھیان سے دیکھ کر پوچھا "آپ کون ہیں ---؟"

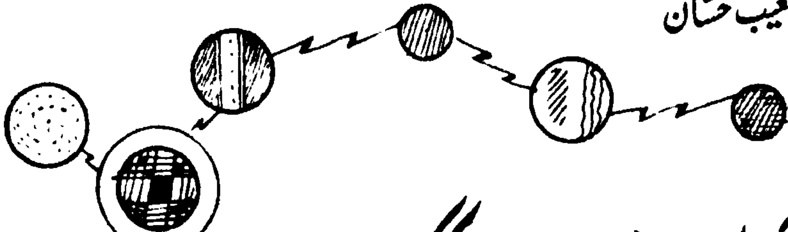
بیوی نے پھر کہا "آپ نے مجھے نہیں پہچانا"

ایڈیسن نے جواب دیا "کہیں دیکھا تو ہے"۔ جب بیوی نے شادی کی یاد دلائی تو کہنے لگا "ہاں ہاں، ٹھیک ہے، ویسے آپ کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے؟" بیوی نے کہا "آپ کے دیدار نہیں ہوتے، یہی تکلیف ہے۔" ایڈیسن نے کہا دیکھیے میں ایک کھوج میں لگا ہوا ہوں۔ چار چھ ماہ میں جب وہ پوری ہو جائے گی، تب میں ضرور آؤں گا۔ اور کوئی خاص بات تو نہیں ہے؟ بے چاری چپ چاپ اپنا سا منہ لے کر گھر لوٹ آئی۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ نیند آ جانے پر ایڈیسن اپنی تجربہ گاہ میں ہی اپنی میز پر سر رکھ کر گھنٹہ دو گھنٹہ سو جاتا تھا۔ اور پھر کام میں جٹ جاتا تھا۔ تب ہی تو دنیا کے لیے ۱۵۰۰ سے بھی زیادہ ایجادیں چھوڑ گیا۔



جناب محمد شعیب حسّان



ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا

آپ نے ڈاکٹر بھابھا کا نام سنا ہوگا۔ ہندوستان کے بلکہ دنیا کے مانے ہوئے سائنس داں تھے۔ پچھلے دنوں ہوائی جہاز کے حادثے میں اچانک ان کی موت ہوگئی۔ ممبئی کی سرکار نے ابھی چند دنوں پہلے ان کے یادگاری ٹکٹ جاری کیے ہیں۔ شاید آپ کی نظر سے گزرے ہوں۔

ڈاکٹر بھابھا ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو ممبئی کے ایک متموّل پارسی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد سر جے۔ ایچ۔ بھابھا بیرسٹر تھے۔ اور ٹاٹا کمپنی کے مقدمات کی پیروی کیا کرتے تھے۔ انھوں نے آکسفورڈ سے ایم۔ اے کیا تھا اور انگلینڈ سے بیرسٹرایٹ لا کی ڈگری لی تھی۔ ڈاکٹر بھابھا نے کیتھیڈرل اور کینن اسکول، ایلفنسٹن کالج اور انسٹی ٹیوٹ آف سائنس ممبئی میں سترہ سال کی عمر تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج گئے۔ وہاں سے انھوں نے میکینکل سائنس میں بی۔ اے کی ڈگری لی۔

بچپن سے ڈاکٹر بھابھا کا میلان آرٹ یا مصوّری کی طرف تھا۔ انسان سوچتا کچھ ہے مگر تقدیر اس کو اسی راہ پر لے آتی ہے جس کے لیے وہ وجود میں آیا تھا۔ ان کے والد نے ان کو مجبور کر کے انجینیرنگ کی اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اسی دَوران میں ان کی ملاقات پال ڈریک (Paul Drak) سے ہوئی جس نے ان کی ذہانت دیکھ کر ان کو ریسرچ ورک یا تحقیقی کام میں اپنے ساتھ لگا لیا۔ اسی وقت سے ان کی سائنٹیفک زندگی شروع ہوئی۔

ڈاکٹر بھابھا بہت ذہین اور دور اندیش تھے۔ یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے، ہمارا ملک ابھی آزاد بھی نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے ٹاٹا برادرز کو مجبور کر کے TaTa Institute of Fundamental Research کی داغ بیل ڈالی۔ یہ واقعی بڑی دور اندیشی کی بات تھی، کیوں کہ ابھی ملک کے آزاد ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا۔ اور اس کے فائدے انگریزوں کو پہنچ سکتے تھے۔ مگر ذہین سائنس داں کی آنکھیں مستقبل قریب میں ملک کو آزاد ہوتا دیکھ رہی تھیں۔ وہ آزاد ہونے سے پہلے ملک کے تعمیری کام میں لگ گیا تاکہ آزاد ہوتے ہی بہت سی ضروری چیزوں کے لیے ملک کسی کا دست نگر نہ رہے۔

آٹمک اِنرَجی کا ادارہ قائم کرنے کا سہرا بھی ڈاکٹر بھابھا کے سر ہے۔ ۵۷-۱۹۵۶ء میں جواہر لال نے ایک تقریب میں ڈاکٹر بھابھا کی تعریف کرتے وقت ان دونوں اداروں کے بارے میں کہا تھا " یہ مندر ہیں نئے ہندوستان کے" اور ڈاکٹر بھابھا کو نئے ہندوستانی حکومت کی طرف سے سائنس کی ریسرچ کے سلسلے میں پوری امداد کا یقین دلایا تھا۔ شروع سے ہی ڈاکٹر بھابھا کی یہ کوشش رہی کہ آٹمک اِنرَجی اور انجینیرنگ کے تمام کارناموں کو لڑائی کے لیے نہیں بلکہ امن اور ترقی کے لیے استعمال کیا جائے۔ اور اس کا اظہار انھوں نے ۱۹۵۵ء میں جینوا میں "ایٹمی طاقت کا استعمال امن کے لیے"، کانفرنس میں اپنے صدارتی خطبہ میں کیا تھا۔ اور انھوں نے اس سلسلے میں جس طور سے کام کرنے کا اشارہ کیا تھا اس پر کام کر کے مغربی جرمنی کے سائنس دانوں نے کامیابی کی طرف ایک بڑا قدم اٹھایا۔ جس کا اعلان انھوں نے ہومی بھابھا کی موت کے دو دن بعد کیا۔

اکتوبر ۱۹۶۱ء میں سوویت یونین اور ہندوستان کے درمیان پلاٹینیم پر کام کرنے والے ایٹمی طاقت کے ری ایکٹر کے ڈیزائن سے متعلق تحقیقات کے میدان میں نیز ایک سائیکل تھوریم یعنی یورینیم نمبر ۲۳۳ سے متعلق تحقیق کے میدان میں باہمی تعاون کے ایک معاہدے کی تکمیل ہوئی۔ ہندوستان کے پاس تھوریم کا دنیا میں سب سے بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اسے ایک نیوکلیائی ایندھن یورینیم ۲۳۳ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح سے ہندوستان کے پاس برقی قوت کا اتنا بڑا خزانہ ہو جائے گا جو سیکڑوں سال تک کفالت

کرسکتا ہے۔

عظیم سائنس داں نے اسے محسوس کرلیا اور ایک سائنس داں کی حیثیت سے اپنی ساری طاقت اور صلاحیت اور اپنی زبردست انتظامی لیاقت ان منصوبوں کی جلد سے جلد تکمیل کے لیے وقف کردی۔ انھوں نے سات سال سے بھی کم وقفے میں ہندوستان میں بہت کچھ کر دکھایا۔ ۳ لاکھ ۸۰ ہزار کلوواٹ کی صلاحیت کا ایک بڑا ایمٹی برقی اسٹیشن تاراپور میں تعمیر کیا گیا۔ دوسرا بڑا اسٹیشن راجستھان میں اور تیسرا مدراس میں قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ تینوں اسٹیشن جلد از جلد اپنا کام شروع کردیں گے۔ اور عظیم سائنس داں کے سنہرے خواب حقیقت میں بدل جائیں گے۔

ڈاکٹر بھابھا کبھی کسی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوئے۔ انھوں نے ہمیشہ ایسے آدمی کو پسند کیا جو کام لگن اور محنت سے کرتا ہو۔ انھوں نے ملک کے کونے کونے میں گھوم کر چھانٹ چھانٹ کر قابل اور محنتی لوگوں کو ڈھونڈھ نکالا۔ ان کا کہنا تھا کہ عالی شان عمارتیں بنانے سے ترقی نہیں ہوتی۔ قابل اور ذہین لوگوں کو ان کے صحیح مصرف میں لانے سے ملک آگے بڑھتا ہے۔ ایسے لوگوں نے انجانی

ڈاکٹر بھابھا کو ہمیشہ اپنا مددگار، راہبر اور ہمدرد پایا۔

ڈاکٹر بھابھا کی ہمیشہ خواہش رہی کہ جس طرح سیاست کے میدان میں ہندوستان دوسرے ملکوں کے لیے امن کا پیام بر ہو، امن کے مقصد کے لیے ایٹم کا استعمال کرنے والا پہلا ملک بھی ہندوستان ہو۔ اور اس سلسلے میں تمام دنیا کی رہنمائی کرسکے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے جان توڑ کوشش کی تاراپور، مدراس وغیرہ کے پاور اسٹیشن اس کا زندہ ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر بھابھا کو سائنس کی خدمت کے صلے میں سب سے پہلے ۱۹۴۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے آدم پرائز دیا۔ اس کے بعد ہوپکنسن پرائز ۱۹۴۸ء میں کیمبرج فلاسفیکل سوسائٹی نے دیا۔ ۱۹۵۷ء میں ان کو حکومت ہند نے پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا۔ اس کے علاوہ ان کو بہت سی یونیورسٹیوں نے آنریری ڈگریاں دیں۔ وہ مختلف سائنسی اداروں کے پریزیڈنٹ بھی تھے۔

ڈاکٹر بھابھا نے اپنے آپ کو سائنسی کاموں کے لیے وقف کردیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر گھریلو ذمے داریوں میں پھنس گئے تو سائنس کا

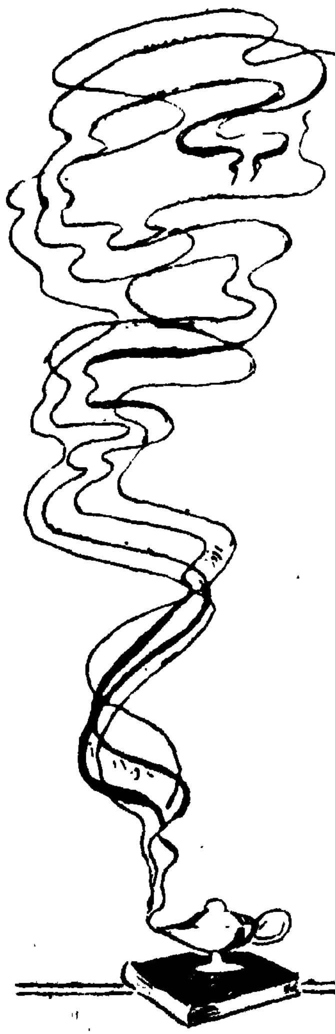
کام اتنی لگن سے نہ کر سکیں گے۔ اسی لیے انھوں نے شادی بھی نہیں کی تھی۔

ہندوستان کا یہ عظیم معمار جنوری ۱۹۶۶ء میں غریب الوطنی کی حالت میں اس دُنیا سے رخصت ہوا۔ خدا اس کی امیدوں کو پورا کرے اور ہندوستان سیاست کے ساتھ ساتھ سائنس کے میدان میں بھی دُنیا کے لیے امن کا پیام بر ثابت ہو۔

روس کے مشہور سائنس داں پروفیسر ابلیانوف نے ہندوستان کے اس عظیم سائنس داں کی موت پر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر ہومی بھابھا کی زندگی بے کار نہیں گزری، آج ان کی کوششوں کی بدولت ایٹمی سائنس دانوں کا ایک بہت بڑا گروہ تربیت پا چکا ہے۔ ان کے شاگرد سیتھنا، مینن، راؤ، دیال، پرکاش، پرساد اور سارا بھائی، سے سوویت ماہرین اچھی طرح سے واقف ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ اور سارے ہندوستانی عوام کے ساتھ مل کر ہم اس زبردست سائنس داں اور انسان کی موت کا ماتم کرتے ہیں۔" کچھ ایسے زخم ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے گہرا داغ چھوڑ جاتے ہیں۔ اور ڈاکٹر ہومی بھابھا کی المناک موت بھی ایک ایسا ہی زخم ہے۔

جناب کوثر اعظمی

وہ آدمی



دیکھ کر اوروں کا غم دل جس کا بھر آتا نہ ہو
جو کسی کے کام آڑے وقت پر آتا نہ ہو
ظلم ڈھاکر بھی کسی پر جو کہ شرماتا نہ ہو
آدمی کہنے کو ہے لیکن نہیں وہ آدمی

آدمی ہے آدمی وہ درحقیقت دوستو!
جس کو ہو سارے زمانے سے محبت دوستو!
جس کے دل میں موجزن ہو جوشِ خدمت دوستو!
ہے دُعا کوثر کی تم بن کر اُٹھو وہ آدمی

جس کا شیوہ دوستی ہو اہلِ عالم کے لیے
جو نشانِ راستی ہو اہلِ عالم کے لیے
جو سراپا آشتی ہو اہلِ عالم کے لیے
ہے دُعا کوثر کی تم بن کر اُٹھو وہ آدمی

جناب اشتیاق بچھرایونی

بتاشے کہاں گئے؟



انور میاں کی نت نئی شرارتوں سے ان کے ساتھی تو ساتھی مولوی صاحب تک پریشان ہو چکے تھے۔ ماشاء اللہ بہت ذہین تھے۔ آئے دن نت نئی شرارتیں سوجھتی تھیں۔ مولوی صاحب اکثر اُن کی خاصی مرمت کر دیتے تھے۔ پر انور میاں باز نہ آتے تھے۔ بالکل چکنا گھڑا بن گئے تھے۔

اور اگر کبھی کبھار مولوی صاحب کوئی کھانے پینے کی چیز اُن کے ہاتھ گھر بھیجتے تو یوں سمجھیے کہ انور میاں کی عید ہو جاتی۔ بس راستے ہی میں انور میاں کے پیٹ میں پہنچ جاتی۔ مولوی صاحب جلبلا جاتے، جی بھر کے سزا دیتے۔ پر کیا مجال جو انور میاں پر ذرا بھی اثر ہو۔ آخر انھوں نے یہ سلسلہ ہی بند کر دیا تھا۔

پر ایک دن اتفاق سے مولوی صاحب کے پاس نذر نیاز کے بتاشے آئے۔ اِس وقت چھٹی ہو چکی تھی۔ بس ایک انور میاں سبق سے کشتی لڑ رہے تھے۔ سزا کے طور پر ابھی تک انھیں چھٹی نہیں ملی تھی۔

مولوی صاحب کو آج کچھ بہت ضروری کام تھے۔ سوچ رہے تھے کہ یہ بتاشے کیسے

گھر بھیجے جائیں۔ آخر ایک بات اُن کی سمجھ میں آئی۔ انھوں نے مسجد کے ایک بدھنے میں بتاشے رکھ کر اس کا منھ اچھی طرح بند کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ انور کی نیت خراب ہوئی، اس نے بتاشے نکالنے کی کوشش کی تو بدھنے کا منھ کھل جائے گا۔ چوری پکڑی جائے گی۔ انھوں نے بدھنا انور کے حوالے کیا اور کہا: "یہ گھر پہنچا آؤ اور استانی سے کہدینا آج مجھے آنے میں کچھ دیر لگ جائے گی۔"

انور میاں نے بڑی سعادت مندی سے "جی اچھا کہا" اور بدھنا لے کر چل پڑے۔ اپنے جی میں کہنے لگے۔ اب کے تو مولوی صاحب نے بڑا انتظام کیا ہے۔ وہ یہی سوچ رہے تھے کہ سامنے میونسپلٹی کا نل نظر آیا۔ بس پھر کیا تھا۔ انور میاں کا چہرہ جیسے کھل اٹھا۔ فوراً نل کی طرف چل پڑے۔

......

مولوی صاحب رات گئے گھر لوٹے بیوی نے آڑے ہاتھوں لیا: "بھلا اس عمر میں مذاق کی کیا سوجھی، خالی بدھنا اس اہتمام سے بھیجا گیا؟"

مولوی صاحب بے چارے گم سُم! آج بھی چُل دے گیا۔ پر وہ بیوی سے کیا کہیں۔ وہ اسی طرح بکتی جھکتی رہیں۔

دوسرے دن صبح کو انور میاں بھولی صورت بنائے مکتب میں آئے۔ مولوی صاحب بھرے بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی برس پڑے۔ دانت پیس کر بولے: "کیوں جی وہ بتاشے کیا ہوئے۔" انور نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ "کون سے بتاشے مولوی صاحب؟" مولوی صاحب نے قہرآلود نگاہوں سے اس کو دیکھا اور بولے: "جی وہی جو کل میں نے آپ کے ہاتھ گھر بھیجے تھے۔" انور نے جواب دیا: "جی مولوی صاحب وہ تو آپ نے مجھے ایک بدھنا دیا تھا وہ میں جوں کا توں گھر دے آیا تھا۔"

مولوی صاحب کو غصہ تو بہت آیا پر وہ پی گئے۔ اور ہنس کر بولے: "انور میاں میں ناراض نہیں ہوں، ہاں اچنبے میں ضرور ہوں۔ بھلا بدھنے کو کھولے بغیر تم نے بتاشے کیسے نکال لئے۔ سچ سچ بتاؤ میں کچھ نہ کہوں گا۔"

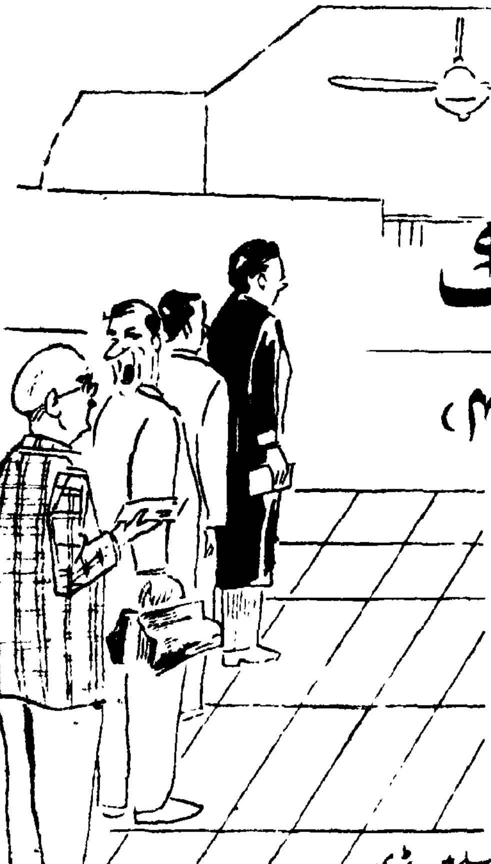
مولوی صاحب کا انداز بدلتا دیکھ کر انور کی جان میں جان آئی۔ بولا: "مولوی صاحب

میں بہت دیر تک ان بتاشوں کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں رہا۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ چلتے چلتے سڑک کے کنارے میونسپلٹی کا نل نظر پڑا۔ بس پھر کیا تھا۔ ساری مشکلیں حل ہوگئیں۔ میں نے ٹونٹی سے بدھنے میں پانی بھرا۔ بدھنے کو خوب ہلایا۔ اس طرح ثابت بتاشے تو نہ مل سکے۔ ہاں ان کا گاڑھا گاڑھا شربت پینے کو مل گیا۔ بدھنا خالی ہوگیا تو جوں کا توں گھر دے آیا۔"

یہ سن کر مولوی صاحب بے اختیار مسکرا دیے بولے: "انور بیٹا میں تمھاری ذہانت کی داد دیتا ہوں۔ لو یہ مٹھائی لو یہ تمھارا انعام ہے۔ پر وعدہ کرو آئندہ ایسی شرارت نہ کروگے۔ کاش کے تم جی لگا کر پڑھو اور یہ ذہانت پڑھنے لکھنے میں کام میں لاؤ تو کیسا اچھا ہو۔ اچھا جاؤ گھر جا کر یہ سارا ماجرا بتا دینا۔ استانی بی مجھ سے بہت خفا ہیں۔"

مولوی صاحب کے اس محبت بھرے انداز نے جادو کا کام کیا۔ انور کی نگاہیں نیچے ہوگئیں۔ اس نے آہستہ سے کتاب اٹھائی اور مولوی صاحب کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس نے اب فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ شرارت نہ کرے گا۔

جناب ابوالکلام



دہلی سے نیویارک

(۴)

مگر اس وقت جہاز کو غور سے دیکھنے کی کہاں فرصت تھی! ہم تو سیدھے کسٹم کے دفتر کی طرف چلے جا رہے تھے۔ یہاں پہنچ کر ایک اینگلو انڈین صاحب سے مڈبھیڑ ہوئی۔ پوری وردی پہنے کرسی پر براجمان تھے۔ مجھ سے کاغذات مانگے۔ میں نے سب سے پہلے پاسپورٹ پیش کیا۔ انھوں نے شروع سے آخر تک دیکھا۔ پوچھنے لگے آپ کے پاس کتنے ڈالر ہیں۔ میں نے جواب دیا چار سو نوّے (۴۹۰) کہنے لگے پاسپورٹ میں تو ان کا ذکر نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بڑی ردوکد ہوئی، بہت سوال و جواب ہوئے۔ آخر میں کہنے لگے "یہ سب ڈالر آپ نہیں لے جا سکتے"۔ کچھ نہ پوچھو اس وقت جو پریشانی ہوئی۔ گوون برادرس کی ایک ذرا سی غلطی کا یہ نتیجہ تھا۔ اس غلطی کو درست کرانے کے لیے نہ میں دہلی جا سکتا تھا نہ پاسپورٹ بھیج سکتا تھا۔ بے چارے مسٹر گاریس صاحب بھی عجیب کشمکش و پیچ میں تھے۔ آخر کچھ سوچ کر انھوں نے کہا: "تو یہ سب چیک آپ مجھے دے دیجیے۔ میں یہ سب چیک گوون برادرس کو بھیج دیتا ہوں۔ وہ آپ کو راستے میں کسی جگہ تار کے ذریعے

ڈرافٹ بھیج دیں گے۔" میں نے سارے چک ان کے حوالے کر دیے۔ کسٹم آفیسر نے خانہ پری کر دی۔ فارم میں لکھ دیا کہ میرے پاس کوئی ڈالر نہیں ہے۔ ہاں ویسے ایک سو بیس روپے تک مسافر باہر لے جا سکتا ہے۔ اس کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں۔

کسٹم کے دفتر سے نجات ملی تو ہم سامان کے پاس آئے۔ دفتر سے ذرا دور نکلے تھے کہ گارین صاحب نے چک مجھے واپس کر دیے۔ میں نے پوچھا "یہ کیا" فرمانے لگے: "ارے جناب یہ چک اپنے پاس رکھیے۔ فکر نہ کیجیے۔ میں گودن برادرس کو ابھی تار دیے دیتا ہوں وہ آپ کو چین پر تار کے ذریعے انڈورسمنٹ بھیج دیں گے۔" میں نے پوچھا: "تو پھر آپ نے یہ شعبدہ کیا کیا؟" کہنے لگے: "یہ کسٹم آفیسر کو تسلی دینے کے لیے کیا تھا تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ آپ ڈالر ساتھ نہیں لے جا رہے ہیں۔" میں نے ان کی عقل مندی کی داد دی اور اور بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

جوں ہی میں نے یہ چک بکس میں بند کیا، خان برادرس کا تقاضا ہوا کہ چلو سامان جہاز میں لے چلیں۔ میں نے کہا "بھئی جانچ تو ہوئی نہیں۔" کہنے لگے "بس یہی جانچ تھی" یہ کہہ کر انھوں نے قلیوں کو اشارہ کیا۔ وہ تو جیسے انتظار میں تھے۔ سامان اُٹھا فوراً چل کھڑے ہوئے۔

جہاز پر چڑھنے کے لیے کوئی پچیس فٹ لمبی سیڑھی لگی تھی۔ اس پر چڑھ کر جہاز میں داخل ہوئے۔ تھوڑی دور کھلے صحن میں چلنا پڑا۔ پھر کیبن آ گئے۔ ان میں داخل ہوئے، تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی عمدہ مکان میں داخل ہو رہے ہیں۔

جیسے ہی ہم جہاز میں داخل ہوئے، جہاز کے ایک افسر نے میرا ٹکٹ دیکھا اور قلیوں کو ایک خاص کیبن میں سامان لے جانے کی ہدایت کی۔

میں نے اپنا سامان کیبن میں جمایا۔ قلیوں کو رخصت کیا۔ کیبن کے دروازے میں چابی لگی تھی۔ سامان سلیقے سے رکھ کر میں نے کیبن کا دروازہ بند کیا۔ چابی جیب میں رکھی اور دوستوں کے کیبن میں جا دھمکا۔ یہاں خان برادرس کے دو تین دوست بھی موجود تھے۔ دیر تک گپ ہوتی رہی۔ اُس وقت ساڑھے پانچ بجے تھے۔ اطلاع ملی کہ چھ بجے ڈِنر (رات کا کھانا) ہوگا۔ یہ سن کر خان برادرس کے دوست اٹھ کھڑے ہوئے۔

دروازے تک انھیں پہنچانے آئے، اور آخری سلام کیا۔

وہاں سے لوٹے ہیں تو ایک پولس افسر صاحب سے نظر آئے۔ ہمارے پاسپورٹ دیکھے اور ان پر روانگی کی تاریخ لکھ دی۔ یہ صاحب سیکورٹی پولیس کے افسر ہیں۔ باہر جانے والے مسافروں کی جانچ کرتے ہیں۔ ان سے چھٹی ملی تو ایک صاحب بنگالی دھوتی میں اسی طرف آتے نظر آئے۔ بڑی پریشانی تھی۔ نہ جانے اِن بلاؤں سے کب پیچھا چھٹے گا۔ آگے بڑھ کر پوچھا "آپ کون صاحب ہیں؟" کہنے لگے "میں گولڈ اسٹون کا آدمی ہوں۔" یہ سُن کر کچھ اطمینان ہوا۔ اور اُن سے کہا جی ہاں کسٹم نے ہمارا سامان دیکھ لیا۔ جبھی تو ہم یہاں آسکے ہیں۔ یہ سن کر وہ جدھر سے آئے تھے اسی طرف واپس چلے گئے اور ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔

ابھی چھ بجنے میں کچھ وقت باقی تھا۔ ہم نے ڈِنر کی تیاری کرنے کے لیے ہاتھ مُنھ دھویا۔ ذرا بال وال دُرست کیے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بیرا، ایک موٹا سا گھنٹہ ہاتھ میں لیے ہمارے ہی سامنے چلا آرہا ہے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً بجانے لگا۔ اتنی زبردست آواز تھی کہ معلوم ہوتا تھا قیامت آنے والی ہے۔ خان برادرس کو تو جہاز ہلتا نظر آرہا تھا۔ یہ گھنٹہ غالباً جاوا کا بنا ہوا تھا۔ ایسا ہی گھنٹہ میں نے شانتی نکیتن میں دیکھا تھا۔ اسے خاص طور سے تیار کیا گیا تھا۔

آواز ختم ہوئی تو ہم نے پوچھا "کیوں بھئی یہ تو بتاؤ، یہ کیا بیماری تمھیں ہوگئی تھی۔ گھنٹہ اتنے زور سے کیوں بجا رہے تھے؟" وہ بولا: "جناب یہ آپ کے لیے ہے۔ جائیے نا ڈنر کھائیے!" میں نے کہا: "ارے عقل مند یہ بات تو دھیرے سے کہتے تب بھی ہم سُن لیتے۔ اتنے زور سے قیامت برپا کرنا کیا ضرور تھا!" اس نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا: "جناب ہم کو ایسا ہی حکم ہے۔"

خیر صاحب ہم تینوں ساتھی ڈائننگ روم یا کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک بڑا سا کمرہ ہے کوئی بیس فٹ لمبا اور پندرہ فٹ چوڑا۔ دو لمبی لمبی میزیں کمرے میں الگ الگ لگی ہیں۔ دونوں پر سفید براق سا میز پوش۔ ان پر ہر قسم کے اوزار (چھری کانٹے) سجے ہیں۔

چینی کی کچھ سفید تشتریاں بھی ہیں۔ پہلی نظر میں تو یہ کمرہ کسی اسپتال کا آپریشن روم نظر آتا ہے۔ میزوں کے چاروں طرف قرینے سے کرسیاں بھی لگی ہیں، اور بھلی لگتی ہیں۔

اتنے میں بیرے نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا یعنی یہ کہ یہ میری کرسی ہے، میں اس پر بیٹھ گیا۔ اور در و دیوار پر نظر ڈالی۔ کمرہ لکڑی کا تھا مگر دیواروں پر اتنی پالش تھی کہ ذرا پتہ نہ چلتا تھا۔ بیچ کی دیوار پر ایک خوب صورت گھڑی لگی تھی۔ گھڑی کے سامنے ایک اور میز تھی۔ اس پر بڑا سا آئینہ لگا تھا۔ یہ کھانے کا سامان رکھنے کے لیے تھی۔ آئینے میں میری صورت صاف نظر آ رہی تھی۔ غرض کمرہ بہت صاف ستھرا بہت قرینے سے سجا ہوا تھا۔

میں جب کرسی پر بیٹھا تو معلوم ہوا کہ میز ذرا دور ہے۔ میں کرسی کو آگے کھسکانے لگا۔ پر جناب اس نے تو جنبش تک نہ کی۔ یہ چاروں طرف گھوم تو سکتی تھی پر اپنی جگہ سے ہل نہ سکتی تھی، فرش پر نصب تھی۔ ناچار خود مجھے آگے کھسکنا پڑا۔

ابھی ہم لوگ سنبھل کر بیٹھے ہی تھے کہ جہاز کے افسر اپنی اپنی وردی میں چلے آ رہے ہیں اور آس پاس کی کرسیوں پر بیٹھ رہے ہیں۔ وردیاں سب کی ایک جیسی تھیں فرق بس یہی تھا کہ کسی کی سفید تھیں کسی کی خاکی۔ سب کے سب قمیص اور نیکر پہنے تھے۔ ہاں کندھوں پر مختلف قسم کے سنہرے نشان بنے تھے۔ ان نشانوں کا مطلب ہمیں معلوم نہیں تھا۔ اس لیے کچھ پتہ نہ چلا کہ ان میں کون "چھوٹے صاحب" ہیں کون "بڑے صاحب" ہیں۔ البتہ ان میں سے ایک "صاحب" سب سے بوڑھے تھے میں نے سوچا یہی سب سے بڑے افسر ہوں گے۔ ہمارا خیال ٹھیک نکلا، یہ جہاز کے کپتان تھے۔ یہ بڑے میاں خوب ہشاش بشاش تھے۔ ہم سے پورے وقت خوب باتیں کرتے رہے۔ میں ان لوگوں سے کسی اور جگہ تمھیں ملاؤں گا۔

تو جناب یہ پہلا موقع تھا کہ انگریزوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں انگریزی طرز کے میز پر کھانے کے آداب سے بالکل واقف نہ تھا اس لیے ذرا اندازہ لگاؤ میری کیا کیفیت ہوگی۔ مجھے یہ بھروسا ضرور تھا کہ یہ طور طریقے میں جلد سیکھ لوں گا۔ پر اس وقت تو دل پر بڑی گھبراہٹ تھی۔ اس وقت میں نے

یہی بہتر جانا کہ پاس جو افسر بیٹھے ہیں اُن کی نقل کرتا جاؤں ۔ پھر بھی بہت سی غلطیاں کر بیٹھا ۔ اب ان کی یاد آتی ہے تو ہنسی بھی آتی ہے ۔ مثلاً اگر آپ کھانا کھاتے میں چُھری اور کانٹا الگ الگ لیکن پاس ہی پاس رکھ دیں تو گویا آپ کھانا کھا چکے ۔ پہلے دن میں نے پانی پیتے وقت جوں ہی چُھری کانٹا اس انداز سے رکھا ۔ بیرا کھانے کی بھری پلیٹ میرے سامنے سے اُٹھا کر چلتا بنا ۔ اور جناب میں تھا کہ بس دیکھتا رہ گیا ۔

کھانا ختم ہونے کے بعد ہم لوگ کیبن میں آئے تو میں نے اپنے ساتھیوں یعنی خان بھائیوں سے یہ داستان سُنائی ۔ وہ کھانے کے انگریزی یا یورپی آداب سے تھوڑا بہت پہلے سے واقف تھے ۔ کہنے لگے بیرے نے بالکل ٹھیک کیا ۔ کانٹا چھری پاس پاس رکھ دینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کھانا ختم کر چکے ہیں ۔

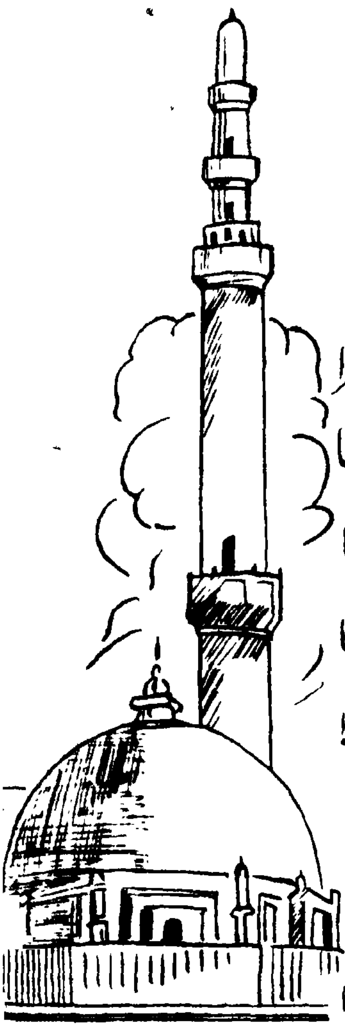
خان بھائیوں کے اِس جواب سے بڑی فکر ہوگئی ۔ آج یہ غلطی ہوئی ، کل دوسری ہوگی ۔ بہتر یہ ہوگا کہ بیرے کو الگ سے بُلایا جائے اور کھانے کے یہ انگریزی آداب ایک ایک کرکے معلوم کیے جائیں ۔ ورنہ بھوکا الگ رہنا پڑے گا بھد الگ ہوگی ۔ لوگ سمجھیں گے نہ جانے کہاں کا جاہل گنوار آپھنسا ہے ۔

بیرے کی شاگردی کا یہ خیال خان بھائیوں کو کچھ زیادہ اچھا نہ لگا ۔ پر میں تو جی میں ٹھان چکا تھا کہ ضرور کسی وقت بیرے سے یہ سب باتیں معلوم کروں گا اور میں نے پہلی فرصت میں بیرے کو اپنے کیبن میں بُلایا ۔ اور ساری حقیقت کہہ سُنائی ۔ اور کہا ”ہمارے دیس میں کھانے کے آداب بالکل مختلف ہیں اسی لیے میں انگریزی آداب بالکل نہیں جانتا ۔ تم اس معاملے میں میری مدد کرو تو بہت مشکور ہوں گا ۔“

(باقی دل چسپ حال اگلے پرچے میں دیکھیے)

جناب زین العابدین راہیؔ

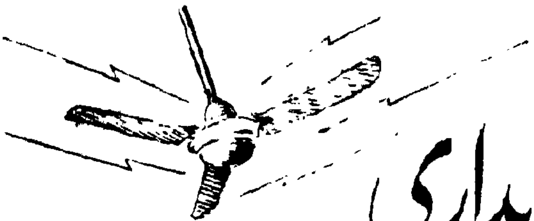
دُعا



اے خُدا! سُن لے میری دُعا — مجھ کو ہے بس ترا آسرا
رکھ کرم کی ہمیشہ نظر — اے خدا! ہم پہ صبح و مسا
ہو عطا علم کی روشنی — تیرگی زندگی کی مٹا
سایہ ہر دَم سلامت رہے — اے خدا! ہم پہ ماں باپ کا
مشکلوں میں بھی ہنستے رہیں — حوصلہ ایسا دے اے خدا!
تُو بچا ہر بُرے کام سے — نیک راہوں پہ ہم کو چلا
ہم نہ آگے کسی کے جُھکیں — کر خودی ہم کو ایسی عطا
بے سہاروں کے دُکھ درد کی — مجھ کو یارب بنا دے دوا

التجا ہے یہ تجھ سے مری
بخش دے تو مری ہر خطا

جناب مولانا بدر الدین مراد آبادی



پنکھے کی خریداری

بازار میں بجلی کے پنکھوں کی ایک بڑی شان دار دکان تھی۔

گرمی کے دنوں میں ایک دن دوپہر کے وقت دو آدمی دکان کے قریب سے گزر رہے تھے، دکان دار سمجھا شاید پنکھے کے خریدار معلوم ہوتے ہیں۔ آواز دی، آیئے جناب! کیا پنکھے وغیرہ کی ضرورت ہے۔

گاہک: جی ہاں نکلے تو ہیں پنکھے ہی لینے۔

دکان دار: جی تو تشریف لایئے، یہ لیجیے پنکھے ہی پنکھے۔ ارے ملّو (ملازم سے) ذرا جلدی سے دو کوکا کولا کی ٹھنڈی بوتلیں اور دو پان لاؤ۔

پھر گاہکوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"ہاں صاحب تو دیکھیے یہ اوشا کا ٹیبل فین ہے، یہ اورینٹ، سنی، کرامپٹن ہیں۔ سب کے سب دیکھنے میں خوب صورت، چلنے میں پائدار، اور یہ ہیں ان کی قیمتیں۔

فرمایئے کون سا پسند ہے؟"

اتنے میں ملّو نے کوکا کولا اور پان لا کر گاہکوں کے سامنے پیش کیا۔

گاہک پنکھے کی طرف نظر جمائے ہوئے کوکا کولا میں پڑی ہوئی نلکی منہ سے لگا کر چسکی لینے لگے۔

دکان دار نے اور دو قسم کے پنکھے اندر سے لا کر رکھے اور گاہکوں کو ان کی خوبی کی طرف توجہ دلائی۔

کوکا کولا ختم ہوا اور گاہکوں نے پان منہ میں

رکھتے ہوئے پوچھا "کیوں بابو جی آپ کے ہاں سب سے سستا پنکھا کتنے کا ہے؟"

دُکان دار: سب سے کم قیمت ۸۵ روپے کا پنکھا ہے۔

گاہک: اوہو بابو جی آپ کے پاس پچاسی روپے سے کم کا پنکھا ہے ہی نہیں۔ ہم تو جی دَو آنے والا کھجور کا پنکھا لینا چاہتے تھے، جو کھیت میں اور باغ میں سب جگہ کام آتا ہے۔

دَو آنے کا لفظ سُن کر دُکان دار کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ گاہکوں کی طرف گھور کر کہنے لگا تم نے پہلے ہی کیوں نہ بتایا تھا کہ دو آنے کا پنکھا لینے چلے ہو، خواہ مخواہ مجھے اتنا پریشان کیا۔

گاہک کھڑے ہوتے ہوئے بولے:

بابو جی غصہ کیوں ہوتے ہیں، ہم کوئی خود تمہاری دُکان پر تھوڑی آئے تھے۔ نہ ہم نے تم سے کہا تھا کہ کوکا کولا پلاؤ۔

تم نے خود ہی بُلایا، خود پانی پلایا اب تمہاری دُکان پر ہمارے مطلب کا سودا نہیں ہے تو کیا لیں۔

"چلو بھیا چلو"، کہتے ہوئے دونوں آگے بڑھ گئے۔

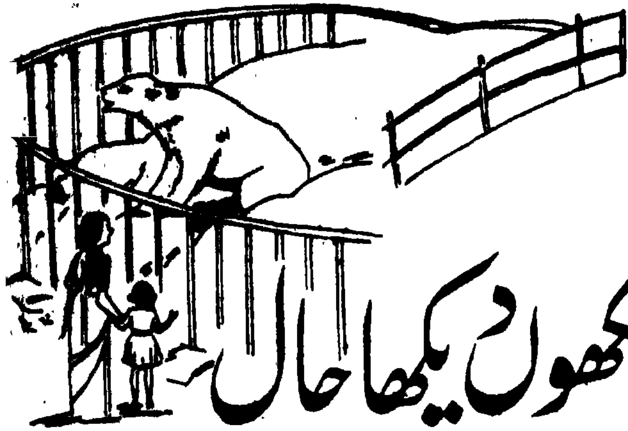
بقیہ "بچوں سے باتیں"

پیشِ نظر رکھتے تھے۔ آپ کے انتقال سے مکتبہ جامعہ ایک مخلص بہی خواہ اور ہمدرد کی سرپرستی سے محروم ہو گیا۔

خبر ملتے ہی کارکنانِ مکتبہ جامعہ و ادارہ پیامِ تعلیم کا ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں جناب غلام ربانی تاباں، جنرل منیجر مکتبہ جامعہ نے مرحوم اور مکتبہ جامعہ کے تعلقات پر روشنی ڈالی اور ایک قرار داد کے ذریعے ادارے کے رنج و غم کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ہی مکتبہ کے تمام دفاتر بند کر دیے گئے۔

پیامِ تعلیم اس غم میں محترمہ ڈاکٹر گلبانو پریم جی اور جملہ افرادِ خاندان کا شریک ہے۔

خدا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین



جناب احسان الحق جامعی

لندن کا آنکھوں دیکھا حال

(۲)

لندن کا چڑیا گھر بھی بہت مشہور ہے۔ ہر دیس کے جانور یہاں ملتے ہیں۔ بہت صاف ستھرا ہے۔ جگہ جگہ کھانے پینے کی دُکانیں ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ Zoo دیکھنے نہیں آئے ہیں کوئی بڑی سی نمائش گھومنے نکلے ہیں۔ بکری کی طرح لیکن بکری سے بہت بڑا ایک خوبصورت سا جانور ہے 'یاک'۔ وہ ایک گاڑی میں جُتا ہوا ہے اور بچے اس میں سوار ہیں۔ سینکڑوں طرح کے بندر ایک طرف ہیں۔ بڑی بڑی دُموں والے، سُرخ سُرخ گالوں والے، لمبے لمبے بالوں والے۔ آپ کی نقل کر رہے ہیں، خوخیا رہے ہیں۔ دھمکا رہے ہیں۔ کبھی دانت نکالتے ہیں۔ کبھی منہ چڑھاتے ہیں۔ آپ ہیں کہ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے ہیں۔ ہنستے اس لیے ہیں کہ وہ پنجرے میں بند ہیں ورنہ ——— ورنہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ کیا ہوتا؟

ایک جگہ اور ہے جہاں گھومنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہ جگہ ہے 'ملکہ کا محل' جسے بکنگھم پیلس کہتے ہیں۔ کسی نئے آدمی کو یہ یقین ہی نہیں آسکتا کہ بھلا انگلینڈ کی ملکہ یہاں رہتی ہوگی۔ دیکھنے میں پُرانا۔ باہر رنگ تک نہیں ہے۔ جگہ جگہ کائی جمی ہوئی ہے۔ پھر بھی دیکھنے والوں کی بھیڑ ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

لندن میں لائبریریاں ہر محلے میں مل جاتی ہیں۔ انگلستان کی لائبریریوں میں لگ بھگ دس کروڑ کتابیں ہیں۔ اور دیس کی ایک تہائی آبادی ان کی ممبر ہے۔ بچوں کی کتابیں تو ان گنت ہیں۔ کتابیں کیا اگر آپ کوئی گراموفون ریکارڈ لینا چاہیں تو وہ بھی حاضر ہے۔ لیکن رُکیے پہلے ریکارڈ سُن لیجیے اگر پسند ہو تو اپنے نام پر لکھوا کر لے جائیے۔ ریکارڈ سُننے کے لیے ایک خاص کمرہ بنا ہوا ہے۔ لائبریریوں اور پارکوں کے علاوہ بچوں کے سینما کلب ہیں، سارے انگلستان میں ان کی تعداد کوئی ۹۰۰ کے قریب ہے۔

اس دیس کے سب سے مقبول کھیل فٹ بال اور کرکٹ ہیں۔ کوئی تین کروڑ آدمی ہر سال فٹ بال کے میچ دیکھتے ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کرکٹ کا کھیل دُنیا کو انگلستان ہی نے دیا ہے۔

۱۷۸۷ء میں ایم۔سی۔سی (M. C. C.) کلب بنایا گیا تھا۔ جو آج کل لارڈ کے میدان میں ہے۔ اسی جگہ ایک کرکٹ کا میوزیم بھی بنا ہوا ہے۔ جہاں سو سال پُرانے بیٹ، وکٹ، اور گیندیں رکھی ہیں۔ اِس میوزیم میں



ایک کبوتر بھی رکھا ہے۔ میں نے پوچھا کہ بھئی یہ کبوتر کون سا میچ کھیلا تھا؟ تو پتہ چلا کہ ہندوستان کے مشہور بالر نثار کی گیند سے یہ بے چارا مرا تھا۔ اگر آپ یہ میوزیم ایک دفعہ دیکھ لیں تو پھر آپ کرکٹ کی ساری تاریخ کو جان جائیں گے۔

تہواروں میں سب سے بڑا تہوار کرسمس ہے۔ کرسمس میں ایک دوسرے کو تحفے دیے جاتے ہیں۔ بچوں کی تو بن آتی ہے، اس تہوار میں۔ کچھ لوگوں کے تحفے



دینے کا بڑا انوکھا طریقہ ہے۔ یہ تو آپ کو

معلوم ہے کہ کرسمس ۲۵ دسمبر کو ہوتا ہے۔ مگر کچھ لوگ اپنے تحفے پہلی دسمبر کو بچّوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ لیکن ہوتا کیا ہے! یہ تحفے پچیس کاغذوں میں لپیٹے ہوتے ہیں۔ بچے ہر روز ایک ایک کاغذ اُتارتے جاتے ہیں۔ آخر پچیسویں دن جب آخری کاغذ اُترتا ہے تو بچّوں کی مسکراہٹ، ان کی خوشی اور ان کا جوش بس دیکھنے والا ہوتا ہے۔

اور جناب آخر میں سب سے ضروری بات یعنی پیٹ کا معاملہ۔ وہ لوگ آخر کھاتے کیا ہیں۔ تو بھئی وہ ہماری طرح کھانا پکانے میں نخرے نہیں کرتے۔ ہمارے یہاں تو بعض گھروں میں کبھی کبھی صرف اس وجہ سے ہانڈی نہیں چڑھتی کہ الائچی نہیں تھی اور الائچی کے بغیر بھلا کھانا کیسے پک سکتا ہے، انگلینڈ والے سیدھا سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ خود میں نے ایک دن کھانا پکایا تھا۔ بھلا کیسے پکایا تھا! اگر آپ کو بتادوں تو آپ تعجب کریں گے۔ کمال تو یہ کہ نہ تو کوئی برتن خراب ہوا نہ پتیلی گندی ہوئی نہ کھانا کھانے کے بعد پلیٹ دھونا پڑی۔ ایک مکھن کی ٹکیا اور چار دُھلی دُھلائی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں۔ پلاسٹک کی قسم کی ایک تھیلی میں بند تھیں اور اوپر یہ لکھا ہوا تھا: پانی جب اُبلنے لگے تو اس پیکٹ کو دس منٹ کے لیے پانی میں ڈال دیجیے۔ دوسری اسی طرح کی ایک اور تھیلی تھی۔ اس میں ایک آدمی کے کھانے بھر کے چاول بند تھے۔ اس پر بھی یہی لکھا ہوا تھا۔ تو جناب میں نے دونوں تھیلیوں کو اُبلتے ہوئے پانی میں دس منٹ کے لیے ڈال دیا۔ اس بیچ میں نے ایک پلیٹ صاف کر کے میز پر لگادی۔ جب دس منٹ گزر گئے تو سب سے پہلے میں نے چاول کا پیکٹ نکالا اس کو قینچی سے کاٹ کر پلیٹ میں اُنڈیل دیا پھر مچھلیوں کا پیکٹ کھولا اور نمک مرچ چھڑک دیا۔ بھئی کیا مزہ آیا کھانے میں! اس وقت سوچ کر مُنہ میں پانی آرہا ہے۔ اور جب کھانا ختم ہوگیا تو پلیٹ اُٹھاکر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دی۔ ہاں ہاں یقین کیجیے۔ پلیٹ ردّی کی ٹوکری میں پھینک دی۔

لیکن بھئی میں اتنا کاہل نہیں ہوں کہ پلیٹ دھونے کی مصیبت سے بچنے کے لیے پلیٹ ہی کو اُٹھاکر پھینک دوں۔ بات در اصل یہ تھی کہ وہ صرف ایک ہی دفعہ کام آنے والی پلیٹ تھی۔ اور جناب وہ پلیٹ کاغذ کی پلیٹ تھی۔

جناب بدیع الزّماں خاور

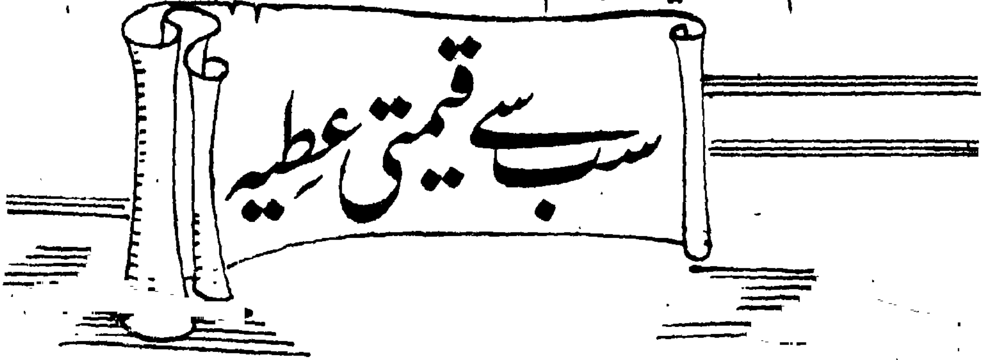
ترنگا

اِس جھنڈے کی آن پہ، تن من دھن قُربان ہمارا ہے
یہ جھنڈا ــــــ یہ ترنگا جھنڈا، جگ میں ہم کو پیارا ہے
رنگ روُپ میں نیارا ہے
یہ جھنڈا
یہ جھنڈا، یہ ترنگا جھنڈا

جگمگ جگمگ چمک رہا ہے، دھرتی کے اندھیاروں میں
نئے سویرے کی پرچھائیں ہے اس کے اُجیاروں میں
اَمن کا روشن تارا ہے
یہ جھنڈا
یہ جھنڈا، یہ ترنگا جھنڈا

جیتے جی تو اِس جھنڈے کی شان نہ کھونے پائیں گے
ہم آکاش کی اونچائی پر، یہ جھنڈا لہرائیں گے
جان سے ہم کو پیارا ہے
یہ جھنڈا
یہ جھنڈا، یہ ترنگا جھنڈا

جناب ابوالمکارم غازی الدّین کمال کریم نگری



اسٹیج کو خوب صورتی کے ساتھ سجایا گیا ہے۔ مختلف قسم کے، مختلف رنگوں کے بجلی کے بلب جگمگا رہے ہیں۔ پردے کے پیچھے آرکسٹرا دھیمی آواز میں ایک سحر انگیز دُھن پیش کر رہا ہے۔ اسٹیج کے ایک حصے پر مائکروفون رکھا ہے۔ ایک اناؤنسر صاحب مائکروفون پر تشریف لاتے ہیں۔ اور ناظرین سے اس طرح خطاب کرتے ہیں۔

اناؤنسر: آج ہم آپ کی خدمت میں ایک ایسا ڈراما پیش کر رہے ہیں، جس کی کہانی نئی دُنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ وہی نئی دُنیا ہے جسے کولمبس نے پندرھویں صدی عیسوی میں دریافت کیا تھا۔ وہ سمندری راستے سے ہندوستان آنا چاہتا تھا۔ لیکن اتفاق سے وہ امریکی ساحل پر پہنچ گیا۔

جب کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تو یورپ کے بہت سے گورے باشندے وہاں جاکر آباد ہوگئے۔ اِن گورے لوگوں نے محنت مزدوری کا کام کرانے کے لیے افریقہ کے حبشیوں کو غلام بنالیا۔ اور اُنھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ اِنھی کو نیگرو کہا جاتا ہے۔ نیگرو لوگوں کو ابتدا میں سماجی حقوق بالکل نہیں دیے جاتے تھے۔ اِنھیں پڑھنے لکھنے کی سخت ممانعت تھی۔ پھر بھی نیگرو نسل کے

لوگوں میں بعض ایسے اشخاص پیدا ہوئے، جنھوں نے بہت سی باتوں میں نام پیدا کیا۔ بکر۔ ٹی۔ واشنگٹن بھی انھی میں ایک تھے۔ اس عظیم انسان کی جدوجہد کی داستان کا ایک رُخ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پہلا حصّہ

(پردہ اُٹھتا ہے)

(باورچی خانے میں بکر۔ ٹی۔ واشنگٹن کی ماں، کھانا پکا رہی ہے۔ آٹھ سالہ بکر۔ ٹی۔ واشنگٹن اپنی ماں سے چمٹ کر کہتا ہے)

بکر۔ ٹی۔ واشنگٹن: ماں! میرا جی اب کوئلے اور نمک کی کانوں میں مزدوری کرنے میں نہیں لگتا۔ میں تو مدرسہ جانا چاہتا ہوں۔ میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے مدرسے جانے سے کیوں روکتی ہو ماں؟

ماں: میرے بیٹے ہم تو غلام ہیں غلام، ہمیں پڑھنے لکھنے کی اجازت کہاں ہے میرے لال!

بکر۔ ٹی۔ واشنگٹن: تو ماں چلو کہیں بھاگ چلیں۔

ماں: ہم مجبور ہیں بیٹے، ایسا نہیں کر سکتے۔ کاش ہمارا جسم بھی گورے لوگوں میں ہوتا۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا حصّہ

(بکر۔ ٹی۔ واشنگٹن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں، وہ اپنے شفیق اور ہمدرد اُستاد سے جدا ہو رہا ہے)

بکر۔ ٹی۔ واشنگٹن: ماسٹر صاحب! اب میں اپنے وطن جا رہا ہوں۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے، جس دن پھٹے پُرانے کپڑوں میں اپنے وطن سے دُور، پیدل، بھوکا پیاسا، ورجینا کے اس عظیم الشّان ہیمپٹن اسکول میں آیا تھا۔ اگر اُس دن آپ میرے ساتھ ہمدردی نہ کرتے تو یہ بہت ممکن تھا کہ میں تعلیم کے شوق میں خودکشی کر بیٹھتا —— ماسٹر صاحب، آپ نے مجھ پر اور نیگرو نسل پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

ماسٹر: بیٹے! یہ تو خود تمھاری ذاتی محنت اور شوق کا نتیجہ ہے کہ تمھیں علم کی روشنی حاصل ہوئی۔

بُکر۔ ٹی۔ واشنگٹن : اگر آپ کی ہمدردی میرے ساتھ نہ ہوتی تو مجھے اس اسکول میں داخلہ بھی نہ ملتا۔

ماسٹر : بیٹے — ! تعلیم کے لیے تم نے جو طریقہ اختیار کیا وہ خود اس بات کی علامت ہے کہ تم ایک بڑے آدمی بننے والے ہو۔ میں بیس برس سے اس اسکول میں پڑھا رہا ہوں۔ لیکن مجھے کوئی ایسا طالب علم نہیں ملا جس نے اسکول میں محنت مزدوری کرکے تعلیم جاری رکھی ہو۔ وہ تو صرف تم ہی ہو جو صبح سویرے اسکول کی صفائی کرکے اپنے کھانے پینے اور کتابوں کا خرچ چلاتے رہے۔ مجھے تم سے امید ہے کہ آئندہ بھی اپنی سخت محنت اور لگاتار کوششوں کو جاری رکھوگے۔

بُکر۔ ٹی۔ واشنگٹن : ہاں ماسٹر صاحب، میں آپ کی اِس امید کو مشورہ سمجھتے ہوئے ہمیشہ یاد رکھوں گا، اور اس پر عمل کرتا رہوں گا۔ خدا حافظ ماسٹر صاحب۔

ماسٹر : خدا حافظ، خدا تمھاری عمر و اقبال میں ترقی دے۔ اور تم جہاں بھی رہو، خدا تمھاری حفاظت کرے۔

(پردہ گرتا ہے)

(تیسرا حصّہ)

(بُکر۔ ٹی۔ واشنگٹن جانے کے لیے اپنی ماں سے اجازت طلب کر رہے ہیں، ماں روتے ہوئے کہتی ہے)

ماں : بیٹے، اب میں بہت بوڑھی ہو چکی ہوں۔ اب میں تم سے الگ نہیں رہ سکتی۔

بُکر۔ ٹی۔ واشنگٹن : ماں — ! یہ قربانی مجھے اور تمھیں دونوں کو دینی ہی ہوگی، خود اپنے لیے اور نیگرو نسل کے لیے۔ ماں — ! کیا تمھیں یاد نہیں، جس دن میں ورجینیا سے لوٹا تھا، سارے نیگرو لوگ تمھارے اور میرے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ وہ اُس دن کتنے خوش تھے — ! ان کی خوشی اسی لیے تھی نا کہ ان کے بچّوں کو پڑھانے والا مِل گیا۔ اور تم نے دیکھا کہ چند ہی دنوں میں نیگرو بچّے پڑھنا لکھنا سیکھ گئے۔ اگر نیگرو بچّے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھیں گے تو پھر ہمارا مستقبل تاریک رہے گا اور ہم

ایسے ہی غلام رہیں گے، ہمیں کبھی بھی آزادی کی نعمت حاصل نہ ہو گی ماں ـــ! جنوبی امریکہ کے ٹیسکیگی اسکول میں مجھے ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا ہے، مجھے اب وہاں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے بہتر موقع فراہم ہوگا۔ مجھے اجازت دے دو ماں ـــ! میں وہاں جاکر تمھیں جلد ہی بُلالوں گا۔

ماں : نیگرو نسل کی آزادی کے لیے تو میں جان بھی دے دوں گی۔ میرے بیٹے ـــ! تم جا سکتے ہو۔ خدا تمھیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔

(پردہ گرتا ہے)

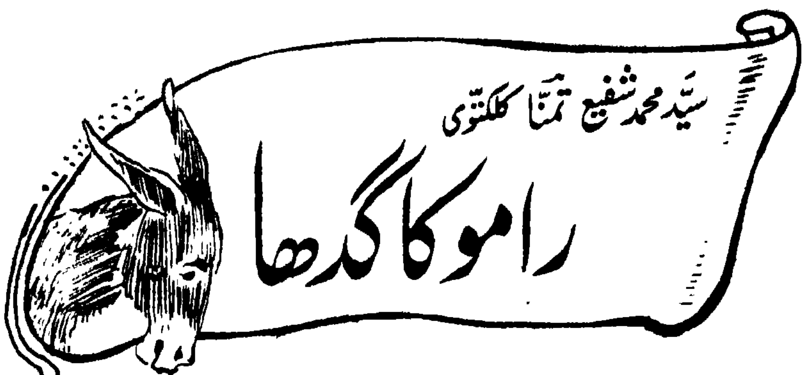
چوتھا حصّہ

(بکر۔ ٹی۔ واشنگٹن، ٹیسکیگی اسکول میں صدارت کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ایک بوڑھی نیگرو عورت پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہے۔ لاٹھی ٹیکتی ان کے اجلاس میں آتی ہے)

بوڑھی عورت : مسٹر واشنگٹن ـــ! خدا بہتر جانتا ہے کہ میں اَن پڑھ اور جاہل ہوں، لیکن میں جانتی ہوں کہ آپ نیگرو لوگوں کو ترقی دینے کے لیے کتنی مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔ میں ایک غریب عورت ہوں۔ میرے پاس دَھن دولت نہیں ہے لیکن مَیں یہ چاہتی ہوں کہ آپ اِن چھ انڈوں کو جنھیں میں نے بہت دنوں سے بچا کر رکھا ہے اسکول کی ترقی کے لیے میری طرف سے عطیہ سمجھ کر قبول فرمائیں۔ اگر میری صحت ساتھ دیتی تو میں بھی اسکول میں داخل ہو جاتی۔

بُکر۔ ٹی۔ واشنگٹن : اے میری بوڑھی اماں ! یہ اسکول تو چند دنوں ہی سے چلتا ہے، مگر تمھارا یہ عطیہ، سارے عطیوں سے زیادہ قیمتی ہے یہاں چیز کو نہیں دیکھا جاتا، دینے والے کی نیّت اور جذبے کو دیکھا جاتا ہے۔ تمھارے اس عطیے کے ساتھ تمھارا خلوص اور تمھاری نیک تمنائیں شامل ہیں۔ خدا تمھیں اس کا بڑا اجر دے گا اے بوڑھی اماں ـــ! میں تمھارے اس عطیے سے اتنا متأثر ہوا ہوں کہ میرے پاس الفاظ نہیں کہ اظہار کر سکوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ مرتے دم تک نیگرو قوم کی تعلیم و تربیت کے لیے سخت جدوجہد کرتا رہوں گا۔

(پردہ گرتا ہے)



سیّد محمد شفیع تمنّا کلکتوی

رامو کا گدھا

تمھارے سامنے یہ جو کھڑا ہے
سُنو بچّو! یہ رامو کا گدھا ہے

جو اِس کی پیٹھ پر ہے گول گٹھّا
یہ سب لوگوں کے کپڑوں کا ہی بوجھا

بہت ہی دُور اِسے چلنا پڑے گا
کڑکتی دھوپ میں جلنا پڑے گا

کہیں رُکتا نہیں پھر بھی بچارا
چلا مالِک کا پاتے ہی اشارا

زرا ہم بھی تو سوچیں مل کے اتنا
کہ رب کے حکم پر چلتے ہیں کتنا

جناب حیدر پٹھان بمبئی

کرشناجی آرا

کرشناجی آرا (KRISHNAJi ARA) کا نام شاید آپ نے سُنا ہو۔ یہ ہمارے دیس کے بہت بڑے آرٹسٹ، بہت کامیاب مصوّر ہیں۔ بمبئی میں تو ان کا بڑا نام ہے۔ ایک بمبئی کیا سارے دیس میں بلکہ دیس کے باہر بھی ان کی بڑی شہرت ہے۔ مگر انھوں نے اپنی زیادہ تر زندگی بمبئی میں گزاری ہے۔ اس لیے وہاں کے تو قریب قریب سبھی پڑھے لکھے لوگ انھیں جانتے پہچانتے ہیں۔ ان کی عزّت کرتے ہیں۔

پر یہ کرشناجی آرا صاحب یوں ہی اتنے بڑے آرٹسٹ نہیں بن گئے۔ انھوں نے بڑی محنت کی ہے، بڑی ریاضت کی ہے۔ اس محنت اور ریاضت کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اور اگر آپ کو ان کے بچپن کی زندگی کا حال معلوم ہو جائے تو آپ کو حیرت ہوگی کہ کس طرح ایک بے سہارا بچّہ محض اپنے بل بوتے پر اپنی محنت اور کوشش کی بدولت ـــــ ترقّی کے زینوں پر چڑھتا چلا گیا۔

آندھرا پردیش کی راج دھانی حیدرآباد کے قریب ایک فوجی چھاؤنی ہے بلارم۔ اب سے کوئی باون برس پہلے (۱۹۱۴ء) میں یہاں ایک صاحب ہولاجی آرا (HOWLA Ji ARA) کے گھر میں ایک بچّہ پیدا ہوا۔ ماں باپ نے اس کا نام کرشناجی آرا رکھا۔ یہ بچّہ ابھی تین ہی برس کا تھا کہ ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا۔ اور ابھی دسویں

برس میں تھا کہ باپ بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔ یہ دس برس کی عمر دیکھیے اور مصیبت کا یہ پہاڑ دیکھیے۔ ابھی تو بے چارے کے کھانے کھیلنے کے دن تھے، لکھنے پڑھنے کے دن تھے۔

پر اب اس دس سال کے بچے "کرشنا جی آرا" کے لیے کھیل کود دُور کی بات تھی۔ اب تو اس کے سامنے پیٹ کا دوزخ بھرنے اور آپ ہی کنواں کھودنے کا سوال تھا۔ اور کوئی بچہ ہوتا تو اس بے بسی کے وقت ہمت ہار جاتا۔ اور نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔ مگر اس ہونہار بچے نے ہمت نہیں ہاری، اپنا حوصلہ اونچا رکھا۔

بچپن میں وہ موٹر کے پُرزوں سے، بولٹ سے، اسپنرز سے، اسکرو وغیرہ سے کھیلا کرتا تھا۔ اس کے باپ شاید موٹر کے میکانک ہوں گے۔ کرشنا جی آرا نے اب انھی چیزوں کو روزی کمانے کا ذریعہ بنایا۔ وہ بمبئی چلا گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں موٹر کا کلینر ہو گیا۔ اس زمانے میں دیس میں آزادی کی لڑائی بھی جاری تھی۔ کرشنا جی آرا نے اس میں بھی حصہ لیا اور جیل ہو آیا۔

پر کرشنا جی آرا موٹر کلینر بننے کے لیے تو پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر تو کچھ اور صلاحیتیں چھپی ہوئی تھیں۔ یہ صلاحیتیں موقع کی تلاش میں تھیں۔ اسے مصوّری کا شوق تھا۔ اور جوں ہی اسے موقع ملا اس نے مصوّری یا آرٹ کی مشق شروع کر دی۔ وہ محنت کرتا رہا، کرتا رہا، تصویریں بناتا رہا، بناتا رہا۔ اس نے کسی سے سبق نہیں لیا۔ کسی کو اُستاد نہیں بنایا۔ اس کی ذہانت، اس کی چُھپی ہوئی صلاحیتیں اس کی رہنمائی کرتی رہیں۔

ہوتے ہوتے اس کے اس شوق کا پتہ بمبئی آرٹ اسکول کے اُس وقت کے انگریز پرنسپل کو چلا۔ اس نے کرشنا جی آرا کی ہر طرح سے ہمت بڑھائی اور رہنمائی کی۔ اس کی تصویروں کی نمایش کا انتظام کیا۔ اس کے بعد دو اور انگریزوں نے اس کے کام کو آگے بڑھایا۔ ہر طرح اس کی مدد کی۔ ان دونوں کا تعلق ٹائمس آف انڈیا بمبئی سے تھا۔ اس کے ایک اور انگریز دوست نے بھی اس کی پوری سرپرستی کی۔ کرشنا جی آرا ان سب کے بہت احسان مند ہیں۔ ایسے جوہر قابل کو ڈھونڈ نکالنے اور اس کے کارناموں کو شہرت دینے کا سہرا انھیں انگریزوں کے سر ہے۔

آپ جانتے ہیں آرٹ یا مصوّری کی بہت سی

قسمیں ہیں، بہت سی شاخیں ہیں۔ کرشنا جی آرا نے ان میں سے بہت سی قسموں پر توجّہ کی ہے، ان میں مشق بہم پہنچائی ہے۔ تبھی تو ان کے آرٹ میں ایسی پختگی، ایسا اُستادانہ انداز پیدا ہوا ہے۔ اس پرچے میں کسی دوسری جگہ ان کی ایک تصویر چھپ رہی ہے۔ اِس تصویر کو غور سے دیکھیے آپ کو آرا کی مہارت اور اُستادی کا خود اندازہ ہو جائے گا۔ ان کی بنائی تصویروں کا ہندوستان ہی میں نہیں دوسرے ملکوں میں بھی بہت چرچا ہے۔

۱۹۶۱ء میں ہند سرکار نے للت کلا اکاڈمی کی طرف سے کرشنا جی آرا کو بلغاریہ بھیجا۔ یہاں سے حکومت فرانس کے مہمان کی حیثیت سے وہ پیرس گئے۔ یہاں ایک مہینہ ٹھہرنے کے بعد کرشنا جی آرا نے لندن، اسٹروم، ویانا، میونخ، وینس، سوئٹزرلینڈ، فلورینس، روم، ایتھنز اور مصر کی سیر کی۔

کرشنا جی آرا کی ایک اور بات عجیب و غریب ہے۔ دُنیا کے اکثر شاعروں، آرٹسٹوں اور مصوّروں کی طرح خود پسندی، تنہائی یا خلوت پسندی اور الگ تھلگ رہنے کی عادت ان میں نہیں ہے۔ بلکہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کا بھرپور جذبہ ہے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بہت سی سوسائٹیاں بنائی ہیں، بہت سے ادارے قائم کیے ہیں اور یہ سب بہت کامیابی سے چل رہے ہیں۔ ویسے بھی وہ ہونہار اور نَومشق آرٹسٹوں کی برابر مدد کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ہمّت اور حوصلہ بڑھاتے رہتے ہیں۔ وہ دوستوں کے اچھے دوست، ساتھیوں کے اچھے ساتھی ہیں۔

غرض ہمارے آزاد دیس میں کرشنا جی آرا نے ہمارے آپ کے لیے ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ بہت اچھا نمونہ۔ آدمی چاہے کتنا ہی بے سہارا ہو اس کے دل میں اگر لگن ہو، شوق ہو، اپنے اوپر بھروسا ہو، ساتھ ہی مستقل مزاجی سے کام میں لگے رہنے کا جذبہ ہو تو وہ کہاں سے کہاں پہنچ سکتا ہے!

بچّوں کی دل چسپ اور سبق آموز کتابیں

ایک پکوڑی تیل میں راجا جی چلیں -/۴۰	اُس نے کیا کرنہ جانا -/۳۷	بچّوں کی کہانیاں -/۳۷	بڑے دادا کی کہانی -/۵۶
پرندوں کا ایکا -/۲۰	تانبیل خاں -/۳۰	تُرکوں کی کہانیاں -/۵۵	جنگو کی بلّی -/۲۵
چنبیلی -/۵۰	چمپاوت کا آدم خور شیر -/۳۵	چوہوں کی کانفرنس -/۴۵	خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا -/۳۰
سونے کی چڑیا ۱/۰	شہزادہ اور ٹھگ -/۴۵	شہزادی گلفام -/۵۰	شہزادی گلنار -/۴۰
شیدلا -/۵۰	کیمپ فائر کی نقلیں اوّل -/۷۵	کیمپ فائر کی نقلیں دوم -/۷۵	لال مُرغی -/۵۰
مزہ چکھائیں گے -/۳۵	مُرغی اجمیر چلی -/۲۵	ننھا ٹٹو -/۳۰	ہمّت کے پھل -/۳۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

جناب سید قمر الحسن لکھنوی

اب تمھیں اختیار ہے

حضرت جُنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے حالات میں ایک عجیب و غریب کہانی ملتی ہے حضرت جُنید پہلوانی کے فن سے اچھی طرح واقف تھے اور ایک بادشاہ کے یہاں شاہی پہلوان کی حیثیت سے ملازم تھے۔

ایک دن ایک آدمی بادشاہ کے پاس آیا اور کہنے لگا "جہاں پناہ میں آپ کے پہلوان سے لڑنا چاہتا ہوں" بادشاہ یہ سن کر ہنسا اور کہا "تم تو بہت دُبلے پتلے آدمی ہو، تمھارا ہمارے پہلوان سے کیا مقابلہ" لیکن وہ اپنی بات پر اَڑا رہا۔ آخرکار بادشاہ راضی ہو گیا اور کشتی کے لیے ایک دن مقرّر ہو گیا۔

مقررہ دن آئے پر حضرت جنیدؒ بغدادی خم ٹھونک کر اکھاڑے میں اترے۔ دیکھنے والوں کا ایک بہت بڑا مجمع لگا ہوا تھا۔ دونوں پہلوانوں میں داؤں پیچ شروع ہوئے۔ کشتی کے دوران دوسرے پہلوان نے چپکے سے کہا "جنیدؒ میں سید ہوں اور حاجت مند ہوں اب تمھیں اختیار ہے" یہ سنتے ہی آپ نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور اُس آدمی نے آپ کو چت کر دیا۔ آپ کے چت ہوتے ہی عوام نے شور مچایا "کشتی غلط ہوئی، کشتی غلط ہوئی"۔

چنانچہ دوبارہ کشتی ہوئی۔ لیکن اس وقت بھی آپ نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ لوگوں نے اس بار بھی وہی شور مچایا "کشتی غلط ہوئی پھر سے ہونا چاہیے"۔ لہذا تیسری مرتبہ پھر کشتی ہوئی۔ آپ پھر چت ہو گئے اور ہار مان لی۔ ہزاروں آدمی اس کشتی کو ایک عجیب مُعمّا سمجھ کر واپس گئے اور بادشاہ

نے اُس آدمی کو انعام واکرام دے کر واپس کیا۔
بعد میں بادشاہ نے حضرت جنیدؒ بغدادی سے خفگی کی حالت میں اصل واقعہ کا سبب پوچھا اور کہا "کیا ہم نے تم کو اسی لیے کھلایا پلایا تھا۔ حضرت جنیدؒ نے اصلی حقیقت بیان کی تو بادشاہ دنگ رہ گیا اور حیرت میں پڑ گیا۔
اُسی دن آپ نے خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ "جنیدؒ تم نے ہماری اولاد کے ساتھ سلوک کیا انشاء اللہ تم کو اس کا نیک بدلا ملے گا۔" دوسرے ہی دن سے آپ نے شاہی ملازمت کو لات مار دی اور تلاش حق میں گھومنے لگے۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے، اور بہت بڑے بزرگ اور درویش ہو کر دنیا کو فیض پہنچایا۔



جناب جہانگیر احمد شمسی بریلوی

دیوار گرادی

اسلم اور نعیم دونوں چچازاد بھائی تھے۔ مگر ان دونوں کے والدین میں برسوں سے نااتفاقی چلی آرہی تھی۔ اس کا قدرتی اثر یہ تھا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے تھے یہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے تھے۔ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ اوران دونوں کی دشمنی کا چرچا سارے اسکول میں تھا۔

اسکول میں ایک بار سالانہ جلسہ تھا خوش قسمتی سے دیس کے سب سے بڑے نیتا اور بچوں کے چاچا پنڈت جواہرلال نہرو کو بلایا گیا تھا۔

پنڈت جی نے اس جلسے میں بڑی اچھی تقریر کی۔ انھوں نے فرمایا "بچو! تم جانتے ہو میں تمھیں کتنا چاہتا ہوں۔ یقین جانو تم ہی میرے لیے سب کچھ ہو۔ تم ہی بڑے ہوکر اس دیس کی باگ ڈور سنبھالو گے۔ تم ہی کو اسے مضبوط بنانا ہے۔ اسے آگے بڑھانا ہے۔ پر دیکھو یہ سب کچھ جب ہی ہو سکتا ہے۔ جب ہم میں اتحاد ہو۔ اتفاق ہو۔

یاد رکھو اتفاق و اتحاد بڑی دولت ہے اور نفرت، تعصب اور تنگ نظری سب سے بڑی لعنت۔ اتحاد و اتفاق کی بدولت ہم ایک مضبوط رسی بن جائیں گے۔ جسے کوئی نہ توڑ سکے گا۔ ایسا پہاڑ بن جائیں گے جس پر کسی کو نگاہ ڈالنے کی ہمت نہ ہوگی۔"

سب بچے اور بڑے غور سے نہرو چاچا کی

تقریر سُن رہے تھے۔ سب پر نہرو چاچا کی باتوں کا اثر تھا۔ پر نہ جانے کیوں اسلم اور نعیم پر سب سے زیادہ۔ ان دونوں نے خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے کچھ باتیں ہوگئیں۔

شام کو نعیم گھر آیا۔ جلسے کی وجہ سے دیر ہوگئی تھی۔ امّی نے وجہ پوچھی تو جلسے کا سب حال بتایا۔ پھر اچانک کہنے لگا: "امّی مجھے بھوک لگی ہے۔ پر میں کھانا نہ کھاؤں گا۔" امی بولیں: "کیوں بیٹا کیا بات ہے کیا اسلم سے لڑکر آرہے ہو؟"

نعیم نے کہا: "نہیں امّی لڑائی تو کسی سے نہیں ہوئی ہے۔ پر میں کھانا جب ہی کھاؤں گا جب آپ میری بات مان لیں گی۔"

امّی نے کہا: "اے ہے۔ ایسی کیا بات ہے بیٹے ماننے کے قابل ہوگی تو کیوں نہ مانوں گی۔"

نعیم بولا: "چاچا نہرو کی تقریر سننے کے بعد میں نے اور اسلم نے طے کیا ہے کہ پہلے ہم اپنے گھر کی خبر لیں گے۔ بعد میں دوسروں سے اتحاد و اتفاق کی باتیں کریں گے۔ اور یہ طے کیا ہے کہ جب تک آپ اور چچی جان آپس میں گلے نہ مل لیں گی۔ ہم کھانا نہ کھائیں گے۔

امی کو یہ سُن کر تاؤ آگیا: "چل دور ہو یہاں سے بڑا آیا ہے چودھری بن کر۔ میں بھی دیکھتی ہوں کب تک فاقے کرتا ہے۔"

یہ سُن کر نعیم اُداس ہوگیا اور گھر سے باہر جانے لگا۔ اتنے میں اس کے ابّا آگئے اور کہنے لگے: "نعیم میں نے تمھاری باتیں تھوڑی بہت سُن لی ہیں۔ تم اُداس نہ ہو۔ مجھے پورا قصّہ بتاؤ۔"

نعیم نے پوری باتیں تفصیل سے سنائیں اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ نعیم کے ابّا نے اپنے پیارے بیٹے کو گلے سے لگالیا۔ نعیم کی امّی کو بھی قائل معقول کیا۔ وہ بھی پسیج گئیں۔

صبح کو عید تھی مگر ان دونوں بچوں کی تو دوہری عید تھی۔ جنھوں نے برسوں کے بعد ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا تھا۔ اپنے والدین کو آپس میں ملوایا تھا۔

صبح تڑکے مزدور بلوائے گئے۔ اسلم اور نعیم نے سب سے پہلے پھاوڑا لے کر نفرت کی دیوار پر ضرب لگائی۔ دیوار میں لمبا سا سوراخ کر دیا۔ باقی کام مزدوروں نے کیا۔

دیوار گر گئی تو اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ کر نعیم کے ابّا اور چچا ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ نعیم نے جھٹ سے دونوں کی تصویر لے لی۔

جناب مناظر عاشق ہرگانوی

اخبار



زمانہ حال کی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ سب سے پہلا اخبار ایکٹا ڈیمنا (Acta Dimna) ملک روم کے قدیم باشندوں نے حضرت عیسیٰ سے کئی صدی پہلے جاری کیا تھا۔ اس کے بعد ایک اخبار جرمنی میں پندرھویں صدی عیسوی میں شائع ہوا۔ انگلستان میں پہلا اخبار ویکلی نیوز ۱۶۲۲ء میں اور فرانس میں گزٹ دی فرانس ۱۶۳۱ء میں جاری ہوا۔ روس میں پہلا اخبار ۱۷۰۳ء میں اور امریکہ میں بوسٹن نیوز لیٹر ۱۷۰۴ء میں شمالی امریکہ میں شائع ہوا۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت سے پہلے کوئی اخبار نہ تھا۔ انڈیا گزٹ پہلا ہندوستانی اخبار تھا۔ بنگال میں ۱۸۱۸ء میں عیسائی مشینریوں نے پہلا اخبار سماچار درپن بنگالی میں جاری کیا۔

اس کے بعد ہندوستانی زبانوں میں اور بھی دوسرے اخبار نکلنے لگے۔ فارسی زبان کا پہلا اخبار راجہ رام موہن رائے کا اخبار "مراۃ الاخبار" تھا جو ۱۸۲۲ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس کے بعد فارسی زبان میں دوسرا اخبار "جام جہاں نما" نکلا۔ جو "مراۃ الاخبار" کی اشاعت کے دو تین ہفتے بعد سے ہی شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور ٹھیک ایک سال بعد یعنی ۱۸۲۳ء سے اس کا اردو ضمیمہ بھی شائع ہونے لگا تھا جو بجائے خود ایک اخبار تھا۔ اس طرح اردو زبان کا پہلا اخبار ۱۸۲۳ء میں جاری ہوا۔

۱۸۳۵ء میں لارڈ آکلینڈ نے مطبع کو پوری آزادی عطا کر دی تو اخبار کو ہندوستان میں اور بھی ترقی ہوئی۔ لیکن لارڈ لٹن نے ایک ایکٹ

کے ذریعے ہندوستانی اخباروں سے پبلک معاملات پر بحث کرنے کی آزادی چھین لی۔ مگر بعد میں لارڈ رپن نے اس ایکٹ کو مسترد کر دیا۔ اس وقت سے جرنلزم نے خوب ہی ترقی کی ہے۔

"اخبار" خبر کی جمع ہے۔ خبر کو انگریزی میں نیوز کہتے ہیں۔ لفظ نیوز چار حروف N. E. W.S. سے مرکب ہے۔

N	علامت ہے	North	شمال
E	"	East	مشرق
W	"	West	مغرب
S	"	South	جنوب

اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو خبریں دُنیا کے ہر سمت، ہر گوشے سے ہم تک پہنچیں ان کو نیوز کہتے ہیں اور ان ہی خبروں کے مجموعے کا نام اخبار ہے۔

اخبار مہذب دُنیا کا ایک نشان ہے۔ جتنا زیادہ کوئی ملک تعلیم یافتہ ہوگا۔ اتنی ہی وہاں اخباروں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ ایک پڑھا لکھا آدمی یہ جاننے کے لیے ہمیشہ بیتاب رہے گا کہ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اخبار ہمیں مقامی، ملکی، اور ملک سے باہر کی خبروں سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ ہمیں اپنے ملک کے حالات سے باخبر رکھنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے مختلف حصّوں کی خبریں مہیا کر کے ممالک کو ایک دوسرے سے قریب تر لاتا ہے۔ اخبار ہمیں بتاتا ہے کہ علوم و فنون کے میدان میں کیا کیا ترقیاں ہوئی ہیں۔ وہ ہمیں بڑے بڑے لوگوں کے خیالات سے آگاہ کرتا ہے۔ دُنیا کی نت نئی ایجادوں کا پتہ ہم اخبار ہی کے ذریعے لگاتے ہیں۔ اخبار ہی وہ بہترین ذریعہ ہے جس سے کسی ملک کے باشندے وہاں کی حکومت کے سامنے اپنی شکایتیں پیش کر سکتے ہیں۔ اپنے حقوق کا مطالبہ اخبار ہی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ کسی بات کے مشتہر کرنے کا پُر اثر ذریعہ اخبار ہے۔ اگر آپ ملازمت کے خواہاں ہیں تو "ضرورتوں" کے کالم کو دیکھیے۔ تاجر ہیں تو تجارتی کالم ملاحظہ فرمائیے۔ علمی مذاق ہے تو ایڈیٹوریل اور دوسرے مضامین سے فائدہ اُٹھائیے۔ آپ کو کھیل کود سے دلچسپی ہے تو کھیل کود یا اسپورٹس کا کالم دیکھیے۔

غرض اچھا اخبار انسان کو ہر طرح سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ خیالات کو وسیع کرتا ہے۔ فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ غلطیوں پر تنبیہہ کرتا ہے اور ملک و قوم کی بہتری کا خواہاں رہتا ہے۔

بڑوں کی کوششیں

جامعہ میں بیسک ٹریننگ سال اوّل کے طلبا کا آسان اُردو کا امتحان اپریل ۱۹۶۶ء میں ہوا تھا۔ عبدالغفار صاحب مدہولی نے اپنے شاگردوں کے چند مضامین ہمیں دیے ہیں۔ مناسب یہی سمجھا گیا کہ جامعہ کھلنے پر یہ مضامین شائع کیے جائیں۔ یہ پہلی قسط ہے۔ دوسری قسط اگلے پرچے میں دی جائے گی۔

مُدیر

ہماری اوکھلا پکنک

ہماری کلاس کے طالب علموں کو آج اوکھلا پکنک کی یاد زبردستی آہی گئی۔ لیکن ہمارا قصہ تو عجیب ہی ہے۔ "کھیر کھائی اور پکنک یاد آئی۔"

ہنستے گاتے، دنگا کرتے، ہاتھ پاؤں ہلاتے، کالج کے میدانوں میں ہائے ہو مچاتے ہوئے خوشی کے ساتھ کمروں کو تالا لگا کر اوکھلا پکنک کے لیے روانہ ہوئے۔

میٹھی میٹھی ہوا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں بانسری کی آواز، ہتھیلیوں کی پٹ پٹ کانوں کو رس دے رہی تھی۔

حال بہت لمبا ہے، چھوٹا کر کے لکھنا پڑے گا۔

آسن لگایا، بیٹھ گئے، کھڑے ہوئے۔

کھیل کھیلے۔ چاروں ہاؤسوں میں مقابلہ ہوا۔

پہلے سے بتائی ہوئی چیزوں کو اکٹھا کرنا تھا۔ صرف ۲۵ منٹ میں۔ میں گاندھی ہاؤس کا ممبر تھا۔ اور ہوں۔ گاندھی جی کی جیت ہوئی۔

پھر گانا بجانا ہونے لگا۔ گانے والوں نے رنگ باندھ دیا۔ گانوں میں بھی لُطف آگیا۔

بہت دیر ہوگئی تھی ۔ پیٹ میں چوہے کودنے لگے ۔ یہ اُداسی نہ جانے کیوں تھی ۔

"آگئی، آگئی" چاروں طرف سے آواز آنے لگی ۔

"کیا آگئی؟" میں نے پوچھا ۔

"کھیر"

سچ پوچھو تو مُنہ میں پانی آگیا ۔ مگر صبر کیا ۔

"اعلان" ایک آواز آئی ۔

"بیٹھ جاؤ" بڑی لمبی قطاریں ۔ لڑکے الگ اور لڑکیاں الگ بیٹھے دکھائی دیے ۔ چمچوں کی آواز دَنادَن آرہی تھی ۔

آہستہ سے اشارہ ہوا ۔ ماحول سنسان ہوگیا ۔ کچھ بہنیں اور کچھ بھائی بڑے چاؤ سے کھیر ۔ پوری ۔ ساگ ۔ سبزی ۔ نمکین اور رائتا پروس رہے تھے ۔ من بھر کر کھایا ۔ جتنا پیٹ میں آیا کھا کر ہٹ گئے ۔

آرام کرنے لگا سارا گُٹ ۔ کوئی کھیلنے لگا تو کوئی گانے لگا ۔

سردار جی کا بھنگڑا بڑا اچھا لگا ۔

دوسری بیٹھک ہوئی دری پروگرام گانا ۔ انا ۔ ہندوستانی گانے ۔ بنگالی گانے ۔ پنجابی پیے تک بھی سُنے ۔

دن ڈھلنے لگا ۔ جی مچلنے لگا ۔ انعامات دیے گئے ۔ تالیاں بجائی گئیں ۔ کوکو کولا پلایا گیا ۔

چھٹی ہوئی ۔ کالج لوٹ آئے ۔

پکنک مبارک ہو ۔

دھیر سنگھ راجپوت، جامعہ
بیسک ٹریننگ، پہلا سال

بُڈّھا پارک کی سَیر

زندگی میں انسان کہیں نہ کہیں گھومنے تو جاتا ہی ہے ۔ کبھی سیر پر، کبھی یاترا پر ۔ اس طرح ہمارا بھی دو بار سیر کو جانے کا پروگرام بنا اور وہ تھا بُدّھا پارک جانے کا ۔ ہم پکنک منانے کے لیے وہاں پر دو بار گئے ۔ ایک بار ہوسٹل کی طرف سے، دوسری بار کالج کی طرف سے ۔ جس دن پکنک کی تاریخ مقرر ہوئی اور میرے کانوں میں جب یہ خبر پہنچی تو میرا دل باغ باغ ہو اُٹھا ۔ اور میں اُس دن کا بڑی بے قراری سے انتظار کرنے لگی ۔ آخر وہ دن آہی گیا ۔ ہم صبح سات بجے یہاں سے چل پڑے اور بُدّھا پارک میں قریب ۹ بجے پہنچے ۔ آہا! کتنا مزا آیا اُس دن ۔ سب سے پہلے

کھیل شروع ہوئے۔ میں نے ان میں حصّہ لیا۔ کچھ کھیلوں میں ہار گئے اور کچھ میں جیت گئے۔ اس کے بعد گانا ہوا۔ سب لڑکے اور لڑکیوں نے اس پروگرام میں دل چسپی لی ـــــ ہمارے اُستادوں نے بھی حصّہ لیا۔ استادوں کو کھیلوں میں کھیلتا دیکھ کر بڑی ہنسی آئی۔ خاص کر ہمارے آرٹ کے ٹیچر سردار جی نے بہت دل چسپی لی۔ دوپہر کو ہم سب نے مِل جُل کر کھانا کھایا۔ بڑا مزا آیا۔

اِس کے بعد پھر گیتوں اور کہانیوں کا پروگرام چلا۔ بہت سے لڑکے اور لڑکیوں نے اس پروگرام میں حصّہ لیا۔ اس سے پہلے ہم نے سارے بُدّھا پارک میں گھوم کر سیر کی۔ شام کو جب ہم آنے لگے تو ہمیں ہلکا ناشتا ملا۔ پھر شام کے ۵ بجے ہم ہنستے کھیلتے واپس آئے۔ یہ سیر کیا تھی، ایک نہ بھولنے والی گھٹنا تھی۔ ایک سُندر باغیچہ پھولوں سے بھرا ہوا۔ ایک شانتی سے بھرا ہوا ماحول۔

لاجونتی، جامعہ

بیسک ٹریننگ پہلا سال

میں نے ایک دن کا مدرسہ دیکھا

۲۴ مارچ کو ہم سب لڑکیاں جامعہ کے ابتدائی مدرسے میں "ایک دن کا مدرسہ" دیکھنے گئے۔ ہمیں کالج سے کہا گیا کہ آپ سب ڈپلوما سال اوّل کی لڑکیاں دیکھنے کے لیے جائیں۔ پھر ہم سب ہوسٹل کی لڑکیاں اکٹھی ہو کر جامعہ میں گئیں۔ مَن میں بہت خوشی تھی کہ جب ہم نے پڑھایا تھا تو ہمارے سب اُستاد نگرانی کے لیے آئے تھے۔ آج ہم بچوں کا پڑھانا دیکھ کر آئیں گے۔

لیکن خوشی کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے من میں ڈر بھی تھا۔ آپ پوچھیں گے کہ وہ کیا، تو سُن کر حیران ہوں گے کہ ہمارا اُس دن حساب کا ٹیسٹ تھا اور مجھے کچھ یاد بھی نہیں تھا۔ پر پھر بھی جب میں اُدھر پہنچی تو سب کچھ بھول گئی کیوں کہ وہاں پر اتنی اچھی طرح بچّوں کا کام ہو رہا تھا کہ جو میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ پانچویں جماعت تک کے بچّے اتنے چُست ہو سکتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم نے ہوسٹل دیکھا جو بہت ہی اچھی طرح سجایا گیا تھا۔ وہاں پر ایک چھوٹی سی لڑکی گائڈ بنی ہوئی تھی اور بڑے تمیز کے ساتھ برتاؤ کر رہی تھی۔ وہ مجھے بہت پسند آئی۔ اس کے بعد ہم نگران صاحب کے پاس گئے جو بہت ہی اچھی طرح باتیں سُن اور سُنا رہے تھے۔ لیکن کچھ ہچکچاتے تھے۔ آخر چھوٹے سے تو تھے۔

پھر ہم جماعتوں میں گئے، جہاں پر طالب علم ہی پڑھا رہے تھے۔ اُن کے پڑھانے کا طریقہ اچھا تھا اور پورے یقین کے ساتھ پڑھا رہے تھے۔ ہمیں یہ بات بہت ہی پسند آئی کہ اتنے چھوٹے سے بچے اتنے یقین کے ساتھ پڑھا رہے ہیں اور ہم اتنے بڑے ہو کر بھی پڑھانے میں ڈرتے ہیں پھر سوچا کہ ہمارے پڑھانے میں تو نگران پیچھے آ کر بیٹھتے ہیں اور نمبر دیتے ہیں۔ انھیں کون سا ڈر ہے۔

اس طرح مجھے ان کا پڑھانا بھی اچھا لگا پھر ہم نے کتب خانہ دیکھا، پھر بینک دیکھا اور پرنسپل اور اُستادوں کے ساتھ فوٹو کھنچوائے اور پھر پانی پی کر ہوسٹل میں واپس آئے، اس طرح ہم نے ان کا یہ "ایک دن کا مدرسہ" دیکھا اور پسند کیا۔

انیتا وادھوا، جامعہ
بیسک ٹریننگ۔ پہلا سال





بچّوں کی کوششیں

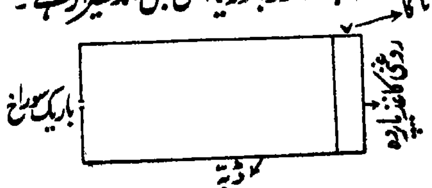
پن ہول کیمرا

اچھا سب سے پہلے اس انوکھی چیز کے نام کا مطلب سن لیجیے۔ "پن ہول کیمرا" کا مطلب ہے باریک سوراخ والا کیمرا۔ یہ بھی آپ کے فوٹوگرافی کیمرے کی طرح ہے۔ آپ اس کی مدد سے کسی بھی شے کا عکس اُلٹا دیکھ سکتے ہیں۔ آپ بے چین ہو گئے ہوں گے کہ یہ کس طرح بنایا جا سکتا ہے اور ہم کسی بھی چیز کا عکس اُلٹا کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے بنانے کا طریقہ بہت آسان ہے اور اسے ہر کوئی بنا سکتا ہے۔ اچھا تو طریقہ بھی سن لیجیے۔

سب سے پہلے گول، چوکور ڈبّہ لیجیے۔ (جس کی اندرونی اور بیرونی سطح کالی ہو تو بہتر ہے) اس ڈبّے کے نیچے کی طرف یعنی پیندے کے بیچ میں ایک کیل کی مدد سے باریک سوراخ کر دیجیے۔ اب ڈھکن کو نکال دیجیے اور اس کی جگہ ایک روغنی کاغذ لگا کر موٹے تاگے سے اچھی طرح باندھ دیجیے جس طرح تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ تو یہ کاغذ ہوگا آپ کا پردہ جس پر آپ دیکھیں گے۔ بس ہو گیا تیار آپ کا کیمرہ۔

مگر بنانے سے پہلے ایک اور بات سن لیجیے وہ یہ کہ آپ کو کسی چیز کا عکس تب ہی صاف نظر آئے گا جب کہ وہ چیز دھوپ میں یا تیز روشنی میں ہو۔

احتیاط: عکس دیکھنے سے پہلے اپنے ہاتھوں کی مدد سے اندھیرا کر کے دیکھا کیجیے تاکہ صاف نظر آ سکے کیوں کہ عکس تب ہی صاف نظر آ سکتا ہے جب کہ آزو بازو یا اغل بغل اندھیرا رہے۔



سزا جو مجھے دی گئی

ابتدائی ششم کے طلبا نے اس عنوان پر اپنے اپنے تجربے لکھے ہیں۔ آپ سب کی دل چسپی کے لیے اُنھیں پیش کیا جاتا ہے۔

سزا کا مطلب تو میں بچپن ہی سے جانتی ہوں۔ ماسٹر صاحب نے ہمیں اس عنوان پر جو مضمون لکھنے کے لیے دیا تو میں کئی دن تک پریشان رہی بھلا اس عنوان پر بھی مضمون لکھا جا سکتا ہے؟ زرا سوچیے تو کس قدر بھیانک منظر بیان کرنے ہوں گے اور اُن کے لکھتے وقت کتنی اُلجھن ہوگی۔ مار کی تکلیفیں یاد کر کے یا سزا کے خوف سے کہیں چھپے رہنے کی بات یاد کر کے۔

مجھے یاد ہے کہ اسکول کا کام نہ کرنے پر مجھے کچھ نہ کچھ سزا ضرور ملی ہے۔ لیکن یہ یاد نہیں کہ کبھی کوئی سخت سزا ملی ہو۔ شاید دو ایک بار اپنے چھوٹے بھائی کو ستانے پر، کبھی آپا نے اور کبھی کبھار اتی نے مجھے ڈانٹا ہے۔ سزا بھی دی ہے۔ ہاں میں اپنی بہن فاطمہ آپا سے ضرور پٹی ہوں انھیں ربن، بُندے اور چوڑیاں جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ ان کی یہ چیزیں کبھی کبھی مجھے پسند آ جاتی ہیں اور میں بغیر سوچے استعمال کرنے لگتی ہوں۔ وہ دیکھ لیتی ہیں تو پیٹنا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ بھی ہوتا رہا ہے کہ میں نے کلاس کا کوئی کام نہیں کیا اور اُستاد نے مجھے نکال دیا۔

زبیدہ خاتون

عمر ۱۰ سال

میں جس مدرسے میں پڑھنے جاتا تھا وہاں سے مجھے بھاگنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ پڑھائی دل چسپ نہ ہو تو اکثر لڑکے مدرسے سے بھاگتے ہیں۔ ایک دن میں چند لڑکوں کے ساتھ حسبِ معمول مدرسے سے بھاگا اور ٹھیک چھٹی کے وقت گھر آ گیا۔ گھر والوں نے سمجھا پڑھ کر آیا ہے۔ شام کو اسکول کے اُستاد میرے والد صاحب سے ملنے آئے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ آج آپ کا لڑکا پڑھنے نہیں آیا تھا۔ والد صاحب نے کہا وہ تو پڑھنے گیا تھا۔ بُلا کر پوچھا گیا۔ بات سچی تھی۔ انکار کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دو معزز انسانوں کے درمیان کیسے انکار کرتا۔ اتنی بے حیائی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ سر نیچا کر لیا۔ سر کا نیچا کرنا تھا کہ پڑا پڑ چانٹے پڑنے لگے۔

یہاں تک کہ میں بے حال ہوگیا۔ وہ دن اور آج کا دن پھر میں اسکول سے نہیں بھاگا۔

مسعود الحق، کشن گنج، بہار

عمر ۱۲ سال

"سزا جو مجھے دی گئی" کے عنوان پر لکھنا اپنے بڑوں اور بزرگوں کی شکایت کرنا ہے۔ لیکن آپ نے عنوان دیا ہے تو میں اس ناگوار فرض کو ادا کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ میں اپنی والدہ صاحبہ کو بہت پریشان کر رہا تھا۔ انھیں بہت غصّہ آیا اور قینچی کھینچ کر ماری۔ قینچی میرے سر میں لگی اور خون بہنے لگا۔ پٹّی وغیرہ باندھی گئی اور خون بہنا بند ہوگیا۔ شام کو جب والد صاحب شہر سے آئے تو پوچھا "یہ چوٹ کیسے لگی ہے؟" والدہ صاحبہ نے بات بنا دی کہ بستر جھاڑتے ہوئے قینچی لگ گئی۔

سیّد محمد زہیر

عمر ۱۲ سال

ہم سب اپنے آموں کے باغ میں کھیل رہے تھے کہ میرے بڑے بھائی نے مجھے مارا۔ میں نے بھی اُن کو مارا۔ اس طرح اچھی خاصی مار پیٹ ہوگئی۔ والد صاحب یہ سب دیکھ رہے تھے۔ اُن کو بہت غصّہ آیا۔ اُن کے ہاتھ میں ناپنے والا فُٹا تھا۔ اس فُٹے سے مجھے اور میرے بھائی کو بہت مارا۔ ہم دونوں رونے لگے تو ملازم سے ہم دونوں کو باغ سے نکلوا دیا۔ اس وقت تو ہم چلے گئے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد جب والد صاحب گھر پر آئے تو ان کا غصّہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ انھوں نے ہم دونوں کو بہت پیار کیا اور بہت سی اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دیں۔ وہ محبّت اور وہ پیار مجھے اب تک یاد ہے۔

عثمان احمد خاں

عمر ۱۳ سال

الماس

ایک مال دار آدمی۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ ایک دن اس کے جی میں آئی کہ انھیں آزمائے۔ اس نے تینوں کو اکٹھا کیا اور اپنی ساری ملکیت ان کے درمیان برابر برابر بانٹ دی۔ صرف ایک قیمتی چیز اپنے پاس رکھ لی۔ یہ ایک بڑا سا الماس تھا۔ اس نے تینوں لڑکوں سے کہا کہ اچھا اب تم لوگ کہیں گھر سے دور چلے جاؤ اور پورے تین مہینے کے بعد مجھ سے ملو ــــ میں یہ قیمتی انعام ــــ الماس ــــ اسے دوں گا جس نے سفر کے دوران کوئی اعلیٰ ترین اخلاقی کارنامہ

انجام دیا ہو۔ چنانچہ تینوں لڑکے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور مختلف سمتوں کو روانہ ہو گئے۔ اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے رہے۔ جب تین مہینے ختم ہونے کو آئے تو سب گھر لوٹے اور باپ کی خدمت میں حاضری دی۔ پھر ہر ایک نے باری باری اپنے نیک کاموں کی روداد سنائی۔

ایک لڑکے نے کہا: ایک دن ایک اجنبی آدمی میرے پاس آیا، اور اچھا خاصا قیمتی سامان میری امانت میں رکھ کر چلا گیا، اس کے لیے نہ کوئی دستاویز لکھوائی اور نہ کسی شاہد و گواہ کی ضرورت محسوس کی۔ کچھ دنوں کے بعد واپس آیا اور اپنی امانت طلب کی، میں نے بغیر کسی ٹال مٹول کے اس کا سامان اس کے حوالے کر دیا۔

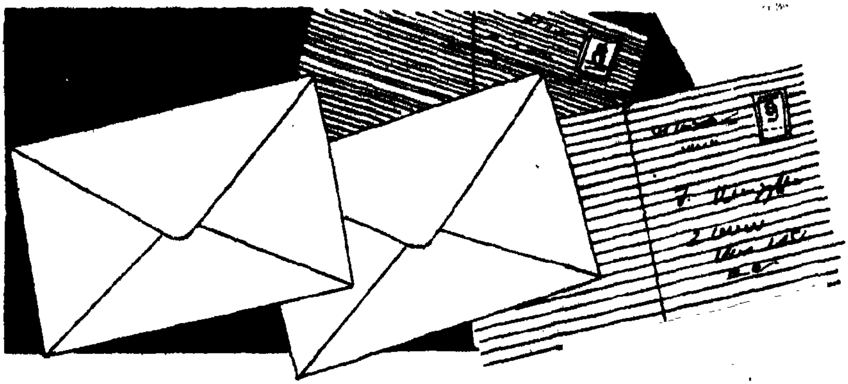
باپ نے کہا: تم نے بہت اچھا کیا ایک ذمے داری سے سُبک دوش ہو گئے۔ امانت کی ادائیگی ایک عام فریضہ ہے اور وہی فریضہ تم نے ادا کیا ہے۔ ایسا نہ کرتے تو خائن اور بے ایمان کہلاتے۔

اب دوسرے لڑکے کی باری تھی۔ اس نے کہا: آبا جان! میں ایک بار دریا کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ دیکھا کہ ایک بچہ اس میں ڈوب رہا ہے، ہر چند کہ دریا چڑھا ہوا تھا، لیکن یہ منظر دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر دریا میں کود گیا اور ان تُند و تیز لہروں سے لڑتا ہوا بچے کے قریب جا پہنچا اور اسے بچا لینے میں کامیاب ہو گیا۔

شاباش! باپ نے داد دی اور کہا، بے شک تمھارا یہ نیک کام تعریف کے لائق ہے۔ لیکن تمھارے اس عمل کی حیثیت بھی یہی ہے کہ تم نے اپنا ایک فرض ادا کیا ہے۔ مُروّت و انسانیت کا یہی تقاضا تھا۔ اگر تم ایسا نہ کرتے تو خود غرض، بُزدل اور سنگِ دل کہلاتے اور مُروّت و انسانیت کے دائرے سے خارج سمجھے جاتے۔

آخر میں تیسرے صاحبزادے نے اپنی حکایت شروع کی۔ کہنے لگے: سفر کے زمانے میں ایک آدمی میرا دشمن ہو گیا، اس کی دشمنی کی وجہ مجھے نہیں معلوم ہو سکی۔ وہ مجھے بڑا تنگ کرتا، عاجز آکر ایک دن میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ جاتے جاتے ایک ٹیلے کے پاس پہنچا۔ دیکھا کہ میرا وہی دشمن ایک خطرناک گہرے کھڈ کے کنارے سو رہا ہے اگر میں اسے ذرا سا دھکا دیتا تو وہ فوراً اس گہرے کھڈ میں جا گرتا اور بڑی بُری موت مرتا۔ اس طرح

(باقی صفحہ پر دیکھیے)



آدھی ملاقات

مکرمی ایڈیٹر صاحب، تسلیم

.... مئی کا شمارہ وقار صاحب سے لیا تھا۔ بہت پسند آیا۔ مجھے سو فی صدی یقین ہے کہ پیامِ تعلیم اپنا صحیح مقام حاصل کر کے رہے گا، جو آپ کا مقصد ہے۔

ظفر صدیقی مہو (ام پی)

محترم جناب ایڈیٹر صاحب، آداب

پیامِ تعلیم ہمارے دفتر ماہنامہ "اشارہ" میں تین ماہ سے پابندی کے ساتھ آرہا ہے۔ جولائی کا شمارہ زیرِ نظر ہے۔ سبھی چیزیں قابلِ قدر ہیں

نشاط قیصر، پٹنہ

مکرمی، آداب

جولائی کا شمارہ ملا۔ بے حد خوشی ہوئی — پیامِ تعلیم کا ہر شمارہ پہلے سے بہتر شائع ہو رہا ہے۔ جون کے پرچے میں آپ نے ایک کالم قلمی دوستی شروع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ جولائی کے پرچے میں یہ کالم کہیں نظر نہ آیا۔ امید ہے اگلے شمارے میں ضرور شامل کریں گے۔

ابرار احمد، علی گڑھ

محترمی تسلیمات

جولائی کا پیامِ تعلیم موصول ہوا۔ گو کہ یہ شمارہ ذرا تاخیر سے ملا۔ لیکن ہاتھوں میں آتے ہی انتظار

کی ساری کوفت دُور ہوگئی۔ پیامِ تعلیم بلاشبہ ہر لحاظ سے اور ہر زاویے سے ایک بہترین رسالہ ہے۔ آج کی گرانی کے دَور میں اتنی کم قیمت میں اتنا دل چسپ، معلوماتی اور خوب صورت رسالہ پیش کرنا آپ کے اُردو نواز ہونے کا ثبوت ہے۔ خدا آپ کے ارادوں کو کامیابی عطا کرے۔ اور پیامِ تعلیم ترقی کی انتہا کو پہنچ جائے۔ سال گرہ پر مبارک باد اور تحفہ روانہ کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ سال گرہ کا تحفہ خوب ہے۔ یقین ہے میری طرح دوسرے پیامی بھی پسند کریں گے۔

آپ کا

زین العابدین راہی، دھولپوری

محترمی، تسلیمات

پیامِ تعلیم کا تازہ شمارہ ملا۔ (مقامی ایجنٹ کے توسط سے)، پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ واقعی آپ حضرات بڑی محبت اور لگن کے ساتھ اسے سنوارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندستان بھر میں اس وقت پیامِ تعلیم سے اچھا بچوں کا کوئی اور رسالہ نہیں۔

قاضی انصار، کھنڈوا ایم پی

محترم، تسلیم

پیامِ تعلیم کے بارے میں کچھ کہنا یا تعریف کرنا ضروری نہیں ہے۔ وہ تو ایک چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا ہے۔ اور ہر ماہ کی اشاعت میں ایک نئے ڈھنگ سے حاضر ہوتا ہے۔

مظفر علی شاد آکوٹوی

محترمی ایڈیٹر صاحب، تسلیم

بہر حال پیامِ تعلیم بچوں کا ایک ایسا پرچہ ہے جو کبھی بند نہیں ہوگا۔ اور بہت جلد ہندوستان کے صفِ اوّل کے پرچوں میں اس کا شمار ہوگا۔ اس کے لیے میں کوشش کر رہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ خریدار بناؤں اور انشاء اللہ سب سے پہلے میں اس کا خریدار بنوں گا۔ یہ صحیح ہے کہ خریداروں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی۔ اتنا ہی پرچے کا رنگ نکھرے گا۔ اور اتنا ہی ترقی کرے گا۔

واحد علی خاں سنگا کروز، بمبئی

محترمی ایڈیٹر صاحب، آداب

آپ کا رسالہ پیامِ تعلیم دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب اُردو میں بھی اس قسم کے

رسائل نکلنے لگے ہیں۔ اُردو میں بچوں کے لیے معلوماتی رسائل کی بہت کمی ہے۔ امید ہے پیامِ تعلیم اِس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔

جناب ایڈیٹر صاحب، اسلام علیکم

بعد دُعا آپ سے یہ عرض ہے کہ آپ نے مئی اور جون کا پیامِ تعلیم نمونے کے طور پر بھیجا ہے۔ پیامِ تعلیم نے تو مجھے حیران کر دیا۔ جناب یوسف ناظم کی کہانی 'قربان میاں کے کارنامے'، جناب مولانا مقبول احمد سیوہاروی کا 'ابن بطوطہ' اور عبدالغفار بمبئی کا 'منگل مندر' بہت ہی پسند آیا۔ جناب بزمی بھارتی نے تو مرثیہ لکھنے میں کمال کر دیا۔ بھارتی صاحب نے تو پوری کربلا کی تصویر پیش کر دی۔ میں آپ کی ایجنسی کے لیے یہاں کوشش کروں گا۔ خدا کرے آپ کا پیامِ تعلیم زیادہ سے زیادہ ترقی کرے۔

محمد ابراہیم، سری نگر (کشمیر)

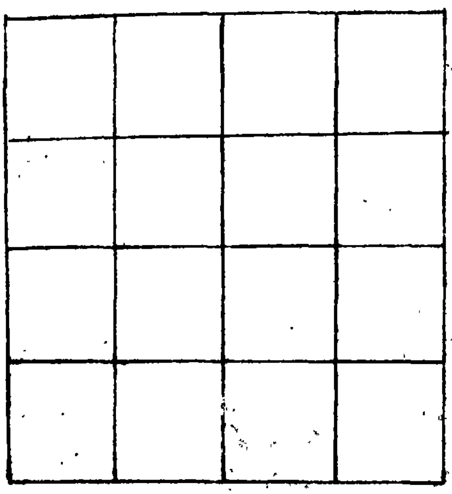
کماری خورشید عبداللہ

الائچی بنائیے

دیکھیے آپ کے خاصدان کے لیے ہم الائچی بھجوا رہے ہیں امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ ارے آپ تو واقعی کھانے کی الائچی سمجھ بیٹھے! یہ تو وہ الائچی ہے جو شادی کے بلاوے کے لیے رت جگے کا مالیدہ اور گلگلوں کے ساتھ رکھ کر بھجوائی جاتی تھی۔ یہ رواج اب ختم ہو گیا ہے۔ پہلے اس خوب صورت سی رنگین کاغذ کی ڈبی میں الائچی، چاول اور مصری رکھ کر تمام رشتے داروں اور پڑوسیوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ اب آپ اسے اپنی میز کی خوب صورتی بڑھانے کے لیے رکھ سکتے ہیں۔

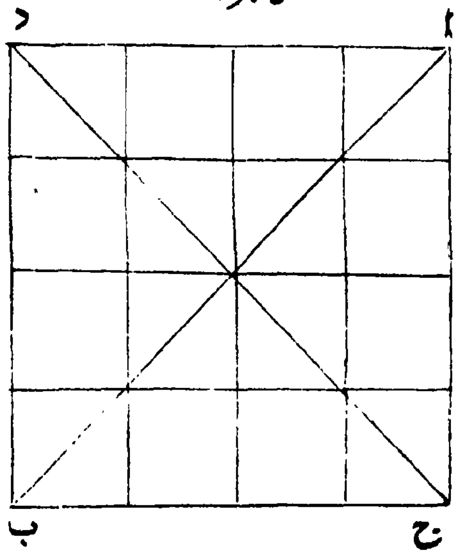
۱۔ مربع شکل کاغذ لے کر دی ہوئی شکل نمبر ایک کی طرح شکنیں ڈال کر کھول لیجیے، جس میں دی ہوئی شکل نمبر ایک کے مطابق (۱۶) مربع ہوں۔

شکل نمبر ایک



۲ موڑ ا ب، ج د موڑ کر کھول دیجیے۔ جو شکل نمبر ۲ کے مطابق ہوگا یعنی شکل نمبر ایک پر مزید دو ترچھے خطوط ا ب، ج د شکل نمبر ۲ کی طرح ہوں گے۔)

شکل نمبر ۲

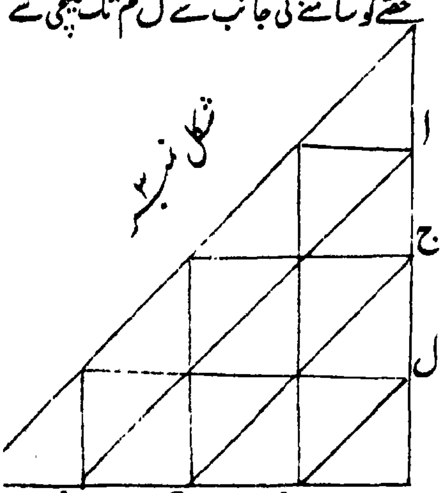


۳ خط ا ب کو اس طرح موڑیے کہ نقطہ د، ج پر آجائے۔ شکل مثلث کی طرح ہو جائے گی جس پر پہلے ۳ اس کے بعد ۲ اور پھر ایک مربع ہے ان تمام کو نصف مربعوں پر شکل نمبر ۳ کی طرح اوپر نیچے شکنیں ڈالیے یعنی ا ب، ج د، ل م پر شکن ڈالتے جائیے جو شکل نمبر ۴ کی طرح ہو جائے گا

اس کے بعد کھول کر یہی عمل دوسری جانب یعنی شکل نمبر ۲ کے ج اور د پر دُہرائیے اور کاغذ کھول لیجیے جو شکل نمبر ۵ کی طرح ہوگا۔

موڑ ۴: ل م کو اس طرح موڑیے کہ ھ، ن پر آجائے۔ شکل نمبر ۶ پر نقطہ دار لائن یعنی ا ب تک ہر دو جانب قینچی سے کاٹ لیجیے اس کٹے ہوئے حصے ا ب کو احتیاط سے ایک حصے کو سامنے کی جانب سے ل م تک قینچی سے

شکل نمبر ۳



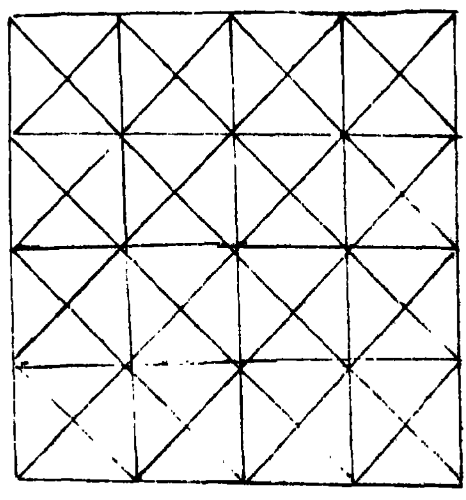
شکل نمبر ۴



کاٹیے دوسرے حصے ا ب کو پچھلی جانب سے

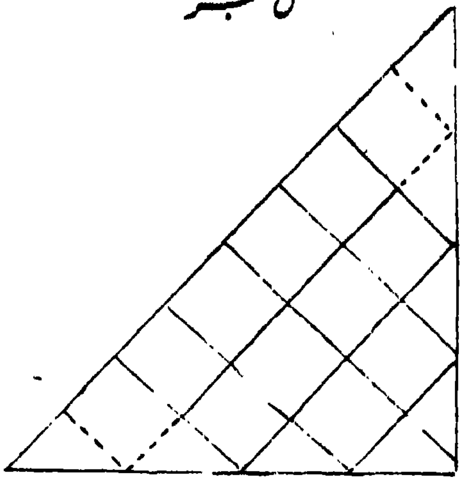
یعنی دی ہوئی شکل نمبر ۲ کے مطابق ل م تک کاٹ لیجیے۔ کاٹتے وقت احتیاط ضروری ہے ورنہ پورا حصّہ کٹ جائے گا اور ساری محنت برباد ہو جائے گی۔ یہی عمل دوسری جانب یعنی شکل نمبر ۵ کے ھ اور ب کو موڑ کر لیجیے اور کھول لیجیے جو شکل نمبر ۲ کی طرح ہوگا اب آپ نوک ا کے ن د کو ھ ی پر موڑ کر احتیاط سے اٹھا کر ب کے کھانچے ل م میں ڈال کر دوسری جانب ن د اور ھ ی کو کھول دیجیے۔

شکل نمبر ۵

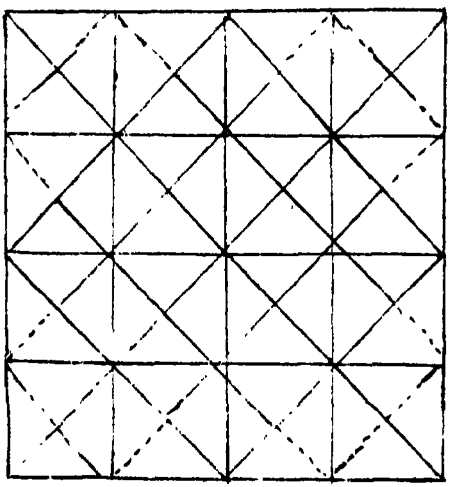


یہی عمل موڑ ج د پر احتیاط کے ساتھ

شکل نمبر ۶



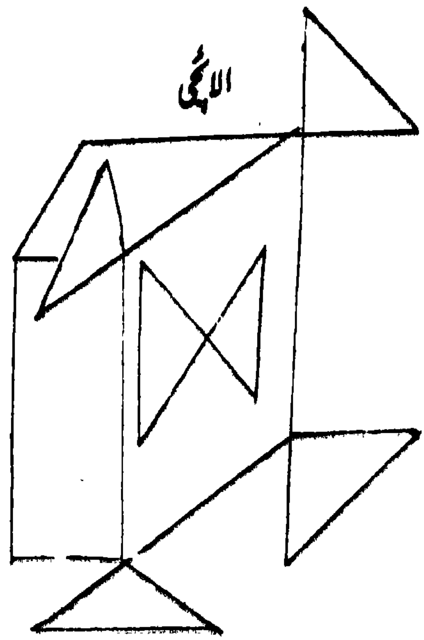
شکل نمبر



ہر گھڑی برابر شکن پر موڑیئے دوسری مرتبہ یہ عمل

کرتے وقت زرا مشکل ہوتی ہے اس لیے آپ پہلی گھڑی کو نیچے کی جانب دبا کر دوسرا عمل دُہرائیے ہر طرف کے ڈُو ڈُو کونے پکڑ کر آہستہ آہستہ کھینچیے اور نکلے ہوئے گوشوں کو شکل کے مطابق برابر کر دیجیے۔

لیجیے الائچی تیار ہے اپنی بہن یا بھائی کی شادی پر ہمیں الائچی بھجوائیے گا بھولیے گا نہیں۔





آپ کی عمر بڑھ سکتی ہے

آپ ہم اور دُنیا کے سبھی لوگ جی سے چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ دنوں اس دُنیا کی بہار دیکھیں۔ انسان کا یہ پُرانا خواب ہے، بہت ہی پُرانا۔ جبھی تو مُلکوں مُلکوں کے سائنس داں اس خواب کو پورا کرنے کی کھوج میں لگے ہیں۔ یعنی یہ کہ انسان کیوں بوڑھا ہوتا ہے۔ جوانی کے بعد جوں جوں آگے بڑھتا ہے ہاتھ پیر جواب دینے لگتے ہیں۔ طرح طرح کی بیماریاں آگھیرتی ہیں وغیرہ۔

اس وقت روس میں زیادہ عمر کے لوگ دُنیا کے سب دیسوں سے زیادہ ہیں۔ سو سال اور اس سے زیادہ عمر کے لوگوں کی تعداد روس میں مجموعی طور پر اکیس ہزار سات سو ہے۔ قفقاز کے علاقے میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان میں سے اکثر لوگ دیہات میں رہتے ہیں۔

جارجیا میں سائنس والوں نے بوڑھے لوگوں کا غور سے مطالعہ کیا تو بہت سی اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ مثلاً ایک بھی کاہل اور سست آدمی زیادہ دنوں زندہ نہ رہ سکا۔ کام کرنا، محنت کرنا انسان کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور لمبی عمر پانے کی پہلی اور لازمی شرط ہے۔ کام اور پھر اپنی پسند کا کام انسان میں جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔

روس کے سب سے بوڑھے بزرگ شیر علی مسلوف ۱۶۰ سال سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ ان سے کسی نے اتنی لمبی عمر کا سبب پوچھا۔ انھوں نے سیدھا سادا سا جواب دیا "میرا روزانہ کا کام"۔ شیر علی مسلوف زندگی بھر کام کرتے رہے ہیں اور اب بھی صبح کو اُٹھتے ہی وہ اپنے باغ میں کام میں لگ جاتے ہیں۔

جارجیا میں اسّی سال سے زیادہ عمر والے عام طور پر سرکس میں، چائے کے باغوں میں یا خود اپنے باغوں میں کام کرتے ہیں، اپنے مویشیوں اور پرندوں وغیرہ کی دیکھ بھال اور رکھوالی کرتے ہیں، شکار کھیلتے ہیں، گھوڑ سواری کرتے ہیں۔ دل چسپ بات یہ کہ یہ سب لوگ ستر اسّی سال سے بیوی بچّوں والے ہیں۔ گھریلو زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ لوگ کبھی بیمار بھی نہیں ہوتے۔ ان کے اعصاب بھی اچھی حالت میں ہیں۔ یادداشت بھی بہت اچھی ہے۔

رہی کھانے پینے کی بات تو یہ دن میں تین چار مرتبہ کھاتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ یا بھوک سے زیادہ کبھی نہیں کھاتے۔ کھانے میں زیادہ تر ترکاریاں ہوتی ہیں۔ پھل ہوتے ہیں۔ شہد بھی ہوتا ہے۔ بہرحال یہ تمباکو کے پاس نہیں جاتے۔ ہر طرح کی نشیلی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے بہترین قدرتی شراب صاف ستھرا تازہ پانی ہے۔ یہ اپنی تن درستی کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ خوب پیدل چلتے ہیں۔ زیادہ وقت کھلی ہوا میں گزارتے ہیں۔ آپ بھی ان سب باتوں کا خیال رکھیں تو یقیناً آپ بھی زیادہ دنوں تک اس دُنیا کی بہار دیکھ سکیں گے۔ یاد رکھیے تمباکو اور نشے والی چیزیں انسان کے لیے زہر کا حکم رکھتی ہیں۔

سیگاؤں سے استانبول تک

جاپانی پارلیمنٹ کے ممبروں اور جاپانی سرمایہ داروں نے مل کر ایک اسکیم بنائی ہے۔ اس اسکیم کے مطابق سیگاؤں سے لے کر استانبول تک ریلوے لائن بچھائی جائے گی۔ اگلے سال اس ریلوے لائن کے سلسلے میں ویت نام، تھائی لینڈ اور برما میں سروے بھی شروع کر دیا جائے گا۔

اس لائن پر چلنے والی ریل گاڑی کی رفتار ۱۲۰ میل فی گھنٹہ ہوگی اور سیگاؤں سے استانبول تک جن ملکوں میں ہو کر گزرنے میں اسے کم سے کم ۵۰ گھنٹے لگیں گے ان کے نام ہیں۔ جنوبی ویت نام، کمبوڈیا، تھائی لینڈ، برما، بھوٹان، مشرقی اور مغربی پاکستان، ہندوستان، ایران، عراق اور ترکی۔

یہ اسکیم بیس برس میں مکمل ہوگی۔ بیس ہزار ملین ڈالر لاگت آئے گی۔ اسکیم بنانے والوں کی رائے ہے کہ جاپان سمیت تمام ترقی یافتہ ملکوں کو اس کی رقم کے جمع کرنے میں حصہ لینا چاہیے۔ اس ریلوے لائن کے بننے کے بعد جو فائدے ہوں گے ان کو دیکھتے دس ہزار ملین یا دس ملین ڈالر کی یہ رقم

کچھ زیادہ نہیں ہے۔

رات میں دن

لیجیے جناب، تھوڑے دنوں بعد رات میں بھی آپ کی زمین سورج کی روشنی سے جگمگائے گی۔ امریکہ کی ایک کمپنی نے امریکی حکومت سے اس بات کا معاہدہ کیا ہے کہ وہ رات کے وقت سورج کی روشنی حاصل کرنے کے طریقے دریافت کرے۔ کوشش کی جائے گی کہ ایک بہت بڑا سیارچہ چھوڑا جائے۔ اس سیارچے پر سورج کی جو کرنیں پڑیں گی وہ زمین کے اس حصّے پر روشنی ڈالیں گے جو اندھیرے میں ہوگا۔ یہ روشنی چاند کی روشنی سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔

عجیب و غریب دُوربین

روسی سائنس دانوں نے ایک عجیب و غریب دُوربین بنائی ہے جو دُنیا کی بڑی سے بڑی دُوربینوں میں سے ایک ہے۔ اس کی اونچائی ۴۲ء۱۴ میٹر اور وزن ۴۲ ٹن ہے۔ اس کے ذریعے ایک ہی وقت میں ۱۰۴ ستاروں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے ذریعے نو ہزار تین سو کلو میٹر کے فاصلے پر دیا سلائی کی تیلی کی روشنی نظر آ سکتی ہے۔

طالب علموں نے ۵ چوٹیاں سر کیں

پچھلے دنوں (اگست کے پہلے ہفتے میں) ہندوستانی طالب علموں کی ایک جماعت ہمالیہ کی مہم سے دِلّی واپس آئی ہے۔ اِس جماعت نے پانچ چوٹیاں سر کی ہیں۔ یہ چوٹیاں ۱۹ ہزار سے لے کر ۲۳ ہزار فٹ تک اونچی ہیں۔

اِس مہم کی جماعت کے سردار مدراس کے آر۔ بے کمار ہیں۔ ان کے علاوہ وی۔ وی سری افغان پلانی کے ہیں۔ جارج ورگھیز اور جی سری کانت مدراس کے، جگدیش کمار سولن کے، رام داس پرابھو بمبئی کے اور ہرایش شاہ بمبئی کے۔ جن چوٹیوں کو انھوں نے سر کیا ان کے نام یہ ہیں: ماؤنٹ دیوٹبا، ماؤنٹ ٹھلا، ماؤنٹ للا، ماؤنٹ کانگ نِلدا، ماؤنٹ کالنکا۔

دہلی کے ایک طالب علم گوتم پال نے جالیہ صدر رادھا کرشنن کی تصویر بنائی ہے۔ یہ اس نے پنسل سے بنائی ہے۔ پچھلے ہفتے اس نے خود صدر کی خدمت میں پیش کی۔ صدر رادھا کرشنن نے اسے خوب شاباشی دی اور کہا اپنے اس شوق کو برابر جاری رکھو۔


رنگ بھریے



پرنٹر و پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا



عمل : کرشناجی آرا

ان کے بارے میں مضمون صفحہ ۳۲ پر دیکھیے

September 1966. Regd. No. D. 1457.

Payam -i- Taleem

New Delhi-25.



یاسمین (بمبئی)، عمر ۶ سال



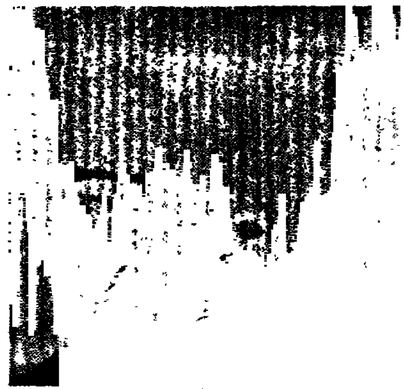


عابد امام (شیوپوری)، عمر ۳ سال

پہچانیے میں کون ہوں



ننھے پیا جی

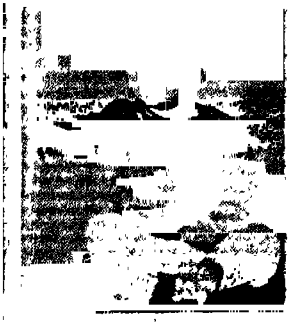


شکیلہ احمد آباد، عمر ۶ سال

ینہ بانو کھتری (بمبئی) عمر ۴ سال



جبین (بمبئی) عمر ۱۴ ماہ



جعفر رحیم (حیدرآباد) عمر ۱½ سال

ریا بحرین والا عمر ۵ سال



امتیاز محمود (بمبئی) عمر ۶ سال

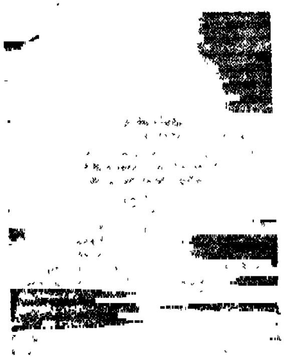


محمد فاروق کھتری (بمبئی) عمر ۱ سال

ہاشم (بمبئی) عمر ۱۱ سال



عارف علی (بمبئی) عمر ۴ سال



رضی الرحمٰن عمر ۱۱ سال

ریاست جموّں وکشمیر میں تمام تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ



جلد ۳ — اکتوبر ۱۹۶۶ء — شمارہ

ایڈیٹر: محمد حسین حسّان ندوی

آرٹسٹ: گلیڈون میسی

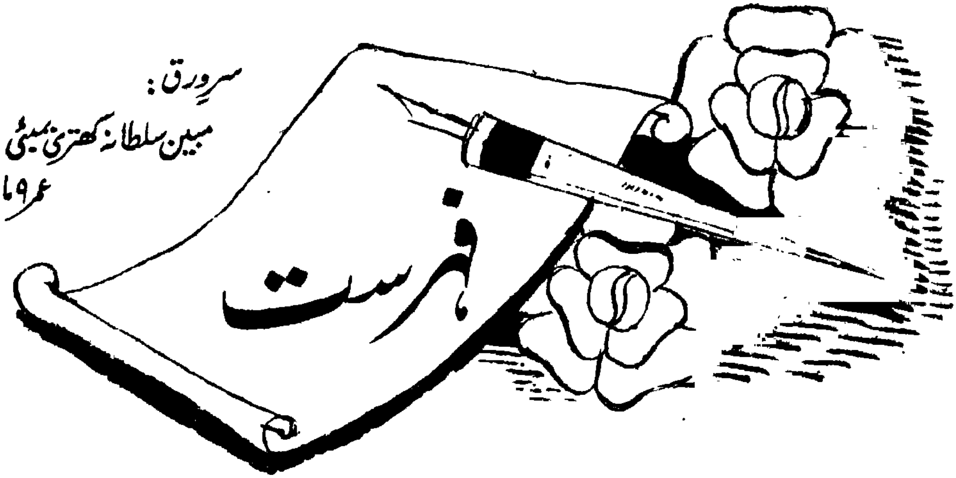
سالانہ چندہ: — پانچ روپے

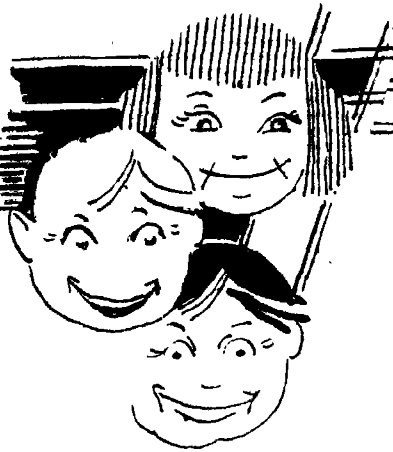
فی پرچہ: — پچاس پیسے

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

بمبئی آفس:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنس بلڈنگ، جے جے ہسپتال بمبئی

سرورق: مبین سلطانہ کھتری بمبئی
عمر ۹ ماہ





بچوں سے باتیں

جناب شاہد علی خاں صاحب کا نام ان صفحوں میں بار بار آیا ہے۔ آپ کے پرچے کی موجودہ ترقی میں ان کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ پیامیوں کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ پچھلے مہینے انھیں بہت سخت صدمہ اٹھانا پڑا۔ ان کے والد ایک عرصے سے بیمار تھے۔ ستمبر کی پہلی تاریخ کو ان کا انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ شاہد صاحب کو ان سے دلی لگاؤ تھا اسی لیے انھیں صدمہ بھی بہت ہوا ہے۔ خدا انھیں اور دوسرے عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے اور مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

ستمبر کے پرچے میں ہم نے لطیفوں کے سلسلے میں جامعہ ملیہ اور پیام تعلیم کے بہت پرانے ہمدرد جناب احمد منال صاحب کی ایک تجویز شائع کی تھی یعنی جس پیامی کا لطیفہ سب سے اچھا سمجھا جائے گا پیام تعلیم اس کے نام مفت جاری کیا جائے گا۔ اگر وہ خریدار ہے تو جس بچے کا وہ نام اور پتہ لکھے گا رسالہ اس کے نام جاری کر دیا جائے گا۔ ہمارے پیامیوں نے ابھی تک توجہ نہیں کی ہے۔ تو بھئی اب اس تحریر کو پڑھتے ہی مزے مزے کے لطیفے ہمیں بھیج دیجیے۔ یہ زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک ہمیں مل جائیں۔

"سائنسی دنیا" کے سلسلے میں بھی بس ایک آدھ پیامی نے محترم اکرام صاحب کے سوالوں کے جواب بھیجے ہیں اسی لیے ہم نے اسے شائع نہیں کیا۔ اور بھئی یہ تو بہت ہی مفید، بہت ہی دل چسپ سلسلہ ہے۔

اس میں تو آپ کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے۔ یہ سوال جولائی کے پیامِ تعلیم میں چھپ چکے ہیں "سائنسی دنیا" عنوان سے انھیں ضرور پڑھ لیجیے۔

قلمی دوستی اس مہینے سے شروع کیا جا رہا ہے۔ یہ آپ کے پیامِ تعلیم کا مستقل عنوان ہوگا۔ ہمارے بہت سے پیامی فقط اپنا پتہ اور یومِ پیدائش لکھ دیتے ہیں۔ اپنا شغل اور ہابی بھی تو لکھیے۔ پیامیوں پیامیوں میں ربط ضبط اور دوستی کی بنیاد یہی چیز تو بنے گی۔

جوں جوں سال نامے کی تاریخ قریب آتی جا رہی ہے۔ پیامِ تعلیم کے کارکنوں کی مصروفیت بڑھتی جا رہی ہے۔ مصروفیت بھی پریشانی بھی۔ پریشانی اس بات کی کہ پرچہ ٹھیک وقت پر نکلے۔ اس مہنگائی کے زمانے میں اتنا خوب صورت اتنا شان دار نکلے کہ آپ پڑھ کر پھڑک جائیں۔

کوئی ایک مہینہ ہوا میرے سیدھے ہاتھ میں چوٹ لگ گئی تھی۔ پلاسٹر چڑھا ہوا ہے۔ میری اس معذوری کو محسوس کر کے محترم سید احمد علی صاحب نے بہت سے مضمون نگار بزرگوں اور ساتھیوں کو میری طرف سے خط لکھے ہیں۔ تاہم اگر کسی صاحب کو خط نہ ملا ہو تو اس معذوری کے پیشِ نظر مضمون ضرور مرحمت فرمائیں۔ میں منتظر رہوں گا۔

پچھلے مہینے جامعہ کے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں انتخابات کے سلسلے میں۔ بڑی رونق، بہت چہل پہل رہی۔ خوب خوب تقریریں ہوئیں جلوس نکلے، نعرے لگے۔ نئے نئے ڈیزائن کے دل چسپ پوسٹر نکلے۔ مدرسہ ابتدائی میں فتح کا سہرا عزیزی ذاکر مرتضیٰ کے سر رہا۔ وہی اپنی انجمن کے صدر چنے گئے۔ دوسرے امیدوار نواب احمد اور شاہد ادریس تھے۔

مدرسہ ثانوی کے کامیاب امیدواروں کے نام یہ ہیں:

نائب صدر: عبدالحفیظ خاں۔
سکریٹری: محمد شمیم
مدیرِ آہنگ: ناہید تاباں
ایڈیٹر المصوّر: غضنفر زیدی
لائبریرین: محمد اسلم عباسی
کھیل سکریٹری: اختر حسن خاں

ہماری طرف سے ان سب کو دلی مبارک باد

جناب عبدالرحیم نشترؔ

اے خدا

غمزدوں کی آس ہے تو اے خدا
دُور رہ کر پاس ہے تو اے خدا
جی رہے ہیں تیرے دم سے بے گماں
تو ہی تو ہے رونقِ بزمِ جہاں
یوں تو ہر اک شئے میں تیرا نور ہے
تو نگاہوں سے مگر مستور[1] ہے
آدمی کی آنکھ کیا دیکھے تجھے
کتنے موسیٰ دیکھ کر غش کھا گئے
پھر بھی مومن کی نظر میں، دل میں ہے
آنکھ ہو تو خلوت و محفل میں ہے
یا الٰہی مجھ کو ایسی آنکھ دے
جو ترے دیدار میں کھوئی رہے

---

[1] چھپا ہوا

جناب آفاق احمد

روشنائی کیا ہوئی

نجمہ، بابو، منّی اور شمّو ——— یہ چاروں بچے" بچّیاں بھیّا کی عدالت میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان سے سیدھے بچے ساری دُنیا میں کہیں اور ہوں گے نہیں۔

بھیّا بہت غصّے میں تھے۔

سویرے ہی انھوں نے ایک دوات خریدی تھی اور شام کو جب وہ لکھنے پڑھنے کی میز پر آئے، تو وہ آدھی سے زیادہ خالی تھی۔ بھیّا نے دوات کو خالی دیکھا تو غصّے سے لال ہو گئے۔ سب بچّوں کو بلایا گیا۔

اور اس وقت یہ چاروں بھیّا کے سامنے لائن بنائے کھڑے تھے اور وہ چیخ چیخ کر پوچھ رہے تھے کہ ان کی دوات کس نے خالی کی۔ مگر توبہ کیجیے جو اُن میں سے کوئی بھی یہ ماننے کو تیار ہو کہ اس نے دوات کو ہاتھ بھی لگایا ہے۔

مُنّی کہہ رہی تھی: "قسم لے لیجیے جو میں نے آپ کی دوات کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔"

بابو صفائی پیش کر رہا تھا: "میں تو آج آپ کے کمرے میں گیا ہی نہیں۔"

بھیّا چیخے: "تو پھر اس کی آدھی روشنائی کہاں گئی؟"

نجمہ نے گردن جھکائے جھکائے جواب دیا:

"ہمیں کیا معلوم!"

بھیّا کا پارہ اور چڑھ گیا۔ ایک ایک کر کے سب انکار کر چکے تھے۔ اب صرف شمّو بچی تھی۔

بھیّا نے طنز کے ساتھ کہا: "آپ کہیے شمّو بی! آپ نے دوات دیکھی ہی نہ ہوگی؟"

"جی ہاں"—— شمّو نے کچھ شرما کر کہا۔

بھیّا نے غصّے سے سب کو گھورا اور پھر شمّو سے بولے: "تو پھر کیا بھوت لے گئے آدھی روشنائی کو۔ کیوں؟"

"جی ہاں" شمّو پھر بولی۔

"مونچھیں رنگنے کے کام آئے گی اُن کے۔ کیوں؟" بھیّا نے پوچھا۔

"جی ہاں" کہہ کر شمّو نے طاق کی طرف دیکھا۔ بھیّا کی نظر بھی اُدھر گئی۔ وہاں بچّوں کے گڈّے گڑیوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

شمّو کی جی ہاں جی ہاں سن کر بھیّا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"جی ہاں! ہر سوال کا جواب جی ہاں—— مگر بھلا بتاؤ تو بھوتوں کی مونچھیں تو خود کالی ہوتی ہیں۔ وہ بھلا سیاہی سے کیوں رنگتے؟"

بھیّا نے اب جاسوسوں کی طرح چالیں چلنا شروع کر دیں۔ وہ تہیّہ کر چکے تھے کہ ان چاروں سے سچ اُگلوا کر ہی رہیں گے۔

اُنھوں نے پھر کہا: "بتاؤ بھوتوں کی مونچھیں تو کالی ہوتی ہیں۔ وہ سیاہی کیوں پوتیں گے؟"

"مگر دوات تو ہرے رنگ کی تھی"، مُنّی منمنائی۔

"کیا مطلب؟ ہرے رنگ سے کیا مطلب؟ تمھیں ہرے رنگ کا کیسے پتہ چلا۔ تم نے تو دوات کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ بتاؤ بتاؤ تمھیں رنگ کا کیسے پتہ چلا؟" بھیّا مُنّی کی طرف پلٹے۔

مُنّی گھبرا گئی۔ ہکلانے لگی: "وہ—وہ—بات یہ ہے کہ—— وہ"

"وہ۔ وہ کیا۔ ضرور تم نے دوات خالی کی ہے"

بھیّا آگے بڑھے۔

"نہیں۔ میں نے نہیں۔ وہ تو بابو نے اپنے قلم میں بھری تھی"

مُنّی نے خود کو پکڑے جاتے دیکھ کر بابو کو پھنسانا چاہا۔

اس بار بھیّا بابو کی طرف بڑھے۔

"میں نے کیوں؟" بابو نے مُنہ بنایا، "نجمہ آپا نے اس میں سے لے کر سفید ریشم کی لچھی

رنگی تھی۔"

بھیّا، نجمہ کی طرف مڑے۔

نجمہ نے جھٹ اپنی صفائی پیش کی۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ تو شمّو نے اپنے گڈّے کی مونچھیں رنگی تھیں۔"

اِس اعتراف کے بعد چاروں شریروں کی پول کُھل چکی تھی۔ چاروں اپنی سزا کے منتظر سر جھکائے کھڑے تھے۔

اب کی بھیّا نے شمّو کی خبر لی: "کیوں۔ اتنا جھوٹ ——— تم نے دوات دیکھی ہی نہ تھی پھر وہ کیا اُڑ کر تمھارے گڈّے تک پہنچ گئی ——— کیوں شمّو بتاؤ۔"

"جی ہاں،" شمّو اپنی پُرانی معصومیت کے ساتھ بولی۔

"پھر توتے کی وہی ایک رٹ "جی ہاں"۔"

بھیّا کہاں تو خفا ہو رہے تھے کہاں اِس جی ہاں کو سُن کر قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

کہنے لگے: "مانتے ہیں تمھیں شمّو بی ——— ایک تم ہی ہو جس نے میری کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا ——— بہرحال اب تو تم یہ قبول ہی کرلو گی کہ تم نے روشنائی سے اپنے گڈّے کی مونچھیں رنگی تھیں۔"

انھوں نے شمّو کی طرف دیکھا۔ مگر خلاف توقع شمّو کا جواب تھا: "جی نہیں۔"

اور بھیّا اس سفید جھوٹ پر حیران رہ گئے۔ اور اِن چاروں شریروں کو چھوڑ کر امّی کے پاس چل دیئے شکایت کرنے ——— بھیّا کے جاتے ہی چاروں نے ایک دوسرے کو شکایتی انداز میں دیکھا اور پھر نئی شرارتوں کی تیّاری کرنے لگے۔



"پانی آیا، پانی آیا"
کتنی فرحت بخش ہوا ہے
"چھاتا لاؤ چھاتا بھائی"
کسی کو برساتی یاد آئی
"زیادہ دیر نہیں ٹھہرے گا"
وہ دیکھو مغرب سے بادل
اُف! کتنی گھنگھور گھٹا ہے
دیکھو دوکانوں کے باہر
بے چارے مجبور کھڑے ہیں
سب کا چہرا اُترا ہوا ہے
سڑکوں پر پانی ہی پانی
پانی، رک جائے گا پھر بھی
کھڑے رہیں گے سب جھنجھلائے
اکثر ہم نے غور کیا ہے
سورج وقت سے نکلے ڈوبے
وقت سے آئیں، وقت سے جائیں
جب بھی ان کے جی میں آئے

سب بچوں نے شور مچایا
جس کو دیکھو جھوم رہا ہے
کہہ کے کسی نے دوڑ لگائی
دیکھو دیکھو کدھر ہے بھائی
کہتا ہے کوئی "یہ برسے گا"
جھوم کے آئے کرتے ہل چل
پانی بڑھتا ہی جاتا ہے
کالج کے لڑکے آ آ کر
بھو کے گھر سے دُور کھڑے ہیں
پانی نے رستہ روکا ہے
جیسے آئی ہو طغیانی
رہنا پڑے گا سب کو یونہی
گھر جانے کی آس لگائے
آخر ایسا کیوں ہوتا ہے
چاند، ستارے، شام سویرے
لیکن بادل مینہہ برسائیں
خواہ یہ دُنیا رہے کہ جائے

کتنا اچھا ہوتا عادل
وقت سے پانی ہوتا نازل

محمد حسین حسان

باپو

گجرات کے صوبے میں ایک جگہ ہے پور بندر۔ آزادی سے پہلے یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ آزادی کے بعد اور دوسری ریاستوں کی طرح یہ بھی ختم ہو گئی۔

یہ اب سے کوئی ستانوے برس پہلے کی بات ہے۔ اس ریاست میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ ماں باپ نے اس کا نام موہن داس رکھا۔ کرم چند باپ کا نام تھا۔ گاندھی کنبے یا خاندان کا لقب تھا۔ اس طرح اس کا پورا نام موہن داس کرم چند گاندھی ہے۔ اور اب تو ہمارا دیس اور ساری دنیا انہیں مہاتما گاندھی کہتی ہے۔ ہاں ایک نام اور بھی ہے۔ یہ بہت ہی پیارا نام ہے۔ دیس کے بہت سے بچے اور بڑے انھیں باپو کہتے ہیں۔ کیوں نہ کہیں، وہ سچ مچ باپ کی ہی طرح تھے۔

خیر، ہم تو اس وقت ۹۷ برس پہلے (۱۸۶۹ء) کی بات کر رہے ہیں۔ اس وقت تو یہ ایک ننھا منا بچہ تھا۔ اس کے باپ ریاست کے دیوان تھے۔ کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ موہن داس اسی گھر میں پلا بڑھا اور پروان چڑھا۔ یہ گھر میں سب سے چھوٹا تھا اس لیے سب کا چہیتا تھا۔

باپو، بچپن میں دیس کے عام لڑکوں کی طرح تھے۔ پر شرمیلے بہت تھے۔ اور بچوں کی طرح چنچل اور شریر نہیں تھے۔ اور تو اور اپنے ساتھیوں سے بھی گھل کر نہ مل پاتے۔ اکثر کھیل کود میں بھی حصّہ نہ لیتے۔ اسکول کی چھٹی ہوتی اور یہ گھر بھاگے۔ اپنے بھائی بہنوں میں سا ہی

زیادہ خوش رہتے۔

چند باتیں اور بھی تھیں۔ کوئی غلط بات ان کے جی کو نہ لگتی تھی۔ ایک دفعہ ان کے درجے میں تعلیمات کا انسپکٹر آیا۔ املا کا امتحان لیا۔ یہ ایک لفظ غلط لکھ گئے۔ استاد نے اشارے سے بتایا۔ سامنے والے لڑکے کی نقل کرلو۔ پر یہ بات ان کے جی کو نہ لگی اور انھوں نے وہ لفظ جوں کا توں رہنے دیا۔

کبھی کبھی وہ ساتھیوں اور دوستوں کی صحبت میں بہک بھی جاتے تھے مگر جلد ہی سنبھل جاتے تھے۔ ایک بار انھیں سگریٹ پینے کا شوق ہوگیا پر تھوڑے ہی دنوں میں انھیں ایسا لگا کہ وہ بہت غلط کام کر رہے ہیں اور پھر انھوں نے سگریٹ یا تمباکو کو ہاتھ نہ لگایا۔ اسی طرح کے اور بھی کئی واقعات ہیں۔

انھیں اپنے ماں باپ سے بہت محبت تھی۔ گھر کے بڑوں کا اور اپنے استادوں کا بہت ادب کرتے تھے۔ وہ ابھی اسکول میں پڑھ رہے تھے کہ ان کے باپ بہت بیمار ہوگئے۔ باپو اسکول کے وقت کے علاوہ دن رات ان کی خدمت میں لگے رہتے۔ آدھی رات تک کھانا کھلاتے، پاؤں دباتے، دوا پلاتے۔ اسی بیماری میں ان کے باپ اس دنیا سے چلے گئے۔ گاندھی جی نے ۱۸۸۷ء میں میٹرک پاس کرلیا۔ گھر والوں کی خواہش تھی کہ ان کو بیرسٹری کے لیے انگلستان بھیجا جائے۔ ایک تو باپ کے مرنے کے بعد گھر میں وہ فارغ البالی نہیں رہی تھی۔ دوسرے ان کی ماں ان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ انھیں اپنی نظروں سے جدا نہ کرنا چاہتی تھیں۔ پھر وہ بہت مذہبی خیال کی تھیں۔ انھیں ڈر تھا کہ ولایت جاکر موہن داس اپنے مذہب سے نہ پھر جائے۔

یہ دیکھ کر ایک صاحب نے باپو کی ماتا کو سمجھایا اور کہا میں اس لڑکے سے تین باتوں کی قسم لیتا ہوں۔ اُسے بھیجنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ لڑکا عہد کا پکا ہے اپنے قول سے پھرنے والا نہیں۔ انہوں نے باپو سے قسم لی کہ وہ انگلستان میں گوشت نہ کھائیں گے۔ شراب کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ وہاں کی سب عورتوں کو اپنی بہنیں سمجھیں گے۔ بہرحال اس قول و قرار کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں باپو لندن سدھائے۔

لندن میں اپنے اس قول و قرار کی وجہ سے انھیں بہت مشکلیں پیش آئیں، بہت پریشانی اٹھانی پڑی۔ مگر وہ اپنی بات پر جمے رہے۔ وہاں انھوں نے بیرسٹری کے علاوہ سینیر کیمبرج کا امتحان بھی پاس کیا۔ اس امتحان کے سلسلے میں انھوں نے لاطینی اور فرانسیسی زبانیں بھی سیکھیں آخر بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ۱۸۹۱ء میں اپنے وطن واپس لوٹے اور بمبئی میں بیرسٹری کرنے لگے۔

اسی زمانے میں ان کی ملاقات جنوبی افریقہ کے چند ہندوستانی سوداگروں سے ہوئی۔ وہ انھیں اپنے، مقدموں کے سلسلے میں جنوبی افریقہ لے گئے۔ اس ملک میں بہت سے ہندوستانی آباد تھے۔ گاندھی جی وہاں پہنچے تو ہندوستانیوں کی حالت بہت قابلِ رحم تھی۔ یہاں انگلستان سے آئے ہوئے گوروں کی حکومت تھی۔ یہ گورے ہندوستانیوں سے اور یہاں کے اصلی رہنے والوں سے خوب محنت مزدوری کراتے تھے۔ اور ان سے جانوروں جیسا سلوک کرتے تھے۔

یہ دیکھ کر باپو کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ دھیرے دھیرے اور ہندوستانیوں کو سدھارنے کے کام میں لگ گئے۔ یہاں انھیں بہت تکلیفیں اٹھانی پڑیں، بہت مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں بہت ذلتیں سہنی پڑیں مگر انھوں نے کسی بات کی پرواہ نہیں کی، ان کی کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ وہاں کے ہندوستانیوں میں اپنی ذلت و خواری کا احساس پیدا ہوگیا۔ گوروں سے مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا ہوئی۔

اپنے مخالفوں سے لڑنے کا باپو نے ایک نیا راستہ نکالا تھا۔ اسے وہ ستیہ گرہ کہتے تھے۔ اہنسا کی لڑائی کہتے تھے۔ یعنی ایسی لڑائی جو پُرامن طریقے سے لڑی جائے۔ اس میں نہ تو مار پیٹ کا کوئی دخل ہو نہ گالی گلوج کا نہ اس سے زیادہ یہ کہ قانون کو توڑا جائے اور حکومت کا کسی بھی طرح سے ساتھ نہ دیا جائے۔

ادھر ہندوستان میں انگریزی حکومت کے مقابلے میں آزادی کی لڑائی جاری تھی۔ یہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی اور سارے دیس میں پھیل رہی تھی۔ باپو کے من میں یہ بات آئی کہ مجھے دیس میں جا کر اس کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔ اور وہ ۱۹۱۵ء میں ہندوستان لوٹ آئے۔ یہاں آکر انھوں نے آزادی کی اس لڑائی میں نئی جان ڈال دی۔ یہاں بھی باپو نے انھیں

ہتھیاروں سے کام لیا۔ اور یہ لڑائی اہنسا کی لڑائی تھی ۔ عدم تشدد کی لڑائی تھی۔ ہوتے ہوتے وہ اس لڑائی کے اگوا بن گیے، لیڈر بن گئے، رہنما بن گئے ۔ اور آخر انھیں کی رہنمائی میں دیس نے یہ لڑائی جیت لی۔

کچھ چیزیں ایسی تھیں جنھیں باپو آزادی سے بھی زیادہ اہم سمجھتے تھے اور وہ تھیں دیس کے سب فرقوں میں پیار محبّت کا جذبہ، سب مذہب کے لوگوں سے رواداری اور ساری دنیا کے لیے محبّت کا پیغام۔ مگر انگریزی حکومت نے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت کا ایسا بیج بو دیا تھا کہ باپو کی کوششوں کے باوجود نفرت کا یہ جذبہ کم نہ ہو پایا۔ اور اسی کا یہ اثر تھا کہ ملک دو ٹکروں میں بٹ گیا۔

ہمارے دیس میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس نفرت کا پرچار کرنے میں بہت آگے نکل گئے تھے ۔ ان ہی لوگوں میں سے ایک سر پھرے نے امن وسلامتی کے اس دیوتا کو، آزادی کی لڑائی کے اس جنرل کو پستول کا نشانہ بنا دیا۔ ۱۳ر جنوری ۴۸ء کو ساری دنیا رنج وغم میں ڈوب گئی۔

باپو اب ہم میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کا بتایا ہوا راستہ اب بھی موجود ہے اور وہ ہے رواداری کا راستہ، سب سے میل محبّت اور بھائی چارے کا راستہ سب انسانوں کی برابری کا راستہ اور عدل وانصاف کا راستہ!

جناب سعادت صدیقی

ایک پرندہ



میں نے دیکھا ایک پرندا — ننّھا ننّھا مُنّا مُنّا
اتنا اچّھا اتنا پیارا — جیسے میاں ننّھے کا کھلونا
باغیچے میں بول رہا تھا — ڈالی ڈالی ڈول رہا تھا
پاؤں ننّھے اس کے نیلے نیلے — پر تھے اس کے بھورے بھورے
گردن اس کی چھوٹی ساری — دُم اوپر کو کچھ اُٹھی سی
سر پر لال بھبھوکی کلغی — جیسے شمع کی لَو کی سُرخی
آواز اس کی ایسی رسیلی — گائے پری جیسے جنّت کی
دِل کش دِل کش اچّھی اچّھی — بین بجائے جیسے کوئی
دُور سے اس کو میں نے دیکھا — کتنا دل کش اور حسیں تھا

پاس اس کے لیکن جب آیا
پھُر سے اُڑ کے پرندہ بھاگا



جناب قاضی انصار

گُل خان

بھائی جان تو بالکل ناستک ہو کر رہ گئے تھے۔ جی ہاں ناستک۔ یعنی خدا کے منکر۔ جہاں کوئی ایسی ویسی بات نکلی کہ زہر اُگلنے لگے۔

"ہونہہ! خدا کوئی چیز نہیں۔ اگر خدا ہوتا تو غریبوں کو اتنی پریشانی نہ اُٹھانی پڑتی۔ وہ بھی آخر امیروں کی طرح انسان ہیں۔ ارے بھئی! یہ سب بارش، گرمی، سردی، چاند، سورج، زمین، آسمان، پہاڑ، ندیاں، ندّیوں میں بہتا ہوا پانی، اور یہ سرسراتی ہوئی ہوا —— یہ سب ایک قسم کا سسٹم ہے —— آٹومیٹک سسٹم!"

اور ہم لوگ ان کی صورت دیکھتے رہتے——

ابّو جان نے تو کئی بار ایسی باتیں سن کر انھیں سمجھایا بھی تھا۔

پر آج بھائی جان کے غصّے کا پارہ بہت چڑھا ہوا تھا۔ گل خان پر انھیں رہ رہ کر تاؤ آرہا تھا۔ سفر کی اہمیت اور ٹرین کا وقت سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے گاڑی نکلوا دی —— امّی جان کو اسی گاڑی سے دلّی پہنچنا ضروری تھا۔ کیوں کہ وقت بہت تنگ تھا۔ اور وہاں پہنچنے کے لیے یہی گاڑی یعنی پٹھان کوٹ ایکسپریس مناسب تھی۔ دوسرے دن ماموں جان کی صاحبزادی کی شادی تھی۔ یوں تو امّی جان کو بھی تاؤ آرہا تھا۔ لیکن وہ خاموش تھیں۔ کیوں کہ بھائی جان کے علاوہ گھر میں سب ہی گل خان کی بہت عزّت کرتے تھے۔ گل خان بڑا نمازی اور بہت سیدھا سادا آدمی تھا۔ وہ دادا جان مرحوم کے زمانے سے ہمارے ہاں تھا۔ جب گل خان گاڑی جانے کے بعد پلیٹ فارم

پر آیا تو بھائی جان نے غراتے ہوئے پوچھا "تم نے اتنی دیر کر دی کہ گاڑی نکل گئی ——!"

بھائی جان کی بات سن کر اس نے ہم سبھوں کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کندھے پر پڑے ہوئے سفید رومال کو اٹھاتے ہوئے بولا۔

"قدرت کو یہی منظور تھا —— میاں ——"

پھر کیا تھا میاں تو وہیں پیر پٹکنے لگے —— امی جان کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ اور ابو جان نے وہاں سے ٹل جانا مناسب سمجھا۔ غصے کی حالت میں اگر ان کے منھ سے گل خان کی شان میں کوئی بدکلامی ہو جاتی تو انھیں بعد میں بہت افسوس ہوتا۔ وہ دادا جان مرحوم کے زمانے سے ہمارے خاندان کی خدمت کر رہا تھا۔ اس میں بس ایک ہی عیب تھا وہ ہر بات پر بس یہی کہہ دیا کرتا۔

"قدرت کو یہی منظور تھا ——"

دراصل گل خان کو پلیٹ فارم نمبر دو پر آنا تھا مگر سب کچھ بتلانے اور سمجھانے کے بعد بھی وہ پلیٹ فارم نمبر تین پر پہنچ کر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اور نمبر دو پلیٹ فارم پر ہم اس کے بے چینی سے منتظر تھے۔ پھر جب گل خان ہمارے پاس آیا تو پٹھان کوٹ ایکسپریس پلیٹ فارم چھوڑ چکی تھی۔ غصے کی وجہ سے سب کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ گل خان سر جھکائے کھڑا تھا۔ اتنے لمبے سفر میں امی جان کے ہمراہ ایک مرد کا ہونا ضروری تھا۔ ابو جان کو چھٹی نہیں ملتی تھی اور بھائی جان امتحانات کے سبب نہ جا سکتے تھے۔ ہماری گنتی ابھی مردوں میں نہ تھی، ابھی ہم بہت چھوٹے تھے۔

اس رات سارے گھر کو نیند نہ آئی۔ امی جان اور ابو جان تو سوچ سوچ کر ہول کھا رہے تھے کہ ماموں جان وغیرہ کیا خیال کریں گے۔ عزیزداری کا معاملہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے اور پھر ہماری ممانی جان کی بڑی بہن تو سو سو باتیں بنائیں گی۔ ممانی جان خود اٹھتے بیٹھتے طعنے دیا کریں گی۔ بہر حال! رات کے آخر میں خدا خدا کر کے سب کی آنکھ لگی۔ مبارک باد کا ٹیلی گرام دے دیا گیا تھا۔

دوسرے دن بھی سب کی حالت غیر رہی۔ لیکن کوئی منہ سے کچھ نہ بولا۔ آج کی رات بھی سب لوگ دیر سے سوئے اور خلافِ معمول تڑکے ہی اٹھ بیٹھے۔ سب کی آنکھیں سرخ انگارہ سی ہو رہی تھیں۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے گلے میں خراش محسوس ہو رہی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھانسی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ بھائی جان،

(بقیہ دیکھیے صفحہ ۳۰ پر)



برسات کا جشن

سید صفدر رضا کھنڈوی

گرمی رخصت ہوئی بادل آنے لگے
کلیاں ہنسنے لگیں پھول گانے لگے

ابرِ رحمت کو آتا ہوا دیکھ کر
سارے دہقان خوشیاں منانے لگے

"پانی با با تو آ، ککڑی بھٹے کھلا"
مل کے آپس میں بچے یہ گانے لگے

دیکھ کر آج بچوں کی اٹکھیلیاں
مجھ کو بچپن کے دن یاد آنے لگے

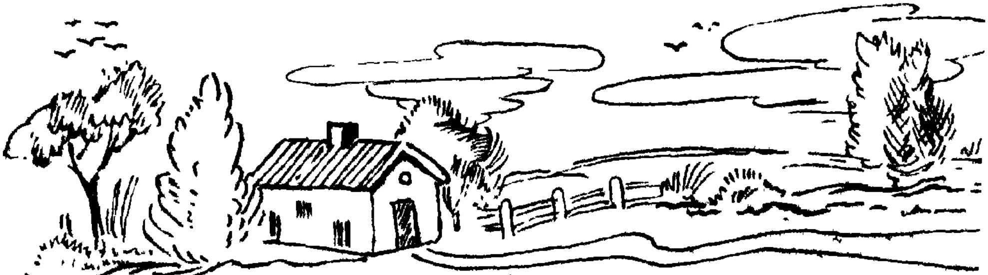
ابر گرجا، لرزنے لگیں بجلیاں
روشنی کے دیے جھلملانے لگے

دیکھتے دیکھتے تیز بارش ہوئی
نالے ندی سبھی گنگنانے لگے

چھیڑا کوئل نے پیارا سا نغمہ ادھر
جشنِ باراں پرندے منانے لگے

کوئی پھدکا ادھر کوئی پھر سے اڑا
گیت ساون کے اڑ اڑ کے گانے لگے

واہ کیا خوب موسم ہے برسات کا
اس کا ہر ایک منظر ہے کتنا بھلا





جناب ریاض آفندی

چار بے وقوف

ایک چڑیا تھی، بہت خوب صورت، بہت پیاری۔ اس کے پر رنگ برنگے تھے، پیر سنہری تھے، چونچ روپہلی تھی۔ سر پر ایک کلغی تھی۔ اس کی آواز بھی بڑی سُریلی، بہت رسیلی تھی۔ وہ جب گاتی تو اس کے منہ سے ہیرے موتی جھڑنے لگتے۔

اس نے اپنا گھونسلا پہاڑ کی ایک اونچی چوٹی پر بنایا تھا۔ وہ دن رات اسی گھونسلے میں رہتی اور گاتی۔ جب گھونسلا ہیروں اور موتیوں سے بھر جاتا تو وہ انھیں پہاڑ کے دامن میں پھینک دیتی۔ اس طرح پہاڑ کے دامن میں ہیروں اور موتیوں کا خزانہ جمع ہو گیا تھا۔

ایک دن اس کا جی گھبرانے لگا۔ اس نے سوچا چلو آج چل کر جنگل کی سیر کر آئیں۔ وہ اپنے گھونسلے سے اُڑی اور ڈالی ڈالی گھومنے لگی۔ جنگل کے جانور اس کی پیاری پیاری آواز کو سُن کر حیرت میں پڑ جاتے۔

اُڑتے اُڑتے وہ تھک گئی۔ ایک درخت کی اونچی شاخ پر آرام کرنے کے لیے بیٹھ گئی۔ اپنے تکان کو دور کرنے کے لیے اس نے گانا شروع کیا۔ وہ اپنی میٹھی میٹھی آواز میں گا رہی تھی۔ ہیرے موتی اس کے مُنہ سے جھڑ رہے تھے۔ قریب ہی ایک چڑی مار چُھپا بیٹھا تھا۔ اس نے چڑیا کو گاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اس کے مُنہ سے موتی جھڑتے ہوئے دیکھے۔ اس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔

اس نے سوچا، اگر میں اس چڑیا کو پکڑ لوں تو خوب امیر بن جاؤں گا۔ یہ سوچ کر اس نے دانا ڈالا اور اپنا جال پھیلا دیا۔

چڑیا نے دانا دیکھا۔ اس کا من للچایا۔ وہ پھر سے اُڑی۔ دانا چگنے کے لیے جال پر آ کر بیٹھ گئی۔ چڑی مار نے اسے پھانس لیا۔ بے چاری چڑیا دانے کی لالچ میں پکڑی گئی۔

چڑی مار اسے اپنے گھر لے آیا، اس کے لیے ایک خوب صورت پنجرا بنایا اور اس پنجرے میں اُسے بڑے آرام سے رکھا۔ اور اس کی خوب دیکھ بھال کرتا۔ اُسے اچھا اچھا کھانے کو دیتا، پینے کو دیتا، اسے کسی بھی قسم کی تکلیف نہ دیتا۔

پنجرے میں چڑیا گاتی۔ اس کے مُنہ سے ہیرے موتی جھڑتے۔ چڑی مار ان کو جمع کرتا۔ اس طرح اس کے پاس بے شمار دولت جمع ہو گئی۔ وہ اپنے گاؤں کا سب سے زیادہ امیر آدمی بن گیا۔ اس نے اپنے رہنے کے لیے عالی شان مکان بنایا اور اس طرح سُکھ کی زندگی بسر کرنے لگا۔

ایک دن اس نے سوچا، اب دولت جمع کر کے کیا کروں؟ پہلے ہی سے اتنی جمع ہو گئی ہے کہ میرے بیٹے کے بیٹے بھی کھائیں گے تو ختم نہیں ہو گی، کیوں نہ اس چڑیا کو بادشاہ کے ہاتھ بیچ کر انعام حاصل کروں؟

یہ سوچ کر وہ چڑیا کو لے کر بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔ اس نے چڑیا کا پنجرہ بادشاہ کے سامنے رکھ دیا۔ چڑیا گانے لگی۔ اس کے مُنہ سے ہیرے موتی جھڑنے لگے۔ بادشاہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے چڑیا خرید لی اور چڑی مار کو مالا مال کر دیا۔

ایک دفعہ چڑیا پنجرے میں گا رہی تھی۔ بادشاہ کو گانا بہت پسند آیا۔ بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا کہ "چڑیا کیا گا رہی ہے"؟ وزیر نے ادب سے جواب دیا "جہاں پناہ چڑیا آپ کے مرنے کی دعا مانگ رہی ہے"۔

بادشاہ کو چڑیا پر بہت غصہ آیا۔ اس نے حکم دیا کہ "چڑیا کو فوراً اُڑا دیا جائے"۔ حکم ملتے ہی وزیر نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ چڑیا پھر سے اُڑ گئی اور درخت کی ایک اونچی شاخ پر بیٹھ کر کہنے لگی "بادشاہ سلامت کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس دنیا میں چار بے وقوف رہتے ہیں"۔ بادشاہ نے کہا "نہیں ۔۔۔! میں نہیں جانتا!! تمھیں بتاؤ وہ کون ہیں"؟ چڑیا نے جواب دیا۔

"اس دُنیا میں پہلی بے وقوف میں ہوں جو زرا سے دانے کے لالچ میں پھنس گئی۔

دوسرا بے وقوف چڑی مار ہے جس نے مجھے آپ کے ہاتھ بیچا۔

تیسرا بے وقوف آپ کا وزیر ہے جس نے مجھے رہا کرنے کا مشورہ دیا۔ اور چوتھے بے وقوف آپ ہیں جس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے مجھے آزاد کر دیا۔"

بادشاہ یہ جواب سن کر پچھتایا اور حکم دیا کہ چڑیا کو دوبارہ پکڑ لیا جائے۔ پر وہ تو پھر سے اُڑ گئی تھی۔

بقیہ "گُل خان"

امّی جان اور ہم حسب معمول ناشتے کی میز پر آکر بیٹھ گئے۔ ابھی ابّو جان کے آنے میں دیر تھی کہ منّی دوڑتی ہوئی آئی اور ہماری طرف آج کا اخبار بڑھاتے ہوئے بوکھلائے لہجے میں بولی۔

"بھائی جان بھائی جان ۔۔۔ ندا ۔۔۔ زرا آج کا اخبار تو دیکھیے ۔۔۔ غضب ہو گیا ۔۔۔" ہم سب ایک دم اخبار پر جھپٹ پڑے۔

"زبردست حادثہ" صفحۂ اوّل کی سُرخی تھی۔

"۹ر اکتوبر: آگرہ اور دلّی کے درمیان پٹھان کوٹ ایکسپریس ایک مال گاڑی سے ٹکرا گئی ۔۔۔ سو آدمی ہلاک اور لگ بھگ پانچ سو زخمی ہوئے ہیں ۔۔۔ تقریباً دو سو کی حالت انتہائی نازک ہے۔" خبر پڑھتے پڑھتے بھائی جان نڈھال سے ہو گئے۔ اور ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

"قدرت کو یہی منظور تھا گل خان! ورنہ آج اس خوش و خرم گھر میں صفِ ماتم بچھ جاتی۔"

ایک ناستک کے مُنہ سے ایسے الفاظ سن کر امّی جان کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ دوڑتی ہوئی ابّو جان کے کمرے میں گھس گئیں۔

★

جناب ندا فاضلی



اسمٰعیل میرٹھی اور بچے

مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی پیدائش ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں ہوئی۔ ابھی مکتب کی تعلیم سے مشکل فارغ ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب میرٹھ سے شروع ہوا۔ اس کی لپیٹ میں دوسرے دلیں باسیوں کی طرح یہ بھی آئے۔ اس وقت ان کی عمر مشکل سے تیرہ ۱۳ برس تھی۔

ہنسنے کھیلنے کے دن تھے اور ان پر یہ تباہی پڑی۔ امن قائم ہونے کے بعد آپ کو سولہ سال کی عمر میں محکمۂ تعلیم کے دفتر میں ایک جگہ مل گئی۔ جہاں آپ نے نہایت محنت اور لگن سے کام کیا۔ سرکار نے اچھے کام کے سلسلے میں آپ کو 'خاں صاحب' کا خطاب بھی عطا کیا۔

اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی زیادہ زندگی بچّوں کی صحبت میں گزاری۔ وہ شروع سے پیشے کے لحاظ سے بچّوں کے دوست اور ان کے دُکھ سکھ میں شریک رہے ہیں۔ بچّوں کی نفسیات، اُن کے کھیلوں اور اٹھکھیلیوں کی سوجھ، اُن کی پسند کی چیزوں کی پہچان ان کے ہنسنے، بولنے اور شرارتوں کے قریبی مطالعے کے لحاظ سے اُن کا مقابلہ صرف بنگال کے صوفی شاعر (جنھوں نے بچّوں کے لیے بہت خوب صورت نظمیں

لکھی ہیں، ٹیگور سے کیا جاسکتا ہے۔

مولوی اسمٰعیل کی نظمیں گائے کے دودھ کی طرح سفید، چڑیوں کی چہچہاہٹ کی طرح مدھر اور کھٹ مٹھے بیروں کی طرح مزے دار ہوتی ہیں۔ ان کو بچے ہی خوش ہو ہو کر نہیں گاتے بلکہ بچوں کے ساتھ ہنسنی گاتی نظر آتی ہیں۔ ان کی ہر نظم میں بچوں کے لیے شاعر کا پیار شربت بھرے کٹورے کی طرح چھلکا پڑتا ہے۔ مولانا اسمٰعیل نے اور بہت سے چھوٹے بڑے شاعروں کی مانند کبھی کبھار صرف منہ کا مزہ بدلنے کی خاطر بچوں کے لیے ۴ نظمیں نہیں لکھیں بلکہ خاص طور سے بچوں کے کھیل کود میں شریک ہو کر بچوں کے لیے خوب صورت گیت لکھے ہیں۔

ان میں ٹھنڈک ہے۔ ... گھر کے آنگنوں کی ٹھنڈک، ان میں پیار ہے۔... ماں کی آنکھوں میں چمکتا مسکراتا پیار، ان میں ہریالی ہے۔ چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں لہکتی ہریالی، ان میں چھاؤں ہے، بڑی بہنوں کے باریک آنچلوں کی چھاؤں۔

مولوی صاحب کی نظموں کے بہت سے شعر قریب قریب ہر اسکول جانے والے بچے کو یاد ہیں۔ ان میں اچھی اچھی نصیحتیں بھی ہیں لیکن یہ نصیحتیں بچوں کی زبان میں اور بچوں کے سے بھولے پن کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ ان سے بچے اُکتاتے نہیں بلکہ احترام کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔

"ایک ایمان دار لڑکا" اسی طرح کی ایک نظم ہے۔ اس میں ایک ہنس مکھ بچہ کھیلتا کھاتا پڑوس کے کسی گھر میں جا نکلتا ہے۔ اتفاق سے گھر میں کوئی نہیں تھا۔ شاید پڑوسی کہیں کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ کھیلتے میں بچے کی نظر تازہ تازہ کھٹ مٹھے بیروں کی ڈلیا پر پڑی جو وہاں رکھی تھی۔ گول گول تازہ بیر کس کو اچھے نہیں لگتے۔ مگر اس نے ایک بیر بھی نہیں چھوا۔ دوسرے کی چیز بنا اجازت کون لے۔ اتنے میں ہمسایہ بھی آگیا اور اس نے جب:

اپنے بیروں میں نہ پائی کچھ کمی

تو: ہو کے خوش لڑکے سے بولا آدمی

'بیر یہ تم نے چرائے کیوں نہیں'

دیکھیے بچے نے کتنی خوب صورتی سے چٹ سے جواب دیا:

کیوں چراتا چور تھا کیا میں کہیں

بھولے بھالے منہ سے یہ ایمان دار جواب سن کر پڑوسی حیرت میں پڑ گیا اور تعریف میں بولا:

واہ وا شاباش لڑکے واہ وا

تو جواں مردوں سے بازی لے گیا

دوسری نظم 'ہماری گائے'، میں مولوی صاحب نے گائے کی خوب صورتی اور اس کے دودھ کے فائدے بیان کیے ہیں۔ گائے کو ہم سب روزانہ دیکھتے ہیں۔ کتنا بھولا بھالا جانور ہے۔ بے چاری خود گھاس پھوس کھاتی ہے اور بدلے میں ہم کو بالٹیاں بھر بھر کے دودھ دیتی ہے جسے بچّے، جوان، بوڑھے سب مزہ لے لے کر پیتے ہیں۔ اور اس کے بچھڑے جنھیں وہ بڑی ممتا سے پالتی پوستی ہے، بڑے ہو کر کھیتی باڑی کے کام آتے ہیں۔ سورج نکلتے ہی جنگل کو سدھارتی ہے اور اور شام کو دودھ بھرے تھن لیے گھر لوٹتی ہے۔ گائے بھی کتنی اچھی، کتنی بھولی اور کتنی فائدہ مند ہے:

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

'صبح کی آمد' بھی بہت اچھی نظم ہے۔ اس نظم کی لے بڑی میٹھی اور لچکیلی ہے۔ اس میں صبح اپنے سندر روپ اور پوری سج دھج کے ساتھ چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ صبح ہوتے ہی اُجلی اُجلی دھوپ نیچے پتّوں سے چھن کر کھیل تماشوں کی صورت چاروں طرف بکھر جاتی ہے۔ میاں مٹھو پنجرے میں بیٹھے بیٹھے اپنی ٹائیں ٹائیں شروع کر دیتے ہیں۔ لال کلغی والا ککڑوں کوں، سر اونچا کر کے پوری آواز سے بانگ دیتا ہے۔ مندر میں گھنٹیاں بجتی ہیں۔ مسجد میں نماز کی اذان گونجتی ہے۔

صبح بے چاری ہر روز اسکول کی بوڑھی نوکرانی کی طرح گھر گھر جا کے بچّوں کو جگاتی اور اکھٹا کرتی پھرتی ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جو اب بھی سوئے رہتے ہیں۔ اُن کے لیے وہ کہتی ہے۔

لو ہشیار ہو جاؤ اور آنکھ کھولو
نہ لو کروٹیں اور نہ بستر ٹٹولو
خدا کو کرو یاد اور منہ سے بولو
بس اب خیر سے اُٹھ کے منہ ہاتھ دھولو
اُٹھو سونے والو! کہ میں آرہی ہوں

مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ دال کی فریاد، پن چکّی، دو مکھیاں، ریل گاڑی، ملمع کی انگوٹھی وغیرہ اسی ڈھنگ کی نظمیں ہیں۔ آپ ان کے عنوان دیکھ کر ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کتنی میٹھی اور پیاری ہوں گی۔ مولوی صاحب صحیح معنوں میں بچّوں کے شاعر تھے۔

جناب انورؔ برہان پوری



نیا دَور ہم کو لانا ہے



جہانِ علم و ادب کو ہمیں سجانا ہے
خوشی کے ساز پہ مِل جل کے گیت گانا ہے

اُٹھو اُٹھو کہ ہمیں ظلمتیں مٹانا ہے
زمیں پہ چاند کی مانند جگمگانا ہے

جہاں سے نام و نشانِ جہل کا مٹانا ہے
بڑھو بڑھو کہ نیا دَور ہم کو لانا ہے

ارادے اپنے اٹل عزم اپنا مستحکم
عمل سے اپنے زمانے کو یہ بتانا ہے

دل و دماغ کو تعلیم کی ضیا دے کر
پیامِ صبحِ مسرت ہمیں سُنانا ہے

ابھی سے سُست خرامی؟ ابھی کہاں منزل
ابھی تو دُور، بہت دُور ہم کو جانا ہے

ہمارے قبضۂ قدرت میں کیا نہیں انورؔ
بہی تو راز جہاں کو ہمیں بتانا ہے

جناب مقبول احمد سیوہاروی

ابنِ بطوطہ

مولانا مقبول احمد صاحب سیوہاروی اپنی چند در چند مجبوریوں کی وجہ سے اس سلسلے کے مضمون نہیں بھیج سکے تھے۔ اسی لیے اگست اور ستمبر کے پرچوں میں یہ نہ چھپ سکے۔ مگر یہ سلسلہ اتنا دلچسپ ہے کہ پیامیوں کے خط پہ خط آنے لگے۔ خیر اب مقبول صاحب نے پورا مسودہ مرحمت فرما دیا ہے۔ اور یہ باقاعدگی سے چھپتا رہے گا۔ پیامی جولائی (صفحہ ۱۰) کے پرچے سے سلسلہ ملائیں۔

ایڈیٹر

اِبراہیم ادہم

ابراہیم ادہم کی قبر اسی جبلہ میں ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ادہم نے بادشاہی چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی، مگر یہ غلط ہے۔ سلطنت توان کے بیٹے ابراہیم کو حاصل ہوئی تھی۔

ان کا قصہ یہ ہے کہ ادہم کسی دن بخارا کے ایک باغ کی طرف سے گذرے اور نہر کے نالے جو باغ کی طرف بہتی تھی بیٹھ کر وضو کرنے لگے۔ اتنے میں ایک خوبصورت اور خوش رنگ سیب پانی میں بہتا نظر آیا۔ ادہم نے سیب اٹھا کر کھا لیا۔ کھانے کو تو کھا لیا مگر سوچنے لگے نہ جانے کس کے باغ کا سیب تھا۔ میں نے بغیر پوچھے کھا لیا، یہ تو بہت بڑی بات ہوئی۔ خدا کے ہاں اس کی پکڑ ہوگی۔ اب یہی صورت ہے کہ اس کے مالک سے معافی مانگی جائے۔

دمشق یہاں سے قریب ہے اور مجھے دمشق جانے کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے دوسرے ہی دن روانہ ہو گیا۔

۹ رمضان ۷۲۶ھ مطابق ۹ اگست ۱۳۲۶ء کو دمشق میں داخلہ ہوا۔ شہر کیا ہے سجی ہوئی دلہن ہے، مسلمانوں کے شہروں میں اس سے بڑھ کر حسین دوسرا کوئی شہر نہیں ہے۔ اس کے باغ، نہریں پھلواریاں اونچے اونچے چمکتے محل، بڑے بڑے شاندار دروازے، اچھلتے فوارے، چہچہاتے پرند، لہلہاتا سبزہ، بل کھاتا ہوا نہروں کا پانی جنت ہے جنت۔

دمشق میں حضرت عیسٰی اور حضرت مریم کی قیام گاہ بھی ہے۔ جس کے چاروں طرف سبزہ کا فرش بچھا ہے، دمشق کی آب و ہوا ایسی ہے کہ مردہ آئے تو جی اٹھے۔ سارا شہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی نے قلعی کر دی جس کی چمک آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے کہ اگر جنت کی تلاش ہے تو دمشق میں آجاؤ۔ ہموار سڑکیں صاف ستھری دکانیں، خوش پوش دکاندار ہفتہ کے سات دنوں میں ایک دن دکاندار دکانیں بند کر دیتے ہیں اور سیر گاہوں میں چلے جاتے ہیں۔ شام تک درختوں کے سایہ میں پھولوں کی ٹٹیوں کے نیچے میلہ سا رہتا ہے۔

دمشق کی کس کس چیز کا بیان ہو۔ ایک ہو، دو ہوں، ہر چیز نرالی ہے۔ دمشق کی جامع مسجد دیکھیے۔ دنیا کی تمام مسجدوں سے بڑی ہے۔ ایسی پختہ اور شاندار ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

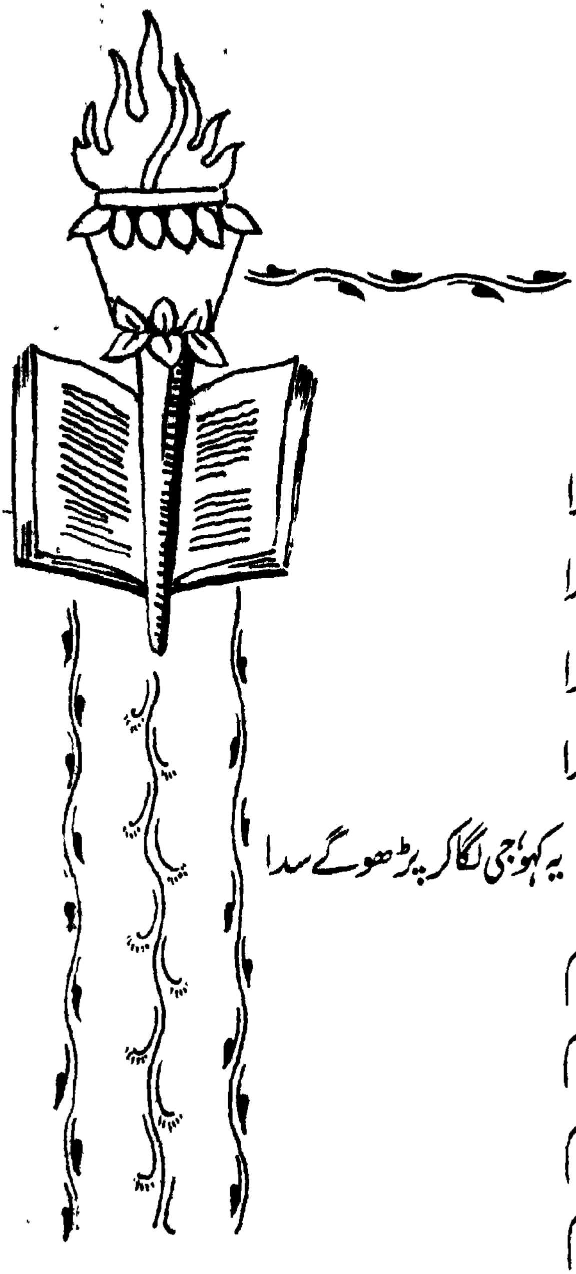
بنی امیہ کے فرماں روا ولید بن عتبہ بن عبدالملک ابن مروان نے مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو اٹلی کے بادشاہ کو لکھا۔ اعلیٰ ترین انجینیر اور فن عمارت کے بہترین جاننے والوں کو بھیجو۔

اٹلی کے بادشاہ نے بارہ ہزار ایسے آدمی بھیجے جن کی نظیر نہ تھی۔

مسجد کی عمارت جدھر سے دیکھو نسر طائر کی شکل ہے۔ نسر گدھ کو کہتے ہیں۔ نسر طائر اڑتا ہوا گدھ۔

مسجد کی آمدنی پچیس ہزار سالانہ اشرفی بتائی جاتی ہے، یہاں وہ قرآن پاک رکھا ہے۔ جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شام والوں کے لیے بھیجا تھا، جمعہ کے دن جب

جناب خالد رحیم



بچوں کے نام

راہِ انصاف پر تم چلو گے سدا
بات ہر حال میں سچ کہو گے سدا
ساتھیوں سے محبت کرو گے سدا
نیک بن کر جہاں میں رہو گے سدا

یہ کہو جی لگا کر پڑھو گے سدا

ظلمتوں کو جہاں کی مٹاؤ گے تم
علم کی شمع ہر سو جلاؤ گے تم
بھولے بھٹکوں کو رستہ دکھاؤ گے تم
انجمن وقت کی جگمگاؤ گے تم

وقت کے ساتھ آگے بڑھو گے سدا
یہ کہو، جی لگا کر پڑھو گے سدا

مکتبِ علم سے دل چرانا نہ تُم
فرضِ انسانیت کا بھلانا نہ تُم
جھوٹ کو اپنا رہبر بنانا نہ تُم
راہِ باطل کی جانب بھی جانا نہ تُم

پرچمِ حق کو اونچا رکھو گے سدا
یہ کہو، جی لگا کر پڑھو گے سدا

تم ہی فخرِ وطن، نازِ اجداد ہو
تم ہی نہرو ہو، گاندھی ہو، آزاد ہو
تم ہی غالبؔ ہو، اقبالؔ ہو، شاد ہو
تم ہی منٹو ہو، تاباںؔ ہو، سجّادؔ ہو

علم کے آسماں پر چڑھو گے سدا
یہ کہو، جی لگا کر پڑھو گے سدا

چالاک کوا

ایک روسی کہانی



نشاط ادیب

ایک مرتبہ پانی برسنے لگا اور بھئی جب برسنا شروع ہوا تو برستا ہی رہا۔ برستا ہی رہا۔ پورے دن، پوری رات برستا رہا۔ پھر اگلے دن اور اگلی رات اسی طرح بارش ہوتی رہی۔ موسلا دھار بارش۔

جب کئی دن تک لگاتار بارش ہوتی رہی تو آپ جانتے ہیں پھر کیا ہوا؟ ہر چیز کا رنگ بہہ گیا اور پھیکا پڑ گیا۔ سب ہی چیزیں بھدے میلے رنگ کی ہو گئیں۔ باغوں میں بھیگے ہوئے بھورے پھول کھڑے تھے۔ بھورے پرندے اپنے گھونسلوں میں سر چھپائے بیٹھے تھے اور بُری طرح کانپ رہے تھے۔

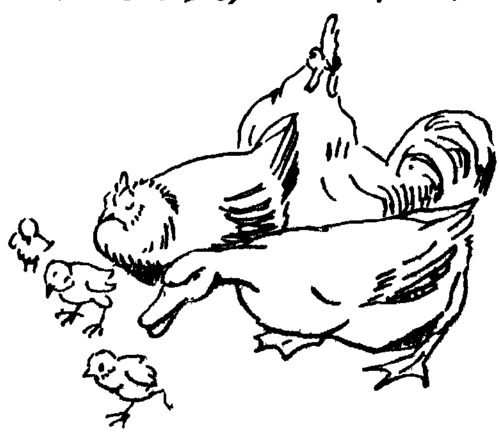
آخر کار بادل اپنی آخری بوند تک زمین پر گرا چکے تب سورج نکلا اور اُس نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ زمین کی طرف دیکھ کر سورج کا دل اداس ہو گیا۔ اب سب ہی جانور، پرندے اور پھول بھدے میلے ہی رہیں گے۔ دنیا بڑی بے رونق ہو جائے گی۔

اچانک آسمان میں قوس قزح یا دھنک

دکھائی دی رنگ برنگی اور چمکتی ہوئی دھنک جو کئی خوبصورت رنگوں میں ایک کمان کی طرح آسمان پر بہت دور تک پھیل گئی تھی۔

"کتنے پیارے رنگ ہیں اس کے" سورج نے خوش ہوکر کہا اور دھنک میں اپنی ایک انگلی گاڑ دی۔ اس نے اپنی انگلی پر نظر ڈالی تو اسے ہرا پایا۔ پھر اُس نے دھنک میں دوسری انگلی گاڑ دی اور وہ لال ہو گئی۔ اب سورج کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے فوراً کھیت میں سے ایک گاجر اکھیڑی، اس گاجر کے سرے کو پیلے رنگ میں ڈبو دیا اور پکار کر کہا۔ "کوئی ہے جو پیلا ہونا چاہتا ہے!"

سب سے پہلے ایک مرغی اور اس کے چوزے بھاگتے ہوئے آئے، مرغی کڑکڑ کرتی ہوئی اِدھر



اُدھر دوڑ دھوپ کرتی رہی اس نے اپنے چوزوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا۔ سورج نے اپنی کوچی ہلائی اور سب کے سب چوزے پیلے ہوگئے۔ اُس کے بعد ایک بطخ اپنے بچوں کو لیکر آئی سورج نے اس کے بچے بھی پیلے کر دیے اس کے بعد ایک کوا دوڑتا ہوا سورج کے پاس پہونچا اور بولا "میں بھی پیلا ہونا چاہتا ہوں" سورج نے کوے کی پیٹھ پر اپنی کوچی پھیر دی کوا جلدی ایک تالاب کے کنارے پہونچا اس نے تالاب کے پانی میں اپنا عکس دیکھا "نہیں۔ نہیں، پیلا رنگ مجھ پر نہیں جچتا" اس نے فیصلہ کیا اور پھر جلدی سے سورج کے پاس پہونچا اس درمیان میں سورج نے اپنی کوچی نیلے رنگ میں ڈبو لی تھی۔ سورج نے ایک یا دو کوچی پھیر کر ابھی ابھی "گل داؤدی" کے پھولوں کو رنگا تھا۔

"میں بھی نیلا ہونا چاہتا ہوں"! کوے نے کہا سورج نے پیلے کوے پر نیلے رنگ کی کوچی پھیر دی۔ کوے نے اپنے پروں پر نظر ڈالی تو چلایا "اے خدا یہ کیا ہوگیا" اور پھر وہ زور زور سے چیخنے چلانے اور کائیں کائیں کرنے لگا اس نے چلا کر پوچھا "کیا کسی نے ہرے رنگ کا کوا بھی

دیکھا ہے؟"

مگر سورج کے پاس اُس کی بات سُننے کا وقت نہیں تھا۔ وہ بہت ہی مصروف تھا۔ اس نے اپنی کوچی کو لال رنگ میں ڈبویا۔ اس نے پوست اور گلاب کے پھولوں کو رنگ دیا۔ ایک مرغ ہانپتا ہوا آیا اور اس کی کلغی بھی لال رنگ سے رنگ دی گئی۔

کوا وہاں کھڑا کھڑا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا 'لال رنگ اچھا نہیں لگے گا۔ کوئی دوسرا رنگ ہی ٹھیک رہے گا۔

سورج نے اپنی کوچی بینگنی رنگ میں ڈبوئی اور پھر تمام بینگنی رنگ کے پھول خوشی سے کھل اٹھے پھر اس نے اپنی کوچی ہرے رنگ



میں ڈبوئی۔ تمام مینڈک اس طرح اچھلتے کودتے ہوئے آئے جیسے ان کے جسم میں کمانیاں لگی ہوں اس کے بعد ایک لومڑی یہ معلوم کرنے کے لیے آئی کہ کیا اس کے لیے اصلی لال یا بادامی رنگ بن سکتا ہے اس کے پیچھے پیچھے ایک گلہری پھدکتی ہوئی آئی۔

سورج لگاتار کام کر رہا تھا۔ وہ بہت مشکل سے رنگ حاصل کرنے والوں کی خواہش پوری کر رہا تھا۔ رنگ بھی قریب قریب ختم ہوتے جا رہے تھے۔ بھونرے کے درمیانی حصّوں کو پیلا بنانے کے لیے مشکل سے پیلا رنگ پورا ہو رہا تھا۔ جو کچھ تھوڑا بہت لال رنگ بچا تھا وہ سارس کی ٹانگوں اور چونچ پر ختم ہو گیا اور بیچارے پپیہے کی چھاتی پر تو صرف ایک ہلکی سی دھاری بن سکی۔

کوا دل ہی دل میں گھبرانے لگا۔ میرے لیے تو کچھ بچے گا نہیں وہ سورج کے پاس گیا "مجھے تو پیارا پیارا سا گلابی رنگ پسند ہے نہیں! شاید نارنگی رنگ بہتر رہے گا یا پھر سب سے اچھا تو یہ ہی ہوگا کہ آپ سب ہی رنگوں کو ملادیں۔"

سورج نے دھنک سے اس کے سب ہی بچے

بجائے رنگ لیے ان سب کو ملایا اور کوّے کو رنگ دیا۔ کوّا پیر بدلتا ہوا ٹہنی سے وہاں کھڑا تھا۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے بیقرار تھا کہ اس کا رنگ کتنا بڑھیا ہوگیا ہے۔ وہ جلدی سے تالاب کی طرف اڑا۔ اس کے پانی میں اپنا عکس دیکھا تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس کا رنگ بہت ہی بھدّا سا سرمئی تھا۔ اس پر کالے کالے دھبّے پڑے تھے۔ "کائیں کائیں" کوّا چلّایا۔

"سورج نے مجھے اتنا بدصورت کیوں بنا دیا ہے؟ کائیں کائیں" اور وہ اپنے بھدّے اور کالے کالے پیروں کو نوچنے لگا۔

پر کیا اس میں سورج کا کچھ قصور تھا؟ آپ کا کیا خیال ہے؟

(بقیہ ابن بطوطہ صـ ۲۹)

یہ حجرہ کھلتا ہے جس میں کلام پاک رکھا ہے تو زیارت کرنے والوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔

دمشق کی مسجد سے پہلے مسلمانوں نے کسی مسجد میں محراب نہیں بنائی تھی۔ سب سے پہلے دمشق میں محراب بنائی گئی۔

مسجد میں ستّر موذن اذان دینے والے رہتے ہیں۔

(باقی اگلے پرچے میں)

جناب ابوالکلام

دہلی سے نیویارک

(۵)

بیرا بے چارہ بھلا مانس تھا۔ مجھے فوراً بتانے لگا۔ پر میں نے کہا: "نہ بھائی یوں نہیں تم اپنا سارا سامان لے آؤ۔ اور یہاں میز پر سجا کر بتاؤ۔ یہ بتاؤ کہ کس چیز کا کیا مصرف ہے۔ اُسے کس وقت اور کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔

یہ سن کر اسے تعجب بھی ہوا کچھ رحم بھی آیا۔ دوڑا دوڑا باورچی خانے گیا۔ وہاں سے سارا سامان لے آیا اور میز پر سجا کر بولا۔ دیکھیے صاحب چاہے آپ یورپ جائیں چاہے امریکہ ہر میز پر یہ سامان اسی طرح رکھا ہوا ملے گا۔

بیرے نے یہ سامان جس طرح سجایا تھا اس کا خاکہ غور سے دیکھنا۔ شاید تمھیں اُس سے کچھ فائدہ ہو۔

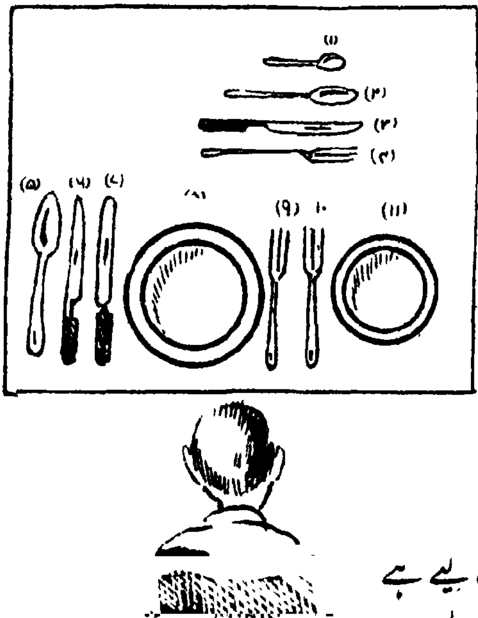
غرض انگریزی کھانے کے میدانِ جنگ کا نقشہ تو معلوم ہو چکا۔ ہر ہتھیار کے استعمال کا طریقہ بھی معلوم ہو چکا۔ چند باتیں اور ہیں وہ بھی تمھارے کان میں پڑ جائیں تو اچھا ہے۔ کیا عجب جو کسی وقت کام آئیں۔

۱۔ چھری ہمیشہ دائیں ہاتھ میں ہوتی ہے کانٹا ہمیشہ بائیں ہاتھ میں ہوتا ہے۔ چاہے آپ کچھ بھی کھا رہے ہوں۔

۲۔ آپ صرف کانٹے سے کھانا چاہیں چھری اور چمچے کسی چیز کا بھی استعمال نہ کریں تو کانٹا دائیں ہاتھ میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ ویسے عموماً کانٹا بائیں ہاتھ میں رہتا ہے۔

۳۔ چمچہ ہمیشہ سیدھے ہاتھ میں رہنا ہی چاہیے

۱ چھوٹا چمچہ چائے یا کافی کے لیے
۲ یہ چمچہ پڈنگ چاول اور کری کے کام آتا ہے
۳ یہ چھری صرف مچھلی کھانے کے لیے ہے
۴ یہ کانٹا صرف مچھلی کھانے کے لیے ہے
۵ یہ چمچہ صرف (soup) سوپ کھانے کے لیے ہے



۶ یہ چھری گوشت کھانے کے لیے ہے
۷ یہ چھری مکھن لگانے کے لیے ہے
۸ یہ پلیٹ کھانا کھانے کے لیے ہے
۹ یہ کانٹا صرف اس وقت استعمال ہوتا ہے۔ جب آپ صرف کانٹے سے کھا رہے ہوں۔
۱۰ یہ کانٹا گوشت کھانے کے لیے ہے۔
۱۱ یہ پلیٹ صرف مکھن اور توس رکھنے اور مکھن لگانے کے لیے ہے۔

خالی چمچے سے کھا رہے ہوں یا کانٹے اور چمچے دونوں سے۔

۴۔ کانٹے کے لئے چھری استعمال ہوتی ہے۔ کھانے کے لئے کانٹا استعمال ہوتا ہے کانٹا پکڑنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس حصے میں خم ہے وہ نیچے رہے۔ اور ابھرا ہوا حصّہ اوپر رہے۔

۵۔ پھل کھاتے وقت منہ میں سے گٹھلی نکالنی ہو تو چمچے میں نکال کر پلیٹ کے ایک کنارے پر رکھ دیتے ہیں۔

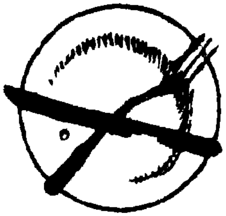
۶۔ ہڈی کو ہاتھ سے کبھی نہیں چھوتے۔ اس کا گوشت کانٹے سے چھڑاتے ہیں۔ کانٹے کی ضرورت پڑے تو چھری استعمال کرتے ہیں گوشت چھڑاتے وقت ہڈی کو چھری سے دبائے رکھتے ہیں

۷۔ صرف توس کو ہاتھ سے چھوتے ہیں۔ مکھن دائیں ہاتھ سے چھری سے لگاتے ہیں توس ہاتھ میں نہ ہو تو پلیٹ میں رکھ کر ہاتھ میں دبائے رکھتے ہیں۔ پھر دائیں ہاتھ سے اٹھا کر کھاتے ہیں توس کے ٹکڑے نہیں کرتے۔ دانت سے کاٹ کر کھاتے ہیں۔

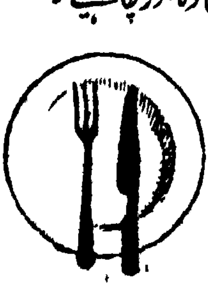
۸۔ سلاد صرف بکری یا گائے کے گوشت کے ساتھ کھاتے ہیں۔

۹۔ کھاتے وقت منہ سے آواز نہیں نکالتے کھانے سے پہلے نیپکن گھٹنوں پر رکھ لیتے ہیں کھانے کے بعد اسی نیپکن سے منہ پونچھ لیتے ہیں اور اسے تہہ کرکے میز پر رکھ دیتے ہیں۔

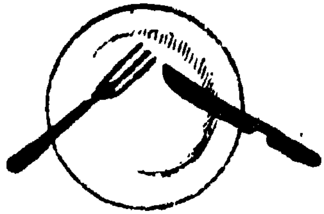
۱۰۔ میز پر رکھی ہوئی چیزیں بار بار لے سکتے ہیں۔ جو چیزیں صرف ایک دفعہ سرو (SERVE) ہوتی ہیں۔ انھیں دوبارہ نہیں منگانا چاہیے البتّہ ایک دفعہ میں لیتے وقت چاہے جتنی لے سکتے ہو۔ اس میں کوئی شرم کی بات نہیں۔



اگر پلیٹ میں اس طرح چھری اور کانٹا رکھا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز آپ کھا رہے ہیں وہ اور چاہیئے۔



پلیٹ میں اگر اس طرح چھری اور کانٹا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کھا چکے ہیں۔ پلیٹ اٹھالی جائے۔



اس طرح اگر چھری کانٹا پلیٹ سے باہر رکھا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کھا رہے ہیں۔ اور کھانا باقی ہے۔

اتنی تفصیل کے بعد تمھیں اندازہ ہوا ہوگا کہ جسے کبھی اس مغربی یا یورپی طریقہ سے کھانے کا اتفاق نہ ہوا ہو شروع شروع میں اُسے کتنی اُلجھن کتنی پریشانی ہوتی ہے۔ اور بھی کئی باتیں ہیں موقع موقع سے لکھتا رہوں گا۔

بیرے کو استاد بنانا میرے لیے مفید ثابت ہوا۔ اب میز پر بے تکلف بیٹھ کر کھانا کھاتا ہوں۔ کبھی کوئی نئی چیز سامنے آتی ہے تو بیرا مجھے بتا دیتا ہے۔ کوئی غلطی ہو جاتی ہے۔ تو کھانے کے بعد مجھے بتا جاتا ہے۔ خدا اسے نیک توفیق دے سبے بیچارہ میری بڑی مدد کرتا ہے۔

غرض کھاپی کر فارغ ہوئے تو سات بج رہے تھے۔ اپنے کیبن میں آئے اور کھانے کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ جہاز کی روانگی کا سب کو انتظار تھا۔ آٹھ بجے روانگی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی کسی نے بتایا تھا کہ نو بجے روآنہ ہوگا۔ پر اب تو جہاز میں بیٹھ گئے ہیں چاہے جب روآنہ ہو۔

ہم سب اپنے اپنے کیبن میں بیٹھے جہاز کے چلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ایسا لگا جیسے جہاز میں حرکت ہو رہی ہے ہم لوگ اپنے اپنے کیبن سے باہر نکل آئے اور دیکھنے لگے کہ ماجرا کیا ہے۔ جی ہاں جہاز چل پڑا تھا۔ مگر مشکل سے پچاس گز چلا ہوگا کہ پھر رک گیا معلوم ہوا کہ پائلیٹ صاحب جہاز پر چڑھیں گے۔ اور انھیں کی رہنمائی میں جہاز چلے گا۔

بات یہ ہے کہ دریائے ہگلی کہیں اتھلا ہے۔ کہیں گہرا ہے۔ پائلیٹ اسکے جغرافیے سے واقف ہوتے ہیں۔ اسی لیے جب تک سمندر نہ آجائے جہاز پائلیٹ ہی کی ہدایت اور رہنمائی

میں چلتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سمندر تک پہنچنے کیلئے ۱۴۰ میل اسی ہگلی میں سفر کرنا پڑے گا یہ سفر کوئی دو دن میں پورا ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ دریا میں بعض، جگہ پانی اتنا گہرا نہیں ہوتا کہ جہاز آسانی سے چل سکے۔ ایسی صورت میں "مد" کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ مدو جزر جوار بھاٹے کو کہتے ہیں۔

پائلیٹ کے سوار ہونے کے بعد کوئی ایک میل چلے ہوں گے کہ جہاز پھر رک گیا۔ معلوم ہوا ساری رات جہاز یہیں رکا رہے گا۔ صبح آٹھ بجے جب "مد" آئے گا تو روانہ ہوگا۔ جہاز کے رُکتے ہی ہم لوگ باہر نکل آئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ آس پاس کئی جہاز اور کشتیاں لنگر انداز ہیں۔ چاندنی تو تھی نہیں گھپ اندھیرا تھا اس تاریکی میں جہازوں اور کشتیوں کی روشنیاں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ ہم نے تھوڑی دیر اس منظر کا لطف اٹھایا۔ پھر کچھ تھکن سی محسوس ہوئی اپنے اپنے کیبن میں آ گئے۔ اور بستر پر لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ دن بھر کے تھکے ماندے تھے خوب گہری نیند آئی

جہاز کا بستر بھی صاف ستھرا اور بہت عمدہ ہوتا ہے۔ دیکھیے خوب نرم نرم موٹا سا گدا، چادر اور ایک بستر یا پلنگ پوش۔ میں تو بس صبح کو اٹھا۔ سوتے وقت پنکھا کھول دیا تھا۔ رات بھر چلتا رہا۔ جب اُٹھا تو بند کیا۔ جہاز ابھی تک جوں کا توں کھڑا تھا۔ کوئی آٹھ بجے پھر چلنے لگا۔ دو تین گھنٹے چلا ہوگا کہ پھر رُک گیا۔ شام کے پانچ بجے تک رُکا رہا۔ پانچ بجے اس کو پھر حرکت ہوئی۔ آج ۲۳ مئی ہے۔ اتوار کا دن ہے۔ معلوم ہوا کہ کل آٹھ بجے ہم سمندر تک پہنچ پائیں گے۔

آؤ اب تمھیں ہگلی دریا کے بارے میں کچھ بتاتے چلیں۔ اس دریا کا پانی پیلا پیلا کچھ مٹیالہ سا ہے۔ کافی گندہ معلوم ہوتا ہے۔ دریا کے دونوں کنارے خوب سرسبز ہیں۔ کناروں پر کہیں کہیں فیکٹریاں بھی نظر آئیں۔ غرض یہ علاقہ کافی خوبصورت ہے۔ آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔

پانچ بجے کے بعد جو جہاز چلا تو بس چلتا ہی رہا۔ رات آ گئی اور پھر صبح ہو گئی صبح کے وقت بھی ہم ہگلی میں تھے۔ یہاں دریا کا پاٹ کافی چوڑا ہو گیا۔ دونوں طرف کے کنارے پھر نظر آ رہے تھے۔

(باقی آئندہ)



بچوں کے لیے



ہنستے کھیلتے بچپن کو لازماً صحت مند بچپن ہونا چاہیے۔ بچے کی صحت کی نگہداشت اُسی دن سے شروع ہوتی ہے جس دن وہ دُنیا میں داخل ہوتا ہے۔ جو بچے باڑھ پر ہوتے ہیں وہ حیاتین (وٹامن) کی کمی کے باعث بہت سی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ بڑھتے ہوئے بچوں کو روزمرہ کی غذا میں حیاتین کی بہتات چاہیے۔ اگر غذا میں حیاتین کی کمی ہے تو اس کمی کو اُن مرکبات سے پورا کرنا چاہیے۔ جن میں ضروری حیاتین ہوتے ہیں۔ حیاتین کے علاوہ بڑھتے ہوئے بچوں کو کیلشیم (چونے کا ست) اور لوہے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دانت اور ہڈیاں اچھی طرح نشوونما جبھی پا سکتی ہیں جب بڑھتے ہوئے بچوں کو کیلشیم باقاعدہ دیا جاتا رہے۔ لوہا، جسم میں خون کے ذرات بڑھانے کے لیے بہت ضروری ہے۔ ان تمام حیاتین، لوہے اور کیلشیم کی کمی کی وجہ سے بچے بہت سی بیماریوں مثلاً سوکھے، ہاڑ روگ، دانتوں کی خرابیاں وغیرہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ "سپلا" کا "مالٹوین" ان تمام ضروری حیاتین، کیلشیم اور لوہے کو فراہم کرتا ہے۔ بچے "مالٹوین" پینا بہت پسند کرتے ہیں اس لیے کہ یہ بہت خوش ذائقہ ہوتا ہے۔

خوراک: بڑوں کے لیے ——— دو سے چار چائے کے چمچے

بچوں کے لیے ——— ایک چائے کا چمچہ

دودھ پیتے بچوں کے لیے ——— ½ چائے کا چمچہ۔ دن میں تین بار کھانے کے بعد

"مالٹوین"، ہندوستان کی مشہور دواساز کمپنی "سپلا لیبارٹریز" تیار کرتی ہے۔

"مالٹوین"، دواؤں کی ہر دکان پر ملتی ہے۔ اگر نہ ملتی ہو تو براہِ کرم "سپلا لیبارٹریز"، بمبئی ۸ سے طلب کیجیے۔

نئی منزل کے متوالو



جناب اقبال نصیب

مبارک ہو تمھیں ارض و سما[1] کی جلوہ آرائی — مبارک ہو تمھیں سائنس کی یہ جادہ پیمائی[2]
زمانہ کو پیامِ امن و راحت کی ضرورت ہے — تمھیں یہ کام بھی کرنا ہے ناوصفِ[3] مسیحائی[4]
نئی منزل کے متوالو نئی دنیا کے رکھوالو

یہ دنیا جنگ بازی کے فسانے کو نہ دہرائے — زمین کو آدمیت کے لہو سے اب نہ نہلائے
یہ ایٹم کے نئے ہتھیار دنیا کو نہ جھلسا دیں — ذرا آواز دو انسان کو انساں نہ مرجائے
نئی منزل کے متوالو نئی دنیا کے رکھوالو

ترقی علم و حکمت کی تکبّر میں نہ کھو جائے — گلِ فردا[5] کہیں گلچیں کے دامن میں نہ مرجھائے
ابھی فکر و عمل کی روشنی کو تیز ہونے دو — ذرا انسانیت کی مشعلیں لے کر بڑھو آگے
نئی منزل کے متوالو نئی دنیا کے رکھوالو

ہزاروں بستیاں افلاس میں اب بھی تڑپتی ہیں — ہزاروں مائیں، بیٹے، بیٹیاں اب بھی سسکتی ہیں
زمیں کی گود امراض تباہی سے نہیں خالی — کئی لاشیں ابھی گور و کفن کو بھی ترستی ہیں
نئی منزل کے متوالو نئی دنیا کے رکھوالو

---

[1] زمین و آسمان [2] منزل کی جانب قدم رکھنا [3] سلیقے کے ساتھ [4] چارہ گری [5] کل کے پھول

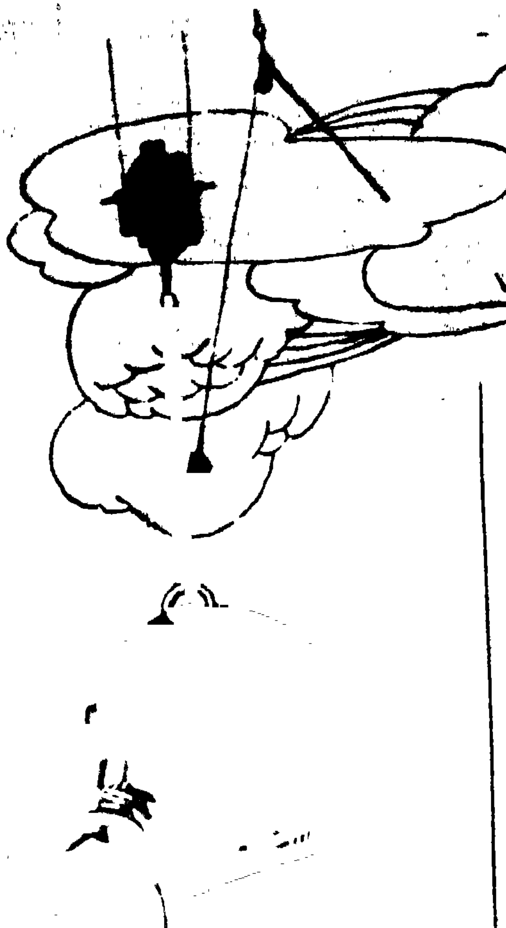
بچوں کی دل چسپ اور سبق آموز کتابیں

ایک پھوری تیل میں راجا جی میں ۴۰/-	اُس نے کیا کر نہ جانا ۳۷/-	بچوں کی کہانیاں ۲۷/-	بڑے دادا کی کہانی ۵۶/-
پرندوں کا ایکا ۲۰/-	تانبیل خاں ۳۰/-	تُرکوں کی کہانیاں ۵۵/-	جنگو کی بلی ۲۵/-
چنبیلی ۵۰/-	چپادت کا آدم خور شیر ۳۵/-	چوہوں کی کانفرنس ۴۵/-	خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا ۳۰/-
سونے کی چڑیا ۱/-	شہزادہ اور ٹھگ ۴۵/-	شہزادی گلفام ۵۰/-	شہزادی گلنار ۴۰/-
شیدلا ۵۰/-	کیمپ فائر کی نقلیں اوّل ۷۵/-	کیمپ فائر کی نقلیں دوم ۷۵/-	لال مُرغی ۵۰/-
مزہ چکھائیں گے ۳۵/-	مُرغی اجمیر چلی ۲۵/-	ننھا ٹٹّو ۳۰/-	ہمت کے پھل ۳۵/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

جناب محمد امین

چاند پر اُترنا



رینجر کی حیرتناک کامیابی

کوئی دو مہینے سے اس مضمون کا سلسلہ بند ہوگیا تھا۔ بہت سے پیامیوں کے شکایتی خط بھی آئے۔ چاند کو سر کرنے کی مہم کے سلسلے میں امریکہ اور روس کی کوششیں برابر جاری ہیں۔ پیامی چاہتے ہیں کہ ان کوششوں کا حال مہینے کے مہینے معلوم ہوتا رہے۔ ہمارے امین صاحب کا بھی یہی منشا تھا۔ مگر اس زمانے میں وہ کچھ اس طرح مصروف رہے کہ ادھر توجہ نہ کر سکے۔ یہ کام ذرا مشکل بھی ہے۔ مختلف ذریعوں سے معلومات حاصل کرنا اور پھر انہیں آسان اور سادہ زبان میں لکھنا کہ آپ آسانی سے سمجھ لیں۔ وقت اور محنت چاہتا ہے۔ بہرحال امین صاحب نے وعدہ فرمایا کہ وہ اس سلسلے میں ہر مہینے کچھ نہ کچھ لکھتے رہیں گے۔ وہ اس بات سے خوش ہیں کہ ان کا مضمون آپ شوق سے پڑھتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ بہت نیک شگون ہے کہ سائنس سے آپکی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔

(ایڈیٹر)

خلائی پرواز یا چاند پر اپنے آدمی پہلے اتارنے کے سلسلے میں سب ہی پیامی جانتے ہیں کہ روس اور امریکہ دونوں میں مقابلہ ہے۔

روس نے لونا ۹ اور لونا ۱۰ کے اڑنے کے بعد ابھی تک کوئی اور کارنامہ انجام نہیں دیا ہے۔ آپ روس کی کوششوں کا حال پچھلے شماروں میں پڑھتے رہے ہیں۔

اِدھر امریکہ بھی خاموش نہیں ہے، کوشش پر کوشش کر رہا ہے۔ روس کے پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھا کر وہ اس سے زیادہ حیرت انگیز کارنامے دکھانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ لیکن سر دست ایک خبر ضرور سنتے چلیے۔ بہت دلچسپ ہے۔

۲۵ مئی ۶۶ء کو آپ نے روس کا ایک اعلان پڑھا ہوگا۔ وہ ساڑھے پانچ مہینے سے یعنی ۱۴ دسمبر ۶۵ سے ۲۵ مئی ۶۶ تک خلا میں کسی سیارے پر آہستگی سے اترنے کا جو تجربہ بحرالکاہل میں کر رہا تھا۔ اسے اس نے کامیابی سے مکمل کر لیا ہے۔

امریکہ نے اس کی تصدیق کی ہے۔ پر یہ بات بھی کہی ہے کہ تجربہ بے شک کامیاب تھا۔ لیکن یہ واضح نہ ہو سکا کہ خلائی پرواز کے سلسلے میں یہ تجربہ کس قسم کا تھا۔ کیا روس اپنے خلابازوں کو پانی میں اتارنا چاہتا ہے۔

بہر حال اب تک روس نے جتنی کوششیں کی ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سائنس داں اپنے خلابازوں کو ایک اوسط اونچائی تک بھیجتے تھے۔ اس لیے زمین پر اترنے میں ان کو کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ وہ آسانی سے خشکی میں روس ہی کے علاقے میں اتر آتے تھے۔

اگرچہ ایک دو بار بڑی مشکلیں پیش آئی ہیں۔ مثلاً لیونوف جب اتر رہے تھے تو ان کا پیراشوٹ انہیں ٹیرکا کے جنگلوں میں اڑا لے گیا تھا۔ اور وہاں وہ جنگل میں کئی دن تک بے یار و مددگار ڈبے کے اندر بند پڑے تھے۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد ہوائی جہازوں اور ہیلی کوپٹروں نے ان کو ڈھونڈھا اور پھر جنگل کے درخت کاٹ کر ان کو باہر نکالا گیا۔

لیکن خلا میں بہت اونچا اڑنے کے بعد نیچے اترنا آسان نہیں۔ اب تک کی معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ چاند یا اس کے قرب و جوار کے علاقے سے اگر کوئی راکٹ یا خلاباز واپس آئیگا تو خیال ہے کہ اس کے لیے زمین کے استوائی علاقے

میں اترنا زیادہ آسان ہوگا بجائے اس کے کہ وہ روس کے شمالی حصے میں اترے۔
غلطی سے اگر راکٹ استوائی خطے کے کسی خطرناک اور گھنے جنگل میں اتر گیا۔ تو بڑی پریشانی ہوگی۔ لیونوف کے ساتھ بھی حادثہ پیش آیا تھا۔
اسی لیے حفظ ماتقدم کے طور پر روس نے زیادہ بلندی سے زمین پر اترنے کے سوال کو تجربہ کر کے حل کر لیا ہے۔ اس کے خلاباز بحرالکاہل کے پانی میں اتریں گے۔
روس کے اس کامیاب تجربے کے بعد کئی خبریں گرم ہیں۔ ایک تو یہ کہ جلد ہی وہ انسان کو راکٹ میں بٹھا کر چاند کے ارد گرد اڑانے والا ہے۔ دوسری یہ کہ ۱۴ اکتوبر ۶۶ء تک وہ اپنے خلابازوں کو چاند پر اتار دے گا۔
امریکہ بھی بہرحال اپنی ان تھک کوششوں میں مصروف ہے۔ اس نے دنیا کا سب سے بڑا راکٹ زحل تیار کر کے ۲۶ مئی ۶۶ء تک راس کنیڈی کے ساحل پر پہنچا دیا تھا۔ اس راکٹ کا وزن ۵۰ لاکھ پونڈ، لمبائی ۳۶۰ فٹ یعنی ۳۶ منزلہ عمارت کے برابر، چوڑائی ۱۴ فٹ اور قیمت ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر (دس کروڑ روپے) تھی۔
۲۶ مئی کو سابق صدر کنیڈی کی مشہور تقریر کی پانچویں سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ پانچ سال پہلے اسی تاریخ میں انھوں نے امریکی جنتا کو مخاطب کرتے ہوئے للکار کر کہا تھا "خلا کی تحقیق میں ہم کسی سے پیچھے نہ رہیں گے۔ چاند پر ہم جائیں گے اور ضرور جائیں گے"۔
اس دن صدر کنیڈی نے نہ صرف اپنے عزم کا اظہار کیا تھا۔ بلکہ امریکہ کی پوری قوم کے سامنے خلائی پرواز کا پروگرام پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم کو وقت اور حالات کے مطابق اس منصوبہ پر عمل کرنا ہے۔ تاکہ ۱۹۷۰ سے پہلے پہلے امریکی خلاباز چاند پر پہنچ جائیں۔
زحل نام کا راکٹ جو ۲۶ مئی کو راس کنیڈی لے جایا گیا تھا۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ امریکہ کتنی تندہی سے اپنے سابق صدر کی کہی ہوئی بات کو صحیح ثابت کرنا چاہتا ہے۔
لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس دوڑ میں امریکہ روس سے بازی لے جائے گا۔ اگرچہ صدر جانسن نے ابھی حال ہی میں ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اب کی بار ہم پیچھے نہیں رہیں گے

اور چاند پر پہلے ہم پہنچیں گے"۔

پچھلے ۵ سالوں میں امریکہ نے خلا کی سائنس میں جتنی تیزی سے ترقی کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بہرحال وہ روس سے اب زیادہ پیچھے نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ چاند پر پہلے کوئی روسی خلاباز پہنچے لیکن اس دوڑ میں امریکہ اس سے زیادہ پیچھے نہیں رہے گا۔

ان دنوں امریکہ میں ۳۰۰۰۰۰ انجینئر، سائنس داں، اور فنی ماہر دن رات زحل اپولو راکٹ پروجکٹ کو مکمل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ امریکہ اب تک ۲ ارب ۳۰ کروڑ ڈالر (۱۸ ارب ۴۰ کروڑ روپے) خرچ کرچکا ہے۔ آئندہ یہ خرچ اور بڑھ جائے گا۔ اور چاند پر قدم رکھنے تک ۲۰ ارب ڈالر (۱۴۲ ارب روپے) خرچ ہوسکتا ہے۔

امریکہ کے سامنے اب مسئلہ چاند پر پہنچنے یا نہ پہنچنے کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ جلد سے جلد وہاں پہنچا جائے۔ سائنس دانوں میں جوش ہے، خود اعتمادی ہے اور بڑی امنگ ہے۔ لیکن عقلمند اور سنجیدہ لوگ فکرمند بھی ہیں کہ چاند پر پہنچنا مذاق نہیں۔ بہرحال ایک سال کے بعد چاند پر جانے والا راکٹ اپولو ضرور بننا شروع ہوجائے گا۔ جو خلاباز چاند پر اتریں گے ان کی ٹریننگ شروع ہوچکی ہے کل ۵۰ خلاباز ٹریننگ کیے جارہے ہیں۔ ان میں سے ۳۰ جو سب سے اچھے ہوں گے چُن لیے جائیں گے۔

۳۰ مئی ۱۹۶۶ء کو امریکہ نے "سنٹور یوسٹر" راکٹ اڑادیا۔ "سروے یر" نام کا مصنوعی چاند اس میں فٹ تھا۔ جس کا وزن ایک ٹن تھا۔ حالات بالکل سازگار رہے۔ اس لیے ۶۳ گھنٹے کے بعد وہ چاند کی سطح پر اطمینان سے اتر گیا۔ اور وہاں اترتے ہی اس نے ٹیلی ویژن کے ذریعہ چاند کے منظر اور اس کی سطح کی بناوٹ کے فوٹو بھی بھیجنے شروع کردیے۔ یاد رہے زمین سے چاند کا فاصلہ ۳۸۴۱۳۲۲ میل ہے۔

جب "اطلس سنٹور" راکٹ "سروے یر" کو لے کر اڑا تو ۳ منٹ ۴۲ سیکنڈ کے بعد وہ ۵۸ میل کی اونچائی تک پہنچ گیا۔ ٹھیک اسی وقت "سروے یر" کے پہلے حصے نے اپنی حفاظتی کاروائی شروع کردی۔ ۱۲ منٹ ۳۷ سیکنڈ کے بعد ۱۱۱ میل کی بلندی، اور ۲۵۶۲۴ میل فی گھنٹہ کی رفتار پر "سروے یر" راکٹ سے الگ ہوگیا۔ پھر وہ خود چاند کی طرف آگے بڑھنے لگا بعد

میں اس کی رفتار کم ہوتے ہوتے ۳,۰۰۰ میل فی گھنٹہ رہ گئی۔ جب وہ چاند کے قریب پہنچا تو چاند کی قوت کشش کی وجہ سے اس کی رفتار بڑھ کر ۶,۰۰۰ میل ہو گئی۔ اس کا انتظام پہلے سے تھا کہ کسی نقطہ پر پہنچ کر وہ خود کام نہیں کرے گا تو زمین سے ہدایت دے کر اسس کو ٹھیک کر دیا جائے گا۔

پرواز کے ۳۲ منٹ کے بعد "سروے یر" میں جو الکٹرانک کا دماغ تھا۔ اس نے حکم دے کر کچھ ایسی ترکیبیں کیں کہ اس میں کچھ پر نکل آئے۔ اور انھوں نے سورج کی کرنوں کو جذب کر کے بجلی اور طاقت میں بدلنا شروع کر دیا۔ اس طرح جب "سروے یر" کے دماغ کو یقین ہو گیا کہ نئی قوت ملنا شروع ہو گئی ہے تو اس نے اپنی خاص بیٹری کو بند کر دیا اور سورج کی طاقت سے چلنے والی بیٹری استعمال کرنے لگا۔

زمین سے اُڑنے کے ۶ گھنٹے بعد "سروے یر" کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ جنوبی نصف کرہ کے سب سے چمکیلے ستارہ یعنی "کے ناپس" کا مشاہدہ کرے۔ جیسے ہی اس نے اس کا مشاہدہ شروع کیا وہ "کے ناپس" اور سورج کے درمیان گھر گیا۔ اور پھر اطمینان سے اس نے اپنی خلائی پرواز جاری رکھی۔ اس دوران میں سائنس داں اس پر برابر نظر رکھتے رہے کہ وہ ٹھیک راستے پر جا رہا ہے یا نہیں اور یہ کہ چاند پر پہنچ کر وہ طوفانی سمندر کے علاقے پر اترے گا یا نہیں؟ کچھ اِدھر اُدھر بھٹکنے کی اس نے کوشش کی لیکن ماہرین نے اس کو بھٹکنے نہیں دیا۔ ۱۵ گھنٹے زمین سے اڑان کے بعد وہ اپنی منزل مقصود کی طرف سیدھا ہو لیا اور ۶۲ گھنٹے کے بعد جب وہ چاند سے صرف ۱,۰۰۰ میل اوپر رہ گیا تو اس نے اپنے آپ کو "کے ناپس" اور سورج کے شکنجے سے آزاد کر لیا اور زمین سے حکم ملنے کے مطابق اس نے چاند پر اترنے کی تیاری شروع کر دی جب وہ چاند سے صرف ۶۰ میل اوپر رہ گیا۔ تو اس کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے تین چھوٹے انجن داغے گئے اور بریک لگنا شروع ہو گیا۔ تاکہ اس کی رفتار کم ہونا شروع ہو جائے۔ چنانچہ رفتار ۶,۱۰۰ میل فی گھنٹہ سے گھٹ کر صرف ۴,۰۵۰ میل رہ گئی۔ چاند سے ۲۵ میل کی بلندی پر پہنچ کر بڑے راکٹ نے اپنا کام بند کر دیا۔ اور تین چھوٹے انجن رفتار کو گھٹاتے چلے جب چاند سے

وہ صرف ۱۴ فٹ رہ گیا تو انجن بند ہو گئے۔ اور پھر "سروے یر" نے خود بخود نیچے چاند پر گرنا شروع کر دیا۔ اس وقت رفتار ۵ر۳ فٹ (۳٫۵) فی گھنٹہ رہ گئی تھی۔

اس کا انتظام پہلے سے تھا کہ چاند کی سطح کو چھوتے وقت اس کو جھٹکا نہ لگے۔ لگے تو معمولی سا۔ جیسے پیراشوٹ سے کودنے والے کو لگتا ہے۔ چنانچہ "سروے یر" ۲ر جون ۶۶ء کو ہمارے وقت کے مطابق دن میں ۱۱ر بج کر ۴۷ر منٹ پر (گرین وچ کے وقت کے مطابق صبح کو ۶ر بج کر ۱۷ر منٹ) چاند پر اطمینان سے اتر گیا۔ اس کے پنجوں میں گدے دار پیڈ لگے ہوئے تھے۔ اسی لیے آہستگی سے اترا۔

اترتے ہی اس نے تصویریں بھیجنی شروع کر دیں۔ اور کھٹا کھٹ اس نے ۱۴۴ر تصویریں بھیج دیں۔ وہ مسلسل ۱۲ر گھنٹے تک تصویریں بھیجتا رہا۔ اس کے بعد اسے حکم دیا گیا کہ وہ خاموش ہو جائے چنانچہ حکم ملتے ہی اس نے فوٹو بھیجنے کا سلسلہ بند کر دیا۔

چاند پر پہنچنے میں بالکل ٹھیک ۶۳ گھنٹے لگے۔ "سروے یر" کی اس حیرت انگیز کامیابی پر دنیا خصوصاً امریکہ اور روس میں بڑی خوشی منائی گئی۔ روس میں اسپتنک کے بابا لیونڈ سیڈاف نے کہا کہ "سروے یر" کی کامیابی سے روس کے طول و عرض میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

ہمارے صدر، نائب صدر اور وزیر اعظم نے صدر جانسن کو مبارک باد کے پیغام بھیجے۔

جو تصویریں "سروے یر" نے بھیجی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہاں کنکر، پتھر، چٹان، کے بھاری ٹکڑوں سب ہی کی بھرمار ہے پتھر یا چٹان کے یہ ٹکڑے ایک فٹ سے لے کر ایک انچ تک ہیں۔ غار اور گڑھے بھی کافی ہیں "سروے یر" جس جگہ اترا ہے۔ وہاں اس کے پیروں کے نیچے زمین چند انچ دھنس گئی تھی۔ مگر یہ کوئی خاص بات نہیں۔ یوں سمجھیے کہ زمین پر، ریت یا چکنی مٹی پر "سروے یر" اترتا تب بھی اس کے پیر یا پنجے کچھ نہ کچھ نیچے مٹی میں ضرور دھنس جاتے۔ اسی طرح چاند پر "سروے یر" کے دھکے سے تھوڑی بہت مٹی دھنس گئی تھی۔

روس کے لونا ۹ (پیام تعلیم مئی ۶۶ء) نے جو نو اہم تصویریں بھیجی تھی ان سے یہ تصویریں ملتی جلتی ہیں "سروے یر" کے ایک سائنس داں

ڈاکٹر "لیونرجیف" (?) نے کہا ہے کہ تصویروں کے مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ چاند کی سطح سخت ہے اور وہاں پہنچ کر انسان نیچے قدم رکھے گا تو وہ ہرگز نہیں دھنس سکتا۔ طوفانی سمندر کے علاقے کی سطح جہاں ۱۹۷۰ء سے پہلے پہلے اپولو نام کے راکٹ میں بیٹھ کر خلاباز اتریں گے۔ ہموار اور ٹھوس ہے۔ بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ چاند پر گرد یا نرم مٹی کی پتلی سی تہہ ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ایسی گہری نہیں ہے کہ اترتے وقت انسان اس میں دھنس جائے یا اس کا راکٹ اس کے سمندر میں غائب ہو جائے۔ ۱۵ ٹن کا اپولو راکٹ بہ آسانی اس پر ٹھہر سکتا ہے۔

ایک سائنس داں کا یہ بھی خیال ہے ہ طوفانی سمندر کے علاقے کی بناوٹ دیکھ کر ندازہ ہوتا ہے کہ شاید چاند کے باقی حصوں ں بناوٹ بھی ایسی ہی ہوگی۔ اس لیے وہاں ج کر اس کی چھان بین کرنا اور تفصیل سے ئزہ لینا آسان ہوگا۔

۱۷ جون ۶۶ء تک "سروے یر" نے ۱۰۳۰۰ تصویریں بھیج دی تھیں اس طرح اس نے معلومات کا ایک خزانہ بھیج دیا ہے۔ دنیا کے سائنس داں پچھلے دس سال سے پریشان تھے کہ شاید چاند پر کئی گز موٹی گرد کی تہہ بیٹھی ہوئی ہے اور خلا باز اتریں گے تو اس میں پھنس کر بے یار و مددگار ہو جائیں گے۔ اب یہ طے ہے کہ وہاں کوئی خدشہ نہیں ہے۔ خلا کا بھاری سے بھاری جہاز اتر کر ٹک سکتا ہے۔ انسان ایسا چاند کی سطح پر چل سکتا ہے۔ اس کی بناوٹ یقیناً ٹھوس اور مضبوط ہے۔ "سروے یر" جس جگہ اترا ہے اس کے چاروں طرف پہاڑیاں اور نیچے معمولی قسم کے پہاڑ ہیں۔ وہاں زمین اونچی نیچی ہے تصویروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں گڈھے، غار اور دہانے (آتش فشاں پہاڑوں کے) بھی بہت ہیں۔ یہ ایک فٹ سے لے کر کئی فٹ لمبے چوڑے ہیں۔ کنکر، پتھر بھی بہت ہیں چھوٹے بڑے ہر سائز کے۔ بعض اتنے چھوٹے ہیں کہ ایک انچ کے سویں حصے کے برابر ہیں۔

"سروے یر" کو جہاں اترنا چاہیے تھا اس سے یہ ۱۰ میل دور اترا لیکن اہم بات یہ ہے کہ امریکہ نے چاند پر راکٹ اتارنے کی کوشش پہلی بار کی تھی۔ اور وہ کامیاب ہو گیا۔ اس کے

سائنس دانوں کو خود اس زبردست اور حیرت انگیز کامیابی پر تعجب ہوا۔ حقیقتاً ان کو صرف ۲۵ فی صدی کامیابی کی امید تھی۔ اس سے پہلے روس چار بار چاند پر آہستگی سے راکٹ اتارنے کی کوشش کر چکا تھا۔ کہیں پانچویں کوشش میں اسے کامیابی ہوئی تھی۔ لونا ۹ چاند پر پہنچا تھا۔ اور اس نے نو تصویریں بھیجی تھیں۔

جس جگہ "سروے یر" اترا تھا، چاند کے اس حصے میں ۱۷ر جون کے بعد رات ہو گئی تھی (چاند پر دن ہمارے دن کے چودہ دنوں کے برابر اور رات بھی ہماری رات کی چودہ راتوں کے برابر ہوتی ہے) لہٰذا "سروے یر" خاموش ہو گیا تھا۔ ۷ر جولائی (۱۹۶۶) کو وہ پھر جاگ اٹھا تھا۔ اور اس نے زمین کے سگنل کے جواب دیے۔ زمین کے ارد گرد چکر لگاتے لگاتے جب چاند ایسے نقطے پر پہنچا کہ وہ زمین کے سائے یا عکس میں سے باہر نکل آئے تو "سروے یر" بھی سورج کے سامنے آگیا تھا۔ اور جب اس کی گرمی سے اس کی بیٹری گرم ہوئی۔ تو ۶ر جولائی کی صبح سے اس نے پھر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اندھیرے میں پڑے رہنے کی وجہ سے وہ خاموش تھا۔

۱۲ر جولائی تک وہ بیدار رہا۔ اور اس نے کل ۱۱۰۳۰ تصویریں بھیجی تھیں۔ ۱۴ر جولائی سے اس نے تصویریں بھیجنی بند کر دی تھیں۔ اس طرح "سروے یر" اوّل جو کہ چاند پر امریکہ کی آنکھ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے یک بیک اپنا کام ختم کر دیا تھا۔

(باقی آئندہ)

اِن کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے

کوے دادا	۱/۷۵	دہلی	۱/۵۰
سمندر کے نیچے	۲/-	ہماری پارلیمنٹ	۱/۵۰
سمندر کے کنارے	۱/۱۲	برف کا گھر	۰/۸۷
میر انیس	۱/۲۵	برف کے تیرتے پہاڑ	۰/۳۷
میر تقی میر	۱/-	آستین کا سانپ	۰/۵۰
ابو خاں کی بکری	۲/۵۰	اُلٹی دوا	۰/۵۰
انوکھا عجائب خانہ (مکمل)	۱/۸۰	بادشاہ کے کپڑے	۰/۵۰
تین اناڑی	۱/۴۰	زمین کی گردش	۰/۵۰
ستاروں کی سیر	۱/۷۵	سونے کی چڑیا	۱/-
خرگوش کا سپنا	۱/۷۵	چمپاوت کا آدم خور شیر	۰/۳۵
جن حسن عبد الرحمٰن (مکمل)	۴/-	ایک ٹانگ کا بادشاہ	۰/۳۰
آدمی کی کہانی	۱/۲۵	انوکھی ملاقات	۰/۳۵
بڑ ولوا کی کہانی	۰/۵۶	جلو مرغابی	۱/-
چٹانوں کی کہانی	۱/۷۵	گلّا بو بوڑھیا	۰/۴۵
دادا نہرو	۱/۵۰	ظالم کسان	۰/۳۵

ملنے کا پتہ

عجیب انعام



جناب شمیم ہاشمی

کسی تھانہ دار نے ایک فقیر کو بے قصور قید کر لیا اور سزا دی۔ فقیر خموشی سے اس کے ظلم سہتا رہا، اور جس دن اسے قید سے رہائی ملی اُس نے تھانہ دار کو ترقی کی دعا دی اور چل دیا —— اسی دن تھانہ دار کو اُس کی ترقی کا کاغذ ملا۔ اس کی امید تو اُسے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔ اب وہ داروغہ بنا دیا گیا تھا۔ اُسے اچانک اُس فقیر کا خیال آیا۔ اُس نے سوچا "اُسی فقیر نے تو جاتے جاتے دعا دی تھی" یقیناً وہ کوئی خدا رسیدہ بزرگ ہے اور یہ خیال آتے ہی وہ اُس کی تلاش میں نکل پڑا۔ تمام دن وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا لیکن اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ بیچارہ مایوس ہو کر گھر لوٹ رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظر فقیر پر پڑی، دوڑ کر اس کے قدموں پر گر پڑا اور اپنے قصور کی معافی چاہی، وہ اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا، ندامت سے اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں ——

فقیر مسکرا رہا تھا۔ اس نے داروغہ جی سے کہا۔ جاؤ بیٹا! میں نے تمھیں اُسی دن معاف کر دیا تھا—— اگر معاف نہ کرتا تو دعائیں کیوں دیتا؟

یہ بات سن کر داروغہ جی کو کچھ سکون ملا مگر انھوں نے اب بھی فقیر کو نہ چھوڑا ان کی خواہش تھی کہ وہ اسے منھ مانگا انعام دیں اس لیے انھوں نے کہا —— بابا! میں آپ کو منھ مانگا انعام دوں گا —— آپ جو چاہیں بے دھڑک مانگ لیں!!

"نہیں بیٹا! مجھے خدا کے فضل و کرم سے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے کچھ نہیں لوں گا!!"

"بابا! میں آپ کو انعام ضرور دوں گا، آپ اپنی خواہش ظاہر کیجیے!"

"تم مجھے انعام نہیں دے سکتے بیٹا!" فقیر نے داروغہ جی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر داروغہ جی برابر ضد کرتے رہے —— !!

"اچھا تو مجھے ایک ہزار جگنو دیدے"۔ فقیر نے اپنی خواہش ظاہر کی۔

"جگنو؟" داروغہ جی نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا!" جگنو، کیا نہیں دے سکتے؟

"نہیں بابا! میں آپ کی خواہش پوری کروں گا۔ چاہے مجھے اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت کیوں نہ چکانی پڑے —— اور پھر جگنو کی تلاش جاری ہو گئی —— آس پاس کے جنگلوں اور پہاڑوں میں لوگ جگنو کی تلاش میں نکل پڑے —— کئی دن کی مسلسل محنت کے باوجود بھی اتنے جگنو نہ مل سکے بیچارے داروغہ جی بہت پریشان تھے —— ایک دن فقیر نے پوچھا —— "بیٹا! کئی دن گذر گیے کیا اب تک ایک ہزار جگنو نہیں مل سکے؟"

"نہیں بابا! داروغہ جی نے اداس لہجے میں جواب دیا —— "فقیر مسکرایا اور بولا "گھبراؤ نہیں —— میرے ساتھ چلو میں تمہیں ایسی جگہ لے چلتا ہوں جہاں ہزاروں جگنو ملیں گے"۔ "سچ بابا؟ چلیے چلیے میں ابھی چلتا ہوں ——" داروغہ جی نے کہا اور اسی وقت اپنے چند آدمیوں کے ساتھ فقیر کے ساتھ چل پڑا —— فقیر ان لوگوں کو لیے ہوئے ایک قبرستان میں پہنچا —— کچھ دیر تک ادھر اُدھر گھومتا رہا پھر ایک پرانے مزار کے پاس کھڑا ہو گیا اور کہا —— اس مزار میں ایک بڑا

ساسوراخ کر دو ——— داروغہ جی نے ایسا ہی کیا۔ سوراخ کرنا تھا کہ بے شمار بچھو قطار در قطار اس مزار سے نکلنے لگے۔ لوگ انہیں پکڑنے کی تیاری کرنے لگے ——— مگر فقیر نے انہیں روک دیا اور کہا۔ مجھے میرا انعام مل گیا۔ انہیں پکڑنے کی ضرورت نہیں ——— سب کے سب یہ ماجرا دیکھ کر حیران تھے۔ فقیر مسکرا رہا تھا۔!!

"بابا! آپ نے پہلے ہی یہ جگہ کیوں نہ بتائی۔؟ یہ کس کا مزار ہے بابا؟ اس میں اتنے بچھو کہاں سے آئے؟" داروغہ جی نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"یہ ایک تھانہ دار کی قبر ہے۔ جو لوگوں کو بے قصور سزا دیا کر......" ابھی فقیر کا یہ جملہ پورا بھی نہ ہو پایا تھا کہ داروغہ جی کے چہرے پر وحشت طاری ہو گئی۔ وہ خوف سے لرز اٹھے ان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اور آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اُمڈ آیا۔

مگر فقیر اب بھی مسکرا رہا تھا !!



جناب ل م، شاہد

دیس کی عزّت

احمد ایک غریب لڑکا تھا۔

اسکول کے لڑکے احمد کے پھٹے کپڑے دیکھ کر ہنستے تھے۔ سب سے زیادہ محمود ہنستا تھا۔ محمود ایس۔ ڈی۔ او کا لڑکا تھا۔ وہ اچھے اچھے کپڑے پہن کر اسکول آتا تھا۔ اگر وہ کوئی غلطی بھی کرتا تو کوئی کچھ نہ کہتا۔ بڑے آدمی کا لڑکا جو تھا۔

ایک دن احمد اپنے باپ کے ساتھ بازار گیا۔ اس کے باپ کو چاول لینا تھا۔ سیٹھ چاندی مل کی دوکان پر کافی بھیڑ تھی۔ آدھ گھنٹے بعد اس کا باپ چاول خرید کر گھر کی طرف چل پڑا۔

"ابا جان سیٹھ چاندی مل بلیک کرتا ہے۔ بلیک کرنے والے سرکار کے دشمن ہوتے ہیں۔ بلیک کرنا جرم ہے ابا جان۔"

"میں تو پڑھا لکھا نہیں ہوں بیٹا۔ یہ تو تم جانو کہ جرم کیا ہوتا ہے۔ میں تو ایک مزدور ہوں۔ پیٹ بھرنے سے مطلب ہے۔"

احمد نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ گھر آ کر وہ تمام رات سوچتا رہا۔

دوسرے دن وہ ایس۔ ڈی۔ او صاحب سے ان کے بنگلے پر ملا۔

اس نے بتایا کہ سیٹھ چاندی مل بلیک کرتا ہے۔

پہلے تو ایس۔ ڈی۔ او صاحب احمد کی عمر پر غور کرتے رہے۔ پھر انھوں نے سوچا کہ اسے جرأت

کیسے ہوئی کہ وہ بغیر کسی ثبوت کے کسی پر الزام رکھ رہا تھا۔

"کیا تم سیٹھ چاندی مل کو بلیک کرتے ہوئے پکڑوا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں ــــ"

"اچھی بات ہے۔ کل میں تمھارے ساتھ چلوں گا ــــ"

دوسرے دن احمد سیٹھ چاندی مل کی دکان پر پہنچا۔ بولا۔

"بابا نے چاول مانگا ہے ــــ"

"پیسے لائے ہو ــــ؟"

"لایا ہوں ــــ"

اور سیٹھ چاندی مل نے چاول تول کے احمد کے تھیلے میں بھر دیا۔ جیسے ہی سیٹھ نے پیسے لیے ایس۔ ڈی۔ او صاحب جو دروازے کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے۔ لپک کر آئے اور سیٹھ کو پکڑ لیا۔ سیٹھ بہت گھبرایا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

احمد کو سرکار کی طرف سے انعام ملا۔

"انعام کے علاوہ کچھ اور چاہتے ہو تو کہو۔" ایس۔ ڈی۔ او نے پوچھا۔

"جی ہاں، آپ اپنے لڑکے محمود کو منع کر دیں کہ وہ مجھے اسکول میں تنگ نہ کرے۔"

ایس۔ ڈی۔ او، صاحب نے فوراً محمود کو بلوایا اور ڈانٹ کر بولے۔

"محمود تم احمد سے معافی مانگو۔ یہ تم سے بڑا ہے۔ جو لڑکے اپنے دیس میں کالا بازار کو پھیلنے سے روکتے ہیں، جو ہمیشہ دیس کی بھلائی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ایسے لڑکے دیس کی عزت ہوتے ہیں۔"

اور محمود نے احمد سے معافی مانگی۔

اب اسکول کے تمام لڑکے احمد کی عزت کرتے تھے۔ کوئی احمد کے پھٹے کپڑے دیکھ کر نہ ہنستا تھا۔



بچّوں کی کوششیں

پچھلے شمارے میں عزیزی ابو راشد سلمہٗ کی کہانی "الماس" کا آخری حصہ چھپنے سے رہ گیا تھا۔ ہمیں اس کا افسوس ہے۔ اسی لیے اس شمارے میں ان کی یہ کہانی دوبارہ شایع کی جارہی ہے۔ اسی طرح "پن ہول کیمرہ" کے مضمون نگار عبدالحلیم خطیب کا نام بھی رہ گیا تھا۔ پیامی اس کو درست کرلیں۔ (ایڈیٹر)

الماس

ایک مال دار آدمی۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ ایک دن اس کے جی میں آئی کہ انھیں آزمائے۔ اس نے تینوں کو اکٹھا کیا اور اپنی ساری ملکیت ان کے درمیان برابر برابر بانٹ دی۔ صرف ایک قیمتی چیز اپنے پاس رکھ لی۔ یہ ایک بڑا سا الماس تھا۔ اس نے تینوں لڑکوں سے کہا کہ اچھا اب تم لوگ کہیں گھر سے دور چلے جاؤ اور پورے تین مہینے کے بعد مجھ سے ملو ــــــ میں یہ قیمتی انعام ــــــ الماس ــــــ اسے دوں گا جس نے سفر کے دوران کوئی اعلیٰ ترین اخلاقی کارنامہ انجام دیا ہو۔ چنانچہ تینوں لڑکے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور مختلف سمتوں کو روانہ ہوگئے۔ اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے رہے۔ جب تین مہینے ختم ہونے کو آئے، تو سب گھر لوٹے اور باپ کی خدمت میں حاضری دی۔ پھر ہر ایک نے باری باری اپنے نیک کاموں کی روداد سنائی۔

ایک لڑکے نے کہا: ایک دن ایک اجنبی آدمی میرے پاس آیا، اور اچھا خاصا قیمتی سامان میری امانت میں رکھ کر چلا گیا، اس کے لیے

نہ کوئی دستاویز لکھوائی اور نہ کسی شاہد وگواہ کی ضرورت محسوس کی۔ کچھ دنوں کے بعد واپس آیا اور اپنی امانت طلب کی، میں نے بغیر کسی ٹال ٹول کے اس کا سامان اس کے حوالے کر دیا۔

باپ نے کہا: تم نے بہت اچھا کیا ایک ذمّے داری سے سُبک دوش ہو گئے۔ امانت کی ادائیگی ایک عام فریضہ ہے اور وہی فریضہ تم نے ادا کیا ہے۔ ایسا نہ کرتے تو خائن اور بے ایمان کہلاتے۔

اب دوسرے لڑکے کی باری تھی۔ اس نے کہا: ابّا جان! میں ایک بار دریا کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ دیکھا کہ ایک بچّہ اس میں ڈوب رہا ہے، ہر چند کہ دریا چڑھا ہوا تھا، لیکن یہ منظر دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر دریا میں کود گیا اور ان تُند و تیز لہروں سے لڑتا ہوا بچّے کے قریب جا پہنچا اور اسے بچا لینے میں کامیاب ہو گیا۔

شاباش! باپ نے داد دی اور کہا بے شک تمھارا یہ نیک کام تعریف کے لائق ہے۔ لیکن تمھارے اس عمل کی حیثیت بھی یہی ہے کہ تم نے اپنا ایک فرض ادا کیا ہے۔ مُروّت و انسانیت کا یہی تقاضا تھا۔ اگر تم ایسا نہ کرتے تو خود غرض، بزدل اور سنگ دل کہلاتے اور مُروّت و انسانیت کے دائرے سے خارج سمجھے جاتے۔

آخر میں تیسرے صاحبزادے نے اپنی حکایت شروع کی۔ کہنے لگے: سفر کے زمانے میں ایک آدمی میرا دشمن ہو گیا، اس کی دشمنی کی وجہ مجھے نہیں معلوم ہو سکی۔ وہ مجھے بڑا تنگ کرتا، عاجز آ کر ایک دن میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ جاتے جاتے ایک ٹیلے کے پاس پہنچا۔ دیکھا کہ میرا وہی دشمن ایک خطرناک گہرے کھڈ کے کنارے سو رہا ہے اگر میں اسے زرا سا دھکّا دیتا تو وہ فوراً اس گہرے کھڈ میں جا گرتا اور بڑی بُری موت مرتا۔ اس طرح میں اس سے چھٹکارا پا جاتا۔ لیکن میں نے یہ گوارا نہیں کیا۔ دبے پاؤں اس کے پاس گیا اور نہایت آہستگی سے اس کو جگا دیا —— اتنا سننا تھا کہ باپ اُچھل پڑا اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور کہنے لگا جانِ پدر! خدا کی قسم تم نے بہت بڑا کام کیا۔ بدسلوکی سے درگزر کرنا اور دشمن کو قدرت کے باوجود معاف کر دینا بہادری ہے۔ اور اس کے ساتھ اچھا سلوک ایک بڑا اخلاقی کارنامہ ہے —— خوب بہت خوب —— لو یہ الماس، اس کے مستحق تم ہی ہو۔ جاؤ خدا تمھیں ہمیشہ اچھے کاموں کی توفیق بخشے۔

ابو راشد، سرائے میر

ڈاکو بادشاہ بن گیا

کسی شہر میں ایک غریب لڑکا رہتا تھا۔ اس کا نام جمال تھا۔ جمال بہت ہی شریف اور نیک لڑکا تھا۔ اس کے والدین مر چکے تھے۔ وہ محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ اسے پودے لگانے کا بہت شوق تھا۔ جہاں بھی کوئی خوب صورت پودا دیکھتا اپنے گھر لا کر صحن میں لگا دیتا اور اس کی دیکھ بھال کرتا۔

ایک دن وہ اپنے خوب صورت پودوں کو پانی دے رہا تھا، دور سے ایک آدمی کو آتے دیکھا۔ جس نے پھٹے اور گندے کپڑے پہن رکھے تھے۔ جمال نے آگے بڑھ کر غریب آدمی کی خیر خیریت پوچھی اور اسے اپنے گھر لے آیا۔ تھوڑی دیر بعد غریب مہمان کے سامنے تازہ دودھ اور روٹی لا کر رکھی۔ اس شخص نے جمال کا شکریہ ادا کیا اور کھانا کھا کر خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ جمال نے کہا تم تھکے ہوئے ہو۔ چارپائی پر تھوڑی دیر کے لیے آرام کر لو۔ مہمان آرام کے لیے چارپائی پر لیٹ گیا۔ اور جمال کو دعائیں دینے لگا "اے نیک دل لڑکے اس وقت جو سلوک تم نے مجھ سے کیا ہے اس کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔ اور کوشش کروں گا کہ تم کو اس کا صلہ دوں"۔ جمال نے کہا۔ یہ تو میرا فرض تھا۔

اس شخص کے جانے کے بعد کچھ سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے جمال کے مکان پر پہنچے اور جمال سے پوچھا "تمھارے مکان میں کون ہے"۔ جمال نے کہا "اس وقت تو کوئی نہیں۔ البتہ ایک غریب آدمی کچھ پہلے آیا تھا۔ آرام کر کے ابھی ابھی گیا ہے"۔ شاہی سواروں نے کہا "ہمیں اس شخص کی عرصے سے تلاش ہے۔ بادشاہ نے اس شخص کو گرفتار کرنے والے کو دولت سے مالامال کر دینے کا اعلان کیا ہے۔ جمال نے پوچھا آخر وہ شخص ہے کون؟ شاہی سواروں نے بتایا کہ وہ بہرام ڈاکو ہے جس کی وجہ سے تمام ملک پریشان ہے، یہ کہہ کر اس کے بتائے ہوئے راستے پر بہرام کی تلاش کو چل دیے۔

دوسرے دن جمال نے سنا کہ بہرام ڈاکو نے ایک شاہی سوار کو مار کر اس کی وردی پہن لی اور ایک بڑے دولت مند کے پاس جا کر کہا۔ "بادشاہ سلامت نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ میں آپ کے خزانے کی حفاظت کر سکوں۔ آج کل بہرام ڈاکو ہر امیر آدمی کو لوٹ رہا ہے"۔ امیر آدمی

یہ سُن کر بہت خوش ہوا۔ اور اس نے بہرام ڈاکو کو اپنے خزانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "میرا خزانہ اس سامنے والے کمرے میں محفوظ ہے۔ بہرام ڈاکو وہاں تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ کہہ کر امیر آدمی تو گھر کے اندر چلا گیا اور بہرام ڈاکو اس کے خزانے کی حفاظت کرنے میں مصروف ہو گیا۔ جب آدھی رات گزر گئی تو بہرام نے خزانے کا دروازہ کھولا اور امیر آدمی کی تمام دولت لے کر چلتا بنا۔ جب امیر آدمی کو پتہ چلا کہ اس کی تمام دولت غائب ہے تو وہ بھاگا بھاگا بادشاہ کے دربار میں پہنچا اور بادشاہ سے فریاد کی۔ آپ کے فوجی افسر نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ بادشاہ نے کہا تم اس شخص کو پہچان سکتے ہو۔ امیر آدمی نے فوراً کہا۔ بہت اچھی طرح۔ بادشاہ نے اپنی فوج کے سب افسر بلوائے لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے دولت مند پہچانتا۔ وہ اپنی غلطی پر افسوس کرتا ہوا گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بہرام اس کے ہاں دوبارہ آیا تھا۔ جو کچھ باقی بچ رہا تھا وہ بھی لے گیا ہے۔

جمال نے دل میں سوچا کہ بہرام تو بہت ہی ظالم اور سنگ دل انسان ہے جو دوسروں کو لوٹ کر اپنا گھر بھر رہا ہے۔ اب اگر وہ میرے گھر آ کر ٹھہرے تو میں اُسے پکڑوا دوں گا۔ اور بادشاہ سے انعام حاصل کروں گا۔ ایسے ظالم شخص کی مدد کرنا ٹھیک نہیں۔

جمال ان ہی خیالات میں ایک ایسے بازار سے گزرا۔ جہاں بہت سے غریب آدمی رہتے تھے۔ جمال نے دیکھا ایک بہت مالدار شخص ان غریبوں کو پھل مٹھائیاں، کپڑے اور روپئے تقسیم کر رہا تھا۔ جب جمال اس کے قریب پہنچا تو اسے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ وہی شخص تھا جو اس کے مکان میں ٹھہرا تھا۔ اور پولیس اس کی تلاش میں تھی، بہرام کو غریبوں کی خدمت کرتے دیکھ کر جمال کو بہت خوشی ہوئی اور اس کے دل میں بہرام کے خلاف جتنے بُرے خیالات تھے جاتے رہے اور وہ بہرام کی عزّت کرنے لگا۔ جب بہرام ان غریبوں کو سب کچھ تقسیم کر کے چلا گیا تو جمال نے ایک آدمی سے پوچھا کیوں یہ ڈاکو یہاں کیا کرنے آتا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ وہ ہماری مدد کے لیے آتا ہے۔ وہ چوری کرتا ہے اور تمام دولت ہم لوگوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

کچھ عرصے بعد ایک دن رات کے وقت کسی نے زور سے جمال کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا

جمال نے دروازہ کھولا تو سامنے بہرام ڈاکو کھڑا تھا۔ جمال نے اسے مکان کے اندر لے جاکر بٹھایا اور پوچھا کہیئے کیسے آنا ہوا۔ بہرام نے کہا۔ آج میں تم کو ایک راز کی بات بتانے آیا ہوں، وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گے۔ جمال نے وعدہ کیا۔ بہرام نے کہا ـــ جمال، میں بادشاہ کا لڑکا ہوں ـــ سوتیلی ماں نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ پیدا ہوتے ہی مجھے دریا میں بہا دیا۔ بہتا بہتا میں اس جگہ جا پہنچا جہاں ڈاکو رہتے تھے۔ ڈاکوؤں کے سردار نے مجھے دریا سے نکالا اور میری پرورش کی۔ جب وہ مرنے لگا تو اس نے مجھے بتایا کہ تم شہزادے ہو، اور یہ ملک تمھارا ہے۔ اس بات کا علم ہونے کے بعد میں بادشاہ کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی کہ جناب میں شریف ماں باپ کا بیٹا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی فوج میں ملازم ہو جاؤں۔ بادشاہ نے کہا۔ اچھا تم کل وزیر اعظم سے مل لینا۔ وہ تمھارا بندوبست کر دیں گے۔

ابھی میں دربار سے نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ وزیر نے مجھے پہچان لیا کہ میں تو فیروز ڈاکو کا لڑکا بہرام ہوں۔ شاہی سپاہیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ اس وقت میں نے بادشاہ سلامت سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں فیروز ڈاکو کا لڑکا نہیں، آپ کا لڑکا ہوں۔ اس ملک کا شہزادہ ہوں لیکن درباریوں نے میری باتوں کا مذاق اُڑایا اور پھر مجھے جیل میں ڈال دیا۔ بادشاہ کے اس ظلم و ستم سے میں ڈاکو بن گیا۔

ابھی بہرام نے اپنی کہانی ختم بھی نہ کی تھی کہ شاہی سواروں نے جمال کا گھر گھیر لیا اور دونوں کو پکڑ لیا۔ بہرام نے چپکے سے جمال کے کان میں کچھ کہا جمال مسکرانے لگا۔ جب بہرام کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو بادشاہ نے پوچھا ہم اس بہادر کا نام جاننا چاہتے ہیں جو بہرام کو پکڑ کر لایا ہے۔ جمال نے کہا جناب میں نے بہرام کو پکڑا ہے۔ شاہی سواروں نے کہا۔ بادشاہ سلامت یہ جھوٹ بولتا ہے۔ بہرام کو ہم نے پکڑا ہے۔ جمال نے کہا۔ بادشاہ سلامت، میں بادشاہ کو پکڑ کر آپ کے پاس لا رہا تھا کہ راستے میں شاہی سوار مل گئے انھوں نے ہم دونوں کو پکڑ لیا اور یہاں لے آئے۔

بادشاہ نے اسی وقت جمال کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ جمال نے کہا جناب اگر آپ میری ایک بات ماننے کا وعدہ کریں تو میں آپ سے کچھ کہوں۔ بادشاہ نے کہا اے بہادر لڑکے ہم تیری بہادری سے بہت خوش ہوئے ہیں اور ہر بات

ماننے کے لیے تیار ہیں۔ جمال نے کہا بادشاہ سلامت بہرام کو چھوڑ دیجیے۔ بس یہی ایک درخواست ہے۔ بادشاہ نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ اس شخص نے ہمارے ملک میں ڈاکے ڈال کر ہماری رعایا کو بہت پریشان کیا ہے۔ یہ بہت خطرناک ڈاکو ہے۔ اسے تو ہم کبھی نہیں چھوڑیں گے۔

جمال نے کہا اس میں بہرام کا کیا قصور ہے۔ اس کی جس ماحول میں پرورش ہوئی ویسا ہی بنا، اس میں قصوروار آپ کی ملکہ ہیں۔ جنھوں نے اپنے سوتیلے بچے کو دریا میں پھینک دیا ــــ یہ بچہ بہتا بہتا فیروز ڈاکو کے ہاتھ لگا اور اس نے بہرام کی پرورش کی۔ چوں کہ وہ ڈاکو تھا اس لیے بہرام بھی ڈاکو بن گیا۔

یہ سُن کر بادشاہ کو تعجب نہیں ہوا۔ کیوں کہ ایک مرتبہ بہرام نے بھی کہا تھا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ اس نے آگے بڑھ کر بہرام کو سینے سے لگا لیا۔ تھوڑے دنوں بعد بادشاہ نے تخت و تاج شہزادہ بہرام کے حوالے کیا اور خود یادِ الٰہی میں مشغول ہو گیا۔ شہزادے نے بادشاہ بنتے ہی جمال کو اپنا وزیرِ اعظم مقرر کیا اور اس طرح اس کے احسان کا بدلہ ادا کیا۔

محمد سلیم، ثانوی سوم

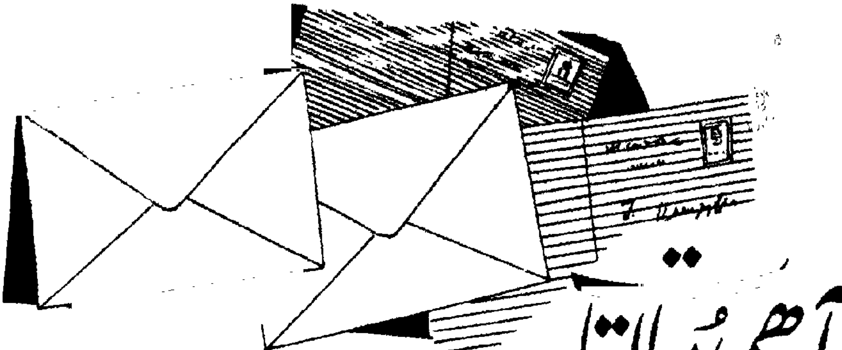
میرے چھوٹے بھائی جان

عجیب چیز ہیں میرے چھوٹے بھائی جان بھی۔ بس جب دیکھو ہمیں چھیڑ رہے ہیں۔ ہم پر دھونس جما رہے ہیں۔ اسکول سے آتے ہی ہم پر حکومت شروع کر دیتے ہیں۔ نوشہ کتابیں رکھو، نوشہ کمرے میں جھاڑو دو، نوشہ یہ کرو، نوشہ وہ کرو۔ میں کبھی تو ان کی بات مان لیتا ہوں اور کبھی ان کو باتوں میں ایسا بہلاتا ہوں کہ اپنے کام بھی انھیں سے لے لیتا ہوں۔

میرے چھوٹے بھائی جان کو اپنے دستخط کرنے کا بہت شوق ہے۔ ایک دن انگریزی لکھنے کے لیے میں نئی کاپی لایا۔ جب لکھنے بیٹھا تو پہلے ہی صفحے پر کیا دیکھتا ہوں کہ بھائی جان کے رنگ برنگ کے دستخطوں سے صفحہ بھرا پڑا ہے۔ اُسی روز سے میں نے ان کو کاپی دکھانا بند کر دیا۔

ایک بات جس پر ان سے ہماری اکثر بحث ہوتی ہے وہ ہے ہمارا ان کو "چھوٹے بھائی جان" کہنا۔ وہ کہتے ہیں میں بھائیوں میں سنجھلا ہوں اس لیے سنجھلے بھائی جان کہو چھوٹے تو تم ہو۔ میں کہتا ہوں چھوٹا میں صحیح لیکن بھائی جان کہاں ہوں۔ بھائی جان تو چھوٹے آپ ہی ہیں۔

نوشیرواں اسرار
(عمر ۹ سال)



آدھی ملاقات

محترمی - سلام شوق

آنکھ کھلتے ہی اپنے گھر میں پیام تعلیم کی حکمرانی دیکھی - (والد صاحب پیام تعلیم کے پرانے لکھنے والوں اور مداحوں میں سے ہیں) ہوش آنے کے بعد پرانے پرچوں کا ذوق و شوق سے مطالعہ کیا - لیکن پیام تعلیم سے اتنا زیادہ متاثر کبھی نہ ہوا جتنا کہ اب ہوں - جب سے میرے محبوب پرچے کو "حیاتِ نو" ملی ہے خوشی ہے کہ یہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے - آپ کے "حسنِ ذوق" اور "خوش سلیقگی" کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی -

جولائی ۶۶ء کے شمارے پر نظر پڑتے ہی طبیعت مچل اٹھی - دل بچپن کی حسین یادوں میں کھو گیا جو چند سال پہلے مجھ سے بچھڑ چکا ہے - آپ ہی بتائیے اگر بچپن روٹھ گیا ہوتا تو "ننھے پیامیوں" میں اپنی تصویر دیکھ کر کتنی خوشی —— ہوتی نہ ...... ؟ —— لیکن ..... افسوس

"لاؤں کہاں سے بچپن لاؤں ؟"

سعادت صدیقی

ریسرچ اسکالر - شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی

پہلی مرتبہ اگست ۶۶ء کا شمارہ "پیام تعلیم" نظر نواز ہوا - واہ صاحب! کیا کہنے ہیں، سرورق دیکھتے ہی دل باغ باغ ہوگیا - اتنی کم قیمت میں اتنا معیاری ادب پیش کرنا صرف آپ ہی جیسے لوگوں کا کام ہے - بچوں کے رسالے میں یہ رسالہ مجھے بے حد پسند آیا - ہر شمارے میں اگر کوئی انعامی مقابلہ رکھ دیا جاتا تو پھر رسالے میں چار چاند

لگ جاتے۔ کہانیوں میں "بوڑوں کی کہانی" "کوّا اور چوہا" "گاؤں کے بے گنوار لوگ" اور "اَٹا گھوڑا"۔ بے حد پسند آئیں۔ "لندن کا آنکھوں دیکھا حال" پڑھ کر تو ایسا محسوس ہوا جیسے خود لندن کی سیر کر رہا ہوں۔

انجم جمال، ہوڑہ ۲

پیامِ تعلیم کا جولائی ۶۶ء کا شمارہ سامنے ہے۔ پرچہ نہایت ہی معیاری ہے اور بچوں کے لیے نظمیں اور مضامین دونوں ہر لحاظ سے نہایت ہی موزوں اور مفید ہیں۔ بچوں کے لیے اتنا معیاری رسالہ اردو ادب میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس کے لیے آپ کا عزم اور حوصلہ قابلِ صد ستائش ہے۔

ہمارے یہاں بچوں نے اسے بہت پسند کیا ہے وہ بھی اپنی طرف سے آپ کی خدمت میں مبارک باد پیش کر رہے ہیں قبول فرمائیے۔

سیّد صفدر رضا، کھنڈوا

جون کے پیامِ تعلیم نے تو مجھے حیران کر دیا۔ کیوں کہ وہ تو بالکل بدلا ہوا تھا۔ جناب یوسف ناظم کی کہانی "قربان میاں کے کارنامے"، جناب مولانا مقبول احمد سیوہاروی کی "ابن بطوطہ" اور عبدالغفار بمبئی کی "منگل مندر" بہت ہی پسند آئی ——

جناب بزمی بھارتی نے تو مرثیہ لکھنے میں کمال کر دیا۔ بھارتی صاحب نے تو پوری کربلا کی تصویر پیش کر دی۔ میں آپ کی ایجنسی کے لیے یہاں کوشش کروں گا۔ خدا کرے آپ کا پیامِ تعلیم زیادہ سے زیادہ ترقی کرے۔

محمد ابراہیم، سری نگر

پیامِ تعلیم دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب اردو میں بھی اس قسم کے رسالے نکلنے لگے ہیں۔ اردو میں بچوں کے لیے معلوماتی رسائل کی بہت کمی ہے۔ امید ہے پیامِ تعلیم اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔

بخشی برلاج کمار

'پیامِ تعلیم' کا بلند معیار دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی خدا سے دعا گو ہوں کہ آپ کا سایہ ہمیشہ پیامِ تعلیم کے سر پر قائم رکھے۔ جولائی ۶۶ء کے رسالے میں مجیب احمد خاں کا مضمون "ڈالفن مچھلی" پسند آیا۔

شمیم انور، کلکتہ ۲۴

بڑوں کی کوششیں

اوکھلا میں پکنک

ٹریننگ کی ابتدا میں ہمارے کالج کی طرف سے ہم پکنک کے لیے اوکھلا گئے۔ ہم صبح ۹ بجے کے قریب وہاں پہنچ گئے۔ موسم یوں تو خاص اچھا نہ تھا۔ سورج پورے زور سے اپنی طاقت دکھانے پہ تُلا ہوا تھا۔ لیکن درختوں کا سایہ ہمارے سر پہ تھا، وہ بھلا ہمارا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ ہار کر بے چارے نے بادلوں کی اوٹ لی۔ اور ہمیں بے انتہا خوشی ہوئی کیوں کہ جو ہمیں تنگ کرنے آیا تھا وہ خود تنگ ہو کر چلا گیا اور اب آئی ہماری باری کسی کو تنگ کرنے کی۔ ہمیں پکنک کا مزا لوٹنے کی۔ نظارا بہت اچھا تھا۔ درختوں کی ٹھنڈی چھایا، ندی کا کنارا، ہری ہری دوب یہ سب مل کر نظارے میں چار چاند لگا رہے تھے۔

ہمارے وہاں پہنچنے سے وہاں کی خاموشی ٹوٹی۔ پروگرام میں سب سے پہلا نمبر کھیلوں کو دیا گیا تھا۔ اس لیے وہاں پہنچتے ہی پہلے کھیل شروع ہوئے جس میں ہمارا ہاؤس دوسرے نمبر پر آیا۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا دیا گیا۔ کھانے میں کچھ دیر ہوگئی تھی اور بھوک پورے زوروں پر تھی اس لیے کھانے میں بہت مزہ آیا۔ اس کے بعد سانسکرتک پروگرام ہوا۔ پھر کچھ ریفریشمنٹ ملا اور پھر ہم وہاں سے نہ بھولنے والی یاد لیے آگئے۔

وجے لکشمی، جامعہ

بیسک ٹریننگ پہلا سال

میں نے ایک دن کا مدرسہ دیکھا

ایک دن میرا دل بہت اُداس تھا، جانے کیوں میرا دل کالج جانے کو نہ تھا۔ جب سُنا کہ آج تو ایک دن کا مدرسہ دیکھنے جامعہ کالج جانا ہے۔ میں

بہت خوش ہوئی۔ کبھی کبھی ہی دل کی تمنا پوری ہوتی ہے۔

میں ہوسٹل میں گئی اپنی دوست سے کہا کہ چلو ہم بھی مدرسہ دیکھنے چلیں۔ جب ہم مدرسے میں گئے، ہم بہت حیران تھے۔ مدرسے میں ایسی چپ چاپی تھی مانو یہاں کوئی بھی نہیں ہے صرف مدرسے کی عمارت ہے۔

ہم سوچ رہے تھے کہ کیا کریں۔ اتنے میں ایک لڑکی ہمارے پاس آئی اور بولی آؤ میں تم کو اپنا مدرسہ دکھاتی ہوں۔ ہم اس کے ساتھ ہو لیے۔ اس نے پہلے اپنا ہوسٹل دکھایا۔ بچوں نے اسے بہت خوب صورت سجایا تھا۔ ہم نے بھی بہت پسند کیا۔ اس کے بعد ہم کلاسوں کو دیکھنے گئے۔ پانچویں تک ہم نے کلاسیں دیکھیں۔ اسی کلاس کے بچے "استاد" تھے وہ اتنا اچھا پڑھا رہے تھے کہ مانو وہ بہت پہلے سے اسی کلاس کے استاد ہوں۔ میں نے سوچا کہ ہمارا تعلیم پانے کا مقصد یہ بچے "بنا تعلیم پائے" پورا کر رہے ہیں۔ مجھے سب سے اچھی کلاس پہلی لگی۔ ہم مدرسے کے نگران سے بھی ملنے گئے وہ بہت اچھے تھے۔ اب ہم تھک چکے تھے ہم واپس آگئے۔

کلجیت کور، جامعہ
بیسک ٹریننگ، پہلا سال

مالی کی کلی

بہار کا موسم تھا، ہر کلی خوش تھی، کسی کو موسم خزاں کا خیال بھی نہ تھا، اچانک زور کی آندھی آئی۔ پتے ہلے، ڈالیاں کانپیں، کلیوں کے دل دہلنے لگے۔ بھولی بھالی تھیں، کچھ نہ سمجھیں۔ روئیں چلائیں پر بے کار۔

آندھی تیز سے تیز چلتی رہی، پھر دھیمی پڑی اور رک گئی۔ کلیاں خوش ہوئیں اور ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دیکھتی کیا ہیں کہ ان میں سے ایک کلی زمین پر آپڑی ہے۔ پھر تو سارا گلشن سہم گیا اور خاموشی سے روتا رہا

صبح کو شبنم آئی، سب کے منہ دھوئے پر اس کلی سے کچھ نہ کہہ سکی۔ خاموش اس کے پاس بیٹھ گئی اور بیٹھی رہی۔ سورج نے کلیوں کو چپ چپ پایا تو خود ٹھٹھر گیا۔ اور بادلوں کے آنچل سے اس درد بھرے حادثے کو دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ جب نہ دیکھا گیا تو بادلوں کی چادر میں منہ لپیٹ لیا۔ لیکن اس کے آنسو چادر میں نہ سما سکے اور گلشن کے گرد گرنے لگے۔

آج مالی نے گلشن کا رنگ کچھ بدلا پایا ہر کلی

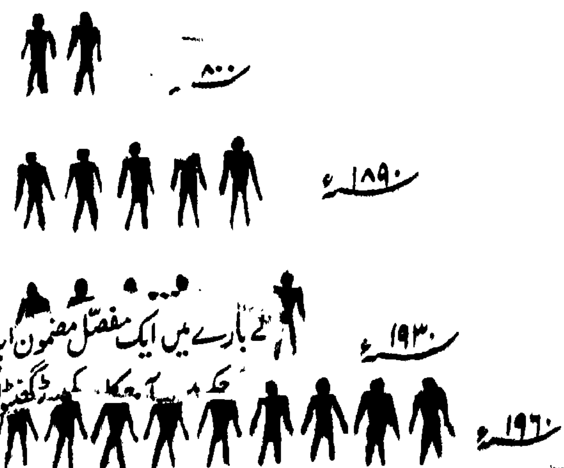
کے گالوں پر آنسو تھے جو ٹپ ٹپ ٹپک رہے تھے۔
وہ خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔
آج گلشن خاموش کیوں ہے؟ نہ خوشبو ہے نہ رونق
ہے، نہ وہ ہنستے ہوئے چہرے ہیں۔ میری وہ کلی
آج اپنے نازک بستر سے کس طرح اس سخت زمین پر
آگری۔ چڑیو، (چلاّتا ہے) یہ یہاں تو آج کوئی
نہیں۔ کہاں چلی گئیں۔ کیا آج تمھیں میرا گلشن پسند
نہیں آیا۔ ضرور آج وہ بھی مجھ سے ناراض ہیں تتلیو
بھنورو، تم میں سے آج کوئی بھی نہیں، سب کہاں
چلے گئے۔ آج تم میری اس ننھی سی کلی کی رکھوالی بھی
نہ کر سکے۔ وہ کلی نہ جانے کب سسک سسک کر
مرگئی۔ وہ میری کلی تھی۔ وہ ابھی کھلی بھی نہ تھی۔ اس پر
کس نے ستم ڈھایا۔ اب میں بھی اس گلشن میں نہ رہوں گا۔
جس نے میرا گلشن لوٹا ہے مجھے کیوں نہ لوٹا۔ میرے
گلشن، میری کلیو، میرے پتو، میرے پیارے
کانٹو آج تمھیں میرا آخری سلام ہے۔ نہ میرا کوئی
گلشن ہوگا نہ کلیاں ہوں گی۔ نہ منڈلاتے ہوئے
بھنورے ہوں گے۔ بس چٹانیں ہوں گی۔ ریت
ہوگی۔ چلچلاتی دھوپ ہوگی۔ دریا کا بہتا ہوا
پانی ہوگا۔ جہاں مجھے کوئی گیت نہ سنا سکے۔
جب رات ہو تو دریا کی کل کل کرتی ہوئی آہ وزاری
سنوں اور تمھیں یاد کروں۔ اور پھر اسی خاموشی میں
میرا وجود بھی مدغم ہو جائے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔
مالی کی یہ بات سن کر ایک کلی مسکرا دی۔
پھول بن گئی۔ پھر تو دیکھتے دیکھتے سارے باغ
میں رونق آگئی۔ پرندے چہچہانے لگے۔ تتلیاں
اور بھونرے پھولوں کے چاروں طرف منڈلانے
لگے۔ ایک پھول نے مالی سے کہا۔ اچھے ساتھی
یہ ہوائیں تو چلیں گی۔ بادل تو برسیں گے — یہ
ہمارے لیے زندگی کا سامان لاتے ہیں ان سے تھوڑا
بہت نقصان پہنچے تو اس پر ماتم کرنا نادانی ہے۔

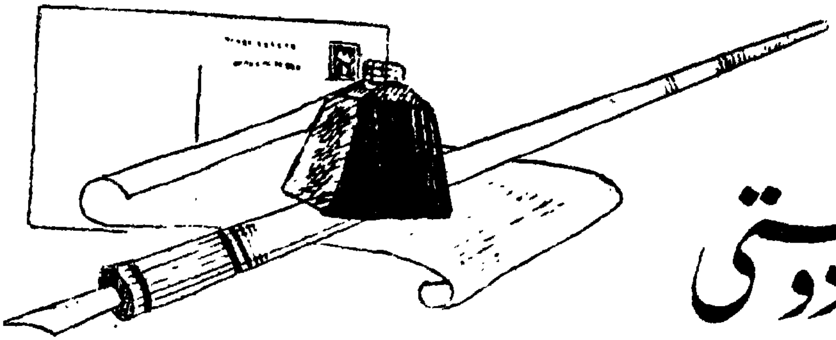
سید وراثت حسین
ڈپلوما سیکنڈ ایر

صحافی

اِدھر اُدھر سے

ہمارے دیس کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہ اسی تیزی سے بڑھتی رہی تو نہ جانے کہاں تک پہنچے گی۔ ہماری حکومت کو موجودہ آبادی کا انتظام سنبھالنے میں بہت دشواری ہو رہی ہے۔ اب سے ۳۲ برس بعد جب یہ آبادی ایک ارب سے بھی آگے بڑھ جائے گی تو کیا ہوگا۔ جبھی تو دیس کی حکومت اور دیس کے سمجھ دار لوگ ایسے جتن کر رہے ہیں کہ آبادی زیادہ بڑھنے نہ پائے۔ نیچے کچھ تصویریں دی جا رہی ہیں ان سے آپ کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا۔ ایک تصویر پانچ کروڑ کے برابر ہے۔





قلمی دوستی

داحد علی خاں
اُنیس ۱۹ برس
مکان نمبر ۶۹/۱ منشی عبداللہ چال
چونا بھٹی سنتا کروز، بمبئی ۲۹
کرکٹ، فٹ بال کھیلنا۔ اردو اخبار و
رسائل کا مطالعہ کرنا۔ مضامین و کہانیاں لکھنا۔
نماز پڑھنا۔ قلمی دوستی کے آئے ہوئے خطوط
کے جوابات دینا اور گانا گانے کا بھی شوقین ہوں۔

صابر احمد جمال الدین
۱۴ سال ۱۲-۲-۱۹۵۲ء
روم نمبر ۱۰ بس چیمبر ہولڈنگ نمبر ۲۹۶
گلی۔ چلچلاتی دھوپ ہوگی۔ دی نگر
مختلف رسل و رسائل جمع کرنا اور پڑھنا۔
مذہبی کتابیں پڑھنا۔

شمس رحمانی قریشی
۱۹ سال
اصالت پورہ، مراد آباد
قلمی دوستی، رسائل کا مطالعہ، زبان اردو
کی ترقی کے لیے کوشش، قوم کی فلاح کے لیے
کوشش۔

محمد ابراہیم، صدیقی
۱۷ سال
نمبر ۶۷/۳ محلہ حسن منزل، الہ آباد (یو۔پی)
بچوں کے ادبی اور علمی رسالوں کا باقاعدہ
مطالعہ۔ کہانیاں لکھنا۔ اخلاقی، ادبی اور مذہبی
کتابیں پڑھنا۔ اور ان کی حفاظت کرنا۔ قلمی دوستی
کرنا اور ہر قسم کے انعامی مقابلوں میں حصہ لینا۔
مزاحیہ نظمیں اور غزلیں پڑھنا۔

سن ۲۰۰۰ء

موٹو بال — ایک نیا کھیل

موٹو بال ایک نئی طرز کا کھیل ہے جو فٹ بال کے عام طرز کے میدانوں میں موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر کھیلا جاتا ہے۔ موٹو بال میں بھی فٹ بال کی طرح گول بنائے جاتے ہیں۔ فٹ بال کے میدان میں جو نشانات استعمال کیے جاتے ہیں وہی موٹو بال میں بھی ہوتے ہیں۔ فرق [illegible] اس قدر ہے کہ گول کے عین سامنے ایک مستطیل نشان بنایا جاتا ہے تاکہ آف سائیڈ کا تعین کیا جا سکے۔ موٹر سائیکل سوار گولا لے کر اس لائن سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

ٹیم میں پانچ کھلاڑی ہوتے [illegible] جس میں ایک گ[illegible] فٹ بال [illegible] گول کیپر ہی کو اس کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ گولا ہاتھ سے روک سکتا اور پکڑ سکتا ہے۔

کھلاڑی اپنی موٹر سائیکلوں پر بیٹھے ہوئے گولے کو لات مار سکتے، ڈھکیل سکتے اور ہیڈ کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی موٹر سائیکل کے پہیوں کی مدد سے بھی گولے کو آگے لے جا سکتے ہیں۔ گول کیپر اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا گول پر کیے جانے والے حملوں کو روک سکتا ہے۔ گولے کا قطر ۳۸ تا ۴۰ سینٹی میٹر ہوتا ہے۔ موٹو بال میں استعمال جانے والی موٹر سائیکلیں مروجہ طرز کی کورد و بیٹس موٹر سائیکلوں کے مانند ہوتی ہیں۔ یہ موٹر سائیکلیں سوویت یونین میں تیار کی جاتی ہیں۔

ٹیلیفون کے ذریعے کمپیوٹر کی خدمات

کمپیوٹر کے بارے میں ایک مفصل مضمون آپ پچھلے پرچے میں پڑھ چکے ہیں۔ آج کل یہ کمپیوٹر گھنٹوں کے حساب سے کرائے پر دیے جا سکتے ہیں۔ جلدی ان کی خدمات سیکنڈوں کے حساب سے بھی حاصل

ہوسکیں گی۔ لوگ ٹیلیفون کی طرح کمپیوٹر سے حاصل کی ہوئی خبروں کے بل بھی ادا کیا کریں گے جن کے پاس ٹیلیفون یا ٹیلی پرنٹر ہوگا وہ کمپیوٹر سے معلومات حاصل کر سکے گا۔ کمپیوٹر بہت آرام کے ساتھ ایک ہی وقت میں سب کے سوالوں کا جواب دے گا۔

وہ پیچیدہ اور لمبا چوڑا حساب کرے گا۔ الجھنوں کا حل ڈھونڈے گا لیکن کسی گاہک کو یہ محسوس نہ ہوگا کہ اسی وقت وہ اور کئی لوگوں کو بھی جوابات دے رہا ہے۔ یہ حیران کن کام وقت تقسیم کرنے والی مشین کی مدد سے ہوتا ہے جو کمپیوٹر کو لمحہ بھر میں ایک مسئلے سے دوسرے مسئلے کی طرف متوجہ ہونے کے قابل بناتی ہے۔ یہ ایک مسئلے کو ایک دفعہ حل نہیں کرتا بلکہ ایک حصہ حل کرکے دوسرے مسئلے کو لے بیٹھتا ہے اور اسی طرح مسئلے بدلتا رہتا ہے۔ عام خیال ہے یہ ایک الجھا ہوا طریقہ ہے۔ لیکن اس کے دیگر فوائد ہیں۔ کمپیوٹر کے مقابلے پر لوگ بہت کم رفتار سے سوچتے ہیں۔ جواب پانے والا جب جواب کے ایک حصے کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، اُس وقت کمپیوٹر رُکتا نہیں۔ بلکہ وہ دوسروں کو جواب دینے لگتا ہے اور سب سے نپٹ لیتا ہے۔

لوہے کے کپڑے

اِسٹین لیس اسٹیل کے برتن تو آپ نے دیکھے ہی ہوں گے۔ چمکیلے، صاف اور شفاف! نہ ان میں زنگ لگتا ہے نہ یہ میلے پڑتے ہیں مضبوط بھی بہت ہوتے ہیں۔

اس اِسٹین لیس اسٹیل کا انتہائی باریک، نرم اور مضبوط ریشہ تیار کیا گیا ہے جس سے عمدہ قسم کا کپڑا تیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ خبر حال ہی میں امریکہ سے ملی ہے۔

ہم نے اپنے بچپن میں ایک خبر پڑھی تھی کہ شیشے کے کپڑے بنا کریں گے۔ اُس وقت ہمیں اس پر یقین نہ آیا تھا مگر آج آپ اور ہم وہی کپڑے نائلون اور ٹریلین کی شکل میں استعمال کر رہے ہیں۔ یقین ہے کہ بڑے ہو کر آپ لوہے کے بنے ہوئے خوبصورت کپڑے پہنیں گے اور اس وقت پیام تعلیم میں پڑھی ہوئی یہ خبر آپ کو یاد آئے گی۔

پرنٹر و پبلشر احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

باغ کے مالک کا پتہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ باغ ایک عورت کا ہے۔ ابراہیم نے اس عورت کے پاس جا کر سارا واقعہ بیان کیا اور معافی کی درخواست کی۔

عورت نے کہا۔ باغ میں آدھا حصّہ میرا ہے۔ آدھا بادشاہ کا ہے۔ بادشاہ بلخ میں ہیں اور بلخ بخارا سے دس دن کا راستہ ہے۔ اپنا حصّہ تو میں معاف کرتی ہوں۔ مگر بادشاہ کے حصّے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔

یہ سن کر ادہم بلخ کی طرف چل دیے، شہر میں پہنچے تو بادشاہ کی سواری جا رہی تھی ادہم بھیڑ میں گھس گئے۔ اور بادشاہ کو سارا قصہ سنایا۔ بادشاہ نے کہا۔ کل شاہی محل میں آجایئے، جواب مل جائے گا

اب یہ سنو کہ بادشاہ کی ایک بیٹی تھی، بڑی نیک اور خوبصورت۔ بادشاہ سوچ میں تھا۔ کہ اس کی شادی کسی ایسے آدمی سے کرے جو نیک ہو، سچا ہو، دیانت دار ہو۔ یوں تو بڑے بڑے شہزادے اور امیرزادے شہزادی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ بادشاہ نے لڑکی کو ادہم کا حال سنایا۔ تو بڑی خوش ہوئی اور ادہم سے شادی کے لیے رضامند ہو گئی۔

دوسرے دن ادہم سیب معاف کرانے بادشاہ کے پاس آئے تو بادشاہ نے اس شرط پر معاف کرنے کا وعدہ کیا کہ ادہم شہزادی سے شادی کر لیں۔ اس طرح شادی ہو گئی۔

شادی تو ہو گئی۔ مگر پہلی ہی رات میں ادہم کا انتقال ہو گیا۔ شہزادی کو بے حد رنج ہوا، مگر کیا کرتی، اسی شہزادی سے ابراہیم پیدا ہوئے۔

بادشاہ کی اولاد میں کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس لیے حکومت نواسے کو ملی اور ابراہیم بادشاہ ہو گئے۔

ابراہیم بن ادہم کے مزار پر ایک خانقاہ ہے۔ جہاں ہر ایک مسافر کو کھانا ملتا ہے۔

شب برات کی پندرہ تاریخ کو یہاں ایک میلہ لگتا ہے۔ جو کوئی آتا ہے۔ قبر کے مجاور کو موم کا ہدیہ دیتا ہے۔ نہ معلوم یہ موم کا ہدیہ کیوں دیا جاتا ہے۔ اس نواح میں اکثر نصیری آباد ہیں۔ نصیریوں کے عقیدے عام مسلمانوں سے الگ ہیں۔ پھر ہم لاذقیہ گئے۔

لوگ کہتے ہیں لاذقیہ وہی شہر ہے جس کا بادشا؟

ہر ایک کشتی کو جو اس کے ساحل سے گذرتی تھی اپنے قبضے میں کر لیتا تھا۔ اور اسی کا ذکر حضرت موسیٰ اور خضر کے سلسلے میں قرآن میں آیا ہے۔

لاذقیہ کا گرجا :۔

شام کے شہروں میں لاذقیہ کا گرجا سب سے بڑا ہے۔ جہاں دور دور سے عیسائی آتے ہیں، عیسائیوں کے بڑے بڑے پادری اس گرجا میں رہتے ہیں۔

مسلمان مسافر گرجا میں آتے ہیں تو عیسائی ان کی دعوت کرتے ہیں۔ دعوت میں روٹی، پنیر، اور سرکہ کھلایا جاتا ہے۔ اور دسترخوان پر کھیر ضرور آتی ہے۔ اس گرجا کا نام دیرالفاروس ہے۔ لاذقیہ سے قلعہ مرقب اور اقرع پہاڑ سے گذر کر بستان کا پہاڑ ملا۔ جہاں سیکڑوں درویش دنیا سے الگ تھلگ پڑے ہیں کہاں کے ہیں۔ اور کس خاندان کے ہیں یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔

بستان بڑا شاداب اور سرسبز پہاڑ ہے۔ رنگ رنگ کے پھولوں اور پھلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ جگہ جگہ پانی کے جھرنے ہیں جنھیں دیکھ کر آنکھوں میں تازگی آجاتی ہے۔

بعلبک :۔

بستان سے چلے تو بعلبک پہنچے، بعلبک شام کے شہروں میں پرانا شہر ہے۔ دمشق کے بعد اس سے مرفہ الحال دوسرا کوئی شہر نہیں ہے۔ آڑو بڑی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعلبک کی مٹھائیاں، کپڑا اور لکڑی کا سامان مشہور ہے۔ چاروں طرف باغات اور چمن ہیں یہاں مکتی نام کا مزے دار حلوا بنتا ہے، یہ انگور کے شیرہ سے بنایا جاتا ہے۔ پستے اور بادام ڈلتے ہیں تو ذائقہ بڑھ جاتا ہے۔ بعلبک میں دودھ بھی بکثرت ہوتا ہے۔ جسے دمشق جاکر بیچتے ہیں۔ بعلبک میں لکڑی کے پیالے بنانے والے بڑے کاری گر ہیں۔ ایک پیالے میں دس پیالے اس طرح رکھے جاتے ہیں کہ دیکھنے والا ایک پیالہ سمجھتا ہے۔ ایسے ہی چمچے بناتے ہیں۔ دسترخوان بچھا کر الگ الگ رکھتے ہیں تو پورا دسترخوان سج جاتا ہے چمچوں اور پیالوں کے لیے چمڑے کا توشہ دان بھی بنایا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مسافر میں بڑے کام کی ہیں۔



لو بھئی ناشتہ کرلو

فوٹو: ایس اے چودھری

[illegible] 1966. Regd. No. D. 1457.

Payam-i-Taleem

New Delhi-25.